PAKSOCIETY.COM
سچی کہانیاں آپ بیتیاں جگ بیتیاں
ماہنامہ
سرگزشت
مارچ 2012
نگران اعلیٰ
معراج رسول
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
سوز و ساز: اردو کے پہلے غزل گو کا زندگی نامہ
لینس ڈاؤن برج: پاکستان کی شان کا تاریخی پس منظر
سفر کہانی، شکار کتھا، فلمی دنیا کی باتیں، بہت سی سچ بیانیاں اور حقیقی واقعات
WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

سرگزشت — 15
عظیم لکھاری
ایک صفحے میں مکمل، مختصر مختصر، ایک نادر روزگار کا تعارف خاص
ادارہ

گفت و شنید — 16
شہرِ خیال
آپ کی باتیں، آپ کے خیال، آپ کے مشورے اور آپ کے سوال
مدیر اعلیٰ

شخصیت — 24
سوز و ساز
اردو ادب میں نمایاں نام حاصل کرنے والے ولی بن غزل گو کا زندگی نامہ
ڈاکٹر ساجد امجد

مہم جوئی — 51
سربلند
اس نے ایک غیر معمولی کام انجام دیا مگر قسمت نے ساتھ نہ دیا، بدنامی مقدر ٹھہری
مریم کے خان

سیرِ پاکستان — 69
لیننگ ٹاور آف پیسا
انجینئرنگ کا شہکار کہے جانے والے انسانی ہاتھوں کے کمال کا تذکرہ
زلفی شاہ

زندگی نامہ — 79
چلبلا
ایک مشہور فلمی اداکار کی زندگی کے نشیب و فراز کی دلچسپ روداد
تنویر ریاض

عبرت کتھا — 91
ایکسٹرا
ایک ایسا کردار جسے لوگ آج بھی دکھ بھرے انداز میں یاد کرتے ہیں
یعقوب جمیل

تاریخ — 97
سنہرا ماضی
اس نے دوران سفر معلومات کا خزانہ جمع کر لیا تھا
مختار آزاد

معلومات — 111
پراسرار مخلوق
سیارۂ زمین کیا دوسرے سیاروں کی مخلوق آتی ہے؟ ناسا کی تجربے گاہیں کیسے قید کیا گیا؟
آصف ملک

سفر کہانی — 129
شبِ رنگیں
سرزمین افریقا کی رنگینی، منفرد سفرنامہ
مسعود عالم

شکار کتھا — 139
بھگوڑا شکاری
ایک بڑے عہدے دار کے شکار کھیلنے کی دلچسپ روداد
مسعود کھدر پوش

جرم کہانی — 153
سیریل کلر
اس علاقے میں مسلسل قتل ہو رہے تھے اور وہ اس قاتل کے تعاقب میں تھا، بیس سال بعد وہ اس تک پہنچا
ابن کبیر

افلاک نامہ — 169
انوکھا سیارہ
افلاک پر محوِ سفر سیاروں میں سے ایک پراسرار سیارے کا احوال
محمد ایاز راہی

معاشرت — 172
سراب
بلند حوصلوں اور بے مثل ولولوں سے گندھی تہلکہ خیز داستان
کاشف زبیر

پہلی سچ بیانی — 216
رقصِ زندگی
زندگی کیسے کیسے کھیل دکھاتی ہے کیسے کیسے ناچ نچاتی ہے
عارفہ

دوسری سچ بیانی — 231
کاری
عورت کی مظلومیت کی یہ انتہا ہے کہ وہ صرف قربان ہوتی رہے
افشاں

تیسری سچ بیانی — 237
غریب
اس نے جرم برسوں پہلے کیا تھا مگر اسے سزا اب ملی ہے
کامران

چوتھی سچ بیانی — 248
مارِ آستین
یہ سچ ہے کہ گناہوں کا بوجھ ضمیر کو کبھی بھی چین لینے نہیں دیتا
نعم الحسن

پانچویں سچ بیانی — 265
پسند
اس نے ایک لڑکی کو پسند کیا مگر اس کے ساتھ کیسا عجب سلوک ہوا
محمد فاروق انجم

چھٹی سچ بیانی — 271
مکافات
یہ دنیا امتحان گاہ ہی نہیں نتیجہ گاہ بھی ہے "جو کریں گے سو بھریں گے"
جنید

ساتویں سچ بیانی — 277
نیکی
نیکی کر تھانے جا یہی اس کے ساتھ ہوا تھا، ہلکے پھلکے انداز کی ایک سچ بیانی
فیض احمد

آٹھویں سچ بیانی — 283
تلاش
اس کی بیوی نے اسے ایک عجیب نکتہ بتایا جس نے اس کی زندگی بدل دی
فیصل ریحان

نویں سچ بیانی — 288
ایسا کیوں
وہ آج تک اس راز کو حل نہ کر سکا کہ اسے نوکری کس نے اور کس واسطے دی تھی
کمال الدین

سوغات — 000
پارچے
دنیا بھر سے مختلف موضوعات پر معلومات انکشافاتی پارچے
قارئین / ادارہ

ماہ نامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوقِ طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
● تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

جلد 22 ❖ شمارہ 05 ❖ مارچ 2012ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

مصور: شاہد حسین

شعبۂ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789

نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391

رانا محمد حمید 0323-2895528

نمائندہ لاہور افراز علی ناز ش 0300-4214400

❖❖❖

قیمت فی پرچہ 50 روپے ❖ زرِ سالانہ 600 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER APNS CPNE

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ جو ہم دیکھتے ہیں وہ نظر کا دھوکا، جو سنتے ہیں وہ ہوا کا جھونکا ثابت ہو رہا ہے۔ اب یہی دیکھ لیجیے کہ دنیا کو گلوبل ویلج بنا دینے والی ٹیکنالوجی نے ہمارے ملک میں بھی خوب ترقی کی ہے کیونکہ مارچ 2000ء سے 2002ء کے دوران سائنس وٹیکنالوجی کی وزارت نے اپنے بجٹ میں 600% کا اضافہ کرایا تھا تاکہ نئے ترقیاتی منصوبوں پر کام ہو سکے۔ اس کے بعد دس بارہ سال میں خوب کام ہوا۔ سات آئی ٹی یونیورسٹیز قائم ہوئیں۔ 34 یونیورسٹیز میں کمپیوٹر سائنس اور آئی ٹی کے شعبے قائم ہوئے ڈیجیٹل لائبریریز قائم ہوئیں جہاں تدریسی کتب، بین الاقوامی جرائد تک مفت رسائی کو ممکن بنایا گیا۔ سوفٹ ویئر سے متعلق برآمدات کو 15 سال کے لیے ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ یہ سب ضروری بھی تھا اور وقت کی آواز بھی کہ آنے والا دور آئی ٹی کا ہے مگر ہم نے اتنے اہم پراجیکٹ سے کیا فائدہ اُٹھایا؟ سوفٹ ویئر پر کام کرنے کا گراف، نصف فیصد جبکہ موبائل اور انٹرنیٹ سے استفادہ 500 فی صد موبائل پر میسجنگ اور انٹرنیٹ پر چیٹنگ کے علاوہ ہم نے آئی ٹی سے اور کس طرح استفادہ کیا ہے؟ کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟ کیا ہمارے ہاں سوفی صد نہ سہی دس فی صد ہی سہی آئی ٹی کا صحیح استعمال شروع ہو سکے گا؟ بہ قول جون ایلیا

سو زخمِ شوق کو جلتا ہوا تو رکھنا ہے
نہ ٹوٹ جائے کہیں سلسلہ تمنا کا

معراج رسو

عظیم لکھاری

سرگزشت

فسادات کا زخم ابھی پوری طرح بھرا نہیں تھا۔ گو کہ کشیدگی کی فضا ختم ہو چکی تھی۔ جلے ہوئے مکانات کی ازسرِ نو تعمیر ہو چکی تھی۔ مرنے والوں پر اعزا رو دھو کر صبر کر چکے تھے مگر راکھ تلے دبی چنگاری کسی بھی وقت بھڑک سکتی تھی۔ اس دن بھی کچھ ایسی ہی فضا بن گئی تھی۔ اندر کمرے میں سفید چاندنی بچھی تھی۔ اگربتی کے دھوئیں سے فضا معطر تھی۔ کچھ عورتیں بیٹھی قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھیں۔ جنازے کی تیاری کا انتظار تھا کہ باہر شور اُٹھا جیسے کچھ لوگ اونچی آواز میں باتیں کر رہے ہیں۔ یہ سب مرنے والے کی بیوی ودیا پتی کی کوکھ سے جنم لینے والی دو بیٹیوں کے شوہر تھے۔ اکلوتا بیٹا تھا۔ ان کا کہنا تھا، ہم اپنے باپ کو شمشان لے جائیں گے، ان کی آتما کی شدھی کے لیے ان کو چتا پر رکھ کر جلانا ضروری ہے جبکہ اندر کمرے میں سوگوار سی بیٹھی مرنے والے کی بیوی کا کہنا تھا، انہیں دفن کرنا ہوگا، یہ مسلمان تھے۔ ان کا نام وقار الملک ہے مگر کوئی اس کی سننے پر تیار نہ تھا۔ مرنے والے کا آبائی شہر تو وزیرآباد تھا مگر اس کا جنم 23 نومبر 1913ء کو بھرت پور، راجستھان میں ہوا تھا۔ اس کے باپ کا نام گوری شنکر تھا اور وہ ذات کا کھتری تھا۔ اس کے چار بھائی اور ایک بہن تھی۔ وہ بھرت پور میں میڈیکل آفیسر تھا۔ بچے کی پیدائش کے بعد ہی اس نے ترکِ وطن کیا اور پونچھ آ گیا۔ یہیں اس بچے کی تعلیم وتربیت کا آغاز ہوا اور آٹھویں تک اس نے ہوم ہائی اسکول پونچھ میں تعلیم حاصل کی۔ سولہ سال کی عمر میں اس نے سیکنڈ ڈویژن سے میٹرک پاس کیا اور کالج میں داخلہ لینے کے لیے لاہور آ گیا۔ 1931ء میں ایف ایس سی اور 1933ء میں بی اے کیا۔ فارمین کرسچین کالج سے 1935ء میں انگریزی ادب میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی پھر ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا۔ 1937ء میں اس نے وکالت پاس کر لی مگر مزاج سے ہم آہنگی نہ ہونے کے سبب وکالت کو پیشہ نہ بنایا اور ایک پبلشر کے ہاں نوکری کر لی۔ دس گھنٹے کی نوکری کے بدلے اسے صرف ڈیڑھ سو روپے ماہانہ ملتے تھے۔ 1937ء سے افسانہ نویسی کا آغاز کیا اور لاہور کے انگریزی اخبار ''دی ٹری بیون'' میں باقاعدگی سے مضامین لکھنے کا آغاز کیا۔ اردو میں پہلا افسانہ یرقان لکھا جسے بہت زیادہ پذیرائی ملی۔ 1939ء میں افسانوں کا پہلا مجموعہ ''طلسم خیال'' شائع ہوا پھر 1940ء میں دوسرا مجموعہ ''نظارے''۔ 1943ء میں پہلا ناول ''شکست'' مارکیٹ میں آیا جسے ادبی حلقے میں بھی بہت پسند کیا گیا۔ 1938ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کلکتہ میں منعقد ہوئی تو بہ طور سیکریٹری صوبہ پنجاب منتخب ہوئے۔ 1939ء کے نومبر میں آل انڈیا ریڈیو لاہور کے پروگرام اسسٹنٹ کے عہدے پر مامور ہوئے۔ اگلے سال دہلی پھر لکھنؤ تبادلہ ہوا مگر یہ نوکری بھی دل کو نہ بھائی اور 1942ء میں شالیمار پکچرز کے ڈبلیو زیڈ احمد کی دعوت پر نوکری سے استعفیٰ دے کر پونا روانہ ہو گئے۔ 1946ء میں بہ حیثیت مکالمہ نگار، فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے۔ تنخواہ ساڑھے چھ سو روپے مقرر ہوئی تھی۔ اسی دوران دیویکا رانی کی جانب سے بمبئی ٹاکیز میں ملازمت کی پیشکش ہوئی تو ان کے ساتھ وابستہ ہو گئے اور بہ طور انچارج اسٹوری ڈیپارٹمنٹ کام کرنے لگے۔ یہاں ان کی تنخواہ پندرہ سو روپے مقرر ہوئی تھی لیکن یہاں بھی دل نہ لگا اور سال بھر بعد استعفیٰ دے کر خود اپنی فلم کمپنی بنالی، نام رکھا ''ماڈرن تھیٹرز'' دو فلمیں تیار کیں۔ ''سرائے کے باہر'' اور ''راکھ'' دونوں فلموں میں ہیرو کا رول اپنے چھوٹے بھائی مہندر ناتھ کو دیا تھا۔ فلم اور ہیرو دونوں ناکام ہو گئے (بعد میں مہندر ناتھ نے افسانہ نگاری میں بڑا نام کمایا) فلموں کی ناکامی نے قرضوں کے بوجھ تلے دبا دیا تھا۔ تنگیِ حالات اور ذہنی انتشار کے باعث وہ بمبئی چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور 1960ء میں دہلی کوچ کر گئے۔ 1961ء میں مہارانی صاحبہ جہانگیرآباد کے نینی تال والے بنگلے میں 7 مارچ کے روز کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کر لیا۔ اسلامی نام وقار الملک اختیار کیا۔ وہیں نابغۂ روزگار انشا پرداز رشید احمد صدیقی کی مطلقہ بیٹی سے نکاح پڑھوایا۔ ان کے ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں جبکہ رشید احمد صدیقی کی بیٹی اپنے ساتھ ایک بیٹا لے کر آئی تھیں۔ ان دونوں کا عشق عرصے سے چل رہا تھا۔ عشق کچھ ایسا تھا کہ دونوں طرف سے مطالبات تھے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ وہ شوہر سے طلاق لے اور اس کا مطالبہ تھا کہ یہ اکیس سالہ رفاقت کو تج کر بیوی کو طلاق دے کر مسلمان ہو جائیں۔ دونوں نے شرائط پوری کر دی تھیں اور ایک دوسرے کو پا لیا تھا۔ اب نئی زندگی کو شروع کرنے کے لیے بمبئی واپس آ گئے اور فلموں کے لیے تگ و دو کرنے لگے۔ 23 نومبر 1967ء کو پہلا دل کا دورہ پڑا مگر بروقت علاج سے افاقہ ہوا اور وہ پھر سے کارزارِ زیست میں گم ہو گئے۔ 1968ء میں سویت لینڈ نہرو ایوارڈ ملا۔ 8 مارچ 1977ء کو بمبئی میں 64 سال کی عمر میں 32 افسانوی مجموعے 48 ناول، 12 ڈرامے، 11 بچوں کی کتابیں 2 رپورتاژ کا خالق اپنے خالق کے پاس چلا گیا۔ موت کے بعد آخری رسوم کے وقت جو تنازع اُٹھا اس سے ہندو مسلم فساد ہو سکتا تھا اس لیے دوسری بیوی سلمیٰ صدیقی نے پہلی بیوی سے ہونے والی اولاد کو لاش سونپ دی نتیجتاً کرشن چندر جیسے عظیم لکھاری کو مسلمان ہو جانے کے بعد بھی چتا میں جلایا گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

شہرِ خیال

✉ ایم اے خالق بھٹی، صدر پریس کلب اللہ آباد ضلع رحیم یار خان سے لکھتے ہیں" جب بھی [illegible] لکھنے بیٹھتا ہوں قلم کی روانی اُلجھنے لگتی ہے۔ ہر کہانی ہر مضمون انگوٹھی میں جڑے نگینے [illegible] اس لیے الجھ جاتا ہوں کہ کس کس کی تعریف کروں کہ ہر تحریر اپنی جگہ مکمل ہوتی ہے [illegible] بھی اولیٰ سی کوشش ہے۔ اس بار اداریہ میں معراج رسول صاحب [illegible] کرسی نشینوں کی بے پروائی پر احتجاج رقم کررہے تھے۔ محترم [illegible] کا مشاہدہ کیا ہوگا وہاں پر وزیروں، مشیروں سے زیادہ قدر [illegible] وہاں کے پروفیسر صاحبان کی جو قدر و منزلت ہے وہ [illegible] کہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج یورپ پوری دنیا میں حکمرانی کر رہا ہے جبکہ ہمارے جیسے ترقی پذیر ملکوں کے حکمران ان کی غلامی میں [illegible] ہیں۔ [illegible] پاکستان یعنی قومی ترانے کے خالق محترم حفیظ جالندھری مرحوم جس نے تعلیم کی کمی کو ترقی ادب میں حائل نہ ہونے دیا [illegible] ڈاکٹر ساجد امجد سے گزارش ہے کہ خالص دہلوی لب و لہجے میں کوئی تحریر لائیں۔ پرانی اردو پڑھنے کا جو مزہ اور دہلوی، لکھنوی انداز گفتگو میں جو چاشنی ہوتی ہے، وہ پڑھنے والے کو اپنی آنکھیں پھڑکانے نہیں دیتی۔ قابلِ تقلید میں ابن کبیر نے ایک جرمنی کی ہمدرد روتھ فاؤ جو پاکستانیوں سے محبت کرتی ہے اور اسی سرزمین میں دفن ہونے کی خواہش مند ہے، صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا تعلق عوام سے رہا ہے۔ اگر اس کا تعلق ہمارے حکمرانوں سے ہوتا تو کب کی واپس چلی جاتی کیونکہ تمام کرپشن ہمارے حکمرانوں میں ہے۔ عوام بے چارے تو معصوم اور ہمدرد شخصیات کی متلاشی ہے۔ موت بردار ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی تحریر پڑھ کر مجھے 1971ء میں پاکستانی آبدوز کی غرقابی یاد آگئی کیونکہ اس آبدوز میں ہمارے علاقے کے ایک فوجی بھائی بھی شہید ہوگیا تھا۔ فلمی الف لیلہ میں دیو آنند اور ثریا کا ذکر سے اپنی معلومات میں اضافہ کیا۔ ذوالفقار ارشد گیلانی کی کاوش سامری پڑھ کر مصری ٹی وی کا ڈراما یاد آگیا ہے جو غالباً 1982ء میں پی ٹی وی پر دیکھا ہے لیکن اس مضمون سے صحیح معلومات اخذ ہوئی ہیں۔ آسٹریلیا جیسے ترقی یافتہ ملک میں ایب اور یجن مخلوق کی موجودگی کے بارے میں ایس جی یزدانی نے بتا کر حیران کردیا۔ ویلڈن سرگزشت۔ مختار آزاد کی بھیڑ کھال معلوماتی مضمون تھا جس سے اون کی افادیت عیاں ہوتی ہے۔ صبا شفیق کی چیمپئن بھی اچھی تحریر تھی۔ چراغِ محبت نے بہت مزہ دیا۔ تعبیر پڑھ کر رونا آگیا کہ شوبز کی دنیا کتنی گندی ہے۔ کیسے کیسے گدھ بیٹھے ہیں۔ کس کس طرح معصوم لڑکیوں کو ورغلاتے ہیں۔ مشورے نے بھی مزہ دیا کہ یہ بہت بڑی حقیقت ہے۔ ہمارے ہاں مشورے دینا ہر کوئی اپنا حق سمجھتا ہے اس پر مجھے مشہور مزاحیہ کہانی "پڑیے جو بیمار" یاد آگئی۔ بغلی گھونسا بھی دل دکھا گئی۔ کیسی وہ بہنیں تھیں جنہوں نے بہن کا گھر اجاڑنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ نسخہ عام سی کہانی تھی۔ انتقام پڑھ کر بے وقوفی پر سر پکڑ لیا۔ دیہاڑی چھوٹی سی مگر بہت وزن دار کہانی تھی جس میں آج کے سیاست دانوں کا چہرہ بہ آسانی دیکھا جاسکتا ہے۔ ایثار بالکل الگ انداز کی تھی مگر دعا جی بابا اپنی منفرد انداز کی وجہ سے بہت پسند آئی۔ بہت عمدہ تحریر تھی۔ شہرِ خیال کی کرسی صدارت پر اعجاز حسین سٹھار بھرپور تبصرے کے ساتھ براجمان تھے۔ مبارک باد۔ راجا ثاقب نواز ثاقب، حکیم سید محمد رضا شاہ، جی اے مغل، سدرہ بانو ناگوری، سعید احمد چاند اور علی محمد بروہی نے مختصر سہی پھر بھی بھرپور تبصرے کیے ہیں اور اپنے خطوط میں نئی نئی معلومات فراہم کی ہیں۔ پروین چوہدری کی سرگزشت سے محبت کو سلام پیش کرتا ہوں۔ اشفاق احمد صاحب اللہ تعالیٰ آپ کی غربت کو ثروت میں تبدیل کرے، آمین۔ مجھے خیر پور میرس کے بارے میں کوئی ایسی تاریخی تصنیف یا مضمون درکار ہے جس میں خیر پور کے نوابوں کا مکمل ذکر و تصاویر بھی ہوں، میں آپ کو مقررہ رقم ایڈوانس بھیج کر منگوالوں گا۔ جاوید محمد خان سرکانی درانی اس برس سردی کم پڑی ہے گھروں اور دکانوں میں جو انگیٹھیاں روشن نظر آتی ہیں وہ اس بار نظر نہیں آئی ہیں۔ عاطف نعمان آپ کے مضمون کا انتظار ہے۔ غیر ممالک کے سفر کی تھکان کے باوجود سرگزشت کا مطالعہ اس ڈائجسٹ کے بہترین مواد کا کرشمہ ہے۔ ایک حقیقی آپ بیتی پیش ہے، خوبصورت بنانے کی پوری کوشش کی ہے لیکن اصل کہانی کو نہیں چھیڑا ہے۔" (کہانی پڑھ کر فیصلہ کیا جائے گا)

✉ ساگر تلوکر، چشمہ بیراج سے لکھتے ہیں" سرگزشت بہت معیاری اور معلوماتی رسالہ ہے مگر افسوس ہے کہ ہمارے علاقے میں بہت لیٹ آتا ہے۔ پُراسراریت نمبر 1 ابھی تک نہیں ملا بھی نہیں جبکہ پُراسراریت نمبر 2 آگیا ہے (علاقے کے بک اسٹال والوں سے تقاضا کریں کہ وہ جلد منگوایا کریں یا پھر آپ سالانہ خریدار بن جائیں) میں اپنے تاثرات آپ تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ پُراسراریت نمبر 2 کی سب تحریریں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ ایسی تحریریں کوئی رسالہ پیش ہی نہیں کرسکتا۔ آپ اور لکھاریوں کی محنت کا ثمر ہے کہ مارکیٹ میں سرگزشت جیسا کوئی اور رسالہ نہیں ہے۔ فلمی الف لیلہ میں آفاقی

صاحب سے گزارش ہے، محترم! رؤف خالد کی زندگی پر بھی روشنی ڈالیں اور ان کی فلم لاج کا بھی ذکر کریں اور ان کے افسانوں پر بھی قلم اُٹھائیں۔"

✉ اعجاز حسین سٹھار کا تبصرہ تور پور تھل سے" اس ماہ خلافِ توقع پرچہ 25 تاریخ کو مل گیا اور خود کو مسندِ صدارت پر دیکھا، جاوید خان سرکانی درانی، ہم ہر ماہ تفصیلی احوال لے کر آتے ہیں۔ ایم اے خالق بھٹی صاحب، یہ حقیقت ہی کہ ہم پہلے شمارے سے ہی سرگزشت کے ساتھ رفاقت نبھا رہے ہیں عاطف نعمان شاہ، وادی جن مدینہ المنورہ سے شمال میں 36 کلو میٹر دور پہاڑوں کے حصار میں ہے، میں اپنی فیملی کے ساتھ دیکھنے گیا تھا، کیا آپ اسی وادی جن کی بات کررہے ہیں؟ پرچہ ہاتھ میں آیا تو ہم تیز رفتاری سے اپنے پسندیدہ سلسلے فلمی الف لیلہ پر جا رکے۔ اس بار تسلسل کی کمی ہے۔ مختلف ٹکڑوں کو جوڑا گیا ہے جس کی وجہ سے تشنگی رہی۔ مصطفیٰ زیدی کا منتخب کلام مزہ دے گیا۔ انہوں نے ایسے اشعار کہے ہیں جو زبان عام ہوئے۔ آدم خور کے لیے کتنی تگ و دو کی گئی اور ہاتھ پیر ہلائے بغیر قربان ہوگیا۔ چیمپئن واقعی چیمپئن ہے، اصل چیز جذبہ اور خود اعتمادی ہوتی ہے۔ یہ سب ریان میں موجود ہے۔ وہ ضرور فتح مند ہوگا۔ ہر ماہ سراب کی قسط اتنی زبردست ہوتی ہے کہ تعریف کرنا معمول بن گیا ہے۔ سچ بیانیوں کا آغاز معراجِ محبت جیسی خوبصورت جذبوں اور قربانیوں سے گندھی کہانی سے ہوا ہے۔ طارق سطحی ذہن رکھنے والا اور لاابالی خیالات کا مالک تھا، میں اسے فصلی بٹیر کہوں گا۔ اس میں ایثار کا جذبہ زیادہ ہونا چاہیے تھا لیکن اس میدان میں بہ ظاہر نقصان میں رہتے ہوئے آفاق نے اسے بُری طرح پچھاڑ دیا۔ تعبیر میں کہکشاں پر لعن طعن کرنے سے پہلے کئی دوسرے پہلوؤں پر غور کرنا ہوگا، یہاں شکار کو گھیرنے کے لیے لمبا منصوبہ بنایا گیا اور سنہرے مستقبل کا فرضی نقشہ کھینچا گیا تو آنکھیں خیرہ ہوگئیں اور عقل ماؤف ہوگئی اسے سنبھلنے، سوچنے اور مشورہ کرنے کے قابل نہ رہنے دیا گیا۔ بغلی گھونسا کی رابعہ کتنی بدقسمت ہے کہ اسے اُجاڑنے کے لیے بہنوں نے ہر حد پار کرلی۔ نسخہ میں اگر سچ لڑکی کا کسی لڑکے پر دل آگیا تو کیا ہوگا کیونکہ یہ فطری جذبہ ہے۔ انتقام کی ردا کو اب احساس ہوا ہے کہ وہ گھاٹے کا سودا کرتی رہی ہے۔ دعا جی بابا حیران کردینے والی تحریر تھی۔ ایسی زبردست اور عجیب واقعات رکھنے والی کہانی پُراسراریت نمبر میں آنا چاہیے تھی۔" (آپ کا خیال درست ہے، پُراسراریت نمبر کا تمام مواد شائع نہیں کیا جاسکا تھا اسے حسبِ وعدہ مختلف شماروں میں شامل کیا جاتا رہے گا)

✉ جویریہ قاضی، مظفر گڑھ سے لکھتی ہیں" اس سال کا آغاز انتہائی پُراسرار انداز میں ہوا ہے کیونکہ نئے سال کا آغاز ہی پُراسرار نمبر سے ہورہا ہے۔ جنوری 2012ء کا سرگزشت سرتاپا اسرار کی دھند میں لپٹا ہوا تھا لیکن پچھلے پُراسرار نمبر سے بازی لے جانے میں کامیاب نہیں ہوسکا لیکن یہ کچھ کم نہیں ہے۔ اداریے میں معراج انکل بھی پُراسراریت پر ہی لیکچر دیتے نظر آئے۔ شہرِ خیال میں خالد کبیر نے پچھلے سال کا مکمل احوال بیان کرنے کی کوشش کی۔ کاوش اچھی تھی لیکن افسوس ایک اہم نام مس کرنے کی وجہ سے ان کا تبصرہ مکمل نہیں ہوا۔ خالد کبیر صاحب، ذرا ذہن پر زور دیں کہ آخر وہ کون سا نام ہے جسے آپ نے مس کردیا، سوچیے، اپریل 2011ء میں کس نے شہرِ خیال میں نیو انٹری دی تھی؟ ابن مقبول جاوید صدیقی، رانا محمد سجاد اور سدرہ بانو ناگوری کے تبصرے بہت اچھے تھے۔ شہرِ خیال میں ایک اور مختصر سا خط بھی موجود تھا۔ کافی غور و خوض کیا اور پھر پتا چلا کہ ارے یہ تو میرا اپنا ہی خط ہے، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے یہ خط کافی لمبا لکھا تھا لیکن آپ نے کاٹ چھانٹ کے بعد شائع کیا۔ (خطوط لکھنے والے زیادہ اور صفحات کم اس لیے خواہ مخواہ کی طوالت کاٹنے پر مجبور ہیں) پُراسرار نمبر کی سب سے اچھی تحریر "وہ کون" تھی۔ مجھے خود بھی ذوالقرنین کے بارے میں جاننے کا بہت اشتیاق تھا۔ لنکن کا بھوت ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری کی اچھی کاوش تھی۔ سچ بیانیاں ساری کی ساری ہی عمدہ تھیں۔ بمبئی کے بابا بنڈل شاہ جیسا بابا میں نے پہلی دفعہ دیکھا ہے، میرا مطلب ہے کہ ایسے بابا کے بارے میں پہلی دفعہ پتا چلا ہے جو فلموں کو کامیاب بنانے کے لیے تعویذ دیا کرتا تھا (اگر موقع ملے تو بابا تاج الدین ناگپوری کی سوانح حیات پڑھیں، شکایت ختم ہوجائے گی اس لیے کہ فرقۂ ملامتیہ کے بابا ایسے ہی ہوتے ہیں) ایمان فروش میں رضوان نے جتنا بُرا کیا اس کی اسے سزا تو ملنی ہی تھی۔ پُراسرار مذہب ایک بہت معلومات افزا کہانی تھی۔ میں نے آج تک فری میسنری نامی تنظیم کے بارے میں صرف اتنا سنا تھا، تفصیلی معلومات آج ملی ہیں، تھینکس سرگزشت۔"

✉ سدرہ بانو ناگوری، کراچی سے رقم طراز ہیں" سرگزشت کا تازہ شمارہ 23 جنوری کو ملا۔ پہلے انکل کا اداریہ پڑھا۔ ارفع کریم کے بارے میں بس اتنا ہی کہوں گی بہار تو بھی انہیں پھر سجا نہیں سکتی، بکھر گئی ہیں جو پھول کی پتیاں لوگو! لاہور میں لوگ ابھی ڈینگی وائرس کو بھول نہیں پائے تھے کہ جعلی دوائیوں کے استعمال سے لوگوں کی اتنی بڑی تعداد اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ شہرِ خیال ہی ہوتے ہوئے فلمی الف لیلہ میں پہنچے۔ اس دفعہ الف لیلہ [illegible] خنک صاحب کے خط نے میلہ لوٹ لیا۔ مریم کے خان تو جب جب کسی موضوع پر لکھتی ہیں تو گویا اس کے بخیے ہی ادھیڑ ڈالتی ہیں۔ اس دفعہ انہوں [illegible] گرانی اور شہابیوں کی طرف سے خبردار کیا۔ چیمپئن ایک معصوم بچے کی داستان جس نے ثابت کردیا کہ ہمت جواں ہو تو سب کچھ ممکن ہے، بہت [illegible] اور عبدالرب بھٹی کی بڑی طاقتوں کے درمیان کھیلے جانے والے کھیل کی روداد تھی۔ سراب اس بار بازی لے گئی، زبردست، فنٹاسٹک اور [illegible] کے ساتھ ہمارے دلوں کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کرگئی۔ اگلی قسط کا انتظار بے چینی سے رہے گا۔ آدم خور شکاریات کے موضوع پر لکھی [illegible] مصنف نے خود ہی کردیا کہ مزہ نہیں آیا۔ اس بار ہمت کرکے ابتدائی صفحات کو پڑھنے کا اعزاز حاصل کرلیا اور اچھا لگا، خاص طور پر جب [illegible] غالب گئے اور جب غالب کے مکان کی سیڑھیاں طے کیں تو یوں لگا جیسے وقت پلٹ گیا ہے اور ہم خود بنفس نفیس اس عظیم شاعر کی محفل میں [illegible] غالب مانتی ہے، اس کے فوراً بعد مادام فاؤ کی داستان عجب پڑھی تو اک سوال میرے ذہن میں اُبھر آیا۔ آپ بھی سوچیے [illegible] لوگوں کے دلوں میں؟ مادام فاؤ جیسے لوگ اپنی ساری زندگی اس تگ و دو میں لگا رہے ہیں کہ دکھی انسانیت کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

دامن سے کچھ دکھ کم کردیں، اس جدوجہد میں وہ اپنی ذاتی زندگی کی ساری خوشیاں نظر انداز کررہے ہیں اور سچ مچ اپنے آپ کو آزمائش کی بھٹی میں کندن بنا گئے، سلام مادام فاؤ سلام۔ بیت بازی میں پروفیسر سحر انصاری کا شعر پسند آیا۔ سچ بیانیوں کی پہلی سچ بیانی معراج محبت واقعی دلوں کو ہلا گئی۔ دعاجی بابا کا انداز دعا بہت ہی مختلف لگا۔ دوسروں کو دعائیں دینے والا اپنے لیے کچھ نہ کرسکا۔ مصنف سے درخواست ہے کہ سرگزشت میں آئندہ بھی لکھتے رہیے گا۔''

☒ **شاہدہ گلزار** کی آمد، پشاور سے ''پہلے تو ادارے اور تمام سرگزشت کے دوستوں کو سلام اور انکل معراج کو سلام کے ساتھ ساتھ اچھی صحت کے لیے دعا بھی (جزاک اللہ) لیکن انکل سے میرا گلہ بھی ہے کہ میں نے اپنے تینوں دوستوں سسپنس، جاسوسی اور سرگزشت کو خطوط لکھے لیکن لگتا ہے کہ ڈاک والوں کو بھی خوشبو آجاتی ہے کہ یہ کسی پٹھان کے خطوط ہیں، انکل میں کلاس 5th کی اسٹوڈنٹ تھی جب ان تینوں کو پڑھنے کا چسکا لگا۔ جب کسی لفظ کے معنی میں اُلجھ جاتی تھی تو اپنے والد صاحب سابق پرنسپل ہیں اور ہسٹری میں ایم اے ہیں، وہ مجھے بتادیتے تھے۔ اور اب جون 2011ء سے میں نے پھر سرگزشت سے دوبارہ اپنی دوستی استوار کی۔ کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ بکس سے زیادہ بیسٹ فرینڈ اور کوئی نہیں ہوتا۔ سرگزشت کی کیمسٹری بالکل الگ ہے۔ اس میں مذہبی، سیاسی، قلمی اور معاشرے کے سچی اور کھری کہانیاں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ شاعری بھی بہت زبردست ہوتی ہے۔ لاجواب اشعار شامل کیے جاتے ہیں۔ اب ذرا کہانیوں کی طرف۔ کہانی معراج محبت، محبت وہ لازوال جذبہ ہے جو اللہ تعالیٰ بہت کم اور خاص لوگوں کو عطا کرتا ہے۔ یہ مردوں کا معاشرہ ہے، خود کچھ بھی کریں لیکن بیوی سات پردوں میں چھپی ہوئی چاہتا ہے۔ عورت گناہگار نہ ہو پھر بھی اس کو یہی سزا ملتی ہے۔ تعبیر، یہ ہماری دنیا کا وہ جھوٹا اور سراب سے پُر معاشرہ ہے جس نے آج کل ہر لڑکا لڑکی کو اپنے جالوں میں جکڑا ہے اور پھر نکلنے کے بعد کیا ملتا ہے، رسوائی، چند لوگ جھوٹے خواب بیچتے ہیں۔ یہ خواب اتنے پُرکشش ہوتے ہیں کہ کہکشاں جیسی معصوم لڑکی، وارث اور وارث جیسے لوگوں کی باتوں میں آکر اپنی پاکبازی اور معصومیت کھو دیتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی محبت بھی۔ یہ مرد حضرات اپنی ماں، بہن اور بیٹی کی تو عزت کرتے ہیں اور دوسروں کی بہن بیٹیاں ان کی نظر میں کھلونا ہیں۔ جس کہانی نے میرا رشتوں پر جو تھوڑا سا اعتبار قائم تھا، اس کو بھی کم کرنے کی کوشش کی وہ ہے بغلی گھونسا۔ اس کہانی کو پڑھ کر یقین نہیں آیا کہ اپنی سگی بہنیں ایسا کرسکتی ہیں۔ اگر میں نے اپنی ایک دوست کے حالات نہ دیکھے ہوتے کہ اس کی بہن نے اس کے گھر کو اجاڑنے میں کوئی کسر نہیں رکھی تھی، کیا قصور تھا رابعہ کا کہ وہ خوبصورت تھی۔ دونوں بہنوں نے دونوں بار اس کو برباد کیا۔ ایسی بہنوں پر لعنت ہے۔''

☒ **محمد عزیز ترین** کا مکتوب خاص، راولپنڈی سے ''آپ سب کا بہت ہی مشکور ہوں کہ آپ کا ارسال کردہ ماہنامہ سرگزشت پُراسراریت نمبر 2 بطور تحفہ سال 2012ء کا ملا۔ حقیر کو اس سنہری موقع پر آپ سب نے یاد رکھا۔ میں 26 دسمبر 2012ء کو بازار سے ماہنامہ سرگزشت پُراسراریت نمبر 2 خرید لایا تھا۔ یہ خوشی وہیں ورق گردانی کی۔ گھر آکر مطالعہ میں جب سب سے پہلے لنکن کا بھوت پڑھا تو مجھے اس وقت کچھ خفگی سی محسوس ہوئی کہ ابراہام لنکن کا بھوت پہلے بھی کسی رسالے میں پڑھ چکا تھا لیکن آخر میں تحریر کرنے والی ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری نے اعتراف نامہ کو مختلف کتب اور انٹرنیٹ کی مدد سے یہ لکھا (آپ کا کیا خیال ہے، ڈاکٹر روبینہ لنکن کی ہم عمر ہیں۔ تحقیقی مضامین دیگر تحریروں سے ہی اخذ کیے جاتے ہیں) اس کے بعد آفاقی صاحب نے دنیا بھر کے تمام اداکاروں، ڈائریکٹرز کا ذکر تفصیل سے کیا۔ شکیل بدایونی اور نوشاد کی جوڑی کے متعلق لکھا۔ کہتے ہیں کہ پسند اپنی اپنی جناب محمد رفیع مرحوم کا ذکر تک نہیں کیا۔ شکیل بدایونی کو زیادہ تر بھگوان بیجو باورا بسنت بہار کے ہی گانے لکھے اور پھر مشہور و معروف فلم ''محل'' کا بہت شوق سے ذکر کیا کہ کیا پُراسرار فلم تھی۔ اس فلم میں پُراسراریت صرف اور صرف اشوک کمار کا خوف تھا جس نے خوف زدگی کی عمدہ ایکٹنگ کی تھی۔ یقیناً وہ ایک بڑا اداکار تھا اور کئی گانے بھی محل کے مقبول ہوئے۔ اگر ایک ہی گانا آئے گا آنے والا کو فلم اسکرین سے خارج کردیا جائے تو مجھ جیسے فلم بین گالیاں دیتے ہوئے آتے۔ افسوس کہ آفاقی صاحب نے مشہور شاعر نخشب اور ناشاد کا ذکر نہیں کیا۔ نخشب ایک ایسا شاعر تھا کہ فلم آن کی مشہور ترین ہیروئن ''نادرہ'' نے نخشب کی شاعری سے متاثر ہوکر نخشب سے شادی کی نہ کہ دلیپ کمار کی خوبصورتی سے۔ اور پھر ناشاد کا کیا کہنا۔ افسوس کہ آفاقی صاحب کو انڈیا اور دیگر ممالک کی فلموں اور کتابوں کے نام یاد رہے حالانکہ پاکستان نے لاجواب پُراسرار فلمیں بنائیں۔ زندہ لاش، اداکار ریحان کی لاجواب ایکٹنگ اور جعفری کی ایک فلم جس کا نام میں بھول گیا، جو اپنی خیالی محبوبہ کو ساتھ ساتھ لے کر پھرتا تھا اور ملنے والوں سے اس طرح تعارف کراتا تھا گویا سامنے والے ملاقاتی کو وہ نظر آرہی ہے اور پھر آپ نیر سلطانہ اور سنتوش کمار کی مشہور و معروف فلم گھونگھٹ کا بھی ذکر نہیں کیا۔ سنتوش کمار نے فلم گھونگٹ میں خوفزدگی کی شاندار ایکٹنگ کی تھی اور مشہور و معروف فلمی ہیروئن شمیم آرا کی ایک فلم افسوس کہ مجھے اس کا نام بھی یاد نہیں رہا، آخر عمر کا تقاضا ہے، ستّر برس کی عمر میں کیا کیا یاد رکھا جائے۔ شمیم آرا نے خوفزدگی کی ایکٹنگ کرتے ہوئے مشہور گانا، کہاں ہو سہیلیو! آواز دو۔ فلم بینوں کے ذہنوں پر اثر کرتا۔ اسی فلم میں رنگیلا نے بھی خوب ایکٹنگ کی۔ آغا طالش کا تو جواب ہی نہ تھا۔ غرضیکہ کئی فلمیں تھیں۔ مشہور و معروف فلم شمیم آرا و نیر سلطانہ، درپن کیبلی میں پُراسراریت کو خوب فلمائی گئی تھی۔'' (آپ نے الف لیلہ پر قسط نمبر نہیں دیکھا؟ تقریباً سب پر علی سفیان آفاقی مفصل لکھ چکے ہیں)

☒ **سعید احمد چاند** کا مکتوب، کراچی سے ''پرچہ ملا۔ سب کہانیاں پڑھنا ممکن نہ تھا۔ جو کچھ پڑھا اس پر لکھ رہا ہوں۔ اداریہ حالاتِ حاضرہ کے مطابق تھا۔ توتی پاکستان میں حفیظ جالندھری کو پڑھا۔ ان کے متعلق کچھ معلوم تھا اور بہت کچھ اسے پڑھنے سے معلوم ہوگیا۔ شہر خیال میں داخل ہوئے، اس میں اپنے آپ کو ڈھونڈا۔ شکر ہے، ہم موجود تھے۔ شکر گزار ہوں جس نے میری حوصلہ افزائی کی۔ کیا کروں اس سے بہتر کاغذ کوئی بچا ہی نہیں۔ مسندِ صدارت پر اعجاز حسین سٹھارا اپنے بہترین تبصرے کے ساتھ براجمان تھے۔ علی محمد وفا بروہی کی آمد اچھی لگی، ساتھ ہی ڈاکٹر روبی کی غیر حاضری بری لگی۔ جن

تبصرے اچھے تھے، وہ یہ ہیں۔ راجا ثاقب نواز ثاقب، ایم اے خالق بھٹی، ناصر حسین رند، سدرہ بانو ناگوری، حکیم سید محمد رضا شاہ، جاوید محمد خان سرکانی درانی، رانا محمد سجاد، رانا محمد شاہد، سلیم رشید، محسن علی موم، بی اے مغل، محمد ثاربٹ، غلام یٰسین نوناری، عاطف نعمان شاہ، محمد افضل اعوان، سید قیصر علی، پروین باہودری، اشفاق احمد سرکی بھائی آج کل تو بہت سے لوگ افورڈ نہیں کرسکتے لیکن پڑھتے ہیں۔ سرگزشت چیز ہی ایسی ہے کہ جس نے ایک بار پڑھ لیا، وہی اس کا دیوانہ ہوگیا۔ بھائی دل چھوٹا نہ کریں، اللہ سب ٹھیک کرے گا۔ مختصر تبصرے کے ساتھ محمد طیب بھی تھے جنہوں نے اہم موضوع کی طرف اشارہ کرکے تبصرے کو لازوال بنادیا۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سید قیصر علی صاحب، چوری چوری جاپان چلے گئے اور ہمیں خبر بھی نہ ہوئی۔ جاپان جاکے بھی لکھتے رہنا، بھول نہ جانا۔ مختار آزاد کی بھیڑ کھال سچ بیانیوں میں ریحانہ کا معراج محبت افسر حیات کی تعبیر رابعہ کا بغلی گھونسا کمال الدین کا دعاجی بابا نے بھی متاثر کیا۔''

☒ **محمد طفیل طوفی** نے الصفات، کویت سے لکھا ہے ''انڈیا کے مختلف ماہناموں میں اور اخباروں میں مضمون لکھتا ہوں۔ آپ کی محفل میں پہلی بار اپنی ذاتی تحریر لے کر حاضر ہوا ہوں۔ تمام نام اور مقام فرضی ہیں۔ قریبی اشاعت میں میری یہ تحریر اندر کا غم ضرور شائع کریں گے۔'' (ہم معذرت خواہ ہیں کہ آپ کی تحریر سرگزشت کے مزاج کی نہیں ہے، آپ بغور سرگزشت پڑھیں اور اسی انداز میں تحریر بھیجیں)

☒ **راجا ثاقب نواز ثاقب**، رتی بی، ساہیوال سے لکھتے ہیں ''معراج صاحب نے ارفع کریم رندھاوا کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے اور کیا خوب انداز سے ہمارے معاشرے کی عملی بے حسی کی نشاندہی بھی کی ہے۔ توتی پاکستان میں قومی ترانہ کے خالق محترم حفیظ جالندھری مرحوم کی زندگی کے بارے میں تفصیل سے معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ کچھ عرصہ قبل بھی ٹی وی چینل پر ہمارے پارلیمنٹیرینز سے قومی ترانہ سنانے کو کہا گیا تھا، ایسے ایسے جوابات ملے کہ جی چاہتا تھا کہ اپنا سر پیٹ لیں، قدر دانوں کی محفل میں جاوید محمد خان سرکانی درانی اور کراچی کے چاند سعید احمد چاند نمایاں لگے جبکہ اللہ آباد پریس کلب کے تاحیات صدر ایم اے خالق بھٹی جی آپ تو موتی چور لڈوؤں کے دیوانے نکلے۔ فرقش میں مولوی عبدالغفور نساخ اور ارفع کریم دونوں کے حالات زندگی موجود تھے۔ دونوں اپنے اپنے میدان کے فاتح تھے۔ خلا کے شکاری، مریم کے خان شکار کرنے خلا تک جا پہنچی۔ قابل تقلید پڑھنے کے بعد یہ کہنا پڑا اور تھہ فاوجی تسی گریٹ او۔ موت بردار میں آبدوز پر سوار عملہ موت کے ہاتھوں تو بچ نکلا مگر جسمانی بیماریوں کے ہاتھوں یرغمال بن گیا۔ فلمی الف لیلہ میں اب کی بار آفاقی صاحب نے جہاں دیو آنند کے بارے میں بتلایا ہے، وہاں انہوں نے مصطفیٰ زیدی کے ساتھ مل کر کی جانے والی شرارتیں بھی ہم سے بانٹی ہیں۔ سامری نے پُراسرار نمبر کی یاد تازہ کردی۔ (پُراسراریت نمبر کے لیے جمع شدہ مواد میں سے مزید مضامین آئندہ شماروں میں بھی شامل ہوتے رہیں گے) ایب اور یجن کے آخری پیرے نے ہمیں مجبور کردیا کہ ہم اس کے پارٹ ٹو کا انتظار کریں جو کہ مصنف کی فرصت پر منحصر ہے۔ بھیڑ کھال اچھی کاوش تھی۔ ملک ریان نے سراب تک پہنچایا۔ جہاں شہباز ملک شہلا کے وار سے تو بچ نکلا ہے مگر پھر کسی پُرانے دشمن کے نرغے میں ہے۔ پہلی سچ بیتی معراج محبت پڑھ کر بے ساختہ لبوں سے نکلا، رب نے بنادی جوڑی۔ تعبیر میں کہکشاں نے جیسے سپنے دیکھے تھے، ان کی تعبیر اکثر ڈراؤنی ہی ہوتی ہے۔ بغلی گھونسا، اپنے ہی اس قدر گر جاتے ہیں یقین نہیں آتا۔ بہرحال بعض مواقع پر رابعہ کے فیصلوں سے اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے کیونکہ وہ خطرناک حد تک جذباتی تھے۔ نسخہ کے اختتام نے مسکرانے پر مجبور کردیا۔''

☒ **محمد شاہد** کا خط، بورے والا سے ''معراج رسول صاحب نے بالکل صحیح لکھا کہ صرف ارفع کریم رندھاوا ہی کیا، ہم نے تو ثابت کیا ہے کہ ہم مردہ پرست ہی نہیں، احسان فراموش بھی ہیں۔ ڈاکٹر عبدالقدیر کی مثال سب کے سامنے ہے۔ محسنِ پاکستان کے ساتھ جو کچھ ہوا کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ پاکستان سے ہزاروں کی تعداد میں ٹیلنٹڈ نوجوان ملک چھوڑ کر باہر چلے جاتے ہیں۔ کیوں؟ قرۃ العین حیدر جیسی افسانہ نگار اس ملک کو چھوڑ کر کیوں چلی گئیں؟ غلام علی نے کتنی دلچسپ بات کہی تھی۔ جب ہم بارڈر سے اُدھر جاتے ہیں تو بھگوان کہلاتے ہیں، اِدھر آتے ہیں تو کنجر بن جاتے ہیں۔ اسی طرح ہم کسی کی کامیابیوں و کامرانیوں کو سراہنے کے لیے اس کے مرنے کا انتظار کرتے ہیں۔ حفیظ جالندھری کے بارے میں یک تحی سرگزشت نے معلومات میں اضافہ کیا، خصوصاً اس بات نے کہ وہ صرف 6 جماعتیں پاس تھے۔ کیسے کیسے گوہر نایاب تھے۔ نغمہ سخن ایک شاعر کی باکمال سرگزشت پڑھنے کو ملی۔ ویسے ہمارے ہاں ایسے تو ایسے لوگ چھپے ہوئے گوشے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی کھوج لائقِ تحسین ہے کہ وہ ان ہستیوں پر قلم کشائی کرتے ہیں جن کے متعلق لوگ بہت کم جانتے ہیں۔ خلا کے شکاری مریم کے خان نے ایک دلچسپ تحریر پیش کی۔ ڈاکٹر روتھ فاؤ کی داستان دلچسپی کے ساتھ ساتھ حیرت انگیز بھی ہے۔ کیا یہ بات کسی کی عظمت کو ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں کہ وہ اپنے وطن کو چھوڑ کر کسی دوسرے ملک میں انسانیت کی خدمت کررہی ہے۔ ڈاکٹر روتھ کے یہ کام لاالہ اکلیدہی نہیں قابل ستائش بھی ہیں۔ انسانیت سے محبت سے بڑا کوئی کام نہیں۔ اسی لیے تو بابا اشفاق احمد کی یہ دعا ہوتی تھی کہ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے (آمین) انسانیت سے محبت کرنے والے اللہ کو بہت محبوب ہیں۔ اللہ ہمیں بھی اپنے ان محبوب بندوں میں شامل فرمائے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی نے ایک بڑے حادثے کی روداد بیان کی۔ ذوالفقار ارشد گیلانی کا شمار بھی بڑے تحقیق نگاروں میں ہوتا ہے، سامری جادوگر کے بارے میں انہوں نے بڑی تفصیل سے لکھا۔ ایب اور یجن قوم کی عجیب و غریب عادتوں سے متعلق پڑھ کر حیرت ہوئی، مضمون بہت دلچسپ تھا۔ چیمپئن از صبا شفیق ایک مختصر مگر باعزم بچے کی حوصلہ مند داستان تھی۔''

☒ **ملک ثاقب شاد تنولی ایڈووکیٹ**، حویلیاں ضلع ایبٹ آباد سے لکھتے ہیں ''زندگی کے جھمیلوں میں ایسا اُلجھا کہ کاغذ، قلم اور سرگزشت سے کچھ عرصہ کے لیے دور ہوگیا (یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہوئی وکیل صاحب، ہم سے دوری......) مورخہ 28 جنوری کو فروری کا سرگزشت خریدا تو ایسا لگا

WWW.PAKSOCIETY.COM

جیسے صحرا میں پانی کے پیاسے کو کوئی چشمہ مل گیا ہے۔ سوچا اگر مکمل رسالہ پڑھ کے تبصرہ ارسال کروں گا تو غالباً پرچے میں شمولیت نہ ہوگی چنانچہ دوستوں کی محفل میں جانے کی تڑپ نے کہا کہ باقی رسالہ بعد میں پڑھنا پہلے خط لکھ ڈالو۔ آتا ہوں شمارے کی طرف۔ سیدھا آپ کے اداریے سے آنکھیں ملائیں۔ آپ نے بجا فرمایا، ہم سب مردہ پرست ہیں، کسی کی قدر ہمیں اس وقت ہوتی ہے جب وہ ہمیں چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ ارفع کریم ایک ایسا پھول تھا جس نے کم عمری میں اپنی خوشبو سے ماحول کو مہکا دیا اور وطن عزیز کا نام روشن کیا۔ یقین جانیے اس کی موت کی خبر نے اشک رواں کی لہر جاری کردی۔ کاش اس پھول کے مرجھانے سے پہلے اربابِ اختیار کو ہوش آجاتا۔ افسوس کہ ہم من حیث القوم آہ و زاری کررہے ہیں، ہمیں جھوٹے خواب دکھائے جاتے ہیں اور ان کی تعبیر کی امید میں ہم عمر گنوا دیتے ہیں۔ مختصر سرگزشت میں حفیظ جالندھری کے بارے میں پڑھا، اس اتنا کہوں گا کہ آپ نے کوزے میں دریا بند کردیا۔ شہر خیال میں محترم اعجاز حسین سٹھار صاحب طویل تبصرے کے ساتھ منصبِ صدارت پر براجمان ہوگئے۔ سٹھار صاحب آپ نے تو کمال کردیا، اتنا مفصل تبصرہ لکھ کر۔ مبارکاں جی مبارکاں! راجا ثاقب نواز ثاقب پراسراریت نمبر پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے مبارک باد دیتے نظر آئے۔ جاوید سرکانی کا خط بھی موزوں لگا لیکن پہلے جیسا مزہ نہیں رہا۔ کراچی کے چاند سعید احمد چاند یقین جانیے آپ کا نام ... ہے۔ جناب بجا فرمایا، سیاست دان اقتدار کی رسہ کشی میں لگے ہیں، یہاں میں اس بات کا اضافہ کرنا چاہوں گا کہ عوامی مسائل کے سہارے ... اور ایک دوسرے سے برتری لے جانے میں مصروف ہیں لیکن ہمارا آہ و زاری کرنا لاحاصل۔ ایم اے خالق بھٹی بھی جاندار تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ جناب، بلاشبہ اللہ کی ذات ہی ہے جس سے ہمیں کوئی امید ہے باقی سیاست دان اب ملک کے مسائل کی طرف کوئی توجہ دیں گے۔ عوام کو ... تو صرف ایک حسین خواب ہی ہوسکتا ہے۔ ناصر حسین رند صاحب آپ نے یاد کیا تو ہم حاضر ہوگئے۔ کافی طویل تبصرہ تھا آپ کا ہر حال اچھا لگا۔ ... وفا بروہی صاحب، آپ نے سرگزشت کے پڑھنے کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سرور کو الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے لیکن اگر ... میں تعبیر پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ کہکشاں، سراب کے پیچھے بھاگی اور آخر کار عزت کے ساتھ اپنی زندگی بھی ... معاشرے کے ایک پہلو کی عکاسی۔ میں نے تو بعض لوگ ایسے بھی دیکھے ہیں جو مشورہ اس انداز میں ... بھٹی گھونسا ایک ایسی عورت کی داستان تھی جس کی زندگی برباد کرنے والا کوئی اور نہیں عورت ہی تھی اور وہ بھی اس کی اپنی بہن۔“

✉ **احمد خان توحیدی**، کراچی سے لکھتے ہیں ”معراج رسول صاحب، ہم نے قائداعظم، قائد ملت، حکیم محمد سعید، ڈاکٹر عبدالقدیر خان جیسے عظیم لوگوں کی کب قدر کی جو ارفع کریم جیسی معصوم فرشتہ کی فکر کرتے۔ تھری پیس سوٹ اور کرسی کی سب کو فکر ہے۔ وقت جانے کے بعد یہ ہوگا اور وہ ہوگا۔ ت کے ساتھ توتا چشم مطلب پرست کو کہتے ہیں۔ حفیظ جالندھری جیسے عظیم شاعر میٹھی اور پیاری باتیں کرنے والا طوطا پاکستان لکھنا چاہیے۔ (نور اللغات، فرہنگ آصفیہ والے غلط لکھ گئے اس لیے ہم بھی وہی لکھتے ہیں۔ صاحب لغت نے لکھا ہے توتی ایک خوش آواز چڑیا جو توت کے موسم میں دکھائی دیتی ہے۔ امید ہے ہماری غلطی کی وجہ سمجھ گئے ہوں گے) محفل شہر خیال میں پہنچے۔ کرسی صدارت اعجاز سٹھار، نور پور تھل، راجا ثاقب، ساہیوال۔ جی اے مغل، ایم اے خالق بھٹی، سدرہ ناگوری، ناصر حسین رند، سلیم رشید، لاہور۔ نثار بٹ حمید، اٹک۔ رانا سجاد، مظفر گڑھ کے تبصرے ویری گڈ۔ مختصر لکھا کریں۔ فخرِ سخن ڈاکٹر ساجد امجد کی عبدالغفور نساخ کے حالات زندگی نئی نسل کو آگاہ کرنے کا شکریہ، تاریخی معلوماتی کہانی ہے۔ ابن کبیر کی قابلِ تقلید میں ڈاکٹر روتھ فاؤ، ڈاکٹر زرینہ، ڈاکٹر صفیہ کا ایثار لائق تعریف ہے۔ فلمی الف لیلہ، آفاقی صاحب شیون رضوی اور مصطفیٰ زیدی سے ہم بالکل لاعلم تھے۔ (حیرت ہے کہ مصطفیٰ زیدی جیسے شاعر سے لاعلم تھے۔ ویسے خطوط سے تو ادب نوازی محسوس ہوتی ہے) ناجی فلم نہ دیکھنے کا افسوس ہے۔ ڈاکٹر وِدگر سے آپ کا فون پر مذاق بہت ہنسی آئی۔ ارشاد نے خوشامدی چاپلوسی سے شوکت رحمن خٹک سے مفت میں دعوت کھالی۔“

✉ **سعید احمد صدیقی** کی آمد، کراچی سے ”زندہ قومیں اپنی تہذیب، ثقافت، روایات اور تاریخ کی محافظ ہوتی ہیں لیکن پاکستان میں ثقافتی مراکز، تاریخی مقامات اور قدرتی ماحول کو جس بے دردی اور بے حسی سے تباہ کیا گیا اور کیا جارہا ہے، یہ بھی تاریخ پاکستان کا ایک تاریک پہلو ہے۔ شالامار باغ، نور جہاں کا مقبرہ، مکلی کا قبرستان، ٹھٹھہ کی مسجد زبانِ حال سے اسی قومی بے قدری پر نوحہ کناں نظر آتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے حکمرانوں کو نہ ہمارے بیوروکریٹس کو، نہ سیاست دانوں کو اور نہ کسی تنظیم یا ادارے کو کبھی یہ خیال آیا کہ ان بیش قیمت اور تاریخی مقامات کا تحفظ کیا جائے۔ تاریخ تو نام ہی واقعات رفتہ کا ہے اور تاریخ کبھی خود کو نہیں دہراتی۔ ایسا ہی ایک مقام کراچی کا ایک باغ نما جنگل بھی تھا جو تاراج ہوکر کٹر با غیچہ بن گیا۔“ (آپ کی تحریر موصول ہوگئی، پڑھ کر ہی بتایا جاسکتا ہے کہ کب لگے گی)

✉ **سہیل احمد عباسی** کا خلوص نامہ، سانگھڑ ضلع سکھر سے ”سرگزشت سے ہمارا تعلق تقریباً اس کی عمر جتنا ہی ہے یعنی تقریباً 22 سال (ماشاء اللہ) اور ہمارا پہلا خط اس کے ”خودکشی نمبر“ میں شائع ہوا تھا۔ پھر تو ہمیں یاد نہیں کہ کل کتنے خطوط ہمارے شہر خیال کی زینت بنے لیکن یہ یقین ہے کہ وہ درجنوں کے حساب سے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ ایسا حساب رکھنے والے ہمایوں دین پوری صاحب جیسے لوگ اب کہاں؟ پُراسراریت نمبر 1 کے لیے فری میسن تنظیم پر ایک مضمون لکھا تھا جو قابلِ اشاعت نہ ٹھہرا تو ہم نے بھی پانچ سات مہینے سوگ میں گزار دیے۔ پھر ایک دوست نے پُراسراریت نمبر 2 کا بتایا اور کمال مہربانی سے اس کی کاپی بھی عطا کی کہ ہم لینے سے بھی محروم رہے تھے اور وہاں جو مریم کے خان کا مضمون فری میسن کے بارے میں دیکھا تو ہمارے سارے

WWW.PAKSOCIETY.COM

گلے شکوے دور ہوگئے۔ (آپ کا مضمون شائع کرکے ہمیں خوشی ہوتی، سرگزشت کے لیے جب بھی مضمون لکھیں، مکمل لکھیں) اور ہم تو ایسے جذباتی ہوئے کہ آپ اور آپ کے ادارے اور خصوصاً مریم کے خان کے لیے دل سے آمین دعائیں نکلیں۔ مجموعی طور پر پُراسراریت نمبر دوم ایک بہترین کاوش تھا۔ (شکریہ) فروری کے شمارے میں ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر نے ایک گمنام اردو شاعر نساخ کے نام اور کام سے آشنا کرایا۔ اردو زبان ادب کی خدمت جیسی سرگزشت نے کی ہے، اس کے مکمل احاطے کے لیے ڈاکٹر بٹ کا مقالہ لکھا جانا چاہیے اور اس سلسلے میں ڈاکٹر ساجد امجد کو کوشش بھی کرنی چاہیے کہ یہ بھی ایک اہم کام ہے۔ ڈاکٹر روتھ فاؤ کا نام ایوارڈ پانے والی اہم شخصیات میں سنتے تھے لیکن وہ ایسی عظیم انسان ہیں کہ محسن ہیں، معلوم نہ تھا اور ہمارے جیسے بے حس معاشرے میں ان کے جیتے جی اتنا احترام کیا گیا اس پر بھی شکر کیا جانا چاہیے۔ شہر خیال میں ناصر حسین رند بھائی نے مجھے یاد کیا اور پریشانی کا اظہار کیا لیکن ہمارے غائب ہونے کا سبب فری میسن کا شائع نہ ہونا تھا، اب وہ شائع ہوگیا دکھ ختم۔ (خوش رہیے) باقی بھائی یہ میرا انجم کا شادی کے بعد لکھنا پڑھنا چھوڑ دینا تو پرانا ایرانی والا مسئلہ نہیں ہے۔ ہم کو کچھ سندھی شاعرات کا پتا ہے کہ جب تک وہ یونیورسٹی میں پڑھتی تھیں تو شاعری بھی چلتی تھی لیکن جب شوہروں کے نام ہوئیں تو شاعری وغیرہ بھول گئی۔ ہم مرد غلبے والے معاشرے میں رہتے ہیں اور کسی عورت کا لکھنا پڑھنا دیکھ کر خواہ مخواہ ہماری مردانگی کو چوٹ لگتی ہے۔ (درست فرمایا) سعید احمد چاند نے ساتھیوں کی خیر و عافیت اچھی طرح سے پوچھی ہے۔ جی اے مغل کی اس رائے سے ہم بھی اتفاق کرتے ہیں کہ پُراسراریت نمبر دوم میں زیادہ تر جن بھوتوں کی داستانیں ہیں۔ ایم اے خالق بھٹی، ٹی وی دیکھ کر اتنے سوٹ نہ سلوائیں سادگی کا اپنا ہی وقار اور حسن ہوتا ہے۔“

✉ **محسن علی موم** نے بالاکوٹ سے لکھا ہے ”فروری کا سرگزشت کافی لیٹ 29 کو ملا۔ یک صفحی سرگزشت میں حفیظ جالندھری کے بارے میں پڑھا، ان پر ایک مفصل مضمون ہونا چاہیے۔ سرگزشت کے صفحات پر شہر خیال میں سب کے تبصرے شاندار تھے۔ فخرِ سخن پڑھ کر نساخ کے حالاتِ زندگی کے بارے میں پتا چلا۔ خلا کے شکاری ایک دلچسپ اور معلوماتی تحریر تھی۔ یہاں میں قرآن سے علم فلکیات کے بارے میں چند باتیں تحریر کرنا چاہوں گا۔“ (آپ کی تحریر ہم نے محفوظ کرلی ہے۔ بطور اقتباس لگایا جاسکتا ہے)

✉ **طاہر الدین بیگ**، میرپور خاص سے رقم طراز ہیں ”فروری کے سرگزشت پر اظہار خیال کرنے سے پہلے پُراسراریت نمبر کے بارے میں عرض کرتے چلیں کہ یہ ایک ایسا شاندار نمبر ہے کہ جسے بڑے فخر کے ساتھ دوستوں کو تحفہ میں آپ دے سکتے ہیں اور لائبریری میں بھی رکھ سکتے ہیں۔ سرگزشت والوں کو اتنا معلوماتی نمبر نکالنے پر مبارک باد (شکریہ) اب ذکر ہوجائے کچھ فروری کے سرگزشت کا توتی پاکستان پڑھ کر طبیعت بہت ہی خوش ہوئی، صرف چھ جماعتیں پاس شاہنامہ اسلام اور قومی ترانہ کے خالق کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ جناب حفیظ جالندھری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ انہیں کروٹ کروٹ سکون عطا فرمائے۔ اور ان کے درجات بلند کرے۔ جنت فردوس میں جگہ عطا کرے (آمین) اعجاز حسین سٹھار صاحب کا تبصرہ بڑا دلچسپ رہا۔ سٹھار صاحب کو بنڈل شاہ جیسی ہستی سے ملنے کا شوق ہے بقول ان کے سارے دلدر دور ہوجائیں گے مگر سٹھار صاحب، اتنے درد پالے کیوں ہیں؟ ناگوری صاحب کا تبصرہ بھی اچھا رہا۔ رند کا تبصرہ کافی معلوماتی رہا۔ حضرت امام احمد رضا خاں بریلویؒ پر ایک زبردست سوانح حیات شائع کردیں۔ رشید صاحب کی طرح ہم بھی عرض کریں گے کہ مدھوبالا پر ایک شاندار مضمون کے لیے گھونگھٹ نیر اور سنتوش ہم نے دیکھی اور کئی بار دیکھی مگر مدھوبالا کی ہم نے نہیں دیکھی اس لیے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ گھونگھٹ محل کے طرز کی تھی۔ فخرِ سخن ڈاکٹر صاحب کا اچھا معلوماتی مضمون اردو کے طالب علموں کے لیے بہت اچھی کوشش، مریم کے خان خلا کے شکاری جیسی دلچسپ تحریر لے کر آئے ہیں۔ شہابیوں کا ذکر نظامِ شمسی کا ذکر، سیاروں کا ذکر علم فلکیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے خوبصورت تحفہ ہے۔ ابن کبیر صاحب ایک ایسی خاتون کا تذکرہ لے کر آئے جو سارے پاکستانیوں کے لیے باعث فخر ہے یعنی روتھ اور اس کی خدمات پاکستان سے محبت میں ایسی حوصلہ مند اور کام میں مگن، میں انہیں سلام پیش کرتا ہوں۔ صبا شفیق نے ایک باہمت اور نڈر بچے کی داستان شجاعت پیش کی ہے۔ بھیڑ کی کھال عطار آزاد صاحب لے کر آئے اور خوب لے کر آئے۔“

✉ **عبدالعزیز جی آ**، چکوال سے تشریف لائے ہیں ”فروری کا سرگزشت چکوال سے خریدا اور لاہور سفر کے دوران اس بے لوث دوست نے ایک لمحہ بھی بور نہ ہونے دیا۔ ہم نے آفاقی صاحب کی فلمی الف لیلہ ساری پڑھ لی۔ مزہ تو آیا مگر کیا تا کہیں، تشنگی سی رہ گئی۔ ہم نے سرگزشت پچھلے جون سے پڑھنا شروع کیا ہے، ہاں فلمی الف لیلہ میں قارئین کے خطوط بالکل بور نہیں ہونے دیتے۔ میں نے آفاقی صاحب سے ایک دو دفعہ درخواست کی تھی کہ فلم اسٹار عالیہ کے حالاتِ زندگی قلمبند کیجیے، لوگوں سے سنا کہ عالیہ میرے شہر چکوال جبیر پور کی رہنے والی تھی۔ آج کل وہ کہاں ہیں؟ معراج محبت مکمل پڑھ کر ہی دم لیا۔ زبردست کہانی تھی۔ جناب مولوی عبدالغفور نساخ کو پڑھا، خوب لگی خاص کر نساخ کی شاعری نے مجھے بہت متاثر کیا۔ خلا کے شکاری سائنسی معلومات پر ایک دلچسپ تحریر تھی۔ سامری نے کوئی خاص مزہ نہ دیا۔ میں نے دو ماہ قبل ایک کہانی روانہ کی تھی مگر 7 دن بعد وہ رجسٹری ہمیں واپس مل گئی۔ لکھا تھا کہ ..... کے تھرو بھیجی گئی رجسٹریاں پوسٹ بکس ڈیلیور نہیں کرتا۔ (دفتر کا مکمل پتا اداریے کے صفحے پر تحریر کیا جاتا ہے) جی اے مغل، جاوید محمد خان سرکانی، عبدالخالق بھٹی، سدرہ بانو ناگوری، ناصر حسین رند۔ محسن علی موم اور رانا محمد سجاد کے تبصرہ جات بھی بہت پسند آئے۔“

✉ **محمد جاوید خان سرکانی درانی** کا بروزئی، بھمبھر سے خلوص نامہ ”اداریہ کے متعلق یہی کہہ سکتے ہیں کہ قدرت قدموں سے اپنی ناراضی کا اظہار اس طرح بھی کرتی ہے کہ ان میں موجود باصلاحیت افراد اٹھالیے جاتے ہیں جیسا کہ ارفع کریم کی بے وقت موت ہے۔ سٹھار صاحب مسند صدارت

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی مبارک باد۔ راجا ثاقب صاحب، اللہ والے لوگ اور طلسماتی طاقتوں کے مالک ہونا متضاد باتیں ہیں۔ ہاں بنڈل شاہ طلسماتی طاقتوں کے مالک ضرور تھے۔ عبدالخالق بھٹی صاحب، چھچھ 84 دیہات پر مشتمل ایک وادی کا نام ہے۔ دریائے سندھ کے کنارے آباد یہ علاقہ اپنے دینی، مذہبی رجحان اور زرخیزی کی وجہ سے عالمی شہرت رکھتا ہے۔ صوبہ پنجاب کا انتہائی شمالی علاقہ ہے، اس کا ضلع اٹک اور تحصیل حضرو ہے جبکہ عوامی سوچ یہ ہے کہ تحصیل حضرو کی بجائے تحصیل چھچھ کا نام استعمال ہونا چاہیے کیونکہ یہاں کے لوگ چھچھ کی مناسبت سے چھاچھی کہلاتے ہیں۔ تحریکِ خلافت کے سلسلے میں یہاں جلسے منعقد ہوتے رہے ہیں۔ انہی جلسوں میں کی گئی ایک تقریر کی وجہ سے مولانا ظفر علی خان پر انگریز سرکار نے مقدمہ چلایا تھا اور مولانا ظفر علی خان کو ظفر الملت کا خطاب بھی یہیں سے دیا گیا تھا۔ صوبہ سرحد کے ایک شاعر نے پشتو اشعار میں یہاں کے لوگوں کی تعریف و توصیف کی ہے۔ محمد نثار حمید، آپ کی آمد پر خوشی ہوئی اور نابینائی نمبر کی تجویز پر آپ اور رانا سجاد کا شکریہ۔ رند صاحب دل چھوٹا نہ کریں۔ آپ پھر بھی صدرِ محفل بنتے رہیں گے بلاشبہ آپ اہل ہیں مگر دیگر ساتھی بھی کچھ حق رکھتے ہیں۔ اور سب ہی تحقیق کے بعد حوالہ جات کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے فخرِ سخن لکھ کر خوب رنگ جمایا کہ جناب نساخ نے بنگال میں اردو زبان کی جو خدمت کی وہ ان کے مقام کا تعین کرتی ہے بلاشبہ فخرِ سخن تھے۔ ایک غیر مانوس ماحول میں رہ کر انہوں نے ہماری زبان کی جو خدمت کی ہے، وہ ان کے مقام کو میر اور غالب سے بھی بلند کر دیتی ہے گو کہ فنِ شاعری میں نساخ ان کے ہمسر نہیں، کیا ان کی تصانیف یہاں دستیاب ہیں؟''

✉ **علی مغل** کی فسوں سازی، مانسہرہ کلوال سے ''فروری کا سرگزشت اور پُراسراریت نمبر 2، 29 جنوری کو اکٹھے خریدے ہیں۔ پُراسراریت نمبر دو کے اعلان نے مجھے جتنا مضطرب رکھا اتنی ہی تاخیر سے یہ محبوب جریدہ زیرِ نظر آیا۔ شدید سردی، برف باری کے باعث پاؤں زمین پر جمانا جہاں محال ہو رہا ہو وہاں ڈھلوان میں دو کلومیٹر بس اڈا تک اُترنا جان جوکھوں میں ڈالنے کے مترادف ہے، ایسے میں انتظار کی صعوبت اپنی جگہ۔ اس نمبر کے ساتھ خالد کبیر صاحب کو اول نمبر پر آنے اور سالانہ جائزے کی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ سال بھر کی کہانیاں جب ذہن کے پردۂ اسکرین پر چلیں تو احساس ہوا کہ موصوف نے اس شاندار جائزے میں کئی اہم لکھاریوں کا ذکر زیرِ بحث نہ لا کر ایک جاندار تبصرے کی ساکھ کو نقصان پہنچایا ہے۔ جے اے مغل صاحب سرگزشت کے گلوں میں خارشکوں کے زیب نہیں دیتے حوصلہ نہ ہاریں، ہمت جاری رکھیں، خطوط میرے بھی نوک پلک کٹواتے رہتے ہیں۔ انتساب عباس صاحب کی کارگزاری کا دکھ ہوا۔ سیدھے اور سادے لوگ جانے اس ملک میں کب تک لٹتے رہیں گے۔ مگر اس نقصان کا یہ بھی تو ایک فائدہ ہے کہ محترم کئی ایک کو ایسے دھوکے بازوں سے ہوشیار کر گئے، کس سے گلہ کریں، کمپنیوں کو تو غرض ہے کار ڈکیتیں کاروبار چمکے۔ راجا ثاقب نواز ثاقب کوئی مضمون لے کر آئیں، اس سلسلے میں بھی صرف آپ کے خطوط ہی پڑھنے کو ملتے ہیں۔ آخر میں اعجاز سحار صاحب کا مختصر سا اظہارِ خیال اول تو عجیب لگا مگر جنوری کے شہرِ خیال میں کرسی صدارت پر براجمان دیکھ کر عمرہ و کرسی کی دو دو مبارک باد وصول کر گئے مگر یہ بات کچھ انوکھی پہیلی بن گئی کہ سلیم اختر کے ساتھ شائع ہوتے رہے پھر تو ہمارے درمیان اجنبیت اُٹھ جانی چاہیے کیونکہ حاجی محمد انور لانگ، افضل بٹ ناز، رفعت محمود، ایم شفیع کوکب مرحوم، یونس ناز کے درمیان آپ کا نام نظروں سے گزرا نہیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ بہت سے سوالات جنم لے رہے تھے۔ مولانا سے جواب بن نہیں پا رہے تھے بلکہ مسئلہ سے مسائل بن رہے تھے، یہ معما ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کا مضمون ''وہ کون'' پڑھ کر حل ہو گیا۔ لیکن بھوت کسی تجربہ کار قلم سے آتی تو مزہ دوبالا کرتی مگر پھر بھی کچھ معلومات بڑھا گئی (حالانکہ اندازِ تحریر اور روانی و معلومات میں بہت پختگی تھی) گو کہ بل ہضم ہونے کا نام نہیں لیتی، ایسی کہانیاں اس علاقے میں رہتے ہوئے بھی سنیں اور کچھ مبالغہ آرائی اپنی نانو کی زبانی بھی۔ (یہی خاص بات ہے علاقائی کہانیوں کی تاہم انہیں یکسر مسترد نہیں کیا جا سکتا، اس کہانی میں جس قدر تحقیق ممکن تھی وہ کی گئی) ''قہر گزیدہ'' میں لکھاری کی محنت قابلِ داد ہے۔ سورج کا رقص پڑھ کر مجھ پر کئی اسرار، رموز کھلے۔ بھائی کے قلم کو خدا اور ترقی دے مدینۃ الاولیاء کے ''عامل'' میں لکھاری کا کچاپن واضح ہے۔ (سچ بیانیوں میں کوشش کی جاتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو کاٹ چھانٹ سے بچا جائے تاکہ واقعہ/ روداد کا اثر زائل نہ ہو) یوگا اور ٹیلی پیتھی والوں کے بھی یہی دعوے ہیں۔ لہٰذا کہانی ایمان افروز تھی اللہ ہر ایک کو استقامت عطا فرمائے۔ باقی مضامین، سچ بیانیاں بھی اچھی رہیں، جو مضمون بازی لے گیا وہ ہے مریم کے خان کا پُراسرار مذہب، پاکستان، ہندوستان میں فرقہ پرستی کا یہ عروج شاید فری میسنری کی لگائی آگ ہے۔ ماہ جنوری کے شمارے میں ابن کبیر صاحب مریم کے خان صاحب اور ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کا مضمون ہی پڑھا۔ کچھ بھی ہو مگر پُراسراریت نمبر 1 کے سحر سے ابھی تک نہیں نکل پایا ہوں۔'' (یہ آپ کی محبت ہے)

✉ **مہوش رفیق** کا نامہ کراچی سے ''میری والدہ آپ کی عرصہ دراز سے خاموش قاری ہیں۔ ان کے شوق کو دیکھتے ہوئے ہی ہم بہنوں نے بھی سرگزشت کو پڑھنا شروع کیا۔ سچ بیانیوں کو پڑھتے ہوئے آج اتنی جسارت کر رہی ہوں، ایک سچ بیانی آپ کو ارسال خدمت ہے۔ میں خود نسرین آنٹی سے مل چکی ہوں، میں نے نام اور مقامات تبدیل کر دیے ہیں، اس داستان کا حرف بہ حرف سچ پر مبنی ہے۔ اگر اشاعت کے قابل ہو تو برائے مہربانی ضرور اس کی نوک پلک سنوار کر قریبی اشاعت میں جگہ عنایت فرمائیں۔ (آپ کی روانہ کردہ کہانی اچھی ہے مگر اندازِ تحریر کی کمزوری آڑے آ رہی ہے۔ ری رائٹ کرانا پڑے گا) میں فروری 2012ء کی اشاعت پر تبصرہ کرنا چاہتی ہوں۔ پہلی سرورق کی کہانی ''معراجِ محبت'' پڑھی۔ پڑھ کر اندازہ ہوا کہ محبت کس عظیم رشتے کا نام ہے۔ اچھا ہوا کہ طارق کی اصلیت بہت جلد سامنے آ گئی۔ دوسری کہانی تعبیر، مجموعی طور پر اچھی تھی کہ اونچی اُڑانیں اُڑنے والے جلد نیچے آ گرتے ہیں، لڑکیوں کے لیے عبرت ہے۔ تیسری کہانی مشورے پڑھی، بہت اچھی لگی۔ دوسروں کے مشورے نہ مانو بس اپنے دل کی کرو۔ فروری کی اشاعت جتنی پڑھی ہے اس پر تبصرہ کیا ہے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

✉ **تفسیر عباس بابر**، [illegible] سے لکھتے ہیں ''فروری کا [illegible] شمارہ 26 جنوری کو دستیاب ہوا۔ وطنِ عزیز کی ہونہار اور قابلِ فخر بیٹی ارفع کریم کا تذکرہ، مغموم و افسردہ کر گیا۔ [illegible] یہاں قبروں پر شمعیں جلائی جاتی ہیں جبکہ زندہ لوگوں کے گھروں میں اندھیروں کا راج اور رواج ہے۔ [illegible] کے دور میں ہم رہ رہے ہیں۔ یک صفحی داستان میں ایک اور نابغۂ روزگار شخصیت، حفیظ جالندھری سے متعلق پڑھا۔ [illegible] شہرِ خیال میں [illegible] سے اعجاز حسین سحار کا اظہارِ خیال زبردست رہا۔ ان کا تبصرہ ہمیشہ منفرد اور بہترین ہوتا ہے۔ ساہیوال سے [illegible] راجا ثاقب نواز ثاقب کی [illegible] دل کی آنکھوں سے پڑھیں۔ میانوالی سے سید محمد رضا شاہ کا تبصرہ بھی خاصے کی چیز تھا۔ بروزکی سے ملک محمد جاوید سرگالی کا اظہارِ خیال بھی [illegible] گیا۔ کراچی کے اُفق سے سعید احمد چاند کا طلوع بھی خوب رہا۔ رحیم یار خان سے ایم اے خالق بھٹی صاحب، پہلے وجودِ زن سے تصویر کائنات میں رنگ تھا، اب میک اپ اور فیشن سے وجودِ زن میں رنگ ہے۔ ناصر حسین رند کا مکتوب خاص بہاولپور سے۔ یقیناً مسندِ صدارت کے تقاضوں سے ہم آہنگ تھا۔ دیگر احباب کے خطوط بھی بصد شوق ملاحظہ کیے۔ پُراسراریت نمبر دو سے متعلق کچھ کہنا لازم ہے جو کہ پُراسراریت نمبر ایک کے مقابلے میں (زبردست رہا۔ ذوالقرنین، سائرس اعظم تاریخ کی پُراسراریت شخصیت سے متعلق پڑھا۔ [illegible] کے ہاتھوں سکندر مقدونی کی سرگزشت بھی دستیاب ہو جائے تو سونے پہ سہاگا ہو جائے۔ (سکندر مقدونی پر مضمون ستمبر 09ء میں روشنک، اکتوبر 09ء میں استیرا اور مارچ 10ء میں برسین ملاحظہ کریں) وادیٔ پرنگال سے متعلق پڑھ کر ذہن کافی [illegible] ممکن ہے کہ جناب بی بی فاطمۃ الزہرہ اور بی بی مریم نے وادیٔ پرنگال میں معجزاتی طور پر اپنے نور کی جھلک دکھائی ہو اور مقام صد افسوس ہے کہ مسلمان محققین، علما اور ارباب اختیار نے اس اہم و مقدس راز کی جستجو کے لیے کوئی عملی قدم نہ اُٹھایا۔ مصنفین کی قطار میں روبینہ نفیس انصاری کو دیکھ کر ازحد خوشی ہوئی۔ ابتدائی صفحات پر ڈاکٹر ساجد امجد کی ایک اور نایاب تحریر و تحقیق فخرِ سخن، بنگال میں اردو ادب کی معتبر ترین شخصیت، مولوی عبدالغفور نساخ سے متعلق پڑھ کر معلومات میں گرانقدر اضافہ کیا۔ ارفع کریم کی خوبصورت تصاویر و اقتباس، دل درد سے بھر جاتا ہے اسے مرحوم اور محروم تمنا کہتے ہوئے۔ مریم کے خان کی سائنسی معلومات پر مبنی تحریر خلا کے شکاری بھی دلچسپ ثابت ہوئی۔ خالد کبیر کی قابلِ تقلید، جذبۂ خدمت انسانیت کا تذکرہ ہو گا تو اب لیڈی ڈائنا کے بعد روتھ فاؤ کا نام ہی ذہن کی اسکرین کے پردے پر روشن ہو گا۔ (لیڈی ڈائنا اور روتھ کا مقابلہ نہیں۔ روتھ گمنامی میں خدمت خلق انجام دے رہی ہیں) ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی موت بردار، ایک بہت بڑے حادثے کا دلچسپ احوال متاثر کن رہا۔ علی سفیان آفاقی کی فلمی الف لیلہ کا دو سو پانچواں مہینا زبردست، شاندار رہا۔ ذوالفقار ارشد گیلانی کی معلوماتی تاریخی دلچسپ اور عبرت اثر تحریر سامری، تاریخ کی ایک اور مکروہ اور فتنہ پرور شخصیت کا مفصل احوال۔ ایب اور یجن، بھیڑ کھال اور چیمپئن بھی اچھی تحریریں تھیں۔ کاشف زبیر کی متزلزل حوصلوں کو مہمیز کرتی سلسلے وار کہانی سراب اپنی مثال آپ ہے۔ دوسری تلخ و سفاک سچ بیانی افسر حیات کی تعبیر، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا فرمان ہے کہ دنیا گندگی کا ڈھیر ہے۔ کاش ہم اس کی ظاہری خوبصورتی اور عارضی رنگ و رعنائی کی حقیقت کو سمجھ جائیں۔ نفس کے غلاموں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ مشورے، مشورہ برائے مشورہ کا عملی نمونہ ثابت ہوئی۔ بلقی گھونسا، اپنے ہی گراتے ہیں نشیمن پہ بجلیاں، رابعہ کے ساتھ اپنوں نے جو کچھ کیا، ایسا تو بے گانے بھی نہیں کرتے۔ دیہاڑی زمانے کی بے ثباتی کا اور کیا ہو گا ثبوت۔ دعا بابا جی، پُراسراریت نمبر کے لیے نہایت موزوں تھی لیکن شاید منتخب یا شاملِ اشاعت نہ ہو سکی۔'' (آپ کا اندازہ درست ہے، پُراسراریت نمبر کے لیے مواد کے انتخاب میں یہی مشکل درپیش رہی کہ مواد تمام ہی بہت اچھا تھا، جمع شدہ مضامین اور سچ بیانیاں آئندہ شماروں میں پیش کی جاتی رہیں گی)

✉ **ڈاکٹر روبینہ نفیس ثاقب**، بھکر سے لکھتی ہیں ''فروری کا سرگزشت بہت دیر سے ملا۔ پھر یہ ستم کہ ہر ماہ تبصرہ تفصیل سے لکھتی ہوں مگر وہ بھی محکمۂ ڈاک کی نذر ہو جاتا ہے۔ اب میں رُکو نا جن تو ہوں نہیں کہ کہوں کہ مجھے کام بتاؤ، میں کیا کروں، میں کس کو کھاؤں؟ اگر یہی حالت رہی تو مجھے غصہ آ جائے گا اور میں لکھنا ہی چھوڑ دوں گی (نا...... نا، ایسا غضب نہ کرنا، اتنی اچھی تحریر کے ساتھ آئیں اور اب کہتی ہو لکھنا چھوڑ دوں گی، کہیں لکھن کے بھوت نے تو کچھ نہیں کہہ دیا؟) اب اپنا اپنا منہ بند کر لیں اور جلدی جلدی بتائیں آپ سب کیسے ہیں؟ میری دعا ہے کہ اللہ پاک آپ سب کو ڈھیروں خوشیاں عطا فرمائے۔ شہرِ خیال میں پہلے سب ایک گھر کے فرد جیسے تھے، اپنے غم و خوشیاں شیئر کرتے تھے۔ اب تو بس کہانیوں پر تبصرہ کیا اور یہ جا وہ جا۔ پہلے جیسی اپنائیت اب نظر ہی نہیں آتی یا پھر میری نظر کمزور ہو گئی ہے۔ اب سب چپ کیوں ہیں، بولیں نا! رضا شاہ، جاوید خان، سعید احمد چاند، سدرہ بانو، ناصر حسن، محسن علی، رانا شاہد، غلام یاسین، آپ سب کا کہانی پسند کرنے پر بہت بہت شکریہ۔ کہانیوں میں معراجِ محبت نے دل کو چھو لیا۔''

آخر میں ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

توقیر ناصر، لاہور۔ عدنان صدیقی، ملتان۔ رضوان احمد، پنڈی بھٹیاں۔ ارسلا فضل، روہڑی۔ عبدالعزیز، کراچی۔ سدرہ ظہیر، ساہیوال۔ شکیلہ فاروقی، گجرات۔ شجاعت علی چوہدری، منڈی بہاؤالدین۔ شوکت حسین رضوی، شیخوپورہ۔ سمندر خان، کوہاٹ۔

ماہنامہ سرگزشت کے سینئر لکھاری، دنیائے صحافت کا نامور نام، فلمی دنیا میں برسوں تک راج کرنے والی شخصیت جناب علی سفیان آفاقی بہت زیادہ علیل ہیں، تمام قارئین سے دعائے صحت کی اپیل ہے، علالت کے باعث ہی وہ اس ماہ فلمی الف لیلہ کی قسط مکمل نہیں کر سکے ہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

سوز و ساز

ڈاکٹر ساجد امجد

زندگی کے جہنم اور اس کی گرم و تند ہوا کے مقابل وہ آیندہ کے تصور میں کو بہ کو پھرتے رہے ، انہوں نے زرد موسم کی رُتوں کو بھی جھیلا، مصائب والم کا سامنا کیا اور خوشیوں کے ہنڈولے کا مزہ بھی لیا۔ بڑے امرا ورؤسا کی مصاحبی بھی کی اور ادب کے بونوں کی پھبتیاں بھی سہیں۔ غزل گوئی کے بنیادی معمار کہلائے۔ اپنے جدّت اندازِ بیاں کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ شوخی ورنگینی طرۂ امتیاز ٹھہرا۔ سادہ بیانی کی طرح ڈالی جسے بعد میں غالب نے مقبولیت بخشی۔ ایسے اشعار کہے کہ سرزمینِ علم وادب لکھنو میں اتھل پتھل مچادی۔ میرتقی میَر نے انہیں منصب سے گرانے کی حتی الامکان کوشش کی۔ شاگردوں کی فوج در فوج تھی ، وہ میرتقی میَر کو جواب دینے کی اجازت کے طلب گار بھی تھے مگر خود ایسے منکسر المزاج تھے کہ حد ادب کا دامن نہ چھوڑا۔

سکون واطمینان نے تکیے سے سر اُٹھایا تو اپنے سامنے محمد شاہ بادشاہ کو دیکھا جو عوام میں محمد شاہ رنگیلا کے نام سے مشہور تھا۔ خانہ جنگیوں کے شور سے گزرنے کے بعد اتنا ضرور ہوا تھا کہ ایک نا قابلِ عبور سناٹا دور تک پھیل گیا تھا۔

دہلی کا شباب عروج کی کہانیاں سنا سنا کر تھک چکا تھا لیکن اب بھی اقتدار کے ایوانوں میں نہ سہی شہر کے گلی کوچوں میں اس عروج کی کہانیاں سننے، دیکھنے اور جاننے کو مل جاتی تھیں۔ کئی معزز خاندان اپنے طرزِ عمل سے بھولے بسرے دنوں کو دُہراتے رہتے تھے۔

ان روشن ستاروں میں ایک تابندہ ستارہ میر ضیا الدین کا گھرانا تھا۔ ان کا مکان محلہ قراول پورہ (موجودہ قرول باغ) میں مرجع خلائق بنا ہوا تھا۔ میر ضیا الدین کا سلسلہ نسب کئی واسطوں سے حضرت جلال سرخ بخاری سے ملتا تھا گویا مرشد اسلام شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ سے جاملتا ہے۔

وعظ وتبلیغ اس خاندان کی ہمیشہ سے پہچان رہی تھی۔ وقت نے کئی کروٹیں لیں اور افتاد کا سیلاب میر ضیا الدین کو دہلی لے آیا۔ خاندانی میراث کو تکیہ بنائے بیٹھے تھے۔ یہ وقت وہ تھا کہ شرفا کے دامن موتیوں سے خالی ہو چکے تھے۔ ناتواں ہاتھ بڑی مشکل سے آبرو بچائے ہوئے تھے۔ جب حال یہ ہو کہ شہزادے اقتدار کو آنکھوں سے دیکھنے کی آرزو میں آنکھوں سے ہاتھ دھو رہے ہوں وہاں غریب کی آبرو کی قیمت کتنی؟ ہاں اتنا ضرور تھا کہ ابھی موتیوں کی آبرو انسانوں کی آبرو سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ عزت اسی کی ہوتی تھی جو عزت کا مستحق ہوتا تھا اور عزت وابستہ تھی کردار کی عظمت سے۔

میر ضیا الدین اس لیے بھی معزز تھے کہ وہ حضرت جلال سرخ بخاریؒ کے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے اور اس لیے بھی کہ وہ خود نہایت متقی اور پرہیزگار تھے۔ امرائے نامداران کے حلقہ بگوشوں میں تھے۔ وہ مستغنی تھے لیکن امیروں سے ملنے میں کوئی عار بھی نہیں تھا۔ ان کا شمار معززین شہر میں بھی ہوتا تھا اور مبلغین شہر میں بھی۔

ایسے لائق فائق شخص کو جب اللہ تعالیٰ نے فرزند عطا فرمایا تو شکر گزاری نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کر دیے۔

گھر کا ماحول پاکیزہ ، آنے جانے والے صاف ستھرے، ملنے جلنے والے شرفائے دہلی، باپ کی انگلی پکڑ کر جہاں جاتا دعاؤں کے پھول سمیٹ کر لاتا۔

تربیت کے لیے گھر کا ماحول ہی کیا کم تھا کہ پڑھنے کی عمر آئی تو بہترین اساتذہ کا دامن فیض میسر آ گیا۔ ذہانت سائے کی طرح ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اساتذہ کی توجہ نے ہاتھ تھاما تو عربی فارسی میں اچھی خاصی استعداد حاصل کر لی۔

مغل دورِ حکومت میں خوش نویسی کے فن کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ شہر دہلی میں اساتذۂ فن کی کمی تھی نہ اس فن کے سیکھنے والوں کی۔ عمر میں ذرا درازی ہوئی تو میر ضیا الدین اسے خوش نویسوں کی صحبتوں میں لے جانے لگے۔ یہ نہیں کہا کہ تمہیں بھی یہ فن سیکھنا چاہیے بلکہ صرف یہ دیکھا کہ وہ لکھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوئی تختیوں کو دیکھ کر خود کیا کہتا ہے۔ وہ کیا کہتا، چپکے چپکے ان خوش نویسوں کو لکھتے ہوئے دیکھتا رہا۔ کس طرح وہ قلم پکڑتے ہیں اور کس طرح جوڑ بٹھاتے ہیں۔ پھر ان کی نقل میں خود بھی لکھ لکھ کر وصلیاں پھاڑتا سنبھالتا رہا۔ ایک دن میر ضیاالدین نے اس کے شوق کو پروان چڑھتے ہوئے دیکھ لیا۔

''میاں صاحبزادے، کیا ہو رہا ہے؟''

''جادو رقم کے خط کی نقل اُتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔''

''صاحبزادے یہ فن ہے بچوں کا کھیل نہیں۔ سیکھے بغیر نہیں آتا۔ اگر شوق ہے تو کسی کی شاگردی اختیار کرو۔''

''آپ ہی بتائیں مجھے کس کے پاس جانا چاہیے؟''

''یہ شہر خوش نویسوں سے بھرا پڑا ہے۔ کل تیار رہے گا، کہیں بھی لے چلیں گے۔''

دوسرے دن وہ باپ کے تیار ہونے سے پہلے تیار ہوگیا۔ سائیس نے گھوڑا تیار کر دیا تھا۔ میر ضیاالدین تیار ہو کر نکلے اور بیٹے کو آمادۂ سفر دیکھا تو لبوں پر ہنسی اپنی جگہ بنائے بغیر نہ رہ سکی۔ اس نے وہ وصلیاں بھی ساتھ لے لی تھیں جن پر اپنے خیال کے مطابق اس نے بڑے استادانہ خطوط کھینچ رکھے تھے۔

''میاں، یہ کیا؟''

''استاد، یہ نہ سمجھیں کہ میں بالکل کورا ہوں۔ اس لیے انہیں بھی ساتھ لے جا رہا ہوں۔''

''کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ دکھانے لائق ہیں؟''

''یہ تو استاد بتائیں گے، میں نے تو اپنی سی خوب کوشش کی ہے۔''

''شاباش! اگر یہی شوق رہا تو آپ اس فنِ شریف کو ضرور حاصل کرلیں گے۔''

میر عطاﷲ ان کا نام تھا اور جادو رقم کے نام سے مشہور تھے۔ ان کی انگلیوں میں واقعی جادو تھا۔ قلعے کی بھول بھلیوں تک ان کی رسائی تھی۔ کئی شہزادے ان کے فیض یافتہ تھے۔ سن رسیدہ ہوگئے تھے لیکن ہاتھوں کا جادو ابھی تک برقرار تھا۔

میر ضیاالدین یہاں آتے ہی رہتے تھے لیکن آج ایک خاص مقصد کے لیے آئے تھے اس لیے کچھ شرمندہ سے نظر آرہے تھے جیسے کوئی قرض مانگتے وقت دکھائی دیتا ہے۔ میر عطاﷲ سے ان کی یہ کیفیت چھپی نہ رہ سکی۔

''میر صاحب، خیریت تو ہے۔ لگتا ہے آج کچھ جی اچھا نہیں۔''

''بات یہ ہے کہ آج میں آپ سے کچھ مانگنے آیا۔ مانگنے والے کی صورت ایسی ہی ہوتی ہے، جیسے میری ہے۔'' میر ضیاالدین نے کہا۔

''یہ آپ نے خوب کہی میر صاحب! اپنی چیز مانگنے سے کوئی شرماتا ہے۔ یہاں جو کچھ ہے، آپ ہی کا تو ہے۔''

''یہ میرا بیٹا ہے، سید محمد میر۔''

''ماشاءاللہ۔ اِدھر آیئے صاحب زادے!''

محمد میر نے اس عزت افزائی پر انہیں جھک کر آداب کیا اور ان کے پاس جاکر کھڑا ہوگیا۔ میر ضیاالدین نے پھر کہنا شروع کیا ''میں اس کے لیے آپ کی رہبری مانگنے آیا ہوں۔''

''حقیقت تو یہ ہے میر صاحب کہ یہ فن شریفوں کے حاصل کرنے کا تھا۔ آج کل سب ہی کے ہاتھ اس کے گریبان تک پہنچ رہے ہیں۔ اس لیے اس میں برکت نہیں رہی۔ آپ جیسے خاندان اب دلی میں کتنے رہ گئے ہیں۔ اچھا ہے یہ فن ایسے خاندانوں میں منتقل ہوجائے۔ اب تو قلعہ بھی سازشوں کا گڑھ بن کر رہ گیا ہے۔ اس فن کو وہاں بھی کوئی پوچھنے والا نہیں۔''

''یہ کچھ اُلٹا سیدھا لکھ کر بھی لائے ہیں۔ ذرا یہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔''

انہوں نے اس کا لکھا ہوا دیکھا اور ایک طرف رکھ دیا ''فن تو سیکھنے سے آتا ہے لیکن اصل چیز ہوتی ہے شوق۔ ان وصلیوں کو دیکھ کر صاحبزادے کا شوق ظاہر ہو رہا ہے۔ میں اپنے تجربے سے کہہ رہا ہوں کہ آپ کا بیٹا نہ صرف اس فن کو حاصل کرے گا بلکہ مہارت حاصل کرے گا۔''

''تو میں یہ سمجھوں کہ آپ نے اسے قبول کیا؟''

''اگر اس کا دل لگا رہا تو میں اسے ضرور سکھاؤں گا۔ ایک اور صاحبزادے انہی کے ہم عمر آتے ہیں۔ مرزا رفیع نام ہے ان کا۔ کابلی دروازے میں رہتے ہیں۔ رئیس زادے ہیں۔ ابھی سے شاعری کا شوق لگا بیٹھے ہیں۔ سودا تخلص کرتے ہیں۔ ابھی مشاعروں میں تو نہیں جاتے لیکن یہی شوق رہا تو یہاں ٹکنے والے نہیں۔ پھر بھی جب تک آتے ہیں ان کی وجہ سے محمد میر کا بھی دل لگا رہے گا۔ دونوں مل کر کچھ نہ کچھ سیکھ ہی لیں گے۔''

محمد میر ان کے پاس خوش نویسی سیکھنے کے لیے جانے لگا۔ اسے وہاں جاتے ہوئے کئی دن ہوگئے تھے لیکن مرزا رفیع کا کہیں پتا نہیں تھا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ شاید وہ لڑکا کہیں اور مشغول ہوگیا۔ وہ آتا رہتا تو میرا بھی دل لگا رہتا۔ پھر ایک دن وہ بڑی شان سے ہاتھی پر سوار ہو کر آیا۔ استاد نے اسے محمد میر سے ملوا دیا۔ مرزا رفیع کو ایک تو اپنی ذہانت کا غرور، پھر شاعری کا گھمنڈ۔ سب سے بڑھ کر باپ کی دولت کا نشہ... وہ سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا لیکن محمد میر میں اسے کوئی ایسی بات نظر آئی کہ پہلی ہی ملاقات میں گھل مل گیا۔

یہ زمانہ وہ تھا جب لوگوں کو خاندانوں سے پہچانا جاتا تھا۔ مرزا رفیع سودا کو جب یہ معلوم ہوا کہ محمد میر کوئی معمولی لڑکا نہیں میر ضیاالدین کا بیٹا ہے تو وہ اور بھی مرعوب ہوا۔ میر ضیاالدین دولت مند نہیں تھے لیکن علم و فضل اور درویشی کی بدولت ان کا شمار دہلی کے معززین میں ہوتا تھا اور اتنی بات سودا بھی جانتا تھا۔

میر عطاﷲ نے درست کہا تھا کہ مرزا رفیع کا رجحان شاعری کی طرف ہے اس لیے وہ یہاں ٹکتے نظر نہیں آتے۔ ایک دن وہ آیا تو بہت جلدی میں تھا اور غالباً محمد میر ہی سے ملنے آیا تھا۔

''میں آج صرف تمہارے پاس آیا ہوں۔''

''وہ تو تم روز ہی آتے ہو۔''

''آج یہ بتانے آیا ہوں کہ بندے کا دل خوش نویسی سے بھر گیا ہے۔ جتنا سیکھ لیا وہی بہت ہے مگر تم سے ملنا بھی ضروری ہے۔ ہر شام میرے گھر پر کچھ شاعر دوست جمع ہوتے ہیں، تم بھی آجایا کرو۔''

''میں ان شاعروں میں اکیلا جاہل کیا اچھا لگوں گا؟''

''وہاں صرف شاعری نہیں ہوتی، دنیا بھر کی باتیں ہوتی ہیں۔ اچھا ہے تم سے ملاقات ہوجایا کرے گی۔''

''مجھے والد محترم سے اجازت لینی ہوگی اس کے بعد ہی کچھ کہہ سکوں گا۔''

محمد میر کے والد کی طرف سے زیادہ سختی نہیں تھی۔ انہوں نے بہ خوشی اجازت دے دی۔ شرط صرف یہ تھی کہ وہ نوکر کو ساتھ لے کر جائیں گے۔ اسے کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ اس نے ایک روز نوکر کو ساتھ لیا اور مرزا رفیع سودا کی عالی شان حویلی کے سامنے پہنچ گیا۔ نوکر، نوکروں کے درمیان بیٹھ گیا اور وہ اندر چلا گیا۔ سودا نے ٹھیک کہا تھا۔ وہاں اس وقت بھی چند شاعر بیٹھے تھے جن سے محمد میر واقف نہیں تھا۔ سودا کے بتانے پر اسے ان کے صرف نام معلوم ہوسکے۔ ایک نسبتاً بڑی عمر کے شاعر تھے جن کا نام شاہ مبارک آبرو بتایا گیا تھا۔

محمد میر یہ تمام نام پہلی مرتبہ سن رہا تھا۔ اسے ان ناموں سے کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی۔ وہ تو صرف سودا سے ملنے آیا تھا۔ کچھ دیر بعد تو اسے وحشت سی ہونے لگی تھی۔ وہ چاہتا تھا، وہاں صرف سودا ہو اور کوئی نہ ہو۔ یہ بھی آدابِ مجلس کے خلاف تھا کہ اُٹھ کر چل دے۔ جی کڑا کر کے بیٹھا رہا۔ اتنے میں کسی نے شاہ مبارک آبرو سے کلام سنانے کی فرمائش کر دی اور اسے یہ کلام بھی سننا پڑا۔

تمہارا دل اگر ہم سے بھرا ہے
تو بہتر ہے ہمارا بھی خدا ہے
ہماری کچھ نہیں تقصیر لیکن
ہمیں تم کو کہیں گے بے وفا ہے
ہوئے ہو اس قدر بے زار ہم سے
کہو ہم نے تمہارا کیا کیا ہے
وہ احمق ہے کہا ہے جس سے تم نے
ملو جس سے تمہارا دل ملا ہے
عبث بے دل کرو مت آبرو کو
مسافر ہے شکستہ ہے گدا ہے
(آبرو)

اسے اس کلام نے بہت متاثر کیا۔ سادہ سادہ شعر تھے جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔

اسے نو وارد سمجھ کر کسی نے اس سے بھی فرمائش کر دی ''حضرت کچھ آپ بھی ارشاد فرمایئے۔'' اسے اس وقت ایسی شرمندگی ہوئی جیسے کوئی ضرورت مند کچھ مانگے اور دینے والے کی جیب خالی ہو۔

''یہ شاعر نہیں ہیں۔'' سودا نے وضاحت کی۔

''کمال ہے، سودا کے دوست اور شاعری نہیں کرتے؟''

محمد میر یوں تڑپ کر رہ گیا جیسے اسے کسی نے گالی دے دی ہو۔

وہ شاعری سے نابلد تھا لیکن فنِ شعر سے ناواقف نہیں تھا۔ عربی، فارسی سے واقف تھا اور فارسی شاعری کا گہرا مطالعہ کر چکا تھا چنانچہ جب اسی نشست میں شاعری کے فن پر بات ہونے لگی تو وہ خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے اپنے مطالعے کے زور پر اس بحث میں حصہ لیا۔ تب سودا کے دوستوں کو یقین آیا کہ وہ گونگا نہیں ہے بلکہ اصرار کیا کہ وہ ان مجلسوں میں آتا رہے۔ وہ شاعر نہیں لیکن شاعروں کی اچھی رہنمائی کرسکتا ہے۔

اسے بھی اپنی حیثیت کا اندازہ ہوا اور وہ باقاعدگی سے ان محفلوں میں شریک ہونے لگا۔

ایک روز جو وہ سودا سے ملنے گیا تو سودا کہیں باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے محمد میر کو بھی مجبور کیا کہ وہ بھی اس کے ساتھ چلے۔

''جانا کہاں ہے، کچھ معلوم تو ہو؟'' محمد میر نے کہا۔

''تم نے سراج الدین خاں آرزو کا نام سنا ہے؟''

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

"سنا تو ہے اور یہ بھی سنا ہے کہ نہایت عالم فاضل شخص ہیں۔ فارسی میں شاعری کرتے تھے، اب کچھ دنوں سے اردو میں بھی شعر کہنے لگے ہیں بلکہ نئے شعرا کو اردو کی طرف راغب کرنے والے ہی وہ ہیں۔ نئے لوگوں کے لیے تربیت گاہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اصلاحِ زبان کے لیے ان کی بہت خدمات ہیں۔ جو لفظ انہوں نے متروک کر دیا بس ہو گیا۔ ولی کا دیوان دلی میں آیا اور یہاں کے شعرا نے اردو میں شاعری شروع کی تو آرزو پہلے شخص تھے جو دہلوی شعرا کی رہنمائی کے لیے آگے بڑھے۔ نہایت شفیق بزرگ ہیں۔ تمہیں یقیناً ان سے مل کر خوشی ہوگی۔"

"تمہارے تعلقات اتنے بڑے بڑے لوگوں سے ہیں؟"

"یہ تعلقات نہیں، میری تربیت کا حصہ ہیں۔ میں نے ایسے بڑے لوگوں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ خان آرزو ہی ظہور الدین حاتم ہیں، مرزا مظہر جان جاناں ہیں، شاہ مبارک آبرو ہیں، یہ سب اسی قبیل کے لوگ ہیں۔ تمہیں رفتہ رفتہ سب سے ملواؤں گا۔"

وہ آرزو کے درِ دولت پر حاضر ہوا۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ وہ میر ضیا الدین کا بیٹا ہے تو بہت خوش ہوئے۔ یہاں اس نے سودا کا کلام سودا کی زبانی پہلی مرتبہ سنا۔ غالباً وہ غزل سنانے ہی ان کے پاس آیا تھا۔

نرگس کی طرح خاک سے میری اگی ہے چشم
تک آن کے یہ حسرت دیدار دیکھنا
کھینچے تو تیغ ہے حرم دل کے صید پر
اے عشق کر بھلا، تو مجھے مار دیکھنا
ہے نقص جانِ دید ترا پر یہی ہے دھن
جی جائے یا رہے مجھے یک بار دیکھنا
اے طفل اشک ہے فلک ہشت میں یہ عرش
آگے قدم نہ رکھیو تو زنہار دیکھنا

خان آرزو نے تو سودا کی غزل کو بہت سراہا لیکن محمد میر کو یہ انداز شاعری قطعی پسند نہیں آیا۔ ان شعروں سے سودا کی علمی قابلیت تو جھلک رہی تھی لیکن جذبۂ دل ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے فارسی میں کئی ایسے شعرا کا کلام پڑھا تھا جو مشکل الفاظ استعمال کرتے تھے لیکن شاعری کی روح نظر نہیں آتی تھی۔ اس نے یہ بات سودا کو نہیں بتائی لیکن اس کا خیال تھا کہ اگر وہ غزل کے بجائے اپنے لیے قصیدے کا انتخاب کرے تو زیادہ کامیاب رہے۔۔۔۔ یہ سوچ کر اس کی آنکھیں چمکنے بھی لگی تھیں کہ اگر سودا قصیدے میں طبع آزمائی کرے تو اس کی رسائی بادشاہ تک ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد معاصر شعرا کی باتیں نکل آئیں۔ اس وقت اردو میں شاعری کرنے والے تھے ہی کتنے اور جو کہہ رہے تھے ان کی زبان معیاری نہیں تھی۔ کئی الفاظ ایسے تھے جن کا چلن تھا اور خان آرزو کے مطابق اب ان الفاظ کو متروک ہو جانا چاہیے تھا البتہ اس نے ان کی زبانی مرزا مظہر جان جاناں اور شاہ مبارک آبرو کی تعریف سنی۔ ظہور الدین حاتم کی بھی تعریف کر رہے تھے۔ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے سوچ لیا تھا کہ وہ ظہور الدین حاتم اور مرزا مظہر جان جاناں سے بھی ضرور ملاقات کرے گا۔

مرزا مظہر جان جاناں اپنے زہد و اتقا کے باعث اہلِ دہلی کی آنکھ کا تارا تھے۔ اس کے علاوہ شاعری میں بھی آپ کے اجتہادات بے شمار تھے۔

دہلی کے شعرا ولی دکنی کی تقلید کر رہے تھے۔ ولی کے کلام میں دکنی اور ہندی الفاظ کی آمیزش کے باعث زبان میں سنگی اور روانی کی کمی کا احساس ہوتا تھا۔ متروکات بھی ثقالت کا سبب بن رہے تھے۔ آرزو اور مظہر جان جاناں اس ثقالت کو دور کرنے کے لیے ہی کوشاں تھے۔ مرزا مظہر نے ہندی الفاظ متروکات کو خارج کیا اور فارسی الفاظ اور تراکیب کو رواج دے کر زبان میں نکھار اور شائستگی پیدا کی۔ ان کی پیروی میں بہت سے نوجوان بھی اپنے کلام کو صاف اور سادہ بنا رہے تھے۔

وہ اسی ملاقات میں مرزا مظہر کے کلام سے واقف ہوا جب اس نے یہ غزل سنی۔

ہم نے توبہ کی ہے اور دھوم مچاتی ہے بہار
ہائے بس چلتا نہیں کیا حیف جاتی ہے بہار
نرگس و گل کی کھلی جاتی ہیں کلیاں دیکھیو
آج پھر خوابیدہ فتنوں کو جگاتی ہے بہار
(مرزا مظہر جان جاناں)

یہ شاعری اس کے دل میں اتر گئی۔ نہ مشکل الفاظ تھے نہ دور از کار مضامین۔ باتیں دل سے نکل رہی تھیں اور دل تک پہنچ رہی تھیں۔ نہ کوئی تکلف تھا، نہ قابلیت کا اظہار۔ اس نے اسی وقت تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ان کی غزلیں سننے ان کے پاس آتا رہے گا بلکہ اس نے ان سے اجازت بھی لے لی تھی۔ پھر وہ اس قول کو نبھاتا رہا۔ گاہے گاہے ان کے پاس حاضری دیتا رہتا تھا۔

میر ضیا الدین کی صاحب سلامت شاہی امرا سے بھی تھی۔ وہ جب کسی امیر سے ملنے جاتے تو محمد میر کو بھی ساتھ لے جاتے، اس کے پیچھے یہ مقصد پوشیدہ تھا کہ وہ آدابِ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

مجلس سے واقف ہوجائے۔ امرا اور رؤسا کی محفلوں میں شریک ہونے سے اسے گفتگو کا سلیقہ آیا۔ نشست و برخاست کے طریقے سیکھتا رہا۔ گویا یہ ملاقاتیں بھی اس کی تعلیم و تربیت کا حصہ تھیں۔ اگر وہ اس معزز گھرانے کا فرد نہ ہوتا تو یہ مواقع اسے ہرگز نہ مل سکتے۔

وہ جس عہد سے تعلق رکھتا تھا اس میں جسمانی قوت، شجاعت اور بہادری کی بہت قدر کی جاتی تھی۔ تیر اندازی، تیراکی، سپہ گری، یہ ایسے فنون تھے جو معزز گھرانوں کے لڑکوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ سیکھیں۔ اس نے دراز قد نکالا تو والد نے اسے ورزش کی طرف ڈال دیا۔ بلاناغہ ورزش کرنے سے اس کا بدن سڈول اور خوبصورت ہوگیا۔ تیر اندازی اور گھڑ سواری میں بھی اس نے کمال مہارت حاصل کرلی۔ اُدھر خوشنویسی میں ایسی ترقی کی کہ خطِ نستعلیق اور خطِ شعیفا خوب لکھنے لگا۔ عربی، فارسی کی استعداد بھی خوب تھی۔ غرض وہ تمام علوم حاصل کرلیے جو معززین کے لیے ضروری سمجھے جاتے تھے۔ ایک شاعری تھی جو اس سے کئی قدم دور کھڑی تھی حالانکہ اس کا اُٹھنا بیٹھنا شاعروں میں تھا۔ سودا تو اب مشاعروں میں شریک ہوکر اساتذہ سے دادِ سخن وصول کررہا تھا۔

دوستوں کی طرف سے برابر تقاضے ہورہے تھے بلکہ طعنے سننے کو ملنے لگے تھے کہ علم کا دعویٰ کرتے ہو اور شعر نہیں کہہ سکتے۔ علم دانی کا دعویٰ ہے تو شعر کہہ کر دکھاؤ۔

اس نے ایک ایسے ماحول میں آنکھ کھولی تھی جس میں شاعری زندگی کا معمول بن چکی تھی۔ عجیب بات تھی کہ دہلی کی عظمت کو گھن لگ رہا تھا مگر شاعری اپنے دورِ شباب سے گزر رہی تھی۔ خود اس کے تمام دوست شاعر تھے۔ اس نے ان دوستوں کی خاطر شاعری کو آواز دے لی۔

صاحبو تم سے راست کہتا ہوں
شاعری سے مجھے نہیں نسبت
یار آپس میں بیٹھتے تھے کبھی
دل خوشی کو وہ بیٹھتے تھے جگت
میں انہوں میں تھا سب سے بیگانہ
وہ دلاتے مجھے بہت غیرت
کہ تجھے بات بھی نہیں آتی
ہم سے اتنی بڑھائی کیوں صحبت
یا تو ہم سے کیا کرو باتیں
یا ہمیں جانتے ہو بے غیرت
تب میں ناچار ہو کے کہنے لگا
انھی باتوں کو شعر کی صورت
بسکہ موزوں تھے وہ صاحب لوگ
مجھ کو بھی اتنی ہوگئی قدرت
کہ لگا کرنے بات کو موزوں
شاعروں میں ملی مجھے شوکت
ورنہ اس منہ پہ شاعری توبہ
وہ بھی مرزا رفیع کی دولت

قافیوں کا شعور تھا، ردیفوں کی پہچان تھی، اوزان سے واقفیت تھی، شاعروں کی صحبت اُٹھائی تھی اور پھر شاید فطرت میں قدرتی موزونیت تھی۔ اس نے شاہ مبارک آبرو کی ایک غزل سامنے رکھی اور ایک غزل نکال لی۔

کبھی کالے گیا وہ دل ربا دل
نہ پوچھو میں کہاں اور وہ کجا دل
نہ چھوڑا مرتے مرتے ساتھ اس کا
خوشا دل، دل آفریں دل مرحبا دل
کروں کس منہ سے میں تعریف اس کی
کہ جس دن سے صنم سے جالگا دل

پچھلے دنوں مرزا مظہر جانِ جاناں سے ملاقات کو گیا تھا۔ ان کی زبانی ایک غزل سنی تھی۔ اس کی طرف بھی خیال گیا اور اس زمین میں بھی شعر نکالنے کی جسارت کرلی۔

عندلیبو خوش ہو پھر گلشن میں آتی ہے بہار
گل کے تئیں خوابِ عدم سے اب جگاتی ہے بہار
گل کو چھنکار نہ پوچھو سوچنے کی بات ہے
چٹکیوں میں عندلیبو کو اُڑاتی ہے بہار
قطرۂ شبنم نہیں گرتے ہیں گل کے منہ اوپر
خواب سے غفلت کے سوتوں کو جگاتی ہے بہار
عاشقو فکر تہی دستی گرو گر شوق ہے
گل کو زر دیتی ہے جب گلشن میں آتی ہے بہار

یہ دونوں غزلیں لے کر وہ دوستوں کی محفل میں پہنچا اور سنائیں تو سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہ غزلیں پہلے پہل کہی گئی ہیں۔ فارسی تراکیب بھی استعمال کی گئی تھیں، سادگی بھی تھی، مضامین بھی نئے تھے۔ کسی کو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ غزلیں اس نے کہی ہیں لیکن جب اس کے علمی پس منظر پر نظر ڈالی جاتی تھی تو یقین کیے بغیر رہا بھی نہیں جاتا تھا۔ دوستوں کو بالآخر یہی کہنا پڑا کہ وہ [illegible] سفر کو جاری رکھے۔ وہ بنا بنایا شاعر ہے۔ خاص طور پر سودا نے اس کی خوب حوصلہ افزائی کی اور وہ بات جو محمد میر اس سے نہیں کہہ سکتا تھا سودا نے کہہ دی۔

"تمہارا مزاج غزل کے قریب ہے۔ ہمیشہ اسی صنف کو اپنائے رکھنا۔"

"اور تم غزل سے دور رہنا۔ قصیدے کو اپنانا۔" محمد میر نے وہ بات کہہ دی جو پہلے نہیں کہہ سکا تھا۔

ابھی اردو غزل کی تعمیر ہورہی تھی۔ نہ میر تقی میر سامنے آئے تھے نہ خواجہ میر درد۔ ایک سودا تھے جو غزل کے حوالے سے کوئی کارنامہ انجام دیتے نظر نہیں آرہے تھے۔ غزل اپنے شاعر کی تلاش میں تھی۔ اولیت کا سہرا شاید محمد میر کے سر بندھنے والا تھا لیکن یہ پیش گوئی فی الحال کوئی بھی نہیں کرسکتا تھا۔

دوستوں نے سمجھا تھا کہ مزاحاً کچھ غزلیں لکھ لی ہیں لیکن جب وہ باقاعدہ غزلیں لکھنے لگا تو دوستوں نے مشورہ دیا کہ وہ کسی استاد شاعر کی شاگردی اختیار کرے اور یہ غزلیں ان کے سامنے اصلاح کے لیے پیش کرے لیکن وہ اس مطالبے کو ٹالتا رہا جب اصرار بہت بڑھا تو اس نے عجیب سا جواز پیش کیا۔

"یہ غزلیں تو میری باتیں ہیں جو میں اپنے دل سے کرتا ہوں۔ بھلا باتوں کی بھی کوئی اصلاح کرتا ہے۔"

"باتیں جب شعر بن جاتی ہیں تو اصلاح کی محتاج ہوجاتی ہیں۔"

"غلط باتوں کی اصلاح کی جاتی ہے، میں غلط باتیں نہیں کرتا۔"

"برسرِ مشاعرہ کسی نے کوئی اعتراض کردیا تو جواب دینے کے لیے کوئی تو استاد ہو۔"

"واہ! یہ اچھی کہی۔ اعتراض مجھ پر ہو جواب استاد دیں۔ استاد ہوں بھی تو جواب مجھے ہی دینا ہے۔"

"اس شاعر کو شاعر ہی نہیں سمجھا جاتا جس کا کوئی استاد نہ ہو۔"

"یہ اچھی زبردستی ہے۔ پہلے آپ لوگ کہتے تھے مجھے شاعری کرنی چاہیے۔ اب شاعری شروع کردی تو اصرار ہے کہ کسی کو استاد بھی بناؤ۔"

دوست اصرار کرتے رہے لیکن اس نے اپنی طبع موزوں ہی کو استاد بنایا۔ کسی استاد کی طرف راغب نہیں ہوا حالانکہ اس کے حلقے میں جتنے شاعر دوست تھے، سب کا کوئی نہ کوئی استاد تھا۔ اور صرف اپنے حلقے ہی میں نہیں، دہلی بھر میں وہ اکیلا شاعر تھا جس کا کوئی استاد نہیں تھا۔

یہ ایسا دور تھا جب مشاعروں میں شعرا اپنے استاد کے پہلو میں بیٹھتے تھے۔ ان کے کلام میں غلطی ہوتی تو جواب دہ استاد ہوتا تھا۔ استاد کی طرف سے لڑنے والے بھی یہی شاگرد ہوتے تھے۔ جس نے کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہ کیا ہو اس کا شمار شاعروں میں ہوتا ہی نہیں تھا، لہٰذا خود کو شاعر منوانے کے لیے لوگ ضرورت بے ضرورت کسی نہ کسی کو اپنا استاد ضرور بناتے تھے۔ محمد میر نے یہ عجیب جسارت کی کہ استاد کے بغیر خود کو شاعر منوانے کا تہیہ کرلیا۔

سوانحی خاکہ

نام...... سید محمد میر
تخلص...... سوز
والد...... میر ضیاالدین
نسب...... حضرت جلال سرخ بخاری
خلیفہ ارشد حضرت بہاوالدین زکریا ملتانی
اولاد...... قدرت علی۔
میر مہدی
ولادت...... بہ مقام دہلی
سفر...... فرخ آباد، ٹانڈہ، پٹنہ، مرشد آباد، فیض آباد، لکھنو
سن ولادت...... 1712ء
وفات...... 1798ء
تدفین...... نامعلوم

شاعر منوایا بھی اور استادی کے درجے پر فائز بھی ہوا۔

ایک مرحلہ تخلص کا بھی تھا۔ یہ مسئلہ چٹکی بجاتے حل ہوگیا۔ اس نے اپنے نام کے حصے "میر" کو تخلص کے طور پر استعمال کیا۔ (اس وقت تک میر تقی میر سامنے نہیں آئے تھے)

وہ بہت سی غزلیں لکھ لکھ کر پھاڑ چکا تھا۔ طبیعت نے گواہی دے دی تھی کہ اب وہ ایسی غزلیں لکھنے لگا ہے جو حلقۂ شعرا میں سنائی جاسکتی ہیں تو وہ ایک مشاعرے میں جانے کو تیار ہوگیا۔ یہ مشاعرہ خواجہ ناصر عندلیب (خواجہ میر درد کے والد) کے مکان پر برپا ہوتا تھا۔

اس کا استاد تو کوئی تھا نہیں۔ جو کچھ تھا سودا ہی تھا۔ وہ سودا کے ہمراہ اس مشاعرے میں پہنچ گیا۔ مکان کی چھت پر جانے والا زینہ آوازوں کے شور سے بھرا ہوا تھا۔ اس کا مطلب ہے لوگ آچکے ہیں۔ اس نے سوچا اور زینہ چڑھنے لگا۔ زینے کے دوسرے کنارے پر کوئی ملازم شمع دان ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ شمع کی روشنی میں وہ دونوں زینہ طے کرکے اوپر پہنچ گئے۔

چاند کی چودھویں تھی۔ چھت پر سفید فرش اور فرش پر

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

چاند کی چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ شاہ مبارک آبرو، مصطفیٰ خان یک رنگ ظہور الدین حاتم، مظہر جان جاناں، خاکسار، عاجز، کون تھا جو یہاں نہیں تھا۔

سودا کے استاد وہاں موجود تھے۔ وہ تو ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ محمد میر نے بھی ایک گوشہ پکڑ لیا لیکن سخت گھبراہٹ طاری تھی جیسے بہت سے اجنبی اسے اٹھا کر لے آئے ہیں۔ کئی شناسا چہرے بھی تھے لیکن اسے غور سے اس لیے دیکھ رہے تھے کہ اس سے پہلے وہ کسی مشاعرے میں نہیں آیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد سودا کو اس کی حالت پر رحم آیا۔ اس نے استاد سے اجازت لی اور اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

ابھی مشاعرہ شروع نہیں ہوا تھا۔ مخالفین پر فقرے کسے جا رہے تھے۔ ایک قسم کی جگت بازی تھی جو جاری تھی۔ ایسے میں محمد میر اور سودا جو مشاعرے میں داخل ہوئے تو محمد میر کی طرف سب نے غور سے دیکھا۔ پھر یہ دیکھا کہ سودا اپنے استاد کے پاس سے اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھا تو سب کو یہ جاننے کی فکر ہوئی کہ موصوف ہیں کون؟ جو دو چار جانتے تھے، وہ چپکے رہے لیکن باقیوں میں سے کسی نے پوچھ ہی لیا۔

”آپ کی تعریف؟“

”یہ محمد میر ہیں۔ آج پہلی مرتبہ داخلِ مشاعرہ ہو رہے ہیں۔“ سودا نے اس کی طرف سے جواب دیا۔

”ماشاء اللہ! کس خوش نصیب استاد کے شاگرد رشید ہیں؟“

”یہ اپنے استاد خود ہیں۔“

”یہ کیوں نہیں کہتے کہ بے استادے ہیں۔“ اس پر ایک قہقہہ پڑا۔

”جی ہاں، استاد کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ تلمیذ الرحمٰن ہیں۔“

”اِیں...... کوئی استاد ہی نہیں۔ ارے صاحب، یہ تو پہلی مرتبہ سن رہے ہیں کہ کوئی شاعر خودرو جھاڑیوں کی طرح خود بہ خود اُگ آیا ہو اور چمن کی زینت بھی بننا چاہتا ہو۔“

مقابل سودا تھا۔ بلا کا منہ پھٹ۔ کسی نے محسوس کیا ہو نہ کیا ہو ظہور الدین حاتم نے تاڑ لیا کہ اب سودا کن لفظوں میں جواب دینے والا ہے لہٰذا انہوں نے گفتگو کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی اور سودا کے بجائے محمد میر سے مخاطب ہوئے۔

”محمد میر، میں نے تمہارے شعر سنے ہیں۔ بے شک! تمہیں کسی استاد کی ضرورت نہیں لیکن ٹھوکر لگتے دیر نہیں لگتی۔ بھری سڑک پر تماشا بننے سے بہتر ہے کہ کسی کو اپنا رہنما بنا لیا جائے۔ کسی کی باتوں کا بُرا مت منانا۔ ان لوگوں کا مطلب بھی وہی ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔“

”بہت بہتر۔ میں اس پر بھی سوچوں گا۔“

اتنی دیر میں لوگوں کے علم میں یہ بھی آ گیا تھا محمد میر، میر ضیاالدین کا بیٹا ہے۔ اس لیے بھی چلتی ہوئی زبانیں کچھ تھم سی گئی تھیں اور پھر اسی وقت خواجہ ناصر عندلیب داخلِ مجلس ہوئے۔ حاضرین نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔

”سب لوگ آ گئے ہوں تو مشاعرے کا آغاز کیا جائے۔“

”جی ہاں، سب آ چکے۔ اب مشاعرہ شروع کیا جا سکتا ہے۔“

صفیں ترتیب دے دی گئیں۔ ہر ایک کو اپنے اپنے مقام پر بٹھایا گیا۔ ان میں ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا بھی آ کر بیٹھ گیا۔ یہ خواجہ ناصر عندلیب کا بیٹا خواجہ میر درد تھا۔ مچھلی کے جائے کو کون تیرنا سکھائے۔ اس عمر میں شعر نکالنے لگا تھا اور مشاعروں میں شریک ہوتا تھا۔ صاحب خانہ تھا اس لیے آغاز اسی سے ہوا۔ شمع محفل اس کے سامنے گئی اور اس نے مطلع پڑھا۔

زلفوں میں کسو کی جو گرفتار نہ ہوتا
کچھ کام مجھے تجھ سے شب تار نہ ہوتا

مطلع کا پڑھا جانا تھا کہ مشاعرہ جاگ گیا۔ ہر طرف سے داد و تحسین کا شور بلند ہوا۔

اس نے شعر پڑھا۔

مرنا ہی لکھا ہے مری قسمت میں عزیزاں
گر زندگی ہوتی تو یہ آزار نہ ہوتا

اس شعر نے بھی قیامت ڈھا دی۔ کچھ تو یہ احساس کہ موصوف ناصر عندلیب کے بیٹے ہیں۔ کچھ نوعمری۔ کچھ اشعار بھی ایسے کہ اپنی داد خود لے رہے تھے۔ تعریفوں کے اسی شور میں اس نے غزل ختم کر دی۔

شمع محفل محمد میر کے سامنے آئی۔ اتفاق دیکھیے کہ پچھلے دنوں کہیں طرحی مشاعرہ ہوا تھا۔ محمد میر نے بھی مصرع طرح پر غزل کہہ رکھی تھی۔ یہی غزل جیب میں پڑی تھی۔ اس نے کسی طرف دیکھے بغیر نظریں جھکائے جھکائے مطلع پڑھا۔

زلفوں سے اگر مجھ کو سروکار نہ ہوتا
یاں تک تو پریشان میں اے یار نہ ہوتا

یہ معلوم ہوا جیسے سب کے گلے بیٹھ گئے ہوں۔ ایک دو نے واہ کی صدا بلند کی اور پھر خاموشی۔

اس نے شعر پڑھا۔

خوگر جو مداوے سے طبیب اپنے کو پاتا
تو زیست سے مایوس یہ بیمار نہ ہوتا

یہ شعر بھی سپاٹ گیا۔ البتہ آخری دو شعروں کو خوب سراہا گیا۔

اسرار سے کعبہ کے خبر شیخ جو رکھتا
بت خانے سے ہرگز اسے انکار نہ ہوتا
کیا نور بھر آن کے یاں لطف اٹھاتا
دنیا میں اگر کوئی طرح دار نہ ہوتا

شمع محفل گردش کرتی رہی۔ اشعار رقص کرتے رہے، داد کے ڈونگرے برستے رہے۔ محمد میر کو یہ سب دور کی آوازیں معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ مطمئن نہیں تھا۔ یہ احساس فزوں سے فزوں تر ہوتا جا رہا تھا کہ جو پذیرائی میری ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہوئی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ کسی طرف سے کوئی اعتراض نہیں اُٹھا۔ اسی اطمینان کو ساتھ لے کر وہ مشاعرے سے اُٹھا۔

”تم نے غزل کا انتخاب ٹھیک نہیں کیا۔ جب میر درد اس زمین میں غزل پڑھ چکے تھے تو تمہیں کوئی دوسری غزل پڑھنی چاہیے تھی۔“ سودا نے راستے میں اس سے کہا۔

”میر درد کی غزل کے بعد میں جو بھی پڑھتا اس کا حال یہی ہونا تھا۔“

”وہ تم سے کم عمر تھے اس لیے؟“

”نہیں، وہ میزبان تھے اس لیے۔“

”خیر، تم دل چھوٹا مت کرو۔ شہر میں اور مشاعرے بھی ہوتے ہیں۔“

مشاعروں کی اس شہر میں کمی نہیں تھی۔ ہر شب کہیں نہ کہیں مشاعرے جمتے تھے۔ وہ اب ان مشاعروں میں باقاعدگی سے شریک ہونے لگا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی شاعری کے قدردان بھی پیدا ہونے لگے تھے۔ سودا کے مقابلے میں اسے غزل گو تسلیم کر لیا گیا تھا۔

اس مقبولیت پر پہنچ کر اس نے شعر خوانی کا ایک ایسا طرز ایجاد کیا جو دلی بھر میں کسی کو نصیب نہیں تھا بلکہ ہندوستان بھر میں اس کی دوسری مثال نہیں مل سکتی تھی۔

یہ فن اس نے عربی فنِ شاعری سے ماخوذ کیا اور اسے اس کمال پر پہنچا دیا کہ کوئی اس کی نقل بھی نہ کر سکا۔ یہ فن اس نے ایجاد کیا اور اسی پر اس کا خاتمہ ہو گیا۔

عربی زبان میں ایک اصطلاح ہے ”انشاد“ اس کے معنی ہیں فن شعر خوانی۔ شعرائے عرب میں اس کا رواج تھا۔ شعر کو اس طرح پڑھنا کہ مضمون کی تصویر کھنچ جائے۔ اس نے بھی اسی طرز کی مشق کرنی شروع کی۔ آئینہ سامنے رکھ کر گھنٹوں مشق کرتا رہتا۔ رفتہ رفتہ ایسی مشق فراہم کر لی کہ شعر پڑھتے وقت ہاتھ، آنکھ بلکہ تمام اعضا حرکت میں آ جاتے۔ جو لفظ شعر میں آتا اس کی تصویر بنا کر دکھا دیتا مثلاً شمع کا مضمون آیا تو پڑھتے وقت ایک ہاتھ سے شمع دوسرے ہاتھ کی اوٹ سے وہیں فانوس بنا کر دکھاتا۔ مرنے کا مضمون آتا تو وہیں لیٹ جاتا۔ زندہ پر مردے کا گمان ہوتا۔

اب جو وہ ایک مشاعرے میں پہنچا اور اشعار پڑھے۔

او مارِ سیاہِ زلف کچھ کہہ
بتلا دے دل جہاں چھپا ہو
کنڈلی تلے دیکھیو نہ ہووے
کاٹا نہ افعی ترا برا ہو

پہلے مصرع پر ڈرتے ڈرتے جھکا گویا کنڈلی تلے دیکھنے کو جھکا ہے اور جس وقت کہا ”کاٹا نہ افعی“ بس دفعتاً ہاتھ کو چھاتی سے مسوس کر ایسے بے اختیار لوٹ گیا کہ لوگ گھبرا کر سنبھالنے کو کھڑے ہو گئے۔

یہ انداز نیا بھی تھا اور دلچسپ بھی۔ یہ تو تھا فنِ شعر خوانی لیکن اس پر اس کی شعری بھی جاندار تھی۔ زبان کی سادگی اور مافی الضمیر کو سیدھے سادے انداز میں بیان کرنے میں کوئی اس کا ثانی نہیں تھا۔ تصوف اس دور کا مروجہ مضمون تھا۔ اس چاشنی سے بھی اس کا کلام خالی نہیں تھا۔

جب کچھ ہی ہم بوجھ چکے سارے جہاں کو
غم ہیچ، ستم ہیچ، طرب ہیچ، عطا ہیچ

معاملات حسن و عشق سے بھی اس کا کلام خالی نہیں تھا جو ہر دور کا سدا بہار موضوع رہا ہے۔

زلفوں کا منہ پر ڈھانپنا ہونٹوں کا ہر دم چبانا
ہر کوئی رکھتا ہے جگر اتنی بلا یک جا نہ کر

شوخی اور ظرافت تو اس پر ختم تھی۔

کہتا ہوں میں کہ میری تو [illegible] بھی بتا
کہتا ہے ہوئی ہے مری تجھ پر زبان صاف

ایک اور نئی ادا اس نے یہ نکالی کہ شاعری میں عاشق و معشوق کے مکالمے باندھے۔ یہ اس وقت تک بالکل نئی بات تھی۔ بعد میں اسی کی تقلید کرتے ہوئے لکھنؤ کے کئی شعرا نے اس انداز کی شاعری کی۔

میں کہا اب آج یاں رہیے تو یوں بولا وہ شوخ
رات کے رہنے سے میرے مدعا، مطلب، غرض

میں کہا اس شوخ سے ہم بھی کبھی ہوں شادماں
ہنس کے یوں بولا ”دلِ عاشق تو غمگیں چاہیے“

یہ شوخی، یہ ظرافت، یہ مکالماتی انداز اور اس پر مصفا اردو اور بھاؤ بتا کر پڑھنے کا انداز انوکھا۔ ایک اکیلے اس کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

دم سے مشاعروں کی گرم بازاری ایسی بڑھ گئی کہ وہ جس مشاعرے میں پہنچ جاتا سننے والوں کے ٹھٹ لگ جاتے۔ پہلے صرف شعرا شریک ہوتے تھے اس کی آمد سے صاحبانِ ذوق بھی مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔

☆☆☆

بیس بائیس سال کی عمر تھی کہ والد کو اس کی ملازمت کی فکر ہوئی۔ تیر اندازی، سپہ گری اور شہ سواری کے فنون میں مہارت حاصل کرلی تھی۔ فوج کی ملازمت کے لیے یہی فنون درکار ہوتے ہیں۔ معزز گھرانوں میں یہی ملازمت درکار ہوتی ہے۔ اس نے محمد شاہی فوج میں شمولیت اختیار کرلی۔ وہ شاہی توپ خانے میں شامل ہوگیا۔

اس ملازمت کے بعد اس کی اہمیت وعزت میں مزید اضافہ ہوا۔ امرائے وقت سے میل جول میں بھی اضافہ ہوا۔ امرا کے گھروں پر ہونے والے مشاعروں میں اس کا توتی بولنے لگا تھا۔ اب اس کے معاصرین ہی نہیں اساتذۂ وقت بھی اس کی اہمیت کو تسلیم کررہے تھے۔ یہ اس کی غزلوں پر غزلیں لکھ کر اسے عزت بخش رہے تھے۔ اب وہ محض شاعر نہیں تھا بلکہ دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ غزل کا جو محل تعمیر ہورہا ہے، اس کا ایک ستون وہ بھی ہے۔

محمد میر سات سال کا تھا جب محمد شاہ بادشاہ اٹھارہ سال کی عمر میں دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ اس وقت سادات بارہہ کے سیّد برادران بادشاہ گر کہلاتے تھے۔ انہوں نے ہی شہزادہ روشن اختر کو محمد شاہ کے لقب سے مسند شاہی پر بٹھایا تھا لیکن وہ ان کی توقعات پر پورا نہیں اترا۔ سیّد برادران کو ہی ختم کردیا۔

محمد میر اپنے بچپن میں ان شورشوں کو دیکھتا رہا تھا۔ اس نے وہ جنگ بھی دیکھی تھی جو محمد شاہ اور سیّد برادران کے درمیان ہوئی تھی اور اب وہ محمد شاہی فوج میں شامل تھا۔

سیّد برادران کا استحصال محمد شاہ کا بڑا کارنامہ تھا لیکن امن وسکون ہوتے ہی وہ خوشامدی امرا کے ہتھے چڑھ گیا اور حکومت سے غافل ہوکر عیش وعشرت میں پڑ گیا اور عوام کی نظروں میں محمد شاہ رنگیلا کہلایا جانے لگا۔ اس افراتفری نے نادر شاہ کو موقع دے دیا اور وہ ہندوستان پر چڑھ آیا۔ محمد شاہ بھی اپنی فوجیں لے کر پانی پت کی طرف چلا۔ محمد میر بھی شاہی توپ خانے کے ساتھ اس لشکر میں شامل تھا۔ یہ جنگ معمولی سی جھڑپ سے آگے نہیں بڑھی۔ محمد شاہ کو گفت وشنید کا سہارا لینا پڑا۔ صلح ہوگئی اور نادر شاہ، محمد شاہ کے مہمان کی حیثیت سے دہلی میں داخل ہوا۔

جنگ کا خطرہ ٹل گیا تھا۔ محمد میر بھی اپنے مکان واقع قرول باغ میں آیا اور ہتھیار کھول دیے۔ میر ضیا الدین نے شکر بھیجا کہ محمد شاہ کی مصلحت سے خطرہ ٹل گیا۔ بیٹا بھی زندہ سلامت گھر پہنچ گیا ہے۔

نادر شاہ قلعے میں تھا اور اس کے سپاہی گشت پر شہر کی طرف نکلے ہوئے تھے کہ کسی نے اس کے سپاہیوں پر گولی چلادی۔ کئی سپاہی مارے گئے۔ پھر دوسروں کی بھی ہمت ہوئی اور ایک بلوا سا برپا ہوگیا۔

یہ خبر جب نادر شاہ کو پہنچی تو پہلے تو اسے یقین نہیں آیا لیکن جب تصدیق ہوگئی تو وہ گھوڑے پر سوار ہوکر نکلا۔ قزلباش سپاہی اس کے اردگرد موجود تھے۔ جامع مسجد کے پاس پہنچا تھا کہ کسی نے اس پر فائر کیا۔ وہ بچ گیا لیکن اس کے غیظ وغضب کی انتہا نہ رہی۔ خود تو جامع مسجد میں جاکر بیٹھ گیا اور اپنی فوج کو قتلِ عام کا حکم دے دیا۔

حکم ملتے ہی نادری فوج نے کشتوں کے پشتے لگادیے۔ جو نظر آیا قتل ہوا۔ سیکڑوں مکانوں کو آگ کا ایندھن بنادیا۔ جتنے میدان جنگ میں نہ مرے شہر میں مرگئے۔ محمد شاہی فوج میں اتنی سکت کہاں تھی کہ شہریوں کی جان بچاتی۔

شام ہوئی اور خون بہانے کو کوئی نہیں بچا۔ کتے بلیاں لاشوں کو بھنبھوڑتے پھرتے تھے کہ نظام الملک وزیر اعظم اور قمرالدین خاں نائب وزیر اعظم مسجد میں آئے اور منت سماجت کرکے نادر شاہ سے قتلِ عام کا حکم واپس کرایا۔

کئی دنوں تک لاشیں دفن کی اور جلائی جاتی رہیں۔

نادر شاہ نے ستاون دن دہلی میں قیام کیا۔ رخصت ہوا تو اس شان سے کہ اسّی کروڑ کا مالِ غنیمت اپنے ساتھ لے کر گیا۔

محمد میر قیدی بنا اپنے گھر میں پڑا تھا۔ سانحہ ایسا تھا کہ ماتم سے بھی یہ داغ دھل نہیں سکتا تھا۔ خبریں دیواریں پھلانگ کر گھروں میں داخل ہورہی تھیں۔ وہ ڈرتے ڈرتے گھر سے باہر نکلا۔ لوگ چل پھر رہے تھے لیکن انہیں زندہ کہنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ وہ گھبرا کر لوٹ آیا۔

پھر خبر آئی کہ نظام الملک پایہ تخت کی ابتری دیکھ کر دکن چلا گیا۔ وزارت کا منصب قمرالدین خاں کو ملا۔ وہ باحوصلہ اور باتدبیر شخص تھا۔ اس نے محمد شاہ کا حوصلہ بحال کیا اور منتشر فوجوں کو جمع کرنے کا کام شروع کردیا۔ محمد میر بھی اپنی ملازمت پر چلا گیا۔

دہلی کی رونق رفتہ رفتہ بحال ہونے لگی۔ کسی رئیس نے ایک مشاعرہ بھی کر ڈالا۔ شاعر جمع ہوئے تو ایک ایک کا منہ تکتے تھے کہ کیا پڑھیں اور کس منہ سے پڑھیں۔ کلام کیا پڑھنا تھا، دل ہلکا کرنا تھا۔ شہرِ آشوب پڑھے گئے، شہر کے لٹنے کے مرثیے سنائے گئے۔ محمد میر نے بھی وارداتِ قلبی کو اس طرح بیان کیا۔

کون سنتا ہے کسی کا حالِ دل کس سے کہیں
سچ ہے دنیا میں نہیں کوئی کسی کا آشنا
جب تلک تھا کروفر کہتے تھے ہم مخلص ہیں سب
جب کمی پر آگئی پھر کون کسی کا آشنا
حیف کیا باطل گئے اوقات اپنی عمر کے
ہائے اس دشمن کا جانا اپنا پیارا آشنا
اے خدائے جرم بخشا اے علیم واے خبیر
مرتے مرتے تو مجھے کر اپنے در کا آشنا

آہستہ آہستہ محمد شاہ کی دل گرفتگی نے صحت پائی اور وہ امورِ مملکت کی طرف راغب ہوا۔ حالات اس کے حق میں نہیں تھے لیکن رعایا نے یہی جانا کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بے فکروں کی بھیڑ جمع ہونے لگی۔ بازاروں کی رونق بڑھنے لگی۔ دہلی والے بڑے جی دار تھے۔ کچھ دن نہیں گزرے تھے کہ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ کوئی نادر شاہ بھی یہاں آیا تھا۔

یہی وہ دن تھے جب میر تقی میر آگرہ سے چلے اور دہلی آکر سراج الدین علی خاں آرزو کے مہمان بنے۔ آرزو ایک نام نہیں ایک مکتب تھا۔ وہ گھر بیٹھے سیکڑوں کی تربیت کررہے تھے۔ پھر میر تو ان کا بھانجا تھا۔ سوتیلا سہی تھا تو بھانجا۔ انہوں نے اس کی تربیت شروع کردی۔ معلوم ہوا بھانجے موصوف شاعری بھی فرماتے ہیں۔ کلام سنا تو دل باغ باغ ہوگیا۔ یہ سن اور ایسا کلام۔ قیافے سے معلوم کرلیا کہ وہ آسمانِ ادب پر ستارہ نہیں، چاند بن کر چمکے گا۔

فرمایا ”تخلص کیا کرتے ہو؟“

”محمد تقی نام ہے۔ میر تخلص اختیار کیا ہے۔“

”اس تخلص کے ایک شاعر دہلی میں پہلے سے موجود ہیں اور ادبی حلقوں میں بہت جانے پہچانے ہیں۔ بہتر ہے کہ تم تخلص بدل لو۔“

”واہ صاحب! کل کلاں کو آپ کہہ دیں گے محمد تقی نام کے بہت سے لوگ دہلی میں رہتے ہیں، تم اپنا نام بھی بدل لو۔“

”نام کی بات اور ہے، تخلص کی بات اور ہے۔ تخلص مقطع میں استعمال ہوتا ہے۔ اسے سن کر خواہ مخواہ لوگوں کو التباس ہوگا کہ یہ کس ”میر“ کا شعر ہے۔ میر تقی میر کا یا محمد میر کا؟“

”میرا شعر خود بتائے گا کہ میں میر تقی میر کا شعر ہوں۔ میرا تخلص میری جاگیر ہے۔ میں اس سے دست بردار نہیں ہوسکتا۔ ان صاحب سے کہیے اپنا تخلص بدل لیں۔“

معاصرینِ سوز

مرزا محمد رفیع سودا، میر عبدالحئی تاباں، خواجہ میر درد، میر تقی میر، شیخ قائم الدین قائم، انعام اللہ خان یقین، اشرف علی فغاں، جعفر علی حسرت، شاہ مبارک آبرو، مظہر جان جاناں، محمد شاکر ناجی، ظہور الدین حاتم، جرأت، انشاء، رنگین، مصحفی۔

تلامذۂ سوز

نواب آصف الدولہ، نواب محمد یار خاں امیر، میر شیر علی افسوس، محمد تقی خان ترقی، میر مہدی داغ، نواب مہرباں خاں رند، سید قدرت علی طپاں، مرزا حسین رضائی عیش، گنا بیگم شوخ، میر یحییٰ خاں مدہوش، شمس الدین سوزاں، موتی لال حیف، لالہ صاحب رائے فریاد، شمسی الدین ہوش۔

”یہ تو ناانصافی ہوگی۔ وہ صاحب کچھ نہیں تو تم سے بارہ سال بڑے ہوں گے۔ انہوں نے شاعری شروع کی ہوگی تو آپ پتنگ اُڑاتے پھرتے ہوں گے۔“

”اب ان سے کہیں وہ پتنگ اُڑائیں۔ یہ میر تقی میر کا عہد ہے۔“

”چھوٹے منہ سے تم بڑی بات کہہ گئے ہو۔“

”باتیں ہماری یاد رہیں گی، باتیں نہ ایسی سنیے گا۔“ میر تقی میر نے کہا اور ماموں کے سامنے سے ہٹ گیا۔

خان آرزو نے سن رکھا تھا کہ میر کے دماغ میں کچھ خلل آگیا ہے۔ اس کا مظاہرہ وہ اس وقت دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے زیادہ زور دینا مناسب نہ سمجھا۔

کچھ دن نہیں گزرے تھے کہ خان آرزو کے کوئی ملاقاتی آئے۔ ان سے کسی بات پر اُلجھ پڑا۔ بات بڑھتی گئی اور وہ بک گیا جنوں میں کیا کیا کچھ۔ خان آرزو اس وقت تک تو چپ ہوگئے لیکن ان کے جانے کے بعد دسترخوان بچھا۔ ماموں اور وہ آمنے سامنے بیٹھے تو ماموں نے اصلاح کی غرض سے نصیحت کی۔ وہ بھلا کب کسی کی سننے والا تھا۔ نوالہ دسترخوان پر رکھا اور دامن جھاڑ کر اُٹھ گیا۔ صرف دسترخوان ہی نہیں، مکان بھی چھوڑ دیا۔

میر کے والد علی متقی کی سفارش دلی میں بھی چلتی تھی۔ بہت سے لوگ تھے جو انہیں اپنا محسن سمجھتے تھے۔ انہی کے حوالے سے اس کی رسائی بھی وزیر اعظم قمرالدین خاں کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

داماد نواب رعایت خاں تک ہوگئی۔ وہ نواب رعایت خاں کے مصاحبین میں شامل ہوگیا۔ اب اس پر کریلا اور نیم چڑھا کی مثال صادق آنے لگی۔ اپنی شاعری پر ایسا ناز ہوا کہ شمشیر برہنہ بن گیا۔ مشاعروں میں جا نکلتا تو کسی کو خاطر ہی میں نہ لاتا۔ سودا اور درد کے سوا کسی کو شاعر ماننے ہی کو تیار نہ تھا۔ کچھ اس کی لاجواب شاعری، کچھ نواب رعایت خاں کی مصاحبی، لوگ اس سے مرعوب ہوکر اس کے ناز اٹھاتے تھے۔

یہ داستانیں محمد میر تک بھی پہنچیں۔ اسے کسی نے بتایا کہ آپ میر تخلص کرتے ہیں۔ اس تخلص کا ایک اور شاعر دہلی میں آگیا ہے۔ اس نے میر تقی میر کو کسی سے کہلوایا کہ میں میر تخلص کرتا ہوں اس لیے آپ کو چاہیے کہ آپ کوئی اور تخلص اختیار کریں۔ پھر ایک مشاعرے میں آمنا سامنا بھی ہوگیا۔ میر نے اسے بھی وہی جواب دیا جو وہ خان آرزو کو دے چکا تھا۔

”میرا شعر خود بتائے گا کہ میں کس میر کا شعر ہوں۔ میر تقی میر کا یا محمد میر کا؟“

محمد میر نے جب دیکھا کہ یہ شخص تخلص پر قبضہ ہی کر چکا ہے تو اس نے کسی تنازع میں پڑنے کے بجائے یہی بہتر سمجھا کہ ”میر“ کا ہم وزن کوئی تخلص اختیار کرلیا جائے تاکہ جتنی غزلیں وہ کہہ چکا ہے ان میں میر کے بجائے نیا تخلص لکھ لیا جائے، شعر بدلنا نہ پڑے۔ غور و فکر کے بعد اس نے ”سوز“ تخلص اپنے لیے تجویز کرلیا جو میر کا ہم وزن تھا، کئی دن تک وہ اپنے مقطعوں میں میر کاٹ کر سوز لکھتا رہا۔ اب وہ مشاعروں والوں کے لیے میر سوز ہوگیا۔

تخلص کی اس تبدیلی کا قصہ میر تقی میر تک پہنچا تو بہت ہنسے ”سوز گوز کیا تخلص رکھا ہے۔“ ایک شخص میر تقی میر کے پاس ایسا بھی بیٹھا تھا جو میر سوز کی صحبت میں بھی بیٹھتا تھا۔ وہ وہاں سے اُٹھا اور میر سوز کی خدمت میں پہنچ گیا اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔

”ابھی میر صاحب کی طرف سے چلا آرہا ہوں۔ آپ کا تخلص سن کر بہت ہنس رہے تھے۔ کہتے تھے یہ کیا تخلص رکھا ہے سوز گوز۔“

”کوئی مضائقہ نہیں۔ اب کسی مشاعرے میں آمنا سامنا ہو تو مجھ سے یہی قصہ بیان کرنا۔ بس ان کا نام مت لینا، بس یہی کہنا کہ کوئی صاحب کہتے ہیں۔“

چند روز بعد کہیں مشاعرہ ہوا۔ میر سوز بھی آئے بیٹھے تھے اور میر تقی میر بھی اپنی مخصوص وضع میں موجود تھے۔ اس شخص نے جسے سب کچھ سکھا دیا گیا تھا، بہ آواز بلند پوچھا ”حضرت، آپ کا تخلص کیا ہے؟“

میر سوز نے جواب دیا ”صاحب، فقیر نے تخلص تو میر کیا تھا مگر وہ میر تقی میر صاحب نے پسند فرمایا۔ فقیر نے خیال کیا کہ ان کے کمال کے سامنے میرا نام نہ روشن ہو سکے گا۔ ناچار سوز تخلص کیا۔ اب سنتا ہوں وہ صاحب گوز کرتے ہیں۔“

یہ سننا تھا کہ مشاعرہ زعفران زار بن گیا۔ لوگوں نے فرمائش کر کے اس جملے کو بار بار سنا۔ میر صاحب غصے میں اُٹھ کر چلے تو گئے لیکن یہ جملہ اپنے ساتھ لیتے گئے۔ میر صاحب کی ابھی ابتدا تھی اور سوز درجہ استادی پر فائز تھے اور ایسے معتزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے کہ ہر جگہ عزت سے بٹھائے جاتے تھے۔ میر کے دل میں کدورت تو آگئی تھی لیکن ان کی استادی کو تسلیم کرتے ہی بنی۔

ایک روز ایک مشاعرے میں جب شمع محفل گردش کرتی ہوئی میر سوز کے سامنے آئی تو میر تقی میر نے چوٹ کرتے ہوئے کہا ”پڑھیئے صاحب، کچھ تماشا ہی سہی۔“

میر سوز نے غلط انداز نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور یہ قطعہ پڑھا۔

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے
سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے
وہاں دیکھے کئی طفل۔ پری رو
ارے رے رے ارے رے رے

قطعے میں کچھ بھی نہیں تھا لیکن چوتھا مصرع پڑھتے پڑھتے وہیں زمین پر گر پڑے۔ گویا پری زادوں کو دیکھتے ہی دل بے قابو ہوگیا اور ایسے نڈھال ہوئے کہ ارے رے کہتے کہتے غش کھا کر بے ہوش ہوگئے۔

کھڑے ہوئے اور پھر کہا ”حضور نے تماشا دیکھا؟“ اور پھر یہ قطع پیش کیا۔

بہ وقت نزع بولا سوز رو کر
سنا کر اپنے سبب خور دوکلاں کو
سبھا کے صاحبو صاحب سلامت
چلے ہم سیدھے اب دارالاماں کو
یہ اپنا جھونپڑا رکھ او پڑوسن
نہ جاوے کیا کریں دیکھا جہاں کو

یہ قطع کچھ اس انداز سے پڑھا کہ لوگ جو پہلے سے محو ہو رہے تھے، زیادہ محو ہوئے اور اس کے مزے میں ایسے بے خود ہوئے کہ سوز نے جریب سنبھالی اور گھر کی راہ لی۔ کسی کو یہ ہوش بھی نہ رہا کہ سوز اُٹھ کر جا بھی چکا۔

میر تقی میر کو بھی اب بیٹھنے کا یارا کہاں تھا۔ وہ بھی یہ کہہ کر اُٹھ گیا کہ اب کہاں کا جلسہ کیسا مشاعرہ۔ سوز کو میں نے پادشاہ شاعر تسلیم کیا۔

☆☆☆

مرکز کی کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے صوبوں نے خود مختاری اختیار کی اور مطلق العنان بن بیٹھے۔ نظام الملک نے حیدرآباد کی داغ بیل ڈالی۔ بنگال بھی مرکز سے الگ ہوگیا۔ اودھ کا صوبہ بھی برائے نام وابستگی کا دم بھرتا رہا۔ روہیل کھنڈ میں علی محمد خاں نے روہیلہ حکومت قائم کرلی۔ بنگش پٹھانوں نے فرخ آباد کو اپنا مستقر بنا کر اپنا الگ دربار لگا لیا۔ سکھوں، جاٹوں اور راجپوتوں کی بن آئی۔ ہر طرف سرکشی اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوگیا۔

ابھی بے فکری کے جلسوں کو برپا ہوتے ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ نادر شاہ کے قتل کے بعد اس کے ایک جرنیل احمد شاہ ابدالی نے ہاتھ پاؤں نکالے۔ وہ سرزمین ہند کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اہلِ دہلی ابھی نادر شاہ درانی کی خوں ریزی کو بھولے نہیں تھے۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ محمد شاہ ان دنوں بیمار تھا۔ حکیموں نے تجویز کیا کہ وہ جنگ کی سختیاں جھیلنے کے لائق نہیں۔

”ہم کیا کریں۔ کوئی اور صورت بھی تو نہیں۔ ابدالی فوجیں لاہور کے دروازے پر دستک دے رہی ہیں۔ دروازہ کھلتے دیر نہیں لگے گی اور پھر دہلی کون سی دور رہ جائے گی۔“ اس نے زرنگار چھت کو گھورتے ہوئے کہا جیسے وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔

محمد شاہ کو دیوان خاص میں پہنچا دیا گیا جہاں عمائدین اس صورتِ حال پر غور کرنے کے لیے موجود تھے۔

”ہم فرمان شاہی کے منتظر ہیں۔“

”ابدالی کا راستہ ضرور روکنا ہے۔ ہماری صحت اس لائق نہیں۔ شہزادہ احمد شاہ اس لشکر کی سربراہی کریں گے۔ اعتماد الدولہ قمرالدین خاں اور نواب رعایت خاں شہزادے کے ساتھ ہوں گے۔“

میر تقی میر سپاہی پیشہ نہیں تھا لیکن نواب رعایت خاں کی مصاحبی میں اسے بھی لشکر کے ساتھ ہونا پڑا۔ میر سوز شاہی توپ خانے میں شامل تھا۔ اسے تو جانا ہی تھا۔

احمد شاہ درانی (ابدالی) لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد سارے علاقے کو پامال کرتا ہوا ستلج کے کنارے پہنچ گیا۔ شہزادہ احمد شاہ نے جرأت سے کام لیا اور دریا کو پار کر کے سرہند پر قبضہ کرلیا۔

دن پر دن گزرتے جا رہے تھے۔ شاہی لشکر خندقیں کھود کر محصور ہو گیا تھا۔ بیس پچیس دن گزر گئے۔ تیروں اور گولوں کی بارش ہوتی رہی لیکن کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ ایک نقصان عظیم الشان ہوگیا۔ دشمن کی طرف سے ایک گولہ آیا اور اتفاق سے قمرالدین خاں کے خیمے میں آکر گرا جس سے وہ جاں بحق ہوگئے۔ ان کے مرنے کے بعد افراتفری ہونا لازمی تھی لیکن فتح مقدر میں تھی۔ اس طرف سے توپیں چلیں۔ ایک گولا احمد شاہ ابدالی کے بارود خانے میں جا کر گرا۔ میدان میں آتش بازی کا میلہ لگ گیا۔ آگ ایسی تھی کہ بجھنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ ایک ہزار سپاہی جل کر مر گئے۔ مجبوراً احمد شاہ ابدالی کو میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔

اتفاقات تھے کہ دامن نہیں چھوڑ رہے تھے۔ احمد شاہ فتح کے شادیانے بجاتا ہوا دہلی کی طرف لوٹ رہا تھا کہ پانی پت کے قریب پہنچ کر یہ خبر ملی کہ دہلی میں محمد شاہ کا انتقال ہوگیا۔

میر سوز بھی اس فاتح لشکر کے ساتھ دہلی پہنچ گئے۔

احمد شاہ بادشاہ بن گیا لیکن صفدر جنگ سے چپقلش شروع ہوگئی اور اس نے صفدر جنگ کو برطرف کر کے عماد الملک کو وزیراعظم بنا دیا۔ احمد شاہ کو جلد اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ اب جو اس نے عماد الملک کو ہٹانا چاہا تو اس نے اپنا اقتدار بچانے کے لیے احمد شاہ کو اندھا کرا دیا اور اس کی جگہ جہاندار شاہ کے لڑکے عزیز الدین کو عالمگیر ثانی کے لقب سے تخت پر بٹھا دیا اور خود سیاہ و سفید کا مالک بن گیا۔ اس حرکت سے لازماً دو گروہ سامنے آگئے۔ سازشوں اور شورشوں نے دہلی کے حالات خراب کر دیے۔

میر سوز شاہی توپ خانے میں ملازم تھا اور شاہی توپ خانہ شجاع الدولہ کے ماتحت تھا۔ شجاع الدولہ اور عماد الملک میں اچھے تعلقات نہیں تھے اس لیے پُرانا عملہ برخاست کر دیا گیا۔ یہ اندیشہ بھی تھا کہ پُرانے عملے کی پکڑ دھکڑ بھی کی جائے گی۔ شاہی ملازموں پر گھبراہٹ طاری ہونا لازمی تھی۔

سوز ان حالات سے ایسا دل گرفتہ ہوا کہ دہلی کی زمین اسے تنگ معلوم ہونے لگی۔ سودا کا ممدوح عماد الملک تھا۔ سودا نے لاکھ چاہا کہ وہ عماد الملک سے کہہ کر سوز کے لیے نئی ملازمت کا بندوبست کردے اور اسے دہلی سے جانے سے روک سکے لیکن دہلی کی زمین اس پر تنگ ہونا شروع ہوگئی تھی۔ سوال صرف یہ تھا کہ کہاں جایا جائے۔

اسے فرخ آباد کی یاد آئی۔ ریاست کی منصرم مہربان خاں رند تھے۔ جب وہ دہلی میں تھے تو سوز سے ان کی ملاقاتیں رہی تھیں۔ اس بُرے وقت میں وہی یاد آئے اور اس نے فرخ آباد کے لیے رختِ سفر باندھا۔ وہ فرخ آباد پہنچا تو مہربان خاں رند نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

رند نے اسے اپنی خوش خبری سمجھی کہ سوز اس کے پاس چلا آیا ہے۔ فنِ شاعری میں استفادہ کرنے کے لیے اسے ایسے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہی استادِ فن کی ضرورت تھی۔

یہاں اس کی ایسی پذیرائی ہوئی کہ پچھلے سارے دکھ بھول گیا۔ ریاست کے منصرم کا استاد تھا اور شاگرد بھی ایسا ملا تھا کہ دن رات قدر دانی کے سکے نچھاور کرتا رہتا تھا۔

دو سال بعد احمد شاہ ابدالی نے پھر ہندوستان کا رُخ کیا۔ عماد الملک نے پانچ لاکھ تاوان کی رقم پر اس کا راستہ روکا لیکن اتنی بڑی رقم وہ خود فراہم نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ابدالی سے مہلت مانگی کہ وہ یہ رقم دو آبے سے وصول کر کے اس کے حوالے کر دے گا۔

رقم کی وصولی کے لیے جب وہ دورے پر نکلا اور فرخ آباد آیا تو سودا بھی اس کے ساتھ تھے۔ دونوں دوست کم از کم دو سال بعد ملے تو فرخ آباد کا منظر ہی دوسرا ہو گیا۔ سوز کو معلوم تھا کہ عماد الملک جلد ہی چلا جائے گا۔ سودا کو بھی اس کے ساتھ ہی جانا پڑے گا۔ اس نے سودا کو مشورہ دیا کہ وہ فرخ آباد ہی میں رک جائے۔ اس نے دہلی کے مخدوش حالات کی طرف اس کی توجہ دلائی۔ حالات سودا کو بھی نظر آ رہے تھے۔ اس نے بھی سوچا کہ ابدالی اور عماد الملک کی رنجش نہ جانے کیا رنگ دکھائے۔ عماد الملک تاوان کی رقم اکھٹی کر بھی سکتا ہے یا نہیں۔ اس کے ساتھ کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتا پھروں گا۔ اس نے سوز کی بات مان لی۔ عماد الملک بھی اپنے معاملات میں ایسا گھرا ہوا تھا کہ اس نے بھی اجازت دے دی۔

دونوں دوست پھر آپس میں مل بیٹھے۔

فرخ آباد دلی بنا اور سودا کا ساتھ ہوا تو شاعری پر بھی بہار آئی۔ معاش کی طرف سے بے فکری تھی۔ دن رات شاعری کا مشغلہ تھا۔

سودا کو فرخ آباد میں رہتے ہوئے تیرہ سال ہو گئے تھے۔ اس دوران میں نواب شجاع الدولہ ناظم اودھ نے کئی بار اسے یاد کیا لیکن وہ ٹالتا رہا۔ سوز کی محبت تھی یا فرخ آباد کی کشش جو اسے یہاں سے جانے نہیں دیتی تھی لیکن پھر اچانک وہ شجاع الدولہ کے پاس جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے مہربان خاں رند کی خدمت میں ایک قطعہ گزارا اور ان کی سرکار میں میر سوز کی موجودگی کو غنیمت قرار دیا اور مشورہ دیا کہ وہ ان کی قدر دانی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھیں۔

شعر کے بحر میں ترا استاد
کشتی ذہن کو ہے باد مراد
اس کو ہر طرح سے غنیمت جان
پھر ملے گا نہ سوز سا انسان

سودا یہ کہتے ہوئے اودھ کی طرف روانہ ہو گئے۔

میر سوز کو تیرہ سالوں میں سودا کی عادت پڑ گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد وہ بہت دن گم صم رہے۔ شاید اسی تنہائی کو دور کرنے کے لیے اس نے شادی کر لی۔ اس وقت اس کی عمر چالیس سال سے زیادہ ہو گئی تھی۔ اسی بڑھاپے میں اللہ نے اولاد دی جس کا نام انہوں نے مہدی رکھا۔

قیامِ دہلی کے دوران سوز کا کلام سنجیدہ، عارفانہ اور دہلوی بول چال کے عین مطابق تھا لیکن فرخ آباد آنے کے بعد اس کے انداز سخن میں تبدیلی آ گئی۔ لہجہ بھی بدل گیا۔ اس میں فرخ آباد کا ٹھیٹ دیہاتی اثر بھی شامل ہو گیا۔ اس کی زبان سے وہ الفاظ ادا ہونے لگے جو اس علاقے میں اوسط درجے کے لوگ بولتے تھے۔

تو نے ظالم بہت ستایا ہے
کیا ستانا ہی تجھ کو بھایا ہے
دل کو میرے چُرا لیا ہے ابھی
ہاتھ خالی مجھے دکھایا ہے
چھینتا ہوں تو مجھ کو کہتا ہے
واہ وا بے بڑا تو آیا ہے
ہاتھ میرا مروڑتا ہے سرک
تو نے مجھ کو دبیل پایا ہے
چل بے عیار تیری عیاری
کس نے یہ فن تجھے سکھایا ہے

وہ فرخ آباد میں تھا اور دہلی کی سیاست کروٹوں پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ دہلی میں ایک لمحے کو بھی سکون نہ ہو سکا تھا۔ عماد الملک نے اپنے ساتھ مرہٹوں کو ملا لیا تھا جو دہلی کا سکون غارت کرتے پھر رہے تھے۔ ان کی سرکوبی کے لیے احمد شاہ ابدالی پھر آیا اور پانی پت میں چھ لاکھ مرہٹوں کو شکست دے کر نئے انتظامات کیے۔

اب صورت حال یہ تھی کہ شاہ عالم اگرچہ بادشاہ تھا لیکن پایہ تخت اس کے قبضے میں نہ تھا۔ وہ الہ آباد میں ایک قسم کی جلاوطنی کاٹ رہا تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے اس کے بیٹے جواں بخت کو دہلی میں نائب السلطنت بنا دیا تھا۔ نواب نجیب الدولہ کو امیر الامرا کے منصب پر فائز کر دیا تھا۔

انتظامات کرنے کے بعد احمد شاہ ابدالی افغانستان واپس چلا گیا۔ اب یہ شاہ عالم پر منحصر تھا کہ وہ دہلی جائے اور اپنی بادشاہت کا اعلان کرے۔ شجاع الدولہ کی بھی یہی منشا تھی اور انگریز بھی یہی چاہتے تھے لیکن شاہ عالم دہلی جاتے ہوئے ڈر رہا تھا بالآخر والی فرخ آباد نواب احمد خاں بنگش کو

درمیان میں ڈالا گیا۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ شاہ عالم کو بہ حفاظت دہلی تک پہنچا دیں گے اور تاجپوشی کی رسم بھی ادا کر دیں گے۔ یہ سہارا ملتے ہی شاہ عالم الہ آباد سے نکلا اور کالپور ہوتا ہوا فرخ آباد پہنچ گیا۔ اب یہ شاہ عالم کی قسمت کہ جس وقت وہ فرخ آباد پہنچا۔ نواب احمد خان بنگش بستر علالت پر تھے اور اپنا وعدہ پورا کرنے اس کے ساتھ نہیں جا سکے تھے۔

شاہ عالم ان کی صحت یابی کے انتظار میں فرخ آباد ہی میں رکا رہا۔ اپنی حالت پر غور کرتا تھا تو مایوسی بڑھتی جاتی تھی۔ وہ مغل خاندان کا چشم و چراغ تھا اور ایک معمولی سی ریاست کے نواب کا محتاج۔

اسی عالم میں سوز اس سے ملاقات کے لیے گیا۔ اپنے شہر کے ایک بے بدل شاعر کو اپنے سامنے دیکھا تو شاہ عالم کی آنکھیں بھر آئیں۔

”اگر سازشوں نے مغلوں کو تباہ نہ کر دیا ہوتا تو تم دہلی میں ہوتے اور ہم نے تمہارا منہ موتیوں سے بھر دیا ہوتا۔ اب تو ہم خود در بدر ہیں اور اپنی ہی رعایا میں سے ایک نواب کے محتاج۔“ شاہ عالم نے بڑی بے بسی سے کہا۔

سوز کو اس کا یہ انداز قطعی اچھا نہیں لگا۔ بادشاہوں کو یہ کم ہمتی قطعی زیب نہیں دیتی، سوز نے سوچا۔ اسے ہمایوں بادشاہ یاد آ گیا۔ شیر شاہ کے ہاتھوں اسے اپنی سلطنت سے ہاتھ دھونے پڑے تھے مگر اس نے تلوار کے بل پر اپنی سلطنت کو دوبارہ حاصل کر لیا تھا اور یہ نواب احمد خاں بنگش کے انتظار میں رکا ہوا ہے۔

باتوں باتوں میں شاہ عالم نے یہ مصرعہ بھی پڑھ دیا تھا
”جی میں آتا ہے کہ شاہی میں گدائی کیجیے۔“

سوز وہاں سے اُٹھا تو شاہ عالم کی باتیں بھی یاد تھیں اور یہ مصرعہ بھی ذہن میں گونج رہا تھا۔ اس نے اس مصرعے کے جواب میں ایک قطعہ لکھا اور شاہ عالم کے حضور پیش کر دیا۔ اس قطعے میں وقار اور تمکنت کے ساتھ نصیحتیں کی گئی تھیں کہ اس وقت ان نصیحتوں ہی کا موقع تھا۔

خسرو اقلیم میں فرماں روائی کیجیے
رتبۂ صاحب قرانی تک رسائی کیجیے
نائب اللہ کو لازم ہیں سب حق کی صفات
اے صفات اللہ کچھ اپنی بڑائی کیجیے
تیغ سلطاں ناخن تدبیر ہے لاریب فیہ
اس سے عقدے کھولیے مشکل کشائی کیجیے
نیک سے نیکی جزا ہے بد سے لازم ہے بدی

اقتباس

میر سوز نام، ساکن قراول پوری، سید عالی نسب اور فن وری میں استاد، طرز ارابندی کے بادشاہ اور صورت مضمون درود آں تھے۔ کلام ان کے سر سے پاؤں تک سوز و ساز ہے اور پاؤں سے سر تک ناز و نیاز۔ شعر کے پڑھنے میں صاحب طرز خاص تھے اور علم تیر اندازی اور کماںداری میں بے شدت دل آشنا رکھتے تھے اور فن خوشنویسی میں نہایت دستگاہ رکھتے تھے۔ ابتدائے جوانی سے انہوں نے ساتھ کام دل کے ایام زندگانی کو صرف نشہ بے خمار کیا۔ لکھنو میں تشریف رکھتے تھے اور اوقات ساتھ توکل و قناعت کے بسر کرتے تھے۔

(تذکرہ گلشن ہند)

مرض کو پہچانیے ویسی دوائی کیجیے
بعد ازیں مختار ہو اے بادشاہ مومنیں
خواہ شاہی کیجیے یا پھر گدائی کیجیے
گر گدائی کیجیے تو بوسۂ محبوب کی
ورنہ مثل سوز ناحق جگ ہنسائی کیجیے

دو مہینے کے انتظار کے بعد نتیجہ یہ نکلا کہ نواب احمد خاں بنگش کا انتقال ہو گیا۔ شاہ عالم بادشاہ کے سارے منصوبے خاک میں مل گئے۔ شاہ عالم نے مرہٹوں کی مدد لی اور دہلی روانہ ہو گیا۔ یہ ایسی غلطی تھی جس نے اسے مرہٹوں کا یرغمال بنا دیا۔

نواب احمد خاں بنگش کے انتقال کرتے ہی اس ریاست کو نظر لگ گئی۔ حالات روز بہ روز خراب ہوتے چلے گئے۔ مسند نشینی کے جھگڑوں نے بھائیوں کو آپس میں لڑا دیا۔ امراء گروہوں میں بٹ گئے۔ سوز کے ممدوح مہربان خاں رند، مظفر جنگ کے خلاف تھے لہذا اس کے اقتدار میں آتے ہی انہوں نے فرخ آباد چھوڑ دیا اور عازم دہلی ہوئے جہاں ان کے خسر افراسیاب خاں موجود تھے۔

مہربان خاں رند کے چلے جانے کے بعد سوز کا فرخ آباد میں ٹکنا مشکل ہو گیا۔ سترہ سال کے قیام نے فرخ آباد کو دوسرا وطن بنا دیا تھا۔ اسے چھوڑتے ہوئے دکھ بھی ہو رہا تھا۔ یہ فکر بھی تھی کہ اب کس دستر خوان کو تلاش کیا جائے؟

اس روز گھر پہنچے تو بہت دل گرفتہ تھے۔ مظفر جنگ نے برسرِ اقتدار آتے ہی مہربان خاں رند کی تمام نشانیاں مٹانی شروع کر دی تھیں۔ پچھلے ملازمین ملازمتوں سے نکالے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جارہے تھے۔ سوز چاہتا تھا کہ کسی باز پرس سے پہلے وہ فرخ آباد چھوڑ دے۔

بیوی ذرا تیز مزاج تھیں اور فرخ آباد چھوڑنے پر تیار بھی نہیں تھیں۔ اس روز بھی وہ اس سے اُلجھ پڑی تھیں جب اس نے فرخ آباد سے نکلنے کا عندیہ دیا تھا۔

”نیک بخت، اب فرخ آباد میں کچھ نہیں رہا۔ یہاں رہے تو جان کے لالے پڑ جائیں گے۔“

”واہ، میں کیوں چھوڑوں فرخ آباد۔ اس سے اچھی کون سی جگہ ہوگی؟ میں اپنے وطن سے کہیں اور جانے والی نہیں۔“

”مہربان خاں رند چلے گئے۔ اس سے پہلے کہ فاقے ہمارا انتظار کریں۔ ہمیں بھی نکل جانا چاہیے۔“

”آپ نے کیوں رند موئے کا ساتھ دیا؟ مظفر جنگ کے ساتھ رہتے تو آج عیش کر رہے ہوتے۔“

”بے وقوف عورت، مجھے معلوم تھا کہ آٹھ بھائیوں میں مظفر جنگ کو نوابی ملے گی؟“

”اتنی عقل تم میں بھی نہیں تھی کہ حالات کو بھانپ لیتے۔“

”چلو اب جو ہوا سو ہوا، آیندہ کی فکر کرو۔“

”اب کون ہے جو تمہیں اپنے دسترخوان پر بٹھائے گا؟“

”نواب محمد یار خاں والی ٹانڈہ مجھے کب سے بلا رہے ہیں۔ ان کی غزلیں دیکھوں گا اور روٹی کما لوں گا۔“

”میں تو تم سے شادی کر کے پچھتائی۔ موئی شاعری نہ ہوئی دربدر پھرانے کی مشین ہوگئی۔“

”بیگم، کیوں ناشکری کرتی ہو۔ اسی شاعری کی بدولت فرخ آباد میں عیش سے گزار رہی ہو۔ ٹانڈہ میں بھی عیش ہی کروگی۔“

سوز نے سامان باندھا، بیوی اور دونوں بچوں کو ساتھ لیا اور ٹانڈہ پہنچ گیا۔ محمد یار خاں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ رہنے کو شاندار مکان دیا۔ توقع سے زیادہ وظیفہ ملنے لگا۔ بیوی خوش ہوگئی کہ فرخ آباد سے بھی زیادہ آرام مل گیا۔

مرہٹوں کا سردار سندھیا ابھی پانی پت کا معرکہ بھولا نہیں تھا۔ مرہٹوں کی تباہی میں نجیب الدولہ کا بڑا ہاتھ تھا۔ وہ انتقام لینے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ یہ موقع آ گیا تھا کہ اب بادشاہ اس کی مٹھی میں تھا۔ نجیب الدولہ کا انتقال ہوگیا تھا۔ اب یہ انتقام اس کے بیٹے ضابطہ خاں سے لیتا تھا۔

شاہ عالم کو دہلی آئے بیس دن بھی نہیں ہوئے تھے کہ مرہٹوں نے اس کو ضابطہ خاں کی گوشمالی کے لیے مجبور کرنا شروع کر دیا۔ شاہ عالم ایسا نہیں چاہتا تھا لیکن اب وہ مرہٹوں کے ہاتھوں میں تھا۔ مجبوراً اس مہم میں شریک ہونا پڑا۔ مرہٹوں نے ضابطہ خاں کی عمل داری کو برباد کر دیا۔ اس کے صدر مقام غوث گڑھ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ سکھرتال کے معرکے میں شکست دے کر ضابطہ خاں کو شجاع الدولہ کے علاقے میں دھکیل دیا۔

سکھرتال کے معرکے میں شکست کے بعد ٹانڈہ کا دربار درہم برہم ہوگیا۔ سوز کو یہاں رہتے ہوئے چھ ماہ ہوئے ہوں گے کہ اسے یہاں سے نکلنا نہیں بھاگنا پڑا۔

وہ چپکے چپکے ماتم کر رہا تھا۔ وہ ہاتھ جو اس کے آنسو پونچھ سکتے تھے خود مجسم آنسو بن گئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کاش وہ تاریخ کے اس موڑ پر پیدا ہوا ہوتا جب مغلوں کا عروج تھا پھر اسے یوں ایک دروازے سے دوسرے دروازے کی طرف بھاگنا نہ پڑتا۔ اتنی فرصت تو ملتی کہ غمِ روزگار سے آزاد ہو کر فکرِ سخن کر سکتا۔ اب تو یہ حال ہے کہ اپنا ماتم کروں یا اپنے مہ وجبین پر آنسو بہاؤں۔ ہائے کیا زمانہ تھا۔ اورنگ زیب کے خوف سے مرہٹے، دکن کے پہاڑوں میں منہ چھپائے پھرتے تھے یا یہ حال کہ شاہی محلات جاٹوں کی رہائش گاہ بن گئے۔ جہاں جان کے لالے پڑے ہوں وہاں شاعری کی فرصت کسے ہو۔ یہی سوچتے سوچتے وہ مع اہل وعیال فیض آباد پہنچ گیا۔ یہاں پہنچتے ہی اسے احساس ہوگیا کہ دہلی کے حالات کی تپش یہاں تک آ رہی ہے۔ شجاع الدولہ روہیلوں اور انگریزوں سے اُلجھا ہوا ہے۔ امیروں میں قدردانی کی خوبو ہی نہیں۔ اس پُرآشوب دور میں سپاہیوں کی ضرورت ہے، شاعروں کی نہیں۔ معاش کے لیے کوشش کرتا رہا۔ امیروں کے دروازے کھٹکھٹاتا رہا۔ دستک کی آواز کسی نے نہیں سنی تھی۔ پچاس سے اوپر عمر ہوگئی تھی۔ بڑھاپے میں شادی کی تھی۔ بچے چھوٹے تھے۔ بیوی بھی ایسی کہ سہارا بننے کے بجائے چڑ کے لگائی رہتی۔ اسے رہ رہ کے فرخ آباد کا عیش یاد آتا تھا۔

یاد آتے ہیں کہ وہ دن جب غم نہ تھا کسی کا
اے سوز اب خجل ہیں دل کی مصیبتوں سے

اہل وعیال کا غم کھائے جاتا تھا۔ پیروں میں پڑی ان زنجیروں کو دیکھ دیکھ کر اب تو وہ یہ سوچنے لگا تھا کہ کاش اس نے شادی نہ کی ہوتی، اکیلا ہوتا تو دربدر ٹھوکریں کھانے کی بجائے گوشہ تنہائی میں بیٹھ جاتا۔

بڑا دنیا میں ہے گا وہ خردمند
زن و فرزند کا جو ہو نہ پابند

اب دنیاوی سہارے ساتھ چھوڑ دیں تو لے دے کے اللہ تعالیٰ کا سچا اور حقیقی سہارا ہی رہ جاتا ہے۔ ناطاقتی اور ... میں ٹھوکریں کھانے کو ملیں تو اسے بھی یہی سہارا یاد آیا۔ کون امیر تھا جس کی مدح کرتا اور انعام وصول کرتا۔ اس نے ... سنبھالا اور دل کے آبلے ایک ایک کر کے پھوڑتا رہا۔

ہمارا حوصلہ کوڑی کا دو کوڑی کا بس لیکن
جو تو بخشش کرے تو ہو ابھی عیش و طرب صاحب
اگر مجھ سے بھی نالائق کو بخشو تو عجب کیا ہے
ہزاروں لاکھوں بخشے تو نے میرے بے طلب صاحب
الٰہی تجھ سے کیا مانگوں کہ تو دانا و بینا ہے
ولیکن دور کیجیے جلد یہ رنج و تعب صاحب
ضعیفی دوسرے ناطاقتی حیران ہوں اب تو
کہ چلنے کی نہیں طاقت کہاں جاؤں میں اب صاحب
طلب تھی سوز کی جو بیٹھ کر مر جائے عزلت میں
ولیکن غم سے ان اطفال کے مارا کڈھب صاحب

قدردانی سے محرومی، فرخ آباد سے جدائی، فکر معاش اور پھر معاش کی تلاش۔ آئے دن کی مہاجرت نے مقروض الگ کر دیا۔ بیڑیاں پاؤں میں ہوں تو آدمی کتنی دور چل سکتا ہے۔ اس نے یہ بیڑیاں اتاریں اور ایک طرف رکھ دیں۔ بیوی بچوں کو فیض آباد میں چھوڑا اور پٹنہ پہنچ گیا۔

اتنی دور آنے کا ایک سبب یہ بھی ہوگا کہ احمد شاہ بادشاہ کے ایک دودھ شریک بھائی اشرف علی خاں فغاں دہلی کے حالات سے ملول ہو کر یہاں آ گئے تھے اور مہاراجا شتاب رائے کی ملازمت میں تھے۔ ان کا انتقال ہوگیا تو یہ جگہ خالی ہوگئی۔ سوز نے سوچا ہوگا وہ فغاں کی جگہ لے سکیں گے۔ مہاراجا شتاب رائے کی قدردانی نے بہت سے شاعروں کو عظیم آباد پٹنہ میں جمع کر دیا تھا۔ قدرت اللہ قدرت، میر ضیاالدین ضیا، محمد فقیہہ دردمند وغیرہ بہت سے شاعر وہاں تھے۔ سوز نے سوچا ان شعرا کے ساتھ خوب نبھے گی اور پٹنہ چلا آیا تھا۔

وہ بڑی آس لے کر پٹنہ آیا تھا۔ معاصر شعرا نے جو سنا کہ سوز آیا ہے تو انہیں اپنی گرم بازاری سرد ہوتی نظر آئی۔ سب نے مل کر ایک گروہ بنا لیا کہ ہر مرحلے پر اس کی مخالفت کرنی ہے۔ سوز جیسا کامل فن اگر یہاں مقیم ہوگیا تو ہم سب کے چراغ گل ہو جائیں گے۔ وہ جس مشاعرے میں جاتا اس کے اشعار کا مذاق اُڑانے کے لیے لوگ تیار بیٹھے ہوتے۔ ایسی رکاوٹیں ڈالی گئیں کہ وہ مہاراجا تک بھی نہ پہنچ سکا۔ یہاں کی آب و ہوا بھی اسے راس نہیں آ رہی تھی۔ دوستوں کی سردمہری نے اسے مزید توڑ دیا۔

اقتباس

سید محمد سوز ہندوستان کے بہت لائق اور معروف لکھنے والوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ادبی اوصاف کے علاوہ وہ تیراندازی اور شہ سواری میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ انہوں نے خوش نویسی میں بھی کمال حاصل کیا تھا۔ انہوں نے آسان اور سادہ طرز میں اشعار لکھے ہیں۔ ان اشعار کا طرز ایسا مسرت بخش ہے کہ وہ ایک نئے شعر کے سربراہ سمجھے جاتے ہیں۔

اپنی شاعرانہ زندگی کے آغاز میں سوز اپنے ہیجان انگیز جذبات سے مغلوب تھے لیکن عہد شاہ عالم کے اٹھارھویں سال میں وہ سلوک اور تصوف کے میدان میں داخل ہوئے اور درویشوں کا لباس اختیار کیا۔

(گارساں دتاسی، تاریخ ادبیات)

وہ امرا اور وزرا کے درباروں میں قدر و منزلت کا عادی تھا۔ دوسروں کے ساتھ ہمیشہ حسنِ سلوک سے پیش آتا تھا۔ یہی توقع وہ اپنے لیے کرتا تھا کہ دوسرے بھی اس کی عزت کریں گے۔ یہاں اس کے برعکس معاملہ پیش آیا تو اس نے شکایتوں کے دفتر کھول دیے۔

کون سے اعمال کا بدلہ ملا ہے یا نصیب
زندگانی سے بھی زیادہ کون سا ہوگا عذاب
اپنے گھر سے یوں جدا کر کے پھرایا شہر شہر
واہ وا ہم کو زمانے نے دیا یوں انقلاب
ایک تو مجھ کو نہیں اب زندگانی کی امید
دوسرے گھر کی مرے اب ہو چلی حالت خراب
تیسرے جس شہر میں میری ہوئی ہے مسکنت
جس طرف اس کے نظر پڑتی ہے، ہے گا آب آب
قرض کو اپنے اُتاروں اور کر لوں کارِ خیر
جس کی خاطر اب پڑا پھرتا ہوں در در یوں خراب
سید الشہدا کو سونپ آیا ہوں دلپسندوں کو میں
وہ ملا دیں گے مجھے ایک ایک کا کر کے حساب

اسے صرف ماحول ہی سے شکایت نہیں تھی۔ پٹنہ کے شاعروں نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا، اس نے بھی اسے تکلیف پہنچائی۔ اسے قدم قدم پر دہلی کی یاد آ رہی تھی اور وہ موجودہ حالت کا موازنہ کر رہا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

حضرت دہلی کی کس منہ سے کروں تعریف میں
ایک ایک اس اُجڑے گھر میں عالم تصویر ہے
کثرت عشاق ہے یاں تک کہ تم سے کیا کہوں
جور محبوباں سے ہر اک غنچۂ دلگیر ہے
پر عظیم آباد کے جتنے ملے صاحب سخن
جو ملا عیار تھا جو ہے سو آہو گیر ہے

جہاں میں آشنا کوئی نہ پایا
جسے دیکھا اسے پایا یگانا
ملا بھی کوئی تو اپنی غرض کا
اسے واجب ہوا میرا ستانا
پڑھیں دو چار بیتیں بے دلی سے
تو سن سن کر انہوں نے یہ نہ جانا
کہ اچھے کون ہیں ان میں برے کون
مگر سن سن انہیں گردن ہلانا
نکالا سوز کو کس جا سے یارب
کدھر لایا ہے اس کو آب ودانہ

وہ ایسے شعر لکھ کر اپنا لوہا منوانے کی فکر کر رہا تھا۔

عناں جس طرف دل ربا موڑتا ہے
صفوں کی صفیں آن میں توڑتا ہے
اِدھر دل ہے یارو اُدھر عشق اس کا
نہ یہ چھوڑتا ہے نہ وہ چھوڑتا ہے
سلامت رہ اے خارِ وادیٔ الفت
کہ دل کے پھپھولے تو ہی پھوڑتا ہے

اس سادگی کا کوئی قدر دان نہیں تھا۔

اردو غزل نے ابھی پاؤں پاؤں چلنا سیکھا تھا۔ میر سوز کی غزلیں اس کے دورِ شباب کی یاد دلا رہی تھیں۔ حال میں مستقبل کا تماشا دکھا رہی تھیں۔

تو ہے اب اس طرف لے کشتی بحرِ مراد
اس کی خاطر میں بھی سیر موجۂ دریا کروں
اے دل تو اس کے حسن خط کو آ تو دیکھ
خورشید آ کے تا بہ لبِ بام رہ گیا
نظر کو زلف کے حلقے میں اے دل
گل خورشید پھولا شام میں دیکھ
برگ گل بہتے ہیں جیسے آبشار باغ میں
لختِ دل جھڑتے ہیں ویسے آنکھ کے ناسور سے

باشندگانِ عظیم آباد پٹنہ کی بے مہری نے اس کا دل اُچاٹ کر دیا۔

سوز پٹنہ سے نکل جلد میں کہتا ہوں تجھے
یاں کے جتنے بھلے مانس ہیں جفا جو ہیں گے

وہ پٹنہ سے نکلا اور مرشد آباد پہنچ گیا لیکن یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی پرندہ ایک ہی درخت کی ایک شاخ سے اڑے اور دوسری پر بیٹھ جائے۔ پہلی شاخ پر پتے کم تھے دوسری پر ذرا زیادہ کہ کچھ دیر کے لیے سایہ مل گیا لیکن ہوا اتنی تیز تھی کہ لگتا تھا یہ پتے کچھ ہی دیر کے مہمان ہیں۔

مبارک الدولہ مسند نشیں تھا۔ اس نے کچھ عزت افزائی کی لیکن اس کی آمدنی بھی اتنی کہاں تھی۔ میر جعفر کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا نجم الدولہ نواب بنگال بنا۔ اس کے بعد اس کا چھوٹا بھائی سیف الدولہ اور اب مبارک الدولہ تھا۔ صوبہ داری برائے نام رہ گئی تھی۔ انگریزوں کی حکمت عملی کے باعث بنگال کا اقتصادی نظام دگرگوں تھا۔ سوز کا دل یہاں بھی نہ لگا۔ مجبوری پاؤں پکڑی رہ گئی اور وہ یہ کہتے ہوئے فیض آباد آ گیا۔

خدا کے در پہ بیٹھا اے سوز یوں واہی نہ پھر دردر
کہ وہ پیدا کیے کی شرم کو اپنی نبھاتا ہے

فیض آباد اس وقت معمولی قصبے سے زیادہ نہیں تھا۔ شجاع الدولہ مسند آرا تھے۔ ان کا زیادہ وقت جنگوں اور معرکوں میں گزرتا تھا۔ اس لیے وہ فیض آباد کو بناؤ سنگھار کی اس منزل تک تو نہ پہنچا سکے جو بعد میں لکھنؤ کا مقدر بنا لیکن پھر بھی شجاع الدولہ کی فیاضیوں نے اسے تارا سا چمکا دیا تھا۔ اسی لیے تو کیا سپاہی کیا علما اور شاعر۔ جس کو دیکھو یہاں آن بسا تھا۔ وہ چوک بازار میں پہنچا تو سجی ہوئی دکانیں دیکھ کر کھڑا دیکھتا رہا۔

وہ جب پہلی مرتبہ یہاں آیا تھا اور اہل و عیال کو چھوڑ کر پٹنہ کی طرف چلا گیا تھا تو اس نے اس رونق کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ مفلس کے لیے بازار ویرانے سے کم نہیں ہوتا لیکن اب جو پٹنہ کا ویرانہ دیکھ آیا تو یہ ویرانہ گلزار معلوم ہونے لگا۔ جیب اب بھی خالی تھی لیکن گھر قریب تھا۔ وہ اپنے بچوں سے بہت محبت کرتا تھا اور ان سے ملے بہت دن ہو گئے تھے۔

چوک سے نکل کر گلیوں سے ہوتا ہوا وہ ایک تنگ گلی میں داخل ہوا۔ وہ اسی گلی کے ایک معمولی سے مکان میں اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر گیا تھا۔ مکان ڈھونڈنے میں اسے ذرا بھی دقت نہیں ہوئی۔ اس کا بیٹا میر مہدی اسے گلی میں ہی مل گیا۔

”ابا تم آ گئے؟ اماں تو کہہ رہی تھیں، اب کے گئے ہیں تو کبھی نہیں آ ویں گے۔“

یہ سن کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ فیض آباد میں رہ کر بھی یہ بچہ فرخ آباد کی زبان بول رہا ہے۔ ماں نے اسے کیسی

ٹوکی ہے۔ اب تو یہ بڑا ہو گیا ہے اسے بولنے کا ڈھنگ آنا چاہیے۔ غلطی میری بھی ہے۔ میں نے بے جا محبت میں بچوں کو ان کی شرارتوں پر بھی ٹوکا ہی نہیں۔ ماں نے بھی کوئی روک ٹوک نہیں کی۔

وہ آوازیں دیتا رہ گیا اور میر مہدی آگے بڑھ گیا۔

اسے ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی کہ اس کا باپ گھر واپس آیا ہے۔ ابھی بچہ ہے۔ عقل آئے گی تو خود ٹھیک ہو جائے گا۔ ذرا ٹِک کر بیٹھوں تو اس کے لیے کسی اچھے اتالیق کا بندوبست کروں۔

اس نے سوچا گھر کے دروازے پر دستک دے دی۔

”کون ہے بھائی، دم کیوں نہیں لیتے، کوئی آتے آتے ہی آئے گا۔“

یہ اس کی بیوی تھی جو اندر سے گرجتی برستی آئی تھی اور دروازہ کھول دیا تھا۔ میاں کو دیکھتے ہی اس کا سارا غصہ ٹھنڈا ہو گیا لیکن اندر پہنچتے ہی مطالبے کا ہاتھ بھی بڑھا دیا۔

”اتنے بڑے شاعر ہو۔ ملازمت تو مل گئی ہو گی؟ کیا وظیفہ بندھا مجھے بھی تو معلوم ہو۔“

”بچے کہاں ہیں۔ قدرت علی بھی نظر نہیں آ رہا ہے؟“

سوز نے بات کا رُخ کسی اور طرف موڑنے کے لیے کہا۔

”اے میں نے کیا پوچھا ہے تم سے۔ نوکری ہوئی یا نہیں؟“

”کچھ ٹھوکریں مقدر میں تھیں وہ کھالیں اور لوٹ آیا۔ نوکری کہاں؟“

”اے ہے۔“ وہ اس سے کچھ ہٹ کر بیٹھ گئی ”تو کیا خالی ہاتھ ہی لوٹ آئے؟“ وہ دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھنے لگی ”یہ بھی تو پوچھو، میں نے اتنے دن گزارہ کیسے کیا؟“

”اتنا تو میں تمہیں دے گیا تھا۔“

”کیا خزانہ چھوڑ گئے تھے۔ وہ تو اللہ بھلا کرے مرزا سودا کا کہ کبھی کبھی آ کر پوچھ لیا کرتے تھے ورنہ یہاں تو فاقے ہو جاتے۔ تم وہاں مفت کے مشاعرے پڑھ رہے تھے۔“

”مشاعرے نہیں پڑھ رہا تھا نااہلوں کی جوتیاں کھا رہا تھا اور خون کے گھونٹ پی رہا تھا۔ پیٹ بھر گیا تو گھر چلا آیا۔“

”کون سی گھڑی تھی جو تمہارے ساتھ فرخ آباد سے چلی تھی۔“ وہ باقاعدہ رونے لگی۔

”میں سودا کی طرف جا رہا ہوں۔ دیکھو شاید کوئی سبیل نکل آئے۔“

بیوی نے روکنے کی زحمت بھی نہیں کی کہ ابھی تو سفر سے آئے ہو۔ تھکن تو اتار لو۔

نثر سوز

”کہ جو شے حق سبحانہ تعالیٰ نے خلق کیا ہے بلکہ جتنے خار و خس ہیں، کتنے ہی کام آتے ہیں اور بندگانِ خدا ان سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ مگر یہ سوز وہ مخلص ہے کہ کسی کو اس سے حلاوت حاصل نہیں ہوتی سوا سکوت اور کراہیت کے۔ سبحان اللہ یہ بھی قدرت الٰہی اظہار کمال ہے کہ ایسی شے خلق کی جاوے جس سے کوئی فائدہ نہ اٹھاوے پس اگر کوئی منکر سوال کرے کہ ناکارہ محض تو نہیں ہے؟ خیر تو اس لائق ہے کہ نام اس کا قابل جلانے کے ہے۔“

سودا سے مل کر اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ وہ کسی سفر سے واپس آیا ہے۔ کوئی اس سے یہ نہیں پوچھ رہا ہے کہ کیا کما کر لائے بلکہ اس پر خوش ہے کہ وہ واپس آ گیا اور یہ وعدہ کر رہا ہے کہ وہ اس کے لیے فیض آباد ہی میں روزگار کا کوئی بندوبست کر دے گا۔

اس نے گھر آ کر بیوی کو دلاسا دے دیا کہ بہت جلد کوئی انتظام ہو جائے گا۔

فیض آباد میں نہ شاعروں کی کمی تھی نہ علما کی قلت۔ شجاع الدولہ کے فرزند آصف الدولہ کی سرکار الگ مرجع خلائق تو بنی ہوئی تھی۔ سودا اسی سرکار سے منسلک تھا۔ شاعری کے بغیر کوئی یہاں مکمل ہی نہیں ہوتا تھا۔ آصف الدولہ کا مشغلہ فرصت بھی شاعری تھا۔ سودا ان کی غزلوں کی اصلاح کے لیے مقرر تھا۔ سودا کے ساتھ وہ بھی شہزادے کی صحبت میں چلا جاتا تھا۔ اس کا طرز شاعری سودا سے مختلف اور شہزادے کے رنگ طبیعت کے بہت قریب تھا۔ خاص طور پر اس کے اندازِ شعر خوانی نے تو شہزادے کو اپنا اسیر بنا لیا۔ اس کے کلام کی سادگی دیکھ کر آصف الدولہ کے دل میں ضرور آتا ہو گا کہ وہ میر سوز کو اپنا کلام دکھائیں لیکن مروت کا تقاضا یہ نہیں تھا کہ سودا کو جواب دیں۔ کمال فیاضی یہ تھا کہ اس نے میر سوز کا بھی وظیفہ مقرر کر دیا۔ ملازمت یہ ٹھہری کہ مجرے کے لیے حاضر ہو جایا کریں۔ شہزادے کی غزلیں سنا کریں اور اپنی غزلیں سنایا کریں۔ معاشرے کا دستور ہی تھا۔ لوگوں کو معلوم ہوا کہ سوز کی رسائی آصف الدولہ تک ہے اور وہ ان کا قدردان ہے تو فیض آباد میں اس کے بہت سے قدردان پیدا ہو گئے۔ وہ دہلی میں پیدا ہوا تھا۔ دہلوی شعرا کی سادہ زبان اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس سادگی پر فیض آبادی شعرا مرے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جا رہے تھے۔ یہ وہ خوبی تھی جو سودا کے پاس نہیں تھی۔

شجاع الدولہ کے بعد آصف الدولہ تخت نشین ہوئے۔ پڑوس میں لکھنو آباد تھا لیکن ساری رونق فیض آباد کو میسر تھی۔ آصف الدولہ کو شاہی ملی تو عیاشی نے بھی پاؤں پھیلائے۔ فیض آباد میں والدہ موجود تھیں۔ قدم قدم پر روک ٹوک تھی۔ آصف الدولہ نے والدہ کی نظروں سے دور رہنے کے لیے لکھنو کو مستقر بنایا۔ لکھنو کو پری خانۂ عالم بنا دیا۔ فیض آباد کا جوہر لکھنو میں سمٹ آیا۔ اس جناب کے فیض سے خوبانِ عالم کا مجمع ہو گیا۔ شہر کیا تھا خوانِ کرم تھا۔ آب و تاب چادرِ مہتاب کو خجل کر رہی تھی۔ دنیا تھی کہ روشنیوں کے اس سیلاب کا رُخ کر رہی تھی۔ ہر فن کے قدردان یہاں موجود تھے۔ جس کو جو چاہیے تھا مل رہا تھا۔ ایران و توران کے ضرورت مند بھی اسی سرکار کے دامنِ دولت کے سائے میں پہنچ رہے تھے۔

خوش حالی کی ایسی ہوا چلی تھی، دلوں کے کنول کھل اُٹھے۔ فکر و غم دلوں سے دور ہوا۔ وہ شعرا جنہوں نے اسی آب و ہوا میں آنکھ کھولی، ان کا طرزِ سخن ہی بدلا ہوا تھا۔ دہلی کی داخلیت ختم ہوئی، خارجیت کا رنگ ابھر آیا۔

سوز و گداز کی جگہ شوخی اور چھیڑ چھاڑ نے لے لی۔ محبوب کے خدوخال میں کشش محسوس کرنے کے بجائے ان اشیا پر نظر رکھی جانے لگی جس سے افزائش حسن ہوتی ہے۔ مہندی، چولی، زیر جامہ، سرخی پان، یہ سب بیان ہونے لگے۔ شگفتگی کے ماحول میں بوڑھے سوز جب اسی طرح مخاطب ہوا۔

منہ سے لگا ہے کاجل مسی گلے سے لپٹی
وہ کون چلبلی تھی جس پاس جا کے سویا

تو نوجوانوں کا سرخیل بن گیا۔ اس کی شاعری کی لکھنو میں دھوم مچنے لگی۔

گھور کر کہتا ہے کیا "اے لو غضب"
یہ بڑھاپے پٹیا نکلا من چلا
دختر از کو جو کچھ میں نے کہا مان گئی
جب میں چھیڑا تو کہا اوئی مری جان گئی
آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے
اے میں اس کی ہر آن کے صدقے

محاورہ بندی نے اسے ہر آنکھ کا تارا بنا دیا۔

عجائب سیر ہے اب کوچہ قاتل میں سنتے ہو
کوئی تو "ایڑیاں رگڑے ہے" کوئی تھر تھراتا ہے
بلا دربان کو بولا ابے سنیو تو اندھا تھا
کھلایا تھا تجھے کیا تیری جورو نے مگر الو
میں جانتا تھا آگ لگی دل کو سیکھ ہو
یہ آنکھ کیا لگی مرے دل کو بلا لگی

ان اشعار کا اخلاقی یا فنی معیار کچھ بھی ہو لکھنو کی سوسا[ئٹی] میں اسے پسند کیا گیا اور پھر سوز کے پڑھنے کے انداز [نے] خوش اندازوں کو عجیب دلچسپی کا سامان مہیا کر دیا۔ اس کی قدردانی ہوئی کہ اگلے پچھلے سارے دکھ بھول گیا۔

یہ گرم بازاری جاری تھی کہ سودا کا انتقال ہو گیا۔ برسوں کی رفاقت نے دم توڑا تو بے اختیار مرثیہ سودا اس [کی] زبان پر آ گیا۔

حمد میں تیری اے خدائے سخن
اس زباں سے کہا نہ جائے سخن

لیکن پھر وہ اس نتیجے پر بھی پہنچا۔

سوز خاموش رہ کے کیا لے گا
زندگانی تو ہے برائے سخن

اس وقت سوز سے بڑا استاد لکھنو میں کون تھا۔ سودا [کی] وفات کے بعد نواب کی استادی کا شرف سوز کو حاصل ہوا۔ اس کے احترام اور خوش حالی میں مزید اضافہ ہو گیا۔

شعرائے دہلی سخاوت کی کہانیاں سن سن کر ایک ایک کر کے لکھنو کی طرف کوچ کر رہے تھے۔ سودا اور سوز تو پہلے [ہی] آ گئے تھے۔ مصحفی بھی پہنچے اور اب میر تقی میر سامانِ سفر باندھے تیار بیٹھے تھے کہ کوئی زادِ راہ بھیجے تو وہ لکھنو پہنچیں۔ خط و کتابت نے سالارِ جنگ کا دل پگھلا دیا۔ انہوں نے زادِ راہ روانہ کیا اور نواب آصف الدولہ سے ملاقات کے وعدے [پر] اسے لکھنو بلا لیا۔

میر اپنی تمام تر نازک دماغیوں کے ساتھ لکھنو آ گیا۔ سالارِ جنگ کے ہمراہ وہ دریائے گومتی کے کنارے [بنے] ہوئے اس محل تک گیا جو نواب کا دربارِ شاہی تھا۔ نواب اس وقت سیرِ گل گشت میں مشغول تھا۔ سالارِ جنگ اسے لے کر نواب کے سامنے پہنچ گئے۔

"آپ میر تقی میر ہیں؟" نواب نے نظر پڑتے ہی کہا۔

"بندے کو اسی نام سے پکارتے ہیں۔"

"ہم تو کب سے آپ کو یاد کر رہے تھے۔ آپ نے بہت دیر کی آنے میں۔"

"جامع مسجد دہلی کی سیڑھیاں کسی کو اتنی جلدی بلندی سے پستی کی جانب نہیں اُترنے دیتیں۔"

"آپ تو بلندی کی طرف آ رہے تھے۔"

"ایک بلندی سے اُتر کر ہی دوسری بلندی کی طرف آیا جاتا ہے۔"

نواب نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کمالِ شفقت سے اپنے [دربارِ] خاص میں آ گئے۔ نواب کے مصاحبین کھڑے [تھے۔ حکم] ہوا کہ میر کو زمرۂ شاہی میں ملازم رکھا جائے اور تین [سو روپے] تنخواہ لکھ دی جائے۔ اتفاق سے اسی وقت نواب کے [استاد] میر سوز بھی آ گئے۔ نہ سوز کے لیے میر اجنبی تھے نہ میر [کے] لیے سوز نا آشنا تھے۔ دہلی میں جب تک رہے تھے، ایک [دوسرے] پر چوٹیں ہی کرتے رہے تھے لیکن یہ دیارِ غیر تھا۔ [د]ونوں عرصہ دراز کے بعد ملے تھے۔ اچھی طرح ملے۔ دیر [تک] دہلی اور اہلِ دہلی کی باتیں ہوتی رہیں۔ نواب نے [افسر]دگی کے اس ماحول سے نکلنے کے لیے میر سے فرمائش کی کہ وہ کلام عطا کرے۔ سودا ہوتا تو اس موقعے کے لیے قصیدہ لکھ کر لایا ہوتا لیکن یہ تو میر تقی میر تھا۔ اس کی کائنات تو غزل تھی۔ اس نے غزل سنا دی۔ اس کے بعد نواب نے اصرار کر کے میر سوز سے غزلیں سنیں۔ ایک نہیں، دو نہیں مسلسل تین غزلیں۔ لکھنو کے رنگین ماحول میں میر کی افسردگی کیا رنگ [جم]اتی۔ اس کے مقابلے میں سوز نے غزلوں کا گلزار سجا دیا تو نواب نے تعریف کرنے میں اتنا مبالغہ کیا جیسے سوز سے بڑا کوئی شاعر ہی نہیں۔

نواب نے یہ حرکت جان بوجھ کر نہیں کی تھی۔ سوز، نواب کا استاد تھا۔ لکھنو کے معاشرے میں میر کی افسردہ شاعری کو پسند نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دربار سے باہر بھی سوز کی شاعری کو پسند کیا جا رہا تھا۔ اس کے بہت سے اہم ترین شاگرد تھے جن کے ذریعے مختلف مشاعروں میں اس کے نام کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ نواب کا اپنے استاد کی شاعری کو [سر]اہنا معمول کی بات ہوگی لیکن اس وقت میر تقی میر سامنے [تھ]ا۔ وہ تو اپنے سامنے کسی کو شاعر ہی تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اسے یوں لگا جیسے نواب نے اسے جان بوجھ کر نظر انداز کیا [ہے]۔ پھر میر نے اس جرأت کا مظاہرہ کیا کہ نواب آصف الدولہ کی جگہ کوئی اور نواب ہوتا تو میر کا لکھنو میں رہنا محال [ہ]و جاتا۔ وہ یہ بھول گیا کہ سوز اس وقت دہلی میں نہیں لکھنو [می]ں ہے اور یہاں کے نواب کا استاد ہے۔

اس نے سوز کو مخاطب کیا "موقع اور محل تمہاری شاعری کا وہ ہے جہاں لڑکیاں جمع ہوں اور ہنڈ کلیاں پکتی ہوں نہ کہ [ہم]ارے سامنے۔" اس نے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

سودا، نواب کے دربار کا شاعر رہ چکا تھا۔ نواب سے [ناز] نخرے اٹھواتا تھا لیکن یہ موقع دوسرا تھا۔ ابھی میر نے اس [کے] دل میں اتنی جگہ نہیں کی تھی کہ اس کے استاد کی بے عزتی [کر]ے اور نواب نظر انداز کر جائے۔ اس نے میر کو روکنے کی [بھی] کوشش نہیں کی۔

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

مارچ 2012ء

کے جھلملاتے

رنگوں کی دلکش عکاسی

سودے بازی

بہت انتظار کے بعد آخری صفحات پر **احمد اقبال**
کے قلم کا جادو... کچھ پانے اور کچھ کھو دینے کا اذیت ناک احساس....
وہ جو بہت بڑا بیوپاری تھا کبھی زندگی کی کوئی سچی خوشی نہ خرید سکا

شہید ہند

ابتدائی صفحات پر **ڈاکٹر ساجد امجد**
کے قلم سے، تاریخ کی ورق گردانی کرتے ہوئے
ایک اور عہد ساز شخصیت کے حالات زندگی......
گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی کو بہتر
جاننے والے ٹیپو سلطان کا دبنگ انداز حکومت

ضرورت مند

مرزا امجد بیگ کی جرح اور ایک ضرورت مند کا اقدام
قتل...... مگر افسوس اس بھکاری کی جھولی پھر بھی خالی رہی

مسافر

سلسلے وار صفحات پر **ناصر ملک** کا چونکا دینے والا طویل
سلسلہ۔ گل و گلزار سے راہِ پرخار تک ایک مسافر بے نوا کی روداد حیات

حضرت داؤد علیہ السلام

پرندوں کی زبان سمجھنے والے اور پتھروں کی پکار سننے والے
نبی کی سوانح...... انہیں نبوت اور بادشاہت بیک وقت ملی

اس کے علاوہ کشکول، محفل شعر و سخن، آپ کے خط

مزید
ابرارِ راحت، کاشف زبیر،
مختار آزاد، ڈاکٹر شیر شاہ سید،
سلیم انور اور تنویر ریاض کے دلکش شاہکار آپ کے منتظر

WWW.PAKSOCIETY.COM

میر اُٹھ کر چلا آیا اور گھر بیٹھ گیا۔

لکھنو کے معاشرے میں جس چٹخارے، معاملہ بندی، محاورہ بندی اور رنگینی سے لبریز شاعری کی ضرورت تھی۔ اس کو میر سوز کی شاعری پورا کررہی تھی۔ میر اگر کسی طرف نکل بھی جاتا تو اجنبی نظر آتا۔ سوز استادِ وقت تھا۔ نواب کا استاد تھا۔ شاگردوں کے ہجوم میں اس کی سواری جب مشاعروں میں پہنچتی تو دھوم مچ جاتی۔ میر تقی میر اس اجنبیت کے باوجود اپنے لیے جگہ بنا سکتا تھا لیکن مزاج کی تلخی نے اسے کسی کے قریب بیٹھنے ہی نہیں دیا۔

مرزا محمد تقی خاں ترقی کے گھر مشاعرہ تھا۔ مرزا کا شمار سوز کے تلامذہ میں ہوتا تھا۔ سوز کسی وجہ سے اس مشاعرے میں شریک نہیں تھا۔ میر اسی لیے آمادۂ شرکت ہوگیا تھا۔ جرأت، انشا، رنگین جیسے نوجوان شریک تھے اور یہ سب کے سب سوز کے تلامذہ میں شامل نہ سہی اس کے تربیت یافتہ ضرور تھے۔ سوز کے رنگِ شاعری ہی سے متاثر تھے۔ اسی کے رنگِ شاعری کو آگے بڑھا رہے تھے۔

جرأت نے کلام پڑھا تو ایسا شور مچا کہ خدا کی پناہ۔ میر کی نظروں میں یہ کلام ہرگز اس قابل نہیں تھا کہ اس پر اس قدر داد دی جائے۔

میر تقی میر ناخوش بیٹھا تھا بلکہ اس کے ماتھے کی شکنیں بتا رہی تھیں کہ اسے یہ سب کچھ ناگوار گزر رہا ہے۔ جرأت کلام پڑھنے کے بعد اس کے پاس آکر بیٹھ گئے۔

''حضرت، آپ نے میرا کلام سماعت نہیں کیا؟''

''میں نے سنا۔''

''توجہ نہیں کی۔''

''وہ بھی کی۔''

''میں چاہتا ہوں میرے کلام پر آپ اپنی رائے دیں۔''

اس گزارش پر میر نے جو جواب دیا وہ تاریخ کا حصہ بن گیا ''بات یہ ہے کہ شعر تو تم کہنا نہیں جانتے ہو۔ اپنی چوماچاٹی کرلیا کرو۔''

ایسا عجیب وغریب جواب جرأت نے کبھی نہیں سنا تھا۔

جب نخوت کا عالم یہ ہو تو کون اس کے قریب بیٹھتا۔ اور یہ کوئی ایک مرتبہ کا قصہ نہیں تھا۔ آئے دن یہی ہوتا رہا۔ سوز کی طبیعت میں شر انگیزی نہیں تھی ورنہ وہ لوگوں کو میر کے خلاف کھڑا کرکے طوفان اُٹھا سکتا تھا۔

میر کو یہ گوارا نہیں تھا کہ جسے یعنی سوز کو وہ اپنے سے کم مرتبے کا شاعر سمجھتا ہے۔ اسے لوگ استادِ سخن کا درجہ دیں۔ وہ لکھنو کے شعرا کی بے عزتی کرکے اپنی دانست میں میر سوز سے بدلہ لے رہا تھا۔

دہلی میں ضابطہ خاں کا بیٹا غلام قادر روہیلہ علم بغاوت بلند کرچکا تھا۔ اس نے قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ شاہ عالم کی آنکھوں میں سلائیاں پھیر کر اسے معزول کردیا تھا۔

پھر یہ ہوا کہ اندھا بادشاہ مرہٹوں کی مدد سے دوبارہ تخت پر بیٹھ گیا مگر اب اس کی آنکھیں کہاں تھیں۔ وہ مرہٹوں کی آنکھوں سے دنیا کو دیکھ رہا تھا۔

میر تقی میر لکھنو سے بددل تھا لیکن دہلی واپس جاکر کیا کرتا؟ یہاں بے توقیری کے باوجود تین سو روپے ماہانہ کا وظیفہ مل رہا تھا۔ وہ بے دلی سے لکھنو میں پڑا رہا۔

سوز کا حال بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ اس کی تمام شوخیاں صرف اس لیے تھیں کہ اس خوش وخرم معاشرے میں اس شوخی کی ضرورت تھی ورنہ اندر سے وہ بھی اتنا ہی سنجیدہ تھا۔

بستیاں بستی ہیں اور اُجڑے نگر آباد ہیں
وے کہاں جن کے جدا ہونے سے ہم ناشاد ہیں
نام کو محبوب صورت مہر و مہ سے بھی دو چند
گر عمل دیکھو تو پھانسی گیر یا جلاد ہیں
اے عزیزو اُٹھ گئے دنیا سے یوسف طلعتاں
اور جو باقی ہیں سو فرعون ہیں شداد ہیں
کان رکھ کر سنیو اس ڈھب کی سخن کرتا ہے سوز
حالتِ غم میں بھی جس کو شوخیاں یہ یاد ہیں

نام ونشاں تھا جن کا بڑا آن شان میں
نام ونشاں ان کا نہیں اب جہان میں
آئینہ سا غبار تھا مکھڑے کا جن کے رنگ
وہ تہ بہ تہ بسے ہیں اسی خاکدان میں

کوئی اگر اس کے سامنے میر کی مخالفت کا ذکر بھی کرتا تو جواب میں بُرے بھلے الفاظ کہنے کے بجائے یہ کہہ کر چپ ہوجاتا۔

خموش حسن کی مجلس میں خصم جاں ہیں تمام
مثال شمع جلانے کو یک زباں ہیں تمام
جنہوں کو بات نہ کہہ آئی ساری عمر کبھی
ہمارے عیب کے چننے کو نکتہ داں ہیں تمام
میں کس کا نام لوں کیا پوچھتے ہو چپ کر جاؤ
نہیں ہے غیر کوئی میرے مہرباں ہیں تمام

کمال یہ ہے کہ یہی بجھا ہوا دل جب لکھنو کے مشاعروں [illegible] ہوتا تو خاطر دوستاں کے لیے اور رنگِ شاعری کا [illegible] کے لیے یوں مخاطب ہوتا۔

[illegible] کہتے کہ خط پڑھ کر کئی ایک گالیاں دی ہیں
جو میں پوچھا یہ قاصد سے کہ کچھ انعام لے آیا
ہوتا نہیں ہے مجھ سے تو اے بدگماں صاف
دیتا ہے گالیاں تو مجھے آن آن صاف
کہتا ہوں میں کہ میری تو تقصیر کچھ بتا
کہتا ہے ہوتی ہے مری تجھ پر زباں صاف
سوز کا دل خوش ہوا جاتا ہے وعدے سے میاں
پر غضب ہے وقت آنے پر مکر جاتے ہو تم

شاہ عالم بادشاہ کے صاحب زادے سلیمان شکوہ غلام قادر روہیلہ سے جان بچا کر لکھنو پہنچے تو آصف الدولہ نے ان کی بہت مدارات کی۔ ان کا دربار لگا تو لکھنو کی شاعرانہ رونق میں چار چاند لگ گئے۔ شاعری کا ایک ایسا قدردان پیدا ہوگیا جس نے مقابلے کی فضا پیدا کردی۔ وہ اپنی محل سرا میں مشاعرے منعقد کرتے تھے۔ جرأت، رنگین اور انشا کی شاعری کی گرم بازاری اسی دربار سے شروع ہوئی۔ مصحفی اور انشا کے معرکے بھی اسی دربار سے شروع ہوئے۔ دونوں کے شاگردوں نے ایک دوسرے کے استادوں کے خلاف غزلیں لکھیں جو تاریخ میں محفوظ ہیں۔ سوز کی عمر اب ایسی نہیں تھی کہ وہ ان جھگڑوں میں پڑتا لیکن وہ بھی کبھی ان مشاعروں میں شریک ضرور ہوتا تھا۔ سلیمان شکوہ اس کی قدر افزائی کرتے تھے اور انعام واکرام سے نوازتے رہتے تھے۔ میر لکھنو میں موجود تھے لیکن ان مشاعروں میں بھی نہیں دیکھے گئے اس کے [illegible] میر سوز درجۂ استادی پر فائز تھے اور لوگ ان کی گواہی کو [illegible] سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب ایک مرتبہ سلیمان شکوہ کے دربار [illegible] مصحفی کو اپنی قدردانی میں کمی نظر آئی تو مصحفی نے شہزادے کی خدمت میں ایک قصیدہ گزارا۔ اس میں اپنی تعریف کی اور [illegible] کی سند میں سوز کا نام پیش کیا کہ سوز ان کی ستائش [illegible] کرتے رہے ہیں۔ گویا سوز کا کسی شاعر کی تعریف کرنا [illegible] کی نشانی اور قابلیت کی سند سمجھا جاتا تھا۔

وہی ہوں میں کہ جسے میر سوز سلمہ
کرے ہے یاد بہ لفظ ستائش موقوز

یہی نہیں بلکہ اس وقت لکھنو کا ہر شاعر اس کی پیروی میں [illegible] کر رہا تھا۔ کوئی اس کی شوخی وظرافت کا گھائل تھا۔ کوئی اس کی طرح محاورہ بندی کر رہا تھا۔ کوئی معاملہ بندی کا اسیر تھا۔ کسی کو اس کی سادہ بیانی نے اپنا قیدی بنا رکھا تھا۔ وہ ایک ایسے شاعر کا روپ اختیار کرچکا تھا جو تاریخ بناتے ہیں۔

کیا آپ
لبوب مُقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مُقوّی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوّی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مُقوّی اعصاب ٹیلیفون کرکے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں فون صُبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی یونانی دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

WWW.PAKSOCIETY.COM

تمام شاعر اس کی غزلوں پر غزلیں لکھ کر اسے دادِ تحسین پیش کر رہے تھے۔

مصحفی جیسا شاعر اس کی غزلوں پر غزلیں لکھ رہا تھا۔ سوز نے غزل لکھی۔

جو تو یونہی آنکھیں چُراتا رہے گا
تو حسرت بھرا جان جاتا رہے گا

مصحفی نے غزل لکھی۔

جو دل اس کے کوچے میں جاتا رہے گا
تو البتہ وہ تلملاتا رہے گا

سوز نے غزل کہی تھی۔

جاتا ہے دل تو جا، ذرا ہشیار آج کل
چلتی ہے اس کے کوچے میں تلوار آج کل

جرأت نے بھی اس زمین میں غزل لکھی اور سوز کے خاص رنگ میں لکھی۔

کیا جانے کیا کرے گا وہ بیمار آج کل
رکھتا بہت ہے ہاتھ میں تلوار آج کل

انشاء اللہ خاں انشا نے تو بہت کھل کر سوز کی پیروی میں قدم بڑھایا۔ سوز نے عشقیہ مضامین کو ایک نیا رنگ دیا تھا۔ ایک ایسا ''اچکا'' محبوب تخلیق کیا تھا جس سے وہ چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے تھے۔ وہ بھی جواب میں ایسا ہی جواب دیتا تھا جس سے شوخی وظرافت کی فضا پیدا ہوتی تھی۔ اس شاعری کے موجد میر سوز ہی تھے جوان کے زمانے ہی میں انشاء اللہ خاں کی شکل میں نظر آئی اور بہت بعد میں داغ دہلوی کی شاعری میں یہ فضا نظر آئی بلکہ یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ غالب کے ہاں جو طنز و مزاح ملتا ہے اس کی ابتدا میر سوز نے کی۔ سوز نے ادا بندی کی اس شاعری کو حد اعتدال میں رکھا تھا لیکن انشا نے اسے ابتذال اور فحاشی کے حدوں تک پہنچا دیا۔ رنگین نے ریختہ کے وزن پر ''ریختی'' ایجاد کی یعنی عورتوں کی زبان میں شاعری۔

اس کا آغاز بھی سوز ہی نے کیا تھا۔ اس نے پہلی بار غزل میں عورتوں کی زبان کو رواج دیا۔ عورتوں کے مخصوص محاوروں کو غزل میں استعمال کرنے کا سہرا اسی کے سر ہے۔

طفل کہیے کس طرح سے اشک کو
یہ تو گھر کھویا بڑا طوفان ہے
میں کہا دل میں درد ہے میرے
سن کے کہنے لگا خدا نہ کرے
پھر جو کچھ دل میں آ گیا تو کہا
مجھ کو پیٹے اگر دوا نہ کرے

یہی طرز ادا بعد میں ریختی کی صورت اختیار کر گئی۔

میں جو لپٹا تو وہ گھبرا کے یہ بولے کہ سرک
چھوڑ دے مجھ کو کسی اور سے یہ پیار نکال

صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سامنے میر سوز کے اشعار اور ان کا طرز بیان ہے۔

ایک دن اس شوخ سے میں لگ چلا
کہنے لگا مجھ سے یہ کیا حال ہے
بس دوانہ مت ہو اپنے تئیں سنبھال
ان دنوں کچھ زور تیری چال ہے

سوز کے اس طرز کی گونج اردو شاعری میں بڑی دور تک سنائی دی۔ بہادر شاہ ظفر کی شاعری اس کی مثال ہے جنہوں نے اپنی غزلوں میں بیگماتی زبان کے کئی اچھے نمونے مہیا کیے۔

سوز دل اپنا ان سے جو میں نے بیاں کیا
کہنے لگے کہ آگ ترے جھوٹ پر پڑے

اس دشت شاعری کی سیر کو نکلے اسے ساٹھ سال گزر گئے تھے۔ یہ طویل سیاحت اس نے اس دور میں گزاری جو غزل کا سنہری عہد تھا۔ یہاں سودا تھے، درد تھے، میر تقی میر تھے۔ وہ خود تھا اور سیکڑوں دوسرے شعرا تھے جنہوں نے شہر غزل آباد کیا۔ فارسی شاعری کے نمونے پر شہر غزل آباد کیا۔

ان اساتذہ نے غزل کا مزاج ملحوظ رکھتے ہوئے اس میں نئے نئے تجربے کیے اور فکر و فہم کے نئے نئے پھول کھلائے۔ ان اساتذہ کے تلامذہ نے اس روش کو مضبوطی سے اختیار کیا اور اسلوب و آہنگ کے خاص معیار قائم کیے لیکن یہ بھی طے شدہ امر تھا کہ اساتذہ نے جو اسلوب مقرر کر دیا تھا اس کی پیروی لازمی تھی۔ ایسے ادبی ماحول میں وہ پہلا شاعر تھا جس نے اپنی طرز الگ نکالی اور ایک نئے انداز کو پیش کیا۔

وہ بہ لحاظ عمر میر تقی میر سے بارہ سال بڑا تھا۔ سودا بھی اس سے چھوٹے تھے اور خواجہ میر درد بھی۔ گویا اس نے ان شعرا سے پہلے اردو غزل میں نئے نئے پھول کھلائے۔ صرف ایک سودا تھے جو اس سے پہلے شعر گوئی کا آغاز کر چکے تھے لیکن ان کی زبان قصیدے کی تھی نہ کہ غزل کی۔ اس لحاظ سے اوّلیت کا شرف میر سوز ہی کو حاصل تھا۔

☆☆☆

میر سوز کو دربارِ آصفیہ سے وابستہ ہوئے صرف آٹھ سال ہوئے تھے۔ ان آٹھ برسوں میں کوئی عیش ایسا نہیں تھا جو اسے فراہم نہ ہو گیا ہو۔ آصف الدولہ کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ لکھنؤ میں یہ مقولہ عام تھا ''جس کو نہ دے مولا اسے دے

آصف الدولہ'' سوز تو نواب کا استاد تھا۔ دستِ سخاوت سے اچھا فیض یاب ہوا ہوگا۔

عیش اور فراغت کے یہ دن طویل ثابت نہ ہوئے بلکہ یہ فراغت اس کے ہاتھ پکڑ کر اس راہ لے گئی جہاں وہ اگلے آٹھ برسوں تک کانٹوں پر چلتا رہا۔

اس کے بیٹے میر مہدی نے ہوش کی منزلیں طے کیں تو باپ کے نقشِ قدم پر چل کر شاعری کرنے لگا اور داغ تخلص اختیار کیا۔ میر سوز جن صعوبتوں سے گزرا تھا، اس کے بیٹے نے اپنے ہوش میں وہ بُرے دن نہیں دیکھے تھے۔ آنکھ کھولی تو گھر میں عیش وعشرت کا سماں دیکھا۔ بڑھاپے میں اللہ نے اولاد دی تھی لہٰذا سوز کا لاڈ پیار بھی دیدنی تھا۔ لکھنؤ کا بگڑا ہوا سماجی ماحول سامنے تھا اور میر مہدی کا عالم نوجوانی تھا۔ کسی دن بازاری سے دل لگا بیٹھا۔ جب تک عالمِ وصال رہا، رہا پھر ہرجائی محبوب نے بے وفائی کی۔ میر مہدی کی جان پر بن آئی۔ ہر وقت اُداس اور کھویا کھویا رہنے لگا۔ وارفتگی اور آشفتگی نے بسترِ مرگ پر پہنچا دیا۔ آخر اسی غم میں اس نے گھل گھل کر جان دے دی۔

میر سوز پوچھتے رہ گئے۔

بھلا کچھ ان دنوں مغموم ہو غم خوار کس کے ہو
کسے اب گھورتے ہو دیدۂ خوں بار کس کے ہو

اور وہ دنیا سے اُٹھ گیا۔

بیٹے کی موت نے باپ کی کمر توڑ دی۔ وہ بیٹا جس کو بہت منتوں سے پالا تھا داغِ مفارقت دے گیا۔ سوز جو نہایت ظریف، بزلہ سنج اور خوش مزاج تھے یاس والم کی تصویر بن کر رہ گئے۔

آجا مری منتوں کے پالے
اے پیارے جھنڈولے بالوں والے
تو سامنے میرے اُٹھ گیا ہائے
میں مر نہ گیا تری بلا لے
تاریک ہوا جہان تجھ بن
اے میرے اندھیرے کے اُجالے
وہ شرم سے تیرے مسکرانا
اے پتلے ہی پتلے ہونٹوں والے
دل چاہتا ہے پھر بھی دیکھوں
اک آن تو پھر مجھے دکھالے
یا آن کے پاس بیٹھ میرے
یا پاس تو اب مجھے بلالے

پہلی عید آئی تو بوڑھے باپ کو نوجوان بیٹے کی یاد آئی۔

ہوئے ایسے ہی تم نظروں سے اب بابا کے گم مہدی
مبارک باد کو بھی عید کی آئے نہ تم مہدی

اب وہ تھا اور موت کا انتظار تھا کہ دوسری دنیا میں اپنے نورِ نظر کو دیکھ کر آنکھوں کو روشن کرے۔

یہ تو معلوم ہے تم ملنے نہ آؤ گے ہمیں
پر یہ فرماؤ کہ کس روز بلاؤ گے ہمیں

اس نے بس دنیا چھوڑ کر جنگل کی راہ نہیں لی ورنہ تقریباً فقیری اختیار کر لی۔ شاعری کا رنگ بھی تبدیل ہو گیا۔ آصف الدولہ بھی اب اسے زیادہ زحمت نہیں دیتے تھے۔ کبھی کبھی جوگی کے پھیرے کی طرح دربار میں جا نکلتا تھا۔

اِدھر آصف الدولہ بھی اپنے بکھیڑوں میں گرفتار تھا۔ اس کی کمزوریوں نے اودھ کی شہ رگ پر انگریزوں کے قدم جما دیے تھے۔ وہ انگریزوں کو خوش رکھنے کے لیے اپنی دولت پانی کی طرح بہا رہا تھا مگر معشوق تھا کہ مانتا ہی نہیں تھا۔ اسے اپنی بے بسی اور انگریز کی برتری کا شدت سے احساس تھا۔ اسی احساس نے اسے بیمار ڈال دیا۔ اور پھر ایک دن لکھنؤ نے سیاہ ماتمی لباس پہن لیا۔ نواب آصف الدولہ کا انتقال ہو گیا۔

یہ کسی عام آدمی کی موت تو تھی نہیں۔ آصف الدولہ مرا تھا۔ سیکڑوں موسیقار، گویے، رقاص یتیم ہو گئے۔ بٹیر بازی، مرغ بازی، پتنگ بازی کا مزہ جاتا رہا۔

سوز کا سہارا ابھی یہی دربار تھا۔ بیٹے کی موت کے بعد اس نے دربار جانا موقوف کر دیا تھا۔ وہ دربار جاتا نہیں تھا

غزل

گزر گئے اس جہاں سے یار و فقرا امرا و شاہ لاکھوں
طریق پر کوئی کوئی آیا وگرنہ بھٹکتے ہیں راہ لاکھوں

بلا تردد، بلا تامل، بلا تصنع، بلا تعلّی
امید بخشش ہے جب سے ہم کو کیے ہیں ہم نے گناہ لاکھوں

زبان اپنی سنبھال ظالم، یہ گالیاں کس کو دے رہا ہے
مجھے نہیں ایک کی تحمل سناتا ہے خواہ مخواہ لاکھوں

قتیل مژگاں کی گور پر کل نظر پڑا دور سے نشاں اِک
جو پاس جا کر کیا تفحص نکلتے تھے نالہ و آہ لاکھوں

کسی نے اس کو جتا کے پوچھا کہ دیکھو سوز کیا یہی ہے
مجھے جو دیکھا تو ہنس کے بولا پھرے ہیں اسے تباہ لاکھوں

(میر سوز)

WWW.PAKSOCIETY.COM

نکلیں چلا سکتا تھا۔ اب یہ امید بھی ختم ہوئی، تنخواہ آتی تھی، اب کیا ہوگا؟

کچھ دن در و دیوار لڑکھڑائے پھر سب کچھ ٹھیک ہوگیا۔ نواب سعادت علی تخت پر بیٹھے تو وہ لوگ جو آصف الدولہ کی زندگی میں اس کی رفاقت کا دم بھرتے تھے، نئے بادشاہ کے گرد جمع ہونے لگے۔ جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ سوز دل مسوس کے رہ گیا۔

نہیں سوز دل سے کوئی بھی نہ رویا
پھر ان سے امید وفا کیا بجا ہو

سوز تو اسی دربار میں دھونی رما کر بیٹھ گیا تھا۔ آصف الدولہ کے اُٹھتے ہی وہ بیٹھ گیا۔ وہ جتنے درباروں سے وابستہ رہا کسی کی مدح میں کچھ نہیں کہا۔ آصف الدولہ وہ خوش قسمت تھا جس کی مدح میں اس نے مدحیہ قصیدہ لکھا تھا۔ اب وہ کسی کی مدح نہیں کرسکتا تھا۔

آصف الدولہ کے انتقال کے چند ماہ بعد ہی 1798ء میں اس کا بھی انتقال ہوگیا۔

جرأت نے مرثیہ لکھا۔

سوز ماتم نے میر سوز کے آہ
شمع ساں بس جلادیا دل کو

مٹ گیا لطف ریختہ گوئی
خاک پھر دے سخن مزا دل کو

خاک میں مل گئی ادا بندی
گفتگو اب خوش آوے کیا دل کو

کہی جرأت نے روکے یہ تاریخ
داغ اب سوز کا لگا دل کو

1213ھ مطابق 1798ء

میر سوز نے کس جگہ وفات پائی اور کہاں دفن ہوئے۔ اس بارے میں مختلف روایتیں ہیں۔ بعض لوگ لکھنو بتاتے ہیں۔ بعض نے لکھا ہے کہ ان کی وفات تلہر، ضلع شاہجہاں پور میں ہوئی۔

اس رائے کی تصدیق اس طرح ہوتی ہے کہ لکھنو میں اس کے مزار کا کہیں نشان نہیں ملتا۔ اب یہی کہا جاسکتا ہے کہ ان کی وفات لکھنو میں ہوئی ہو اور دفن تلہر میں ہوئے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تلہر ہی میں کسی تعلق کی بنا پر مقیم ہوں اور وہیں وفات پائی ہو۔ وہ اگر آخری دنوں میں لکھنو میں ہوتے تو نواب سعادت علی خاں اسے ضرور بلاتے لیکن آصف الدولہ کی موت کے بعد اس کا کہیں نام نہیں آتا۔ سوال یہ بھی ہے کہ اگر اس کی تدفین تلہر ضلع شاہجہاں پور میں ہوئی تھی تو وہاں قبر کا کوئی نشان ہوتا۔

مقام عبرت ہے کہ کیسے کیسے ناموروں کو دنیا کتنی جلد بھول جاتی ہے۔

ان کی عمر کے بارے میں بھی بحث و مباحث ہوتے رہے لیکن خلاصہ یہ نکلا کہ وہ 1124ھ مطابق 1712ء میں پیدا ہوا اور 1219ھ مطابق 1798ء میں وفات پائی۔ وفات کے وقت ان کی عمر 86 سال تھی۔ اس کا ایک بیٹا قدرت علی زندہ رہا جس سے اس کی نسل چلی۔

کہتے تو ہیں سب ریختہ اس دور میں لیکن
اس فن میں کوئی سوز سا ممتاز نہیں ہے

غزل

جاتا ہے تو دل تو جا ذرا ہشیار آج کل
چلتی ہے اس کے کوچے میں تلوار آج کل

کوئی دوا نہیں ہے موثر بغیر وصل
مرتا ہے تیرے غم میں یہ بیمار آج کل

گر زمزمہ یہی ہے تمہارا تو بلبلو
ہوتا ہوں اس چمن کا گرفتار آج کل

عرصہ سمجھ بہار کا ساقی پہنچ شتاب
گھٹتا ہے اس چمن سے یہ گلزار آج کل

گر ہے ترا سلوک یہی ہم سے اے صنم
بت سے کریں گے برہمن انکار آج کل

مت چل تو اس لٹک سے کہ ظالم قدم تلے
مل ڈالے گی جہاں کو یہ رفتار آج کل

ایسی زباں کے عہد سے بر آوے کیا کوئی
اے سوز ہے جو کچھ تری گفتار آج کل

(میر سوز)

ماخذات: سید محمد میر سوز، پروفیسر ڈاکٹر سردار احمد خاں لکھنو کا دبستان شاعری، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

سربلند

مریم کے خان

اس نے بلند و بالا پہاڑوں کو سر کرنے کے لیے کیسے کیسے جتن کیے، کیسی کیسی صعوبتیں اٹھائیں اور ان چوٹیوں کو سر کیا جہاں تک پہنچنے کے لیے مہم جو خواب دیکھا کرتے تھے اور عام آدمی خوف سے پیلا پڑجاتا تھا مگر اس نے جب ان چوٹیوں کو سر کیا، فتح کا پرچم لہرایا تو دنیا بھر میں اس کی بدنامی پھیل گئی، لوگ اسے لعنت ملامت کرنے لگے۔

ایک مشہور مہم جو کی بدنامی کا تذکرہ، زندگی کے اہم واقعات

جوزف میسنر نے حسرت سے کوہ الپس کی چوٹیوں کو دیکھا۔ وسطِ یورپ کے ان پہاڑوں پر سارے سال برف کی موٹی چادر موجود رہتی ہے اور یورپ میں رہنے والے کوہ پیما ہمیشہ الپس سے اپنی کوہ پیمائی کا آغاز کرتے ہیں۔ جوزف اسکول ٹیچر تھا لیکن کوہ پیما بننا اس کا ہمیشہ سے خواب رہا تھا۔ جوانی میں اس نے کئی چوٹیاں سر کی تھیں۔ لیکن جب اس کے بہترین دن تھے تو یورپ دوسری جنگِ عظیم کی لپیٹ میں آگیا اور جوزف بھی رضا کار بن کر ملک کی خدمت کرنے لگا۔

جوزف میسنر بنیادی طور پر جرمن تھا اور جنگ سے پہلے اس کا خاندان جرمنی چھوڑ کر اٹلی میں آباد ہوگیا تھا۔ اس کے گھر میں جرمن زبان بولی جاتی تھی۔ شمالی اٹلی میں کوہ الپس کا سلسلہ اسے اتنا بھایا کہ وہ اس کے نزدیک کی ریاست برلیس نان کے قصبے بریکسن میں آباد ہوگیا۔ ممکن ہے جوزف ان جرمنوں میں سے ہو جو جرمنی میں ایک فاشسٹ حکومت کے قیام کے مخالف تھے اور جب وہاں ہٹلر برسر اقتدار آیا تو انھوں نے جرمنی سے نکل جانا مناسب سمجھا۔ مگر جوزف نے کبھی جرمنی چھوڑ کر اٹلی میں آباد ہونے کی وجہ نہیں بتائی تھی۔ اس نے ایک جرمن خاتون سے شادی کی تھی اور اٹلی کی شہریت حاصل کرنے کے بعد اس نے استاد کا پیشہ منتخب کیا تھا۔

جس فاشسٹ حکومت سے وہ جان چھڑا کر اٹلی آیا تھا۔ وہ مسولینی کی صورت میں اٹلی میں آگئی تھی۔ پھر جنگِ عظیم کا آغاز ہوا اور اٹلی نے جرمنی کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ اتحادی فوج اٹلی پر چڑھ دوڑی تھی۔ آئے دن طیارے بمباری کرتے تھے۔ اس بمباری سے عام قصبے اور دیہات بھی محفوظ نہیں تھے۔ بریکسن بھی کئی بار بمباری کا نشانہ بنا تھا۔ چھ سال تک جوزف اور اس کے خاندان نے رات تاریکی میں گزاری تھی۔ بلیک آؤٹ کا حکم اتنا سخت تھا کہ روشنی کرنے والوں کو فوراً گولی ماردی جاتی تھی۔ ایمرجنسی کی صورت میں بھی کسی کو روشنی کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ 1944 کا سال تبدیلیاں لا رہا تھا۔ جرمنی کی شکست کے آثار نمایاں ہوتے جا رہے تھے اور اٹلی میں بھی مسولینی اور جرمنوں کے خلاف تحریک مزاحمت بڑھ رہی تھی۔ آئے دن چھاپہ مار حملے

WWW.PAKSOCIETY.COM

کر ... دھماکے ہوتے اور گولیاں چلتی تھیں۔

جوزف اور اس کی بیوی عام لوگ تھے۔ اس لیے وہ سہمے ہوئے اپنے گھروں میں محصور رہتے تھے۔ ایسے میں جوزف کی بیوی امید سے ہوگئی۔ اس کی حالت خراب تھی اور جب وہ راتوں کو درد سے تڑپتی تو جوزف روشنی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پھر ایسی ہی ایک رات جب بلیک آؤٹ تھا اور کہیں ایک ماچس کی تیلی جلانے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ مسز جوزف کو دردِ زہ شروع ہوگیا اور اس نے تاریکی میں ایک بیٹے کو جنم دیا۔ یہ 17 ستمبر 1944 کی ایک سرد رات تھی۔ جوزف کو اس بیٹے کی آمد اچھی نہیں لگی تھی جس نے آکر ان کی مشکلات میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ لیکن بہر حال وہ اس دنیا میں آ گیا تھا۔ بچے کو رین ہولڈ میسنر کے نام سے بپتسمہ دیا گیا تھا۔ اس وقت کوئی نہیں جانتا تھا کہ آنے والے وقت میں اس بچے کا نام دنیا بھر میں جانا جائے گا۔

رین ہولڈ میسنر خاموش اور خود میں گم رہنے والا بچہ تھا۔ اس کے ماں باپ بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ تین چار سال کی عمر میں بھی وہ کسی گوشے میں بیٹھ کر اپنی سوچوں میں گم ہو جاتا تھا۔ جوزف نے ایک دن اپنی بیوی سے کہا۔ ”مجھے لگتا ہے یہ کاہل ہے اور اسے جسمانی کام کرنے سے نفرت ہے۔“

”نہیں میرا بیٹا سوچنے والے لوگوں میں سے ہے۔“ ماں نے فخر سے کہا۔ ”تم دیکھ لینا یہ جو کام کرے گا اس میں بہت اوپر جائے گا۔“

لیکن جوزف بیوی کے خیال سے متفق نہیں تھا۔ وہ خود کوہ پیما تھا اور جسمانی کاموں میں اسے مشکل ترین کام سمجھا جاتا ہے۔ اس نے ننھے میسنر کو کوہ پیمائی سکھانے کا فیصلہ کیا۔ اس کی بیوی کو پتا چلا تو اس نے مخالفت کی تھی کہ میسنر ابھی بہت چھوٹا ہے کیونکہ وہ پانچ سال کا بھی نہیں ہوا تھا اور اسے اسکول میں بھی داخل نہیں کرایا گیا تھا لیکن جوزف نے بیوی کی مخالفت کی پروا کیے بغیر میسنر کو کوہ پیمائی کے اسرار و رموز سکھانا شروع کر دیے۔ جوزف کا خیال تھا کہ لڑکا آسانی سے یہ کام کرنے پر آمادہ نہیں ہوگا اور اسے سختی کرنا پڑے گی اور اس نے اپنا رویّہ بھی درشت ہی رکھا تھا لیکن اسے حیرت ہوئی جب میسنر نے پوری دلچسپی سے کوہ پیمائی سیکھنا شروع کی اور وہ پانچ سال کی عمر میں اپنی ہمت سے بڑھ کر کام کرنے لگا تھا۔ جوزف نے اپنی ڈائری میں لکھا۔ ”رین میری توقع سے بڑھ کر تیزی سے سیکھ رہا ہے۔ شاید وہی میرے خواب کی تعبیر بن جائے۔“

میسنر کا بھائی گنتھر اس سے دو سال چھوٹا تھا۔ جوزف فیملی پلاننگ کا قائل نہیں تھا کیونکہ رین ہولڈ سمیت اس کے آٹھ بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ جب وہ پانچ سال کی عمر کو پہنچا تو جوزف نے اسے بھی کوہ پیمائی کا سبق دینا شروع کر دیا۔ اس بار اس کی بیوی نے مخالفت نہیں کی تھی کیونکہ وہ دیکھ چکی تھی اس کے بیٹوں کو کوہ پیمائی اور مہم جوئی کا شوق ہے۔ ایک طرف میسنر کوہ پیمائی کا سبق لے رہا تھا تو دوسری طرف جوزف نے اسے اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ اسکول اس کے لیے ... دلچسپی کی ایک اور دنیا ثابت ہوئی تھی۔ عام طور سے جو بچے جسمانی کاموں میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں ان کے لیے تعلیم بوجھ بن جاتی ہے۔ لیکن میسنر شروع سے اچھا طالب علم ثابت ہوا تھا۔ وہ ہوم ورک باقاعدگی سے کرتا اور تمام ٹیسٹ پوری تیاری کے ساتھ دیا کرتا تھا۔ کیونکہ گھر میں وہ جرمن بولتے تھے اس لیے میسنر نے غیر ملکی زبان کے طور پر جرمن زبان کا انتخاب کیا تھا۔ جبکہ اٹالین اس کی مادری زبان نہیں تھی لیکن وہ اسے ملک کی زبان کے طور پر پڑھ رہا تھا۔

جب جوزف میسنر اور اس کے بھائیوں کو کسی مہم پر لے جاتا تو میسنر کے پاس لازمی اس کی کاپی یا کوئی نصابی کتاب ہوتی تھی۔ مہم کے دوران جب دوسرے سستاتے تھے تو وہ اپنا کام کرنے بیٹھ جاتا تھا یا سبق یاد کرتا۔ تعلیم اور اس سے بھی زیادہ علم سے بھی دلچسپی ساری عمر اس کے ساتھ رہی تھی۔ جب اس نے اسکول کی مروجہ تعلیم مکمل کر لی تب بھی کوہ پیمائی کی کسی مہم پر جاتے ہوئے وہ اپنے پاس کوئی نہ کوئی کتاب رکھتا تھا۔ خاص طور سے جرمن کوہ پیماؤں کی لکھی کتابیں اس کی پہلی ترجیح ہوتی تھیں۔ مگر ساتھ ہی اسے ادب سے بھی دلچسپی تھی۔ جب وہ پہلی بار چوٹی کو سر کرنے کے لیے روانہ ہوا تو وہ یورپ کا بیشتر ادب چاٹ چکا تھا۔ اس ادب نے اس کی سوچ، گفتگو اور تحریر میں انوکھا پن، روانی اور تازگی بھر دی تھی اور یہی چیز اسے دوسرے کوہ پیماؤں سے ممتاز کرتی تھی۔

گیارہ برس کی عمر میں جوزف پہلی بار اسے بارہ ہزار فٹ سے زیادہ کی بلندی پر لے گیا تھا۔ اس بلندی پر کوہ الپس میں سارا سال برف جمی رہتی ہے اور اس سلسلے کی بیشتر چوٹیاں اس سے زیادہ بلند ہیں۔ اس کا بڑا حصہ اٹلی، جرمنی اور سوئٹزر لینڈ میں پھیلا ہوا ہے۔ اس مہم کے دوران اگرچہ انہوں نے کوئی چوٹی سر نہیں کی تھی۔ لیکن جوزف نے محسوس کیا کہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر میسنر بالکل نارمل انداز میں سانس لے رہا تھا اور ایک کوہ پیما کے لیے لازمی ہے کہ اس کے پھیپھڑے مضبوط ہوں ورنہ وہ اچھا کوہ پیما نہیں بن سکتا .... میسنر خوش قسمت ہے کہ قدرت نے اسے ناقابلِ یقین حد تک مضبوط

WWW.PAKSOCIETY.COM

... دیے ہیں۔

☆☆☆

میسنر نے مڑ کر اپنے بھائی گنتھر کو دیکھا۔ وہ ایک کلہاڑی کی مدد سے اس برفانی چٹان کو عبور کر رہا تھا۔ گنتھر اس رسّی کو تھامے ہوئے تھا۔ جو میسنر کی کمر سے منسلک تھی۔ ذرا بلندی پر جاتے ہوئے میسنر چٹان میں کلپ لگا دیتا تھا اور پھر رسّی اس سے باندھ دیتا تھا۔ گویا وہ اس مہم کا لیڈر تھا۔ آج وہ اور گنتھر پہلی بار اکیلے کوہ پیمائی کے لیے نکلے تھے۔ جوزف نے ان سے کہا کہ وہ انہیں وہ سب سکھا چکا ہے جو اسے آتا تھا اور اب اگر ان کو کچھ سیکھنا ہے تو انہیں خود کوشش کرنا ہوگی۔ ویسے بھی جوزف عمر کی اس حد سے نکل گیا تھا جب وہ بلا جھجک بلندیوں کی طرف جا سکتا تھا۔ دوسرے اس نے محسوس کیا کہ اس کے بیٹے کوہ پیمائی میں اس سے کہیں آگے نکل گئے تھے اور ان کو مزید اس کی رہنمائی کی ضرورت نہیں تھی۔

چند برس پہلے جوزف اور اس کا خاندان بریکسن چھوڑ کر الپس کی ڈھلان پر آباد ایک اور قصبے ویلا نو چلا آیا تھا اور میسنر نے کوہ پیمائی کے بیشتر رموز یہیں سیکھے تھے۔ وہ ان سالوں کو اپنے بچپن کا سب سے خوشگوار حصہ سمجھتا ہے کیونکہ یہاں الپس کا سلسلہ بالکل اس کے سامنے تھا۔ اسکول سے آنے کے بعد اور اتوار کے دن اس کا بیشتر وقت ان پہاڑی ڈھلانوں پر گزرتا تھا۔ جب وہ پہلی بار بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچا اور اس نے باپ کا سہارا نہیں لیا تھا۔ اس دن سے اس کی خواہش تھی کہ وہ اکیلا یا کم سے کم لیڈر کی حیثیت سے کسی چوٹی تک پہنچے۔ لیکن وہ اپنی خواہش کا اظہار کرنے کے بجائے اپنے باپ کی طرف سے اجازت کا منتظر تھا۔ اسے اعتماد تھا کہ جب اس کا باپ محسوس کرے گا کہ وہ اس قابل ہو گیا ہے کہ اکیلا یا لیڈر کی حیثیت سے کسی مہم پر جا سکتا ہے تو وہ اسے روکنے کے بجائے خود اجازت دے گا۔

دونوں باپ بیٹے میں ذاتی تعلقات کسی قدر سرد تھے لیکن جہاں تک کوہ پیمائی کا تعلق تھا تو ان کا ذہن ایک ہی طرح کام کرتا تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے پر مکمل اعتماد تھا۔ اس لیے جب جوزف نے محسوس کیا کہ اب میسنر لیڈ کرنے کے قابل ہو گیا ہے تو اس نے اسے اکیلے جانے کی اجازت دے دی۔ مگر میسنر نے گنتھر کو لے جانے کی اجازت مانگ کر اسے مشکل میں ڈال دیا تھا کیونکہ گنتھر ابھی مکمل کوہ پیما نہیں بنا تھا۔ اسے سیکھنے کی ضرورت تھی۔ لیکن میسنر نے باپ کو یقین دلایا تھا کہ وہ اس کا پورا خیال رکھے گا اور اسے سکھائے گا۔ جوزف نے اسی شرط پر گنتھر کو ساتھ لے جانے کی اجازت دی تھی۔ دونوں بھائیوں نے کوہ الپس کے درمیانی سلسلے میں واقع ایک چھوٹی چوٹی کا رُخ کیا تھا جو زیادہ مشکل بھی نہیں تھی۔ جب چڑھائی شروع ہوئی تو میسنر آگے تھا اور گنتھر پیچھے۔

”اے تم ڈر تو نہیں رہے ؟“ میسنر نے اوپر سے پکارا۔

گنتھر نے بھائی کی طرف دیکھا اور مضبوط لہجے میں بولا۔ ”میں کبھی پہاڑوں سے نہیں ڈرا۔“

میسنر نے جواباً کہا۔ ”پہاڑوں سے ڈرنا چاہیے کیونکہ جو کوہ پیما پہاڑوں سے نہیں ڈرتا ہے وہ مردہ کوہ پیما ہوتا ہے۔“

”تم پہاڑوں سے ڈرتے ہو؟“

”ہاں۔“ میسنر نے سادگی سے کہا۔ ”کیونکہ میں ان پر چڑھنا چاہتا ہوں ان سے گر کر مرنا نہیں چاہتا۔“

دونوں بھائیوں نے اس دو دن کی کوہ پیمائی میں سترہ ہزار فٹ چوٹی کو سر کیا۔ اگرچہ دیکھا جائے تو یہ بلندی خاص نہیں تھی اور نہ ہی یہ کوئی مشکل چوٹی تھی لیکن جب ان بھائیوں نے چوٹی پر قدم رکھا تو میسنر تیرہ سال اور گنتھر صرف گیارہ سال کا تھا۔ دونوں ابھی جوانی کی سرحد سے بہت دور تھے لیکن اس روز انہوں نے اس چوٹی پر عہد کیا تھا کہ وہ صرف کوہ پیما بنیں گے اور اس کے سوا کوئی کام نہیں کریں گے۔ بعد میں میسنر نے بھائی کے ساتھ کیے اس عہد میں ترمیم کی اور وہ کوہ پیما کے ساتھ مہم جو بھی بن گیا اور پھر اس نے پہاڑوں کے بارے میں کتابیں لکھنا شروع کیں یعنی مصنف بھی بن گیا۔ مصنف بھی ایسا کہ اگر وہ ایک بھی چوٹی سر نہ کرتا صرف یہ کتابیں لکھ دیتا تب بھی اس سے زیادہ مشہور شخص پہاڑوں کی دنیا میں اور کوئی نہیں ملتا۔ اس مہم سے واپسی پر گنتھر نے ضد کی کہ اسے لیڈر بننے دیا جائے لیکن میسنر نے انکار کر دیا اس نے جوزف سے وعدہ کیا تھا کہ وہ گنتھر کا خیال رکھے گا اور وہ اپنا وعدہ بہر صورت نبھانا چاہتا تھا۔

☆☆☆

میسنر کی خوش قسمتی کہ جب اس نے ہوش سنبھالا تو دوسری جنگِ عظیم اپنی تمام تر ہولناکی سمیت ختم ہو چکی تھی اور جب وہ اسکول میں آیا تو اس کے آثار بھی ختم ہو رہے تھے۔ اس نے اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد پیشہ ور کوہ پیما بننے کا فیصلہ کیا تو یورپ اور اٹلی دونوں بہت تیزی سے ترقی کی منازل طے کر رہے تھے۔ اس وجہ سے کھیلوں میں پیسا آنے لگا تھا۔ واضح رہے کہ یورپ امریکا میں کوہ پیمائی کو کھیل سمجھا جاتا ہے اور اس کے ماہر افراد اس کام سے ایسے ہی کماتے ہیں جیسے فٹ بالر فٹ بال سے اور کرکٹر کرکٹ سے کماتے ہیں۔ اگرچہ کوہ پیمائی کی نوعیت ذرا مختلف ہے اس میں عوام

WWW.PAKSOCIETY.COM

براہ راست کوئی مقابلہ نہیں دیکھتے ہیں لیکن اس میں مقابلہ اصل میں ملکوں اور قوموں کے درمیان ہوتا ہے۔یورپ میں خاص طور سے ملکوں میں اس قسم کی مسابقت کا جنون ہے۔کوہ پیمائی میں سب سے بلند نام جرمن کوہ پیماؤں کا آتا ہے۔ان کے بعد برطانوی، فرانسیسی، اطالوی، سوئس اور اسپین کے کوہ پیما مشہور ہیں۔مشرقی یورپ میں اس طرف رجحان کم ہے لیکن وہاں سے بھی اچھے کوہ پیما نکلے ہیں جنہوں نے بلند ترین اور دشوار ترین چوٹیاں سر کرکے اپنے ملک اور قوم کا نام روشن کیا۔جیسے دنیا کی مشہور ترین کوہ پیما خاتون وانڈا کا تعلق پولینڈ سے ہے۔

ان کوہ پیماؤں کو ان ملکوں میں کمپنیاں اور دولت مند افراد اسپانسر کرتے ہیں۔کوہ پیمائی ایک بے حد مہنگا کھیل ہے اور اس میں ہزاروں نہیں لاکھوں کی ضرورت پڑتی ہے۔عام فرد تو کیا کسی دولت مند کے لیے بھی مشکل ہے کہ وہ محض اپنے بل بوتے پر کوہ پیمائی کرے۔اس لیے کوہ پیمائی کے کلب قائم ہیں جو نوجوان اور نئے کوہ پیماؤں کو سہولت اور سامان فراہم کرتے ہیں۔جو نوجوان اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کریں تو انہیں کم عمری میں ہی اسپانسر شپ مل جاتی ہے۔یوں وہ غم روزگار سے بے نیاز ہو کر اپنی ساری توجہ کوہ پیمائی پر لگا سکتے ہیں

میسنر اوائل جوانی میں یورپ بھر میں کوہ پیمائی کا ایک جانا پہچانا نام بن چکا تھا اور الپس سے متعلق تقریباً ہر کلب کی خواہش تھی کہ وہ اس کا رکن بن کر اپنے کیریئر کا آغاز کرے لیکن میسنر نے پہلے کالج کی تعلیم مکمل کرنے کا فیصلہ کیا۔وہ کالج میں پڑھنے گیا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس نے پہاڑوں سے ناتا توڑ لیا تھا۔وہ تعلیم کے دوران جب موقع ملتا پہاڑوں پر نکل جاتا تھا خاص طور سے موسم گرما کی چھٹیاں تو پوری کی پوری کوہ الپس میں گزرتی تھیں۔الپس میں اس کا پسندیدہ علاقہ ڈولومائٹس ہے یہاں شاندار چوٹیاں اور برف کے آسمان کو چھوتے ستون ہیں جن پر چڑھنا ہر کوہ پیما کا خواب ہے۔1950ء سے 1964ء کے درمیان جب وہ تعلیم بھی حاصل کر رہا تھا اس نے کوئی پانچ سو مہمات کی رہنمائی کی تھی اور ان میں سے بیشتر ڈولومائٹس کے علاقے میں کی گئی تھیں۔وہ اس جگہ کو اپنی ہاتھ کی لکیروں کی طرح جانتا تھا۔

1965ء وہ سال تھا جب میسنر پہلی بار ایک پیشہ ور کوہ پیما کے روپ میں سامنے آیا اور اس نے اپنی پہلی مہم کے لیے اوٹلر کی چوٹی منتخب کی۔بیس ہزار فٹ سے زیادہ بلند اس چوٹی کا شمار یورپ کی چند بلند ترین چوٹیوں میں ہوتا ہے۔اسے مشکل سمجھا جاتا ہے۔اس کے باوجود کہ ہر سال کئی سو افراد اسے سر کر لیتے ہیں۔میسنر نے اس کے جنوبی رُخ کا انتخاب کیا تھا جو سب سے زیادہ مشکل سمجھا جاتا ہے۔ایک نئے کوہ پیما کے لیے یقیناً یہ کام آسان نہیں تھا اس لیے کوہ پیمائی کے حلقوں میں اس خبر کو دلچسپی سے سنا گیا اور جب میسنر نے صرف دو دن میں چوٹی سر کر لی تو بہت سارے لوگوں کو یقین ہی نہیں آیا تھا۔میسنر کی خوش قسمتی کہ الپس زیادہ بلند نہیں ہے اس کے باوجود یہاں چوٹیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ہر چوٹی کے کئی کئی رُخ ہیں۔بے شمار چوٹیوں کے کئی رُخ ایسے ہیں جہاں سے ان کو کبھی سر نہیں کیا گیا۔اسی طرح سرما میں چوٹیوں کو سر کرنا بہت مشکل کام ہوتا ہے جب مسلسل برف گر رہی ہوتی ہے اور درجہ حرارت نقطہ انجماد سے نیچے گر جاتا ہے۔

میسنر کے پاس اپنی اہلیت ثابت کرنے کے بہت مواقع تھے۔وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ کوہ پیماؤں کا اصل امتحان تو ہمالیہ میں ہوتا ہے لیکن اس سے پہلے اہلِ یورپ الپس میں تجربہ حاصل کر لیتے تھے اور یہ اہلِ یورپ کی خوش قسمتی تھی کیونکہ دنیا میں دوسری کوہ پیمائی کا جنون رکھنے والی اقوام یعنی امریکا، جاپان اور کوریا کے پاس بلند چوٹیاں بہت کم ہیں۔ان کے کوہ پیماؤں کو براہ راست ہمالیہ جاکر اپنے کیریئر کا آغاز کرنا پڑتا ہے۔میسنر نے الپس کا دل بھر کر فائدہ اُٹھایا۔اوٹلر سر کرنے کے ایک سال بعد اس نے گرینڈیز جوراسیس نامی چوٹی کو سر کیا اور اس نے یہ کام اس کے مشکل ترین پہلو یعنی واکر پلر سے کیا۔الپس میں اینگر نامی چوٹی بہت مشکل سمجھی جاتی ہے۔1967ء کے گرما میں میسنر نے اسے شمال مشرقی رُخ سے سر کیا اور اسی سال سرما میں اس چوٹی کو شمالی رُخ سے فتح کرکے کوہ پیماؤں کی دنیا میں ہل چل مچا دی تھی۔اس سے پہلے کسی نے یہ کارنامہ انجام نہیں دیا تھا۔پھر اسی سرما کے دوران اس نے فرشیٹا کی چوٹی کو شمالی رُخ سے فتح کرکے ایک بار پھر سب کو حیران کر دیا۔

سرما میں چوٹیوں کے شمالی رُخ ہمیشہ خطرناک ہوتے ہیں کیونکہ شمال سے تند و تیز ہوائیں چلتی ہیں اور اکثر برفانی طوفان آ دھمکتے ہیں۔کوہ پیما ہمیشہ ان کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔اس کے باوجود شمالی رُخ سے بہت کم کوہ پیما کسی چوٹی کو سرما کے دوران سر کرتے ہیں۔ایک جرمن کوہ پیمائی کے میگزین نے میسنر کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا۔”درحقیقت بہت کم نوجوان ایسی شاندار کوہ پیمائی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ایسا لگتا ہے میسنر کے جسم میں کسی پُرانے

کوہ پیما کی روح سما گئی ہے۔“

کیونکہ میسنر جرمن نژاد تھا اس لیے جرمنوں کی طرف سے اسے سراہنا سمجھ میں آتا ہے۔کیونکہ یورپی اقوام ایک دوسرے کے کوہ پیماؤں کو سراہنے میں ذرا کنجوس واقع ہوئی ہیں۔یہی وجہ تھی اس وقت میسنر کا ذکر اٹلی اور جرمنی سے باہر کم ہی ہوتا تھا۔آنے والے گرما میں میسنر کا وقت الپس میں بہت سرگرم گزرا تھا اور اس نے یکے بعد دیگرے کئی چوٹیاں سر کرلیں۔ایسا ہوتا تھا کہ وہ ایک چوٹی سر کر کے نیچے آتا تھا اور فوراً ہی کسی دوسری چوٹی کو سر کرنے کے لیے روانہ ہو جاتا تھا۔ایک موقع پر اس نے لگاتار چار چوٹیاں سر کیں۔اس کے بعد اس نے چند مہینے آرام کیا تھا۔ڈاکٹر اس کی قوت برداشت پر حیران تھے کہ وہ کس طرح مسلسل سولہ ہزار فٹ کی بلندی سے اوپر وقت گزارتا رہا تھا اور اس دوران میں اس پر کوئی منفی اثر نہیں پڑا تھا۔

گھر میں اسے جرمن کوہ پیما پیٹر ہبلر کا خط ملا۔وہ ایک مہم لے کر جنوبی امریکا میں کوہ انڈیز جا رہا تھا۔میسنر کے لیے انڈیز کا نام ایسا نہیں تھا کہ وہ اسے نظر انداز کر دیتا کیونکہ یورپ کے برعکس انڈیز کی چوٹیاں بہت مشکل ہیں۔عین خط استوا پر ہونے کی وجہ سے یہاں برف کم ہے اور چٹانیں بہت زیادہ ہیں۔بیشتر مقامات پر یہ چٹانیں کسی سیدھی دیوار کی طرح کھڑی ہیں جن پر قدم جمانے جتنی جگہ بھی مشکل سے ملتی ہے۔برف اگرچہ کوہ پیماؤں کو تنگ کرتی ہے اور سب سے زیادہ اموات کی وجہ بھی برف ہے لیکن برف کی موجودگی سے چٹانوں پر راستے بنتے ہیں اور یہ پتھروں کو توڑ کر بھربھرا کرتی ہے۔میسنر نے خوشی سے یہ دعوت قبول کر لی۔یورپ سے باہر یہ اس کی پہلی کوہ پیمائی تھی۔

کوہ انڈیز کی ایک وجہ کشش اس کی چوٹی یروپاجا چیکو ہے۔چھ ہزار ایک سو اکیس میٹرز یا بیس ہزار کے جادوئی ہندسے سے ذرا بلند یہ چوٹی کوہ پیمائی کے لحاظ سے بہت مشکل ہے۔اگرچہ میسنر اس سے پہلے اس سے زیادہ بلند چوٹیوں پر چڑھ چکا تھا۔لیکن اسے صحیح معنوں میں اگر کوئی دشواری پیش آئی وہ کوہ انڈیز کی چوٹیوں میں آئی تھی۔اسی سلسلے میں آکون کاگوا کی چوٹی ہے جسے ہمالیہ سے باہر دنیا کی سب سے بلند چوٹی ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔لیکن اسے سر کرنا پیٹر کے منصوبے میں شامل نہیں تھا اس لیے میسنر دل مسوس کر کے واپس آگیا تھا۔انڈیز میں اس نے کئی چوٹیاں عبور کی تھیں اس کی یہ مہم نہیں تھی اس لیے اس کے حصے میں خاص شہرت نہیں آئی تھی۔اس کا میدان فی الحال کوہ الپس تھا۔

واپس آتے ہی وہ ایک نئے عزم کے ساتھ الپس کی بچ جانے والی چوٹیوں کو سر کرنے میں لگ گیا۔اس کے جنونی انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ چند سالوں میں کوہ الپس کے چپے چپے پر اپنا نشان لگا دے گا۔ڈرو ایٹس کی چوٹی کو جنوبی رخ سے سر کرنے کے دوران اس نے اپنے بھائی گنتھر سے ایک اہم گفتگو کی تھی اور اس گفتگو نے نہ صرف میسنر بلکہ گنتھر کی زندگیوں کے رُخ بدل دیے تھے۔سترہ ہزار فٹ کی بلندی پر لگائے کیمپ میں دونوں بھائی سرد رات گزارنے کی کوشش کر رہے تھے۔نیند دونوں کی آنکھوں سے غائب تھی کیونکہ کل ان کو صبح سویرے چوٹی کی طرف بڑھنا تھا۔اچانک گنتھر نے کہا۔”ہمالیہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

عجیب بات تھی کہ کوہ پیمائی کا جنون رکھنے والا میسنر ہمالیہ کے بارے میں بات نہیں کرتا تھا۔جب اس سے کوئی ہمالیہ کی بات کرنا چاہتا تو وہ اسے ٹال جاتا تھا۔اس وقت بھی اس نے گنتھر کو مختصر جواب دیا۔”ٹھیک خیال ہے؟“

گنتھر نے اپنے سلیپنگ بیگ سے باہر جھانکا۔”کیا ٹھیک خیال ہے؟“

”کیا ہم اس قابل ہو چکے ہیں کہ ہمالیہ کے بارے میں بات کریں؟“

”یقیناً ہم اس قابل ہو چکے ہیں۔“ گنتھر نے یقین سے کہا تھا۔

میسنر کے اندر کہیں یہ بات موجود تھی کہ اس کی اصل منزل ہمالیہ ہے۔لیکن وہاں جانے سے پہلے اسے بہت تیاری کرنا تھی۔اس کے خیال میں ابھی اس کی تیاری مکمل نہیں ہوئی تھی اور ابھی اسے بہت کچھ سیکھنا اور جاننا تھا۔کوہ الپس کی حیثیت یورپ میں ایک ایسے ٹریننگ کیمپ کی سی ہے جہاں کوہ پیما ہمالیہ جانے سے پہلے تربیت حاصل کرتے ہیں۔ان کا اصل امتحان ہمالیہ کے پہاڑوں میں ہوتا ہے جہاں سات ہزار دو سو میٹرز سے بلند چوٹیوں کی تعداد سو سے زیادہ ہے۔یورپ میں ایک بھی چوٹی سات ہزار میٹرز کی بلندی کو نہیں چھوتی ہے۔کوہ الپس کی چوٹیاں سر کرنا دنوں نہیں گھنٹوں کا کام ہے بعض چوٹیاں تو شہروں سے بس اتنی مسافت پر ہیں کہ کوہ پیما دو گھنٹے میں ان کے بیس کیمپ تک پہنچ جاتا ہے اور چھ سات گھنٹے میں چوٹی سر کرکے شام تک گھر واپس بھی آجاتا ہے۔ہمالیہ کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔یہاں ماؤنٹ ایورسٹ اور کے ٹو کے بیس کیمپ کا راستہ دنوں نہیں ہفتوں میں طے ہوتا ہے۔چوٹی تک سفر کا مرحلہ اس کے بعد آتا ہے۔پھر جوکھم بھی کہیں زیادہ ہیں۔اس وجہ سے میسنر ہمالیہ کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بارے میں بات کرتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ اس کے خیال میں ابھی انہیں مزید تیاری کی ضرورت تھی لیکن گنتھر کا اصرار تھا کہ وہ کوہ پیمائی کے تمام ممکنہ تجربات حاصل کر چکے تھے اور اب ان کو ہمالیہ کے بارے میں سوچنا چاہیے تھا۔

''ٹھیک ہے واپسی پر اس پر غور کریں گے۔'' میسنر نے بھائی سے وعدہ کرلیا۔ گنتھر خوش ہو گیا تھا۔ میسنر کوہ پیمائی میں الپس طریقے کا حامی تھا۔ اس طریقے کو ڈاکٹر ہرمن بوہل نے وضع کیا تھا۔ اگرچہ کوہ الپس کے علاقے میں کوہ پیمائی کے لیے شروع سے یہ طریقہ رائج تھا مگر اسے باقاعدہ اصول و قواعد میں ہرمن بوہل نے ڈھالا تھا۔ الپس میں فاصلے کم ہیں اور چوٹیوں تک دنوں میں آیا جایا جاسکتا ہے۔ دوسرے یہاں مقامی طور پر پورٹر اور مزدور نایاب ہیں۔ اس لیے کوہ پیما صرف اتنے سامان کے ساتھ نکلتے ہیں جسے خود اُٹھا سکیں اور ان کو کسی پورٹر کی ضرورت نہ پڑے۔ یہ کوہ پیمائی کا الپس طریقہ کہلاتا ہے۔ ہرمن بوہل ہمالیہ میں بھی اس طریقے کی ترویج کرنے کے لیے کوشاں تھا۔ حالانکہ ہمالیہ کے حالات بالکل مختلف تھے۔ وہاں اکیلا کوہ پیما بہت زیادہ خطرات سے دوچار ہوتا تھا اور فاصلے اتنے زیادہ تھے کہ معمولی سامان سے کام نہیں چلتا تھا۔ کوہ پیماؤں کو لازمی زیادہ سامان اور زیادہ سامان کے لیے پورٹرز کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن ہرمن بوہل نے کوشش کی کہ ہمالیہ اور خاص طور میں نانگا پربت کی چوٹی کے لیے اس طریقے کو استعمال کرے۔

میسنر ہمالیہ کے لیے بھی اس طریقے کا حامی تھا۔ وہ خود بھی اکیلا مہم پر جانے کا عادی تھا اور اپنا سارا سامان خود اٹھاتا تھا۔ جب گنتھر نے اس سے ہمالیہ چلنے کو کہا تو اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہاں بھی الپس طریقے سے کوہ پیمائی کرے گا۔ اس نے بعد میں اپنی ایک کتاب میں لکھا کہ کوہ پیمائی کا مہماتی انداز اصل میں پہاڑوں کی توہین کے مترادف ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ مشین گن سے شیر کو بھون ڈالیں۔

ہمالیہ میں ماؤنٹ ایورسٹ کو انگریزوں اور جاپانیوں کا پہاڑ کہا جاتا ہے۔ کے ٹو کو امریکنوں کا پہاڑ کہا جاتا ہے اور نانگا پربت کو جرمنوں کا پہاڑ کہا جاتا ہے۔ امریکن شاہ خرچ قوم ہے اور اس کے پاس پیسا بھی بے حساب ہے اس لیے دو ڈھائی سو افراد پر مشتمل مہم لے کر کے ٹو سر کرنے جانا ان کے لیے عام سی بات ہے۔ دوسرے کے ٹو بیس کیمپ کا راستہ بھی بہت طویل ہے اس لیے صرف سامان لے جانے کے لیے سینکڑوں کی تعداد میں افراد کی مدد کی ضرورت پڑتی ہے اور پھر امریکن جنگی انداز میں بیس کیمپ میں پڑاؤ ڈال کر اپنی مہم کا آغاز کرتے ہیں۔ اس کے برعکس نانگا پربت کے مختلف بیس کیمپ تک پہنچنا اتنا مشکل کام نہیں ہے اور دو تین افراد بھی آسانی سے بیس کیمپ تک رسائی حاصل کرلیتے ہیں۔ اس میں زیادہ سامان لینے اور ان کے لیے زیادہ افراد لے جانے کی کوئی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔ اس لیے الپس طریقے کے حامی جرمن کوہ پیماؤں نے نانگا پربت کو اپنی توجہ کا مرکز بنالیا۔ اسے سب سے پہلے سر کرنے والا بھی ایک جرمن کوہ پیما تھا۔

میسنر کا تعلق اگرچہ اٹلی سے تھا لیکن وہ خود کو جرمن کوہ پیما گروپ میں شمار کرتا ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے کوہ پیمائی کے بارے میں جو تریسٹھ کتابیں لکھی ہیں وہ سب کی سب جرمن زبان میں ہیں اور ان کا بعد میں دوسری زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔ اس لیے جب اس نے بھائی کے اصرار پر ہمالیہ میں کوہ پیمائی کے بارے میں سوچا تو فطری طور پر اس کا دھیان نانگا پربت کی طرف گیا تھا۔ جرمنوں کے اس چوٹی کی طرف متوجہ ہونے کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ اسے سب سے پہلے بیرونی دنیا میں روشناس کرانے والا ایک جرمن ہے اسے سب سے پہلے سر کرنے والا ایک جرمن ہے اور اس پہاڑ کو سر کرنے کی کوشش میں سب سے زیادہ جانیں جرمنوں نے قربان کیں۔ پھر یہ دنیا کی نویں بلند ترین چوٹی ہونے کے باوجود دنیا کی مشکل ترین چوٹی ہے۔ اتنی مشکل ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ماؤنٹ ایورسٹ کو ہر سال درجنوں افراد سر کرلیتے ہیں۔ کے ٹو کی چوٹی پر بھی سال میں کسی نہ کسی کوہ پیما کے قدم پہنچ جاتے ہیں لیکن نانگا پربت پر کئی سال بعد جا کر کسی خوش نصیب کوہ پیما کے قدم پہنچتے ہیں اور ایسا ہونے سے پہلے یہ چوٹی کئی کوہ پیماؤں کی جان نذرانے میں لے چکی ہوتی ہے تب کہیں جا کر کسی کو اپنے اوپر قدم رکھنے دیتی ہے۔ مشکلات کے شوقین جرمن کوہ پیما دیوانہ وار اس چوٹی کی طرف لپکتے ہیں اور کئی جانیں گنوانے کے باوجود وہ اس شوق سے باز نہیں آتے۔

جرمنوں کے اس عشق کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے جیسے جرمن یورپ میں باقی اقوام سے الگ تھلگ ہیں اسی طرح نانگا پربت بھی ہمالیہ کی باقی بلند چوٹیوں سے بالکل الگ دریائے سندھ کے کنارے شان سے سر اٹھائے کھڑی ہے۔ یہ ہمالیہ سلسلے کی واحد چوٹی ہے جو چاروں طرف سے آبادیوں کے درمیان گھری ہوئی ہے۔ مقامی باشندے صدیوں سے اس کے وجود سے آگاہ ہیں اور ان کے نزدیک یہ ایک مہربان پہاڑ ہے کیونکہ اس کی وسیع و عریض ڈھلانوں پر ہونے والی برف باری اور بارش سے ان کو پانی ملتا ہے۔

☆☆☆

جوزف میسنر نے کبھی اپنے بیٹوں کو کوہ پیمائی یا مہم جوئی سے نہیں روکا اس نے تو خود ان میں اس کی روح بھری تھی لیکن جب اس نے سنا کہ اس کے بیٹے ہمالیہ میں اپنی مہم جوئی کا آغاز نانگا پربت سے کرنا چاہتے ہیں تو وہ مضطرب ہو گیا تھا۔ ایک جرمن ہونے کے ناطے اسے نانگا پربت سے لگاؤ بھی تھا اور وہ اس کی خون آشامی سے بھی آگاہ تھا۔ اس نے میسنر سے بات کی۔ ''نانگا پربت ہی کیوں؟''

''اگر نانگا پربت نہیں تو پھر کیا؟'' اس نے اُلٹا باپ سے سوال کردیا۔

''ہمالیہ کی دوسری چوٹیاں بھی ہیں۔'' جوزف نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ نانگا پربت اس بلندی سے پندرہ سو میٹرز زیادہ ہے جہاں تم آج تک گئے ہو۔''

''لیکن ہمالیہ کی ساری چوٹیاں اس بلندی سے زیادہ ہیں۔''

''پھر نانگا پربت بہت مشکل ہے۔'' جوزف نے اصل بات کہہ دی۔

''آپ کے خیال میں کیا میں اس قابل نہیں ہوں کہ نانگا پربت سر کرسکوں۔''

جوزف یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ وہ اپنے بیٹوں کی صلاحیتوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ دنیا کے کسی بھی بڑے کوہ پیما سے کسی صورت کم نہیں تھے۔ اس کے باوجود ان کے نانگا پربت جانے کے ارادے کا سن کر وہ ڈر گیا تھا۔ میسنر ابھی صرف چھبیس برس کا تھا اور گنتھر چوبیس برس کا۔ جوزف نے جواب دیا۔

''مجھے تم دونوں پر پورا اعتماد ہے۔''

''تب آپ ہمیں منع مت کریں۔'' میسنر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اتفاق سے ان ہی دنوں نانگا پربت پر جانے والی کارل ماریا ہرلگ کوفر کی مہم میں ان دونوں بھائیوں کو شمولیت کی دعوت ملی تھی۔ کوفر جرمنی کا مشہور کوہ پیما تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی نانگا پربت کی مہمات پر جا چکا تھا اور یہ اس کی خالص جرمن مہم تھی۔ میسنر سے زیادہ گنتھر کو اس مہم کی خوشی تھی۔ 1970ء کے موسم گرما میں مہم نانگا پربت کے لیے روانہ ہوئی تھی اور... میسنر برادران اس مہم کا حصہ تھے۔ جب وہ نانگا پربت کے سامنے پہنچے تو ان کے دلوں میں خدشات تو تھے لیکن ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ مہم ایک بہت بڑی کامیابی کے بعد ایک بہت بڑے المیے میں بدل جائے گی۔

ہرلگ کوفر نے میسنر برادران کو چوٹی کی طرف جانے والے گروپ میں شامل کرلیا تھا۔ خود کوفر اس گروپ کا حصہ نہیں تھا۔ جبکہ کوفر بہت بڑا مقصد لے کر آیا تھا۔ نانگا پربت کا روپل فیس جسے چٹانی چہرہ بھی کہتے ہیں اب تک ناقابل تسخیر ثابت ہوا تھا۔ تقریباً چار ہزار میٹرز کی بلندی تک ایک ہی چٹان ہے۔ دنیا میں کہیں بھی کسی پہاڑی سلسلے میں ایک ہی اتنی بڑی چٹان نہیں پائی جاتی ہے۔ اسے کسی بھی پہاڑی کا دشوار ترین حصہ بھی تصور کیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ 1970ء تک یہ حصہ چوٹی تک پہنچنے کا ذریعہ نہیں بنا تھا۔ کوفر کا مقصد اس بار نانگا پربت کو اس طرف سے سر کرنا تھا۔ وہ میسنر برادران اور ان کی صلاحیتوں سے اچھی طرح واقف تھا اور اس نے میسنر کو ٹیم لیڈر کے طور پر منتخب کیا تھا۔

مئی میں وہ نانگا پربت کے بیس کیمپ میں پہنچ چکے تھے اور اب چوٹی کی طرف جانے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ جون کے آغاز میں وہ بیس کیمپ سے روپل فیس تک کئی چکر لگا چکے تھے۔ اس دوران میں پہلی بار میسنر برادران کو اندازہ ہوا کہ الپس کے پہاڑی سلسلے اور ہمالیہ میں کیا فرق ہے۔ حالانکہ بیس کیمپ اور دامن تک رسائی زیادہ مشکل نہیں ہے لیکن اس سے آگے نانگا پربت بہت خوف ناک چوٹی بن جاتی ہے اس کے کسی راستے میں آسانیاں نہیں ہیں بس دشواریاں ہیں۔ جون کے آخر میں انہوں نے چوٹی کی طرف فیصلہ کن پیش قدمی شروع کی۔ 27 جون کے دن دونوں بھائی چوٹی سے کئی سو میٹرز نیچے اس حالت میں تھے کہ ان کے پاس نہ تو موسم کے بچاؤ کے لیے کچھ تھا اور نہ ان کو نیچے سے مدد کی امید تھی۔ اس المناک صورتِ حال کو میسنر نے بعد میں کچھ یوں بیان کیا۔

''میں وہ دن کبھی نہیں بھولوں گا جب ہم دونوں بھائی پہلی بار سات ہزار میٹرز کی بلندی پر آئے تھے۔ جب ہم نے روپل چہرے کی طرف سے چڑھنا شروع کیا تو موسم بُرا نہیں تھا، اگرچہ اسے اچھا بھی نہیں کہہ سکتے ہیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ موسم نے ہمارے آڑے نہ آنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ہماری ٹیم کے ارکان ایک ایک کر کے ہمت ہارتے جا رہے تھے اور وہ سب سات ہزار فٹ کی بلندی سے پہلے واپس چلے گئے تھے۔ اب صرف میں اور گنتھر بچے تھے۔ درحقیقت ہماری حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ سردی، آکسیجن کی کمی اور بے آرامی نے ہماری ساری طاقت نچوڑ لی تھی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ مجھے اتنے خراب موسم کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ نانگا پربت

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی تنگی چٹانوں میں کیلیں اور کلپ لگانا تقریباً ناممکن ہو رہا تھا اور کئی جگہوں پر ہمیں محض ہاتھ پیروں کے سہارے اوپر چڑھنا پڑا تھا۔ اس وجہ سے میرے اور گنتھر دونوں کے ہاتھ اور پیر سردی سے بے کار ہوئے جا رہے تھے۔ گنتھر نے مجھ سے کہا۔ ''ہمیں واپس جانا ہوگا۔''

اس وقت ہم چوٹی سے صرف ایک ہزار میٹرز کے فاصلے پر تھے اور میں کبھی اتنی بلندی پر نہیں آیا تھا۔ میرے نزدیک یہ سنہری موقع تھا اس لیے میں نے انکار کر دیا۔ ''نہیں میں ضرور جاؤں گا۔''

''میری ہمت جواب دے رہی ہے۔''

میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی حالت خراب ہو رہی ہے حالانکہ وہ مجھ سے زیادہ حوصلہ مند تھا۔ میں نے اسے مشورہ دیا۔ ''بہتر ہے تم واپس چلے جاؤ۔''

''نہیں میں رکوں گا۔'' اس نے نیچے جانے سے انکار کر دیا۔ ''تم آگے جاؤ میں یہاں تمہارا انتظار کروں گا۔''

گنتھر جہاں رکنے کو کہہ رہا تھا وہ جگہ بہت خطرناک تھی اور وہاں اوپر سے برف گرتی تو بچنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس لیے میں نے اس کی واپسی پر اصرار کیا لیکن وہ نہیں مان رہا تھا۔ ''میں یہیں رکوں گا۔''

یہ ہمارا آخری پڑاؤ بھی تھا اور اس کے بعد چوٹی تک ہمارے پاس رکنے اور آرام کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس دوران میں موسم نے اچانک اپنے تیور بدلے اور ایسا لگا کہ برفانی طوفان آنے والا ہے۔ میں نے ایک بار پھر گنتھر کو آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ ''گنتھر تم نیچے چلے جاؤ کیونکہ اس طرف طوفان آنے والا ہے۔''

''میں یہیں رک کر تمہارا انتظار کروں گا۔'' گنتھر رونے والا ہو رہا تھا۔ چوٹی کے اتنے پاس آ کر چوٹی سر کیے بغیر واپس جانا کسی بھی کوہ پیما کے لیے مایوسی کی انتہا ہو سکتی ہے۔ میں گنتھر کو کیمپ میں چھوڑ کر دوپہر کے قریب چوٹی کی طرف بڑھنے لگا۔ موسم بے انتہا خراب ہو گیا تھا اور چند میٹر دور سے آگے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ تیز ہوائیں مجھے پیچھے دھکیلنے کے لیے پورا زور لگا رہی تھیں اور سردی مجھے جما دینا چاہتی تھی۔ اس وقت درجہ حرارت منفی تیس ڈگری سینٹی گریڈ تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ مجھے چوٹی تک پہنچنے میں کم سے کم چھ گھنٹے لگتے دوسرے لفظوں میں میری رات سے پہلے کیمپ واپسی ناممکن تھی اور مجھے رات کھلی جگہ ہی گزارنی پڑتی۔ یہ تصور ہی لرزانے کے لیے کافی تھا کیونکہ رات کو یہاں درجہ حرارت گر کر منفی ساٹھ تک چلا جاتا اور بغیر خیمے، سلیپنگ بیگ اور برنر کے اس درجہ حرارت میں رات گزارنا خودکشی کے مترادف ہوتا۔ خراب موسم کی وجہ سے نیچے بیس کیمپ سے رابطہ ٹوٹ گیا تھا اور نیچے والوں کو کچھ نہیں پتا تھا کہ ہم کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے۔ مجھے رہ رہ کر گنتھر کا خیال آ رہا تھا کیونکہ اس سے پہلے ہم نے جس چوٹی کی طرف پیش قدمی شروع کی اسے ساتھ سر کیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ گنتھر پیچھے رہ جانے پر مجبور ہوا تھا۔ نانگا پربت ہمارے اندازے سے بھی زیادہ دشوار ثابت ہوا تھا۔ شام تک میں چوٹی سے کچھ ہی نیچے رہ گیا تھا اور اب مشکل سے ایک گھنٹے کا سفر تھا۔

میں چوٹی کی طرف جانے سے پہلے ایک چٹان سے لگ کر سستا رہا تھا۔ اچانک ہی گنتھر کو اپنے پاس دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا۔ میں اسے خستہ حالت میں کیمپ میں چھوڑ کر آیا تھا اور میرے خیال میں تو اسے واپس نیچے چلے جانا چاہیے تھا اور وہ اوپر میرے پیچھے آ گیا تھا۔ ''گنتھر تم کیسے آ ئے؟''

''بس مجھ سے رہا نہیں گیا۔'' اس نے ہانپتے ہوئے کہا، تھا میں دیکھ رہا تھا کہ اب بھی اس کی حالت اچھی نہیں تھی یہ تو اس کی قوت ارادی تھی جس کی وجہ سے وہ یہاں تک آ گیا تھا۔ میں جس چٹان کے ساتھ تھا یہاں سے چوٹی تک کا حصہ اب تک کی ساری مہم میں دشوار ترین تھا۔ میں نے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔

''کیا تم اس پر چڑھ سکو گے؟''

گنتھر نے اوپر دیکھا اور ایک عزم سے بولا۔ ''ہاں میں چڑھ سکتا ہوں۔''

گنتھر اس مقام تک آ گیا تھا جہاں سے اس کی واپسی بیکار تھی۔ میں چاہتا بھی تو اسے واپس نہیں بھیج سکتا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میں اسے اپنی نظروں کے سامنے رکھوں۔ جب وہ میرے ساتھ نہیں تھا تب بھی سارے راستے مجھے اس کا خیال آتا رہا تھا۔ اس کی آمد اس لحاظ سے بہتر ہوئی تھی کہ اب میں ساری توجہ چوٹی سر کرنے پر لگا سکتا تھا۔ ہم رینگنے کی رفتار سے چوٹی کی طرف پیش قدمی کرنے لگے۔ جن لوگوں نے نانگا پربت کا روپل فیس دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس طرف سے چوٹی کا آخری حصہ نہایت دشوار اور پُرخطر ہے۔ یہی وجہ تھی کہ آج تک کسی کوہ پیما نے روپل فیس سے چوٹی کو سر نہیں کیا تھا، اگرچہ کوشش بہت سارے کوہ پیماؤں نے کی تھی۔

گنتھر میرے پیچھے تھا۔ شام چھ بجے سے ذرا پہلے ہم چوٹی سے چند گز کے فاصلے پر آ چکے تھے۔ حیرت انگیز طور پر چوٹی پر موسم صاف تھا اور ڈوبتے سورج کی روشنی میں اس کی

برف چمک رہی تھی۔ جب کہ نیچے اتنا خراب موسم تھا کہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ سیاہ بادلوں نے دیو قامت اژدھوں کی طرح پہاڑ کو اپنے بلوں میں جکڑ رکھا تھا۔ ہم نے روپل فیس کی دراڑ سے گزرنے کے بجائے کھلی ڈھلان سے چوٹی کی طرف پیش قدمی کی تھی اگرچہ یہ ڈھلان کسی دیوار کی طرح سیدھی کھڑی تھی لیکن دراڑ کے مقابلے میں پھر بھی بہتر تھی کیونکہ دراڑ میں ہمہ وقت اوپر سے برف گرنے کا خطرہ لاحق رہتا تھا۔ اس ڈھلان کا اوپری حصہ دھوپ سے جگ مگا رہا تھا۔

''گنتھر ہم چوٹی کے پاس پہنچ گئے ہیں۔'' میں نے اسے بتایا۔ تھکن اور شاید بیماری سے اس کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے بہ مشکل خود کو قائم رکھا ہوا تھا۔ لیکن میری بات پر اس نے ایک عزم سے کہا۔

''ہم چوٹی سر کریں گے۔''

اس بار ہم شانہ بہ شانہ چوٹی کی طرف بڑھ رہے تھے اور ہماری کوشش تھی کہ ایک ساتھ اس پر قدم رکھیں۔ بالآخر ہمارا خواب حقیقت کا روپ دھار گیا اور ہم ایک ساتھ نانگا پربت پر قدم رکھنے میں کامیاب رہے تھے۔ یہ دنیا کی نویں بلند ترین چوٹی ہے لیکن میرے نزدیک یہ دنیا کی سب سے مشکل چوٹی ہے۔ اوپر پہنچ کر ہم ایک دوسرے سے لپٹ گئے تھے۔ مارے خوشی کے ہمارے آنسو نہیں رک رہے تھے۔ یہ آنسو ہمارے رخساروں پر گر کر برف بن جاتے تھے اور پھر یہ نانگا پربت کی برف میں شامل ہو جاتے۔ آج میں کہہ سکتا ہوں کہ اس چوٹی کی برف میں میرے آنسو بھی شامل ہیں اور شاید ہمیشہ شامل رہیں۔

ہم چوٹی پر زیادہ دیر نہیں رکے تھے کیونکہ سورج ڈوبنے والا تھا اور ہمیں رات ہونے سے پہلے کسی ایسی پناہ گاہ کو تلاش کرنا تھا جہاں ہم آنے والی رات گزار سکیں۔ آخری کیمپ تک واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پھر اس طرف طوفان بھی زوروں پر تھا۔ نیچے سیاہ بادلوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ چوٹی پر آنے کے بعد گنتھر کی حالت کچھ دیر کے لیے سنبھلی تھی اور وہ ٹھیک لگ رہا تھا لیکن کچھ دیر بعد اس کی حالت پھر خراب ہونے لگی۔ اسے نیچے لے جانا بہت ضروری تھا۔ میں نے نانگا پربت کے دیامیر والے رُخ کو دیکھا۔ اس طرف موسم بہتر لگ رہا تھا۔ اگر ہم اس طرف سے اُترنے کی کوشش کرتے تو ایک تو ہمیں کم دشواری کا سامنا کرنا پڑتا اور اس طرف موسم بھی خراب نہیں تھا۔ مسئلہ ایک تھا کہ ہمارا بیس کیمپ روپل فیس کے نیچے تھا اور ہم اس کے بالکل مختلف سمت میں اُترنے والے تھے۔ یہاں ریڈیو کسی قدر کام کر رہا تھا اس لیے میں نے فیصلہ کرنے کے بعد نیچے والوں کو اطلاع کر دی تھی کہ ہم دیامیر والے رُخ سے نیچے جا رہے ہیں۔

گنتھر کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ میرے ساتھ مشورہ کر سکتا تھا اس لیے دیامیر کی طرف اُترنے کا فیصلہ صرف میرا تھا اور بعد میں مجھے اس کا تمام تر بوجھ برداشت کرنا پڑا تھا۔ میں نے گنتھر سے کہا۔ ''ہم دیامیر والے رُخ سے اُترنے جا رہے ہیں۔''

اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور ہم نے نیچے اُترنا شروع کیا۔ سورج ڈوبنے کے قریب تھا اور خوش قسمتی سے سورج اس رُخ سے ڈوب رہا تھا کہ دیامیر والے حصے میں اس کی روشنی آخر تک رہتی۔ لیکن یہ بھی زیادہ دیر کی بات نہیں تھی۔ کچھ دیر میں تاریکی چھا جاتی اور یخ بستہ رات کا آغاز ہو جاتا۔ اس طرف کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی کہ جہاں ہم رات گزار سکتے۔ ہمارا سارا سامان آخری کیمپ میں رہ گیا تھا۔ حد یہ کہ ہمارے پاس کھانے اور پینے کو بھی کچھ نہیں رہا تھا۔ اس وقت میں نے سوچا نہیں تھا کہ اگر ہمیں نیچے اُترنے میں دیر ہو گئی تو ہم بھوک اور پیاس سے بھی مر سکتے تھے۔

پھر وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے رات سر پر آ گئی اور ہمارے پاس سر چھپانے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ رات ہونے پر اس حصے میں بھی تیز ہوائیں چنگھاڑنے لگی تھیں۔ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ برف میں گڑھا کھود کر اس میں دبک جائیں۔ یہاں برف بھی لوہے جیسی سخت تھی اور رات کو یہ مزید سخت ہو جاتی تھی۔ جیسے تیسے ہم نے ایک گڑھا کھودا اور اس میں گھس کر اور ایک دوسرے سے چمٹ کر بیٹھ گئے۔ گرم ترین لباس ایسا ہو گیا تھا جیسے ہم نے باریک سوتی کپڑے پہن رکھے ہوں اور سردی ہماری ایک ایک نَس میں سرایت کر رہی تھی۔ ہمارے جسم بے اختیار لرز رہے تھے اور اس وقت مجھے لگا جیسے ہمیں ہائپوتھرمیا ہو رہا ہے اور صبح تک یہاں ہماری لاشیں رہ جائیں گی۔ اتنی بلندی پر بغیر خیمے، سلیپنگ بیگ اور چولہے کے رات گزارنے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا لیکن ہم نے وہ رات ایسے ہی گزاری تھی۔ ایک سُن کر دینے والی کیفیت میں ہم دونوں بھائی ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھے تھے۔ برف کے گڑھے میں ہونے کے باوجود ہماری کوشش تھی کہ ہمارے جسم برف سے نہ چھوئیں کیونکہ جس حصے کو برف مستقل لگتی رہتی اس کے فراسٹ بائٹ ہونے کا خدشہ تھا۔ مگر تمام تر کوشش کے باوجود ہمارے جوتے تو برف سے لگ رہے تھے ان جوتوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے ذریعے یخ بستگی ہمارے پیروں میں داخل ہو رہی تھی۔ سانس لینے کے لیے ہم نے برف میں چھوٹا سا سوراخ رکھا تھا اس سے آنے والی یخ ہوا بتا رہی تھی کہ باہر کس قیامت کی سردی تھی۔

رات بہت طویل ہوگئی تھی اور مجھے لگ رہا تھا کہ اس کی صبح نہیں ہوگی۔ سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن کبھی کبھی لگتا تھا کہ ہم بے ہوش نہ ہو جائیں۔ میں خود بھی جاگنے کی کوشش کر رہا تھا اور جب محسوس کرتا کہ گنتھر پر... بےہوشی طاری ہو رہی ہے تو اسے بھی جھنجھوڑ کر جگاتا تھا جو اس رات سو جاتا یا بے ہوش ہو جاتا تو پھر اسے جاگنا نصیب نہ ہوتا۔ جب صبح سورج کی روشنی نمودار ہوئی تو مجھے اور گنتھر کو از حد خوشی ہوئی تھی، ہم دونوں بھائیوں نے ایک اور ناقابلِ یقین کارنامہ انجام دیا تھا۔ آٹھ ہزار میٹرز کی بلندی پر آج تک کسی کوہ پیما نے اس طرح رات نہیں گزاری تھی جیسے ہم نے گزاری تھی۔ میں نے گنتھر سے کہا۔ ”ہم بچ گئے ہیں۔“

وہ اتنا کمزور ہو رہا تھا کہ اس سے مسکرایا بھی نہیں جا رہا تھا بس اس کے ہونٹ ذرا سا کھنچ کر رہ گئے تھے۔ خود میری حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ ہم دوسری رُخ پر تھے یہاں دھوپ دیر سے آتی لیکن روشنی تو ہو گئی تھی اور ہمیں اب سفر شروع کر دینا تھا۔ ہمارے پاس کچھ بسکٹ اور تھوڑا سا پانی تھا۔ ہم نے اس سے ناشتا کیا اور دیامیر والے رُخ پر اُترنے لگے۔ یہاں سے میں نے پہلی بار دیوسائی کا میدان دیکھا۔ کوئی چھبیس ہزار فٹ کی اونچائی سے یہ زمین کی تہ لگ رہا تھا حالانکہ یہ میدان خود دس سے سولہ ہزار فٹ بلند ہے اور یہاں سال میں صرف دو مہینے کے لیے برف پگھلتی ہے۔

صبح کے وقت موسم کسی قدر بہتر تھا لیکن اس کے فوراً بعد بادل آنے لگے اور تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ جب میں نے چلنا شروع کیا تو مجھے لگا جیسے میرے جوتوں میں کوئی [illegible] میری انگلیوں کو کاٹ رہی ہے۔ میرے پاس وقت نہیں تھا اور نہ یہاں میں جوتے اُتار کر دیکھ سکتا تھا اگر میرے پیروں میں کوئی مسئلہ ہو گیا تھا تب بھی مجھے نیچے پہنچنے تک انتظار کرنا تھا۔ اس بار بھی میں آگے تھا اور گنتھر میرے پیچھے تھا۔ میں راستہ منتخب کرتا اور پھر رسّے کے ساتھ کلپ لگاتا۔ جہاں کیل ٹھونکنے کی ضرورت پیش آتی وہاں کیل ٹھونکتا تھا۔ میں اپنی قوتِ ارادی سے کام لے رہا تھا ورنہ میری حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ پانی کی کمی سے ڈی ہائیڈریشن والی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ کیونکہ اتنی بلندی پر ہوا انتہائی خشک ہوتی ہے اور پر سے ہمارے پاس پینے کا پانی جسے خاص بوتل میں رکھا جاتا ہے ختم ہو رہا تھا۔ برف منہ میں ڈالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایسے میں مجھے گنتھر کا خیال نہیں رہا اور نہ یہ خیال رہا کہ اس کی دماغی حالت بھی ٹھیک نہیں ہے اور اس کے سارے فیصلے بھی مجھے ہی کرنے ہیں۔

مجھے نہیں معلوم کس وقت گنتھر اس راستے سے ہٹ گیا جس سے میں نیچے آ رہا تھا اور وہ ایک چٹان کے دوسری طرف چلا گیا۔ رسّا اتنا طویل تھا کہ جب تک وہ خاصا نیچے نہیں آ گیا پتا ہی نہیں چلا اور جب میں نے اسے دیکھا تو بہت دیر ہو گئی تھی۔ میں نے چلّا کر کہا۔ ”گنتھر تم غلط سمت میں اُتر گئے ہو واپس جاؤ۔“

اس نے چونک کر اوپر کی طرف دیکھا۔ پھر بولا۔ ”میں واپس نہیں جا سکتا مجھ میں اس چڑھائی پر جانے کی ہمت نہیں۔“

واقعی رسّے اور کسی چیز کی مدد کے بغیر اس کا اس چڑھائی پر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ خود میرا اوپر جانا بھی ممکن نہیں رہا تھا ورنہ میں واپس جا کر اسے کھینچ لیتا۔ گنتھر نے بھانپ لیا تھا کہ ہم مشکل میں پڑ گئے ہیں اس نے مجھ سے کہا۔ ”میں رسّا الگ کر کے نیچے اُترتا ہوں ممکن ہے آگے ایسا راستہ آ جائے جس پر ہم پھر ایک ساتھ ہو سکیں۔“

اس کے سوا کوئی راستہ بھی نہیں تھا اور ہمارے پاس رکنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ ہم جتنا جلدی نیچے جاتے ہمارے بچنے کا اتنا ہی امکان ہوتا۔ گنتھر نے رسّا الگ کر دیا اور از خود نیچے اُترنے لگا۔ ایک بڑی چٹان کے عقب میں جاتے ہوئے میں نے آخری بار اسے دیکھا تھا۔ اس کے کچھ دیر بعد جب میں چوبیس ہزار فٹ کی بلندی تک آ گیا تھا میں نے ایک بڑے ایوالانچ (برف گرنا) کو نیچے آتے دیکھا اس میں بے شمار برف تھی اور ایک منٹ میں اس نے اس ساری ڈھلان کو لپیٹ میں لے لیا جہاں گنتھر ہو سکتا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میرا دل ایک لمحے کو دھڑکنا بھول گیا تھا۔ اگر گنتھر نے کسی دراڑ میں پناہ نہ لی تو اس کے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ دنیا میں کوہ پیماؤں کی سب سے زیادہ اموات ایوالانچ کے ہاتھوں ہی ہوتی ہیں۔

میرے پیروں میں چبھن بڑھتی جا رہی تھی اور مجھے لگ رہا تھا کہ سردی نے میرے پیر ناکارہ کر دیے تھے۔ اس سے پہلے یہ بالکل ہی ناکارہ ہو جاتے میرا نیچے پہنچنا ضروری ہو گیا تھا۔ اس شام کو جب میں نے بیس ہزار فٹ کی بلندی پر رات گزارنے کے لیے برف میں گڑھا کھودا تو میرے پاس کھانے پینے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے بعد آنے والے پانچ

دن میں نے کیسے گزارے مجھے بس ذرا ذرا سا یاد ہے اور آخر میں جب میں ایک مقامی چرواہے کو ملا تو میرے حواس مکمل طور پر غائب ہو گئے تھے۔ میں سردی، بھوک اور پیاس کی شدت سے پاگل ہو گیا تھا۔ رہی سہی کسر میرے پیروں کی انگلیوں نے پوری کر دی تھی۔ یہ فراسٹ بائٹ کا شکار ہو چکی تھیں۔ یہ چرواہا مجھے اُٹھا کر دیامیر والے رُخ کے بیس کیمپ تک لایا تھا۔

میں نے نانگا پربت سر کر لیا تھا لیکن اس کی مجھے بہت بھاری قیمت ادا کرنا پڑی تھی۔ میں نے اپنا بھائی کھو دیا تھا اور ساتھ میں اپنے پیروں کی چھ انگلیوں سے بھی محروم ہو گیا تھا۔ جب میں وطن واپس پہنچا تو مجھ سے ہمدردی کرنے والے چند ایک تھے۔ اکثر لوگ مجھے گنتھر کی موت کا ذمے دار ٹھہرا رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ میرا دیامیر والی سائیڈ سے اُترنے کا فیصلہ بالکل غلط تھا اور اس وجہ سے گنتھر کی موت واقع ہوئی۔ اگر میں واپس روپل سائیڈ سے آتا تو یہ سانحہ رونما نہ ہوتا کیونکہ اس کے فوراً بعد طوفان رک گیا تھا اور ہم رات گزار کر بیس کیمپ تک آ سکتے تھے۔ لیکن اس وقت جیسے حالات تھے ان میں میرا فیصلہ ہی درست تھا اور مجھے آج تک اس پر کوئی پچھتاوا نہیں ہے، ہاں میں گنتھر کی موت کبھی نہیں بھول سکتا۔ اگلے سال میں دوبارہ نانگا پربت آیا تھا لیکن میرا مقصد اسے تسخیر کرنا نہیں بلکہ اپنے بھائی کی لاش کو تلاش کرنا تھا۔ افسوس میں اس میں ناکام رہا۔

☆☆☆

میسنر کے لیے ہمالیہ کا پہلا تجربہ ہولناک رہا تھا اسے کامیابی ملی تھی لیکن بہت بڑا خراج لے کر۔ نانگا پربت کی اس مہم نے دو عظیم کوہ پیماؤں میسنر اور ہرلگ کوفر کو ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے متنفر کر دیا تھا۔ ان کے درمیان قانونی جنگ بھی ہوئی تھی لیکن پھر یہ معاملہ بہ ظاہر ختم ہو گیا تھا۔ مگر حیرت انگیز طور پر چوتھائی صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد میسنر نے ایک بار اپنی ٹیم پر الزام لگایا کہ جس وقت ان دونوں بھائیوں کو مدد کی ضرورت تھی تو ان میں سے کوئی ان کی مدد کو نہیں آیا۔ اس کے بھائی کی موت کی اصل ذمے داری ٹیم ممبران پر عائد ہوتی ہے۔ اگر وہ کوشش کرتے تو ان کو بچا سکتے تھے۔

کوفر اور ٹیم کے دوسرے ارکان کا کہنا ہے کہ جس وقت دونوں بھائی چوٹی کے پاس آخری پڑاؤ پر تھے تو وہاں شدید طوفان آ گیا تھا اور اس دوران میں ان کو اوپر جانے کے بجائے کیمپ میں رہنا چاہیے تھا کیونکہ وہاں ان کی جان بچانے کے تمام لوازمات موجود تھے مگر میسنر نے خود غرضی کا مظاہرہ کیا اور بیمار بھائی کو چھوڑ کر چوٹی فتح کرنے چل پڑا۔ پھر گنتھر کو بھی چین نہیں آیا اور وہ بیماری کی حالت میں بھائی کے پیچھے چل پڑا تھا اور دونوں بھائیوں نے خود کو مصیبت میں پھنسا لیا۔ ان کے ساتھ جو ہوا اس کے ذمے دار وہ خود تھے کیونکہ بیس کیمپ سے رابطہ نہ ہونے کی صورت میں ان کو آخری پڑاؤ میں رک کر موسم بہتر ہونے کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ بعد میں کئی کتابیں اس سانحے کے بارے میں لکھی گئیں۔ مصنفین میں میکس وان کینلن، ہانس سالر، رالف پیٹر مارٹن اور خود میسنر شامل ہیں۔ ان کتابوں میں ایک دوسرے پر الزامات لگائے گئے اور بعد میں نوبت کورٹ کچہری تک جا پہنچی تھی۔

بہرحال گنتھر کی موت کی وجہ کچھ بھی ہو یہ طے ہے کہ میسنر نے غلطی کی تو اس کی قیمت بھی ادا کی تھی۔ اس کے حصے میں نانگا پربت کی فتح بھی آئی اور وہ روپل فیس سے اسے سر کرنے والا پہلا کوہ پیما بن گیا تھا۔ اس پہلی مہم کے بعد نانگا پربت میسنر کی خصوصی توجہ کا مرکز بن گیا اور وہ مزید چار بار نانگا پربت آیا تھا۔ دو کوششیں ناکام رہی تھیں جو 1973ء اور 1977ء میں کی گئیں جبکہ 1971ء میں اس نے گنتھر کی لاش تلاش کرنے کی کوشش کی۔ آخری بار وہ 1978ء میں نانگا پربت آیا اور اس بار اس نے اسے سر کیا تھا۔

آخر یہ معاملہ 2005ء میں اپنے انجام کو پہنچا جب غیر متوقع گرمی کی وجہ سے نانگا پربت کی برف پگھل گئی اور گنتھر کی لاش سامنے آ گئی۔ وہ برف میں اس طرح دبی تھی کہ اس کے نیچے بھی برف کی بہت موٹی تہ تھی اور ایسا صرف ایوالانچ میں ہوتا ہے۔ یوں میسنر کا دعویٰ درست ثابت ہوا کہ اس کا بھائی اس کی کسی غلطی سے نہیں بلکہ ایوالانچ میں مارا گیا تھا۔ اس کے باوجود اس پر یہ الزام برقرار رہا تھا کہ اس نے دیامیر سائیڈ سے اُترنے کا غلط فیصلہ کر کے گنتھر کی موت کا سامان کیا تھا۔ یہ الزام شاید اس پر سے کبھی نہ ہٹ سکے۔ اس واقعے پر ایک فلم نانگا پربت کے نام سے بنائی گئی۔ پروڈیوسر ڈائریکٹر جوزف ولسمیر کی بنائی یہ فلم جنوری 2010ء میں سینما میں پیش کی گئی لیکن کیونکہ اس میں مکمل مہم کا احاطہ نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہی اس میں مہم کے دوسرے ارکان کو دکھایا گیا تھا۔ یہ اصل میں میسنر کی یادداشتوں پر مشتمل فلم تھی جو فیچر فلم سے زیادہ دستاویزی حیثیت اختیار کر گئی تھی اس لیے اسے لوگوں میں خاص پذیرائی نہیں مل سکی تھی۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

نانگا پربت کی اس مہم نے میسنر کو اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ وہ چٹانوں پر مشتمل چوٹیاں سر کر سکے کیونکہ اس کے پاؤں کی چھ انگلیاں کاٹ دی گئی تھیں اس لیے وہ اس قابل نہیں رہا تھا کہ چٹانوں پر پاؤں جما سکے۔ درحقیقت اس کے بعد اس نے چٹانوں پر چڑھنا چھوڑ دیا تھا اور اس کی توجہ ان بڑی چوٹیوں کی طرف زیادہ ہوگئی تھی جن پر زیادہ برف ہوتی ہے کیونکہ اس کے لیے برف والی جگہوں پر چڑھنا آسان تھا بہ نسبت چٹانوں کے۔

نانگا پربت کی پہلی مہم میسنر کے لیے المیہ سہی لیکن اسی مہم سے اس میسنر نے جنم لیا، جس نے بعد میں محیر العقول کارنامے انجام دیئے۔ اس نے 1970ء میں نانگا پربت مہم پر روانہ ہونے سے پہلے ایک انوکھا خیال پیش کیا کہ ماؤنٹ ایورسٹ اور دوسری آٹھ ہزار میٹرز بلند چوٹیوں کو آکسیجن بوتلوں کی مدد کے بغیر بھی سر کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت کوہ پیما، ماہرین اور ڈاکٹرز اسے ناممکن سمجھتے تھے کہ اس قدر بلندی پر جہاں ہوا میں آکسیجن کا تناسب سطح سمندر سے صرف دسواں حصہ رہ جاتا ہے اس میں کوئی انسان سانس لے کر زندہ رہ سکے اسے لازمی اپنے جسم کی کارکردگی کو بحال کرنے کے لیے آکسیجن کی بیرونی سپلائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس وقت آٹھ ہزار میٹرز سے بلند چوٹیوں پر جانے والے کوہ پیما لازمی آکسیجن بوتلیں ساتھ رکھتے تھے۔

پھر میسنر نے اس سے بھی عجیب خیال پیش کیا وہ ہمالیہ کی بلند چوٹیوں کو اکیلے سر کرنا چاہتا تھا جیسا کہ بتایا ہے کہ اسے بہت مشکل سمجھا جاتا ہے۔ ناقدین نے میسنر پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ وہ شاید ہمالیہ کو کوہ الپس سمجھ رہا ہے جہاں مہم چند دن سے زیادہ کی نہیں ہوتی ہے اور اس کی بلند ترین چوٹی پر جانا آنا آسان ترین کام ہے۔ یہ اتنی بلندی ہے کہ اس کا عادی ہونے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی ..... میسنر کے دوستوں نے بھی اس سے یہی کہا کہ وہ ہمالیہ کو سمجھنے میں غلطی کر رہا ہے وہاں کسی کوہ پیما کے لیے اکیلے کسی چوٹی تک جانا ناممکن حد تک دشوار ہے اور ایسی کسی مہم کی کامیابی کا امکان دس فی صد بھی نہیں ہوگا۔

تنقید اور مخالفت کے باوجود میسنر اپنے خیال پر قائم رہا تھا۔ جب گنتھر کی موت کے بعد اس پر تنقید کا طوفان امڈ آیا اور اسے ایسا کوہ پیما قرار دیا جانے لگا جس کے نزدیک اپنی انا کی اہمیت ہے بہ نسبت حقائق کے، تب بھی وہ اپنی بات پر قائم رہا تھا۔ نانگا پربت کی طرف مزید ناکام کوشش کے بعد اس نے 1978ء میں نانگا پربت کو اکیلے سر کرنے کا ارادہ کیا۔

اسے اس کی پہلی مہم سے بھی زیادہ دشوار قرار دیا گیا تھا۔ ماہرین نے اسے ایک ناممکن امر قرار دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ نانگا پربت جیسی بڑی چوٹی پر بنا کسی مدد کے جانا ناممکن ہے۔

لیکن اس سے پہلے میسنر نے کئی قابلِ ذکر چوٹیاں سر کیں۔ 1972ء میں اس نے ماناسلو کی چوٹی سر کی۔ اس چوٹی پر جانے کے لیے اس نے ایک بالکل نیا رُخ تلاش کیا یہ رُخ اس قدر انجانا تھا کہ اس کی کوئی تصویر تک نہیں تھی۔ آخری پڑاؤ جیسے کوہ پیمائی کی زبان میں آخری اونچا پڑاؤ بھی کہتے ہیں کیونکہ اس کے بعد کوہ پیما صرف کوہ پیمائی کا سامان یا محدود کھانے پینے کے ساتھ چوٹی کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں۔ سات ہزار میٹرز کی بلندی پر لگایا تھا وہاں سے میسنر نے اپنے ساتھی فرینک جگیر کے ہمراہ چوٹی کی طرف سفر شروع کیا۔ لیکن جگیر راستے سے پلٹ گیا۔ یہیں سے یہ مہم بھی المیے میں تبدیل ہوگئی۔

جیسے ہی میسنر نے چوٹی پر قدم رکھا اچانک ہی موسم نے اپنے تیور بدلے اور گہری دھند نے ماحول کو یوں ڈھانپ لیا کہ چند فٹ سے آگے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میسنر راستہ کھو بیٹھا تھا لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری اور کسی نہ کسی طرح نیچے آتے ہوئے بیس کیمپ تک رسائی حاصل کرلی۔

.... بیس کیمپ میں دو مزید کوہ پیما ہورسٹ فانک ہوبر اور آنڈی شلک اس اور جگیر کا انتظار کر رہے تھے۔ یہاں پہنچ کر میسنر کو معلوم ہوا کہ جگیر تو آیا ہی نہیں ہے۔ اس پر ہورسٹ اور آنڈی اس کو تلاش کرنے کے لیے نکلے۔ گہری دھند میں یہ بہت مشکل کام تھا۔ میسنر نے ان کو منع کیا تھا کہ اس وقت نہ نکلیں۔ لیکن انہوں نے اس کی بات نہیں مانی تھی۔ دھند گہری ہوتی جا رہی تھی اور اسی دھند میں ہورسٹ اور آنڈی نے جگیر کی چیخیں سنیں لیکن وہ اسے تلاش نہ کر سکے اور خود راستہ بھٹک گئے۔ رات کو اپنی جان بچانے کے لیے انہوں نے ایک غار میں پناہ لی تھی۔ اگلے روز ہورسٹ واپس لوٹ آیا لیکن آنڈی اسی غار میں رکا رہا تھا اور وہ واپس نہیں لوٹ سکا۔ یوں یہ مہم کامیابی کے باوجود ایک المیے میں ڈھل گئی تھی۔ دو کوہ پیما ہمیشہ کے لیے ماناسلو کی برف میں گم ہو گئے تھے۔ بعد میں میسنر نے اس المیے کا ذمّے دار جگیر کو قرار دیا جو درمیان سے ا لپر، لوٹ گیا اور اسے اکیلا چھوڑ دیا تھا اگر وہ اس کے ساتھ ہوتا تو وہ واپس بیس کیمپ تک پہنچ جاتے تھے اور پھر اس کی تلاش بھی نہ کرنی پڑتی جس دوران میں آنڈی بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

1975ء کا سال میسنر کے لیے مزید کامیابیاں لایا تھا کیونکہ اس سال اس نے کے ٹو کے ساتھ واقع قراقرم کے سلسلے میں گیشر برم اوّل کو سر کیا۔ یہ چوٹی بھی آٹھ ہزار میٹرز سے زیادہ بلند ہے اور یوں میسنر پہلا کوہ پیما بن گیا جس نے ایسی دو چوٹیوں کو سر کیا تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ اس نے اسے الپس اسٹائل میں سر کیا تھا جبکہ اس سے پہلے آٹھ ہزار میٹرز بلند چوٹی کو اس انداز میں سر نہیں کیا گیا تھا۔ ایسی ہر چوٹی مہماتی انداز میں سر کی گئی تھی۔ ان ہی دنوں ہرمن بوہل نے ایک نیا انداز متعارف کرایا تھا جسے اس نے ویسٹ الپس اسٹائل کا نام دیا۔ اس میں کوہ پیماؤں کا گروپ کم ترین اور ہلکے سامان کے ساتھ اور نصب ہو جانے والی رسیوں کی مدد سے کسی چوٹی کو سر کرتا ہے اور ان کو کسی بیرونی مدد کی ضرورت نہیں رہتی ہے اس میں تیز رفتاری کی بھی خاص اہمیت ہوتی ہے لیکن ہمالیہ میں یہ انداز زیادہ رواج نہیں پا سکا کیونکہ الپس کے برعکس ہمالیہ میں دشواریاں بہت زیادہ ہیں اور یہاں تیز رفتاری کا مطلب موت سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ خود میسنر نے بھی ہمالیہ کے اس انداز کو پسند نہیں کیا۔

1984ء میں میسنر نے اپنے ہانس کامرلینڈر کے ساتھ ایک منفرد کارنامہ انجام دیا۔ وہ ایک بار پھر گیشر برم کی چوٹیوں کو سر کرنے نکلے تھے اور انہوں نے یکے بعد دیگرے گیشر برم اوّل اور دوم کو سر کر لیا اور اس دوران میں وہ واپس بیس کیمپ آئے تھے بلکہ ان کے پاس جو زادِ راہ تھا اسے ہی استعمال کر کے انہوں نے یہ کارنامہ انجام دیا تھا۔ اس سے پہلے ایک ہی آخری پڑاؤ سے دو آٹھ ہزار میٹرز بلند چوٹیاں کسی نے سر نہیں کی تھیں۔

1978ء کا سال میسنر کے لیے یادگار رہا تھا کیونکہ اس سال اس نے دو ایسے کارنامے انجام دیے جو اس سے پہلے نہ تو کسی نے انجام دیے تھے اور نہ ہی کسی نے کرنے کا سوچا تھا۔ یہ وہی خیالات تھے جو اس نے پندرہ سال پہلے پیش کیے تھے اور اس وقت سب نے اس کی مخالفت کی تھی اور اسے ناممکن قرار دیا تھا۔ سرما کے خاتمے سے پہلے میسنر نیپال میں موجود تھا اور اس نے یہاں پیٹر ہیبلر کے ساتھ ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے کا ارادہ کیا۔ مئی کے آغاز میں وہ بیس کیمپ میں موجود تھے جہاں مستقل برف باری جاری تھی اور محکمہ موسمیات مزید برف باری کی پیشن گوئی کر رہا تھا۔ ایسے میں چوٹی کی طرف جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

لیکن میسنر اور پیٹر کے ارادے کچھ اور تھے اور وہ برف باری اور طوفان کی پروا کیے بغیر ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے روانہ ہو گئے۔ جس نے سنا اس نے ان کو پاگل قرار دیا تھا۔ اس موسم میں چوٹی کی طرف جانا خودکشی کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ چار مئی کو انہوں نے بائیس ہزار فٹ کی بلندی پر پہلا کیمپ لگایا۔ یہاں ایک دن رک کر ستانے کے ساتھ انہوں نے حالات کا جائزہ بھی لیا تھا۔ برف باری جاری تھی لیکن طوفان نہیں تھا اور ہواؤں کی رفتار بھی معتدل تھی۔ میسنر کے خیال میں وہ چوٹی کی طرف بڑھ سکتے تھے اگرچہ پیٹر ہچکچا رہا تھا لیکن میسنر کی وجہ سے وہ تیار ہو گیا۔ اس مہم کی خاص بات یہ تھی کہ ان کے پاس آکسیجن کی سپلائی نہیں تھی اگر ان میں سے کسی کو سانس کا مسئلہ ہوتا تو اسے لازمی واپس آنا پڑتا اور یوں یہ مہم ناکام ہو جاتی۔ انہوں نے پچیس ہزار فٹ کی بلندی پر دوسرا کیمپ لگایا اور ستائیس ہزار فٹ پر آخری کیمپ لگایا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میسنر اتنی بلندی پر آیا تھا اور یہاں تک پہنچ کر کوہ پیماؤں کو لازمی آکسیجن بوتل کی ضرورت پڑ جاتی تھی۔ پھر وہ اس مہم کو الپس اسٹائل میں سر کر رہے تھے جو اس سے پہلے کبھی ماؤنٹ ایورسٹ پر نہیں آزمایا گیا تھا۔

اس آخری پڑاؤ کے بعد وہ آٹھ مئی کو چوٹی کی طرف بڑھے اور آخر کار وہ دنیا کے اوّلین انسان بن گئے جنہوں نے دنیا کی بلند ترین چوٹی کو آکسیجن کی سپلائی کے بغیر سر کر لیا تھا۔ اس سے پہلے کوئی کوہ پیما کسی آٹھ ہزار میٹرز بلند چوٹی تک بھی آکسیجن کی مدد کے بغیر نہیں پہنچا تھا۔ میسنر اور پیٹر کے اس کارنامے نے ماہرین کو انگشت بدنداں رہ جانے پر مجبور کر دیا تھا جو کہہ رہے تھے کہ یہ کام ناممکن ہے اور کوئی انسان اتنی بلندی پر بغیر مصنوعی آکسیجن کے نہیں رہ سکتا..... اس دن دنیا والوں نے میسنر کو دنیا کا عظیم ترین کوہ پیما تسلیم کر لیا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ... میسنر نے دنیا کو حیران کرنے کا سلسلہ ترک کر دیا تھا ابھی اس کے پاس بہت کچھ تھا۔

ابھی میسنر کے اس کارنامے کی گونج کم نہیں ہوئی تھی کہ اس نے یہ اعلان کر کے سب کو حیران کر دیا کہ وہ اسی سال اگست کے مہینے میں نانگا پربت کو اکیلے سر کرے گا۔ آٹھ ہزار میٹرز بلند کسی بھی چوٹی کو ابھی تک کسی اکیلے کوہ پیما نے سر نہیں کیا تھا۔ اس مہم کو اس نے اپنے بھائی گنتھر کے نام کیا اور اس نے چوٹی تک جانے کے لیے دیامیر والا رُخ منتخب کیا۔ لیکن اس نے اس راستے سے جانے سے گریز کیا جس سے وہ پہلی کامیابی کے بعد واپس اُترا تھا اور جس پر گنتھر مارا گیا تھا۔ نو اگست کے دن وہ نانگا پربت کو اکیلے سر کرنے والا اور دو بار سر کرنے والا اوّلین کوہ پیما بن گیا۔ اس مہم میں اس کے ساتھ کوئی نہیں تھا اور بیس کیمپ سے چوٹی تک وہ اکیلے گیا تھا۔ اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے اس بار بھی آکسیجن کی سپلائی نہیں لی تھی اور اس کے بعد اس نے کسی مہم میں آکسیجن کی سپلائی ساتھ نہیں رکھی تھی اور اس کی بیشتر مہمات اکیلے ہی سرانجام پائی تھیں۔

صرف چونتیس برس کی عمر میں میسنر کوہ پیماؤں میں ماورائی حیثیت اختیار کر گیا تھا اس کے کارنامے ناقابل یقین تھے اور اس سے ملنا بھی ایک اعزاز بن گیا تھا۔ اگر وہ کسی کوہ پیما کے ساتھ کسی مہم پر جانے کو آمادہ ہو جاتا تھا تو یہ چیز اس کوہ پیما کے لیے چوٹی سر کرنے سے بھی زیادہ اہمیت اختیار کر جاتی تھی۔ جب وہ واپس اٹلی پہنچا تو اس کا شاندار استقبال ہوا تھا اور یورپ بھر میں اسے اتنے دعوت نامے ملے کہ اسے نوّے فیصد دعوتوں سے انکار کرنا پڑا تھا۔ اس پر اعزازات کی بارش ہوگئی تھی اور کوہ پیمائی کی دنیا کا شاید ہی ایسا کوئی اعزاز ہو جو اسے نہ دیا گیا ہو۔ اٹلی کی حکومت نے اسے ملک کا اعلیٰ ترین سول اعزاز دیا۔ افسوس کہ وہ انگریز نسل سے نہیں تھا ورنہ ایڈمنڈ ہلاری کی طرح اسے بھی سر کا خطاب مل جاتا۔ لیکن میسنر کو ان مصنوعی خطابوں کی ضرورت نہیں تھی، وہ ان سب سے بہت بلند مقام حاصل کر چکا تھا جہاں خود اعزاز کی وقعت اس کی وجہ سے بڑھ جاتی تھی۔

1980ء میسنر ایک بار پھر نیپال میں تھا اور اس نے اس بار ماؤنٹ ایورسٹ کو تن تنہا سر کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ بیس اگست کے دن وہ کامیابی سے اس کی چوٹی تک پہنچ چکا تھا۔ اس بار بھی اس نے آکسیجن کا سہارا نہیں لیا تھا۔ اس نے شمال مشرقی ڈھلان کا انتخاب کیا تھا۔ اس چڑھائی کے دوران اس نے پہاڑ کا پورا شمالی حصہ عبور کیا۔ پھر اس نے مشہور نورٹن کالر پر قدم رکھا۔ یہ سیڑھی دار ساخت رکھنے والا حصہ اس سے پہلے کسی انسان کے قدم سے محروم رہا تھا۔ حالانکہ ہزار سے بھی زیادہ افراد اس وقت تک ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کر چکے تھے۔ اس مہم کے دوران میسنر نے ایک اور منفرد اعزاز حاصل کیا وہ پہلا کوہ پیما بن گیا جس نے ایورسٹ کو سر کرتے ہوئے ایک بھی کیمپ نہیں لگایا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے پاس صرف اتنا سامان تھا جو چوٹی تک اس کے ساتھ رہا تھا اس میں اس کا سلیپنگ بیگ اور کھانے پینے کے سامان کے ساتھ ایک بہت چھوٹا سا برنر بھی تھا جس سے وہ بہ وقت ضرورت خود کو یا کھانے کو گرم کر سکتا تھا۔

سب سے پہلے نانگا پربت اور ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کی وجہ یہ ہرگز نہیں تھی کہ میسنر کے نزدیک کے ٹو کی اہمیت کم تھی۔ بلکہ وہ روزِ اوّل سے اس چوٹی کو سر کرنے کا خواہش مند تھا۔ لیکن وہ پہلے اپنے کچھ کام مکمل کر لینا چاہتا تھا۔ ان میں سب سے اہم تو اس کے دو خیالات تھے جن کو وہ دنیا والوں پر درست ثابت کرنا چاہتا تھا ایک تو آکسیجن کے بغیر چوٹیاں سر کرنا اور دوسرے اکیلے چوٹی سر کرنا۔ یہ ثابت کرنے کے بعد وہ کے ٹو کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

1979ء میں میسنر نے کے ٹو سر کرنے کا ارادہ کیا اور یہاں بھی اس نے اپنی انفرادی حیثیت برقرار رکھی تھی اس نے کے ٹو کو ایک بالکل نئے زاویے سے سر کرنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ کے ٹو کا جنوبی رُخ ہے، پورے پہاڑ پر ایک لکیر ہے جو دامن سے چوٹی تک جاتی ہے اور میسنر نے اسے جادوئی لکیر کا نام دیا۔ اس سے پہلے میسنر کبھی کے ٹو کے بیس کیمپ کنکورڈیا تک نہیں آیا تھا اور جب اس کی ٹیم نے اسکردو سے اپنا سفر شروع کیا تو اسے صحیح معنوں میں اندازہ ہوا کہ صرف بیس کیمپ تک رسائی ہی ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے کے برابر ہے۔ یہ پورے ایک ہفتے کا سفر تھا جس میں ان کو تین گلیشیر عبور کرنا تھے اور متعدد ایسی جان جوکھم والی جگہوں سے تھا جو آدمی کی جان نکالنے کے لیے کافی ہوتی ہیں۔ اس راستے کے بارے میں میسنر کا کہنا تھا۔ ”کے ٹو سے پہلے اس کے بیس کا سفر کسی خواب سے کم نہیں ہے۔ میں نے کبھی کسی چوٹی کے بیس کیمپ تک سفر کا وہ لطف نہیں اُٹھایا جو کنکورڈیا کے سفر میں اُٹھایا تھا۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اگر کے ٹو سر نہ بھی ہو تب بھی اس سفر کا لطف ہی کافی ہے۔“

اس بار میسنر ایک بڑی ٹیم کے ساتھ آیا تھا۔ اس میں کل چھ کوہ پیما تھے تین اٹالین الیگزینڈر روگینگو، فریڈل شیشنر اور رینا ٹوگا ساریٹو تھے۔ ایک آسٹرین کوہ پیما رابرٹ شور اور ایک جرمن کوہ پیما مائیکل ڈیہر تھے۔ جو چین ہولزگر ٹیم کا صحافی اور ارسلا گریتھر ڈاکٹر تھی۔ لیکن کنکورڈیا کے راستے میں ہی ارسلا ایک حادثے کا شکار ہوگئی۔ میسنر اور فریڈل اسے باری باری اپنی پیٹھ پر اُٹھا کر اسکولے چھوڑنے آئے تھے۔ واضح رہے کہ مشینی ٹرانسپورٹ صرف اسکولے تک آتی تھی۔ اس سے آگے کنکورڈیا تک سارا سفر پیدل اور خچروں پر کیا جاتا ہے۔

میسنر نے اس روٹ کا انتخاب سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ کیونکہ یہ ایک پُل کی طرح تھا جس کے دونوں طرف ڈھلان تھی۔ اس لیے اس پر ایولانچ آنا ناممکن تھا جب کہ مروجہ راستوں پر ایولانچ کا خطرہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ کے ٹو کو اس وجہ سے بھی دشوار چوٹی کہا جاتا ہے کہ یہاں موسمی حالات دوسری تمام چوٹیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ خراب رہتے ہیں۔ سال میں کم ہی دن ایسے ہوتے ہیں جب اس پر مطلع

صاف ہو اور چوٹی کا دیدار نصیب ہو سکے۔ بہت سارے کوہ پیما جو اسے سر کرنے کا عزم لے کر کنکورڈیا پہنچتے ہیں وہاں دو ہفتے قیام کے باوجود چوٹی کی ایک جھلک نہیں دیکھ پاتے اور بے نیل و مرام لوٹ جاتے ہیں۔ خراب موسم اور برف باری کی زیادتی سے بہت کم مواقع ایسے ہوتے ہیں جب کوئی مہماتی ٹیم اسے سر کرنے کے لیے بیس کیمپ سے نکل پاتی ہے۔ مئی تک کنکورڈیا کا اپنا موسم خراب ہوتا ہے اور اس میں یہاں رہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ جون سے اگست تک تین مہینے موسم کچھ بہتر ہوتا ہے اور وہ بھی ہر روز نہیں ہوتا..... یہی وجہ ہے کہ سال میں ایک دو کوہ پیما کے ٹو کی چوٹی پر قدم رکھ پاتے ہیں۔

میسنر ان تمام مشکلات سے آگاہ تھا اور اسے امید تھی کہ اسے کے ٹو سر کرنے کا موقع ملے گا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے کے ٹو کو پہلی بار..... اکیلے سر کرنے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ پھر وہ نصب کیے جانے والے رسے، آلات اور پڑاؤ بھی استعمال کرتے کیونکہ اس چوٹی تک جا کر آنا یقیناً چند دن کی بات نہیں تھی اس میں زیادہ وقت لگ سکتا تھا۔ میسنر کی تیاریوں سے واضح تھا کہ اس نے کے ٹو کو بہت سنجیدہ لیا تھا۔ لیکن انہوں نے نہ تو کوئی سانس دلانے والا آلہ رکھا تھا اور نہ ہی آکسیجن بوتلیں ساتھ لی تھیں یعنی وہ یہ مہم بغیر اضافی آکسیجن کے سر کرنے جا رہے تھے۔ جولائی کے پہلے ہفتے میں وہ کنکورڈیا سے روانہ ہوئے اور یکے بعد دیگرے انہوں نے چھ کیمپ مختلف بلندیوں پر لگائے تھے۔

خوش قسمتی سے تمام چھ ارکان آخری کیمپ تک ایک ساتھ رہے تھے۔ اس وقت تک موسم بھی خوشگوار رہا تھا۔ لیکن گیارہ جولائی تک موسم میں خرابی کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے اور بارہ جولائی کو جب انہوں نے چوٹی کی طرف پیش قدمی شروع کی تو موسم انتہائی خراب ہو چکا تھا۔ کوئی تیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے چلنے والی ہوائیں ان کو بار بار چوٹی سے نیچے دھکیلنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ برف کے ذرّے اُڑ رہے تھے اور ان کو یخ بستہ چھرّوں کی طرح لگ رہے تھے۔ ان کے نتھنوں پر بار بار برف جم جاتی تھی اور اس کو صاف کرنا پڑتا۔ میسنر کے ساتھی ایک ایک کر کے ہمت ہار رہے تھے۔ صفر ڈگری سے چالیس درجے نیچے... اور بہت کم آکسیجن کے ساتھ تقریباً عمودی چڑھائی پر جانا آسان نہیں تھا۔ آخر میں میسنر کے ساتھ صرف ایک کوہ پیما مائیکل ڈیہر باقی رہ گیا تھا۔ دونوں ہمت کر کے چوٹی کی طرف بڑھتے رہے اور ڈیہر کو وہ دونوں چوٹی پر پہنچ چکے تھے اور باقی ممبران ناکامی کے احساس کے ساتھ آخری پڑاؤ کی طرف واپس لوٹ گئے تھے۔ خراب موسم کے باوجود ان کی مہم کامیاب رہی اور اس لحاظ سے تو بہت کامیاب رہی کہ اس..... دوران کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔ ورنہ خراب موسم میں کے ٹو اپنے اوپر قدم رکھنے والوں سے زندگی کا خراج لیے بغیر نہیں رہتا۔

ماؤنٹ ایورسٹ کی مہم کے دوران جب میسنر نیپال میں تھا تو اس کے پاس ایک موقع تھا۔ وہ شیشا پانگ مہ کی چوٹی سر کر سکتا تھا۔ بدقسمتی سے اس حسین چوٹی کا سوائے بیس کیمپ کے ایک چھوٹے..... حصے کے باقی سب چین کے حصے میں ہے اور مغربی کوہ پیماؤں کو وہاں جانے کی اجازت نہیں ملتی تھی اور دوران کوہ پیماؤں کو بہت محتاط رہنا پڑتا تھا اگر وہ غلطی سے چین کی حدود میں جا نکلتے تو ان کو گرفتار کیا جا سکتا تھا۔ لیکن میسنر کے نام کو سن کر چینی حکومت نے اسے سر کرنے کی اجازت دے دی اور میسنر، فریڈل، اوسوالڈ اولز اور گرڈ بیئر کے ہمراہ اس چوٹی کو سر کرنے روانہ ہوا اور اٹھائیس مئی کے دن میسنر اور فریڈل چوٹی تک پہنچنے میں کامیاب رہے جب کہ موسم نہایت خراب تھا اور ان کا ریڈیو سے رابطہ بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ پورے چوبیس گھنٹے بیس کیمپ میں موجود ساتھیوں کو ان دونوں کا پتا نہیں چلا تھا۔ لیکن پھر وہ خراب موسم میں بھی بیس کیمپ پہنچنے میں کامیاب رہے تھے۔ ان سے پہلے بہت کم مغربی کوہ پیماؤں کے قدم اس چوٹی تک پہنچے تھے۔

1982ء میں میسنر نے ایک انوکھا منصوبہ بنایا اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس سال تین آٹھ ہزار میٹر سے زیادہ بلند چوٹیاں سر کرنے کی کوشش کرے گا اس سے پہلے کسی کوہ پیما نے ایک سال میں ایسی تین چوٹیاں سر نہیں کی تھیں۔ سب سے پہلے اس نے دنیا کی تیسری بلند ترین چوٹی کنچن جنگا کا انتخاب کیا۔ اس کے بعد اس نے گیشر برم دوم اور براڈ پیک کو سر کرنے کا سوچا تھا۔ خوش قسمتی سے اس نے تینوں چوٹیوں کو سر کر لیا اور ایک منفرد ریکارڈ قائم کرنے میں کامیاب رہا۔

مگر اس کامیابی کی اسے اور اس کے ساتھیوں کو بہت بڑی قیمت دینا پڑی تھی۔ اس بار فریڈل اور آنگ ڈورجے اس کے ساتھ تھے۔ وہ بہت خراب حالت میں کنچن جنگا کی چوٹی پر پہنچے اور وہاں سے واپسی پر فریڈل کو دائیں ہاتھ میں فراسٹ بائٹ ہوا اور اس کے بعد اس کے پاؤں میں بھی فراسٹ بائٹ کا اثر ہو گیا۔ ان کا خیمہ پھٹ گیا تھا اس سے مشکلات میں اضافہ ہوا تھا۔ خود میسنر بیمار پڑ گیا تھا اور اس کے جگر پر ورم آ گیا تھا۔ اس بیماری نے اسے بہت کمزور کر دیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا۔ بیس کیمپ واپسی میں فریڈل نے اسے سہارا دیا ہوا تھا حالانکہ وہ خود شدید بیمار تھا، یوں یہ مہم کامیابی کے باوجود ان کے لیے اچھی نہیں رہی تھی۔ پھر ان بیماریوں سے میسنر کا تین چوٹیاں سر کرنے کا منصوبہ بھی متاثر ہوا تھا۔ فریڈل یورپ روانہ ہو گیا تا کہ اپنے ہاتھ اور پاؤں کا علاج کرا سکے۔ میسنر بھی آرام کے ساتھ اپنے جگر کا علاج کرانے لگا۔ مکمل صحت یابی کے بعد وہ پاکستان آیا اور اس نے گیشر برم دوم کو نئے راستے سے سر کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس بار اس کے ساتھ مقامی کوہ پیما شیر خان اور نذیر صابر تھے۔ یہ تینوں ہی صحت کے لحاظ سے بہت اچھی حالت میں نہیں تھے لیکن اس کے باوجود وہ چوبیس جولائی کو ایک طوفان میں گھرے چوٹی پر پہنچنے میں کامیاب رہے تھے۔ اس مہم سے واپسی پر میسنر کو ایک گم شدہ آسٹرین کوہ پیما کی لاش نظر آئی جو دو سال پہلے یہاں غائب ہو گیا تھا۔

اس سال کی آخری چوٹی براڈ پیک تھی لیکن میسنر کو اکیلے ہی یہ چوٹی سر کرنے کی اجازت ملی تھی۔ البتہ بعد میں دو کوہ پیما جرزے کوکوزکا اور وجیج ورتیا کا اس کے ساتھ شامل... ہو گئے تھے۔ اصل میں ان کو کے ٹو سر کرنے کی اجازت ملی تھی لیکن وہ کے ٹو چھوڑ کر غیر قانونی طور پر میسنر کے ساتھ اس مہم میں شامل ہو گئے تھے۔ میسنر نے اس بات کو بہت عرصے تک چھپا کر رکھا تھا اور پھر اپنی ایک کتاب میں اس کا ذکر کیا تھا۔ مگر میسنر کی یہ کوشش ناکام رہی اور وہ چوٹی تک نہیں پہنچ سکا تھا نہ ہی اس کے ساتھیوں کو کامیابی ملی۔ واپسی پر میسنر مایوس تھا۔ اس کا ایک سال میں تین آٹھ ہزار میٹرز بلند چوٹیاں سر کرنے کا ارادہ پورا ہوتا نظر نہیں آرہا تھا۔ مگر اس نے ہمت نہیں ہاری، دو اگست کو ایک بار پھر شیر خان اور نذیر صابر اس کے ساتھ تھے اور انہوں نے دو اگست کو براڈ پیک کو سر کر لیا تھا۔

الپس کے برعکس ہمالیہ میں سرمائی مہمات نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں کیونکہ یہاں گرما میں موسم اتنا خراب ہوتا ہے اور سرما میں تو مقامی باشندے بھی پہاڑوں کی طرف جانے سے گریز کرتے ہیں۔ اس کے باوجود میسنر نے 1982/83ء کے سرما کے دوران چھو آیو کی چوٹی سر کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر مہم کے دوران ساڑھے سات ہزار فٹ کی بلندی پر اسے زبردست برفانی طوفان کا سامنا کرنا پڑا اور وہ واپس لوٹ گیا۔ اس کے ساتھ ہانس کامرلینڈ تھا۔ پھر میسنر نے آنے والے مئی میں کامرلینڈ اور مائیکل دیچر کے ہمراہ اس چوٹی کو سر کر لیا۔

ان کامیابیوں نے میسنر کو آل ٹائم گریٹ ماؤنٹینئر بنا دیا تھا۔ جب وہ کسی چوٹی کو سر کرنے کے ارادے کا اعلان کرتا تو لوگ پہلے ہی یقین کر لیتے تھے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا۔ اگر فوری کامیاب نہ بھی ہو سکا تب بھی وہ کبھی نہ کبھی اس چوٹی کو سر کرلے گا۔ آنے والے سالوں میں میسنر ہمالیہ میں مصروف رہا۔ یہاں چوٹیوں کی کمی نہیں تھی۔ جب وہ ایک چوٹی سر کر لیتا تھا تو اسے پتا چلتا کہ ابھی مزید بہت ساری چوٹیاں اس کے قدموں کی منتظر ہیں۔ 1985ء میں میسنر نے اناپورنا کو سر کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کے ساتھ رین ہارڈ پیٹ شیڈر، رین ہارڈ شیبٹل اور ایک انڈین کوہ پیما سوامی پریم درشنو تھے۔ لیکن یہ تینوں ہی چوٹی تک نہیں پہنچ سکے اور صرف میسنر کو یہ اعزاز حاصل ہوا۔ اس وقت موسم حد سے زیادہ خراب تھا اور شدید برف باری کا نہ رکنے والا سلسلہ جاری تھا۔ وہ لوگ بڑی مشکل سے نیچے واپس آئے تھے۔

نیپال میں واقع دھول گری کی چوٹی کو دس بڑی چوٹیوں میں سب سے حسین قرار دیا جاتا ہے کیونکہ یہ خوب صورت شکل میں پوری کی پوری برف سے ڈھکی ہے۔ میسنر نے پہلے 1977ء اور پھر 1984ء میں اسے سر کرنے کی ناکام کوششیں کی تھیں لیکن آخر کار وہ اس سال اسے بھی سر کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ اس نے کامرلینڈ کے ساتھ مہم شروع کی اور صرف تین دن بعد وہ پندرہ مئی کے دن چوٹی پر موجود تھے لیکن اس بار بھی ان کو بہت خراب موسم کا سامنا تھا۔ شدید برف باری میں ان کو آس پاس کا منظر بالکل بھی صاف نظر نہیں آرہا تھا۔

ماکالو کی چوٹی بھی میسنر کی توجہ کا مرکز رہی ہے۔ وہ اسے سرما میں سر کرنا چاہتا تھا اور اس نے دو کوششیں کیں لیکن دونوں ناکام رہیں اور سرما میں پہلی بار اس چوٹی پر دو کوہ پیماؤں ڈینس یوکوبکو اور سائمن مورے نے قدم رکھا اور یہ صرف دو سال پہلے کی بات ہے۔ البتہ میسنر نے اسے 1986ء میں سرما کے آغاز سے پہلے سر کر لیا تھا۔ اس مہم میں میسنر کو اپنے ایک ساتھی مارسل روڈی کی موت کا منظر دیکھنا پڑا، وہ ایک برفانی ٹیلے کے عقب میں گر گیا اور پھر دوبارہ نہیں ملا۔ کچھ عرصے بعد اس کی لاش نظر آئی تھی۔ اس کے علاوہ باقی پارٹی بہ حفاظت پہنچ گئی تھی۔ ماکالو کو میسنر اور اس کے ساتھیوں نے ستمبر میں سر کیا تھا اور اس کے فوراً بعد اس کا ارادہ لہوٹ سے کو سر کرنے کا تھا لیکن موسم سرما سر پر آچکا تھا اور ان کے پاس وقت نہیں تھا اس لیے انہوں نے ماکالو کے بیس کیمپ سے لہوٹ سے کے بیس کیمپ کا سفر ہیلی کاپٹر میں

...وقت بچا لیا اور سولہ اکتوبر کے دن وہ اس چوٹی تک ...ں بھی کامیاب رہے تھے۔ یوں اس سال میسنر نے ...ا کی تمام آٹھ ہزار میٹرز بلند چوٹیاں سر کرنے کا اعزاز ...اصل کر لیا اور وہ یہ کارنامہ انجام دینے والا پہلا فرد بن گیا۔ ...ں کے فوراً بعد جرزے کوکوزکا نے بھی یہ اعزاز حاصل کر... 1989ء میں میسنر ایک یورپی مہم لے کر ہمالیہ میں آیا ...ن اب اس کی دلچسپی ختم ہو گئی تھی اس نے مزید کوئی چوٹی سر ...رنے کی کوشش نہیں کی اور مہم ناکام واپس لوٹ گئی۔

تیرہ سال کی عمر میں اس نے پہلی چوٹی سر کی تھی اس ...ے بعد لگاتار تیس سال اس کے گھر اور شہر میں کم اور پہاڑوں ...اور ویرانوں میں زیادہ گزرے تھے۔ نانگا پربت پر اپنی چھ ...انگلیاں کھو دینے کے بعد اس نے چٹانوں پر چڑھنا ترک کر ...دیا تھا۔ ورنہ چٹانوں پر چڑھنا اس کا پرانا شوق تھا۔ کنکورڈیا ...کے راستے میں آنے والے تین دنیا کے بلند ترین چٹانی ٹاور ...ر کلائمبر کا خواب ہیں اور میسنر نے ایک بار بھی ان کو سر کرنے ...کی کوشش نہیں کی۔ دونوں پاؤں میں چھ انگلیاں گنوا دینے ...کے بعد وہ یہ کوشش نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے بجائے اس نے مہم ...وئی کے دوسرے راستے نکال لیے۔ اس نے اپنے بھائی

ہربرٹ میسنر کے ہمراہ بحیرہ منجمد شمالی عبور کیا۔ تقریباً ڈھائی ہزار کلومیٹر کا سفر پیدل طے کر کے دونوں بھائی کینیڈا سے ہوتے ہوئے یورپ جا نکلے تھے اور اس دوران میں انہوں نے قطب شمالی کو چھوا تھا۔ پھر میسنر نے انٹارکٹیکا کا منجمد.... براعظم پیدل عبور کیا۔ اس سفر میں اسے اور اس کی ساتھیوں کو دو مہینے سے زیادہ عرصہ لگ گیا تھا۔

کوہ پیمائی کے میدان میں اپنے جھنڈے گاڑ دینے کے بعد میسنر کی توجہ اس طرف کم ہو گئی تھی اور یہ قدرتی بات ہے۔ جب ایک آدمی ایک کام کو اس کی انتہا تک لے جاتا ہے تو اس کی توجہ خود بہ خود کم ہو جاتی ہے۔ اس لیے میسنر نے نوے کے عشرے کے بعد کوہ پیمائی پر توجہ کم کر دی تھی اور اس کے بجائے وہ ٹریکنگ پر زیادہ زور دینے لگا تھا۔ خاص طور سے برفانی علاقے اور صحرا اس کی توجہ کا مرکز بن گئے تھے۔ پھر اس نے دنیا کے دوسرے ٹریکنگ پوائنٹ کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے مہمات کی تھیں۔

1971ء میں اپنی معمول کی کوہ پیمائی کے ساتھ اس نے دنیا کے کئی ممالک کا طوفانی دورہ کیا۔ وہ چار براعظموں میں گیا اور لوگوں کو کوہ پیمائی کی طرف متوجہ کیا۔ 1978ء میں

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ
مارچ 2012ء کے شمارے کی دلفریبیاں

ابتدائی سوغات • ایم اے راحت کے قلم سے ایک شاہکار کہانی...... آخرکار
مغرب کے نرالے انداز • مغربی دنیا کی تہذیب اور ماحول کی عکاس جرم اور محبت کی پُرودہ ناقابلِ فراموش کہانیاں
گرداب • پے در پے چاہتیں نکل کے ایک نئی منزل کی جانب گامزن انسا قادری کی سلسلے وار کہانی
للکار • طاہر جاوید مغل کے جادو اثر قلم کی ایک اور جھلک۔ زندہ دلان لاہور کے سنگ
سرورق کی کہانیاں
اکھاڑا • کاشف زبیر کے تیکھے قلم کی جولانیاں تیمور شامی کی ہنگامہ آرائیاں
آثار جنوں • جنون اور جوش کی شوریدہ سری میں ڈوبے دیوانے کی فتنہ انگیز داستان سلیم فاروقی کی تحریر
چینی نکتہ چینی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس نے افریقا کی سب سے بلند چوٹی کلی منجارو کو سر کیا۔ اس کے لیے اس نے حسبِ معمول بالکل نیا راستہ اختیار کیا۔

1985ء میں میسنر نے ایک مہم ترتیب دی جس کا مقصد وادی کیلاش سے تبت تک جانے والی قدیم شاہراہ ریشم کی ازسرِنو دریافت تھی۔ اس دوران میں وہ بعض ایسے علاقوں سے گزرا جہاں اس سے پہلے کسی انسان نے قدم نہیں رکھے تھے۔ اگلے سال اس نے سطح مرتفع پامیر کو عبور کیا اور اسی سال اس نے انٹارکٹیکا کو عبور کیا۔ 1990ء میں اس نے ارون فچز کے ساتھ انٹارکٹیکا کو بالکل درمیان سے عبور کیا اور اس دوران میں وہ جنوبی قطب سے بھی گزرا تھا۔ یہ سفر ڈھائی ہزار کلومیٹرز سے زیادہ طویل تھا جو انہوں نے پیدل اور سلیجز کی مدد سے کیا تھا جنہیں کتے کھینچ رہے تھے۔ 1992ء میسنر نے چین کے صوبے زی جیانگ (ترکستان) میں چم بورازو کی چوٹی عبور کی اور پھر اس نے صحرائے تکلی ماکان کو عبور کیا۔ اس دوران میں اس نے دو ہزار میل سے زیادہ سفر پیدل طے کیا تھا۔ 1995ء میں اس نے سائبیریا سے آرکٹک عبور کر کے کینیڈا جانے کی کوشش کی لیکن یہ مہم کامیاب نہ ہو سکی۔ لیکن میسنر نے سائبیریا میں واقع سب سے بلند چوٹی الٹائی سر کر کے اس ناکامی کا کسی حد تک ازالہ کر دیا تھا۔ 1999ء میں میسنر نے ایک اور صحرا تھر کو یوں عبور کیا کہ پاکستان سے روانہ ہو کر وہ انڈیا میں راجستھان پہنچا تھا اس دوران میں اس نے کئی قدیم آثارات کو پہلی بار دیکھا اور دنیا کو ان سے روشناس کرایا۔

تیس سال تک پیشہ ور کوہ پیما کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد میسنر نے اسے ترک کرنے کا فیصلہ کیا اور روزگار کے لیے اس نے کوہ پیمائی سے متعلق ایک فرم بنائی جو مہمات کو سامان اور تکنیکی مدد فراہم کرتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ کتابیں لکھتا ہے اور رسائل میں کوہ پیمائی سے متعلق مضمون بھی لکھتا ہے۔ اسے لیکچرز اور سیمینار میں شرکت کے لیے بلایا جاتا ہے۔ ان سب سے وہ سالانہ لاکھوں ڈالرز کماتا ہے۔ اس کمائی سے اس نے ہمالیہ کے علاقے میں کام کرنے والی این جی اوز بنائی ہیں۔ خاص طور سے نیپال کے پسماندہ حصوں میں اسکول اور صحت کے لیے کام کر رہا ہے۔ نانگا پربت کی وادی دیامیر میں اس نے اپنے بھائی گنتھر کی یاد میں گنتھر ماؤنٹین اسکول بنایا جس کا افتتاح اس نے 2003ء میں کیا۔ وہ ہمالیہ کے علاقوں میں صفائی کی مہم بھی چلاتا رہا ہے کیونکہ بہت زیادہ کوہ پیماؤں، سیاحوں اور ٹریکنگ کے شوقین افراد نے ان علاقوں میں بہت زیادہ آلودگی پھیلا دی ہے جس سے یہ خدشہ پیدا ہو چلا ہے کہ یہاں پر آنے والے برسوں میں آلودگی کے مسائل ناقابل حل ہو جائیں گے۔

میسنر کو ہمیشہ نئے خیالات سوجھتے ہیں جن سے وہ دنیا والوں کو حیران کر دیتا ہے۔ اس بار بھی اس نے ایک ایسا ہی خیال پیش کیا اور پھر اس پر عمل کر کے دکھایا۔ اس نے کوہ پیمائی سے متعلق ایک میوزیم کا آغاز کیا جس میں کوہ پیمائی کی مکمل تاریخ اور چوٹیوں کے بارے میں مع ان کے ماڈلز کے تمام معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس میوزیم کو دلچسپ اور عام لوگوں کے لیے لائق توجہ بنانے کے لیے اس نے جدید ٹیکنالوجی اور آڈیو ویڈیو مصنوعات کا سہارا لیا۔ میوزیم کے لیے اس نے سگمنڈ سکرون کیسل کا انتخاب کیا جو خود ایک پہاڑ پر ہے۔ اس مرکزی میوزیم کے علاوہ اس نے دنیا کے چار مختلف عظیم پہاڑی سلسلوں ہمالیہ، الپس، انڈیز اور راکی میں اس کی شاخیں بھی قائم کی ہیں۔ اس میوزیم میں صرف چوٹیوں ہی نہیں بلکہ برفانی گلیشیرز، انٹارکٹیکا اور آرکٹک اور صحراؤں کے بارے میں بھی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ میوزیم میں میسنر نے ایک انوکھی چیز شامل کی ہے اس نے اہم پہاڑی قبائل جیسے شرپا، تبتی اور ہنزہ والوں کا مکمل کلچر بھی دکھایا ہے کیونکہ یہ پہاڑوں پر آباد ان لوگوں کا کلچر ہی اصل میں پہاڑوں کا کلچر ہے۔

سڑسٹھ برس کی عمر میں بھی میسنر پوری طرح چاق و چوبند، صحت مند اور سرگرم ہے۔ اگرچہ اس نے پہاڑوں پر جانا عرصہ ہوا چھوڑ دیا ہے لیکن وہ آج بھی باقاعدگی سے ہر سال مختلف پہاڑی سلسلوں اور بیس کیمپس تک جاتا ہے۔ نئے کوہ پیماؤں سے ملتا ہے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ وہ کوہ پیمائی کی ترقی کے لیے ہر ممکن قدم اٹھانے کو ہمیشہ تیار رہتا ہے۔ ساتھ ہی وہ پہاڑی خطوں کو انسانی دست برد سے محفوظ رکھنے اور یہاں آباد لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے بھی کام کر رہا ہے۔ ایک جادوئی شہرت رکھنے والے کوہ پیما کی حیثیت سے میسنر کا نام آج کی دنیا میں کسی بھی معروف اسپورٹس مین سے زیادہ جانا جاتا ہے۔ اس کے باوجود وہ صرف نام کو اپنی منزل سمجھ کر آرام سے نہیں بیٹھا ہے۔ میسنر ان لوگوں میں سے ہے جو زندگی میں نت نئے انوکھے کام چنتے رہتے ہیں اور پھر ان کاموں کو پایہ تکمیل تک پہنچا کر دوسروں کو حیران کرتے ہیں۔

ہمارے آس پاس ایسی کتنی ہی سچائیاں ہیں، فنِ تعمیر کے شاہکار ہیں، گم شدہ تعمیرات ہیں، آثار یہ ہیں جو قابلِ فخر ہیں، جن کے بارے میں جاننا ضروری ہے، واقف ہونا لازم ہے مگر ہم قریب سے گزر جاتے ہیں، ان سے لاعلم رہ جاتے ہیں۔ یہ تک نہیں سوچتے کہ ان کے پیچھے کتنی کہانیاں، کتنی افرادی قوت کام آئی ہے۔ زمانے کی سبک روی، تیز رفتاری نے کیسی کیسی حکایتیں ماضی کی قبر میں دفن کر دی ہیں۔ حب الوطنی کا تقاضا ہے کہ وطن کے ہر ذرے سے پیار کیا جائے۔

وطن پرستوں کے لیے وطن دوست کا تحفہ، سیر پاکستان کا حصہ

لینس ڈاؤن برج

ذلفی شاہ

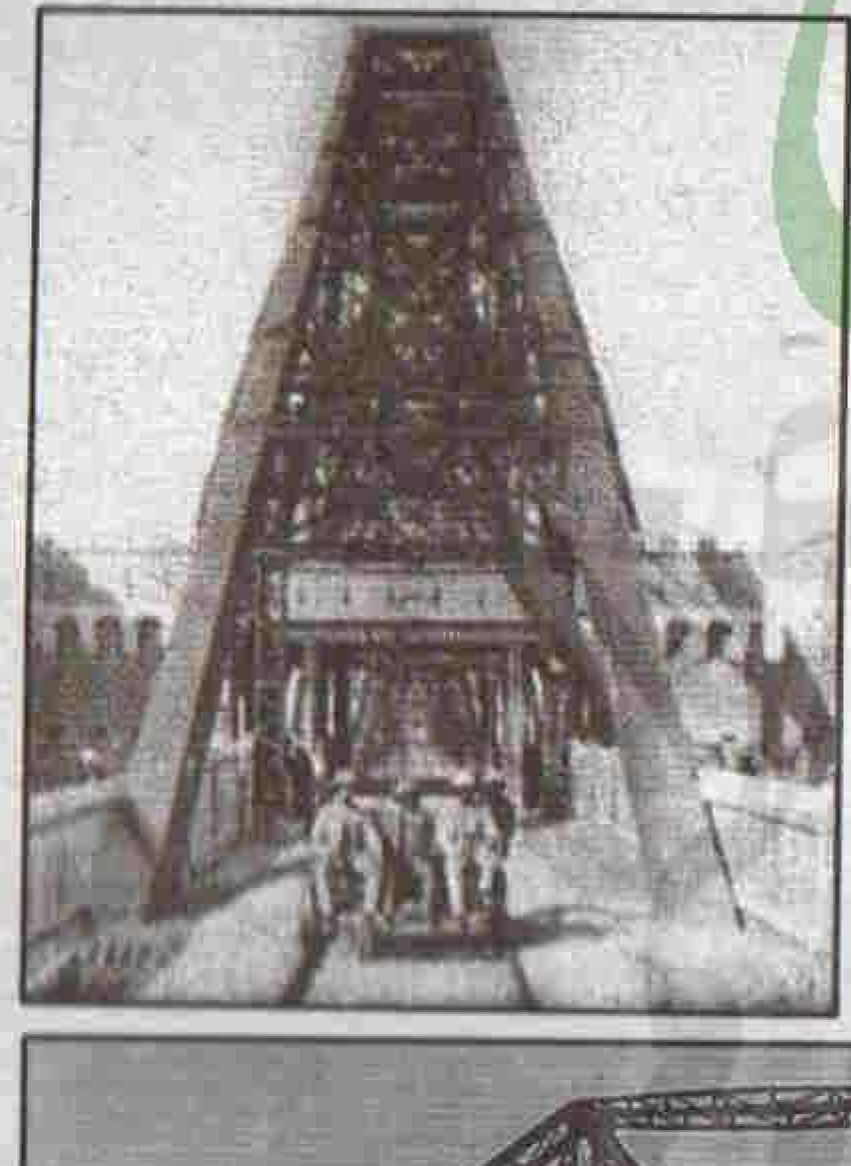

کراچی سے چار سو کلومیٹر کے فاصلے پر دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر سندھ کا تیسرا بڑا شہر سکھر آباد ہے جسے سندھی میں سکر کہا جاتا ہے جبکہ بعض مورخین کا دعویٰ ہے کہ یہی ماضی کا اروڑ اور بکر ہے (لیکن بعض شواہد کی بنیاد پر یہ درست نہیں) سندھی زبان میں سکھر کے جو ہجے کیے جاتے ہیں ان کے معنی "اعلیٰ" کے ہیں جبکہ اسے دریا ڈونو یعنی دریا کا تحفہ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ اگر دریائے سندھ نہ ہوتا تو سکھر شہر کی بجائے صحرا ہوتا۔ مورخین کی ایک بڑی تعداد اس امر پر بھی متفق ہے کہ سکھر کا موجودہ شہر 712ء میں عربوں نے پہلے سے موجود اور اوپر تلے آباد چھ شہروں کے کھنڈر پر آباد کیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا۔ نوجوان مسلمان فاتح سندھ محمد بن قاسم کی سرکردگی میں عرب افواج یہاں پہنچیں تو علاقے میں پڑنے والی شدید گرمی کے باعث انہوں نے اس مقام کو سکر یعنی جہنم کے نام سے پکارا جو بعد میں بگڑ کر یا سنور کر سکھر ہوگیا۔

بہر حال اس معمولی سے اختلاف کے باوجود تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ سکھر عہدِ عتیق سے ہی ایک اہم عسکری مرکز تھا۔ 326 قبل مسیح میں جب الیگزینڈر دی گریٹ نے سندھ پر حملہ کیا تو یہاں موسی کانوس کی حکومت تھی اور اس کا دارالحکومت الور یا اروڑ (موجودہ سکھر) تھا۔ اس قدیم شہر کے آثار ضلع سکھر میں روہڑی سے آٹھ کلو میٹر مشرق میں اب بھی موجود ہیں۔ رائے دورِ حکومت میں یہاں شو دیوتا کا ایک عظیم الشان مندر تعمیر کیا گیا لیکن 712ء میں جب عربوں نے اپنے سترہ سالہ سپہ سالار محمد بن قاسم کی زیرِ قیادت سندھ پر حملہ کیا تو سکھر سمیت پورا سندھ اور پنجاب کا زیریں حصہ اموی خلافت کا حصہ قرار پایا۔

بعد میں مغلوں کے علاوہ متعدد نیم خود مختار قبائل نے سکھر پر حکومت کی۔ 1809ء سے 1824ء کے درمیان خیر پور کے میر یہاں قابض رہے لیکن 1833ء میں قندھار، افغانستان کے ایک جنگ جو سردار شاہ شجاع نے سکھر کے قریب تالپوروں کو شکست دے کر شہر کو اپنی عمل داری میں شامل کرلیا۔ بعد ازاں شاہ شجاع اور سندھ کے تالپور حکمرانوں کے مابین صلح ہوگئی اور معاہدے کی رو سے شاہ شجاع سندھ پر سے اپنے تمام دعوؤں سے دستبردار ہوگیا۔

1843ء میں انگریز جنرل چارلس جیمز نیپئر نے حیدرآباد کے قریب میانی اور دبو کے مقامات پر سندھ کے تالپوروں کو پے در پے شکست دی اور یوں 1947ء میں پاکستان کی آزادی تک سکھر سمیت پورا سندھ انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ سکھر کا علاقہ پہلے ضلع شکار پور میں شامل تھا لیکن 1901ء میں شکار پور ضلع کو لاڑکانہ، شکار پور اور سکھر کے اضلاع میں تقسیم کردیا گیا۔ 1930ء کا عشرہ نہ صرف سکھر کی تاریخ کا سنہرا دور تھا بلکہ اس کے بعد شہر کی معاشی اور معاشرتی حیثیت میں بھی تیزی سے بہتری آئی کیونکہ اس عشرے میں انگریزوں نے دریائے سندھ پر (اپنے وقت میں) دنیا کا سب سے بڑا بیراج تعمیر کیا۔ یہ پہلے لائیڈز بیراج کہلاتا تھا جبکہ اب اس کا نام سکھر بیراج ہے۔

قیامِ پاکستان کے وقت برصغیر کے دوسرے شہروں کی طرح سکھر بھی متاثر ہوا۔ یہاں سے ہزاروں ہندو بھارت چلے گئے جبکہ ان سے کہیں زیادہ تعداد میں مسلمان یہاں پہنچے مگر اس کے باوجود سکھر میں ہندوؤں کی کثیر آبادی موجود ہے جو سندھی بولتی ہے جبکہ یہاں ان کی درجنوں عبادت گاہیں بھی ہیں۔ 2011ء کے اعداد و شمار کے مطابق سکھر میں 72 فیصد افراد سندھی، 15.5 فیصد اردو، 4 فی صد پنجابی، 1.5 فی صد پشتو، ایک فیصد بلوچی اور ایک فی صد افراد دوسری زبانیں بولتے ہیں۔

سکھر کے عین سامنے دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر روہڑی کا قدیم تاریخی قصبہ آباد ہے۔ سکھر کی طرح روہڑی یا لوہڑی کہلائے جانے والے اس چھوٹے سے شہر کی روشنیوں کا عکس رات کو دریا کے پانیوں میں دکھائی دیتا ہے۔ پورا شہر چونے کے ایک پہاڑی سلسلے پر آباد ہے جو کہیں ہموار اور کہیں بے حد نوکیلا ہے۔ یہ پہاڑیاں مغربی جانب دریا کے کنارے سے چالیس فٹ تک بلند ہیں لیکن ان کی کم از کم بلندی بھی سترہ فٹ سے کم نہیں۔ ان پہاڑیوں کے جنوبی حصے کی شکل و صورت بالکل تبدیل ہوچکی ہے۔ روہڑی ریلوے اسٹیشن کا شمار پاکستان کے بڑے ریلوے اسٹیشنوں میں ہوتا ہے اور یہ اسٹیشن اور اس کا مکمل یارڈ انگریز عہد میں انہی پہاڑیوں کو بارود کے ذریعے اُڑا کر تعمیر کیا گیا تھا۔ تاہم انگریزوں نے یہ ضرور کیا تھا کہ پہاڑیوں کے دھماکوں کی وجہ سے اُڑ جانے والے غیر ضروری یا غیر استعمال شدہ حصوں کو خالی چھوڑنے کے بجائے اچھے پتھر سے بھر دیا تھا۔

روہڑی کی اصل اہمیت اس کی تاریخ ہے جو یہاں سے ملنے والے شواہد کے مطابق پتھر کے زمانے تک پھیلی ہوئی ہے۔ روہڑی میں دریا کی تہ کے علاوہ پہاڑوں سے وہ نوکیلے ہتھیار بھی ملے ہیں جو پتھر کا انسان شکار کے لیے استعمال کرتا تھا۔ ممتاز محققین لیفٹیننٹ ویملو آر ای اور جان ٹیٹ کے مطابق روہڑی کسی زمانے میں نیولیتھک انسان کی ترقی یافتہ آبادی تھی۔ ڈاکٹر بلین فورڈ نامی ایک اور محقق نے ان نوکیلے ہتھیاروں کو برصغیر کے کسی بھی اور علاقے سے ملنے والے ہتھیاروں سے بہتر اور معیاری قرار دیا ہے۔

نیولیتھک دور اور عربوں کے حملے کے زمانے میں ایک طویل فاصلہ ہے۔ مورخین اس بارے میں پُر یقین ہیں کہ اس عہد میں جو ہزاروں سال پر محیط ہے، روہڑی کے موجودہ مقام پر کوئی آبادی نہیں تھی۔ صرف پہاڑیاں اور شاید جھاڑیاں وغیرہ تھیں۔ اس عہد کے دوران دریائے سندھ بھی یہاں نہیں بہتا تھا بلکہ دریا نے کہیں بعد کے کسی دور میں پہاڑیوں کے درمیان اپنا راستہ تلاش کیا اور اس مقام سے گزرنے لگا جو اب روہڑی اور سکھر کے درمیان ہے۔ مورخین کا خیال ہے کہ سکھر اور روہڑی کے شہر بیک وقت دریائے سندھ کے جزیرے بکھر پر قائم اور آباد ہونے والے قلعہ کی زیرِ سرپرستی پروان چڑھے۔

روہڑی کو سیکڑوں سال پہلے اس وقت امتیازی حیثیت حاصل ہوئی جب شاہ بیگ ارغون نے بکھر کے سیّدوں کو جزیرہ چھوڑنے کے عوض روہڑی میں متبادل جاگیریں دیں۔ اس نقل مکانی کا اندازہ روہڑی میں پھیلے مقبروں اور مزاروں سے بہ خوبی کیا جاسکتا ہے۔

روہڑی کی پہاڑیاں (جنہیں عرف عام میں روہڑی ہلز بھی کہا جاتا ہے) جن کے بیچوں بیچ اب دریائے سندھ بہتا ہے، شمال سے جنوب میں ضلع خیر پور تک میلوں دور پھیلی ہوئی ہیں لیکن ان میں سے تین پہاڑیاں بے حد مشہور ہیں۔ ان میں اروڑ کی کالکا ہل، روہڑی کی لہڑی ہل اور کندھرا کی شادی شہید ہل شامل ہیں۔

1975-76ء میں کیمبرج کے ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے روہڑی ہلز میں پیلیو لیتھک سائٹس کا ابتدائی سروے کیا۔ ان کی تحقیق کے مطابق روہڑی ہلز 2300 قبل مسیح سے 1750 قبل مسیح تک اپنے عروج پر رہنے والی ہڑپہ ثقافت میں استعمال ہونے والے متوازی بلیڈز کے تیار کنندگان کے لیے ابتدائی ذریعہ تھیں۔ روہڑی ہلز کی سب سے زیادہ پہلو دار پیلیو لیتھک سائٹ، ان پہاڑیوں کے جنوبی اختتام میں ناہا بلوچ نامی گاؤں کے قریب ہے جو کوٹ ڈیجی کی پری ہڑپن سیٹلمنٹ سے محض چار کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہاں کے ریتیلے حصے میں پانچ ہزار مربع میٹرز کے علاقے میں ٹیلوں کے درمیان وسطی اور ابتدائی پیلیو لیتھک عہد کی اشیا بکھری پڑی ہیں۔

نواب پنجابی نامی ہیلمٹ کے نزدیک بھی ورکنگ فلورز کی بڑی تعداد دریافت ہوئی ہے۔ یہاں زیریں وادی سندھ میں اسٹون ایج کے تمام ادوار کی نمائندگی موجود ہے جس سے پری ہسٹارک یعنی قبل از تاریخ سندھ کی تہذیب کو سمجھنے میں بڑی مدد ملی ہے۔

روہڑی اور سکھر کے انہی تاریخی شہروں کے درمیان انسانی ہاتھوں سے تراشیدہ وہ دو شاہکار موجود ہیں جنہیں وادی سندھ کے سب سے بڑے عجوبے قرار دیا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک 1889ء میں تعمیر ہونے والا لینس ڈاؤن برج ہے جبکہ دوسرا 1962ء میں مکمل ہونے والی ایوب آرچ ہے۔ یہ دونوں معلق پل دریائے سندھ پر تعمیر کیے گئے ہیں اور انہیں یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ان میں سے ایک 73 سال تک ریلوے اور سڑک کے لیے بیک وقت استعمال ہوتا رہا جبکہ دوسرا گزشتہ پچاس سال سے ٹرینوں کی آمدورفت کے لیے استعمال ہورہا ہے۔

اس وقت پاکستان ریلوے نیٹ ورک پر 13 ہزار 841 پل موجود ہیں جن میں سے 532 بڑے اور 13 ہزار

مسلمانوں کی نیشنل ڈش یعنی قومی غذا پلاؤ اور قورمہ ہے۔ لہٰذا سب سے زیادہ نزاکت و لطافت انہی چیزوں میں دکھائی گئی۔ دولت مند اور شوقین امیروں کے لیے مرغ مشک و زعفران کی گولیاں کھلا کھلا کے تیار کیے جاتے۔ یہاں تک کہ گوشت میں ان دونوں چیزوں کی خوشبو سرایت کر جاتی اور ہر رگ و ریشہ معطر ہو جاتا پھر ان کی یخنی نکالی جاتی اور یخنی میں چاول ڈالے جاتے۔

موتی پلاؤ کی یہ شان تھی کہ معلوم ہوتا تھا چاولوں میں آبدار موتی ملے ہوئے ہیں۔ اس کے لیے موتیوں کے تیار کرنے کی یہ ترکیب تھی کہ تولہ بھر چاندی کے ورق اور ماشہ بھر سونے کے ورق انڈے کی زردی میں خوب حل کیے جاتے پھر اس حل شدہ مرکب کو مرغ کے نرخرے میں بھر کے نرخرے کے ہر ہر جوڑ پر باریک دھاگا کس کے باندھ دیا جاتا اور اسے خفیف سا جوش دے کر چاقو سے نرخرے کی کھال چاک کردی جاتی اور سڈول آب دار موتی نکل آتے جو پلاؤ میں گوشت کے ساتھ دم کردیے جاتے۔ یعنی رکاب دار پنیر کے موتی بناتے اور اس پر چاندی کا ورق چڑھا دیتے بہر حال ایسی ایسی جدّتیں عمل میں آتیں کہ اور کہیں لوگوں کے خیال میں بھی نہ آئی ہوں گی۔ بعض رکاب داروں نے پلاؤ کی تیاری میں یہ صنعت دکھائی کہ گوشت کی چھوٹی چھوٹی چڑیاں بنا کے اور خوب احتیاط سے اس طرح پکا کے کہ صورت نہ بگڑنے پائے پلیٹ میں بٹھا دیتے، چالوں کی صورت دانے کی کردی اور معلوم ہوتا کہ ہر مہمان کے سامنے پلیٹ میں چڑیاں بیٹھی دانہ چگ رہی ہیں۔

اقتباس: دکنی کلچر از محمد نصیر الدین ہاشمی
انتخاب: نبیلہ اظہر، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

309 چھوٹے پُل ہیں لیکن ان میں سے لینس ڈاؤن برج نہ صرف قدیم ترین پُلوں میں شمار ہوتا ہے بلکہ اپنے وقت میں یہ اپنی نوعیت کا دنیا بھر میں واحد پُل بھی تھا۔ روہڑی سے شروع ہونے والے اس پُل کا اختتام جزیرہ بکھر پر ہوتا ہے۔ چند سو گز خشکی کے بعد دوسرا پُل شروع ہوتا ہے جو بکھر کو سکھر سے ملاتا ہے۔ اب یہاں بھی دو پُل ہیں جو اولڈ چینل برج اور نیو چینل برج کہلاتے ہیں۔ ان میں سے ایک روڈ اور دوسرا ریلوے ٹریفک کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

لینس ڈاؤن برج کا افتتاح 25 مارچ 1889ء کو کیا گیا اور اپنے افتتاح کے وقت یہ اپنی نوعیت کا سب سے طویل سنگل اسپن کانٹی لیور برج تھا۔

اویس مغل نے لینس ڈاؤن برج کے بارے میں جو آرٹیکل تحریر کیا اس کے مطابق برج کی تعمیر کے وقت تک مائٹی انڈس کے پانیوں کو متبادل راستوں سے گزارنے کی تکنیک بنائی نہیں جاسکی تھی یا متعارف نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی کوفرڈیم استعمال کرتے ہوئے بہتے پانی میں پُل کے ستون تعمیر کرنے کا کوئی طریقہ موجود تھا اس لیے انجینئرز کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ دریا کے کناروں پر سے کانٹی لیورنگ کے ذریعے پُل کے درمیانی ڈھانچے کو سہارا دیں۔ دریا کے دونوں کناروں پر مضبوط ترین بنیادیں بنائی گئیں اور کثیر الجہتی ورٹیکل اور کراس ٹروسز کے ذریعے دو شاندار عظیم ڈھانچے ان بنیادوں میں رکھ کر پُل کا درمیانی حصہ ان سے جوڑ دیا گیا۔

کناروں پر بنائی جانے والی بنیادوں میں نصب آہنی ڈھانچوں کو دریا کے دونوں کناروں سے ایک تہائی فاصلے تک آگے بڑھایا گیا۔ دونوں برج ڈیک تو انوکھی نوعیت کے تھے لیکن درمیانی حصہ پنجاب کے دوسرے حصوں میں دریاؤں پر بنائے جانے والے پُلوں کی طرح کے ڈھانچوں جیسا تھا۔

پُل کے درمیانی حصے نے صرف دریا کے دو کناروں کو ہی آپس میں نہیں جوڑا بلکہ اس نے بلوچستان کو غیر منقسم ہندوستان کے تمام حصوں کے ساتھ ملا دیا تھا...... اور یوں اس پُل کی تکمیل کے ساتھ ہی جنوبی ایشیا پر انگریزوں کی حاکمیت بھی مکمل ہوگئی۔

یوں تو دریائے سندھ کو 1887ء میں اس وقت مسخر کرلیا گیا تھا جب اٹک کے مقام پر ریلوے برج مکمل ہوا اور ٹرینوں نے خیبر کے انتہائی مغربی درے سے آخری مشرقی سرے پر واقع کلکتہ کی بندرگاہ تک بلاتعطل دوڑنا شروع کردیا لیکن سندھ میں ریلوے ٹریفک کی روانی ہنوز تعطل کا شکار تھی۔

کراچی کی بندرگاہ سے شروع ہونے والا ریلوے لنک، روہڑی اور سکھر کے درمیان بہنے والے دریائے سندھ کی وجہ سے نامکمل تھا۔ اس وقت تک کوٹری اور حیدرآباد کے درمیان بھی دریائے سندھ پر پُل تعمیر نہ ہوا تھا چنانچہ 1879ء کے اوائل تک ریل گاڑیاں کراچی سے چل کر جام شورو اور لاڑکانہ سے ہوتی ہوئی سکھر پہنچتیں جہاں سے انہیں بڑی کشتیوں کے ذریعے روہڑی پہنچایا جاتا یا دریائے سندھ کے راستے ہی ملک کے بالائی حصوں کو روانہ کیا جاتا۔

سکھر کے مقام پر دریائے سندھ قدرے نیچی چونے کی پہاڑیوں کے درمیان واقع ایک گھاٹی میں بہتا ہے اور جزیرہ بکھر کی وجہ سے دو حصوں میں تقسیم ہوجاتا ہے جنہیں سکھر چینل اور روہڑی چینل کہا جاتا ہے۔ سکھر چینل دریا کے اس حصے کو کہا جاتا ہے جو سکھر شہر سے متصل ہے جبکہ روہڑی کی بنیادوں کو چھوکر گزرنے والے دریا کے پاٹ کو روہڑی چینل کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ جب انگریزوں نے سکھر اور روہڑی کے درمیان دریائے سندھ پر پُل بنانے کا فیصلہ کیا تو انجینئرز نے جزیرہ بکھر کو کراسنگ کے لیے بہترین جگہ قرار دیا۔

چنانچہ ابتدائی مرحلے میں سکھر اور بکھر کو پُل کے راستے ایک دوسرے سے ملا دیا گیا۔ 1885ء میں مکمل ہونے والے اس پُل کو چینل برج کا نام دیا گیا جو اب اولڈ چینل برج کہلاتا ہے۔ یہ ان سیکڑوں پُلوں کی طرح کا ایک عام سا پُل ہے جو پاکستان سمیت دنیا کے دیگر دریاؤں یا نہروں پر تعمیر کیے گئے ہیں۔ اس مقام پر دریا کی تہ چونکہ سخت اور چٹانی تھی اس لیے آسانی سے پختہ بنیادیں تعمیر ہوسکتی تھیں جن پر اینٹوں کے ستون بنائے جاسکتے۔ دریا کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا اور تین گرڈر اسپن بنائے گئے۔ ان میں سے پہلا اسپن نوے فٹ، دوسرا دو سو تیس فٹ اور تیسرا دو سو ستر فٹ طویل تھا چنانچہ پُل کی مجموعی طوالت 590 فٹ رہی۔

سکھر اور بکھر کے درمیان تو پُل بہ آسانی تعمیر ہوگیا لیکن بکھر اور روہڑی کے درمیان پُل بنانا اصل کارنامہ تھا کیونکہ یہاں دریا کی تہ چٹانی نہیں بلکہ چکنی مٹی کی تھی اور اس پر پُل کے ستون تعمیر کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ اس لیے پُل کا نقشہ بنانے والوں کو اس فیصلے سے آگاہ کیا گیا کہ یہاں بغیر ستونوں والے پُل کی تعمیر کو مدِنظر رکھ کر نقشہ بنایا جائے۔

1872ء سے 1882ء کے درمیان متعدد مرتبہ برج سروے کیا گیا اور مختلف لوگوں کی جانب سے پانچ تجاویز پیش کی گئیں لیکن ان میں سے کسی بھی تجویز کو زیرِ غور نہ لایا گیا کیونکہ فی الوقت وہ قابلِ عمل نہ تھیں۔ اس کے بعد سر الیگزینڈر رینڈل نامی ایک انجینئر کو بلایا گیا جس نے تجویز پیش کی کہ یہاں معلق

بنایا جائے جس کا ڈھانچا مکمل طور پر آہنی ہو۔ اس کے ڈیزائن کے مطابق دریا کے دونوں کناروں پر دو اینکرڈ کانٹی لیور تعمیر ہونے تھے جن میں سے ہر ایک کی لمبائی 310 فٹ ہوتی جبکہ درمیانی معلق اسپن صرف 200 فٹ طویل ہوتا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس ڈیزائن کو قابلِ عمل قرار دے دیا گیا اور آج ہم 820 فٹ لمبے اس پُل کو لینس ڈاؤن برج کے نام سے جانتے اور پکارتے ہیں۔

پُل کا گرڈر بنانے کا ٹھیکا لندن کی ویسٹ ووڈ، بیلی اینڈ کمپنی کو دیا گیا۔ پُل کو پہلی مرتبہ کنٹریکٹر کے یارڈ میں ہی جوڑا گیا چنانچہ پُل کے 170 فٹ بلند کانٹی لیور جب جوڑے گئے تو لندن میں یہ ایک دیکھنے والا منظر تھا۔

1887ء میں لوہے کے بڑے بڑے گرڈر سکھر اور روہڑی پہنچنا شروع ہوگئے۔ پُل کی تعمیر ایف ای رابرٹسن اور ہرسٹ کی زیرِ نگرانی شروع ہوئی جن کے نام پُل کے ہر کانٹی لیور پر نصب تختیوں پر کندہ ہیں۔

لیکن لینس ڈاؤن برج کی تعمیر کوئی مذاق نہیں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ پُل کے ڈیزائنرز کو خود بھی یہ یقین نہیں تھا کہ تعمیر کے بعد اس پُل کی زندگی کتنی ہوگی۔ عظیم الجثہ ڈیرکس میں سے ہر ایک کا وزن 240 ٹن تھا اور یہ 230 فٹ لمبا بھی تھا۔ انہیں دریا کے بہتے پانی میں بلندی پر نصب کرنا تھا اور اس کے توازن کا اس حد تک خیال رکھنا تھا کہ کہیں سے انچ کا ہزارواں حصہ بھی جھکنے نہ پائے۔ پُل کو سیدھ میں رکھنے کے لیے ان میں بال برابر فرق بھی نہیں آنا چاہیے تھا۔ اور اگر یہ ممکن تھا تو پھر 123 فٹ لمبے گرڈرز کو جن میں سے ہر ایک کا وزن 80 ٹن تھا، 180 فٹ کی بلندی پر ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنا 1880ء کی دہائی میں واقعتاً ناممکن تھا۔ مگر انگریز باشندوں نے یہ کام کر دکھایا۔

جب دونوں کانٹی لیورز مکمل ہوگئے تو درمیانی اسپن پر کام شروع ہوا۔ برج ڈیزائنرز کی خواہش تھی کہ 200 فٹ لمبے اسپن کو پُل کے نیچے کشتیوں پر رکھ کر جوڑا جائے اور پھر اسے اوپر اٹھایا جائے۔

لیکن عملی طور پر یہ ممکن نہ ہوسکا کیونکہ سیلاب کے باعث دریائے سندھ میں سال کے چھ مہینے پانی اس قدر زیادہ رفتار کے ساتھ بہتا ہے کہ کشتی ایک مقام پر ٹھہر ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ ترکیب ناکام ہوگئی تو رابرٹسن نے ایک اور عارضی پُل بنایا تاکہ معلق اسپن کو اس کے اوپر رکھ کر جوڑا جاسکے۔ یہ پلیٹ فارم بھی 56 ٹن وزنی تھا۔ اسی پلیٹ فارم پر 200 فٹ طویل اسپن کو جوڑنے کا کام شروع کیا گیا جسے ساڑھے چار دن میں مکمل بھی کرلیا گیا۔ آج کے معیار کے حساب سے بھی یہ شاندار رفتار تھی کیونکہ رابرٹسن کے آدمیوں کے پاس 1880ء کی دہائی میں کسی قسم کے جدید اوزار یا الیکٹرک ڈرائیوز نہیں تھیں۔

لینس ڈاؤن برج کی تعمیر و تکمیل کے دوران چھ انسانی جانیں ضائع ہوئیں۔ چار افراد بلندی سے گر کر جان ہار گئے جبکہ دو پر خود بھاری اوزار یا گرڈر گر پڑے۔ پُل کی مجموعی لاگت 26 لاکھ 96 ہزار روپے تھی جن میں سے دو لاکھ 76 ہزار روپے صرف بنیادوں پر خرچ کیے گئے۔

19 مارچ 1889ء کو لینس ڈاؤن برج کی ٹیسٹنگ کے لیے ایک دوسرے سے جڑے دو ایل کلاس لوکوموٹیوز اور ایک ٹرین کو گزارا گیا جس کا وزن 786 ٹن یا لگ بھگ ایک ٹن فی فٹ تھا۔ ٹرین نے 56 کلومیٹر یعنی 35 میل فی گھنٹا کی رفتار سے پُل پار کیا جس سے 250 میٹر یعنی 820 فٹ طویل اسپن کے وسط میں 8.9 سینٹی میٹر (3.5 انچ) کا جھکاؤ پیدا ہوا۔

ماہرین نے پُل کو قابلِ استعمال قرار دے دیا اور اس کے پانچ دن بعد 25 مارچ 1889ء کو پُل کا باضابطہ افتتاح کردیا گیا۔

مارچ کے اختتام میں چونکہ سکھر کا موسم گرم ہوجاتا ہے اس لیے افتتاحی تقریب کا انعقاد صبح سویرے کیا گیا۔ تقریب کے مہمان خصوصی گورنر آف ممبئی لارڈ رے تھے جو وائسرائے آف انڈیا لارڈ لینس ڈاؤن کی نمائندگی کررہے تھے۔ بشپ آف لاہور نے اس موقع پر دعائیہ کلمات ادا کیے۔ بلوچستان اور سرحد کے پُلوں اور سرنگوں کی طرح لینس ڈاؤن برج کے دروازے بھی قلعہ نما بنائے گئے تھے جن کے باقاعدہ آہنی گیٹ تھے۔ گورنر نے روہڑی کی سمت سے بھاری بھرکم دروازے پر لگایا جانے والا عظیم الجثہ روایتی تالا کھول کر پُل کا افتتاح کیا۔ اس تالے کا ڈیزائن میو اسکول آف آرٹ کے پرنسپل اور انگریزی زبان کے معروف مصنف و شاعر جوزف رڈیارڈ کپلنگ کے والد جے ایل کپلنگ، سی آئی اے نے تیار کیا تھا۔

تالا کھلنے کے بعد تقریب کے شرکا نے پُل پر چہل قدمی کی جس کے بعد ایک شامیانے میں ناشتا ہوا اور جام تجویز کیے گئے۔

1889ء میں جب لینس ڈاؤن برج کا افتتاح ہوا تو اس وقت، اس سیکشن پر چلنے والے سب سے بھاری ریلوے انجن کا وزن 73 ٹن تھا۔ یہ وزن ٹینڈر سمیت 16 پہیوں پر

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

تقسیم تھا۔ لہٰذا اگر ٹرین یا انجن کا وزن بڑھایا جاتا تو اس کے لیے پُل کو مزید مضبوط کیا جانا بے حد ضروری تھا۔ 1910ء اور 1939ء میں دو مواقع پر برج کا ڈیڈ ویٹ ہٹا کرا سے مضبوط کرنے کی کارروائی کی گئی۔ 1939ء میں پُل سے دو سو ٹن ڈیڈ ویٹ ہٹایا گیا جس سے یہ ممکن ہو سکا کہ آٹھ انجن ایک دوسرے سے جڑ کر ستر ہ ٹن وزن کے ہمراہ اس پُل سے گزر سکیں۔ یہ ڈیڈ ویٹ روڈ وے ڈیکنگ ہٹا کر پورا کیا گیا اور سکھر روہڑی کے درمیان سڑک کی ٹریفک کو حال ہی میں تعمیر ہونے والے سکھر بیراج پر منتقل کردیا گیا تاہم دو فٹ چوڑے واک وے کو برقرار رکھا گیا۔

اویس مغل نے لینس ڈاؤن برج پر اپنے آرٹیکل میں پُل کی مرحلہ وار تکمیل کچھ اس طرح بیان کی ہے۔

”1872ء سے 1874ء کے درمیان جے رمز نے دریائے سندھ پر پُل بنانے کے لیے سکھر اور روہڑی کا پہلا سروے کیا۔ اس نے ساڑھے چھ سو فٹ طویل معلق پُل کی تجویز پیش کی۔

1875ء میں میجر جنرل سر جیمز براؤن نے سروے جاری رکھا اور تجویز پیش کی کہ لوہے کے رسوں کی مدد سے ایک معلق پُل تعمیر کیا جائے جس کی لمبائی 786 فٹ ہو۔

1879ء میں کراچی سکھر ریلوے ٹریک مکمل ہوا۔ سر گولڈ فورڈ مولس ورتھ نے تھری ہنگڈ آرچڈ برج کی تجویز دی جبکہ جے آر بیل نے تجویز کیا کہ کانٹی لیور برج تعمیر کیا جائے جس کا مرکزی اسپن 680 کا ہو۔

1882ء میں 250 فٹ اسپن کے پُل کی تجویز دی جسے پختہ اینٹوں کے ستونوں پر کھڑا کیا جاتا تھا۔ اس ڈیزائن کو تقریباً منتخب کرلیا گیا لیکن ایک خوفناک سیلاب نے دریا کی گہرائی میں سو فٹ کا اضافہ کردیا اور اس ڈیزائن کو مسترد کردیا گیا۔

11 جولائی 1884ء کو انجینئر نامی بیلی کیشن نے لینس ڈاؤن برج کے ڈیزائن کو جناتی قرار دیا اور کہا کہ یہ انجینئرنگ کا شاہکار ہے نہ تعمیراتی عجوبہ۔

1885ء میں سکھر اور بکھر جزیرے کے درمیان چینل برج مکمل کیا گیا۔

1887ء میں ویسٹ ووڈ، بیلی اینڈ کمپنی آف لندن سے لینس ڈاؤن برج کا اسٹیل اسٹرکچر سکھر اور روہڑی پہنچنا شروع ہوا۔

مئی 1887ء کے آخر میں لینس ڈاؤن برج کی بکھر سائڈ کے کانٹی لیور کی بیڈ پلیٹس سائٹ پر پہنچیں۔

ستمبر 1887ء میں روہڑی سائڈ کے کانٹی لیور کے اسٹیل اسٹرکچر کی سائٹ پر آمد مکمل ہوگئی۔

مارچ 1889ء میں لینس ڈاؤن برج کی ٹیسٹنگ کی گئی۔ اس مقصد کے لیے ایک دوسرے سے جڑے دو ایل کلاس لوکوموٹیو اور ایک ٹرین پُل پر سے گزاری گئی جس کا مجموعی وزن 786 ٹن تھا۔

25 مارچ 1889ء کو لینس ڈاؤن برج کا افتتاح کردیا گیا۔

1910ء میں پُل کو مزید مضبوط بنایا گیا تاکہ اس پر سے زیادہ وزن گزارا جاسکے۔

1924ء میں پُل پر ٹرینوں کی رفتار کم کرکے آٹھ کلومیٹر (5 میل) فی گھنٹا کردی گئی کیونکہ پُل پر ڈی فارمیشن اور ٹمپریچر اسٹریس کا پتا چلایا گیا۔

1936ء میں برٹش ریلویز کے ڈپٹی چیف انجینئر آف برجز ہیرالڈ ووڈ رابنسن نے لینس ڈاؤن برج کی جگہ آرچ ڈیزائن کے پُل کا نقشہ تیار کیا۔ یہ نقشہ مغل پورہ لاہور کے برج آفس میں تیار کیا گیا لیکن اسے دن کی روشنی دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

1939ء میں لینس ڈاؤن برج کو مزید مضبوط بنایا گیا تاکہ یہ زیادہ سے زیادہ وزن اٹھا سکے۔ پُل کا دو سو ٹن ڈیڈ ویٹ ہٹادیا گیا اور روڈ ٹریفک کو سکھر بیراج کے پُل پر منتقل کردیا گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ لینس ڈاؤن برج اپنی تعمیر کے وقت بھی ایک عجوبہ تھا اور آج بھی ایک عجوبہ ہی ہے لیکن اس کے آس پاس چند اور مقامات بھی ایسے ہیں جو اسی پُل کی طرح نہ صرف اہم ہیں بلکہ لوگ دور دور سے انہیں دیکھنے بھی آتے ہیں۔

لینس ڈاؤن برج سے محض سو فٹ کے فاصلے پر ایوب آرچ ہے۔ دریائے سندھ پر یہ محرابی پُل 1960ء سے 1962ء کے درمیان تعمیر کیا گیا۔ لینس ڈاؤن کی طرح یہ بھی معلق ریلوے برج کی حیثیت سے تعمیر ہوا اور اس کے بعد ریلوے ٹریفک کو اس پُل پر منتقل کرکے لینس ڈاؤن برج کو صرف روڈ ٹریفک کے لیے مخصوص کردیا گیا جس سے آمنے سامنے واقع دونوں شہروں کے درمیان پیدا ہونے والا میلوں کا فاصلہ سمٹ گیا اور صبح شام ایک سے دوسرے شہر جانے والوں کے لیے آسان ہوگئی۔

ایوب آرچ چونکہ لینس ڈاؤن برج سے نہایت کم فاصلے پر تعمیر کی گئی ہے اس لیے دور سے دیکھنے پر یہ ایک ہی نظر آتا ہے۔ اس شاندار اور خوبصورت پُل کا نقشہ امریکہ کے ڈاکٹر ڈی بی اسٹین مین نے بنایا جبکہ اس کی تعمیر پر دو کروڑ روپے لاگت آئی۔ اس کا سنگِ بنیاد نومبر 1960ء کو رکھا گیا۔ پاکستانی، امریکی اور برطانوی انجینئرز کے اس شاہکار کا افتتاح 6 مئی 1962ء کو اس وقت کے صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے کیا اور اس پُل کو انہی کے نام سے موسوم کیا گیا۔

روہڑی شہر سے لینس ڈاؤن برج پر آنے کے لیے ایک ہی سڑک موجود ہے لیکن اس سڑک پر ایک ایسی شے بھی ہے جس نے نہ صرف اس تنگ سڑک کو شہر کی اہم شاہراہ بنادیا ہے بلکہ روہڑی جیسے چھوٹے سے شہر کی اہمیت میں کئی گنا اضافہ کردیا ہے۔ یہ آقائے دوجہاں، پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا موئے مبارک ہے جو اسی شاہراہ پر لینس ڈاؤن برج سے چند سو گز کے فاصلے پر ایک خوبصورت عمارت میں موجود ہے۔ مقامی اور قرب وجوار کے باشندوں کی نظر میں موئے مبارک کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بھی بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ موئے مبارک کی زیارت کو ”چھوٹا حج“ کہتے ہیں۔

روہڑی میں موجود موئے مبارک، شیخ نظام الدین کے داماد مخدوم عبدالباقی لائے تھے۔ مخدوم عبدالباقی، حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اولاد میں سے تھے اور اپنے وطن مالوف کو خیرباد کہہ کر مستقل طور پر روہڑی میں رہائش پذیر ہوگئے تھے۔ انہوں نے اپنے پاس موئے مبارک کی موجودگی کچھ عرصہ پوشیدہ رکھی لیکن روہڑی کے سید حیدر شاہ اور واہو کے مخدوم عبدالمالک کو خواب کے ذریعے اس راز سے آگاہ کیا گیا۔ دونوں حضرات مخدوم عبدالباقی کے پاس آئے اور ان سے درخواست کی کہ دنیا کے اس نادر تحفے کے دیدارِ عام کی اجازت دے دیں۔

میر عبدالباقی رضامند ہوگئے اور اس کے بعد عام مسلمان اس کی زیارت کرنے لگے۔ ویسے تو سال کے کسی بھی مہینے میں کسی بھی دن موئے مبارک کی زیارت کی جاسکتی ہے لیکن 9 ذوالحجہ کو جب مکہ مکرمہ میں حج کے مرکزی ارکان ادا کیے جاتے ہیں، روہڑی میں موئے مبارک کی خصوصی زیارت کا اہتمام کیا جاتا ہے اور اسی وجہ سے مقامی باشندے اس زیارت کو ”چھوٹا حج“ کہتے ہیں۔

موئے مبارک کو ایک چھوٹے حجرے میں تاریکی میں رکھا جاتا ہے۔ خصوصی زیارت کے روز وزیر حجرے میں موجود موئے مبارک کے طاق کو اٹھا کر باہر لاتا ہے اور ایک چبوترے پر رکھ دیتا ہے جس پر دو قالین بچھے ہوتے ہیں۔ سبز عبا میں ملبوس ایک سید مور کے پنکھ سے اس طاق کو صاف کرتا ہے جو پہلے سے ہی صاف ہوتا ہے لیکن مور کا پر رسماً اس پر پھیرا جاتا ہے۔ اس وقت اردگرد موجود عقیدت مند نہایت ادب سے دھیمی آواز میں درود شریف پڑھتے ہیں اور اپنی خواہشیں اور منتیں بیان کرتے ہیں۔

اس کے بعد طاق پر موجود ایک درجن سے زیادہ کڑھے ہوئے رومال ایک ایک کرکے اتارے جاتے ہیں اور سونے کی وہ کشتی نمودار ہو جاتی ہے جسے میر علی مراد آف خیرپور نے بطور تحفہ پیش کیا تھا۔ اس مرحلے پر سبز پوش سید اپنے ہاتھ کو سفید ریشمی رومال سے ڈھانپ کر کشتی سے لگ بھگ تین انچ لمبا خالص سونے کا ایک چھوٹا سا بکس نکالتا ہے جس پر چودہ قطاروں میں ہیرے جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔ اس بکس میں جس کا اوپری حصہ شیشے کا ہے، اس میں موئے مبارک موجود ہے۔ اس کی لمبائی ایک انچ کے چوتھے حصے کے برابر ہے جبکہ اس کا رنگ لائٹ ہے۔

موئے مبارک کے نظر آنے پر درود شریف بلند آواز میں پڑھا جاتا ہے۔ اس زیارت کے بعد موئے مبارک کے بکس کو دوبارہ انہی ریشمی کپڑوں میں لپیٹ دیا جاتا ہے۔ لوگ ان کپڑوں سے ہاتھ مس ہوجانے کو بھی اپنے لیے بہت بڑا اعزاز تصور کرتے ہیں۔ موئے مبارک رکھنے کے لیے اور اس کی خصوصی زیارت کی غرض سے 1545ء (952 ہجری) میں اس وقت کے کلہوڑا پرنس میر محمد نے پچیس مربع فٹ کی علیحدہ عمارت بنوائی تھی جو آج بھی موجود ہے۔

روہڑی کی سمت جہاں سے لینس ڈاؤن برج اور ایوب آرچ کا آغاز ہوتا ہے، بائیں سمت دریا کے عین کنارے ایک پہاڑی پر ہموار چبوترہ موجود ہے جس پر ٹھٹھہ کے مشہور زمانہ مکلی قبرستان کی طرز پر تعمیر کئی قبریں ہیں جن پر نہایت خوبصورت نقش ونگار بنے ہوئے ہیں اور عربی رسم الخط میں قرآنی آیات کندہ ہیں۔ قبروں کی درمیانی جگہ پختہ ہے جبکہ جنوبی سمت سے اس چبوترے پر جانے کے لیے سیڑھیاں بھی بنائی گئی ہیں۔ اس پورے حصے کو ستیوں جو تھان یا سات سیدانیوں کا مزار کہا جاتا ہے۔

ان تمام قبروں اور مزاروں کی تعمیر میں منقش ٹائلز استعمال کیے گئے ہیں اور ان میں سے بیشتر پر 1018 ہجری سے 1301 ہجری کے سنین تحریر ہیں جو 1609ء سے 1883ء کا درمیانی زمانہ بنتا ہے۔ ان میں سب سے بڑی قبر میر قاسم کی ہے جو سبزواری سیدوں میں سے تھے۔ اس قبر پر

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

1018ہجری کا سن درج ہے۔ یقینی طور پر یہ وہی قبر ہے جس سے اس مقام کو منسوب کیا جاتا ہے۔ اب تک اس قبر کے سامنے چراغ دان نصب ہے اور چراغ بھی موجود ہے۔ اس لیے اس پہاڑی کو تھان قاسم شاہ کہا جاتا ہے۔

لیکن عام لوگ جنوبی سمت بنی ''ست بھائیں'' نامی عمارت کی وجہ سے اسے کبھی سات کنواریوں کی پہاڑی یا سات سیدانیوں کا مزار بھی کہتے ہیں۔ ست بھائیں نامی عمارت چند کمروں پر محیط ہے جن میں رنگین ٹائل لگے ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کوٹھری نما ان کمروں میں سات کنواریاں رہا کرتی تھیں جنہوں نے قسم کھائی تھی کہ وہ کبھی کسی مرد کا چہرہ نہیں دیکھیں گی جبکہ ایک کہانی یہ بھی ہے کہ اس جگہ عرب سے ہجرت کر کے آئے سیدوں کی سات بیٹیاں رہا کرتی تھیں جو بے انتہا خوبصورت تھیں۔ ساتوں نہایت پرہیز گار اور متقی تھیں اور ہروقت یادالٰہی میں مصروف رہتیں۔ وہ اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ اپنی عزت کی حفاظت کی دعا مانگا کرتیں۔

ایک بار کسی اوباش راجا یا وڈیرے نے انہیں دیکھ لیا اور چاہا کہ اپنی مذموم خواہشات پوری کرے۔ ساتوں بہنوں نے اپنے بچنے اور عزت کی حفاظت کی جب کوئی صورت نہ دیکھی تو انہوں نے اللہ سے دعا کی کہ ان کی مدد کرے۔ دعا قبول ہوئی اور وہ ساتوں زمین میں سما گئیں۔ تب سے اس جگہ کو انہی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ محض ایک حکایت ہے اور تاریخی طور پر اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ انگریز محقق سر رچرڈ برٹن نے اس جگہ سے منسوب تمام قصے کہانیوں کو غلط قرار دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ لوگوں نے توہم پرستی کے تحت اس جگہ کو ستیوں جو تھان یا ستیوں کی جگہ کہنا شروع کر دیا حالانکہ اس کا مطلب سوائے سات کے اور کچھ نہیں۔ بہرحال اس کے باوجود لوگوں کی ایک بڑی تعداد یہاں حاضری دیتی ہے۔ یہ منتیں ماننے کی جگہ بھی ہے کیونکہ کمزور عقائد کے حامل افراد حکایات کو سچ تسلیم کرتے ہیں، حقائق کو نہیں۔

لینس ڈاون برج، روہڑی سے شروع ہو کر دریائے سندھ کے وسط میں واقع خشکی کے جس ٹکڑے پر ختم ہوتا ہے اسے جزیرہ بکھر کہا جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ ساتویں صدی ہجری میں سید محمد مکی نے اس جزیرے کو بکھر یعنی صبح کا نام دیا تھا۔ یہ جزیرہ چونے کی چٹانوں پر مشتمل ہے۔ انڈے کی شکل سے مشابہ جزیرہ بکھر کی لمبائی 800 گز، چوڑائی 300 گز اور بلندی پچیس فٹ ہے۔ سپرنٹنڈنٹ آف لینڈ ریکارڈز اینڈ رجسٹریشن سندھ کے مطابق 1912ء میں جزیرہ بکھر کا رقبہ 2لاکھ 55ہزار 292 مربع گز یا 49 ایکڑ تھا۔

قرائن و شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ بکھر پر شروع سے ایک قلعہ موجود تھا جبکہ بعض روایات میں ہے کہ پورے جزیرے کے گرد فصیل تھی کیونکہ شیخ ابوتراب نامی عرب کو جس کی قبر تعلقہ میرپور ساکرو میں گجو کے مقام پر ہے اور جس پر 171 ہجری بہ مطابق 787ء کا سن درج ہے۔ اس قلعے کو فتح کرنے پر باقاعدہ انعام سے نوازا گیا تھا۔ بعد ازاں 1026ء میں جب سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس کے ایک وزیر عبدالرزاق نے اس پر قبضہ کر لیا۔ بکھر کا ایک نامور اور مشہور گورنر سلطان محمود کوکلتاش تھا جسے 928 ہجری بہ مطابق 1522ء میں شاہ بیگ ارغون نے مقرر کیا تھا۔

شاہ بیگ ارغون نے اسی سال بکھر کو اپنا دارالحکومت بنانے کا فیصلہ کیا چنانچہ سندھ کے پرانے دارالحکومت الور کے قدیم قلعے اور سمہ حکمرانوں (1333ء سے 1522ء) کے علاوہ ترک یا ترکھان فرماں رواؤں (1507ء سے 1543ء) کی عمارتوں کے سامان اور منقش اینٹوں سے قلعہ بکھر کی مرمت اور تزئین و آرائش کی گئی۔ 947 ہجری بہ مطابق 1541ء میں مغل شہنشاہ نصیرالدین محمد ہمایوں کی آمد کے موقع پر سلطان محمود خان نے قلعے کی بیرونی دیوار کا اضافہ کیا جس سے اس کے سرکٹ میں 1875 گز کا اضافہ ہوگیا جبکہ اس نے اندرونی دیواروں کے مرکزی دروازوں کے بالمقابل چار نئے دروازے بھی تعمیر کرائے۔ اس وقت یہاں دو باغات تھے جن میں سے ایک نظرگاہ اور دوسرا گزرگاہ کہلاتا تھا۔

تیمور شاہ کے زمانے میں 1780ء سے 1790ء کے درمیان گورنر غلام صادق خان نے آخری مرتبہ قلعے کی فصیلوں کی مرمت کرائی اور بعض نئی عمارتیں تعمیر کیں۔ اس قلعے کو سندھ کی تاریخ میں بے حد اہمیت حاصل رہی ہے کیونکہ مغل بادشاہوں کے علاوہ کلہوڑوں، افغانوں اور تالپوروں نے ہمیشہ اسے اپنے قبضے میں رکھنے کی کوشش کی۔ 1839ء میں خیرپور کے میروں نے اسے انگریزوں کے حوالے کر دیا۔

کسی زمانے میں ایک شان دار شہر کی حیثیت رکھنے والے بکھر میں اب چند خستہ حال عمارتوں اور ٹوٹی پھوٹی دیواروں کے سوا کچھ نہیں۔ انگریزوں نے مشرقی دیوار کے ساتھ واقع گورنر کے محل کو پاؤڈر میگزین میں تبدیل کر دیا اور اب یہ پورا علاقہ پندرہ سے بیس فٹ اونچے اینٹوں کے ڈھیروں، عمارتوں کے ملبے، ٹیلوں اور اس گندگی سے اٹا ہوا ہے جو وقت نے گرد کی صورت یہاں لا پھینکی ہے۔

جزیرے کی مغربی سمت جہاں دریائے سندھ کا منہ زور ... اور راست بکھر کی سرزمین سے ٹکراتا ہے۔ پیر صدرالدین بادشاہ کا مزار ہے۔ اپنے وقت کے اس جلالی بزرگ کی خانقاہ پر ہروقت عقیدت مندوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ پیر صدرالدین بادشاہ، سیہون کے حضرت لعل شہباز قلندرؒ کے ہم عصر تھے۔

جزیرہ بکھر کے شمال اور جنوب میں دو اور جزیرے بھی موجود ہیں جو لوگوں کی بے پناہ توجہ کا مرکز ہیں۔ شمالی جزیرہ روہڑی شہر کے عین سامنے واقع ہے۔ نصف ایکڑ (چار کنال) کے رقبے پر محیط جزیرہ پانی سے زیادہ بلندی پر ہے لیکن شدید سیلاب کے دنوں میں بھی محفوظ رہتا ہے۔ اسے زندہ پیر کہا جاتا ہے۔

زندہ پیر کے جزیرے پر چاروں جانب دیوار بنی ہوئی ہے اور ایک روضہ بنا ہوا ہے جہاں مارچ اور اپریل کے مہینوں میں ہزاروں مسلمان اور ہندو، سندھ کے ہر حصے سے آ کر حاضری دیتے ہیں۔ مسلمان اس روضے یا مقبرے یا عمارت کو حضرت خضر سے موسوم کرتے ہیں جبکہ ہندو اسے جند پیر یعنی زندہ پیر کہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس جزیرے پر واقع مقدس عمارت پر قبضے کے حوالے سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان طویل کشمکش رہی جس کا خاتمہ اس وقت ہوا جب ہندوؤں نے دریا کے سکھر والے کنارے پر جند پیر کی اپنی درگاہ قائم کرلی۔ 10 اپریل 1894ء کے دی پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ کے ریزولیشن نمبر 55 ڈبلیو، ایک، چھ سو پچاس کے تحت اس وقت کے ہندو فقیروں کے رہنما بھائی بالو کی جانب سے ٹرسٹ ڈیڈ پیش کیے جانے پر سکھر ہندو پنچایت کو جند پیر فقیر ٹرسٹ کے نام پر تقریباً 16.50 گھنٹے زمین الاٹ کر دی گئی۔ اس ٹرسٹ ڈیڈ کے مطابق فقیر بھائی بالو اور اس کے مریدان کو درگاہ اور دیگر تعمیرات کے لیے پندرہ ہزار روپے ادا کر دیے گئے چنانچہ اس کے بعد جزیرے کی درگاہ پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ ہوگیا۔

مسلمان زندہ پیر یا خواجہ خضر کے حوالے سے جو روایت بیان کرتے ہیں، اس کے مطابق دہلی کا ایک سوداگر شاہ حسین (سیف الملوک) اپنی بیٹی بدیع الجمال کے ہمراہ حج کے لیے دریائے سندھ کے راستے مکہ جا رہا تھا۔ جب وہ لوگ الور پہنچے تو الور کے حاکم راجا دلوراج، جس نے بدیع الجمال کے حسن کے چرچے سن رکھے تھے، نے شاہ حسین سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی بیٹی اس سے بیاہ دے۔ شاہ حسین نے یہ کہہ کر راجا کو انکار کر دیا کہ ایک مسلمان لڑکی کی شادی ہندو سے نہیں کی جا سکتی۔

راجا اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا اور اس نے لڑکی کو اغوا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لڑکی خواجہ خضر کی بے حد معتقد تھی اور اپنی کشتی پر ہی خواجہ خضر کے حضور گلہائے عقیدت پیش کر رہی تھی۔ خواجہ خضر نے لڑکی کے والد کو حکم دیا کہ وہ کشتی کا لنگر کاٹ دے چنانچہ جیسے ہی کشتی کی رسی کاٹی گئی، دریائے سندھ نے چشم زدن میں اپنا رُخ تبدیل کر لیا اور الور کے بجائے آٹھ کلومیٹر دور روہڑی اور سکھر کی موجودہ گزرگاہ میں بہنا شروع کر دیا۔ کشتی دریا کے بہاؤ کے ساتھ ہی روہڑی آ گئی۔

اس کرامت کے اظہار تشکر کے طور پر شاہ حسین نے خواجہ خضر کی درگاہ تعمیر کرانے کا فیصلہ کیا کیونکہ ان کی وجہ سے بدیع الجمال کی عزت محفوظ رہی تھی۔ خواجہ خضر نے شاہ حسین کو یہ درگاہ جزیرہ بکھر کے شمال میں ایک چھوٹے سے جزیرے پر تعمیر کرنے کی ہدایت کی چنانچہ شاہ حسین نے خواجہ خضر کی عقیدت میں ایک مسجد اور ایک درگاہ بنوائی جسے بعد ازاں مخیر حضرات نے بے حد توسیع دی۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اصل درگاہ کے مرکزی دروازے کو مکمل طور پر چاندی کا بنوایا تھا لیکن بدقسمتی سے اب ان عمارات کا وجود نہیں رہا۔

ہندو خواجہ خضر کو جند پیر یا زندہ پیر کے نام سے یاد کرتے ہیں جو دریائے سندھ کے حکمران دیوتا کے سوا کچھ نہیں۔ کہیں اس نام کو اوڈیرولال اور کہیں دریا شاہ بھی کہا جاتا ہے جس کی یاد میں وہ چراغ بھی جلاتے ہیں۔

زندہ پیر جزیرے کی مرکزی درگاہ، جس کے دروازے چاندی کے تھے، کے ہال میں درویش کا چبوترہ بنایا گیا تھا جس کی عقبی دیوار میں ایک تختی نصب تھی۔ اس تختی پر فارسی میں ایک عبارت تحریر ہے جس کا ترجمہ کچھ اس طرح ہے۔

''جب اس دربار کو تعمیر کیا گیا تو اسے خضر کے پانیوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔''

اس تعمیر کی تاریخ ''درگاہ علی'' کے الفاظ سے نکالی گئی ہے جو 341 بنتی ہے یعنی جب یہ درگاہ تعمیر ہوئی تو 341 ہجری کا سن تھا جو عیسوی کیلنڈر کے حساب سے 952ء بنتی ہے۔ درگاہ کے جنوب مغرب کی طرف اینٹوں کی ایک ٹوٹی پھوٹی مسجد ہے جس پر 1011 ہجری (بہ مطابق 1602ء) کا سن لکھا گیا ہے۔ ان تواریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ زندہ پیر کی درگاہ کا دریائے سندھ کے رُخ موڑنے سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ ان سے بھی صدیوں پہلے جب محمد بن قاسم نے 712ء میں سندھ پر حملہ کیا تو دریائے سندھ یہیں بہتا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ستیوں جو استھان کی طرح خواجہ خضر کی زمین بھی خیراتی ہے اور برطانوی قبضے سے بھی پہلے.... مجاور یہاں رہے ہیں جو ان مزاروں اور درگاہوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ انگریز فاتح سندھ سر چارلس نیپیئر نے بھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔

جزیرہ بکھر کے جنوب میں دریائے سندھ کے نچلی طرف چند سو گز کے فاصلے پر ست یا سادھ بیلو کا جزیرہ ہے۔ یہ ہندوؤں کے مقدس ترین مقامات میں سے ہے۔ 1823ء میں سوامی باکھنڈی مہاراج اداسی نے یہاں ایک مندر تعمیر کرایا جو قدیم و جدید طرزِ تعمیر کا شاندار شاہکار ہے۔ یہاں پاکستان اور ہندوستان کے علاوہ دنیا کے دوسرے حصوں سے بھی ہندو مذہبی رسومات کے لیے آتے ہیں اور جنم اشٹمی کا تہوار نہایت جوش و خروش اور عقیدت و احترام سے مناتے ہیں۔

سادھ بیلو دو حصوں پر مشتمل ہے ان میں سے ایک سادھ بیلو اور دوسرا دن بیلو کہلاتا ہے۔ 94-1893ء میں اسے پہلی مرتبہ سرکاری نقشے پر ظاہر کیا گیا۔ کلکٹر سکھر کے احکامات پر 1912ء میں اس کا نہایت باریکی اور تفصیل سے سروے کیا گیا جس کے مطابق اس کا رقبہ 1629 یلڑ قرار دیا گیا۔

سادھ بیلو چونکہ ہندوؤں کا مذہبی علاقہ ہے اس لیے یہاں جانے کے لیے محکمۂ اوقاف سے باقاعدہ اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا ہے۔

اور اب قارئین کے لیے لینس ڈاؤن برج کے حوالے سے چند دلچسپ باتیں......

لینس ڈاؤن برج کو بغیر ستونوں کے تعمیر کیے جانے کی حقیقت وہی ہے جو بیان کی جا چکی ہے کہ دریا کی تہ یہاں چٹانی نہیں بلکہ چکنی مٹی کی تھی جس کی وجہ سے ستونوں کو کھڑا کیا جانا ممکن نہیں تھا لیکن مقامی لوگ کہتے ہیں کہ یہاں دریا کی گہرائی اتنی تھی کہ ستون بنائے ہی نہیں جا سکتے تھے جبکہ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس مقام پر دریا کے پانیوں کے نیچے جنوں کی بہت بڑی بستی آباد ہے اور انہوں نے انگریزوں کو ستون نہیں بنانے دیے کیونکہ ان سے جنوں کی بستی متاثر ہوتی۔

ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ لینس ڈاؤن برج درمیان سے دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا تھا جسے ایک تالے کی مدد سے دوبارہ جوڑ دیا جاتا تھا لیکن انگریزوں نے پاکستان سے جاتے ہوئے اس تالے کو مستقل بند کر کے چابی دریا میں پھینک دی۔

ایک کہانی میں بتایا جاتا ہے کہ انگریزوں نے لینس ڈاؤن برج بنانے والے کاریگر کے ہاتھ کاٹ دیے تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ دریائے سندھ میں پانی جتنا چاہے ہو جائے لیکن روہڑی چینل یعنی لینس ڈاؤن برج کے نیچے پانی کبھی خشک نہیں ہوتا جبکہ سکھر چینل (سکھر اور بکھر کے درمیان) پانی خشک ہو جاتا ہے۔

لینس ڈاؤن برج کو شروع میں ریلوے اور روڈ ٹریفک دونوں کی گزرگاہ کے طور پر بنایا گیا اور پچاس سال تک یہ پل دونوں طرح کی ٹریفک کے لیے استعمال ہوتا رہا لیکن پھر اسے روڈ ٹریفک کے لیے بند کر دیا گیا اور تیس سال تک یہاں سے صرف ٹرین گزرتی رہی۔ پھر ٹرینوں کے لیے ایوب آرچ بنا دی گئی اور لینس ڈاؤن برج کو صرف روڈ ٹریفک کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔

لطف کی بات یہ ہے کہ لینس ڈاؤن برج کو ہیوی ٹریفک (ریل گاڑیوں) کے لیے ڈیزائن کیا گیا تھا لیکن اب ٹرینیں تو درکنار بھاری روڈ ٹریفک بھی یہاں سے نہیں گزرنے دی جاتی۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ 1879ء میں اس مقام پر محرابی معلق پل بنانے کی تجویز دی گئی لیکن اسے ناقابلِ عمل قرار دے کر مسترد کر دیا گیا اور تراسی سال بعد 1962ء میں محض سو فٹ کے فاصلے پر محرابی معلق پل بنا دیا گیا جسے ایوب آرچ برج کہا جاتا ہے۔

ایوب برج پاکستان کے کسی بھی دریا پر بنایا جانے والا ریلوے کا وہ واحد محرابی معلق پل ہے جسے آہنی رسوں کی مدد سے سہارا دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور معلق پل نہیں جس پر سے ٹرین گزرتی ہو۔

لینس ڈاؤن برج اپنی تعمیر کے وقت یعنی 1887ء میں دنیا کا سب سے طویل معلق پل تھا۔

لینس ڈاؤن برج کا مجموعی وزن تین ہزار تین سو ٹن ہے۔

لینس ڈاؤن برج کی افتتاحی تقریب صبح سویرے ہونے کی وجہ یہ تھی کہ انگریز افسران اپنے بھاری یونیفارم میں پریشانی محسوس نہ کریں۔

اپنی تعمیر کے وقت ایوب برج دنیا کا تیسرا طویل ترین ریلوے آرچ اسپین اور دنیا کا وہ پہلا پل تھا جس پر بچھے ریلوے ڈیک کو آہنی رسوں کی مدد سے سہارا دیا گیا تھا۔

لینس ڈاؤن برج دیکھنے میں بے حد عظیم الجثہ اور عظیم الشان ہے لیکن انجینئرنگ پر عبور رکھنے والے اسے تکنیکی تعمیراتی شاہکار تسلیم نہیں کرتے...... ہے نا حیرت انگیز بات!

چلبلا

تنویر ریاض

اس نے ایک بڑے فلمی گھرانے میں آنکھیں کھولی تھیں مگر اس میں اپنی بھی خداداد صلاحیتیں تھیں۔ وہ اپنے لیے خود راستہ بناتا چلا گیا۔ وہ بھی ایسا راستہ جس نے ایک جہان کو دیوانہ بنا دیا تھا۔ اس دور کے نوجوان اس کی نقل کرنا فخر سمجھتے، اس کے گیت گا کر، بالوں اور کپڑوں کی نقالی کر کے خود کو نمایاں کرنے کی سعی کرتے تھے۔

ماضی کے ایک مقبول ترین اداکار کی کتھا

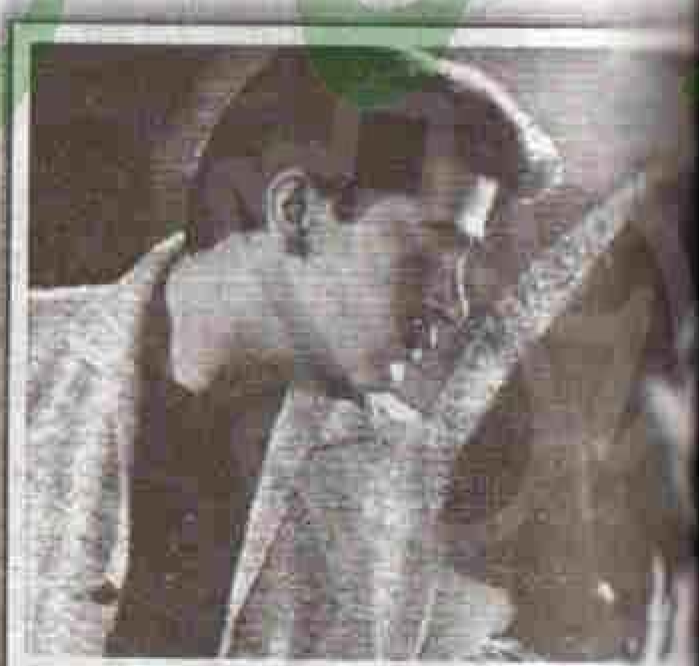

زندگی ایک سفر ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ اس کے مقدر میں کن راستوں سے گزرنا لکھا ہے۔ بہت سے لوگ بھٹک کر کسی منزل کا تعین کیے بغیر ان جانے راستوں پر بھٹکتے رہتے ہیں جبکہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ہر راستے، ہر گلی اور ہر موڑ سے گزرتے ہوئے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں اور دوسروں کی توجہ کا مرکز بنتے چلے جاتے ہیں۔ انہیں اپنی منزل کا علم ہوتا ہے اور وہاں تک پہنچنے کے لیے راستوں کا انتخاب بھی خود ہی کرتے ہیں۔ انہیں تھکاوٹ کا احساس ہوتا ہے اور نہ ہی کسی جگہ رک کر ستانے کی فکر، وہ تو بس چلتے رہتے ہیں۔ ایک مسافت طے ہوتی ہے تو دوسری شروع پھر تیسری، چوتھی اور اس طرح زندگی کا یہ سفر جاری رہتا ہے۔ ایسے لوگوں کو کامیاب کہا جاتا ہے۔ ان کی شخصیت، طرزِ زندگی، کارنامے اور کامیابیاں ایک دنیا کے لیے مثال بن جاتی ہیں اور جب ان کی زندگی کا سفر تمام ہوتا ہے تو لگتا ہے کوئی بھرا میلہ چھوڑ کر چلا گیا۔

آنجہانی شمی کپور کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے ایک بھرپور زندگی گزاری اور 79 سال تک زمانے کے سرد و گرم کو جھیلتے ہوئے 14 اگست 2011 کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ممکن ہے کہ آج کی نسل شمی کپور کے نام سے واقف نہ ہو لیکن جن لوگوں نے آج سے چالیس سال پہلے کی فلمیں دیکھی ہیں۔ وہ جانتے ہوں گے کہ شمی کپور اپنے وقت کے کتنے بڑے اداکار تھے۔ بولی وڈ میں بڑے اداکاروں کی کبھی کمی نہیں رہی۔ ان کے ناموں پر نظر ڈالیں تو ہمیں ایک لمبی فہرست نظر آتی ہے۔ موتی لال، اشوک کمار، پران، کے ایل سہگل، دلیپ کمار، راج کپور، دیو آنند، راجندر کمار، سنیل دت، دھرمیندر، امیتابھ بچن، ونود کھنہ، امجد خان، سنیل کپور، شترو گھن سنہا، شاہ رخ خان، سلمان خان اور عامر خان وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے ہر ذرہ اپنی جگہ آفتاب ہے۔ کسی کو ٹریجڈی کنگ کا خطاب ملا تو کوئی شوقین کے لقب

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے نوازا گیا۔ کوئی روحانی اداکاری میں اپنا جواب نہیں رکھتا تو کسی نے ایکشن کے میدان میں جھنڈے گاڑ رکھے ہیں، لیکن شمی کپور اس حوالے سے ان سب میں ایک منفرد اور ممتاز مقام رکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے خاص طرز اداکاری سے اس دور کی فلموں میں ہیرو کے روایتی تصور کو یکسر بدل کر رکھ دیا اور ایک ایسے وقت میں جب بھارتی فلم انڈسٹری پر دلیپ کمار، راج کپور، دیو آنند، راجندر کمار اور سنیل دت جیسے قد آور اداکار راج کر رہے تھے۔ انہوں نے اسی طرز اداکاری کی وجہ سے جگہ بنائی۔

شمی کپور کے فلمی کیریئر کا آغاز 53ء میں بننے والی فلم ''جیون جیوتی'' سے ہوا، اس کے بعد انہوں نے کئی ہٹ فلموں ''تم سا نہیں دیکھا، دل دے کے دیکھو، جنگلی، دل تیرا دیوانہ، پروفیسر، چائنا ٹاؤن، راج کمار، کشمیر کی کلی، جانور، تیسری منزل، این ایوننگ اِن پیرس، برہما چاری، انداز اور ودھاتا وغیرہ میں کام کیا۔ 68ء میں فلم برہما چاری، میں غیر معمولی فارمنس دینے پر شمی کپور کو بہترین اداکار کا فلم فیئر ایوارڈ ملا جبکہ 82ء میں انہوں نے فلم ودھاتا، کے لیے بہترین معاون اداکار کا خطاب حاصل کیا۔ ان کی آخری فلم راک اسٹار ہے جس میں انہوں نے اپنے بڑے بھائی راج کپور کے پوتے رنبیر کپور کی فرمائش پر ایک چھوٹا سا رول نبھایا ہے۔ یہ فلم گیارہ نومبر 11ء کو ریلیز ہوئی۔

شمی کپور کا اصل نام شمشیر راج کپور ہے۔ وہ 21 اکتوبر 1931ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد پرتھوی راج کپور تھیٹر اور فلم کے مقبول اداکار تھے۔ یہ وہی پرتھوی راج ہیں جنہوں نے مشہور زمانہ فلم مغل اعظم میں شہنشاہ اکبر کا رول کیا تھا۔

شمی کپور کا اپنے تین بھائیوں میں دوسرا نمبر تھا۔ ان کے بڑے بھائی راج کپور اور چھوٹے بھائی ششی کپور بھی ہندی فلموں کے مقبول اداکار تھے، جبکہ راج کپور کے دونوں بیٹوں رندھیر کپور اور رشی کپور نے بھی فلموں میں اداکاری کرکے بڑا نام کمایا جبکہ سب سے چھوٹا بیٹا راجیو کپور اپنے بھائیوں کی طرح فلموں میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اس خاندان کی چوتھی نسل سے تعلق رکھنے والی رندھیر کپور کی بیٹیوں کرشمہ کپور اور کرینہ کپور نے بھی بولی ووڈ میں دھوم مچادی جبکہ رشی کپور کا بیٹا رنبیر کپور بھی 2007 میں بننے والی فلم سانوریا کے ذریعے فلمی دنیا میں قدم رکھ چکا ہے اور اس وقت اس کا شمار نئی نسل کے مقبول اداکاروں میں ہوتا ہے۔

شمی کپور کی پیدائش ممبئی میں ہوئی لیکن ان کی زندگی کا ابتدائی دور کولکتہ میں گزرا۔ جہاں ان کے والد پرتھوی راج کپور نیو تھیٹرز اسٹوڈیوز سے وابستہ تھے۔ کولکتہ میں ہی انہوں نے مونٹیسوری اور کنڈر گارڈن کی تعلیم حاصل کی۔ ممبئی آنے کے بعد انہوں نے واڈلا کے علاقے میں واقع سینٹ جوزف کانونیٹ اسکول میں داخلہ لے لیا۔ اس کے بعد ڈون باسکو اسکول جوائن کیا اور میٹرک کا امتحان نیو ایرا اسکول سے پاس کیا۔ شمی کپور نے کچھ عرصہ روبا کالج ممبئی میں تعلیم حاصل کی اس کے بعد اپنے والد کی تھیٹر کمپنی پرتھوی راج تھیٹر سے وابستہ ہوگئے جبکہ سنیما سے ان کا تعلق بطور جونیئر آرٹسٹ 1948ء میں قائم ہوا۔ ابتدائی طور پر انہیں پچاس روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ وہ پرتھوی راج تھیٹر سے چار برسوں تک وابستہ رہے اور جب 1952ء میں اس تھیٹر سے ملازمت ختم کی تو ان کی تنخواہ تین سو روپے ماہانہ تھی۔

1953ء وہ سال ہے جب فلم جیون جیوتی کے ذریعہ شمی کپور کا فلمی کیریئر شروع ہوا۔ اس فلم کے ہدایت کار مہیش کول تھے اور چاند عثمانی، شمی کپور کی پہلی ہیروئن تھیں، 1953 سے 1956ء تک انہوں نے 19 فلموں میں کام کیا جن میں سے 16 فلمیں ناکام اور صرف تین نے اوسط درجہ کا بزنس کیا جبکہ ان فلموں میں اس دور کی مقبول اداکارائیں شیاما، چاند عثمانی، شمی، وجنتی مالا، نوتن، مدھوبالا، ثریا، چترا سمرتین، منور سلطانہ، نلنی جیونت، ششی کلا، نروپا رائے گیتا بالی، مینا کماری، نادرہ، مالا سہنا وغیرہ ان کے مدِمقابل تھیں۔

شمی کپور نے ابتدائی فلموں میں سنجیدہ کردار ادا کیے لیکن ہدایت کار ناصر حسین کی فلموں تم سا نہیں دیکھا (1957ء) اور دل دے کے دیکھو (1959ء) کے ذریعے وہ ایک نئے روپ میں نظر آئے اور انہوں نے ہندی فلموں کے ہیرو کو ایک زندہ دل اور اسٹائلش پلے بوائے کا امیج دیا، ورنہ اس سے پہلے ان فلموں کے ہیرو رومانی مکالمے بولتے، داڑھی بڑھائے ٹھنڈی آہیں بھرتے اور المیہ گیت گاتے نظر آتے تھے۔ لمبا قد، خوبصورت جسم، گورا رنگ، سبز آنکھیں اور چہرے کے دلکش نقوش نے مل کر قیامت ڈھا دی اور ان کی بدولت شمی کپور دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں دلوں کی دھڑکن بن گئے۔ ان دونوں فلموں کے ذریعے نئی اداکاروں اینا اور آشا پاریکھ نے اپنے فلمی کیریئر کا آغاز کیا اور شمی کپور کی بدولت ان کی پہلی ہی فلم کو ہٹ کا درجہ حاصل ہوا۔

تم سا نہیں دیکھا، کئی لحاظ سے ایک منفرد اور قابل ذکر فلم کہلائی جاسکتی ہے۔ بطور ہدایت کار ناصر حسین کی یہ پہلی فلم تھی۔ اس سے پہلے وہ میم جی اور انگ گیسٹ، جیسی فلموں کی کہانیاں لکھ چکے تھے۔ اس فلم میں اینا کو پہلی بار ہیروئن کے رول میں پیش کیا گیا جو فلمستان اسٹوڈیو کے مالک تولا رام جالان کی منظورِ نظر تھی۔ اس لیے فلم بناتے وقت ساری توجہ اینا پر مرکوز رکھی گئی۔ اس کے میک اپ، ملبوسات اور شاٹس پر خصوصی توجہ دی گئی اور فلم کی پبلسٹی میں بھی اسے ہی نمایاں کیا گیا۔

یہ فلم بے حد کامیاب رہی اور اس نے شمی کپور کو راتوں رات لاکھوں دلوں کی دھڑکن بنادیا۔ اس فلم میں شمی کپور نے ایک منفرد انداز اپنایا اور وہ اپنی بے ساختہ اور ہلکی پھلکی اداکاری کی وجہ سے اس طرز کی فلموں کے لیے موزوں سمجھے جانے لگے۔

اس حوالے سے ایک دلچسپ انکشاف یہ ہے کہ شمی کپور والا رول پہلے دیو آنند کو آفر کیا گیا تھا لیکن اس نے اینا کے ساتھ کام کرنے سے انکار کردیا اور اس طرح یہ کردار شمی کپور کے حصے میں آگیا۔ اس فلم کے گانے مجروح سلطان پوری نے تحریر کیے جبکہ موسیقی او پی نیر نے ترتیب دی تھی۔ ان میں سے بیشتر گانے ہٹ ہوئے جن میں تم سا نہیں دیکھا، سر پر ٹوپی، آئے ہیں دور سے، چھپنے والے سامنے آ، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان گانوں کی مقبولیت سے بھی شمی کپور کی کامیابی کی راہ ہموار ہوئی کیونکہ انہوں نے جس انداز میں ان گانوں کی پکچرائزیشن کروائی۔ وہ شاید اس دور کے کسی دوسرے اداکار کے بس کی بات نہیں تھی۔

شمی کپور کے ابتدائی دور کی دوسری اہم فلم دل دے کے دیکھو (1959ء) تھی۔ اس فلم کے ہدایت کار بھی ناصر حسین ہی تھے لیکن اس بار ہیروئن بدل گئی تھی اور ایک نئی اداکارہ آشا پاریکھ نے ان کے مقابل مرکزی کردار ادا کیا۔ شمی کپور چاہتے تھے کہ وحیدہ رحمان اس فلم میں ان کی ہیروئن کے طور پر کام کرے لیکن فلم ساز نے پہلے ہی آشا پاریکھ سے معاہدہ کرلیا تھا۔ یہ فلم بھی تجارتی اعتبار سے بہت کامیاب رہی۔ اس کے بعد ناصر حسین، شمی کپور اور آشا پاریکھ ایک بار 1966ء میں تیسری منزل کے لیے یک جا ہوئے اور اس فلم نے بھی کامیابی اور مقبولیت کا نیا ریکارڈ قائم کیا۔ دل دے کے دیکھو، آشا پاریکھ کی سترھویں سالگرہ پر ریلیز ہوئی تھی۔ ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے آشا پاریکھ کہتی ہیں۔

سردار قمبر کے آباو اجداد اصل میں حبشی (بلوچی میں قمبر بمعنی حبشی ہے اور اسی سے قمبرانی قبیلے کا نام ہے) بتائے جاتے تھے اور وہ خود ایک مشہور پیر کی اولاد سمجھا جاتا تھا جس نے اپنے دور میں بہت سی کرامات دکھائی تھیں۔ اس سے قمبر اور اس کے حامیوں کو ملک میں ایک خاص وقار و افتخار حاصل ہوگیا جو حامیوں کی مختصر تعداد اور خود قمبر کی حقیر موروثی جائداد جو پنجگور مکران میں تھی، کے لیے حاصل کرنا ناممکن تھا۔ قمبر نے راجا سیوا کو تخت سے اُتار دیا اور سربراہِ مملکت بن گیا۔ سیوا چند لوگوں کے ساتھ زہری چلا گیا جہاں اس کا بیٹا سنگین برسرِ اقتدار تھا۔ بعد ازاں ایک بغاوت میں سیوا مارا گیا اور سنگین نے قیدی ہوکر اپنا مذہب ترک کرکے اسلام قبول کرلیا۔ اس کے بہت سے پیرو بھی مسلمان ہوگئے لیکن ان کا قبیلہ گورووانی (گورووانی یعنی گورو (ہندو پیشوا) کے مرید یا آواز) اب بھی ان کے سابقہ مذہب کی یاد دلاتا ہے۔

لیفٹیننٹ ہنری پوٹنگر کے 1816ء میں لکھے گئے ''سفر نامہ بلوچستان اور سندھ'' سے اقتباس

تلاش: جمیل صدیقی، کراچی

سیب، قلب دوست پھل

یوں تو سیب کے بے شمار فوائد ہیں لیکن دل کے مریضوں کے لیے سیب قدرت کا انمول تحفہ ہے۔ اس میں پوٹاشیم اور فاسفورس کی مقدار بہت زیادہ پائی جاتی ہے لیکن سوڈیم (نمک) نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ دل کی بے قاعدگی کی صورت میں سیب کے ساتھ خالص شہد کا استعمال زمانہ قدیم سے موثر چلا آرہا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے کیلیفورنیا یونی ورسٹی کے ماہرین نے انکشاف کیا تھا کہ غذا میں زیادہ پوٹاشیم استعمال کرنے والے افراد دل کے امراض سے محفوظ رہتے ہیں۔

سیب پیشاب کے زیادہ اخراج کی وجہ سے ہائی بلڈ پریشر کے لیے ایک انمول دوا ثابت ہوتا ہے۔ جسم کو سوڈیم کی فراہمی کے کم ہونے سے گردوں کو آرام ملتا ہے۔ اس کا میلک ایسڈ، یورک ایسڈ خارج کرکے گٹھیا کے مریضوں کو روبہ صحت کرتا ہے۔

مرسلہ: ڈاکٹر محمد علی (کراچی)

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

"اس وقت میں بہت نروس تھی، شمی جی نے فلم کی عکس بندی کے دوران قدم قدم پر میری حوصلہ افزائی کی اور سکھایا کہ کس طرح آرام وسکون سے کام کرنا چاہیے۔ خاص طور سے گانوں پر ہونٹ ہلانے کی مہارت کس بلا کا نام ہے۔ اس کے بعد ہم تیسری منزل میں بھی اکٹھے ہوئے پھر دو اور فلمیں جوان محبت اور پگلا کہیں کا، کیں مگر یہ آخری دو فلمیں کامیاب نہ ہوسکیں۔ جب ہم تیسری منزل کررہے تھے تو اس کی کامیابی کا بھی یقین نہیں تھا مگر قسمت نے کرم کیا، شمی جی کے ساتھ ہنسی مذاق کا تعلق رہا۔ وہ، ناصر صاحب اور ڈائریکٹر وجے آنند میرے پکے دوست ہوا کرتے تھے۔ زندگی کے آخری دنوں میں بھی میں نے انہیں کبھی مایوس اور پریشان نہیں دیکھا۔ صرف گیتا بالی کے انتقال پر انہیں رنجیدہ پایا۔ میرے ساتھ وہ ہمیشہ ایک مہربان اور گورو کی طرح پیش آئے۔"

1961ء کی ریلیز جنگلی، شمی کپور کے کیریئر کی سب سے بڑی ہٹ فلم ہے۔ دل دے کے دیکھو، کے بعد انہوں نے چار فلموں اُجالا، کالج گرل، سنگاپور اور دل اپنا اور پریت پرائی میں کام کیا۔ یہ چاروں فلمیں تجارتی اعتبار سے اوسط درجہ کی تھیں لیکن جنگلی نے انہیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچادیا۔ اس فلم کے فلم ساز وہدایت کار سبودھ مکھرجی تھے۔ گیت نگار شیلندر اور حسرت جے پوری جبکہ فلم کی موسیقی شنکر جے کشن نے ترتیب دی تھی۔ اس فلم میں بھی ایک نئی اداکارہ سائرہ بانو نے بطور ہیروئن اپنے فلمی کیریئر کا آغاز کیا جو ماضی کی نامور اداکارہ پری چہرہ نسیم کی بیٹی تھی اور بعد میں اس نے برصغیر کے عظیم فنکار دلیپ کمار سے شادی کرلی۔ جنگلی بھی ایک ہلکی پھلکی میوزیکل فلم تھی جس میں ایک بار پھر شمی کپور نے اپنی بے ساختہ اداکاری کا جادو جگایا۔ اس فلم میں ان پر فلمایا ہوا گانا "یاہو! چاہے کوئی مجھے جنگلی کہے۔" ان کے لور بوائے امیج کی علامت بن گیا۔ گلی گلی محلے محلے، اس گانے کی گونج سنائی دیتی اور نوجوان لڑکے شمی کپور کے انداز میں اس گانے کو گاتے ہوئے سڑکوں پر پھرتے نظر آتے۔ یہ فلم باکس آفس پر سپرہٹ قرار پائی۔ اس فلم کے دیگر مقبول گانے احسان تیرا ہوگا مجھ پر، دن سارا گزارا، کشمیر کی کلی ہوں میں، اور جا جا میرے بچپن تھے۔ جنگلی کی ریلیز کے بعد شمی کپور اور محمد رفیع لازم وملزوم ہوگئے اور شمی کپور پر فلمائے گئے زیادہ تر گانے محمد رفیع کی آواز میں ہی ریکارڈ کیے جانے لگے۔

ان کے ساتھ اپنے کیریئر کا آغاز کرنے والی سائرہ بانو جنگلی کے دنوں کو یاد کرتے ہوئے کہتی ہیں "وہ بہت ہی نفیس انسان تھے۔ میں نے جنگلی کے بعد ان کے ساتھ مزید دو فلموں بلف ماسٹر اور ضمیر میں کام کیا۔ اس بات کا ہمیشہ افسوس رہے گا کہ میں نے ان جیسے پیارے شخص کے ساتھ زیادہ کام کیوں نہیں کیا؟ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان کی فلموں میں میرے مطلب کا کوئی رول نہ ہو کیونکہ اس زمانے میں فلم ساز اور ہدایت کار، کرداروں کے لحاظ سے اداکاروں کا انتخاب کیا کرتے تھے۔ آج کی طرح اداکاروں کی مارکیٹ ویلیو، ساتھی اداکاروں کی سفارش اور فلم ساز وہدایت کار کی ذاتی پسند اور ناپسند کا کوئی دخل نہیں تھا۔ میں نے اداکاری کے بنیادی رموز شمی جی سے ہی سیکھے ہیں۔ جنگلی، سے میرے کیریئر کا آغاز ہورہا تھا اور میرے متعلقین کی طرح وہ بھی اس معاملے میں گہری دلچسپی لے رہے تھے۔ انہوں نے کبھی خود کو ایک ماہر ڈانسر نہیں کہا لیکن میرے حساب سے وہ قدرتی ڈانسر تھے اور گانا سن کر ہی دھن کے حساب سے رقص شروع کردیتے تھے۔ انہوں نے کبھی کسی کوریوگرافر کا سہارا نہیں لیا۔

شمی کپور نے اپنے ابتدائی دور میں ماضی کی مقبول ہیروئنوں مدھوبالا (ریل کا ڈبہ، نقاب)، نوتن (لیلیٰ مجنوں)، شیاما (ٹھوکر اور ٹلنی جنیت) (ہم سب چور ہیں) کے ساتھ بھی کام کیا لیکن ان میں سے کوئی بھی فلم باکس آفس پر کامیاب نہ ہوسکی۔ 50ء کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں انہوں نے گھریلو فلموں میں بھی کام شروع کردیا تھا۔ ان میں شمع پروانہ (54ء) ثریا کی فلم تھی۔ اسی طرح میم صاحب (56ء) میں مینا کماری کے ساتھ کام کیا۔ شیاما کے ساتھ چور بازار (54ء) اور مرزا صاحباں (57ء) بھی کیں لیکن ان میں سے کچھ فلمیں کامیاب اور کچھ ناکام رہیں لیکن ان فلموں سے شمی کپور کو کوئی شناخت نہ مل سکی۔

ساٹھ کی دہائی کے ابتدائی چند برسوں میں انہوں نے کالج گرل، بسنت، سنگاپور، بوائے فرینڈ، پروفیسر، دل تیرا دیوانہ، واللہ کیا بات ہے، پیار کیا تو ڈرنا کیا، چائنا ٹاؤن، کشمیر کی کلی بلف ماسٹر، جانور اور راج کمار وغیرہ میں کام کیا۔ وہ اس دور کے واحد ڈانسنگ ہیرو تھے اور اسی بنیاد پر ایک ایسی انڈسٹری میں جگہ بنانے میں کامیاب رہے جہاں پہلے سے ہی دلیپ کمار، راج کپور اور دیو آنند راج کررہے تھے۔ انہوں نے صرف اپنے ڈانس کی وجہ سے ان بڑے ہیروز کے بیچ ایک مقام حاصل کیا۔ وہ خود کہا کرتے تھے کہ انہیں ڈانس

کرنا نہیں آتا لیکن وہ صرف گانے کی دھن کو محسوس کرتے ہوئے بے ساختہ رقص شروع کردیتے تھے اور انہیں کبھی کسی کوریوگرافر کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اسی خصوصیت کی بنا پر انہیں بھارت کے ایلوس پریسلے کا خطاب دیا گیا۔

جنوبی ہند کی ہیروئنوں کے ساتھ بھی انہوں نے عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور ان کی بیشتر فلمیں باکس آفس پر کامیاب رہیں، انہوں نے بی سروجا دیوی کے ساتھ پیار کیا تو ڈرنا کیا اور پریت نہ جانے ریت، پدمنی کے ساتھ سنگاپور، وجنتی مالا کے بالمقابل کالج گرل اور پرنس میں کام کیا۔ 1969ء میں راجیش کھنہ کی آمد ہوئی تو رومانی ہیرو کا خطاب اس کی جھولی میں چلا گیا۔ اس کے باوجود شمی کپور نے ساٹھ کی دہائی کے آخری برسوں میں کچھ کامیاب فلموں میں کام کیا۔ ان میں سادھنا کے ساتھ بدتمیز اور سچائی، نوتن کے ساتھ لاٹ صاحب اور ببیتا کے ساتھ تم سے اچھا کون ہے شامل ہیں۔

1970ء میں شمی کپور کا وزن بڑھنا شروع ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی رومانٹک ہیرو کے طور پر ان کا کیریئر بھی زوال پذیر ہونے لگا، انداز (1971ء) ان کی آخری فلم تھی جس میں انہوں نے لیڈ ہیرو کے طور پر کام کیا۔ اس کے بعد وہ کیریکٹر رول کرنے لگے۔ اس حیثیت میں بھی ان کی کئی فلمیں کامیاب ہوئیں۔ جن میں ضمیر، ہیرو، ودھاتا، حکومت، بٹوارہ، تہلکہ، چمتکار، تمک اور پریم گرنتھ شامل ہیں۔ 1974ء میں انہوں نے بطور ہدایت کار پہلی فلم منورنجن اور 1976ء میں بنڈل باز بنائیں، گو کہ یہ دونوں فلمیں کامیاب نہ ہوسکیں لیکن نقادوں نے انہیں بہت پسند کیا۔ ان کی آخری فلم سینڈوچ تھی جو 2006ء میں ریلیز ہوئی۔

ستر کی دہائی میں وہ ایک کامیاب معاون اداکار کے طور پر سامنے آئے۔ بہت کم لوگ یہ بات جانتے ہوں گے کہ یاہو اسٹار شمی کپور نے فلم جنگلی کی اپنی ہیروئن سائرہ بانو کے باپ کا رول بھی پلے کیا ہے اس فلم کا نام ضمیر ہے جو 74ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ پرورش، میں وہ امیتابھ بچن کے باپ بنے۔ اسی طرح 80ء اور 90ء کی دہائی میں انہوں نے کئی فلموں میں معاون اداکار کے طور پر کام کیا اور 1982ء کی ریلیز ودھاتا، پر بہترین معاون اداکار کا فلم فیئر ایوارڈ حاصل کیا۔ انہیں کچھ بنگالی اور تامل فلموں میں بھی کام کرنے کا اتفاق ہوا۔ اسی طرح انہوں نے زی ٹی وی سے دکھائے جانے

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

مارچ 2012ء بہار کے خوشنما رنگ لیے

عمیرہ احمد ...... عکس

عکس در عکس پھیلے سلسلۂ زندگی کے پوشیدہ پہلوؤں کی کھوج وجستجو کا سفر

شیریں حیدر

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

اپنے مخصوص کرداروں کے ساتھ مسلسل ناول کے پرتحیر نشیب وفراز

ناہید سلطانہ اختر ...... زندگی

زندگی کی تلخ وشیریں حقیقتوں سے روشناس کراتا آپ کی پسندیدہ مصنفہ کے قلم سے لکھا نیا سلسلے وار ناول

راحت وفا ...... ایک تھی نیناں

انسانی ذہن کی نفسیاتی الجھنوں کیفیات اور احساسات کے گرد گھومتا سلسلے وار ناول

انجم انصار اور سکینہ فرخ

کے دلکش وخوب صورت ناولٹ

سعدیہ رئیس، سیما یاسمین مجتبیٰ، زاھدہ پروین، نظارت نصر، کرن احمد، عظمیٰ سید افتخار، تابندہ جبین، نزھت جبین ضیا، عائشہ خان اور بشریٰ گوندل کی دلچسپ وپراثر تحریریں

آپ کی آرا ونگارشات سے سجے مستقل سلسلے

کیا آپ نے اس ماہ کا پاکیزہ پڑھا؟ نہیں! کمال ہے!

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ٹرین دائرہ دین پناہ ہوتی ہوئی کوٹ ادو پہنچی۔ وہاں سے اس کا رخ بدلا۔ یہ واپس لوٹی اور لائن بدل کر دریا پار اترنے لگی اور پھر دریا کے دائیں کنارے پر چلتی ہوئی ڈیرہ غازی خان پہنچی۔ اسی ڈیرہ غازی خان جسے اسی (80) سال پہلے دریا بہالے گیا اور لوگوں نے دس بارہ میل پرے ہٹ کر نیا شہر بسایا۔

وہاں بہت اوپر ہمالیہ کے پچھواڑے لداخ سے چل کر دریائے سندھ کے کنارے کنارے سفر کرتا ہوا میں ڈیرہ غازی خان پہنچا تو احساس ہوا کہ بہت تاخیر سے پہنچا۔ مجھ سے پہلے بے شمار قافلے' کاروان' لشکر' سپاہ سالار' جرنیل اور فاتحین یہاں پہنچ چکے تھے اور ڈیرہ غازی خان کی سرزمین کے سادہ ورق پر اپنے اپنے نشان چھوڑ چکے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ زمانے کی تند ہوائیں اور برساتوں کی تیز رو رودکوہیاں وہ سارے نشان بہا کر لے گئیں۔ اس خطے کی تاریخ محفوظ نہ ہو سکی اور نہ شاید ہو سکے گی کیونکہ آج بھی ڈیرہ اسماعیل خان اور ڈیرہ غازی خان کے میدانوں میں کتنے ہی عظیم قلعوں' محلوں اور شہروں کے کھنڈر ویران پڑے ہیں اور ان میں یا تو سائیں سائیں کرتی ہوئی ہواؤں کا گزر ہوتا ہے یا سال کے سال بہنے والے برساتی پانی کے ریلوں کا یا پرانے زمانے کے پتھر' موتی اور زیور تلاش کرنے والوں کا۔ تاریخ داں ادھر بہت کم آتے ہیں محکمہ آثار قدیمہ والوں کو شاید کوہ سلیمان کے دامن میں بکھری ہوئی تاریخ کی ان نشانیوں کی خبر بھی نہیں۔

تاریخ میں جو کچھ واقعات آئے وہ سکندر کے حملے کے وقت آتے ہیں کہ سکندر جب حملہ آور ہوا ہے اور واپس جا رہا تھا تو ہڑنگ کے قلعے پر آیا۔ ہڑنگ اس وقت دارا کی بیٹی نوشابہ کی جاگیر میں تھا۔ یہیں رہتی تھی' یہیں اس کی شادی ہوئی تھی۔

اس کے بعد اس علاقے پر یونانیوں کی اور پھر ہندوؤں کی حکومت رہی۔ یونانی دور کے آثار تو نہیں ملتے مگر ہندو دور کے تو اور اب تک میدانوں میں بکھرے پڑے ہیں۔

ہندوؤں کے زمانے میں ایک راجا دلورائے تھا۔ اس کے شہر کے آثار اب کھنڈر کی صورت میں ہیں۔ پتا نہیں وہ شہر زلزلے سے تباہ ہوا یا دریائے سندھ کے پانی نے اسے تباہ کیا یا رودکوہیوں نے' بہر صورت وہ شہر تباہ ہو گیا لیکن اب تک وہاں سے نوادر مل رہے ہیں۔ گندم اور چاول کے دانے تک صحیح صورت میں نکل آتے ہیں بعض قیمتی اشیا مثلاً زیورات اور مٹی کے برتن وغیرہ بھی برآمد ہوتے رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ چیزیں بہاولپور کے عجائب گھر میں محفوظ ہیں۔

دلورائے کے بعد یہاں راجا داہر کی حکومت ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عربوں نے یہاں پہنچنا شروع کیا اور یہ بات محمد بن قاسم سے بھی پہلے کی ہے۔ محمد بن قاسم سے بھی قبل یہاں پر عربوں نے جب بنوں فتح کیا تو اس وقت یہ علاقہ بھی انہوں نے فتح کر لیا چنانچہ یہاں پر ایک ندی کا ہاہے' اس کے درے پر سات قبریں ہیں۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ صحابہ کی قبریں ہیں۔

محمد بن قاسم کے بعد یہاں اسلامی مملکت قائم ہوئی اور صدیوں بعد بلوچ قبیلے یہاں پہنچنے شروع ہوئے۔ انتظام کی رو سے یہ علاقہ پنجاب میں سہی مگر تاریخ کے اعتبار سے اس پر بلوچوں کی بہت گہری چھاپ ہے۔

پندرہویں صدی عیسوی میں یہاں پر بلوچ قبائل آنے شروع ہوئے۔ ان میں ایک میرانی قبیلہ تھا۔ نواب احمد خان' خان قلات کہتے ہیں کہ وہ دراصل میروانی قبیلہ تھا۔ میروانی قبیلے کی شاخ اب بھی بلوچستان میں ہے اور خود خان قلات کا تعلق اسی قبیلے سے ہے۔ تو ان کی حکومت پندرہویں صدی سے لے کر اٹھارہویں صدی تک رہی۔ ان کے 14 حکمران ہوئے۔ وہ باری باری غازی خان اور حاجی خان کہلائے اور انہی ناموں سے مشہور ہوئے۔ آخری حکمران کمسن بچہ تھا۔ اس کے ایک وزیر محمود خان گوجر نے غداری کر کے کلہوڑوں کو سندھ سے یہاں بلوالیا اور اس بے چارے بچے کو ان کے حوالے کر دیا۔ اسے وہ حیدر آباد لے گئے' اس کی قبر بھی وہیں حیدر آباد میں ہے۔

اقتباس: شیر دریا از رضا علی عابدی — تلاش: اظہر جمیل صدیقی

والے ڈراما چٹان، میں بھی تقریباً ایک سال تک کام کیا۔ آہستہ آہستہ انہوں نے فلموں میں کام کم کر دیا۔ ان کے آخری دور کی قابلِ ذکر فلموں میں سلمان خان کی جانم سمجھا کرو (1999ء) واہ تیرا کیا کہنا (2002ء) اور سینڈوچ (2006ء) شامل ہیں۔

شمی کپور نے 1953ء سے 2011ء تک کل 133 فلموں میں کام کیا، جن میں سے 24 تجارتی اعتبار سے ہٹ اور 48 اوسط درجہ پر کامیاب رہیں جبکہ فلاپ فلموں کی تعداد 58 ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ان کی زیادہ تر ایسی فلمیں ناکام ثابت ہوئیں جن میں وہ ہیرو کی بجائے معاون اداکار کے طور پر کام کر رہے تھے۔ ان کی صلاحیتوں کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے ابتدائی دور کی کامیاب فلموں میں بالکل نئی اداکارائیں ان کے مدِمقابل تھیں جیسے ایتا (تم سا نہیں دیکھا) آشا پاریکھ (دل دے کے دیکھو)، سائرہ بانو (جنگلی) اور شرمیلا ٹیگور (کشمیر کی کلی) وغیرہ لیکن شمی کپور نے کبھی ان نوآموز اداکاراؤں کے ساتھ کام کرنے پر کوئی اعتراض نہیں کیا اور پوری فلم کا بوجھ اپنے کاندھوں پر لے کر اسے کامیابی سے ہمکنار کروایا۔

شمی کپور کا طویل فلمی کیریئر تنازعات اور اسکینڈل سے پاک نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنے دور کی انتہائی خوب صورت اور شوخ اداکاراؤں کے ساتھ کام کیا لیکن کسی کے ساتھ بھی ان کا کوئی اسکینڈل منظرِ عام پر نہیں آیا۔ ہر اداکارہ ان کی عزت کرتی تھی اور کبھی کسی ہیروئن کو ان سے شکایت نہیں ہوئی۔ حالانکہ وہ عموماً فلموں میں شوخ، کھلنڈرے، لاابالی اور رومان پسند ہیرو کے طور پر نظر آتے تھے اور اپنے کردار کی ادائیگی کے دوران انہیں ان اداکاراؤں سے قریب ہونے اور ان کے ساتھ رومانی وجذباتی سین بند کروانے کے مواقع بھی دستیاب ہوتے تھے لیکن یہ سب کچھ محض اداکاری تک محدود تھا۔ شوٹنگ ختم ہونے کے بعد انہیں کسی اداکارہ کے ساتھ باہر جاتے یا فلمی تقاریب اور پارٹیوں میں شرکت کرتے نہیں دیکھا گیا۔

شمی کپور کی 79 سالہ زندگی میں صرف چار عورتوں کا نام آتا ہے۔ ان میں سے پہلی قاہرہ کی بیلے ڈانسر نادیہ جمال تھی جس سے شمی کپور کی ملاقات کولمبو میں ہوئی۔ نادیہ جمال کا اصل نام ماریہ کیری ڈیاس تھا۔ اس کا باپ یونانی اور ماں اطالوی تھی، نادیہ نے بچپن سے ہی اپنی ماں کے ساتھ رقص کرنا شروع کر دیا تھا اور 14 سال کی عمر میں بیلے ڈانسر بن چکی تھی۔ اس نے کئی مصری اور بھارتی فلموں میں بھی کام کیا۔

1953ء میں اس کی ملاقات شمی کپور سے ہوئی اور دونوں ایک دوسرے کے پیار میں مبتلا ہو گئے لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا کہ بات آگے بڑھنے کے بجائے پورے طور پر ختم ہو گئی۔ اور نادیہ قاہرہ واپس چلی گئی۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ کپور گھرانا فلمی ہونے کے باوجود سختی سے مشرقی روایات واقدار کا پابند تھا اور نادیہ جیسی آزاد خیال اور کھلی ڈلی بیلے ڈانسر کا اس فیملی میں نباہ مشکل تھا۔ نادیہ جمال نے آگے چل کر اپنے کیریئر کے حوالے سے بڑی شہرت حاصل کی۔ وہ پہلی مشرقی رقاصہ تھی جس نے بالی بیک انٹرنیشنل فیسٹیول میں پرفارم کیا۔ وہ قاہرہ اوپیرا ہاؤس میں بھی رقص کرتی رہی اور اسے اردن کے شاہ حسین اور ایران کے شہنشاہ ایران کے سامنے بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کا موقع ملا۔ اس نے اپنے کیریئر کے دوران ایشیاء، مشرق وسطیٰ، یورپ، لاطینی اور شمالی امریکا کے کئی ملکوں کا دورہ کیا۔ 1996ء میں وہ چھاتی کے سرطان میں مبتلا ہوئی اور 53 سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔

1955ء میں شمی کپور کی ملاقات اس دور کی بہترین چلبلی اداکارہ گیتا بالی سے ہوئی۔ وہ دونوں ایک فلم رنگین راتیں، کی شوٹنگ میں حصہ لے رہے تھے۔ شمی کپور اس فلم کے ہیرو تھے جبکہ گیتا بالی مہمان اداکارہ۔ اس وقت تک شمی کپور کو فلمی دنیا میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں تھی۔ جبکہ گیتا بالی ایک مقبول ہیروئن کا درجہ رکھتی تھی۔ گیتا بالی کا اصل نام ہرکرتن کور تھا اور وہ سکھ مذہب سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کا بچپن انتہائی غربت میں گزرا، اس نے پچاس کی دہائی کے آغاز میں ہی فلموں میں کام شروع کر دیا اور یہ بھی ایک عجیب اتفاق تھا کہ اسے اپنے ہونے والے جیٹھ راج کپور کے ساتھ باورے نین اور سسر پرتھوی راج کے ساتھ آنند مٹھ میں کام کرنے کا موقع ملا۔ کپور فیملی کی یہ روایت رہی ہے کہ کوئی بھی اداکارہ اس خاندان کے کسی فرد سے شادی کر لینے کے بعد فلموں سے کنارہ کشی اختیار کر لیتی ہے لیکن گیتا بالی نے اس روایت کو توڑتے ہوئے مرتے دم تک فلموں میں اداکاری جاری رکھی۔ اس کی قابلِ ذکر فلموں میں بازی، گھائل، باز، جال، البیلا اور بھگوان دادا شامل ہیں اسے فلم وچن (1955ء) میں بہترین اداکارہ اور فلم کوی (1955ء) میں بہترین معاون اداکارہ کے فلم فیئر ایوارڈ کے لیے بھی نامزد کیا گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

رانی کھیت کے علاقے میں ہو رہی شوٹنگ کے دوران کیوپڈ کے تیر نے وار کیا اور دونوں نے ساتھ جینے اور مرنے کی قسمیں کھالیں۔ گیتا نہ صرف شمی کپور سے ایک سال بڑی تھی بلکہ ان کے بڑے بھائی راج کپور اور والد پرتھوی راج کے ساتھ فلم میں کام بھی کر چکی تھی۔ اس لیے ان کی شادی کے امکان پر پورے خاندان میں ہنگامہ مچ گیا۔ پہلی ملاقات کے ٹھیک چار ماہ بعد جب ان پریمیوں نے سمجھ لیا کہ ان کی شادی آسانی سے نہیں ہو سکتی تو بالکل خفیہ طور پر ممبئی کے پنسن سی روڈ پر واقع بن گنگا مندر میں شادی کرلی۔ اس موقع پر واحد گواہ شمی کپور کا دوست ہری والیا تھا۔ دونوں جانب کے لوگوں کو بعد میں اس شادی کی اطلاع دے دی گئی جسے انہوں نے تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کرلیا۔ گیتا بالی نے شمی کپور کی فلم مجرم میں مہمان اداکارہ کے طور پر کام کیا۔ بعد میں انہیں دو فلموں کوکا کولا اور کافی ہاؤس میں بھی بطور ہیرو ہیروئن کام کرنے کا موقع ملا، مگر یہ دونوں فلمیں ہی بُری طرح ناکام رہیں۔ شادی کے بعد گیتا بالی نے 14 فلموں میں کام کیا اور پھر اداکاری سے ریٹائرمنٹ لے لی۔ ان کی آخری فلم پردیپ کمار کے بالمقابل جب سے دیکھا ہے تمہیں (1963ء) تھی۔ اس فلم میں شمی کپور اور ششی کپور نے مہمان اداکار کے طور پر کام کیا تھا۔

شمی کپور اور گیتا بالی کے آنگن میں پہلا پھول، ادیتہ راج کپور کے نام سے یکم جولائی 1956ء میں ممبئی کے شیزو ڈکر اسپتال میں کھلا جبکہ ان کی بیٹی کنچن 1961ء میں پیدا ہوئی۔ 1965ء میں جب شمی کپور اپنے کیریئر کی اہم ترین فلم تیسری منزل کی شوٹنگ میں مصروف تھے کہ ان کی جان سے پیاری بیوی گیتا بالی، اسمال پاکس میں مبتلا ہو کر اس جہاں فانی سے رخصت ہو گئی۔ بیوی کے یوں چلے جانے سے شمی کپور بُری طرح بکھر گئے۔ اس وقت ان کا بیٹا نو سال اور بیٹی صرف چار سال کی تھی۔ شمی کپور نے دونوں بچوں کو باپ کے ساتھ ساتھ ماں کا پیار بھی دیا، لیکن انہیں زندگی میں ایک عورت کی کمی محسوس ہو رہی تھی چنانچہ انہوں نے ساتھی اداکارہ ممتاز کو پروپوز کردیا۔ وہ اُس کے ساتھ فلم برہم چاری، میں کام کر چکے تھے جس کے گانے آج کل تیرے میرے پیار کے چرچے اور دل کے جھروکے میں تجھ کو بٹھا کر، بہت مقبول ہوئے تھے۔

ممتاز اپنے دور کی معروف اداکارہ تھی، وہ 31 جولائی 1947ء کو پیدا ہوئی اور اس نے بارہ سال کی عمر میں ہی فلموں میں کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ ممتاز نے اپنے کیریئر کے دوران سو سے زیادہ فلموں میں کام کیا۔ اس کی پہلی فلم مجھے جینے دو بطور ہیروئن آخری فلم آئینہ (1977ء) تھی۔ بارہ سال بعد وہ 1989ء میں ایک بار پھر فلم آندھیاں، میں نظر آئی۔ 1989ء میں اسے فلم فیئر لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ ملا جبکہ 1970ء میں وہ فلم کھلونا، میں بہترین اداکارہ کا فلم فیئر ایوارڈ حاصل کر چکی تھی۔

ممتاز نے 29 مئی 1974ء کو ایک کروڑ پتی مایور مادھوانی سے شادی کرلی جس سے اس کی دو لڑکیاں نتاشا اور تانیا ہیں۔ ممتاز نے شمی کپور کے انتقال کے بعد ممبئی مرر، کو انٹرویو دیتے ہوئے تصدیق کی کہ شمی کپور اس سے شادی کرنا چاہتے تھے "اس وقت میری عمر صرف اٹھارہ سال تھی جب انہوں نے کہا کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ ان دنوں مجھے کئی فلموں میں کام کرنے کی پیشکش ہو رہی تھی اور میں اتنی جلدی شادی کر کے اپنے کیریئر کا خاتمہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میرے انکار کا انہوں نے بُرا نہیں مانا، میں ان کی بہت عزت کرتی ہوں اور ان کی یاد ہمیشہ ہمارے دلوں میں رہے گی وہ بہت ہی خوب صورت اور اسمارٹ اداکار تھے۔ نہ جانے کتنی لڑکیاں ان پر مرتی ہوں گی لیکن انہوں نے کبھی کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ اس وقت انڈسٹری میں شمی کپور اور فیروز خان ہی خوش شکل اداکار تھے۔ میں نے آج تک انڈسٹری میں ان سے زیادہ چارمنگ ایکٹر نہیں دیکھا۔

ممتاز کے انکار کے بعد شمی کپور نے گجرات کی رائل فیملی سے تعلق رکھنے والی نیلا دیوی سے 69ء میں شادی کرلی۔ جنہوں نے صحیح معنوں میں حقِ رفاقت ادا کردیا۔ ان کے بارے میں شمی کپور کے بیٹے آدیتہ راج کا کہنا ہے "یہ بہت اچھا ہوا کہ نیلا دیوی، دوسری ماں کی شکل میں پتا جی کی زندگی میں آگئیں۔ واقعی انہوں نے وہ خلا پُر کردیا۔ انہوں نے مجھے زخمی شیر سے نارمل انسان بننے میں مدد دی اور اب میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ایک اچھی ماں ہی خاندان کو جوڑے رکھتی ہے۔"

شمی کپور گزشتہ کئی برسوں سے گردوں کی بیماری میں مبتلا تھے اور ہفتے میں تین بار انہیں ڈائلیسس کروانا پڑتا تھا تاہم اس مشکل علاج نے بھی ان کے چہرے کی ہنسی اور خوش مزاجی کو متاثر نہیں کیا اور لوگوں نے کبھی انہیں مایوسی کی حالت میں نہیں دیکھا۔ وہ دوسروں کے دکھ اور غم شیئر کرتے لیکن اپنی تکلیف کسی سے بیان نہیں کرتے۔ 14 اگست 2011ء کو ممبئی کے برنچ کینیڈی اسپتال میں وہ زندگی کی بازی ہار بیٹھے انہیں ایک ہفتہ قبل ہی اسپتال میں داخل کیا گیا تھا جہاں گردے فیل ہو جانے کے سبب ان کا انتقال ہو گیا۔

15 اگست 2011ء کو مالا بار ہل ممبئی کے مکان پر ان کی آخری رسومات ادا کی گئیں۔ ان کے اکلوتے بیٹے آدیتہ راج کپور نے ان کی چتا کو آگ دکھائی جبکہ امریکا میں مقیم پوتے وشوا پرتاب راج کے ممبئی پہنچنے پر ہی ان کا اَنتم سنسکار کیا گیا۔ اس موقع پر پوری کپور فیملی اور فلم انڈسٹری کے چیدہ چیدہ لوگ موجود تھے۔ رنبیر کپور، ششی کپور، رشی کپور، رندھیر کپور، راجیو کپور، کرشمہ، کرینہ، ببیتا، نیتو سنگھ کے علاوہ دلو دھنہ، شتروگھن سنہا، سجاش گھئی، امیتابھ بچن، پریم چوپڑہ، انیل کپور، گووندہ، عامر خان، شاہ رخ خان، کبیر بیدی اور پریانکا چوپڑا نے بھی نے ان کی آخری رسومات میں شرکت کی۔

شمی کپور کے اکلوتے بیٹے آدیتہ راج کپور نے اپنے آپ کو حیرت انگیز طور پر انڈسٹری سے دور رکھا اس بارے میں اس نے فلمی جریدہ فلم فیئر کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا۔ "دوسرے کپورز کی طرح میں بھی فلمی دنیا میں کیریئر شروع کرنے والا تھا کہ میرے روحانی گورو نے مجھے فلموں میں کام کرنے سے منع کردیا اور کہا کہ فلم انڈسٹری میرے لیے ٹھیک نہیں۔ اس وقت آر کے بینر سے کزن رشی کپور نے بوبی، کے ذریعے کامیابی حاصل کرلی تھی اور میں راج کپور کے اسسٹنٹ کے طور پر کام کر رہا تھا۔ گورو جی سے پوچھا کہ ایکٹنگ میں نہ سہی، ڈائریکشن میں تو جا سکتا ہوں، لیکن انہوں نے کہا کہ کوئی دوسری فیلڈ دیکھو چنانچہ گورو جی کے مشورے پر میں نے شپنگ کمپنی میں ملازمت اختیار کرلی اور پورے 25 سالوں تک اسٹوڈیو کا رخ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ میں نے فلمیں دیکھنا بھی چھوڑ دی تھیں۔ گورو جی کے انتقال کے بعد جی چاہا کہ پھر سینما انڈسٹری کی طرف آؤں چنانچہ دوبئی چھوڑ کر ممبئی آگیا اور پہلے مرحلہ ٹی وی کے لیے تین سو اقساط کی ٹی وی سیریل ڈائریکٹ کی۔ اس کے بعد ایک انگریزی فلم کی ہدایات بھی دیں پھر دو انگلش فلمیں کر ڈالیں۔ 52 سالہ کی عمر میں ممبئی واپس آیا اور ایکٹر بننے کی کوشش شروع کردیں۔ پتا جی نے میری بنائی ہوئی فلموں کو بہت باریک بینی سے دیکھا اور 76 سال کی عمر میں بھی میرے لیے گائیڈ اور گورو بنے رہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب 19 سال کی عمر میں فلم انڈسٹری سے دور جانے کا فیصلہ کیا تھا تب ان کی بڑی خواہش تھی کہ یہیں رہوں اور ان کی سرپرستی میں آگے بڑھوں لیکن کبھی انہوں نے اپنی مرضی مجھ پر مسلط نہیں کی۔ اب 53 سال کی عمر میں ایکٹنگ کیریئر شروع کیا ہے تو اندازہ ہوا کہ اداکاری تو میرے خون میں شامل ہے۔ میری دو فلمیں ممبئی 118 اور چیز، ریلیز ہو چکی ہیں جبکہ سوسائٹی میں ڈمپل کپاڈیہ اور رندھیر کپور کے ساتھ ایک مختصر رول کیا ہے۔ ایک اور فلم دیوانگی نے حد کردی، میں بھی منفی رول کیا ہے۔ سوچتا ہوں کہ اگر پاپا کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے فلمی دنیا سے وابستہ رہتا تو شاید کپور خاندان کے نام کو آگے بڑھانے میں میرا بھی کچھ حصہ ہوتا لیکن دیر آید درست آید۔ اب میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ کچھ ایسا کام کرنے کی کوشش کروں گا جس سے باپ دادا کا نام روشن ہو۔

شمی کپور کی بیٹی کنچن کی شادی مشہور فلمی ہدایت کار کے بیٹے کیتن ڈیسائی سے 1982ء میں ہوئی۔ اور اس وقت وہ صوفیہ کالج ممبئی میں بی اے (آنرز) فائنل کی طالبہ تھی لیکن شادی کی وجہ سے امتحان نہ دے سکی۔ اس کی دو بیٹیاں پوجا ڈیسائی اور رامیشوری ہیں گو کہ کنچن کی پیدائش ایک فلمی گھرانے میں ہوئی اور شادی کے بعد وہ ایک دوسرے فلمی گھرانے میں گئی لیکن اس نے ہمیشہ اپنے آپ کو فلمی سرگرمیوں سے علیحدہ رکھا۔ البتہ اس کا شوہر کیتن ڈیسائی اور بیٹی پوجا ڈیسائی فلمی کاروبار سے منسلک ہیں۔

شمی کپور کے انتقال نے خاندان کے افراد، دوستوں اور لاکھوں پرستاروں کو سوگوار کردیا۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے، لیکن ان کی یادیں ہمیشہ لوگوں کے دلوں میں زندہ رہیں گی۔ وہ ایک زندہ دل اور خوش باش انسان تھے اور جو شخص ان سے ایک بار مل لیتا، انہی کا گرویدہ ہو جاتا، زندگی کے آخری ایام میں انہوں نے جس بے جگری سے بیماری کا مقابلہ کیا، اس سے دوسرے لوگوں کو بھی جینے کا حوصلہ ملتا ہے۔

☆☆☆

انوکھا خراج عقیدت:

شمی کپور کی پہلی ہٹ فلم تم سا نہیں دیکھا، 1957ء میں ریلیز ہوئی اور اس کے ساتھ ہی وہ لاکھوں فلم بینوں کے محبوب اسٹار بن گئے اس دور کے دوسرے مقبول اداکاروں کشور کمار، راج کپور اور دیو آنند کی طرح نوجوان طبقہ ان کے ہیئر اسٹائل، لباس اور چلنے پھرنے کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اندازکی تقلید کرنے لگا، خاص طور پر ان کے بالوں کی لٹ بہت مقبول ہوئی جو ان کے ماتھے پر پڑی رہتی تھی اور گانے یا رقص کے دوران وہ ایک مخصوص انداز میں سر جھٹک کر اسے پیچھے کیا کرتے تھے۔ اس حوالے سے ان کے ایک پرستار راجن کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ 1961ء کی بات جب وہ اپنے دوستوں کے ساتھ اسکول جانے کے بجائے راکسی سینما میں شمی کپور کی فلم جنگلی دیکھنے جایا کرتا تھا۔ راجن کو یاد نہیں کہ اس نے یہ فلم کتنی بار دیکھی تھی۔ البتہ اس نے شمی کپور کو اپنا آئیڈیل بنالیا اور انہی کی وضع قطع اختیار کرلی۔ پانچ سال پہلے راجن نے اپنے پسندیدہ اسٹار کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ایک انوکھا طریقہ اختیار کیا اور شمی کپور کی فلموں سے متعلق یادگار اشیاء جمع کرنا شروع کردیں جن میں ان فلموں کے پوسٹرز، گانے، کتابیں اور تصاویر شامل ہیں۔ تم مجھے یوں بھلا نہ پاؤ گے، کے نام سے ان یادگار اشیاء کی نمائش 9 تا 22 اکتوبر چترپتی شیواجی مہاراج واستو سنگرالیا میں کی گئی۔

اس نمائش میں ان فلموں سے متعلق یادگار اشیاء رکھی گئی تھیں جن میں شمی کپور نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ ان میں کچھ ایسی فلمیں بھی جن کے متعلق شاید لوگ بہت زیادہ نہ جانتے ہوں جیسے چور بازار، ریل کا ڈبہ اور سپہ سالار وغیرہ، یہ فلمیں شمی کپور کی پہلی ہٹ تم سا نہیں دیکھا سے پہلے بنائی گئی تھیں۔ اس نمائش میں شمی کپور کی کچھ فلموں کے سنسر سرٹیفکیٹ بھی رکھے گئے تھے جن میں ڈاکو، واللہ کیا بات ہے اور مجرم، شامل ہیں۔

راجن جے کار نے اس نمائش کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے بتایا ''شمی جی میرے بچپن کے ہیرو تھے اور میں کالج کے زمانے میں ان کے اسٹائل کی نقل کیا کرتا تھا۔ میں گزشتہ پانچ سال سے ان کی فلموں کے پوسٹر، تصاویر، گانے، سنسر سرٹیفکیٹ اور لابی کارڈز وغیرہ جمع کررہا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد مجھے ان اشیاء کی اچھی قیمت مل سکتی تھی لیکن میں نے انہیں عام آدمی کے لیے نمائش میں رکھنے کو ترجیح دی۔ ان میں سے کچھ چیزیں ایسی ہیں جنہیں دیکھ کر خود شمی جی بھی حیرت میں مبتلا ہوگئے تھے۔ میں ان سے سات آٹھ مرتبہ ملاقات کرچکا تھا اور انہوں نے بھی مجھے اپنے ذاتی البم میں سے کچھ تصاویر عنایت کی تھیں۔

☆☆☆

شمی کپور کی
ریلیز شدہ فلمیں

نمبر شمار	سن	فلم	ڈائریکٹر
1	1953ء	ٹھوکر	لیکھ راج بخشی
2	1953ء	گل صنوبر	ایس آزاد
3	1953ء	جیون جیوتی	مہیش کول
4	1953ء	کھوج	بلونت بھٹ
5-	1953ء	لڑکی	ایم ڈی برمن
6-	1953ء	لیلیٰ مجنوں	کے امرناتھ
7-	1953ء	ریل کا ڈبہ	پی این اروڑا
8	1954ء	شمع پروانہ	ڈی ڈی کیشپ
9	1954ء	چور بازار	پی این اروڑا
10	1954ء	احسان	آر شرما
11	1954ء	محبوبہ	کے امرناتھ
12	1955ء	ڈاکو	ایس آزاد
13	1955ء	نقاب	لیکھ راج بخشی
14	1955ء	تانگے والی	لیکھ راج بخشی
15	1955ء	مس کوکا کولا	قادر کپور
16	1956ء	میم صاحب	آر سی تلوار
17	1956ء	سپہ سالار	محمد حسین
18	1956ء	ہوٹل	من موہن صابر
19	1956ء	رنگین راتیں	کیدار شرما
20	1957ء	تم سا نہیں دیکھا	ناصر حسین
21	1957ء	مرزا صاحباں	روی کپور
22	1957ء	کافی ہاؤس	ہری مالیا
23	1957ء	مہارانی	اے کریم
24	1958ء	مجرم	او پی رلہن
25	1959ء	مہر	جے راج

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایکسٹرا

یعقوب جمیل

فلمی دنیا میں ایکسٹرا اداکار کی اہمیت کیا ہے؟ صرف بھرتی کا مہرہ؟ وہ دوسروں کے کرداروں کو مضبوط کرتا ہے مگر اس کا کردار؟ وہ بھی ایک ایکسٹرا اداکار تھا۔ بمبئی کی فلم نگری میں اس کی دھوم تھی مگر اس کی موت کتنی سبق آموز ہے۔

اچھی تحریر پسند کرنے والوں کے لیے عمدہ تلاش

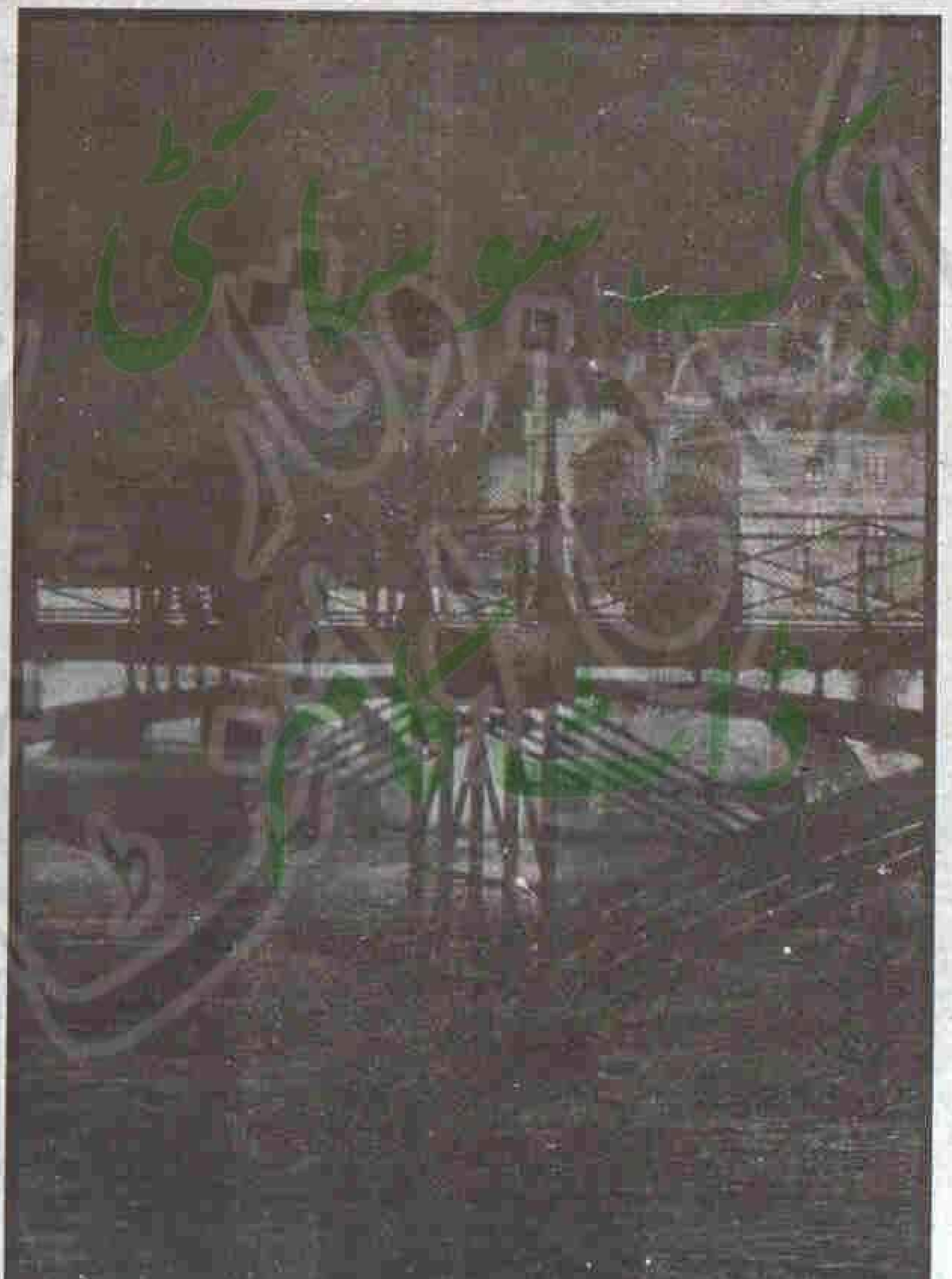

اسٹوڈیو کے مین گیٹ میں داخل ہوتے ہی فلم کی ہیروئن کملا دیوی کے پیر میں موچ آ گئی تھی اور فلم کا ہدایت کار موہن لال کھنہ فوراً ہی ہیروئن کے تلوے سہلانے لگ گیا تھا۔ اس کی بے چینی دیکھ کر یہی محسوس ہو رہا تھا کہ آج شاید وہ ہیروئن کملا دیوی کے رقص کی فلم بندی نہیں کر سکے گا۔ ہیروئن کے تلوے سہلانے میں موہن لال کھنہ کو بہت مزہ آ رہا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اچانک اس وقت فلم کے پروڈیوسر معاملے کو سمجھے بوجھے بغیر ہانپتے کانپتے وہاں آ گئے اور انہوں نے ہیروئن کے پاس آ کر کہا۔ ”کہاں گیا...... کچھ پتا چلا راجا ہریش چندر کا؟“

”اسے ہی تو آواز دے رہا ہوں۔“ کہہ کر ہدایت کار نے ایک زوردار آواز لگائی ”ابے کہاں مر گیا راجا ہریش چندر......؟“

سچ پوچھا جائے تو اب اس فلم میں ہیروئن کملا دیوی کے ناچ گانے کا کوئی کام ہی باقی نہیں تھا اسے تو اب اپنے تجربے سے فلم کے پروڈیوسر اور ہدایت کار کو اپنی انگلیوں پر نچانا تھا۔ پیٹرول کے کوپنوں کی بلیک مارکیٹنگ سے پروڈیوسر اوجھا کے پاس اچھی خاصی رقم جمع ہو گئی تھی جس کے نتیجے میں اس نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے ایک ہدایت کار یعنی موہن لال کی مدد سے ہیروئن کملا دیوی کو رضامند کر کے اپنی ایک چھوٹی سی فلم کمپنی بنا کر پروڈکشن شروع کر دی تھی۔ ہدایت کار موہن لال ہر وقت نشے میں رہنے کا عادی تھا، ویسے بھی فلم انڈسٹری میں شراب نوشی کو کوئی برا کام نہیں سمجھا جاتا۔ موہن لال کی نظر میں دنیا بھر میں صرف ایک ہی سمجھ دار عورت تھی اور وہ تھی کملا دیوی، موہن کھنہ نے اپنے استاد بابو بھائی پٹیل کو چھ پان روزانہ کے حساب سے چھ سالوں تک کھلانے کے بعد اب اسسٹنٹ ڈائریکٹر سے ڈائریکٹر بن گیا تھا اور ہیروئن کملا دیوی کے پیچھے وہ پچھلے چھ سالوں سے مجنوں بنا گھوم رہا تھا۔ ہیروئن کملا دیوی کی جوانی تو اب ڈھلتی جا رہی تھی لیکن اس کے باوجود بھی اپنے زبردست میک اپ کی وجہ سے وہ آج بھی زبردست ہیروئن تھی۔

ایک وقت تھا جب وہ ایک ناز نخرے والی ہیروئن ہوا کرتی تھی لیکن اب بھی کملا دیوی میں وہی جنون تھا۔ اس کے اسی پرانے مزاج کو بنانے کے لیے ہی یہ دونوں کنگال پروڈیوسر اور ڈائریکٹر ہمیشہ اس کے پیر چومنے کے لیے تیار رہتے تھے، خیر یہ تو ہیروئن کے ناز نخروں کی بات تھی۔

اصل میں تو آج راجا ہریش چندر کے عالی شان دربار کا ایک خاص سین فلمایا جانے والا تھا۔ شوٹنگ شروع کرنے کا وقت ہو گیا تھا۔ اس لیے فلم کے کیمرا مین نے ہمیشہ کی طرح اپنا اداس چہرہ اور اپنی خمار آلود آنکھیں لیے راجا ہریش چندر کے تخت پر لائٹس سیٹ کرتے ہوئے آواز لگائی ”راجا ہریش چندر کہاں ہے؟ بلاؤ اسے......“

اور پھر کیمرا مین کی آواز سن کر ڈائریکٹر موہن لال نے بھی زور سے آواز لگائی ”کہاں چلا گیا سالا راجا......؟“

بس پھر کیا تھا؟ اپنے ڈائریکٹر کو خوش کرنے کے لیے اس کے اسسٹنٹ نے بھی آواز لگائی ”ابے راجا، سالے کہاں مر گیا؟“ اسسٹنٹ کی آواز کے بعد بھلا دوسرا اسسٹنٹ کیسے خاموش رہتا، اس نے آواز لگانے کے ساتھ ساتھ راجا کی ماں بہن کو بھی نہیں چھوڑا، لیکن بھارت کی فلم نگری میں اس قسم کی گالیاں بکنا معیوب بات نہیں سمجھی جاتی کوئی کسی کی گالی کا برا نہیں مانتا۔ خیر ان گالیوں کے بعد تو پورے اسٹوڈیو میں راجا ہریش چندر کی تلاش شروع ہو گئی، ہر طرف سے اس کے نام کی پکار سنائی دینے لگی۔

تھوڑی دیر بعد ڈائریکٹر موہن لال کا غصہ اپنے پورے عروج پر پہنچ گیا اور اس نے فلم کے پروڈیوسر کی طرف دیکھ کر راجا کو اور بھی بری بری گالیاں دینا شروع کر دیں۔ اس بار ان گالیوں کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔

اسٹوڈیو کے باہر اس وقت کچھ ایکسٹرا مرد اور لڑکیاں اکٹھے ہو کر ایک دوسرے کے ساتھ ہنس بول رہے تھے۔ ہنسی مذاق کے ساتھ ساتھ چائے اور سگریٹ کا دور بھی چل رہا تھا۔ انہی لوگوں کے ساتھ، شاہانہ لباس میں ملبوس راجا ہریش چندر کے گیٹ اپ میں ایک ادھیڑ عمر شخص بھی موجود تھا۔ اس کی بھاری پگڑی میں ہیروں کی چمک والے پتھر لگے ہوئے تھے اور قیمتی ریشمی لبادے پر بھی سنہری زری کا موٹا موٹا کام کیا ہوا تھا اور اس کے سلیم شاہی جوتوں پر بھی شیشے کے رنگ برنگے ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔ اس لباس میں وہ سچ مچ ہی راجا ہریش چندر ہی لگ رہا تھا۔ اس وقت وہ اپنے ایکسٹرا ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا ان کی ہنسی مذاق کی باتیں سن رہا تھا، اس کے ہونٹوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ چپکی ہوئی تھی۔ وہ بڑی دیر سے سب کی باتیں سن رہا تھا لیکن خود اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا۔ اسے خاموش دیکھ کر ایک ایکسٹرا ساتھی نے اس سے کہا ”بھائی، تم تو راجا ہو...... راجا ہریش چندر آج تو کوئی ایسا حکم دے ہی دو کہ ہمارے دکھ درد بھی دور ہو جائیں۔“

یہ سن کر دوسرے لڑکے لڑکیوں نے نعرہ لگایا ”راجا ہریش چندر کی جے ہو، راجا ہریش چندر کی جے ہو۔“

جواب میں راجا کے ہونٹوں پر چپکی ہوئی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ اس کا اصلی نام دیپ راؤ تھا اور آج وہ شاہی تخت پر بیٹھ کر راجا ہریش چندر کا ایک چھوٹا سا کردار نبھانے والا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آج اسٹوڈیو کے سارے لوگ اسے راجا کہہ رہے تھے۔ ویسے تو وہ ایک ایکسٹرا اداکار ہی تھا۔ اس کا قد اونچا اور جسم ذرا ابھرا ابھرا تھا۔ صرف دو دن کے لیے اسے راجا ہریش چندر بنایا گیا تھا۔

اس کا دھیان اس وقت اپنے ایکسٹرا ساتھیوں کی باتوں پر لگا ہوا تھا۔ چائے کی پیالیوں کی چھن چھناہٹ اسے بے چین کیے دے رہی تھی۔ اس کے ہونٹ اور گلا چائے کی طلب میں سوکھ رہے تھے۔ پچھلے دو دنوں سے کھانا تو دور رہا اسے چائے بھی نصیب نہیں ہوئی تھی اور یہی وجہ تھی کہ جس شخص سے اسے سخت نفرت تھی اس ایکسٹرا سپلائی کرنے والے شخص سے اسے یہ چھوٹا اور ناپسندیدہ کام مانگنا پڑا تھا کہ ایکسٹرا سپلائر جان محمد نے بھی جیسے اس پر بھاری احسان جتاتے ہوئے اسے ایک دن کا سو روپے کے حساب سے دو دن کا یہ کام دلایا تھا، دو دن کے دو سو روپے میں سے جان محمد کے کمیشن کے پچاس روپے کٹ جانے تھے۔ اس طرح دو دن کے صرف ڈیڑھ سو روپے ہی اس کے ہاتھ آنے والے تھے۔

اس کام کے لیے جان محمد کو کوئی آدمی پانچ سو سے کم پر نہ ملتا لیکن غرض تو بے چارے راجا کو ہی تھی اسے تو یہ ڈیڑھ سو روپے بھی ڈیڑھ لاکھ کے برابر لگ رہے تھے، آج صبح اسٹوڈیو میں آنے کے بعد اس نے جان محمد سے پانچ روپے مانگے تھے تاکہ ایک بسکٹ اور ایک پیالی چائے پی کر اپنے بھوکے پیٹ کو تسلی دے سکے لیکن جان محمد نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اگر پانچ روپے اسے دے دیے گئے تو اور بھی ڈھیر سارے ایکسٹرا موجود ہیں، ان سب کو وہ کہاں سے ایڈوانس دے گا؟

جان محمد کا جواب سن کر گردش کا مارا راجا ہریش چندر غم کھا کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر وہاں سے چلا آیا۔ اس نے پانچ روپے تو چائے پینے کے لیے ہی مانگے تھے لیکن پھر اس نے سوچا کہ کوئی نہ کوئی تو اسے چائے پلا ہی دے گا۔ لیکن آج شاید اس کی قسمت ہی روٹھی ہوئی تھی اور کسی نے اسے چائے کے لیے بھی نہیں پوچھا۔ وہ مانگنے والا آدمی نہیں تھا۔ اس لیے اس نے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا۔

دیپ راؤ نے بھی فلم انڈسٹری میں زمانہ گزارا تھا۔ بھری جوانی میں لڑکیاں اس کی دیوانی تھیں اور وہ بھی ان کے پیچھے پاگل تھا اس لیے کہ وہ اس وقت کی فلموں کا ہیرو تھا۔ اس کی زندگی میں ایک دن ایسا بھی آیا تھا جب اس زمانے کی سب سے مشہور ہیروئن کے ساتھ اس نے ایک فلم میں ہیرو کا رول ادا کیا تھا مگر اس بات کو اب پچیس برس گزر چکے ہیں۔ وقت کے ساتھ اس وقت کے لوگ بھی کہاں سے کہاں چلے گئے۔ کچھ تو دنیا سے رخصت ہو گئے اور کچھ لوگ بڑھاپے اور بیماریوں کے سبب گوشہ نشین ہو گئے۔

مگر آج کا یہ راجا ہریش چندر پچیس سال پہلے جس

پرتگیزوں کے بعد ڈچ (اہلِ ہالینڈ) نے جنوبی ہند کا رخ کیا اور سن 1675ء میں ان کی تجارتی کوٹھیاں قائم ہوئیں۔ ان کی پرتگال والوں سے لڑائیاں بھی ہوئیں اور ان کے کئی مقبوضات اور کوٹھیوں پر انہوں نے قبضہ بھی کر لیا۔

ڈچ کے بعد انگریزوں نے ہندوستان کا رخ کیا اور کپتان ہاکنس کا جہاز 1608ء میں بندر سورت کو پہنچا۔ سورت کے علاوہ ملیباری بندرگاہوں میں بھی انہوں نے کوٹھیاں قائم کیں۔ چنانچہ سن 1628ء میں مدراس سے ستر میل جنوب میں ایک کوٹھی قائم کی۔

انگریزوں کے بعد فرانسیسی آئے چنانچہ 1669ء میں مچھلی بندر میں اپنی کوٹھی قائم کی۔ 1674ء میں پانڈیچری میں ان کی کوٹھی قائم ہوئی۔

اقتباس: دکنی کلچر از محمد نصیر الدین ہاشمی

آج سے تقریباً پونے چار سو سال پیشتر 27 ذالحجہ کو سلطان عبداللہ قطب شاہ اپنے شاہی ہاتھی ”مورت“ پر سوار ہو کر حیدر آباد سے گولکنڈہ جا رہا تھا۔ موسیٰ ندی چڑھی ہوئی تھی اور پانی ایک مہیب شور کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ ہاتھی جوش و تلاطم کو دیکھ کر مست ہو گیا۔ مہاوت کو ہلاک کر کے جنگل کی طرف نکل گیا۔ سلطان نے بہت کوشش کی کہ ہاتھی سے اتر جائے مگر کامیابی نہیں ہوئی، ناچار اس پر سوار رہا اور جدھر ہاتھی چاہتا جاتا رہا۔ جب یہ اطلاع سلطان کی والدہ حیات بخش بیگم کو ہوئی تو اس نے حکم دیا کہ جنگل کے درختوں پر کھانا اور پانی باندھ دیا جائے تاکہ ہاتھی جس درخت کے نیچے ٹھہرے، سلطان کو غذا میسر آ سکے۔ آخر ذالحجہ تک یہی حالت رہی۔ محرم کا چاند دیکھ کر حیات بخش بیگم نے منت مانگی کہ اگر سلطان صحیح و سلامت واپس آ جائے تو چالیس من سونے کی زنجیر بنا کر حسینی علم پر لے جائے گی۔ اور وہ وہاں خیرات کر دی جائے گی۔ اس منت کے بعد ہاتھی کی مستی ختم ہو گئی اور وہ سلطان کو لے کر گولکنڈہ آ گئی۔ حیات بخش بیگم نے منت کے مطابق سونے کی زنجیر بنائی اور سلطان کو باندھ کر حسینی علم روانہ کیا اور یہاں اس کو توڑ کر خیرات کر دیا گیا اس کے بعد ہر سال یہ تقسیم ہوتی رہی حتیٰ کہ قطب شاہی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

اقتباس: دکنی کلچر از محمد نصیر الدین ہاشمی
انتخاب: نبیلہ اظہر، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

مشہور ہیروئن کے ساتھ ہیرو راج کمار بنا تھا وہ ہیروئن خود اس پر جان دینے لگی تھی اور تب ہی سے اس کی بدنصیبی کے دن شروع ہوگئے تھے کیونکہ اس فلم کے مکمل ہوتے ہی انڈسٹری کے حاسد ڈائریکٹروں اور پروڈیوسروں نے اس کا مکمل بائیکاٹ کر کے کچھ ہی عرصے میں اسے ہیرو سے زیرو بنادیا اور پھر کچھ ہی دنوں میں وہ لوگوں کی نظروں سے گر گیا۔

پہلے اس کا نام تھا، اس کے پاس کام تھا اور فلموں میں اس کے دام بھی تھے لیکن دھیرے دھیرے وہ بے کار ہوکر انڈسٹری میں گم نام ہوگیا اور لوگ یہ بھی بھول گئے کہ دیپ راؤ نام کا کوئی خوبصورت ہیرو بھی فلم انڈسٹری میں تھا۔ ویسے فلم کی دنیا تو ہے ہی چڑھتے سورج کی پجاری۔ یہی حال دیپ کا بھی ہوا تھا، اس کی شہرت کا دیپ بجھ چکا تھا اس لیے وہ اب اندھیرے میں اپنی بقا کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔

اور اب چھوٹے موٹے ایکسٹرا کا کام جو کہ بہت چھوٹا ہی ہوتا تھا سو چکر لگانے کے بعد کبھی کبھی مل جاتا تھا جس کی قلیل آمدنی میں کسی طرح وہ اپنی گزر بسر کر رہا تھا۔ اس کا اب کوئی ساتھی بھی نہیں تھا۔ کوئی یار و مددگار بھی نہیں تھا۔ یکایک اس کی سماعت سے ماں بہن کی گالیوں کی زوردار آواز ٹکرائی تو وہ بیٹھے بیٹھے ہی اچھل پڑا اس نے مڑ کر دیکھا تو اسسٹنٹ ڈائریکٹر اسی کی طرف دیکھ کر چیخ رہا تھا ”ابے سالے راجا کے بچے، تجھے سنائی نہیں دیتا...... کمینے...... تیری تو......“

اس کا جی چاہا کہ وہ اُٹھ کر گالی دینے والے اسسٹنٹ کا منہ توڑ دے۔ ڈائریکٹر اور پروڈیوسر کے ساتھ ساتھ دو تین اسسٹنٹ لڑکوں کے لیے بھی وہ اکیلا ہی کافی تھا کیونکہ مار پیٹ میں وہ کسی سے کم نہیں تھا۔ کسی کے منہ سے گالی نکلی نہیں کہ اس کا بھرپور ہاتھ گالی دینے والے کے منہ پر پڑ جاتا تھا۔

ابھی چار پانچ روز پہلے کی ہی بات ہے کہ سرجیت سنگھ جواری نے اسے پچیس روپے دینے کا کہہ کر آدھے گھنٹے کے لیے اپنے ساتھ رہنے کو کہا تھا۔ وہ چونکہ ضرورت مند تھا اس لیے سرجیت کے ساتھ بیٹھ گیا۔ سرجیت نے اسے روپے دیتے وقت اپنی عادت کے مطابق دو چار گالیاں بھی دے دیں۔ بس پھر کیا تھا، دیپ راؤ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، فوراً ہی ایک تھپڑ اس کے منہ پر رسید کردیا اور پھر اسے پٹخ کر اس کے سینے پر اپنا پاؤں رکھ دیا۔ وہ تو سرجیت جواری کی قسمت اچھی تھی کہ جگدیش کا نا بیچ میں آ گیا نہیں تو وہ سرجیت کا سر ہی پھاڑ دیتا۔

لیکن آج وہی دیپ راؤ اسسٹنٹ کی گالیاں سن کر بھی کسمسا کر رہ گیا تھا۔ اس وقت بھوک کی وجہ سے اس پر نقاہت سی طاری تھی۔ اسے چکر بھی آ رہے تھے۔ سر میں درد بھی تھا۔ بھوک کے ساتھ ساتھ اسے چائے کی طلب بھی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔

وہ چپ چاپ چلتا ہوا اسٹوڈیو کے فلور پر آیا اور راجا کے لیے بنائے گئے، خوب صورت تخت پر بیٹھ گیا اور تب ہی اسے معلوم ہوا کہ اسے بخار ہے۔ یہ بخار کب چڑھ آیا تھا اسے کچھ پتا نہیں تھا وہ چائے کے لیے ایک بار پھر بے چین ہوا تھا۔ فلور کی لائٹس روشن ہوچکی تھیں۔

پاؤں میں تھوڑی سی موچ آجانے کی وجہ سے درد کا بہانہ بنا کر ہیروئن کملا دیوی پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کو نچاتی ہوئی کنیز کے روپ میں اب ایک کونے میں کھڑی ہوگئی تھی، ڈائریکٹر کے حکم پر راجا کے تخت پر لائٹس پھینکی گئی اور کیمرے کا رُخ تبدیل ہوگیا۔ پورا اسیٹ روشنی میں جگمگا رہا تھا تقریباً تیس چالیس ایکسٹراز جو کہ درباری بنے ہوئے تھے، اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہوگئے تھے۔

یہ مہاراجا ہریش چندر کا دربار تھا، بڑی خوشامدوں کے بعد اس فلم میں کام کرنے کے لیے پورے پچاس ہزار پر آیا ہوا ولن راجا ہریش چندر کے ایک طرف کھڑا تھا۔ اسی طرح پورے ایک لاکھ کی ہیروئن بھی اس وقت کنیز بنی ہوئی دوسری طرف کھڑی تھی اور مہاراجا ہریش چندر کے کردار میں دیپ راؤ سو روپے ایک دن کی مزدوری پر تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔

چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا، منظر فلمایا جانے لگا۔ سب کی نظریں تخت پر بیٹھے ہوئے راجا ہریش چندر پر لگی ہوئی تھیں اور پھر راجا جی کی خماری ٹوٹی اور اس نے ادھ کھلی آنکھوں سے تمام درباریوں پر نظر ڈالی۔ سارے درباری ادب سے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ یکایک راجا ہریش چندر کی نظر سیٹ کے کونے میں کھڑے ہوئے ایک الیکٹریشن کی جانب اُٹھ گئی، اس کے ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی اور وہ دھیرے دھیرے چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر راجا کا حلق سوکھنے لگا۔ چائے کی طلب اب پہلے سے دوگنی ہوگئی تھی۔

ڈائریکٹر نے کیمرا اسٹارٹ کی آواز لگائی اور شارٹ کی فلم بندی شروع ہوگئی، ولن نے پہلے تو مہاراجا ہریش چندر شان میں کچھ مکالمے بولے اور پھر دونوں ہاتھوں کو پیٹ پر باندھ کر ذرا جھک کر بولا ”اب مہاراجا جو بھی حکم دیں گے، اس کی تعمیل کی جائے گی...... حکم دیں مہاراج!“

اس کے جواب میں راجا ہریش چندر کو گرج دار آواز میں کہنا تھا ”پیش کیا جائے اس بدبخت داسی کو......“

لیکن اس سے پہلے کہ راجا ہریش چندر بنا ہوا دیپ راؤ اپنے شاہی لہجے میں داسی کو پیش کرنے کا حکم دیتا کہ وہ ایک لمحے کے لیے گھبرا گیا۔ شاید وہ اپنے چہرے کے تاثرات دینے میں ناکام ہوگیا تھا۔ ڈائریکٹر نے کیمرا کٹ کرا کے دوسرا شاٹ لینے کا اشارہ کیا۔ ڈائریکٹر نے سارے مکالمے جو راجا ہریش چندر کو بولنا تھے، وہ سب پہلے ہی سے اسے سمجھا دیے تھے۔ لیکن راجا ہریش چندر صرف راجا ہی نہیں تھا بلکہ وہ مہاراجا بھی تھا۔ اسی لیے اس نے بڑی رعونت سے ولن کی طرف دیکھا اور پورے رعب و دبدبے سے بولا ”تو ہمارے لیے سب سے پہلے اچھی اور کڑک چائے پیش کی جائے۔“

یہ سن کر پچاس ہزار کا ولن اور ایک لاکھ کی ہیروئن دونوں ہی حیران رہ گئے اور ڈائریکٹر تو جیسے اپنے جامے سے ہی باہر ہوگیا اور وہ غصے میں چیخ کر بولا ”کہاں سے اس سالے گدھے کو لایا گیا ہے؟“

ڈائریکٹر کے اسسٹنٹ نے کچھ ایسے ہی جملے کہے اور پھر ایک ساتھ ہی طرح طرح کی گندی گندی گالیاں اس پر برسنے لگیں، تخت پر بیٹھے ہوئے راجا کے ایک طرف ڈائریکٹر اور دوسری طرف پروڈیوسر کھڑے چیخ رہے تھے۔

راجا ہریش چندر کو اپنی بھول کا احساس ہوگیا تھا۔ اس لیے اس کو سنبھالتے ہوئے ان دونوں سے اپنی بھول کی معافی مانگ لی۔ بہر حال پھر سے اس منظر کو فلمانے کی تیاری شروع ہوئی، کیمرا اسٹارٹ ہوا تو راجا ہریش چندر نے ایک ایک کر کے اپنے سامنے کھڑے ہوئے درباریوں کو دیکھا اور تب ہی اس کے دل میں یہ وہم سا پیدا ہوگیا کہ وہ سچ مچ ہی راجا ہریش چندر ہے اور جو لوگ اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں وہ سب کے سب اس کے غلام ہیں اور اس کے ایک حکم پر اپنی جان بھی دینے کے لیے تیار کھڑے ہیں۔

اس خیال کے ذہن میں آتے ہی اس کا سر بُری طرح چکرانے لگا، بھوک کی وجہ سے پیٹ میں جلن سی ہونے لگی اور اس کے ساتھ ہی ایک بار پھر چائے کی طلب پوری زور و شور سے اس پر حاوی ہوگئی اور تب اچانک ہی اوپر بالکنی میں کھڑے الیکٹریشن پر اس کی نظر پڑ گئی، وہ الیکٹریشن اب بھی چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ پورے دربار میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی، یکایک ڈائریکٹر کی آواز نے اس خاموشی کو توڑ دیا ”ریڈی فور ٹیک، ریڈی......“ ڈائریکٹر کے ساتھ ہی اس کے اسسٹنٹ نے بھی آواز لگائی ”سائیلنس......“ یہ آواز سن کر دربار کی خاموشی اور بھی گہری ہوگئی۔

راجا ہریش چندر بنا ہوا ایکسٹرا اداکار دیپ راؤ دھیرے دھیرے اپنے نقلی وجود کو بھولتا جا رہا تھا۔ راجا ہریش چندر کے گیٹ اپ کے نیچے اس کا اصلی وجود کلبلانے لگا تھا۔ اس کا جسم بخار سے تپ رہا تھا۔ اس نے پوری کوشش کر کے ایک بار پھر خود کو راجا ہریش چندر کے روپ میں ڈھالنے کے لیے زور لگایا اور اپنے سامنے ادب سے کھڑے ہوئے درباریوں کو دیکھنے لگا۔ اس بار اس کی آنکھوں میں چنگاریاں سی اُڑتی دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے دائیں جانب پچاس ہزار کا ولن اور بائیں جانب ایک لاکھ کی ہیروئن کھڑی تھی۔ یہ دونوں راجا کے بدلتے ہوئے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔

اتنے میں ڈائریکٹر نے پھر آواز لگائی ”اسٹارٹ کیمرا......“

کیمرا اسٹارٹ پر فکس ہوگیا۔ ولن نے پہلے کی طرح راجا کی شان میں کچھ مکالمے بولے اور پھر دونوں ہاتھ پیٹ پر باندھ کر بولا ”اب مہاراجا جو بھی حکم دیں گے، اس کی تعمیل کی جائے گی...... حکم دیں مہاراج!“

لیکن جواب میں راجا ہریش چندر کو جو بولنا تھا وہ ایک بار پھر اس کے ذہن سے نکل چکا تھا اور اس کی جگہ، کمزوری، بخار، بھوک اور چائے کی طلب نے لے لی تھی۔ ولن کے مکالمے ختم ہوتے ہی سب کی نگاہیں راجا ہریش چندر کی جانب اُٹھ گئی تھیں کہ وہ کچھ بولے، لیکن راجا ہریش چندر تو للچائی ہوئی نظروں سے اوپر والی بالکونی کو ہی دیکھ رہا تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے وہ دنیا کی ساری باتیں بھول کر اور اپنی بکھری ہوئی طاقت کو سمیٹ کر چلّایا ”کھانا لاؤ میرے لیے...... چائے حاضر کرو...... جلدی۔“

”کٹ...... کٹ!“ ڈائریکٹر نے جلدی سے کیمرا بند کرایا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر فرش پر بیٹھ گیا۔ پھر ایک زبردست گالی اس کے منہ سے نکلی ”سالے تیری تو...... ابے اور کتنا مڑیل کھائے گا حرامی!“

”خبردار! جو آگے کچھ کہا تو......“ راجا نے شیر کی طرح گرج کر کہا اور پھر اپنی جگہ سے اُٹھ کر ڈگمگاتے قدموں سے ڈائریکٹر کے سامنے آ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کی آواز سے اسٹوڈیو کا فلور گونج اُٹھا تھا۔ ایسی بھیانک گرج کسی انسان کے منہ سے آج تک کسی نے نہیں سنی تھی۔ راجا ہریش چندر نے ڈائریکٹر کے سامنے کھڑے ہوکر کہا ”حکم کی تعمیل ہو...... فوراً میرے لیے کھانا لاؤ۔ جاؤ کھڑے کھڑے میرا منہ کیا دیکھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

رہے ہو۔ جلدی کرو.....'' یہ کہتے کہتے وہ کھڑے ہی کھڑے ڈولنے لگا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بخار، بھوک اور نقاہت کی وجہ سے وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے۔ ڈولتے ڈولتے وہ خود کو سنبھال نہیں پایا اور یکایک ہی گر کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے فرش پر گرتے ہی سارے لوگ اس کی طرف دوڑ پڑے اور وہ فرش پر پڑے پڑے اپنی نیم جان آنکھوں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے ہر آدمی کے ہاتھ میں کھانے کی بھری ہوئی پلیٹ اور گرم گرم چائے کا ایک ایک کپ نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے زمین پر لیٹے لیٹے ایک بار پھر زور سے بولنے کی کوشش کی لیکن اس بار اس کے گلے سے ایک بے حد مدھم سی آواز نکل پائی

''کھانا..... چا..... ئے..... میں راجا ہوں، راجا ہریش.....''

دھیرے دھیرے اس کے کانوں میں سیکڑوں برتنوں اور چائے کی پیالیوں کی کھڑکھڑاہٹ کی آوازیں گونجنے لگیں مگر اب تو وہ جہاں پڑا تھا وہاں سے ہل بھی نہیں پا رہا تھا۔

دن بھر کی شوٹنگ ضائع ہونے اور ہزاروں روپوں کا نقصان ہو جانے پر ڈائریکٹر، پروڈیوسر اور اسسٹنٹ وغیرہ دیپ راؤ عرف راجا ہریش چندر کو طرح طرح کی گالیاں دے رہے تھے لیکن اب راجا شاید ان گالیوں کو سن ہی نہیں رہا تھا، سن کر بھی ان سنی کیے چپ چاپ زمین پر پڑا تھا۔ فلور میں ایک ہنگامہ سا مچا ہوا تھا۔ شوٹنگ کینسل ہو چکی تھی۔ درباری بنے ہوئے ایکسٹراز فلور سے باہر نکل گئے تھے، صرف ایک دو ہی آدمی اب بے ہوشی کی حالت میں پڑے ہوئے راجا ہریش چندر کے پاس بیٹھے تھے۔

اچانک ڈائریکٹر نے اپنے ایک اسسٹنٹ سے تیز آواز میں کہا ''ابھی یہ بے ہوش نہیں ہوا ہے، اس کے منہ میں پانی کے چھینٹے مارو اور راجا کا کاسٹیوم اس کے جسم پر سے اُتار لو تا کہ کل کسی اور ایکسٹرا کو راجا بنا کر سین کی شوٹنگ کی جا سکے۔''

لیکن اب راجا کو کوئی بھی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ دنیا کی سب ہی آوازیں اس کے لیے ڈوبتی جا رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے آنسو کی دھاریں اس کے گالوں پر سے لڑھکتی ہوئی اس کے ہونٹوں کو تر کر رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے آنسو ہی اس کی پوری زندگی کی پیاس بجھا رہے ہوں..... دھیرے دھیرے وہ کسی انجان سے اندھیرے میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔

ایک لاکھ کی ہیروئن اور پچاس ہزار کا ولن دونوں اکتا کر ایک کونے میں رکھے ہوئے صوفے پر بیٹھ کر چائے پی رہے تھے، ان دونوں کے قریب ہی ڈائریکٹر اپنا سر تھامے بیٹھا تھا جبکہ پروڈیوسر جھک کر اس سے کچھ کہہ رہا تھا ''بابا ابھی شوٹنگ کینسل مت کرو..... تھوڑی دیر انتظار کر لو۔ وہ ابھی ہوش میں آ جائے گا۔''

''اب ہوش میں آ کر بھی کیا کر لے گا وہ؟'' ڈائریکٹر جھلائے ہوئے لہجے میں بولا ''وہ اول فول بک رہا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ پاگل ہو گیا ہے۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا موہن لال!'' پروڈیوسر اس کا شانہ تھپتھپا کر اسے تسلی دیتے ہوئے بولا ''تم جب تک بیٹھ کر چائے پیو..... میں اسے دیکھتا ہوں۔'' کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اصل میں پروڈیوسر کو اپنے آج کے ہونے والے نقصان کی فکر ستا رہی تھی۔ اس لیے وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح آج کا کام کل پر نہ ٹل جائے۔ وہ دل ہی دل میں راجا ہریش چندر کے ہوش میں آنے کی دعائیں مانگ رہا تھا۔

پروڈیوسر بھاگتا ہوا جب فرش پر پڑے ہوئے راجا کے پاس آیا تو اس کے پاس بیٹھے ہوئے دو ایکسٹرا لڑکوں میں سے ایک نے پروڈیوسر سے کہا ''مجھے لگتا ہے یہ کئی دن کا بھوکا ہے اور آج صبح اس نے ایکسٹرا سپلائر جان محمد سے پانچ روپے ایڈوانس بھی مانگے تھے، چائے پینے کے لیے مگر اس نے اسے پیسے نہیں دیے۔''

''تو اب کیا، کیا جائے؟'' پروڈیوسر نے پوچھا۔

''اس کے لیے کچھ کھانے کے لیے منگوائیں اور چائے بھی، شاید کھا پی کر یہ تازہ دم ہو جائے......''

''ہاں، ہاں۔'' دوسرے ایکسٹرا نے کہا ''یہ مکالمے بولنے کے بجائے کھانا اور چائے ہی تو مانگ رہا تھا۔''

''اچھا......!'' پروڈیوسر حیرت سے بولا، پھر اس نے گھوم کر ایک اسسٹنٹ سے کہا ''جلدی جاؤ اور کینٹین سے ایک پلیٹ بریانی اور چائے لے آؤ۔''

اسسٹنٹ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد وہ کھانا اور چائے کی ٹرے لے کر واپس آ گیا لیکن اب راجا ہریش چندر کے جسم میں کوئی جنبش نہیں ہو رہی تھی۔ چائے اور بریانی کی پلیٹ جو اس کے لیے منگوائی گئی تھی، وہ پاس ہی پڑی تھی اور پروڈیوسر اس سے پیار بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا ''اٹھو راجا..... کھانا آ گیا ہے، اٹھ کر کھا لو۔''

لیکن اب راجا ہریش چندر عرف دیپ راؤ میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ اُٹھ کر بیٹھ سکے۔ اس کا جسم تو بالکل ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ وہ چائے کی..... پیالیوں اور بریانی کی پلیٹ کو آخری سلام کر کے دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔

سنہرا ماضی

مختار آزاد

ہر قوم اپنے ماضی پر فخر کرتی ہے کیونکہ ماضی کی کوکھ میں عہد گزشتہ کی شاندار یادیں جو محفوظ ہوتی ہیں۔ آج کا کیوبا جو کبھی غلاموں کا دیس تھا، جہاں سونے اور چاندی کی کانیں تھیں۔ جہاں کے جہاز آدھی دنیا کے سمندر پر فتح و نصرت کے گیت گایا کرتے تھے۔

باذوق قارئین کے لیے معلومات بھرا تحفہ

کیوبا کے دارالحکومت ہوانا کی سرزمین کو چھونے والے سمندر کے کنارے واقع اُس عمارت کا محافظ خاموشی سے مڑا اور میرے لیے یہاں کے سب سے اہم اور بیش قیمت نوادرات سے اَٹے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ یہ کمرا اور دروازہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے کہ کسی بہت ہی بڑے بینک کا سیف روم، جہاں اُس بینک کی ساری دولت جمع ہوتی ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ویسے اُس کمرے میں جتنی دولت رکھی ہوئی تھی، اُس کی حفاظت کے لیے بینک جیسا ہی محفوظ انتظام درکار تھا۔

عرفِ عام میں آج کے ہوانا کی وجۂ شہرت ہاتھ سے بنے روایتی مگر بہت ہی مہنگے سگار ہیں۔ وہ سگار جن سے پینے والے کے مرتبے اور مالی حیثیت تک کا اندازہ ہوجاتا ہے لیکن میں یہاں سگار والے ہوانا کو دیکھنے...... نہیں بلکہ قیمتی دھات، سونے والے غلام مُلک کی کھوج میں پہنچا تھا اور اب اُس کمرے میں ہوانا کا سنہرا ماضی میری نگاہوں کے سامنے تھا۔

یہ کمرا سونے سے بنے مختلف اقسام کے نوادرات اور انمول ہیرے جواہرات سے بھرا ہوا تھا۔ سونے کی اینٹوں سے لے کر، گلے کی زنجیر، برتن، آرائشی اشیا، نفیس مجسمے، ٹوتھ پک، مختلف اقسام کے ہیرے، جواہرات اور قیمتی پتھر...... جو نہایت محفوظ اور مضبوط شیشے سے بنی الماریوں میں سجے ہوئے تھے۔ تیز روشنی میں سونے کی جگمگاہٹ اور ہیرے جواہرات کی مچلتی کرنوں سے میری آنکھیں چُندھیا رہی تھیں۔

آج یہ ہوانا کے وہ بیش قیمت اور انمول نوادرات تھے جن کی بدولت کبھی اسپین کا بادشاہ اور اس کا شاہی خزانہ دنیا بھر میں نہایت طاقتور سمجھے جاتے تھے مگر اب اُس خزانے کا کافی بڑا حصہ اُس کیوبا کے عوام کی ملکیت ہے جو کبھی صدیوں تک اسپین کی نوآبادی رہے تھے۔ یہ خزانہ شاہِ اسپین کے خزانے سے لوٹ کر یہاں جمع نہیں کیا گیا ہے بلکہ اسے سیکڑوں غوطہ خوروں نے کئی دہائیوں کی کڑی محنت کے بعد، سمندر کی تہ سے نکال کر اس میوزیم میں رکھا ہے۔ یہ وہ نوادرات ہیں جنہیں صدیوں پہلے لاطینی امریکا اور ایشیا سے بحری جہازوں پر لاد کر اسپین کے شاہی خزانوں تک پہنچایا جاتا تھا۔ اکثر جہاز صحیح سلامت اسپین کی بندرگاہ تک پہنچ جاتے تھے لیکن مال و دولت سے لدے کئی بدقسمت جہاز ایسے بھی ہوتے تھے جو سفر کے دوران بدقسمتی سے کیوبا کے سمندر میں حادثات کا شکار ہوئے اور یوں یہ خزانہ شاہی مال خانے میں جمع ہونے کے بجائے تہِ آب چلا گیا۔ سمندر کی تہ سے نکالا گیا یہ خزانہ اتنا بڑا ہے کہ اگر اس کی مالیت طے کرلی جائے تو آج کیوبا کئی مالدار ملکوں سے کچھ زیادہ ہی مالدار نکلے گا۔ شاید ہی دنیا کے کسی اور میوزیم میں اس طرح کے بیش قیمت نوادرات اتنی بڑی تعداد میں موجود ہوں۔

میں کافی دیر تک نوادرات کی دولت کے نظارے میں محو رہا۔ میوزیم کے اُس بیش قیمت ہال نما کمرے میں کافی وقت گزارنے کے بعد جب میں باہر نکلا تو مستعد محافظ نے نہایت چابکدستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً ہی دروازہ بند کردیا۔ شاید کوئی خوف انہیں ایسا کرنے پر مجبور کررہا تھا۔ ویسے انہیں ایسا ہی کرنا چاہیے تھا، آخر کو یہ دولت دوسروں کی تھی اور میں بھی تو اس سرزمین پر ایک اجنبی ہی تھا۔

"کچھ اور بھی دیکھنا چاہیں گے؟" مجھے یہ بیش قیمت اور نادر کمرا دکھانے والے کیوبا کے ایک بحری ماہرِ آثارِ قدیمہ نے نوادرات میں میری دلچسپی، حیرت اور اشتیاق کو محسوس کرلیا تھا۔ شاید اسی لیے کمرے سے باہر نکلتے ہی انہوں نے فوراً پیشکش کردی۔

"کیا اس کے علاوہ ابھی اور بھی کچھ دیکھنے کو باقی رہ گیا ہے؟" میں نے پیشکش سُن کر حیرانی سے سوال کیا۔ جو کچھ میں دیکھ کر آرہا تھا، مجھے تو وہی بہت کچھ لگا مگر اب اس کی بات سُن کر تو واقعی میرے کان کھڑے ہوگئے تھے۔

"بہت کچھ ابھی دیکھنا اور دکھانا باقی ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

میں کیوبا کا ماضی کھنگالنے کے لیے ہی یہاں آیا تھا۔ کسی بھی تہذیب اور مُلک کے ماضی کو بہتر انداز میں سمجھنے کے لیے اُس کے میوزیم کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں، اسی لیے کیوبا کے ماضی کے یہ آثار میری دلچسپی کا بنیادی محور تھے۔ "میں ہر وہ چیز دیکھنا چاہوں گا، جو تمہاری سرزمین کے شاندار ماضی کو سمجھنے میں میری مدد کرے۔" میں نے ماہرِ آثارِ قدیمہ سے کہا تو وہ مسکرا دیا۔

"جانتا ہوں۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔ "میرے ساتھ آیئے۔" اُس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے پیچھے چلنے کے لیے کہا۔ میں خاموشی سے اس کی پیروی کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد ہم میوزیم کی وسیع و عریض عمارت میں واقع الگ تھلگ سے بنے ہال میں پہنچ چکے تھے۔

یہاں مختلف اقسام کے بحری آلات، ساز و سامان اور وہ دیگر نوادرات رکھے تھے جو گزشتہ چار صدیوں کے دوران آج کے کیوبا کی سرحدوں میں شامل سمندر میں تہِ آب ہوگئے تھے۔ اب جنہیں کیوبا کے باہمت غوطہ خور صدیوں بعد سمندر کی کوکھ سے نکال کر یہاں لا رہے ہیں۔

"یہاں تم گزشتہ چار صدیوں کے دوران بحیرۂ کریبین کے سینے پر رواں دواں بحری جہازوں کی بناوٹ، سفر میں رہنمائی کے آلات اور آبی رہ گزر کے نقشوں کا مطالعہ بھی کرسکتے ہو۔" ماہرِ آثارِ قدیمہ نے نہایت سکون سے کمرے کا

تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ "یہی نہیں...... یہاں ان ساز و سامان کے اصل نمونے بھی موجود ہیں جو اسپین بحری جہازوں کے لیے دنیا بھر کے مختلف ممالک سے درآمد کیا کرتا تھا۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ یہ کمرا بھی نوادرات سے اَٹا ہوا تھا۔ اگرچہ میوزیم کے اس حصے میں موجود نوادرات، سونے اور ہیرے جواہرات کی طرح تو قیمتی نہیں تھے لیکن نوادرات کی اہمیت میں وہ معمولی بھی ہرگز نہیں تھے۔

میوزیم میں موجود یہ سامان کبھی اسپین کو برآمد کیا گیا تھا اور بحری قزاقوں، ناقص جہاز رانی یا حادثات کے باعث، صدیوں پہلے کے مختلف ادوار میں یہ تہِ آب ہوچکا تھا لیکن پھر بھی جو کچھ تباہ ہونے سے بچ گیا تھا، اب کیوبا کے غوطہ خور اسے سمندر سے نکال کر ہماری نظروں کے سامنے لے آئے ہیں۔ اس ساز و سامان کو دیکھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قرونِ وسطیٰ کے اختتام پر اسپین کتنے شاندار انداز میں عالمی طاقت کے طور پر اُبھرا ہوگا اور اس کا شاہی حکمران اور اشرافیہ کس انداز کی زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ آج تو یہ نوادرات انمول ہیں لیکن ماضی کے اُن ادوار میں بھی، ان میں سے ایک، ایک چیز کی قیمت اتنی زیادہ ہوتی ہوگی کہ کوئی عام آدمی تو شاید انہیں چھونے کا حوصلہ بھی اپنے اندر پیدا نہیں کرپاتا ہوگا۔

کئی گھنٹے اس جگہ گزارنے کے بعد جب میں نوادرات کے حصار اور ہال کی چار دیواری سے باہر نکلا تو سہ پہر ڈھل چکی تھی۔ میں میوزیم سے تو باہر آچکا تھا لیکن اب بھی میرا دل اور دماغ، دونوں اُن نوادرات کے سحر میں جکڑے ہوئے تھے۔

☆☆☆

اگلے دن سہ پہر کو میں اَل مورّو کی طرف نکل گیا۔ ہوانا کی بندرگاہ پر کئی صدیوں پہلے تعمیر ہونے والا یہ لائٹ ہاؤس آج بھی شہر کی زندگی میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ یہ لائٹ ہاؤس ایک قلعے کے ساتھ تعمیر کیا گیا تھا۔ قلعہ، جس کی چوڑی فصیلوں اور داخلی دروازوں پر کبھی ہسپانوی سنتری دن رات مستعدی سے پہرا دیا کرتے تھے۔

لائٹ ہاؤس سے متصل، قلعے کے ایک ہال نما کمرے کی دیواروں پر لگے فریم اور شیشے کے پٹوں والی الماریوں میں اٹھارویں صدی کے ان سپاہیوں کی وردیاں، ہتھیار، جوتے اور دیگر اس دور کا ساز و سامان محفوظ ہیں، جنہیں دیکھنے کے لیے ہوانا آنے والے سیاح بڑے شوق سے یہاں کا رُخ کرتے ہیں۔ اس قلعے کا نام "کیستیلو دی سان کارلوس دی لا کبانا" ہے۔

کرمان شہر اور صوبہ کے گورنر شاہزادہ ابراہیم خان سے ملاقات کے لیے محل پہنچے۔ اس ملاقات کے اگلے دن میں وزیر کے ہاں حاضر ہوا۔ اس نے مجھے اگلی شام کھانے کی دعوت دی جو میں نے منظور کرلی۔ جب میں شام اس کے گھر پہنچا تو سب سے پہلے قلیان لایا گیا۔ یہ دو قسم کا ہوتا ہے۔ قرنی اور دستو یا سانپ اور ہتھ قلیان۔ پہلا ہندوستان کے حقوں کی طرح پیچواں ہوتا ہے اور چمڑے کا بنا ہوتا ہے اور دوسرا جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، ہاتھ میں پکڑ کر ایک چھوٹی سی نالی سے پیا جاتا ہے جو اکثر سونے یا چاندی کی ہوتی ہے اور اس پر خوبصورت میناکاری کی جاتی ہے۔ وہ باری باری پیے جاتے ہیں اور ان میں تازہ تمباکو دھرا جاتا ہے تاکہ ہر حقہ نوش ایک وقت پر دس بارہ کش کھینچ سکے۔ جب ہاتھ دھلا دیے گئے تو اکل و شرب کا آغاز ہوا۔ پہلے مٹھائی اور دو قسم کا قہوہ لائے گئے۔ ان میں سے ایک میٹھا قہوہ کہلاتا ہے جو شربت اور مختلف قسم کے پھلوں کے رس سے تیار ہوتا ہے۔ یہ اور اصلی قہوہ چھوٹی چھوٹی چینی پیالیوں میں پیش کیے جاتے ہیں۔ ہر پیالی میں میز کے چمچے کے برابر قہوہ دیا جاتا ہے اور عموماً اسے زریں یا نقرئی پرچ میں رکھ کر پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد انواع و اقسام کے پھل، اچار اور مربہ جات تازہ اور خشک حالت میں پیش کیے گئے اور اس کے ساتھ ہی طشتریوں میں شربت کے جام تھما دیے گئے جن کے ساتھ ایک بڑی چوبی قیف لگی ہوئی تھی تاکہ ہر شخص حسبِ منشا پی سکے۔

لیفٹیننٹ ہنری پوٹنگر کے 1816ء میں لکھے گئے "سفرنامہ بلوچستان اور سندھ" سے اقتباس

تلاش جمیل صدیقی، کراچی

قلعے کے داخلی دروازے کے اوپر ایک توپ رکھی ہوئی ہے جو ہسپانوی نوآبادی کے دور میں غروبِ آفتاب کے وقت داغی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ توپ کا داغنا اس بات کا اعلان ہوتا تھا کہ فصیل کے داخلی دروازے بند کردیے جائیں مگر اب یہ ہر شام سیاحوں کی تفریح کے لیے داغی جاتی تھی۔ اب توپ داغنے کا مطلب فصیلِ شہر کے دروازے بند کرنا نہیں بلکہ آنے والے سیاحوں کو خوش آمدید کہنا ہے۔ آج ہر شام سیکڑوں سیاح اور خود مقامی باشندے یہ منظر دیکھنے کے لیے یہاں آتے ہیں اور جیسے جیسے رات کی سیاہی پھیلتی جاتی ہے،

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

قلعے میں ناؤنوش کی دُکانوں، فصیل کے احاطے اور اس کی چوڑی ..... دیواروں پر رونق بڑھتی چلی جاتی ہے۔ آج بھی قلعے کی فصیلوں پر گزرے کل کی طرح، رات کی تاریکی میں قدموں کی چاپ سُنائی دیتی ہے مگر کل یہ چاپ سنتریوں کی ہوا کرتی تھی، آج یہ چاپ لائٹ ہاؤس کی روشنی اور سمندر کی پُرشور موجوں سے لطف اندوز ہونے والے سیاحوں کے قدموں کی ہوتی ہے۔ سمندر کی تیز موجیں جب قلعے کی فصیل سے ٹکرا کر پلٹتی ہیں تو لائٹ ہاؤس کی روشنی میں ان سمندری موجوں کا نظارہ بہت خوبصورت لگتا ہے۔ کم از کم مجھے تو رات کی تاریکی میں پُرشور موجوں کا نظارہ اور اس کی زوردار گونج...... دونوں ہی بہت مسحور کُن محسوس ہوئے تھے۔

ہوانا کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک وہ جو شہر کا پُرانا حصہ ہے اور دوسرا جو بڑھتی ہوئی آبادی کے باعث پھیلتا گیا اور نیا شہر کہلایا۔ پُرانا شہر ساحل سے متصل ہے۔ ساحل کے ساتھ ہی ایک شاندار محل نما عمارت موجود ہے۔ یہ کیپٹن جنرل کا محل ہے۔ کبھی اس محل میں یقیناً اسپین کی شاہی سرکار کے کیپٹن جنرل ہی رہا کرتے تھے لیکن جب نوآبادیاتی دور سے ملک کو آزادی ملی تو یہ سرکار کیوبا کے استعمال میں آیا اور یہاں پر حکومتِ کیوبا کی افسر شاہی کا ہیڈکوارٹر بنادیا گیا مگر یہ دور بھی گزرا اور جب ہوانا کے ماضی کو محفوظ کرنے کی بات آئی تو یہی محل نظروں میں سمایا۔ اسپین کے تسلط سے کیوبا کو آزادی ملنے کی کئی دہائیوں کے بعد جب میں ہوانا پہنچا تو کیپٹن جنرل کا محل میوزیم بن چکا تھا۔ اب یہ کہلاتا ہے 'شہر کا میوزیم'۔

کورل لائم اسٹون سے بنی یہ عمارت قدیم ہسپانوی طرزِ تعمیر کا شاہکار اور نہایت پُرشکوہ ہے۔ یہ عمارت گزرے کل میں ہوانا کے شاندار ماضی کو بیان کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ آسمان پر رات کی تاریکی چھا جاتی ہے تو عمارت جھلملاتی روشنی میں ستاروں کی طرح جھلمل کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ عمارت کا عکس ساحل کے پانی پر بھی نظر آتا ہے۔ یہ عمارت سیاحوں کے لیے کشش کی حامل ہے اور ہوانا آنے والے سیاح اس عمارت کو دیکھے بنا یہاں سے نہیں جاتے۔ سیاحوں کی دلچسپی کے باعث میوزیم رات کو بھی دیر گئے تک کھلا رہتا ہے۔ عمارت کی دلکشی میں اضافے کے لیے اُس پر اس طرح کے زاویوں سے روشنی ڈالی جاتی ہے کہ عمارت دُور سے ہی نظر آنا شروع ہوجاتی ہے۔

میں رات کی تاریکی پھیل جانے کے بعد میوزیم کی عمارت میں داخل ہوا۔ میں یہاں کسی سے ملنے کے لیے آیا تھا لیکن ساتھ ساتھ رات کے اندھیرے میں رنگ برنگی روشنیوں میں جھلملاتی عمارت کا نظارہ بھی کرنا چاہتا تھا۔ واقعی اس عمارت کے بارے میں، یہاں آنے سے پہلے جو کچھ سُنا تھا، حقیقت یہ ہے کہ اُسے سنی سنائی باتوں سے کہیں بڑھ کر پایا۔

میوزیم کی عمارت ایک بہت بڑے قطعۂ اراضی کے بیچوں بیچ واقع ہے۔ عمارت کے اردگرد وسیع وعریض سبزہ زار ہے اور رہ گزر کے دونوں اطراف ناریل کے اونچے اونچے درخت لگے ہوئے ہیں۔ میں پیدل چلتا ہوا عمارت کے احاطے میں داخل ہوا اور ناریل کے دورویہ درختوں کے بیچ بنی پختہ رہ گزر پر چلتا ہوا عمارت کے شاندار مرکزی حصے میں داخل ہوا اور پتھر سے بنی سیڑھیوں پر چڑھتا چلا گیا۔ انہی سیڑھیوں پر چلتے ہوئے مجھے دوسری منزل پر واقع گیلری سے گزر کر اُس کمرے تک پہنچنا تھا، جہاں میوزیم کے کرتا دھرتا اور ہوانا کی تاریخ کے معتبر مؤرخ یوسیبو لیل اسپنگلر میرے منتظر تھے۔

اسپنگلر نہایت گرمجوشی سے ملے۔ پستہ قامت وہ شخص نہایت نفیس سوٹ میں ملبوس تھا۔ ان کی آنکھوں میں علم کی روشنی اور چہرے پر سمندر جیسا گہرا تاثر موجود تھا۔ یقیناً یہ تاثر اس بات کی غمازی تھی کہ وہ اپنے ذہن و دل میں ہوانا سے متعلق علم کا گہرا سمندر لیے ہوئے ہے۔ میں علم کے اس سمندر میں طوفان برپا کرنے کے لیے ہی ان کے پاس پہنچا تھا تاکہ علمِ تاریخ کی بپھری موجوں سے اپنے پیاسے اور متلاشی ذہن کو سیراب کرسکوں۔ میں ہاتھ ملاتے ہی مطلب کی بات پر آگیا۔ ''ہوانا کے ماضی کے جو زر و جواہر میں دیکھ کر آرہا ہوں، وہ تو اس شہر کو تاریخ میں بہت ہی مالدار ثابت کرتا ہے۔''

''بہت بے چین ہو اس شہر کا ماضی جاننے کے لیے۔'' اسپنگلر نے میری بات کا جواب دینے کے بجائے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''بے چین تو ہوں مگر اس لیے کہ یہاں اسی کام سے آیا ہوں۔'' میں نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''تو پھر سنو......'' اسپنگلر نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''شہر ہوں، ملک یا پھر قوم، حاکم کا ایک فیصلہ صدیوں پر اثر انداز ہوجاتا ہے، تقدیر بدل دیتا ہے آنے والی کئی صدیوں کی۔ یہی کچھ ہوانا کے ساتھ بھی ہوا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ چند لمحے کے لیے رُک کر کچھ سوچتا رہا۔ صدیوں پہلے فلپ

دوئم نے ایک فیصلہ کیا اور پھر شہر نے تاریخ کا دھارا کسی اور جانب موڑ دیا۔'' اسپنگلر کا لہجہ اور انداز، دونوں عالمانہ تھے۔ اس کی باتوں میں تدبر جھلک رہا تھا۔

''فلپ دوئم نے کیا فیصلہ کیا تھا؟'' میں نے سوال کیا۔

''اُس نے حکم دیا تھا کہ اسپین کے شاہی خاندان کے لیے دنیا کے مختلف ملکوں سے خزانہ لے کر پہنچنے والے تمام بحری جہاز پہلے ہوانا کی بندرگاہ پر اکٹھا ہوں گے، اُس کے بعد اسپین کی جانب سفر کریں گے۔'' اسپنگلر نے تفصیل سے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''تم جانتے ہو اُس خزانے میں کیا کیا ہوتا تھا جنہیں وہ بحری جہاز اپنے ساتھ لے کر یہاں پہنچا کرتے تھے؟''

''نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ریشم، صندل کی لکڑی، چاندی، زمرد، ہیرے جواہرات اور اسی طرح کی دیگر قیمتی اشیا جو چین اور ایشیا کے دیگر ممالک سے اسپین کے شاہ اور شاہی خاندان کے لیے درآمد کی جاتی تھیں۔'' اسپنگلر نے تفصیل سے بیان کیا۔

فلپ دوئم نے 1556ء سے 1598ء تک اسپین پر حکومت کی۔ یہ اسپین کا نہایت طاقت ور بادشاہ گزرا ہے۔ اس دور میں اسپین کی سلطنت نے کافی وسعت پائی۔ کہتے ہیں اُس کی حکومت میکسیکو، امریکا اور فلپائن تک پھیلی ہوئی تھی۔ دنیا کا بہت بڑا رقبہ اُس کے نوآبادیاتی تسلط میں تھا۔ تاریخ میں تو یہاں تک بیان کیا گیا ہے کہ اُس دور تک دریافت شدہ ساری دنیا پر شاہ فلپ دوئم کا حکم چلتا تھا۔ اسی لیے اُس دور میں مثل مشہور ہو چکی تھی کہ 'فلپ دوئم کی مملکت میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا۔' بعد میں یہی مثال انگلستان پر لاگو کی جانے لگی تھی۔ وہ انگلستان جو کبھی اسپین کا دشمن تھا لیکن ہندوستان پر قبضے کے بعد اس نے خود یہی لقب اختیار کرلیا۔ اسپین ہو یا انگلستان، سورج کو تو غروب ہونا ہی ہے۔ البتہ غروب آفتاب میں کچھ دیر سویر ضرور ہوجاتی ہے۔ کبھی کبھار یہ دیر سویر صدیوں پر محیط ہوجاتی ہے۔ البتہ قوم جتنی زیادہ غیرت مند ہو، دیر اُسی لحاظ سے سویر میں بدل جاتی ہے۔

فلپ دوئم کے فیصلے کے کچھ ہی عرصے ..... بعد اس کے اثرات بھی نظر آنے لگے۔ اس فیصلے کے نتیجے میں ہوانا کی بندرگاہ، بحیرۂ کریبین میں اسپین کا سب سے مضبوط بحری اڈا بن چکا تھا۔ دنیا کے مختلف حصوں سے آنے والے مال بردار بحری جہاز بڑی تعداد میں یہاں آکر لنگر انداز ہونے لگے۔ تجارتی سرگرمیوں کے باعث شہر کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا اور یوں یہ شہر دنیا کا ایک اہم تجارتی شہر بن گیا۔ کہتے ہیں کہ دنیا کے مختلف حصوں سے قیمتی ساز و سامان لے کر اسپین جانے والے درجن سے بھی زائد بحری جہاز صرف ایک دن میں ہوانا کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا کرتے تھے۔

کیوبا 388 برس تک اسپین کی نوآبادی رہا۔ آخر آزادی کی تحریک چلی اور پھر یکم جنوری، 1899ء کی صبح کو آخری بار اسپین کا پرچم ہوانا کی سرزمین پر واقع اُس عمارت پر لہرایا، جہاں آج میں بیٹھا ہوا تھا مگر اُس وقت یہاں اسپین کی شاہی سرکار کے کیپٹن جنرل برائے کیوبا براجمان تھے۔ جونہی غروبِ آفتاب ہوا، توپیں داغی گئیں، شاہِ اسپین کے وفادار سپاہیوں نے سلامی دی اور پھر اس عمارت پر سے اسپین کا پرچم ہی نہیں اُترا، کیوبا کے گلے سے اسپین کی پونے چار سو سال سے زائد عرصے تک جاری رہنے والی غلامی کا طوق بھی اُتر گیا۔ غروب ہوتا ہوا سورج ڈوبتے ڈوبتے اس مُلک پر آزادی کا سورج طلوع کرگیا تھا۔

☆☆☆

ہوانا کے میوزیم میں جن کی دولت محفوظ ہے، خود اُن پر کیا گزری ہے، یہ جاننے کے لیے میں الفریڈو ڈیاز گمیز سے ملا۔ وہ سکّوں کے ذریعے تاریخ کے مطالعے کا ماہر ہے۔ ہوانا کے ماہرینِ آثار اُسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ویسے بھی الفریڈو کی اہمیت میری نظر میں اس لیے بھی تھی کہ دولت مندوں کی تاریخ تو ہمیشہ دولت کے پردے کے پیچھے پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس لیے اُن شاہوں، امیروں اور امیر زادوں کی تاریخ اُس شخص سے بہتر کون جان سکتا ہے جس کا کام ہی سونے چاندی کے سکّوں سے ہر عہد کی تاریخ کو کھنگال کر ...... سب کی نگاہوں کے سامنے لاتا ہے۔

پیر علی لکھنو کا مشہور رکاب دار جو حضور نظام کے باورچی خانے میں ملازم تھا، ایک نہایت قیمتی اور لذیذ ارہر کی دال پکایا کرتا جو اگلے فرماں روایانِ لکھنو کے باورچی خانوں میں پکا کرتی تھی اور سلطانی دال سے مشہور تھی۔ پیر علی مٹھائی کے انار بناتا تھا جس میں اوپر کا چھلکا اندر کے دانے کی ترتیب اور ان کے بیچ کے پردے سب اصلی معلوم ہوتے تھے۔

اقتباس: دکنی کلچر از محمد نصیر الدین ہاشمی
انتخاب: نبیلہ اظہر، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

"تاریخ میں ہمارے لیے سبق پوشیدہ ہے اور یہ سبق ہمیں چاندی کے صرف ایک سکّے کا تجزیہ کرنے سے بھی مل سکتا ہے۔" الفریڈو خوش دلی سے ملا اور رسمی کلمات کے بعد جب تاریخ میں سکّوں کی اہمیت کی بات شروع ہوئی تو اُس نے کہنا شروع کیا۔

"ہمارے خطّے یا اُس وقت کی نئی دنیا میں لین دین کے لیے چاندی کے سکّوں کا رواج 1505ء میں شروع ہوا۔" الفریڈو نے پس منظر بیان کرنا شروع کیا۔ "یہ سکّہ دنیا بھر میں تجارت کے لیے بطور قوتِ خرید ہسپانوی حکمرانوں نے جاری کیا تھا۔ چاندی کے ان سکّوں کی ڈھلائی میکسیکو میں ہوتی تھی، جو اُس وقت چاندی کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ تھا اور بدقسمتی سے اسپین کی نوآبادیوں میں بھی شامل تھا۔ اسپین اُس وقت کی نئی دنیا کی سب سے بڑی مال دار قوت تھا اور اس کے سکّے کو قبول کرنے سے کوئی انکار نہیں کرسکتا تھا۔ ویسے بھی یہ سکّے چاندی کے تھے جو ہر دور میں قیمتی دھات رہی ہے۔ یہ سکّے بہت جلد مقبولِ عام ہوگئے۔ یہ سکّے وزن کے اعتبار سے مختلف مالیت میں تقسیم کیے گئے تھے۔ رفتہ رفتہ اُس وقت کی جدید مغربی دنیا میں ہی نہیں، مشرقِ بعید وغیرہ کے ملکوں میں بھی اسے تجارتی لین دین کے لیے عالمی کرنسی کے طور پر قبول کیا جانے لگا، جیسا کہ آج امریکی ڈالر قبول کیا جاتا ہے۔"

"چاندی کے ان سکّوں کا تجارت کی دنیا پر لین دین کا راج کب تک چلتا رہا؟" الفریڈو کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا تو میں نے پوچھ لیا۔

"یہ سکّے طویل عرصے تک راج کرتے رہے۔" الفریڈو نے بتانا شروع کیا۔ "حتیٰ کہ 1857ء تک یہ چاندی کے سکّے امریکا میں بھی بطور قانونی کرنسی کے طور پر مستعمل تھے۔ نارتھ ہیمپشائر میں اُس دور کے 13,392 چاندی کے سکّے میوزیم میں موجود ہیں۔ ان میں سے 1505 وہ سکّے ہیں جنہیں ڈوب جانے والے ایک تجارتی بحری جہاز سے نکالا گیا تھا۔ یہ جہاز سولہویں صدی عیسوی کا تھا۔ کیوبا میں بھی اُس دور کے چاندی کے یہ سکّے بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ یہ وہ سکّے ہیں جو کیوبا کی سمندری حدود میں صدیوں پہلے ڈوب جانے والے بحری جہازوں سے غوطہ خوروں نے نکالے ہیں۔"

"کیا یہ غوطہ خور سرکار کے ملازم ہیں؟" میں نے قطع کلامی کی۔

"جو کچھ ہمارے میوزیم میں آپ دیکھ کر آچکے ہیں، اُس کی بنیاد پر میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کے پیچھے پوشیدہ غوطہ خوروں کی اہمیت، محنت اور کردار کو آپ اچھی طرح جان چکے ہیں۔" اس نے میری طرف دیکھ کر یقین بھرے لہجے میں کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہمارا شاندار ماضی جو آپ سب کی نگاہوں کے سامنے میوزیم میں موجود ہے، وہ انہی غوطہ خوروں کا مرہونِ منت ہے۔ ان کی افادیت سے سرکار کو بھی انکار نہیں۔ اسی لیے کیوبا میں ایسے غوطہ خوروں کے لیے باقاعدہ طور پر ایک سرکاری محکمہ قائم کیا گیا ہے۔ Carisub نامی یہ ادارہ سرکارِ کیوبا کے تحت کام کرنے والے 'بحری آثار' نامی ادارے کے ماتحت ہے۔ جہاں بڑی تعداد میں ماہرینِ آثارِ قدیمہ دن رات تحقیقی سرگرمیوں میں سرگرم رہتے ہیں۔" الفریڈو تفصیل سے پس منظر سمجھانے کے بعد کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگیا۔

"کامیابی سے غوطہ لگا کر نوادرات باہر نکالنے کے لیے درست مقام کا تعین ناگزیر ہے۔ آپ کو کس طرح پتا چلتا ہے کہ کون سا بحری جہاز کہاں ڈوبا تھا؟" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میں نے سوال کیا۔

"صدیوں پہلے ہوانا کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہونے اور پھر اسپین کے لیے روانہ ہونے والے بحری جہازوں کا مکمل ریکارڈ رکھا جاتا تھا۔ یہ نادر ریکارڈ اب بھی موجود ہے۔" اس نے جواب دینا شروع کیا۔ "اسی ریکارڈ سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ کون سا بحری جہاز، کب ہوانا یا پھر اسپین کی بندرگاہ سے روانہ ہوا اور روانگی کے کتنے دن بعد وہ لاپتا ہوگیا۔ بس! ہم اسی ریکارڈ کی مدد سے سمندر میں مقام کا تعین کرکے تلاش شروع کردیتے ہیں۔ اکثر ہمارے اندازے درست ثابت ہوتے ہیں۔ ہمیں اکثر کامیابی ملتی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میرے ساتھ آؤ۔" یہ سنتے ہی میں بھی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

الفریڈو مجھے لیے ہوئے ایک بہت بڑے ہال میں پہنچا۔ یہ بالکل گودام جیسا منظر پیش کررہا تھا۔ ہر طرف سامان بکھرا ہوا تھا۔ "یہ سترھویں صدی کے ایک بحری جہاز سے ملنے والا سامان ہے۔ ماہرینِ آثار اس سامان پر تحقیق کررہے ہیں جس کے بعد انہیں میوزیم میں رکھوا دیا جائے گا۔"

الفریڈو کی بات سن کر میں اشتیاق سے آگے بڑھا اور اُس کاٹھ کباڑ کا جائزہ لینے لگا جو گزرے کل میں بیش قیمت ساز و سامان رہا تھا اور آنے والے کل میں ہوانا کے میوزیم میں نوادرات کی حیثیت پا جائے گا۔ اس کاٹھ کباڑ میں ہر طرح کا سامان نظر آرہا تھا۔ آرائشی مرتبان، کھانے پینے کے برتن، سوپ پینے کا چمچ، سوپ کا پیالہ، چینی مٹی سے بنی بڑی سی [illegible] جس کے بیچوں بیچ نہایت دلکش گلاب کا پھول [illegible] اس کے برابر تانبے کا بنا ہوا زیورات رکھنے کا [illegible] تھا جس کے ڈھکن پر مشاق دستکار نے نہایت [illegible] مہارت سے ہلال ابھارا تھا۔

"اس جہاز کی دلچسپ بات یہ تھی کہ اُس پر چاندی کے [illegible] بڑی تعداد میں لدے ہوئے تھے۔" الفریڈو نے [illegible] ایک بڑے سے لکڑی کے تختے کی طرف دلاتے ہوئے کہا۔ "یہ تختہ اُسی جہاز کا ہے۔"

"اچھا......" میں نے حیرت سے اُس لکڑی کے تختے کی طرف دیکھا جو صدیوں بعد سمندر کی تہ سے نکالا گیا تھا۔ "نہ جانے وہ جہاز کتنا شاندار رہا ہوگا۔" میں نے زیرِ لب کہا اور الفریڈو کی طرف دیکھا۔ "کوئی ایسا واقعہ جب تم نے کسی [illegible] بحری جہاز کے آثار دریافت کیے ہوں، جس کا تذکرہ ہوانا کی بندرگاہ کے ریکارڈ میں موجود نہ ہو؟"

"ہاں...... ایک بار ایسا ہوا ہے۔" اُس نے کچھ دیر [illegible] اور پھر وہیں کھڑے کھڑے مجھے اپنی زندگی کا یادگار واقعہ سنانا شروع کردیا۔ "ہوا یہ کہ اتنا تو ہوانا کے ریکارڈ سے پتا چلتا تھا کہ 1590ء میں 'نوزترا اسینورا دی روزاریو' نامی ایک بحری جہاز قیمتی ساز و سامان لے کر ہوانا کی بندرگاہ پر رُکا اور کچھ دن تک لنگر انداز رہنے کے بعد اسپین کی طرف روانہ ہوا مگر وہ منزل پر نہیں پہنچ پایا۔ اب مشکل یہ تھی کہ وہ جہاز کہاں پر ڈوبا ہوگا؟ ہمیں اُس مقام کا پتا نہیں چل پا رہا تھا۔ اتفاق سے ماہرینِ آثار کو کچھ ایسی دستاویز ملیں جو اسپین شاہی دربار کی خط و کتابت پر مشتمل تھیں۔ یہ دستاویز اُسی دور کی تھیں، جب جہاز لاپتا ہوا تھا۔ اتفاق سے ہمیں اس دستاویز سے ایک اشارہ مل گیا۔ یہ اشارہ ایک خط تھا جو جارج نامی شخص نے دربار کو لکھا تھا۔ اُس زمانے میں یہ سرکاری کارندہ تھا اور اسپین کی فوج کے توپ خانہ سے بطور سارجنٹ وابستہ تھا۔ دستاویز سے پتا چلا کہ وہ اس جہاز کے ڈوبنے کے واقعہ کا عینی شاہد تھا۔ اُس نے اپنے خط کے ذریعے دربار کو آگاہ کیا تھا کہ جہاز پر بحری قزاقوں نے حملہ کردیا تھا۔ وہ بڑی کشتیوں میں سوار تھے۔ انہوں نے جہاز کو چاروں طرف گھیر رکھا تھا۔ جارج نے اپنے بیان میں لکھا تھا کہ حفاظت اور ہمارے فوجی جہاز نے قزاقوں پر گولیاں چلائیں اور توپوں سے فائر کیے۔ جواب میں انہوں نے بھی گولے داغے۔ اس کشمکش میں جہاز کو بھی نقصان پہنچا اور وہ ڈوبنے لگا اور چند گھنٹوں کے اندر اندر وہ سمندر کی تہ میں بیٹھ گیا۔"

"لیکن اس خط سے کیسے پتا چلا کہ وہ کہاں غرقاب ہوا

سات سالہ زید اسکول جانے کی بجائے دوپہر کو کام کرتا ہے۔ وہ دوپہر کو موٹر سائیکل رکشا چلانے کے بعد کچھ دیر گدھا گاڑی پر پینے والا پانی بھی مختلف مقامات پر پہنچاتا ہے۔ اس کے بڑے خریدار دکاندار ہیں جو پینے کا پانی زید سے خریدتے ہیں۔ دو سال قبل پشاور میں ایک کار بم دھماکے کے نتیجے میں 125 افراد ہلاک ہوئے، ان افراد میں اس کا والد بھی تھا۔ اس کے والد کو اس دنیا سے رخصت ہوئے دو سال ہوچکے ہیں۔ وہ اسکول سے واپس آنے کے بعد کچھ دیر تک خیبر پختونخواہ کے شمالی علاقے کے ایک مشہور بازار میں چائے کی دکان پر بھی کام کرتا ہے جہاں سے اسے روزانہ دس روپے ملتے ہیں اور مہینے میں اسے تین سو روپے حاصل ہوتے ہیں۔

زید کا کہنا ہے کہ مجھے کام کرنا پسند نہیں ہے۔ میرا دل کرتا ہے کہ میرے ہاتھ میں ہر وقت کتابیں ہوں۔ ضابطہ خان بھی اسی گلی کی ایک دکان پر کام کرتا ہے جہاں دو سال قبل اس کا والد بم دھماکے کے نتیجے میں ہلاک ہوگیا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ میرا کوئی دوست نہیں ہے۔ میں یہاں کام صرف اس لیے کرتا ہوں کہ میری ماں مجھے یہاں بھیجتی ہے تاکہ ہمارے گھریلو اخراجات چل سکیں۔ میری ماں مجھے کہتی ہے کہ اب مجھے ہی اپنے بہن بھائیوں کا پیٹ پالنا ہے۔ ضابطہ خان کے دو چھوٹے بھائی بھی ہیں۔ ان میں ایک کا نام سجاد جس کی عمر 5 سال اور دوسرے کا نام عارف جس کی عمر 3 سال ہے۔

پاکستان میں جتنے بھی شہری دہشت گردی کی بھینٹ چڑھتے ہیں ان کے خاندانوں کا یہ دکھ کوئی نہیں ختم کرسکتا اور نہ ہی ان کی مدد کے لیے کسی نے بھی کوئی قدم اُٹھایا ہے۔ اندازے کے مطابق پاکستان کے قبائلی علاقوں سمیت چاروں صوبوں میں دہشت گردی سے 14700 افراد جاں بحق ہوچکے ہیں۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ خاندان کے سربراہ کے مرنے کے بعد اس خاندان کے معصوم بچے اپنے بہن بھائیوں کا پیٹ پالنے پر مجبور ہیں۔

اقتباس: فیملی میگزین، لاہور

مرسلہ: زور آور خان، پشاور

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا؟'' الفریڈو خاموش ہوا تو میں نے سوال کیا۔

''جارج نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ یہ واقعہ ہوانا کے مغرب میں آرگنوس کے قریب اس مقام پر پیش آیا جہاں چابی کی شکل میں چٹانیں موجود ہیں۔ بس اس ایک جملے سے ہمیں اندازہ ہوگیا کہ جہاز کے آثار کہاں پر ہوسکتے ہیں۔'' الفریڈو نے بتایا۔ ''ماہرین نے طے کیا کہ یہ مقام کیوبا کے شمال مغرب میں واقع سمندری چٹانوں پر مشتمل علاقہ ہوسکتا ہے۔ اسی اندازے پر انہوں نے تحقیق کی اور غوطہ خور پانی میں اُتار دیے۔ وہ بیس فٹ پانی کے اندر ہی گئے ہوں گے کہ ان کے آلات نے خبردار کرنا شروع کردیا کہ اردگرد لوہے کے ٹکڑے موجود ہیں۔ پھر چند گھنٹوں کی کوششوں سے انہوں نے سولہویں صدی کی آخری دہائی میں غرقاب جہاز کو ڈھونڈ نکالا۔''

''اتنی آسانی سے......'' یہ سن کر میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں......صرف سننے کی حد تک ورنہ یہ اتنا آسان بھی نہ تھا۔'' الفریڈو میری بات سن کر ہنس دیا۔ ''جس جگہ پر یہ آثار موجود تھے وہ آسان علاقہ نہیں۔ وہ مونگے کی چٹانوں پر مشتمل علاقہ ہے۔ چار، ساڑھے چار صدیوں پہلے ڈوبنے والا یہ جہاز مونگے کی چٹانوں میں شامل ہوگیا تھا۔ بڑی محنت اور جفاکشی کے بعد اس کے آثار کو سمندر سے باہر لانا ممکن ہوا تھا۔''

''اچھا...... یہ بات ہے۔'' میں نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے معصومیت سے کہا اور وہ ایک بار پھر مسکرا دیا۔

''مونگے کی چٹانوں کے سبب ہی جہاز کا ملبہ اور سامان بڑی حد تک محفوظ رہ پایا۔ جہاز کی لکڑی بھی خراب ہونے سے بچ گئی۔'' اس نے ایک بڑے سے تختے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''یہ دیکھو......اس لکڑی کو دیکھ کر کوئی کہہ سکتا ہے کہ ساڑھے چار سو سال سے زیادہ عرصے تک سمندر کے پانی میں پڑی رہی ہے۔''

''شاید نہیں......'' میں نے بھی الفریڈو کی دیکھا دیکھی اس تختے پر داہنا ہاتھ پھیرا اور پھر اس کی تائید کردی۔ ''جہاز پر سے نوادرات بھی ملے ہیں؟''

''ہاں......کافی سارے۔'' الفریڈو نے کہا۔

''کیا کچھ ملا ہے۔''

''شاہ فلپ دوئم کے زمانے کے چاندی کے سکے، سونے کی زنجیریں، زیورات، کئی بڑے اور قیمتی زمرد اور چاندی سے بنے ہوئے کئی جگ۔''

''واہ......''

''ہمیں ایک توپ بھی ملی ہے، یقیناً یہ وہی توپ ہوگی جو آخری بار بحری قزاقوں پر داغی گئی ہوگی۔'' الفریڈو نے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا۔ یہ زنگ خوردہ بڑی سی توپ تھی جس پر اتفاق سے اب تک میری نظر اس پر نہیں گئی تھی۔

''ہم نے جہاز کے کئی ایسے تختے بھی باہر نکال لیے ہیں جن پر چھرّوں کے نشانات ہیں۔ میرے خیال میں یہ قزاقوں پر چلائے گئے کارتوسوں کے ہی چھرّے ہوسکتے ہیں۔ اس سے جارج کی اس بات کی بھی تائید ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنے طمنچوں سے قزاقوں پر کارتوس داغے تھے۔'' الفریڈو اپنی دھن میں کہے...... جارہا تھا اور میں نہایت غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

کچھ دیر بعد میں ایک ایسی میز کے گرد کھڑا ہوا تھا جہاں دو حصوں میں چاندی کے سکے رکھے ہوئے تھے۔ ایک پر انگریزی حروف R کی شکل کا حرف کندہ تھا، جب کہ دوسرے سکوں پر یہ نشان نہیں تھا۔ ''اس نشان کا مطلب کیا ہے؟'' میں نے سکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے الفریڈو سے پوچھا۔

''جن سکوں پر نشان ہے، وہ 1605ء سے 1613ء کے درمیانی عرصے میں ڈھالے گئے تھے۔'' اس نے وضاحت کی۔ ''یہ ایک طرح سے امتیازی نشان تھا اُس دور کے سکوں کا۔ یہ بے نشان سکے نوزترا اسینورادی روزاریو سے ملے ہیں۔ یہ جہاز 1590ء میں ڈوبا تھا اور اس وقت تک سکوں پر امتیازی نشان کندہ کرنے کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا لہٰذا یہ بے نشان ہیں۔''

جب سمندر کے سینے پر رواں دواں ایک بحری جہاز ڈوبتا ہے تو اُس کے ساتھ ہی اس کے تمام تر ثبوت اور پس منظر بھی ڈوب جاتا ہے۔ اس کے بحری سفر کا ریکارڈ، لاگ بک...... سب کچھ مٹ جاتا ہے اُس تباہ ہونے والے جہاز کی طرح۔ رہی سہی کسر سمندر پوری کردیتا ہے۔ لکڑیوں کو آبی کیڑے کھا جاتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ وہ گلنے سڑنے لگتی ہے۔ ایسے میں اس پر لدا ہوا کچھ سامان ایسا بھی ہوتا ہے جو صدیوں بعد بھی اپنی آبی قبر میں بالکل اصل حالت میں موجود رہتا ہے۔ ماہرینِ آثارِ قدیمہ انہی اشیا کی بدولت اپنی تحقیق کو آگے بڑھاتے ہیں۔ دنیا بھر میں بحری آثار صرف ماہرین کی ہی دلچسپی کا سبب نہیں بلکہ لٹیروں کے لیے بھی پرکشش ہیں۔ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی سمندر میں جو چیز سو فیصد محفوظ رہتی ہے وہ ہے سونا، چاندی، ہیرے جواہرات وغیرہ، جن کی کھوج میں اکثر لٹیرے غوطہ خور سمندر کی تہ میں اپنی تلاش جاری رکھتے ہیں۔ کیوبا میں بھی کچھ کچھ ایسا ہی ہے۔ یہاں سمندر کے اندر تلاش کا زیادہ تر کام صرف

سرکاری غوطہ خور کرتے ہیں اور برآمد ہونے والے ہر سامان پر حکومت کے بعد صرف محکمہ بحری آثارِ قدیمہ کا حق ہوتا ہے۔ اسی لیے کیوبا کے سرکاری میوزیم سمندر کی تہ سے دریافت ہونے والے طرح طرح کے بحری نوادرات سے سجے ہوئے ہیں، جن میں سونا اور قیمتی پتھر نمایاں ہیں مگر پھر بھی لٹیرے غوطہ خور اکثر ہاتھ دکھا ہی جاتے ہیں۔

☆☆☆

کیوبا کی سرزمین صدیوں پہلے 'سونے کی سرزمین' کے طور پر اُس وقت مشہور ہوئی جب 1511ء میں ولاز کوئیز ڈی کوئیلر نے اس پر حملہ کرکے قبضہ کیا۔ وہ میکسیکو کا قبائلی باشندہ تھا اور نہایت لالچی شخص تھا۔ اسے سونے کی ہوس تھی اور اسی ہوسِ زر میں اُس نے کیوبا پر قبضہ کیا تھا۔ اس نے مقامی آبادیوں کو غلام بنایا اور اُن پر طرح طرح کے مظالم توڑے۔ وہ ان سے مرتے دم تک کام لیتا تھا اور اس کا صرف ایک ہی کام تھا......سونا تلاش کرو ڈھیروں سونا......اور بے چارے غلام اپنے اس ظالم آقا کے لیے کان کنی کرتے کرتے موت کی آغوش میں چلے جاتے تھے مگر پھر بھی آقا کی ہوس باقی تھی۔ کہتے ہیں کہ سونے کے سبب وہ اتنا مالدار ہوگیا تھا کہ دور دور تک کوئی اس کا ہمسر نہیں تھا۔

ڈھیروں سونا حاصل کرنے کے بعد ولاز نے اپنے قدم مزید آگے کی جانب بڑھائے۔ اس نے اپنے معتمدِ خاص کورٹیس کو اسپین بھیجا۔ اس کی منزل شاہی دربار تھا۔ اس نے کورٹیس کے ذریعے شاہ کے لیے سونے کے دو نہایت بھاری جڑاؤ ہار بطور تحفہ بھجوائے۔ یہ نہایت بیش قیمت ہار تھے۔ ایک ہار میں 185 اور دوسرے میں 172 زمرد اور دس بیش قیمت سچے موتی جڑے ہوئے تھے۔ یہ اسپین کا سونے سے پہلا تعارف تھا۔

کورٹیس کے ذریعے سونے سے متعارف ہونے کے بعد سونا خود شاہِ اسپین کے منہ کو بھی لگ گیا۔ اُس وقت کی عالمی طاقت تو وہ بننے ہی جارہے تھے، اب اس کے ذریعے انہوں نے اپنی دولت کو بھی دنیا کے سب ملکوں سے زیادہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ بعد کی دہائیوں میں وہ جہاں جہاں سے لوٹ سکتے تھے، چھین سکتے یا پھر چوری کرسکتے تھے، وہ ایسا کرتے رہے۔ سونا حاصل کرکے اس پر تاجِ اسپین کی مہر ثبت کرتے، جہاز پر لادتے اور پھر اسے شاہِ اسپین کے شاہی خزانے میں پہنچا دیا جاتا۔ اب ولاز دنیا بھر میں سب سے زیادہ سونا رکھنے والا شخص نہیں تھا۔ اُس کی انفرادیت پر پانی خاک ڈال گیا تھا البتہ شاہِ اسپین کا شاہی خزانہ سونے

میں نے ایک غیر معمولی تقریب دیکھی جو میرے قیام کراہان کے دوران دو تین دفعہ دُہرائی گئی۔ شام کے کوئی پانچ بجے کاروان سرائے کے چوک میں چار پانچ سو آدمیوں کا مجمع ہوتا اور ایک ملا وسط میں ایک منبر پر چڑھتا اور پھر نہایت بلند اور گرج دار آواز میں آنحضور کے داماد علیؓ کی مہمات و مصائب کا کچھ اس طرح ذکر کرتا کہ سب لوگ زار و قطار رونے لگتے۔ شروع شروع میں، میں ان کے اس نوحہ کو مصنوعی سمجھتا رہا لیکن جلد ہی یہ غلط ثابت ہوگیا۔ ملا پڑھتے پڑھتے رک جاتا اور کوئی دس منٹ تک آہ وزاری کرتا تھا اور حاضرین بھی ایسے ہی متاثر و مغلوب ہوتے تھے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں بھی اس منظر پر متاثر ہوتا تھا اور میرے آدمی بھی قریب قریب ایرانیوں کی طرح اشکبار ہوجاتے تھے۔ مجمع دس بارہ سالہ بچوں سے لے کر ستّر اسی سالہ بوڑھوں پر مشتمل ہوتا تھا اور ان سب کو یوں دردناک طور پر روتے دیکھ کر اس مذہب کے احترام وجلال کا معترف ہونا پڑتا تھا، جو اپنے پیروؤں پر اتنا کامیاب اثر رکھتا تھا۔

لیفٹیننٹ ہنری پوٹنگر کے 1816ء میں لکھے گئے ''سفرنامہ بلوچستان اور سندھ'' سے اقتباس

بلوچستان یا بلوچوں کا ملک روئے زمین کے اس حصے کو گھیرے ہوئے ہے جو 24.50 تا 30.40 عرض بلد شمالی اور 58.55 تا 67.30 طول بلد مشرقی کے درمیان واقع ہے۔ اس کے علاوہ اس کے ایک دو صوبے مشرق و مغرب کی طرف اتنی دور تک پھیلے ہوئے ہیں کہ ان کے صحیح حدود و طول بلد متعین نہیں کیے جاسکتے جب تک کہ میں ان کو علیحدہ علیحدہ بیان نہ کروں۔ یہ سارا بسیط علاقہ کسی وقت خانِ قلات کے والد نصیر خان کی مملکت تھا جو اسے ایرانی فاتح نادر شاہ نے 1739ء میں عطا کیا تھا اور اسے بیگلر بیگ بلوچستان کا لقب بھی دیا تھا۔ اسی عطیے کی سند پر میں نے اس عمومی اصطلاح سے فائدہ اُٹھایا ہے۔

لیفٹیننٹ ہنری پوٹنگر کے 1816ء میں لکھے گئے ''سفرنامہ بلوچستان اور سندھ'' سے اقتباس

تلاش: اظہر جمیل صدیقی، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے بدستور بھرتا چلا جا رہا تھا۔

سونے کے حصول میں جب شاہِ اسپین کے حکم پر اس کے عملدار دنیا بھر میں سرگرداں ہوئے، اُس وقت تاجِ شاہی میں نصف سونا اور نصف چاندی لگی ہوتی تھی۔ پھر یہ ہوا کہ چاندی کی مقدار کم ہو کر تیس فیصد رہ گئی۔ کچھ عرصے بعد چاندی کی مقدار میں مزید کمی ہوئی اور یہ صرف بیس فیصد تک رہ گئی۔ ایک وقت وہ بھی آیا کہ جب شاہی تاج میں استعمال کی گئی چاندی کی مقدار سونے کے مقابلے میں صرف دس فیصد ہوتی تھی۔ سترہویں صدی کے آخر تک شاہی تاج میں چاندی کے استعمال کا یہ تکلف بھی ختم ہوا۔ اب تاج سو فیصد طور پر خالص سونے کا بنا ہوا تھا، جس میں بیش قیمت جواہر جڑے ہوتے تھے۔

لوٹ مار اور چھینا جھپٹی کر کے حاصل کیا گیا یہ سارے کا سارا سونا صرف شاہی خزانے میں ہی نہیں جاتا تھا بلکہ عیسائی پیشوا اور چرچ بھی اس کے حصے دار تھے، جن پر وہ اپنی امتیازی مہر ثبت کیا کرتے تھے۔ میں نے ہوانا کے میوزیم میں موجود سونے کی ایسی بہت ساری اینٹیں دیکھی ہیں جن پر لگی ہوئی مہریں چرچ اور پادریوں کے حصے کا پتا دے رہی تھیں۔ یہ بات اُس دور میں پاپائیت کی مضبوطی اور شاہوں پر اثر اندازی کی بھی دلیل ہے ورنہ خراج لینے والا خراج دے اور وہ بھی مذہب کے نام نہاد ٹھیکیداروں کو...... ہاں اقتدار کو خوف درپیش ہو تو یہ سب کچھ ممکن ہے۔ اسی لیے اُس دور کی عالمی طاقت کو بھی اپنے اقتدار کی حفاظت کے لیے اپنے لوٹ کے مال میں سے چرچ کو اچھا خاصا خراج دینا پڑتا تھا۔

☆☆☆

کیوبا صدیوں سے بحری جہازوں کے لیے مقناطیس اور اس کے سمندر کی تہ اُن کا قبرستان ہے۔ گزشتہ کئی صدیوں کے دوران سیکڑوں بحری جہاز قزاقی، جنگ، طوفان اور خراب جہاز رانی کا شکار ہو کر اس کی تہ میں اُتر چکے ہیں۔ ہوانا کی بندرگاہ سے لدے پھندے اکثر بحری جہاز اسپین پہنچنے سے پہلے ہی لٹیروں کے ہتھے چڑھ جاتے تھے لیکن پھر بھی بہت سارے اپنی منزل پر اسباب سمیت پہنچ جاتے تھے۔

جب کیوبا نے اپنی تاریخ کے گم شدہ باب کو سمندر کی تہ سے نکال کر میوزیم میں آباد کرنے کا فیصلہ کیا تو اُس وقت ان کے لیے پریشانی کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ لٹیرے غوطہ خور بھی سمندر کی تہ میں سرگرمِ عمل تھے۔ حکومت نے ان پر پابندی لگادی لیکن چوروں نے چوری کے ساتھ ساتھ ہیرا پھیری کا راستہ بھی اپنالیا۔ یوں ایک طرف کیوبا میں جہاں ماہرینِ آثار اپنی تاریخ کے اہم باب کی تلاش میں سمندر کی تہ میں اُتر کر نوادرات کو باہر لا رہے تھے تو دوسری طرف کڑی نگرانی کے باوجود لٹیرے بھی قسمت آزمائی میں مصروف تھے۔ کبھی کبھار اُن لٹیروں کے ہتھے وہ کچھ لگ جاتا ہے جو کیوبا کے ہوانا میوزیم میں نہیں بلکہ نوادرات کی عالمی منڈی میں پہنچ جاتا ہے۔ یہ بات ماہرینِ آثار اور خود سرکار کو سخت پریشان کیے ہوئے تھی۔ آخر انہوں نے ان لٹیروں پر قابو پانے کا انوکھا راستہ اپنایا۔ انہوں نے سمندر کا ایک علاقہ مخصوص کردیا، جہاں کوئی بھی غوطہ خور فیس ادا کرنے کے بعد اجازت نامہ حاصل کر کے نوادرات کی تلاش کے لیے سمندر کی تہ میں قسمت آزمائی کرسکتا ہے۔ صرف یہی نہیں، کامیاب غوطہ خور کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنی دریافت کو سرکار کے سامنے ظاہر کرے۔ حاصل کردہ نوادرات کی مالیت کا پچاس فیصد سرکار کو ادا کرے، باقی پچاس فیصد وہ خود رکھ سکتا ہے۔ بات یہیں تک محدود نہیں رہی ..... اگر غوطہ خور چاہے تو اپنے دریافت کردہ نوادرات سرکار کو بھی فروخت کرسکتا ہے۔

"کیوبا کے سمندر کی تہ میں بے شمار ایسے بحری جہاز ڈوبے ہوئے ہیں جن پر لدی ہوئی دولت صدیوں سے باہر آنے کی منتظر ہے۔" جب میں غوطہ خور مارکوس سے ملا تو اس نے کہا۔ "یہ وہ جہاز ہیں جو شاہِ اسپین کے لیے سونا، چاندی اور ہیرے جواہرات لے کر سفر پر نکلے تھے مگر یہاں ڈوب گئے۔ اب ہم قسمت آزمائی کرتے ہیں اور خوش قسمتی سے کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹتے۔"

اچھی بات ہے۔ جہاں ان نجی غوطہ خوروں کی جیب میں کچھ جا رہا ہے تو سرکار کو بھی بنا کچھ کیے دھرے اس میں سے بہت کچھ مل جاتا ہے بالکل شاہِ اسپین کے زمانے کی طرح، جب چرچ اور مذہبی پیشواؤں کو بھی ہاتھ پیر ہلائے بنا ہی شاہی خزانے سے بہت سا سونا بطور خراج مل جایا کرتا تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اُس دور میں بادشاہِ وقت انہیں خراج ادا کرتا تھا آج یہ نجی غوطہ خور اپنی محنت سے سرکار کو خراج دے رہے ہیں۔ تھوڑا سا زمانہ بدلا، ذرا سا انداز تبدیل ہوا مگر آج بھی وہی رسم جاری ہے جو اسپین کے فلپ دوئم کے زمانے میں اپنے عروج پر تھی۔

☆☆☆

سونے، چاندی اور ہیرے جواہرات کی اسپین کو ترسیل کے لیے جہاز رانی کا آغاز سولہویں صدی کے اوائل میں شاہی ایوانِ تجارت کے ایک حکم پر ہوا تھا۔ یہ ایوان اسپین کے طاقت ور شاہی دربار کے زیرِ اثر تھا۔ مال و دولت کی ترسیل

کے لیے استعمال ہونے والے ان جہازوں کو 'فلوٹاز' کہا جاتا تھا۔ ان بحری جہازوں کو پابند کیا گیا تھا کہ وہ قافلوں کی صورت میں سفر کریں۔ شاہی حکم نامے کے تحت ان بال بردار جہازوں کی حفاظت کے لیے بحری سپاہ میں شامل جنگی جہاز مامور کیے گئے تھے۔ اسپین نے اپنی تمام نوآبادی کے لیے لازم کردیا تھا کہ وہ صرف ان تجارتی کمپنیوں سے لین دین کرسکتے ہیں جنہیں ایوان نے اجازت دے رکھی ہو۔ ساتھ ہی یہ بھی لازم تھا کہ تجارتی اسباب کی ترسیل کے لیے صرف فلوٹاز کو استعمال کیا جائے۔ اسپین کے شاہی ایوانِ تجارت نے جب یہ حکم جاری کیا اُس وقت تیس سے نوّے بحری جہازوں کو 'فلوٹاز' کا درجہ دیا جا چکا تھا جن میں سے اکثر ہر وقت سمندر کے سینے پر تیرتے رہتے تھے۔

فلوٹاز کی ابتدا میں ہر سال کم از کم دو بحری جہاز اسپین کے شاہ کے لیے خزانے لے کر ہوانا پہنچتے تھے۔ یہ جہاز وینزویلا کے قریب واقع مارگریٹا کے مقام پر بحیرۂ کریبئن میں داخل ہوتے تھے۔ یہ وہ جگہ ہے جو اُس وقت اپنے تیچے موتیوں اور بحری قزاقوں کے حوالے سے دنیا بھر میں مشہور تھی۔ یہ بحری رہ گزر کا دوراہا تھا۔ یہاں سے جہاز تو براہِ راست اسپین کی طرف مڑ جاتے تھے لیکن شاہی حکم کے تحت لازم تھا کہ وہ پہلے ہوانا کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوتے۔ چنانچہ، بحیرۂ کریبئن میں داخل ہونے والے یہ تمام کے تمام جہاز ہوانا کی بندرگاہ پر چل دیتے تھے۔ جہاں وہ اپنے عمومی نوعیت کے سازوسامان کی تجارت کرتے۔ جہاز کی صفائی ہوتی اور مرمت کا کام کیا جاتا تھا۔ یہاں کچھ عرصہ ٹھہرنے کے بعد وہ بیڑے کی حفاظت میں اپنی آخری منزل اسپین کی بندرگاہ کی طرف سفر شروع کردیتے تھے۔

اسپین کی نوآبادیاتی نظام میں شامل تمام ملک اس بات کے پابند تھے کہ وہ اپنے ہاں روزمرہ استعمال کی معمولی سے معمولی چیز بھی تیار نہیں کرسکتے تھے۔ اس وجہ سے وہ ہر چیز کے لیے اسپین کے ایوانِ تجارت کی درآمدات کے محتاج تھے۔ معمولی سے برتن ہوں یا کم قیمت کا کپڑا یا پھر یورپ کی اعلیٰ معیار کی شرابیں ہوں یا چین میں تیار کردہ قیمتی ریشمی پارچہ جات...... ہر شے بحری جہازوں کے ذریعے نوآبادیاتی ملکوں کے ساحلوں پر فروخت کے لیے پہنچتی تھی جس کا مرکز ہوانا کی بندرگاہ تھی۔ اس منضبط تجارت سے حاصل شدہ منافع جاتا تھا شاہی خزانے میں جس میں سے کچھ حصہ مذہبی پیشواؤں اور چرچ کو بھی بطور خراج مل جایا کرتا تھا۔

☆☆☆

اسپین نے شاہی تجارتی بحری جہازوں کے لیے انتظام و انصرام اور تجارت پر نظر رکھنے کے لیے ہوانا کی بندرگاہ پر گورنر جنرل کا دفتر قائم کردیا تھا جس کی ذمے داری تھی کہ وہ یہاں سے آگے جانے والے شاہی مال بردار بحری جہازوں کی حفاظت کا انتظام کرے اور تجارت کی بھی دیکھ بھال کرتا رہے۔

ہوانا کی بندرگاہ سے اسپین تک کی بحری رہ گزر اُن دنوں قزاقوں سے بھری ہوئی تھی۔ اسی لیے یہاں سے شاہی فوج کے بحری جہازوں کی نگرانی میں جہازوں کو اسپین کے لیے قافلے کی شکل میں بھیجا جاتا تھا۔ اس کے باوجود بھی قزاق گھات لگا کر کسی اکیلے دُکیلے جہاز کو لوٹ لیا کرتے تھے لیکن اسپینی فوج کے سخت انتظام کی وجہ سے یا تو وہ طویل عرصے تک شکار کے منتظر رہتے اور اگر شکار ان کے ہتھے چڑھ جائے تو انہیں فوجی مزاحمت کا بھی سامنا ہوتا تھا۔ اس طرح ان کے ہتھے بہت کم ہی مال لگتا تھا۔

ایسا ہی ایک قزاق تھا پیوین ہیمین۔ یہ نسلاً ڈچ تھا اور پیشے کے اعتبار سے ماہر جہاز راں۔ وہ دوسرے قزاقوں کی طرح چھوٹا موٹا ہاتھ نہیں مارنا چاہتا تھا۔ وہ اسپین کے لیے مال و دولت لے جانے والے پورے بحری جہاز پر قبضہ کرنے کا خواہشمند تھا۔ ایک دن وہ اسپین کے بحری سپاہیوں کے ہاتھ پکڑا گیا اور اسے تاحیات غلامی کی سزا سنادی گئی۔

بعد میں حالات بدلے۔ ڈچ اور اسپین کے درمیان کشیدگی تو تھی ہی۔ ایک مرتبہ ڈچ سپاہیوں نے اسپین کے طبقۂ اشرافیہ کی بعض اہم شخصیات کو قید کرلیا اور پھر ایک معاہدے کے تحت دونوں ملکوں میں قیدیوں کا تبادلہ ہوا۔ یوں ہیمین کو بھی قید سے نجات ملی۔ بعد ازاں، 1623ء سے 1626ء کے درمیانی عرصے میں وین ہیمین بطور ایڈمرل اپنے ملک کے دفاع کے لیے اسپین کے خلاف بحری لڑائی لڑتا رہا۔ اس نے اس جنگ کے دوران اسپین کے زیرِ تسلط کیوبا کی ایک بندرگاہ متانزاس پر بھی قبضہ کرلیا تھا اور اسپین کے لیے تجارتی نوعیت کا مال و اسباب لے جانے والے کئی بحری جہازوں کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ یہ سارے جہاز اس وقت کے کروڑوں روپے مالیت کے تجارتی سامان سے لدے ہوئے تھے۔ جنہیں اب اسپین کے بجائے ہالینڈ کی سرزمین پر بطور مالِ غنیمت اُترنا تھا۔ یہ ہیمین کی ایک بہت بڑی کامیابی تھی جس نے اسے اپنے ملک میں ایک دم معروف شخصیت بنادیا تھا۔ ساتھ ہی اس کی یہ کارروائی اسپین کی طاقتور شاہی سرکار کے منہ پر زوردار طمانچہ بھی تھا۔

ہوانا میں اسپین کے سرکاری حکام کسی اور دشمن کی نسبت

وین ہیمن سے سب سے زیادہ خوفزدہ تھے۔ وہ اُس کی نقل و حرکت پر کڑی نظریں رکھے ہوئے تھے۔ وین ہیمن کی جاسوسی اس وقت مزید سخت کردی جاتی تھی جب کوئی بحری جہاز اسپین کے لیے مال لے کر روانہ ہوتا تھا۔

چار اگست، 1628ء کو ہیمن اور اس کا جہاز کیوبا کے لیے روانہ ہوئے۔ انہیں اطلاع ملی تھی کہ میکسیکو سے ایک بحری جہاز شاہی خزانے کے لیے کئی من چاندی لے کر ہوانا کی بندرگاہ کے لیے روانہ ہو رہا ہے۔ یہ اُن کا شکار تھا لیکن انہیں یہ علم نہیں تھا کہ وہ اس جہاز کو کس جگہ روک کر، اُس پر قبضہ کر سکتے ہیں مگر پھر بھی انہیں ایک بات کا یقین تھا کہ جہاز پہلے ہوانا کی بندرگاہ پہنچے گا، اس کے بعد ہی وہ اسپین کے لیے روانہ ہوگا' اس لیے وہ بھی کیوبا کے لیے چل پڑا تھا۔

راستے میں اسپین کے جاسوس جنگی جہازوں نے ہیمن کو کیوبا کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ لیا۔ انہوں نے فوراً ہوانا میں موجود اسپین کی بحری افواج کو کوریئر جہاز کے ذریعے اطلاع بھیجی کہ وہ ہوانا کی بندرگاہ پر آنے والے راستے پر بڑھ رہا ہے۔ ابھی یہ جہاز راستے میں ہی تھا کہ ہیمن نے اسے پکڑ لیا اور یوں اسے تصدیق حاصل ہوگئی کہ وہ جس شکار کی تلاش میں ہے، وہ یہیں سے گزرے گا۔ اس نے شکار کے انتظار میں وہیں وقت گزارنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے کھلے سمندر میں لنگر ڈالے اور شکار کا انتظار کرنے لگا۔

ہیمن کے پاس بندوقیں اور درجنوں توپیں تھیں اور جوآن کا شکار تھا اس کے ایڈمرل نے کبھی معمولی سی لڑائی بھی نہیں لڑی تھی۔ بیچ سمندر میں ہیمن نے جہاز کا محاصرہ کیا اور پھر نہایت آسانی سے اُسے لوٹ لیا۔

جوآن بینا وائڈز لٹنے والے شاہی تجارتی جہاز کا ایڈمرل تھا۔ وہ اسپین کی اشرافیہ میں شامل ایک تجارت پیشہ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا خاندان جہاز سازی میں پورے اسپین میں شہرت رکھتا تھا۔ جوآن بینا وائڈز نے بعد میں اسپین پہنچ کر حکام کو بتایا کہ جب ہیمن کے ملاحوں نے جہاز پر قبضہ جما لیا تو وہ عام ملاحوں کی وردی پہن کر ایک کشتی پر سوار ہوگیا اور سب کی نظروں سے بچتا بچاتا آخر ہوانا پہنچ گیا جہاں سے وہ اسپین آگیا۔

ہیمن کی کامیابی اسپین کی طاقت و حکومت کے لیے بدترین ہزیمت تھی۔ شاہ نے ہیمن کا بدلہ ایڈمرل سے لیا۔ اُسے بزدل قرار دیا گیا اور شاہی خزانہ لٹوانے کے جرم میں اسے موت کی سزا سنائی گئی۔ سزا پر عمل درآمد سے پہلے اسے زنجیروں میں جکڑ کر ننگے پاؤں شاہ کے پایۂ تخت کی گلیوں اور سڑکوں پر گھمایا گیا اور پھر اُس کا سر قلم کردیا گیا۔

جوآن کے بحری جہاز سے ہیمن کو 46 من چاندی حاصل ہوئی تھی۔ اس نے لوٹ مار کا سارا سامان یہ چاندی ہالینڈ کی سرکار کو دے دی۔ ہیمن کی ہالینڈ پورے خطے میں سر اٹھانے لگا۔ اس نے اسپین کی رہ گزر مسدود کرنا شروع کردی۔ حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آ اسپین کے جہازوں کو ہوانا کی بندرگاہ سے بہت دور سے گزرنا پڑتا تھا۔

دوسری طرف وین ہیمن پورے ہالینڈ میں ایک ہیرو کی طرح مشہور ہو چکا تھا۔ اس نے اسپین کے جتنے بحری لوٹے، اُن سب پر چاندی لدی ہوتی تھی، جو میکسیکو اسپین پہنچائی جا رہی تھی۔ اتنی بڑی مقدار میں چاندی لدے بحری جہازوں پر قبضہ کرنے کے سبب ہالینڈ میں چا کی ریل پیل ہو چکی تھی۔ یہ سب کچھ ہیمن کی بدولت ہوا اس لیے اسے ملک میں نہایت اعلیٰ اعزازات سے نوازا وہ اپنی زندگی میں ہی ہالینڈ کی عوام کا ہیرو بن چکا تھا۔ اس مداح میں بچے گیت گاتے تھے:

"اُس نے چاندی کے جہازوں پر فتح پائی۔"

وین ہیمن نے سترھویں صدی کی تیسری دہائی اسپین کو سمندر میں ناکوں چنے چبوا دیے تھے مگر یہ سب عارضی تھا۔ 1629ء میں انگلش چینل میں بحری قزاقوں اس کے جہاز پر دھاوا بول دیا۔ ہیمن عرشے پر کھڑا دونوں طرف سے..... گولے داغ رہے تھے۔ ہیمن جانباز ملاحوں کی ہمت بندھا رہا تھا کہ اچانک قزاقوں کی توپ نے گولا اُگلا اور سیدھا آکر ہیمن سے ٹکرایا۔ اُس کا دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ ہالینڈ اپنے ہیرو سے محروم اسپین نے سکھ کی سانس لی۔ ہوانا کی بندرگاہ، میکسیکو چاندی، کریبین سمندر اور اسپین کا شاہی خزانہ..... ان کی راہ میں کئی برسوں تک ناقابلِ تسخیر رکاوٹ بن جانے وین ہیمن ہی نہیں مرا، ہالینڈ جو اسپین پر کاری ضرب لگانے سوچ رہا تھا، اس نے بھی پسپائی اختیار کرلی، ہوانا کی بندرگاہ پر اسپین کی شاہی سرکار کا تسلط اور بحیرۂ کریبین پر شاہی فلو کا راج ایک بار پھر شروع ہو چکا تھا۔

یہ قصہ اسپین میں محفوظ کی گئی بحری تاریخ کی دستاویزات میں محفوظ ہے۔ سمندر کی تہ میں مدفون خزانوں کی تلاش کر والے انہی دستاویزات سے اپنی تلاش شروع کرتے ہیں ریکارڈ کئی سو جلدوں میں محفوظ ہے جس میں اسپین کی گزشتہ صدیوں کی بحری تجارت کی تمام تر تفصیلات جزئیات سمیت

ہیں۔ ان دستاویزات میں اسپین پہنچنے اور یہاں سے لے کر دوسرے ملکوں کو روانہ ہونے والے ہر جہاز سے تفصیلات موجود ہیں۔ ان سرکاری دستاویزات میں لکھا ہوا ہے کہ یہاں پہنچنے والا کون سا جہاز، کب لاپتا لوٹا گیا یا وہ لوٹے جانے سے قبل ہی سمندر بُرد ہو گیا یا اس کے ڈوبنے کی وجوہات کچھ اور تھیں۔ یہ بھی درج ہے کہ والے بدقسمت جہاز پر کون کون سا سامان کتنی مقدار میں تھا۔ کئی واقعات میں تو جہاز کے ڈوبنے کے درست ترین کو بھی بالکل ٹھیک بیان کیا گیا ہے۔ یہ ان سرکاری دستاویزات کے مصدقہ ہونے کا ثبوت ہیں۔

سولہویں سے انیسویں صدی تک، بحری راستوں سے کی درآمدات و برآمدات کا یہ احوال 'انڈیز ان سیویلے' جنرل آرکائیوز کی درجنوں بکس شیلف پر رکھا ہوا ہے۔ ہوانا کے میوزیم میں اُس دور کے جتنے بحری نوادرات ہوئے ہیں، اُن کی تلاش کا پہلا زینہ یہی دستاویزات ہیں۔

سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں یہ دستاویزات موجود ہیں، وہ سترھویں صدی کی بنی ہوئی قدیم مگر سرکاری عمارت ہے، جس کی عظمتِ رفتہ آج بھی اُس در و دیوار سے جھلکتی ہے۔ جب میں نا ختم ہونے والے شیلف اور دیوار گیر الماریوں کے درمیان سے ہوتا ہوا ہال میں پہنچا تو وہاں کئی لوگ کمپیوٹر مانیٹر پر نظریں تحقیق و جستجو میں مصروف تھے۔ اسپین کی حکومت نے دستاویزات کو جدید تکنیک کی مدد لیتے ہوئے پہلے مائیکرو کمپیوٹر پر منتقل کروا دیا ہے۔ اُس دور میں مروج اور آج لکھی جانے والی ہسپانوی زبان میں بہت فرق آچکا اب کئی ہسپانوی محققین، تاریخ داں اور ماہرینِ اس زبان کو پڑھ کر جدید ہسپانوی کا قالب پہنا اس ہال میں ان دستاویزات کا مطالعہ کرنے لوگ اس علمی کوشش میں مشغول نہیں تھے، کچھ ایسے جو ان دستاویزات کا مطالعہ صرف اس غرض سے تھے کہ سمندر کا ایسا کون سا حصہ باقی ہے جہاں پر ہوئے جہاز اب تک غوطہ خوروں کی لوٹ مار سے بچے ہیں۔

ہیمن کو قتل ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں لیکن اسپین اور چاندی کو لوٹنے والے اب تک سرگرم ہیں۔ ہال میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اکیسویں صدی قزاقوں کو لوٹ مار کے لیے، سمندر کے سینے پر تیرتے بحری جہازوں پر لدے سونے چاندی پر قبضے کے لیے شاہی فلوٹاز کا انتظار نہیں کرنا تھا۔ ان کے لیے تو یہ دستاویزات ہی سونے چاندی کا پتا بتانے کے لیے کافی تھیں۔

☆☆☆

ہوانا اور اسپین کے درمیان صدیوں تک سونے اور چاندی سے لدے بحری جہازوں کے سفر اور اُن کی تاریخ کے بارے میں جاننے کی میری مہم اختتام پذیر تھی۔ آخری دنوں میں، میں ماریا انتونیا کولو مرا لبھار سے ملنے کے لیے اُن کے دفتر پہنچا۔ یہ محترمہ ہوانا میں قائم اس ادارے کی نائب ڈائریکٹر ہیں، جس پر کیوبا کے اُن قدیم مخطوطات کی حفاظت کی ذمے داری ہے جو اسپینی تسلط کے دوران جہاز رانی سے متعلق ہیں۔

ماریا نے مجھے ہوانا کی بندرگاہ کا ایک قدیم نقشہ دکھایا۔ یہ نقشہ 1591ء میں تیار کیا گیا۔ ہاتھ سے بنا یہ نقشہ نہایت نفیس انداز میں تیار کیا گیا تھا۔ اس کی ڈرائنگ بہت شاندار تھی۔ نقشے کے معیاری ہونے کے لیے یہی ایک مثال کافی ہے کہ صدیاں گزر جانے کے باوجود اس کی سیاہی اور مختلف مقامات کی وضاحت کے لیے استعمال کیے رنگ اب بھی خاصے روشن تھے۔

نقشے میں بندرگاہ کے ساتھ ایک دیوار بھی نظر آ رہی تھی جس کے ساتھ ساتھ لوہے کی ایک موٹی سی زنجیر بھی پڑی ہوئی تھی۔ ماریا نے مجھے آؤٹ لائن ڈرائنگ میں تیار کی گئی ایک پینٹنگ بھی دکھائی۔ یہ 1689ء میں تیار کی گئی تھی۔ اس پینٹنگ میں ہوانا بندرگاہ کی منظر کشی کی گئی تھی۔

اس تصویر میں بندرگاہ کی دیوار پر متعدد توپیں بھی نصب نظر آ رہی تھیں، جنہیں داغنے پر شاہ اسپین کے وفادار فوجی تعینات تھے۔ یہ توپیں یہاں لنگر انداز ہونے والے شاہی تجارتی بحری بیڑوں کی حفاظت، قزاقوں کو بندرگاہ سے دور رکھنے اور شاید کیوبا کی نوآبادی کے مقامی باشندوں کو شاہ کے جاہ و جلال سے مرعوب کرنے کا کام سرانجام دیا کرتی تھیں۔ پینٹنگ میں ساحل کے ساتھ ساتھ کئی عمارتیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ ان میں سے ایک عمارت کو میں پہچان گیا۔ یہ اب بھی ساحل کے پاس موجود تھی مگر میوزیم میں بدل چکی تھی۔

روجر اراز کیوبا آرکیالوجی کے ڈائریکٹر ہیں۔ جب ان سے ملاقات ہوئی تو باتوں باتوں میں اُس عمارت کا بھی تذکرہ نکل آیا، جس کا اوپر تذکرہ کیا ہے۔ یہ سن کر وہ بتانے لگے کہ "جس عمارت کا ذکر میں نے کیا ہے، اُس کے برابر کئی عمارتیں واقع تھیں۔ ہم نے اُس پینٹنگ کو دیکھنے کے بعد فیصلہ کیا کہ

اُس جگہ پر کھدائی کر کے دیکھنا چاہیے کہ وہاں کیا کچھ ہوتا تھا۔ جب ہم نے کام شروع کیا تو بہت تھوڑے عرصے میں ہمیں نہایت دلچسپ آثار ملے جن سے پتا چلا کہ وہاں پر جہاز سازی کا کارخانہ تھا۔ اس کے قریب ہی کھدائی پر ہمیں ایسے آثار ملے جن کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ وہ جگہ جہاز سازی میں استعمال ہونے والے سامان کا گودام تھا۔ یہ بہت دلچسپ دریافت تھی۔ اس کے بعد بھی ہماری کوششیں جاری رہیں۔ بہت جلد ہم نے ہوانا کے مشرق میں ایک ایسی جگہ دریافت کرلی جو اس شہر میں جہاز سازی کا سب سے قدیم کارخانہ تھا۔ یہاں سے ہمیں ایک ایسے جہاز کے آثار بھی ملے ہیں، جو تیاری کے مراحل سے گزر رہا تھا۔ جہاز کے آثار سے پتا چلتا تھا وہ سولھویں صدی عیسوی کا زمانہ ہوگا۔"

"ہوانا میں جہاز سازی کی تاریخ اسپین کے سب سے بڑے جنگی بیڑے کی تباہی سے شروع ہوتی ہے، جسے 1588ء میں انگلستانی بحریہ نے تباہ کردیا تھا۔" راجر نے میری معلومات میں اضافے کے لیے ہوانا کی تاریخ کا ایک اور باب بے نقاب کرنا شروع کیا۔ "اُس کے بعد سے اٹھارہویں صدی کے اختتام تک یہاں جہاز سازی کی صنعت بدستور پھلتی پھولتی رہی۔ اسپین نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ اُن جگہوں پر بحری جہازوں کی تیاری نہایت سستی ہے جہاں پر غلام ہیں۔ کیوبا اُس کی نوآبادی تھی۔ ہم غلام تھے اس لیے یہ جگہ انہیں جہاز سازی کے لیے مناسب لگی۔ یوں یہاں پر بحری جہاز بننے لگے۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا اور پھر فخریہ لہجے میں گویا ہوا۔ "اُس وقت ہوانا میں بننے والے بحری جہازوں کی دنیا بھر میں شہرت تھی۔ خریدار کی تسلی کے لیے یہی بات کافی تھی کہ یہ جہاز ہوانا میں تیار کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ صرف لکڑی تھی۔ یورپ کی لکڑی کے مقابلے میں ہماری لکڑی سے بنے ہوئے جہازوں کی عمر دُگنی ہوتی تھی۔"

میوزیم میں گھومتے پھرتے ہم اُس جگہ سے گزرے جہاں پر شیلف میں ٹوٹے ہوئے برتن رکھے ہوئے تھے۔ اچانک روجر مڑا اور ایک شیلف کی طرف بڑھا۔ چند لمحوں بعد وہ پلٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک ٹوٹی ہوئی پیالی تھی۔ "اسے دیکھو۔" اس نے میری توجہ پیالی کی طرف مبذول کرواتے ہوئے کہا۔ "یہ پیالی چین یا پھر جنوبی ایشیا کے کسی ملک کی بنی ہوئی ہے۔ یہ بحری جہاز کے ذریعے ہی ہوانا کے ساحل تک پہنچی ہوگی۔"

"آپ نے اسے کہاں سے دریافت کیا؟" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔

"پرانے ہوانا کی بندرگاہ کے قریب کی گئی ایک کھدائی کے دوران یہ ملا تھا۔" اس نے ایک ہی سانس میں جواب دے دیا اور پھر پیالی میری آنکھوں کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے پیندے کو غور سے دیکھو۔ اس پر اُس چھری کے نشانات اب تک موجود ہیں جو آخری بار اس میں رکھی گئی تھیں۔ یقیناً کسی ملاح نے ہی وہ چھری کھائی ہوگی اور خالی پیالی ساحل پر پھینک گیا ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ مسکرانے لگا۔ "معلوم نہیں کس دیس کا ملاح تھا مگر اب یہ پیالی ہماری ہے، ہمارا تاریخی ورثہ ہے۔"

اس کی یہ بات سُن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ "عہدِ غلامی کی نشانیاں آج کے آزاد کیوبا کا تاریخی ورثہ ہیں۔ سچ ہے کہ غلامی ہو یا مزاجوں کی آزادی...... عادتیں زندگی بھر نہیں بلکہ نسلوں تک پیچھا کرتی ہیں۔" میں نے دل ہی دل میں سوچا اور ایک بار پھر پیالی کو دیکھنے لگا۔

کل کا ہسپانوی امریکا اور آج کا لاطینی امریکا کبھی اسپین کی نوآبادی تھا۔ اس کی کانوں سے نکلنے والا سونا اور چاندی نہایت سرعت سے صدیوں تک، اسپین کے شاہی خزانے میں منتقل ہوتا رہا تھا لیکن کب تک...... آخر کو ایک دن ان کانوں کی کوکھ بھی بنجر ہوئی۔ یہاں سے سونا چاندی لے کر اسپین روانہ ہونے والا شاہی فلوٹاز آخری بار میکسیکو کی بندرگاہ سے ہوانا اور اسپین کے لیے 1778ء کو روانہ ہوا۔

سونے چاندی کی ترسیل کے لیے لدے پھندے اس آخری بحری جہاز کی روانگی کے چند عشروں کے بعد 'اسپین کے کبھی نہ ڈوبنے والے سورج' کو بھی غروب ہو جانے کا خیال آگیا۔

کچھ ہی عرصے میں شاہِ اسپین کی زیرِ تسلط سلطنت کا چمکتا سورج جوں جوں ڈوبتا چلا گیا، توں توں اس کی آبادیاں آزاد ملک کی صورت دنیا کے نقشے پر اُبھرتی رہیں اور پھر انیسویں صدی کے آخری دنوں میں کیوبا کی عوام نے بھی ایک کروٹ لی۔ ہوانا کی بندرگاہ اسپین کے تسلط سے آزاد، لوگ اُن کی غلامی سے آزاد ہوئے۔ اب صدیوں پر محیط اسپین کے زیرِ تسلط کیوبا کے دورِ غلامی کے آثار صرف اُس کے اَن گنت میوزیم میں ہی ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

میری تحقیق ختم ہوئی تو کیوبا سے روانگی کا جواز خود بخود پیدا ہوگیا۔ تاریخ کے اس طویل سفر کے بعد میں بھی اب تھکا ماندہ اپنے گھر کو لوٹ رہا تھا آرام کرنے کی غرض سے جس طرح نوادرات کیوبا کے میوزیم میں آرام فرما ہیں۔

▼▼▼

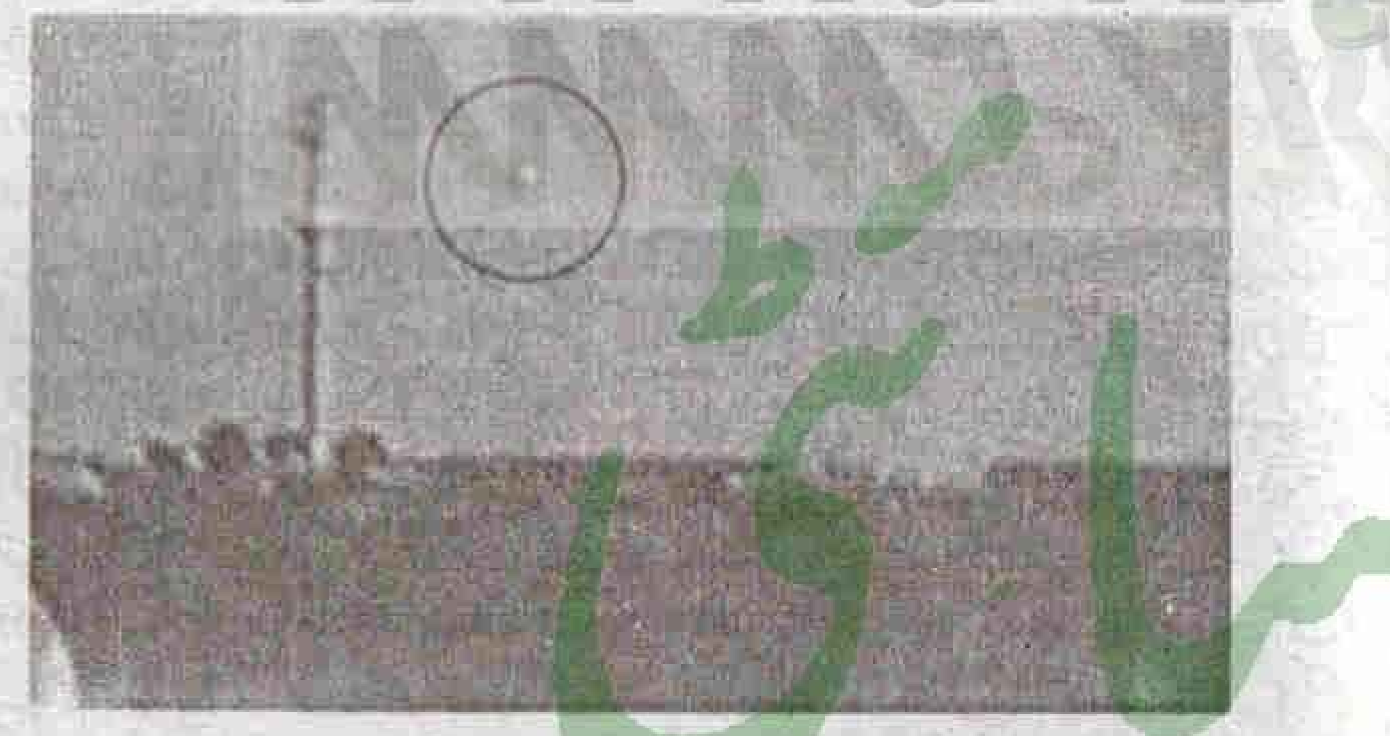

پراسرار مخلوق

آصف ملک

اس شش جہات میں کیسی کیسی مخلوق آباد ہے۔ اب تک انسان نے جن سیاروں کا معائنہ کیا ہے، وہاں انہیں کوئی مخلوق نظر نہیں آئی پھر بھی اس یقین میں ذرا کمی نہیں آئی ہے کہ دیگر سیاروں پر بھی مخلوق آباد ہے جو ہم سے بھی زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ سائنس وٹیکنالوجی میں بہت آگے ہیں۔ تبھی تو ان کی اُڑن طشتریاں کسی بھی طرح قابو میں نہیں آتیں۔

اُڑن طشتریوں میں سوار ہوکر آنے والی مخلوق کا مرکز کہاں ہے؟

جنوب مشرقی کینیڈا کے اس چھوٹے سے قصبے ہارووڈنل میں مارٹن لوریل نامی سترہ سالہ نوجوان اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ بائیس نومبر 1958 کی رات تھی۔ برف باری ہو رہی تھی اور موسم بے حد سرد تھا۔ مارٹن کا باپ والٹر لوریل اور ماں اینا لوریل قصبے کی ایک تقریب میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ مارٹن کا گھر قصبے سے ذرا ہٹ کر تھا اور کوئی دوسرا گھر کم سے کم سو گز کے فاصلے پر تھا اس لیے اس رات مارٹن نے جو دیکھا اس کا واحد گواہ وہ خود ہی ہے لیکن اس کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔ یہ کہانی خود اسی کی زبانی ہے۔

"میں ماما اور پاپا کے جانے کے بعد بور ہو رہا تھا۔ باہر ہلکا سا برفانی طوفان آیا ہوا تھا۔ دوپہر میں آتش دان کے لیے لکڑیاں کاٹتے ہوئے کلہاڑی کی دھار سے میری انگلی پر ہلکا سا کٹ لگ گیا تھا۔ اس سے خاصی دیر خون نکلتا رہا تھا۔ اگر موسم خراب نہ ہوتا تو ماما مجھے اسپتال لے جاتیں اور زخم پر ٹانکے لگواتیں۔ مگر پھر انہوں نے گھر میں پٹی کردی تھی۔ شام تک زخم کی حالت بہتر ہوگئی۔ پارٹی بڑوں کی تھی اس لیے میں نے جانے سے انکار کردیا اور اب گھر میں بور ہو رہا تھا۔ میں نے ریڈیو لگا لیا اور اس پر ایک اسٹیشن ٹیون کیا جہاں سے موسیقی کا پروگرام آرہا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

۔۔۔ میں اپنے گھر کے بارے میں بتا دوں یہ دو منزلہ ہے اور اس میں بیڈ روم زاوپر ہیں۔ ایک ماما پاپا کا ہے، ایک میرا اور تیسرا بیڈ روم کسی آنے والے مہمان کے لیے مخصوص ہے۔ نیچے نشست گاہ اور لاؤنج کے ساتھ کچن اور چھوٹا سا ڈائننگ روم بھی ہے۔ میں لاؤنج میں تھا، یہاں ہمارا پیانو اور ریڈیو سیٹ رکھا تھا۔ میں آتش دان کے پاس صوفے پر بیٹھا ہوا گانے سن رہا تھا کہ اچانک ہی ریڈیو سے گانے کی آواز رک گئی اور اس کی بجائے سیٹیوں جیسی اور عجیب سی لہراتی آوازیں آنے لگیں۔ پھر کوئی بگڑے انداز میں کسی اجنبی زبان میں کچھ کہنے لگا۔ وہ رک رک کر بول رہا تھا۔ انداز ایسا تھا جیسے فوجی ریڈیو پر خفیہ پیغام دیتے ہیں۔ آواز بھی عجیب تھی جیسے کسی لوہے کی پلیٹ پر کوئی سلاخ مار کر جھنکار پیدا کی جا رہی ہو۔ میں نے ریڈیو کی آواز بلند کر رکھی تھی اس لیے جب یہ انوکھی آوازیں آنے لگیں تو شور بہت زیادہ ہو گیا میں نے جلدی سے اُٹھ کر ریڈیو کی آواز آہستہ کی۔ اس وقت میرا خیال تھا کہ یہ آوازیں طوفان کی وجہ سے ریڈیائی لہروں میں خلل کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہیں۔ مجھے فکر ہوئی اگر طوفان شدت اختیار کر گیا تھا تو ماما پاپا کو واپسی میں مشکل ہوگی۔ وہ قصبے کے دوسرے سرے کی طرف گئے تھے۔ یہ جگہ ہمارے گھر سے کوئی تین کلومیٹرز دور تھی۔

ریڈیو آف کر کے میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھا تو طوفان کی شدت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا۔ برف ویسے ہی نرمی سے گر رہی تھی مگر ہوا کسی قدر تیز تھی لیکن اتنی تیز نہ تھی کہ ہمارے گھر کے چاروں طرف لگے درخت لہرانے لگتے۔ تب ریڈیو کی نشریات میں کیوں مسئلہ آ رہا تھا؟ میں کھڑکی کا پردہ برابر کرنے والا تھا کہ مجھے مکان کے سامنے سڑک کے پار والے جنگل میں تیز روشنیاں سی دکھائی دیں جو حرکت کر رہی تھیں۔ یہ رنگ برنگی روشنیاں ایسی تھیں جیسے پولیس لائٹس حرکت کرتی ہیں۔ لیکن یہ روشنیاں کسی پولیس کار کی روشنیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑی تھیں۔ میں ان روشنیوں کو دیکھتا رہا۔ میں سمجھ نہیں پایا تھا کیونکہ میں نے کبھی فاروہیل یا اس کے آس پاس.... اس قسم کی کوئی چیز نہیں دیکھی تھی۔ وہ جو چیز بھی تھی اس کی روشنی درختوں سے اوپر دکھائی دے رہی تھی۔ جبکہ درختوں کے پاس جھیل تھی۔ تو کیا یہ چیز جھیل کے اوپر تھی؟ شاید یہ کوئی ہیلی کاپٹر تھا لیکن اگر ہیلی کاپٹر ہوتا تو اس کے انجن کا شور یہاں تک سنائی دیتا۔

مجھے ڈر لگا تھا لیکن پھر میں نے ہمت کی۔ اپنا کوٹ پہن کر اور ٹارچ لے کر باہر آیا۔ باہر ہوا میں بلا کی کاٹ تھی میں نے اپنا کوٹ کانوں تک اُٹھا لیا اس کے باوجود سردی سے چہرہ اور کان سن ہوئے جا رہے تھے۔ میں مکان کے احاطے سے باہر آیا اور سڑک پار کر کے درختوں کے درمیان پہنچا، یہاں سے وہ روشنیاں بدستور دکھائی دے رہی تھیں۔ ساتھ ہی ان کا حجم بھی بڑھ گیا تھا۔ عجیب بات تھی کہ یہ روشنیاں کئی سمتوں میں تیزی سے گھوم رہی تھیں اور درختوں میں آنے کے بعد مجھے ایک سیٹی نما آواز بھی سنائی دینے لگی تھی جیسے چائے کی کیتلی سے پانی کھولنے پر آتی ہے۔ جنگل میں اتنی روشنی تھی کہ اب مجھے ٹارچ کی ضرورت نہیں تھی اس لیے میں نے اسے آف کر دیا اور درختوں کی آڑ لے کر جھیل کی طرف بڑھنے لگا۔

مجھے خوف بھی محسوس ہو رہا تھا اور اس سے زیادہ تجسس تھا کہ یہ کیا چیز ہے۔ میں دبے قدموں درختوں کے آخری سرے تک پہنچا۔ یہاں سے جھیل تک کوئی پندرہ گز کا خالی میدان تھا جس میں اونچی گھاس اُگی رہتی تھی لیکن اس وقت یہ جگہ برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ تب میں نے اس چیز کو دیکھ لیا۔ میں نے کبھی اس قسم کی کوئی چیز نہیں دیکھی تھی۔ یہ آٹھ پہلو والی چپٹی اور گول پلیٹ نما ڈسک تھی۔ اس کا قطر کم سے کم بھی تیس فٹ تھا۔ اس کے نیچے اور کناروں پر مستقل حرکت میں رہنے والی روشنیاں جل رہی تھیں۔ یہ روشنیاں جل بجھ نہیں رہی تھیں بلکہ دائرے کی صورت میں حرکت کر رہی تھیں۔ جو روشنیاں کناروں پر تھیں وہ اس پوری ڈسک کے گرد گھوم رہی تھیں اور جو اس کے نیچے تھیں۔ وہ آٹھ پہلوؤں کے ذرا نیچے ایک دائرے میں گردش کر رہی تھیں اور یہاں سیٹی نما آواز اتنی تیز تھی کہ کانوں کو چبھ رہی تھی۔ ہوا کے طوفانی جھکڑ درختوں تک آ رہے تھے جبکہ باہر اتنی تیز ہوا نہیں تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہوا کے یہ جھکڑ اس ڈسک نما چیز سے نکل رہے تھے اور سیٹی نما آواز اسی جھکڑ کی تھی۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس شے کے نیچے ایک چھوٹا سا دائرہ نما خلا پیدا ہوا اور اس خلا سے چند لمبی لمبی راڈیں نکل کر زمین پر ٹک گئیں اور وہ ڈسک ذرا نیچی ہو کر جیسے زمین پر اتر گئی۔ اس سے پہلے وہ ہوا میں معلق تھی۔ اس سے نکلنے والی سیٹی نما آواز بھی رک گئی تھی۔ اس کی گھومنے والی روشنیاں رک گئی تھیں اور ان کی روشنی بھی مدہم پڑ گئی تھی۔ میں خوف اور حیرت سے ساکت رہ گیا تھا۔ اس وقت مجھے لگا جیسے میں کوئی حیرت انگیز خواب دیکھ رہا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ اچانک اس ڈسک کے ایک طرف سے ایک پٹی نما

WWW.PAKSOCIETY.COM

[ح]صہ الگ ہو کر زمین پر ٹک گئی۔ یہ کوئی ڈھلان جیسی چیز تھی جو بالکل ہموار تھی۔ اوپر نمودار ہونے والے خلا سے روشنی جھانک رہی تھی۔ اس روشن خلا سے ایک چھوٹے قد کا آدمی نمودار ہوا۔ اس کا سر بڑا سا تھا جیسے اس نے سر پر کوئی ہیلمٹ پہن رکھا ہو۔ مگر جب وہ نیچے آیا تو مجھے پتا چلا وہ اس کا سر ہی تھا۔ اس کا جسم کسی چار پانچ سال کے بچے جتنا تھا لیکن سر کسی آدمی سے بھی کہیں بڑا تھا۔

اس نے سر اوپر کر کے عجیب سی آواز میں کچھ کہا۔ مجھے لگا میں یہ آواز اور الفاظ پہلے بھی سن چکا ہوں اور اچانک مجھے ریڈیو سے آنے والی ان عجیب آوازوں کا خیال آیا جو میں کچھ دیر پہلے سن چکا تھا۔ کچھ دیر اس ڈھلان سے ایسے ہی دو چھوٹے چھوٹے اور بڑے سر والے باہر آئے۔ انہوں نے ہلکے سرخ رنگ کا چمکیلا سا لباس پہن رکھا تھا۔ ان کے خدوخال غیر واضح تھے۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتے جھیل کی طرف جانے لگے۔ پھر انہوں نے اپنے پاس چھوٹے سے گلاس نما چیز میں جھیل سے پانی لیا اور واپس آنے لگے۔ اب ان کے چہروں پر روشنی پڑ رہی تھی۔ میں نے دیکھا ان کی آنکھیں بڑی گول اور بالکل نیلی ہیں۔ ان کے ماتھے چوڑے اور سر بالوں سے بالکل خالی تھے۔ ان کے جلد کی رنگت کاہی جیسی تھی اور وہ یوں زمین پر قدم رکھتے ہوئے چل رہے تھے جیسے ان کے لیے یہ مشقت بھرا کام ہو۔

وہ اسی طرح واپس اس ڈسک نما چیز میں چلے گئے اور پھر ڈھلان بھی سمٹ کر ڈسک کا حصہ بن گئی۔ اس کی روشنیاں حرکت کرنے لگیں اور ویسی ہی سیٹی نما آواز آنے لگی۔ پھر وہ اوپر بلند ہوئی اور اس کے پائے سمٹ کر گول خانے میں غائب ہو گئے اور وہ خانہ بھی بند ہو گیا۔ اس کے بعد اچانک اس ڈسک کے نیچے سے اتنی تیز روشنی نکلی کہ چند لمحے کو میری آنکھیں چندھیا گئیں اور جب میں کچھ دیکھنے کے قابل ہوا تو وہ غائب ہو چکی تھی۔ آسمان دور دور تک صاف تھا۔ میں بھاگ کر اس جگہ آیا جہاں وہ چند لمحے پہلے موجود تھی۔ یہاں اب تاریکی تھی میں نے ٹارچ روشن کی اور زمین پر دیکھا تو جہاں وہ چیز موجود تھی اس کے عین نیچے برف پر جلنے جیسا سیاہ نشان موجود تھا۔ یہ نشان کم سے کم دس فٹ قطر کا تھا۔ میں نے جھک کر دیکھا تو مجھے اس سے گندھک جیسی بو آئی تھی۔‘‘

دو گھنٹے بعد وائٹ اور اینا واپس آ گئے۔ مارٹن نے انہیں اس واقعے کے بارے میں بتایا لیکن انہیں یقین نہیں آیا مارٹن انہیں جھیل کے کنارے لے گیا جہاں وہ جلا ہوا نشان موجود تھا۔ تب وائٹ کو احساس ہوا کہ اس کے بیٹے نے کچھ نہ کچھ دیکھا ہے۔ وائٹ کو فلکیات سے دلچسپی تھی اور وہ زمانہ طالب علمی میں شوقیہ فلکیات داں بھی رہا تھا لیکن اب وہ انشورنس ایجنٹ تھا۔ اس نے گھر سے کیمرا لا کر اس نشان کی تصاویر لیں اور بعد میں اس واقعے کی اطلاع ٹورنٹو ٹائمز کے مقامی رپورٹر میکس پال کو دی۔ میکس پال نے اس اسٹوری کو اپنے اخبار میں بھیج دیا۔ اس کے بعد کئی مہینے تک مارٹن لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا رہا تھا۔ اس سے سرکاری حکام نے بھی ملاقات کی اور پھر اچانک اس نے اس معاملے میں دم سادھ لیا اور پھر کوئی بیان نہیں دیا۔ اس واقعے کے ایک سال بعد مارٹن کے گھر والے یہ جگہ چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے۔

یہ واقعہ اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں عینی شاہد مارٹن نے کسی قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کیا تھا۔ اس نے جو دیکھا من وعن بتا دیا۔ اس نے بعد میں بھی متعدد بار اپنا بیان دُہرایا اور ہر بار حقائق ایک جیسے رہے تھے۔ جھوٹ پکڑنے والے ایک ماہر نے اس کا بیان سنا تو اس نے مارٹن کو سو فیصد سچا قرار دیا۔ پھر شاید اس پر سرکار کی طرف سے پابندی لگا دی گئی اور وہ وہاں سے چلے گئے اس کے بعد مارٹن کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اس نے بعد میں کہیں منظر عام پر آنے یا اس واقعے کے بارے میں کسی کو بتانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن اس نے جو بتایا اس سے بالکل واضح ہے کہ مارٹن نے ایک اُڑن طشتری دیکھی تھی اور اس میں سے کچھ ایسی مخلوق برآمد ہوئی تھی جو زمین کی باسی نہیں لگ رہی تھی۔ اگر وہ زمین کے نہیں تھے تو پھر کہاں سے آئے تھے؟ کیا وہ خلا میں کسی دور دراز سیارے سے آئے تھے؟ کیا زمین پر کسی دوسرے سیارے کی مخلوق آتی ہے جسے ہم عرف عام میں ایلین کہتے ہیں اور یہی اس مضمون کا موضوع ہے۔

☆☆☆

زمانہ قدیم میں انسان کا ذہن محدود تھا اور وہ اپنے ماحول سے باہر کے بارے میں پر تجسس نہیں تھا۔ اس کی بنیادی وجہ انسان کی بقا کے لیے ذرائع کی محدود فراہمی تھی۔ دوسرے لفظوں میں اس وقت انسان کو روٹی کے لالے پڑے تھے اس لیے دور تو کیا وہ پاس کی بھی نہیں سوچتا تھا۔ جیسے رومان، شاعری، موسیقی اور مصوری وغیرہ۔ یہ سب فراغت کے مشاغل تھے اور اس وقت انسان کا صرف ایک مشغلہ تھا اور وہ تھا خوراک تلاش کرنا۔ پھر انسان ترقی کرنے لگا۔ جنگلوں اور غاروں سے نکل کر اس نے بستیاں بسائیں،

WWW.PAKSOCIETY.COM

کاشت کاری کرنے لگا۔ پھر اس نے قبیلے سے بڑھ کر قوم کا روپ اختیار کیا۔ ملک وجود میں آنے لگے۔ بستیاں شہروں میں بدل گئیں۔ نت نئے علوم ایجاد ہونے لگے۔ عالی شان تعمیرات ہونے لگیں اور انسان کے پاس اتنی فرصت آگئی کہ وہ ان مشاغل پر توجہ دے سکے جن سے اسے براہِ راست کوئی فائدہ نہ ہو۔ ان مشاغل میں ایک فلکیات بھی تھی۔

آسمان کا پہلا فلکی نقشہ بنانے والی اقوام میں اختلاف ہے۔ بعض ماہرین کہتے ہیں کہ اوّلین فلکیاتی ماہر لوگ تھے۔ لیکن عراق میں آباد سمیریوں کو بھی اس کا کریڈٹ دیا جاتا ہے۔ جنوبی امریکا کی فنا ہو جانے والی تہذیبوں نے بھی اس بارے میں کچھ حیرت انگیز چیزیں چھوڑی ہیں جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ فلکیات اور ہمارے نظامِ شمسی کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے۔ اسی طرح چینی اور عرب بھی قدیم زمانے میں فلکیات سے دلچسپی رکھتے تھے۔ مگر آسمان کا اوّلین نقشہ ہمیں مصر میں اہرامِ مصر اور دوسری تعمیرات کی دیواروں پر کندہ ملتا ہے۔ اس میں آسمان پر ستاروں کی درست پوزیشن بتائی گئی ہے اور نظامِ شمسی کے چار نزدیکی سیاروں کی بھی نشان دہی ہے۔ جن میں زہرہ، مریخ، زحل اور مشتری شامل ہیں۔ اس سے بعد کے سیارے اس وقت دریافت ہوئے جب دوربین ایجاد ہوئی۔ یہ دوربین کے بغیر عام آنکھ سے نظر نہیں آتے۔

آسمان کو شروع سے غیر الہامی مذاہب میں ایک الوہی حیثیت حاصل تھی اور اسے ایسے ہر مذہب میں مقدس مانا گیا ہے۔ اس لیے جب قدیم تہذیبیں متمدن ہوئیں اور انہوں نے آس پاس کے علاقوں پر تسلط حاصل کر لیا تو انہوں نے دیگر انسانوں سے خود کو برتر ثابت کرنے کے لیے یہ دعویٰ کر دیا کہ وہ ارضی انسان نہیں ہیں بلکہ ان کے آبا و اجداد آسمانوں سے آئے تھے۔ اس سلسلے میں کہانیاں بھی بنائی گئیں اور تصویروں سے بھی کام لیا گیا۔ مصریوں کا عقیدہ تھا کہ ان کے دیوتا آسمان سے آئے ہیں اور وہ اس دنیا کی مخلوق نہیں ہیں۔ کچھ ایسا ہی عقیدہ یونانی بھی رکھتے ہیں کہ ان کے دیوتاؤں کا مسکن آسمانوں پر کہیں ہے۔ پھر جاپانی بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ وہ خود کو سورج کی اولاد بتاتے ہیں اور ظاہر ہے سورج آسمان پر ہے۔ حد یہ کہ ہندوستان کے بعض راجپوت خود کو سورج کی اولاد قرار دیتے ہیں سورج ونشی کہلاتے ہیں۔ اپنی نسل کے غیر ارضی ہونے کا نظریہ وقت کے ساتھ ساتھ صرف ایک روایت رہ گیا۔ آج ہم جانتے ہیں کہ تمام انسان اصل میں ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں، ان میں سے کوئی کہیں باہر سے نہیں آیا ہے۔ ڈی این اے کی نقشہ گری نے برتر ہونے کے سارے دعوے رَد کر دیے ہیں۔

ہمیں قدیم تہذیبوں میں صرف مصری ملتے ہیں جنہوں نے اس دعوے کے ساتھ کچھ ایسی تصویری تحریریں بھی چھوڑی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ اس وقت زمین پر آسمان سے غیر انسانی مخلوق کی آمد جاری تھی۔ اسی مخلوق کو مصریوں نے دیوتا قرار دیا۔ بعض تصویری متنوں سے پتا چلتا ہے کہ اہرامِ مصر اصل میں اس خلائی مخلوق کے اُترنے کی جگہ تھی یعنی آپ اسے خلائی بندرگاہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہاں اس غیر ارضی مخلوق کے جہاز اُترتے تھے اور یہیں سے پرواز کر جاتے تھے۔ ممکنہ طور پر ہمیں اہرامِ مصر اور مصر کی دوسری قدیم تعمیرات پر ان کے دیوی دیوتاؤں کی جو شکلیں کندہ ملتی ہیں وہ اسی مخلوق کی ہوں جو کسی زمانے میں بہ قول مصریوں کے یہاں آتی تھی۔ ان کے جسم بہ ظاہر انسانوں جیسے لیکن سر مختلف ہوتے تھے۔ دوسرے یہ انسانوں کے مقابلے میں کہیں بڑے ہوتے تھے۔

اہرامِ مصر پر جیسے جیسے تحقیق ہو رہی ہے ان کے بارے میں یہ شبہ بڑھ رہا ہے کہ ان نہایت پیچیدہ اور اعلیٰ ریاضی کی مدد سے تعمیر کی جانے والی عمارات کو اصل میں انسان نے نہیں بنایا ہے۔ قدیم مصری بے شک ترقی یافتہ تھے اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ انہوں نے بہت ساری حسین تعمیرات کیں لیکن جہاں تک اہرامِ مصر کا تعلق ہے یہ کسی طرح بھی ان کے فنِ تعمیر سے میل نہیں کھاتی...... کم از کم غزہ کے تین بڑے اہرام مصریوں کے بنائے ہوئے نہیں ہیں کیونکہ جب یہ بنے تو اس وقت مصری عام عمارت بنانے کے فن سے واقف نہیں تھے اور نہ ہی ان اہراموں جتنی کوئی قدیم سادہ عمارت مصر میں ملتی ہے۔ تو اس سے یہ مطلب نکالا جائے کہ اہراموں کی تعمیر کچ کسی اور نے کی ہے اور وہ کوئی غیر ارضی مخلوق بھی ہو سکتی ہے۔

مصر کے علاوہ قدیم سمیری تہذیب میں بھی کچھ ایسی روایات ملتی ہیں جو آسمان سے آنے والی مخلوق کے بارے میں ہیں، ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ دیوتا تھے اور زمین پر حکومت کرنے آئے تھے۔ سمیریوں کے قدیم حکمران بھی ہمیں کچھ اسی قسم کے دعوے کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ یا تو خدا بن جاتے تھے یا پھر خود کو آسمان سے آنے والوں کی اولاد قرار دیتے تھے۔ بابل اور نینوا کے حکمران بھی ہمیں اسی خبط میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ حالانکہ وہ سراسر انسان تھے۔ اس وقت اور آج بھی انسانوں پر حکومت کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ انہیں کم تر اور خود کو کسی طرح برتر ثابت کر دیں، اس کے بعد لوگ خود بہ خود فرماں بردار ہو جاتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ وہ اس قسم کے دعوے کیوں کرتے تھے؟ کیا انہیں معلوم تھا کہ آسمان پر زمین جیسے اور سیارے بھی ہیں جہاں کسی مخلوق کے پائے جانے کے بہت زیادہ امکانات ہیں۔ لیکن بے انتہا دوری کے سبب جدید فلکی سائنس بھی اس بارے میں پتا نہیں چلا سکی ہے۔ اس وقت کے انسان کے لیے تو یہ ناممکن ہی تھا کہ وہ آسمانوں اور اس میں پائے جانے والے اجرامِ فلکی کے بارے میں اس حد تک جان سکیں۔ تب اس صورت میں کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ قدیم انسانوں نے براہِ راست غیر ارضی مخلوق کو دیکھا ہو۔ کیونکہ وہ ان کے بارے میں جس طرح سے وضاحت کرتے ہیں تقریباً وہی وضاحت ہمیں جدید ماہرین بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں جیسے ان کا جسم، ان کا لباس اور ان کے خلائی جہاز۔ ان کے بیان میں قدیم تہذیبوں اور جدید ماہرین کے بیان میں حیرت انگیز مماثلت ہے۔

مثال کے طور قدیم سمیری تہذیب کے ایک کتبے سے ظاہر ہے کہ آسمان سے کچھ غیر ارضی لوگ زمین پر آئے۔ انہوں نے خلابازوں جیسا لباس پہن رکھا تھا اور وہ ایک ایسے جہاز کے ذریعے زمین پر اُترے تھے جس کے نیچے سے شعلے یا شعلے نما روشنی نکلتی تھی۔ وہ دبلے اور طویل قامت تھے۔ اگرچہ انسان سے مشابہہ ضرور تھے لیکن انسان نہیں تھے۔ اسی طرح قدیم مایا اور انکا تہذیبوں میں بھی ایسی روایات ملتی ہیں جو خلا سے آنے والوں کے بارے میں ہیں۔ شمالی اور جنوبی امریکا میں حیرت انگیز طور پر وسیع ایسے میدان ملے ہیں جنہیں ہموار پتھروں سے کسی رن وے کی طرح تعمیر کیا گیا ہے۔ ان کی لمبائی کسی طرح آج کے رن ویز سے کم نہیں ہے بلکہ یہ ان سے کہیں زیادہ بڑے ہیں۔ ماہرین آج تک ان کی تعمیر کی وجہ نہیں جان سکے۔

پتھروں سے بنے یہ میدان کم سے کم بھی آٹھ ہزار سال پُرانے ہیں۔ یہ وقت تھا جب انسان نیا نیا امریکا کے... براعظم میں وارد ہوا تھا اور جنوبی امریکا تک تو شاید اس کے قدم ابھی کہیں پہنچے تھے۔ کئی فٹ لمبے چوڑے پتھر جن کا وزن ٹنوں میں ہے نہایت مہارت اور صفائی کے ساتھ آپس میں جوڑے گئے ہیں اور ان کی مضبوطی اب تک برقرار ہے۔ ان پتھروں کو کئی سو میل دور پہاڑوں سے کاٹ کر لایا گیا تھا جب کہ امریکا میں آباد کسی بھی تہذیب میں پہیے کا نشان نہیں ملتا اس لیے یہاں کسی قسم کی بھی گاڑی پائے جانے کا بھی امکان نہیں تھا۔ تب یہ پتھر کیسے لائے گئے؟ پھر یہاں دھاتوں کے استعمال کا رواج بھی نہیں تھا وہ صرف سونے اور چاندی سے واقف تھے۔ ان سے اوزار نہیں بنتے۔ پھر ان پتھروں کو کیسے کاٹ کر بالکل چوکور بلاک کی صورت دی گئی اور انہیں اس جگہ رکھا گیا؟ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے۔

آج کے فلکی ماہرین غیر ارضی مخلوق کے وجود اور اس کی زمین پر آمد پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ وسیع و عریض پلیٹ فارم دراصل خلا سے آنے والی مخلوق نے بنائے تھے اور وہ یہاں اپنے خلائی جہاز اُتارتے تھے۔ کیونکہ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی صرف پتھروں کی مدد سے اتنے بڑے میدان تعمیر کرنا ممکن نہیں ہے۔ ہاں ہم روایتی کنکریٹ اور دوسرے طریقوں سے بنا سکتے ہیں۔ البتہ اس دور میں نہ تو سیمنٹ تھی اور نہ ہی لوہے کا استعمال کیا جاتا تھا اس لیے آسمان سے آنے والی مخلوق نے آسان کام کیا۔ ان کے پاس یقیناً پتھروں کو تراشنے اور ان کو اُٹھا کر ایک مقام سے دوسرے مقام تک لانے کے لیے مناسب ٹیکنالوجی تھی۔ اس لیے انہوں نے اپنے لیے رن ویز بنا لیے جہاں ان کے خلائی جہاز اُترتے اور یہیں سے پرواز کرتے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے مزدوروں کا کام اس وقت یہاں آنے والے انسانوں سے لیا ہوگا۔ ممکن ہے اس وقت یہ مخلوق کسی کام سے زمین پر آتی ہو اور جب اس کا کام مکمل ہو گیا تو وہ یہاں سے رخصت ہو گئی اور یہ وسیع پلیٹ فارم اس کی یادگار کے طور پر باقی رہ گئے تھے۔

افریقہ کے وحشی قبائل میں بھی ایسی روایات عام ہیں کہ ان کے دیوتا آسمانوں سے آتے تھے۔ بعض قبائل آج تک ان دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں۔ شمالی کانگو کے گھنے جنگلوں میں بسنے والے ایک چھوٹے سے قبیلے کے لوگوں کا دعویٰ ہے کہ ان کے پاس چند سال پہلے تک آسمان سے دیوتا آتے رہے تھے۔ وہ ایسے رتھوں میں سوار ہوتے تھے جن کے نیچے سے شعلے اور روشنیاں نکل رہی ہوتی تھیں۔ لیکن جب مہذب انسان کے قدم اس علاقے میں پہنچے تو ان دیوتاؤں کی آمد رک گئی۔ اس علاقے میں پہنچنے والے مغربی مہم جوؤں کو بعض ایسی چیزیں ملی ہیں جن سے ان وحشیوں کے دعوے کی تصدیق ہو سکتی ہے لیکن انہوں نے یہ چیزیں قیمتی سمجھ کر غائب کر دیں۔

البتہ انٹرنیٹ پر ایک ایسی تصویر دستیاب ہے جس میں اس قبیلے کے لوگ ایک گول گنبد نما دھاتی چیز کے ساتھ کھڑے ہیں۔ یہ شکل میں لمبوتری اور بیضوی ہے اور اس کی اونچائی بارہ فٹ کے لگ بھگ ہے۔ اس چیز کے بارے میں وحشیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ دیوتاؤں کی سواری ہے اور وہ اس میں بیٹھ کر

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہاں آتے ہیں۔ دیوتاؤں کی شکل وصورت کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے کیونکہ انہوں نے سیاہ رنگ کے ایسے لباس پہن رکھے ہوتے ہیں جو انہیں سر سے پاؤں تک ڈھانپ کر رکھتے ہیں۔ ان کے قد طویل اور جسم دبلے ہیں اور وہ آپس میں کسی ایسی زبان میں بات کرتے ہیں جو وحشیوں کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ البتہ وہ ان سے ان کی زبان میں بات کرتے تھے۔

حیرت انگیز بات ہے کہ آسمان سے آنے والوں کی روایات ہمیں صرف ان علاقوں میں ملتی ہیں جو الہامی مذاہب کے اثر سے دور تھے جیسے مصر، جنوبی اور شمالی امریکا اور افریقا وغیرہ۔ اس کے برعکس ہمیں ایشیا اور یورپ کے ان خطوں میں جو بعد میں الہامی مذاہب کا گھر بنے ماضی میں ایسی روایات بہت کم اور نہ ہونے کے برابر ملتی ہیں۔ کم سے کم ان مذاہب کے ماننے والے قدیم لوگ ایسی روایات بیان نہیں کرتے ہیں جن میں کسی غیر ارضی مخلوق کی زمین پر آمد کا ذکر ہو۔ حالانکہ یہ لوگ تحریر اور تہذیب کے لحاظ سے ترقی یافتہ تھے۔ اگر ان کے علم میں ایسی کوئی بات آتی تو وہ لازمی ریکارڈ کا حصہ بنتی۔ مگر ہمیں قصے کہانیاں تو بہت ملتی ہیں لیکن سنجیدہ ریکارڈ کہیں دستیاب نہیں۔

مسلمانوں کے دور میں علمِ فلکیات میں بے پناہ ترقی ہوئی تھی اور مسلمانوں نے اسے اپنے دور میں عروج پر پہنچا دیا تھا لیکن پھر ہم علمی انحطاط کا شکار ہوئے اور دوسری طرف اہلِ یورپ نے سائنس کی شمع تھام لی۔ انہوں نے چرچ کی بے پناہ مخالفت کے باوجود سائنسی تحقیق کا سلسلہ جاری رکھا۔ خاص طور سے گلیلیو نے نہایت بہادری سے سائنسی کام کیے اور پھر اس کی ایجاد کی ہوئی دوربین نے صحیح معنوں میں فلکیات کی ترقی کا راستہ کھول دیا۔ اب تک انسان صرف آنکھ سے مشاہدہ کرتا تھا اور آسمان اور اس پر پائے جانے والے اجرامِ فلکی کے بارے میں اندازے لگاتا تھا۔ بائبل زمین کو کائنات کا مرکز قرار دیتی ہے اس لیے چرچ اس خیال پر قائم تھا کہ باقی چاند سورج اور ستارے زمین کے گرد گردش کرتے ہیں۔ مگر دوربین کی دریافت کے ساتھ ہی یہ واضح ہو گیا کہ زمین اپنے محور پر گھومتی ہے نہ کہ باقی اجرامِ فلکی اس کے گرد گھومتے ہیں۔ جیسے جیسے طاقتور دوربینیں ایجاد ہوتی گئیں ہم کائنات میں زیادہ سے زیادہ دور دیکھنے کے قابل ہوتے چلے گئے تھے۔

جدید فلکیات نے دریافت کیا کہ آسمان پر سورج جیسے لاتعداد ستارے ہیں اور ان میں سے بہت سارے اپنا نظامِ شمسی رکھتے ہیں یعنی ان کے گرد سیارے گردش کر رہے ہیں۔ اس سے یہ خیال پیدا ہوا کہ ان سیاروں میں انسان جیسی یا اس سے زیادہ ذہانت رکھنے والی کوئی مخلوق بھی موجود ہو سکتی ہے۔ ماہرین کے اندازے کے مطابق صرف ہماری کہکشاں میں ایسے ایک ارب ستارے موجود ہیں جن کے گرد سیارے پائے جاتے ہیں اور ان میں سے کم سے کم دس فیصد نظام ہائے شمسی میں کم سے کم ایک سیارہ ایسا ہو سکتا ہے جس میں زندگی پائی جاتی ہو۔ یعنی صرف ہماری کہکشاں میں دس کروڑ سیارے ایسے ہیں جن میں زندگی پائی جا سکتی ہے۔ اگر ان میں سے صرف ایک فیصد میں ذہین مخلوق موجود ہو تو ہماری جیسی کم سے کم دس لاکھ ذہین مخلوق موجود ہیں۔

اب فرض کر لیا جائے کہ اس ذہین مخلوق میں سے کچھ تو ایسی ہوں گی جو سائنسی لحاظ سے ہم سے زیادہ ترقی یافتہ ہوں گی اور وہ ایسے وسائل بھی رکھتی ہیں کہ طویل خلائی سفر کر سکیں۔ انہوں نے اس سفر کے دوران ہمیں یعنی زمین کو دریافت کر لیا ہو گا۔ اب وہ کب آئے اور زمین پر کہاں اترے یہ خارج از بحث ہے کیونکہ ہمارے پاس اب تک ایسا کوئی سائنٹیفک ثبوت نہیں ہے کہ جس سے پتا چلے کہ زمانہ قدم یا حال میں خلا سے کوئی مخلوق زمین پر آئی ہے۔ البتہ ایسی مبہم نشانیاں بے شمار ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ کوئی ایسی مخلوق زمین کا دورہ کر چکی ہے۔ اگرچہ ایسی نشانیوں کی اکثریت یا تو غیر متمدن علاقوں سے تعلق رکھتی ہے یا حیرت انگیز طور پر یہ ہمیں صرف یورپ اور شمالی و جنوبی امریکا میں دکھائی دیتی ہیں۔ ان میں سب سے اہم نشانی اڑن طشتریاں ہیں۔ جو دنیا کے مخصوص حصوں میں دکھائی دیتی ہیں اور ان کا تعلق غیر ارضی مخلوق سے جوڑا جاتا ہے۔

اڑن طشتریوں کا ذکر یوں تو ہمیں قدیم فکشن ادب میں اڑن کھٹولوں کے طور پر ملتا ہے لیکن ان کی شکل وصورت مختلف بیان کی جاتی تھی۔ مغربی اور مشرقی ادب میں انہیں یکساں بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے ان اڑن کھٹولوں کا تعلق زمین سے اور اس کے باسیوں سے جوڑا جاتا ہے۔ ان داستانوں میں کہیں غیر ارضی مخلوق کا ذکر نہیں ملتا۔ پھر عملی طور پر کسی نے ان کو نہیں دیکھا تھا۔ لیکن جدید سائنس کے آغاز کے ساتھ ہی ایسی شہادتیں ملنے لگیں کہ لوگوں نے اڑن طشتری نما چیز کو ہوا میں پرواز کرتے دیکھا ہے۔ ان کو اڑن طشتریاں یا فلائنگ ساسر کا نام اس لیے دیا گیا کیونکہ ان کی شکل طشتری سے مشابہہ ہے۔ دوسرے دیکھنے والوں نے ان میں سے نکلنے

والی رنگ برنگی چمکیلی روشنیوں اور شعلوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ پھر تقریباً سب نے ان کو بے آواز قرار دیا۔ ان سے ہلکی سیٹی نما یا پانی کھولنے جیسی سنسناتی آواز آتی ہے۔ حیرت انگیز بات ہے کہ ان اڑن طشتریوں کو بہت تیز رفتار بتایا جاتا ہے۔ بعض واقعات میں ان کی رفتار کئی ہزار میل فی گھنٹا بھی پائی گئی ہے لیکن ان کی رفتار کی وجہ سے ساؤنڈ بیریر کے ٹوٹنے کے دھماکے کا کسی نے ذکر نہیں کیا ہے۔ جب کوئی طیارہ آواز کی حد رفتار کو توڑتا ہے تو ایک زوردار دھماکا سنائی دیتا ہے۔ اس کا تجربہ اکثر لوگوں کو ہوتا ہے جب کوئی لڑاکا طیارہ شہر کے اوپر سے گزرتا ہے۔

اڑن طشتریوں کے سلسلے میں پہلی باقاعدہ شہادت کرسٹوفر کولمبس کی لاگ بک ہے جس میں اس نے جزائر کریبین کے قریب برمودا کے علاقے میں سمندر سے نکلنے والے تین حیرت انگیز اجسام کا ذکر کیا ہے۔ اس نے انہیں گول چپٹی گیندوں سے مشابہہ قرار دیا اور سمندر سے نکلنے کے بعد ان روشن گولوں نے اس کے ایک بحری جہاز کو بھی غرقاب کر دیا تھا۔ کولمبس کے مطابق ایک چمکدار گولہ اس کے ایک بحری جہاز سے ٹکرایا اور اگلے ہی لمحے وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر سمندر نشین ہو گیا جب کہ گولے کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔ پھر وہ جیسے پانی سے باہر آئے تھے ویسے ہی واپس پانی میں چلے گئے۔ کولمبس نے وہاں رکنے کے بجائے اپنے بحری جہازوں کی رفتار تیز کرنے کا حکم دیا اور جلد وہ اس علاقے سے دور نکل گئے تھے۔ یہ واقعہ کولمبس کے دوسرے سفر کے دوران پیش آیا تھا۔ اسی طرح کا ایک واقعہ اور ہے لیکن اس میں کولمبس نے سمندر سے ایک عفریت نما جانور نکلتے دیکھا تھا اور اس نے اسے طوفان کی نشانی سمجھ کر راستہ بدل دیا تھا شاید اسی وجہ سے وہ اپنے بحری جہاز بچا لے جانے میں کامیاب ہوا تھا۔ کولمبس کے بعض دوسرے جہازوں کے کپتانوں نے بیان کیا کہ انہوں نے آسمان پر ایسی اڑنے والی چیزیں دیکھیں جو سمندر سے نکلتی تھیں اور وہ اتنی تیز رفتار تھیں کہ افق سے افق تک کا سفر چند لمحوں میں طے کر لیتی تھیں۔ سمندر میں افق تیس میل ہوتا ہے گویا یہ اڑنے والی چیزیں ساٹھ میل کا فاصلہ چند سیکنڈ میں طے کر لیتی تھیں۔ یہ کوئی بیس ہزار میل فی گھنٹے کی رفتار بنتی ہے اور یہ رفتار حیرت انگیز ہے کیونکہ آج کا انسان اتنی ترقی کے باوجود کوئی ایسا ہوائی جہاز یا راکٹ ایجاد نہیں کر سکا۔ جو کرہ ہوائی میں اتنی رفتار سے اڑ سکے۔

اس کے بعد وقفے وقفے سے برمودہ کے علاقے میں اڑنے والی چیزوں کے بارے میں واقعات منظرِ عام پر آتے رہے تھے۔ کولمبس کی آمد کے ساتھ ہی اسپین سے لٹیروں اور خزانوں کے متلاشیوں کا ایک سیلاب اس طرف آیا تھا۔ اس علاقے سے اڑن طشتریوں، حیرت انگیز جہاز نظر آنے اور دوسرے واقعات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا جو آج تک جاری ہے۔ یہ تو بالکل واضح ہے کہ آج سے پانچ سو سال پہلے کوئی تہذیب اتنی ترقی یافتہ نہیں تھی کہ اس قسم کی اڑن طشتریاں یا دوسری چیزیں بنا سکتی۔ جنوبی امریکا اور شمالی امریکا کے قبائل تو خارج از بحث ہیں۔ وہ اس وقت دنیا کے پسماندہ ترین قبائل تھے۔ اگرچہ انہوں نے بعض حیرت انگیز تعمیرات ضرور کی تھیں لیکن بہ حیثیت مجموعی وہ آج کے پسماندہ ترین قبائل سے بھی گئے گزرے تھے۔ ان کو نہ تو دھاتوں کا استعمال آتا تھا اور نہ ہی وہ منظم کاشت کاری کرنا جانتے تھے۔ وہ صرف شکار کرتے تھے کبھی جانوروں کا اور کبھی اپنے جیسے انسانوں کا۔

تب یہ اڑن طشتریاں کہاں سے آئیں؟ اس کا جواب ایک جرمن نژاد امریکی ماہر ایرک فان ڈینیکن دیتے ہیں۔ ”یہ اڑن طشتریاں یقیناً اس مخلوق کی ہیں جو کہیں بعید خلا سے زمین پر آئی اور اس نے یہاں اپنے اڈے بنائے۔“

اس بارے میں وہ بالکل پُریقین ہیں کہ کبھی خلا سے کوئی مخلوق زمین پر آئی تھی۔ لیکن اس سوال کا درست جواب ایرک کے پاس بھی نہیں ہے کہ اگر ایسی کوئی مخلوق آئی تھی تو اس نے انسانوں سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟ اور نہ ہی اپنی آمد کا کوئی واضح ثبوت چھوڑا۔ سب سے اہم بات ہے کہ وہ آئے کیوں تھے؟ طویل خلائی سفر مذاق نہیں ہے اور نہ ہی کوئی مخلوق اس سفر کو محض تفریحِ طبع کے لیے کر سکتی ہے۔ اگر زمین پر کوئی مخلوق خلا سے آئی تو اس کا یقیناً کوئی بڑا مقصد ہو گا۔ آج سے کوئی پچاس برس پہلے اکثر ماہرین اور فلکی سائنس دان اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ کائنات میں انسان سے زیادہ ذہین مخلوق اور کوئی نہیں ہے۔ ہاں وہ یہ ماننے کو تیار تھے کہ انسان کے علاوہ اور بھی مخلوقات اس وسیع وعریض کائنات میں پائی جاتی ہیں۔ مگر وہ انہیں انسان سے زیادہ ذہین اور ترقی یافتہ ماننے کو تیار نہیں تھے۔ دوسرے لفظوں میں وہ انکار کر رہے تھے کہ خلا سے کوئی دوسری مخلوق زمین پر آئی ہے۔ کیونکہ بین الخلائی سفر نہایت دشوار ہے۔ آج کی ترقی یافتہ ٹیکنالوجی بھی اس قابل نہیں ہے کہ انسان کو کسی دوسرے سیارے تک بہ حفاظت پہنچایا جا سکے۔ چاند تک کا سفر ہی اتنا مہنگا پڑ گیا کہ اب کئی عشروں سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

2002ء میں گورنمنٹ ایم اے او کالج لاہور کے شعبۂ نفسیات کی ایک ریسرچ رپورٹ جو کہ اسی کالج کے دو طالب علموں محمد شفیق اور احسان الٰہی کی مرتب کردہ تھی کے مطابق عملیات کرانے والوں میں سے 60 فی صد مرد و خواتین ایسے ہوتے ہیں جو کہ اپنے جسمانی و ذہنی امراض سے پریشان ہوتے ہیں، کچھ لوگوں کے پاس علاج معالجے کے لیے پیسے نہیں ہوتے اور ان کے عزیز و اقارب انہیں آسیب زدہ سمجھ کر عامل کے پاس جانے کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ ایسی خواتین جن کے یہاں اولاد نہیں ہوتی یا وہ اولادِ نرینہ سے محروم ہوتی ہیں، ان کی اکثریت عاملین سے رجوع کرتی ہے۔ 30 فی صد افراد کا مسئلہ ذاتی پریشانیاں ہوتی ہیں مثلاً کاروبار میں مندی، بیٹیوں کی شادیوں میں رکاوٹ، ساس بہو کے جھگڑے، مقدمے بازی، ذہنی سکون کی تلاش، انعامی بانڈز کے ذریعے دولت کا حصول، ملازمتوں میں ترقی، ٹرانسفر، اچھی اور پسندیدہ جگہوں پر پوسٹنگ وغیرہ وغیرہ۔ اور بقیہ 10 فی صد رجوع کرنے والے دشمنوں کے خلاف حسد اور نفرت کے کارفرما جذبے کے تحت ان سے ملنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ان میں بھی خواتین کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ جو محض رقابت کی وجہ سے اپنے مخالفین کو ہر طرح نیچا دکھانے کے جذبے سے مغلوب ہوتی ہیں۔ زیادہ تر معاملات، شادی بیاہ اور رشتوں سے متعلق ہوتے ہیں کیونکہ اکثر مرد و خواتین ان لوگوں کے گھروں کو ہنستا بستا دیکھنا نہیں چاہتے جو ان کی مرضی کے خلاف شادی کر لیتے ہیں۔ اکثر اوقات عورتیں اس بات کا تعویذ لیتی ہیں کہ ان کے شوہر کسی اور عورت میں دلچسپی نہ لینے لگیں جبکہ نوجوان لڑکے لڑکیاں اپنی پسند کی شادی کے لیے ان سے رجوع کرتے ہیں۔ اکثر عورتیں جن میں ماں اور بہنوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اپنی بیٹی یا بہن کے لیے ان کی شادی سے قبل ہی ان عاملین سے رجوع کرتی ہیں کہ کوئی ایسا نقش حاصل کر سکیں جس کے باعث ان کا ہونے والا داماد یا بہنوئی کاٹھ کے اُلو کی طرح ان کے اشارے پر چلے اور جلد از جلد سسرال کے آس پاس آباد ہو جائے تا کہ اس کی آمدنی پر بلاشرکتِ غیرے ان کا راج ہو اور اس کی آمدنی میں لڑکے کے ماں باپ، بہن بھائی حصے دار نہ بن سکیں۔ ان مرتبین نے اس سروے سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ پچھلے بیس پچیس سالوں کے دوران ہمارے معاشرے میں جادو اور ٹونے کے رجحان میں 40 فی صد اضافہ ہوا ہے۔ جس کی وجوہات میں ہمارے معاشرے میں پھیلی ہوئی بے چینی، افراتفری، خود غرضی، بے روزگاری، ازدواجی جھگڑے، غربت و تنگدستی، مقدمہ بازی، حسد، رقابت اور راتوں رات امیر ہو جانے کی خواہشات کا بہت زیادہ عمل دخل ہے اور اس نئے رجحان کی زیادتی کے سبب بے شمار بے روزگار اور جرائم پیشہ لوگ جعلی عاملوں کا روپ دھار بیٹھے ہیں کیونکہ اس کاروبار کے لیے نہ تو تعلیم ضروری ہوتی ہے اور نہ ہی کسی قسم کا لائسنس درکار ہوتا ہے جبکہ کوئی بہت بڑی سرمایہ کاری بھی درکار نہیں ہوتی۔

مرسلہ: صاحب زادہ، اٹک

کسی ملک نے اپنا خلاباز چاند پر نہیں بھیجا...... اس وقت اگر کوئی سائنس دان یا ماہر کہتا کہ اسے یقین ہے ماضی میں کسی مخلوق نے ایک بار ضرور زمین پر قدم رکھا ہے اور وہ بعید خلا سے آئی تھی تو اس کا مذاق اُڑتا تھا۔

ایرک فان کہتا ہے۔ ''جب ایڈیسن نے برقی لیمپ ایجاد کر لیا تھا اور اس کا کامیاب مظاہرہ بھی کر کے دکھا دیا تھا تب بھی اس وقت کے سائنس دانوں کا خیال تھا کہ یہ چیز کامیاب نہیں ہو گی لیکن چند سالوں بعد ترقی یافتہ ممالک کا ہر گھر برقی قمقموں سے روشن تھا۔ اسی طرح راکٹ اور ہوائی جہاز کی ممکنہ تیاری پر اس وقت کے بہترین سائنس دان شک و شبے کا اظہار کر رہے تھے جب کہ ان چیزوں کو بنانے کی تیاری کی جا رہی تھی۔ اس کے چند سالوں بعد ہوائی جہاز اور راکٹ پرواز کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کسی چیز کے ممکنات اور ناممکنات کے بارے میں سائنس دانوں کا کہا حرفِ آخر نہیں ہے۔ نصف صدی پہلے غیر ارضی مخلوق صرف ایک سائنس فکشن تھی لیکن آج اس پر شبہ کرنے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔''

کیونکہ سائنس اور خاص طور سے فلکیات میں مسلسل ترقی اور اس بارے میں نئے نظریات سے یہ چیز اب پہلے سے زیادہ ممکن نظر آنے لگی ہے کہ اس کائنات میں انسان کے علاوہ بھی ذہین مخلوقات موجود ہیں اور ان میں سے کوئی کم سے کم ایک بار زمین پر آچکا ہے۔ مشہور سائنس دان ڈاکٹر چارلس گڈ ہوپ کہتے ہیں کہ البرٹ آئن اسٹائن بھی اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ زمین پر کہیں باہر سے کوئی مخلوق آچکی ہے۔ گڈ ہوپ اور آئن اسٹائن کے قریبی تعلقات تھے۔ اسی طرح روسی سائنس دان ڈاکٹر جوزف شکولوسکی جن کا شمار روس کے بڑے ماہرین فلکیات میں ہوتا ہے ان کا بھی یہی خیال ہے کم سے کم ایک بار کوئی ذہین مخلوق خلا سے ہماری زمین پر آچکی ہے۔ ان کے علاوہ بھی بے شمار سائنس دان اور ماہرین ایسے ہیں جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں۔

ایرک فان کا کہنا درست ہے اب سائنس دان پہلے سے زیادہ اس بات کے قائل ہوتے جا رہے ہیں کہ خلا سے کوئی مخلوق زمین پر آچکی ہے۔ ممکن ہے وہ اس وقت آئی ہو جب انسان غاروں میں زندگی گزار رہا ہو اور اس وقت انسان اس قابل نہیں تھا کہ اس کی آمد کو سمجھ سکے یا اس کی آمد کو ریکارڈ کر سکے۔ بلکہ اس وقت انسان کے غیر علمی اور اوہام پرست ذہن نے اسے کچھ اور سمجھا ہو گا اور آنے والوں کو دیوتا اور معبود بنا دیا ہو گا۔ شاید یہی وجہ ہمیں بیشتر غیر الہامی مذاہب میں دیوتاؤں کا تعلق آسمانوں سے ملتا ہے۔

زمین پر کسی خلائی مخلوق کی آمد کے حامی ماہرین قدیم زمانے کی عجوبہ اور بہ ظاہر سمجھ میں نہ آنے والی تعمیرات کو بھی اسی مخلوق کا کارنامہ قرار دیتے ہیں جو کبھی زمین پر آئی تھی۔ اس وقت انسان کے غیر متمدن ہونے کی وجہ سے اس نے فیصلہ کیا کہ مستقبل کے انسانوں کو بتانے کے لیے کہ وہ یہاں آئے تھے انہوں نے عالی شان قسم کی تعمیرات کیں جو اس وقت کے انسانوں کے بس کی بات نہیں تھیں۔ جیسے اہرامِ مصر یا جنوبی

امریکا میں سیکسامان کا قلعہ جو سات ہزار فٹ کی بلندی پر ایسے پتھروں سے تعمیر کیا گیا ہے جن کا انفرادی وزن ڈھائی سو ٹن تک ہے۔ ناقابلِ یقین طور پر ان پتھروں کو دو ہزار فٹ سے سات ہزار فٹ بلند ایسے مقام پر لے جایا گیا جہاں پیدل انسان کا پہنچنا بھی دشوار کام ہے۔ اسی طرح اہرامِ مصر کی تعمیر اور اس میں استعمال کی جانے والی تکنیک بھی اس وقت کے انسانوں کے بس سے باہر ہی نظر آتی ہے۔

اگر انسان اس قابل نہیں تھا تو پھر یہ تعمیرات کس نے کیں؟ خلائی مخلوق کی آمد کے حامی ماہرین انہیں ان تعمیرات کا ذمّے دار قرار دیتے ہیں۔ آسان سی بات ہے جو مخلوق نہایت دور دراز خلائی سفر کی استعداد رکھتی ہو اس کے لیے اس قسم کی تعمیرات کرنا یقیناً بچوں کے کھیل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا ہو گا۔ اپنے قارئین کی آسانی کے لیے وضاحت کر دیں کہ دور دراز خلائی سفر کتنا دشوار ہے اور آج تک انسان خلائی سفر کے جو ذرائع استعمال کر رہا ہے اس میں یہ تقریباً ناممکن ہے۔

ہمارے نظامِ شمسی کی آخری حد سیارہ پلوٹو ہے اور یہ سورج سے کوئی پونے چھ ارب میل کے فاصلے پر ہے۔ کائنات کی تیز ترین چیز روشنی ہے اور اسے بھی پلوٹو تک پہنچنے میں گھنٹوں لگ جاتے ہیں۔ انسان نے آج تک جو سب سے تیز رفتار چیز بنائی ہے وہ مشتری کی طرف بھیجا جانے والا ایک مصنوعی سیارچہ جو خلا میں جانے کے بعد تقریباً سو کلومیٹر فی سیکنڈ کی زبردست رفتار سے سفر کرے گا۔ لیکن کائنات کے پیمانے پر یہ رفتار چیونٹی سے بھی کم ہے اس لیے اس سیارچے کو مشتری تک پہنچنے میں کئی سال لگیں گے۔ مشتری کی طرف جانے والا اوّلین سیارچہ وائجر دوم اس وقت نظامِ شمسی کی حدوں سے باہر نکل گیا ہے لیکن اس کام میں اسے تیس سال سے زیادہ کا عرصہ لگا ہے اور اب اس کا کمپیوٹر سے رابطہ بھی ختم ہو گیا ہے۔ گویا نظامِ شمسی کی حدود سے باہر جانے کے لیے بھی عشروں کا وقت لگ جاتا ہے۔

زمین سے سورج کے بعد نزدیک ترین ستارہ بھی اتنے فاصلے پر ہے کہ اس کی روشنی کو زمین تک پہنچنے میں چار اعشاریہ دو سال لگ جاتے ہیں۔ یعنی اگر کوئی خلائی جہاز روشنی کی رفتار سے سفر کرے تو اسے نزدیک ترین ستارے تک پہنچنے میں چار سال سے زیادہ وقت لگ جائے گا۔ فزکس کے رفتار کے کلیے کی رو سے کوئی چیز روشنی سے زیادہ تیز رفتاری سے سفر نہیں کر سکتی ..... اور مادی اشیا کے سفر کرنے کی رفتار کا کلیہ تو اسے اور بھی محدود کر دیتا ہے۔ کیونکہ جیسے جیسے رفتار بڑھتی ہے کمیت یا وزن بھی بڑھتا ہے اور مزید وزن کو دھکیلنے کے لیے مزید توانائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ مزید رفتار وزن کو مزید بڑھاتی ہے اس طرح رفتار کی ایک حد مقرر ہو جاتی ہے۔ اس لیے کوئی بھی روایتی خلائی جہاز ایک خاص رفتار سے زیادہ تیز نہیں ہو سکتا۔

اگرچہ جدید تحقیق کے مطابق روشنی کی رفتار سے تیز سفر بھی ممکن ہے لیکن یہ فی الحال صرف نظریے تک محدود ہے اور اس کی عملی صورت دور دور تک نظر نہیں آتی۔ لیکن مفروضے کے طور پر مان لیا جائے کہ کائنات میں کوئی اور مخلوق اتنی ذہین اور ترقی یافتہ ہے کہ اس نے آج سے دس بارہ ہزار سال پہلے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

زمین کا سفر کیا اور وہ یقیناً کسی دور دراز سیارے سے آئی ہوگی اور اس کا بھی امکان ہے کہ انہوں نے یہ سفر بہت طویل عرصے میں کیا ہو اور ان کو اتنا طویل سفر کرنے کی دوبارہ ہمت نہ ہوئی ہو۔ اس لیے وہ بس ایک بار ہی زمین پر آسکے ہوں اور اپنی آمد کا ثبوت ان دیو ہیکل سنگی تعمیرات کی صورت میں چھوڑ گئے ہوں۔ اس کے بعد دوبارہ ان کی آمد نہ ہوسکی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے ان عمارات پر کوئی تحریر یا کوئی ایسا اشارہ چھوڑا ہو جو اگلے زمانے کے انسانوں کو ان کے بارے میں بتا سکے لیکن جب انسان متمدّن ہوا اور اس نے ان تعمیرات پر قبضہ کیا تو انہیں اپنی کاوش قرار دینے کے لیے اس پر موجود تحریر یا جو بھی اشارے تھے وہ مٹا دیے اور ان پر اپنی تصویریں اور تحریریں کندہ کردیں۔ تقریباً تمام تعمیرات کے ساتھ یہی سلوک ہوا اور آج ہم بے خبر ہیں کہ ان کو کس نے اور کیوں بنایا تھا؟ جیسا کہ اہرامِ مصر کے ساتھ ہوا۔ ان میں بعض اوقات تو دو دو بار تحریروں اور نشانات کو کندہ کیا گیا اور سابق نشانات مٹا دیے گئے۔

سولہویں اور سترھویں صدی میں کچھ اس قسم کی کہانیاں اور ناول لکھے گئے جن میں زمین سے باہر سے آنے والی مخلوق کا ذکر تھا۔ لیکن یہ ناقابلِ ذکر تھیں۔ لیکن فلکیات کے علم میں ترقی اور عام انسانوں کا اس بارے میں شعور بڑھنے سے رفتہ رفتہ لکھنے والوں کا اس طرف رجحان بڑھنے لگا۔ 1898 میں امریکی مصنف ایچ جی ویلز کی اس سلسلے میں پہلی مقبول کاوش ''وار آف دی ورلڈز'' آج بھی مقبول ہے۔ جب دوسری جنگِ عظیم کے بعد ریڈیو سے اس پر لکھا ہوا ڈراما نشر ہوا تو اس کا انداز حقیقی رکھا گیا تھا اور اس سے لوگ سمجھے کہ سچ مچ خلا سے آنے والے ایلینز نے زمین پر حملہ کردیا ہے۔ اس سے ایک گھبراہٹ اور افراتفری پھیل گئی تھی جسے ختم کرنے میں خاصا وقت لگا تھا۔ جب ریڈیو سے اعلان ہوا کہ یہ صرف ایک ڈراما ہے تب عوام نے سکون کا سانس لیا۔

ناول میں مریخ کی ترقی یافتہ مخلوق کو زمین پر حملہ آور دکھایا گیا تھا۔ اصل میں یہ بڑی طاقتوں کی طرف سے کالونیزم اور گن بوٹ پالیسی کے خلاف ایک علامتی تحریر تھی لیکن اس نے خلائی ادب کی بنیاد رکھ دی۔ اس کی مقبولیت نے ہزاروں افراد کو فلکیات اور دوسری دنیاؤں میں زندگی کے امکانات کی طرف راغب کیا تھا۔ ان میں ایک مشہور ماہرِ فلکیات اور غیر ارضی مخلوق کی آمد کا حامی کارل ساگاں بھی تھا۔ یہ وہی شخص ہے جس نے پہلی بار ایک ڈاکومینٹری مووی بنا کر فلکیات اور سائنس کو عوام تک پہنچایا۔ اس کی بنائی یہ ڈاکومنٹری ایک زمانے میں پی ٹی وی سے بھی نشر ہوئی تھی۔ اس ڈاکومینٹری نے نئی نسل کو اتنا متاثر کیا کہ آج کے کئی سو اعلیٰ درجے کے فلکیاتی ماہر صرف اسی ڈاکومینٹری کی وجہ سے ماہرِ فلکیات بنے۔

اس کے بعد خلا سے متعلق ادب کا مغرب میں ڈھیر لگ گیا تھا جو تقریباً سب کا سب کسی غیر ارضی مخلوق کے بارے میں ہے۔ اس وجہ سے لوگوں میں اس بات پر یقین بڑھنے لگا کہ زمین پر کبھی یا اب بھی غیر ارضی مخلوق آتی ہے اور وہ زمین والوں سے رابطے کی کوشش کرتی ہیں لیکن اس طرح سے کہ وہ اپنے وجود کا ثبوت نہیں دینا چاہتی ہیں۔ تقریباً ستّر فی صد امریکیوں کو یقین ہے کہ ہمارے سیارے سے باہر بھی زندگی موجود ہے۔ تیس فیصد امریکی اس بات کے حامی ہیں کہ بیرونی مخلوق زمین پر آچکی ہے اور تقریباً اسی فیصد امریکی اُڑن طشتریوں کا تعلق خلائی مخلوق سے جوڑتے ہیں۔

فکشن کس طرح ہماری زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ بیسویں صدی میں ایجاد ہونے والی نوّے فیصد اشیا کا ذکر پہلے فکشن میں آیا اور پھر انہیں عملی طور پر بنایا گیا۔ جیسے ایٹم بم، طیارے، راکٹ، ٹیلی ویژن، فیکس مشین، موبائل فون، مصنوعی سیارے اور آبدوز وغیرہ۔ گویا فکشن ہمیں اس طرح سے متاثر کرتا ہے کہ یہ سائنس دانوں کو تخلیق کی راہ دکھاتا ہے۔ اسی طرح جب خلائی ادب لکھنے والوں نے ایسی مخلوق کی کہانیاں لکھیں جو باہر سے زمین پر آتی ہے۔ یہاں حملہ کرتی ہے یا کچھ اور کرتی ہے۔ اس کے بعد سے لوگوں میں اس چیز سے دلچسپی بہت زیادہ بڑھ گئی۔

مگر غیر ارضی مخلوق کسی ایجاد کا معاملہ نہیں ہے جو کوئی سائنس دان ایجاد کرلے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ ہم آنے والے دنوں میں کسی غیر ارضی تہذیب سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہوجائیں۔ لیکن اس چیز میں یہ امر مانع ہے کہ ستاروں کے درمیان فاصلہ لامتناہی ہے۔ جیسا کہ بتایا کہ سورج کا قریب ترین ستارہ بھی اتنا دور ہے کہ اس کی روشنی کو یہاں آنے میں چار سال سے زیادہ کا وقت لگتا ہے۔ پیغام لے جانے والی ریڈیائی لہریں بھی روشنی کی رفتار سے سفر کرتی ہیں۔ زمین سے کوئی اسّی نوری سال کے فاصلے پر ستاروں کا ایک مجموعہ ہے۔ اس مجمع میں ایک ستارہ ہے جس کے بارے میں فلکی ماہرین کو یقین ہے کہ اس کے گرد سیارے موجود ہیں۔ اگر ان سیاروں میں سے کسی ایک میں زندگی کے آثار موجود ہوئے اور وہاں

کوئی ایسی مخلوق موجود ہے جو ہمارے بھیجے ریڈیائی پیغام کو وصول کرسکے اور پھر اسے سمجھ بھی سکے اور اس کا جواب بھی دے۔ تب بھی کسی غیر ارضی مخلوق سے رابطہ کرنے میں ایک سو ساٹھ سال کا عرصہ لگ سکتا ہے۔ یعنی ہماری زندگی میں یہ ممکن نہیں ہے کہ پیغام جا کر واپس آسکے۔

ماہرین کے خیال میں اس رابطے کا ایک طریقہ اور بھی ہے۔ ماہرین کے اس گروہ کے نزدیک غیر ارضی مخلوق نہ صرف زمین پر آچکی ہے بلکہ وہ یہاں مستقل اڈے بھی رکھتی ہے اور ان اڈوں پر اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے۔ اُڑن طشتریاں اور اس قسم کے پُراسرار چیزیں جو ہماری فضاؤں میں اُڑتی دکھائی دیتی ہیں ان کا تعلق اصل میں اسی خلائی مخلوق سے ہے۔ اگر ہم کسی طرح اس مخلوق سے رابطہ کرلیں اور اسے یقین دلا سکیں کہ انسان ان کے دشمن نہیں ہیں تو ہم بہت جلد غیر ارضی تہذیب سے رابطہ کرسکتے ہیں۔ کیونکہ جو مخلوق زمین تک رسائی حاصل کرچکی ہے اس کے پاس یقیناً سفر اور بین الخلائی رابطے کی ایسی سہولیات ہوں گی جو انسانوں کے پاس نہیں ہیں۔ مگر زمین پر یہ مخلوق کہاں ہے اور کس لیے یہاں آئی ہے۔ اس کا پتا چلانا ہے۔ ان ماہرین کا کہنا ہے کہ اس مخلوق کا رویّہ دوستانہ ہے۔ جنوبی امریکا کی ایک قدیم قبائلی کہاوت ہے۔ جو آپ پر حملہ نہیں کرتا وہ آپ کا دوست ہے۔ اس کلیے کی رو سے زمین پر اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے غیر ارضی لوگ بھی ہمارے دوست ہوئے کیونکہ اب تک کہیں کوئی ایسا ثبوت نہیں ملا ہے کہ نظر آنے والی اُڑن طشتریوں یا ایسے پُراسرار جہازوں سے کسی فرد کو نقصان ہوا ہو۔ ہاں کچھ ایسے واقعات ہوئے ہیں جن میں کسی فرد کو اُڑن طشتریاں اپنے ساتھ لے گئیں اور کچھ دن بعد ان کو چھوڑ دیا لیکن ان کو اپنے اوپر گزرنے والی کیفیت یاد نہیں تھی۔ اس سلسلے میں بہت سارے واقعات تو بعد میں جعلی یا شہرت حاصل کرنے کی کوشش ثابت ہوئے۔ لیکن جیسا کہ مارٹن کا واقعہ ہے۔ اسے جھوٹ پکڑنے والے ماہر نے حقیقت قرار دیا۔ اسی طرح کا ایک واقعہ سابق سوویت یونین میں یوکرائن کے ایک ساحلی قصبے میں پیش آیا تھا جو بحرِ اسود کے کنارے واقع ہے۔ اس وقت یہ واقعہ چھپا لیا گیا تھا اور سوویت حکام نے اس بات کو ملک سے باہر جانے نہیں دیا تھا۔

پچیس سال بعد میلسی کورنیووف کی کہانی انٹرنیٹ کے ذریعے منظرِ عام پر آئی۔ 1982 میں میلسی صرف بیس سال کی ایک خوب صورت اور ہر دل عزیز لڑکی تھی۔ وہ کورنی موو کے ایک ٹیکنیکل اسکول میں ڈپلومہ کررہی تھی۔ اس کا باپ یوریکور نیووف افغانستان میں موجود روسی فوجوں کے ایک دستے میں ائیر ٹیکنیشین تھا۔ میلسی اکتوبر کی ایک دھند آلود صبح اسکول جانے کے لیے گھر سے روانہ ہوئی اور پھر اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ شام تک جب وہ واپس نہیں آئی تو اس کی ماں میشکا نے اس کے دوستوں سے رابطہ کیا۔ تب اسے پتا چلا کہ وہ سرے سے اسکول ہی نہیں پہنچی تھی۔ میشکا نے رات گئے پولیس کو رپورٹ کی اور اگلے دن پولیس نے میلسی کو کورنی موو اور اس کے آس پاس تلاش کرنا شروع کردیا۔ پولیس کا خیال تھا کہ میلسی کی گم شدگی میں کسی جرائم پیشہ کا ہاتھ ہے۔ ممکن ہے اس نے ریپ کے بعد لڑکی کو قتل کردیا اور اس کی لاش کہیں چھپا دی ہو۔ پولیس میلسی کی تلاش میں بو سونگھنے والے کتوں سے بھی کام لے رہی تھی۔ لیکن دو دن کی بھرپور تلاش کے باوجود نتیجہ صفر نکلا اور میلسی کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ اگلے دو دن میں پولیس اور رضاکاروں نے کورنی موو کا سارا علاقہ چھان مارا۔

اس واقعے کے پانچویں دن ایک مقامی کسان وکٹر ریمان اپنے کام پر جارہا تھا۔ اس کے پاس ایک چھوٹی کار تھی اور وہ جلدی پہنچنے کے لیے جنگل والے راستے سے جارہا تھا کہ اس نے سڑک کے عین وسط میں میلسی کو لیٹے پایا۔ وہ چت لیٹی ہوئی تھی اور بالکل ساکت تھی۔ وکٹر ڈر گیا کہ شاید وہ مرچکی ہے لیکن جب وہ لڑکی کے پاس آیا تو اس نے اسے سانس لیتے پایا اور اس کا دل بھی درست انداز میں دھڑک رہا تھا۔ وکٹر میلسی کی تصویر اخباروں اور پوسٹرز میں دیکھ چکا تھا اس لیے اسے شناخت کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ لڑکی صاف ستھری تھی اور بہ ظاہر اس کے جسم پر کوئی زخم نہیں تھا۔ وہ ہوش میں نہیں تھی۔ اس کے پاس سڑک پر ایک عجیب چمڑے جیسی کوئی چیز پڑی تھی اور اس پر کسی قسم کے نشانات بنے تھے۔ وکٹر نے میلسی کی طرف سے اطمینان کرنے کے بعد نزدیک ترین فون بوتھ سے پولیس کو اطلاع دی اور آدھے گھنٹے بعد میلسی کو کورنی موو کے اسپتال منتقل کردیا گیا تھا۔ جہاں ڈاکٹروں نے اس کی جسمانی حالت کو تسلی بخش قرار دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ بالکل ٹھیک تھی اس کے ساتھ نہ تو زیادتی ہوئی تھی اور نہ ہی اسے کوئی جسمانی ضرر پہنچایا گیا تھا۔ البتہ ڈاکٹر اس کی بے ہوشی کی وجہ بھی سمجھنے سے قاصر تھے ان کے خیال میں اسے کوئی دوا دی گئی تھی جس کے اثر سے وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔

لڑکی بارہ گھنٹے بعد خود ہوش میں آگئی کیونکہ ڈاکٹروں کے مطابق اگر انہوں نے اسے دواؤں سے جگانے کی کوشش کی تو اس کے ذہن پر بُرا اثر بھی پڑ سکتا ہے۔ ہوش میں آنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے بعد میلسی کی دماغی حالت بالکل ٹھیک رہی لیکن اس نے جو بیان دیا اسے سن کر ڈاکٹروں اور پولیس افسران کو شبہ ہونے لگا کہ اس کی دماغی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ میلسی نے بتایا کہ وہ اسکول جانے کے لیے ایک چھوٹے راستے سے گزر رہی تھی جو جنگل کے وسط سے جاتا ہے۔ دھند کی وجہ سے اسے دور تک نظر نہیں آرہا تھا اچانک اسے لگا جیسے اس کے سر پر گھنے بادل آگئے ہوں اور اس نے اوپر دیکھا تو اسے ایک گول گھومتی ہوئی چیز نظر آئی، یہ گول ڈسک نما تھی اور اس کا کنارہ الگ انداز میں گردش کر رہا تھا جب کہ وسطی حصہ مخالف سمت میں گھوم رہا تھا۔ اس سے تیز اور ہلکی روشنیاں جھلک رہی تھیں۔ میلسی خوف سے ساکت رہ گئی تھی۔ پہلے تو وہ سمجھی کہ شاید یہ کوئی جنگی طیارہ ہے اور بے قابو ہو کر اس کے اوپر گرنے والا ہے۔ یہ خاصا بڑا تھا، اس کا قطر کم سے کم بھی تیس فٹ ہوگا۔ کیونکہ یہ میلسی کے عین اوپر تھا اس لیے وہ اسے مزید نہیں دیکھ سکی۔

اس سے پہلے وہ حرکت کرتی یا وہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتی اچانک اس گھومتی ڈسک کے نچلے حصے سے عجیب سی تیز روشنی نکلی اور اس پر پڑی۔ یہ روشنی دائرے کی صورت میں تھی۔ میلسی اتنا ہی دیکھ سکی تھی کیونکہ جیسے ہی روشنی اس پر پڑی اس کے بعد اسے نہیں یاد رہا تھا کہ پھر اس کے ساتھ کیا گزری۔ اس کے بعد اسے دھندلا سا یاد ہے کہ وہ کسی ایسی جگہ تھی جس کی دیواریں چمکیلی سی تھیں اور اس کے پاس بڑے سر والے انسان آتے تھے وہ اس سے کچھ پوچھتے تھے لیکن اسے یہ نہیں یاد کہ وہ اس سے کیا پوچھتے تھے اور وہ کیا جواب دیتی تھی۔ اسے ان کی زبان بھی یاد نہیں تھی بس یہ احساس تھا کہ وہ ان کی بات سمجھ رہی ہے۔ اس کے علاوہ اسے کچھ نہیں یاد تھا کہ وہ اس دوران میں کیا کرتی رہی۔ اس نے کیا کھایا پیا اور اس کے ساتھ کیا سلوک ہوا؟ پھر اسے اسپتال میں ہوش آیا تھا۔ حیرت انگیز بات یہ کہ وہ اپنے اندر کسی قسم کی کمزوری محسوس نہیں کر رہی تھی، ایسا لگ رہا تھا کہ اس دوران اسے باقاعدگی سے خوراک مہیا کی جاتی رہی تھی۔

اس کی کہانی اعلیٰ حکام تک پہنچی تو اسے فوری طور پر علاقے کے فوجی مرکز منتقل کر دیا گیا اور سوائے اس کی ماں کے ہر ایک کے ملنے پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ میلسی وہاں کتنے عرصے رہی اور سوویت یونین کے ماہرین نے اس سے کس قسم کی تفتیش کی یہ آج بھی صیغہ راز میں ہے۔ وہ کئی سال تک سرکاری تحویل میں رہی تھی اور جب اسے آزاد کیا گیا تب بھی اس پر پابندی لگا دی گئی کہ وہ اس بارے میں نہ تو کسی سے بات کرے گی اور نہ ہی پریس یا میڈیا کو بتائے گی۔ یہ ایک طرح سے زبان بندی کا حکم تھا۔ خود میلسی اتنی خوف زدہ تھی کہ اس نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا تھا اور اسکول بھی نہیں جاتی تھی۔ وہ اپنے گھر میں ایک طرح سے قید تنہائی کاٹ رہی تھی۔

لیکن سوویت یونین کے خاتمے کے بعد میلسی اپنے خاندان سمیت ماسکو منتقل ہوگئی تھی۔ وہ اصل میں روسی تھے لیکن گزشتہ دو نسلوں سے یوکرائن میں آباد تھے۔ اب یوکرائن آزاد ملک بن گیا تھا اس لیے وہ اپنے ملک واپس لوٹ آئے تھے۔ میلسی نے ڈپلومہ اُدھورا چھوڑ دیا تھا۔ ماسکو میں اس نے طبی کالج میں داخلہ لیا اور کچھ عرصے بعد ڈاکٹر بن گئی۔ اسے ہاؤس جاب کے لیے روس کے ایک دور دراز علاقے بھیج دیا گیا۔ میلسی نے یہیں اپنے ایک ساتھی ڈاکٹر سے شادی کر لی اور پانچ سال میں دو بچوں کی ماں بن گئی تھی۔ پھر اس کی اپنے شوہر سے طلاق ہوگئی اور وہ بچوں کو لے کر واپس ماسکو اپنے ماں باپ کے گھر آگئی۔ اس وقت تک کورنی موو میں پیش آنے والا واقعہ اس کے ذہن میں دھندلا پڑ گیا تھا۔

میلسی سن دو ہزار کے بعد ماسکو واپس آئی تھی۔ یہاں اس نے ایک اسپتال میں ملازمت کر لی۔ اس نے دوبارہ شادی نہیں کی اور اپنی ساری توجہ اپنے بچوں کو دینے لگی تھی۔ ان ہی دنوں اسے اُڑن طشتریوں اور غیر ارضی مخلوق سے دلچسپی پیدا ہوئی تھی۔ ممکن ہے اس کے پسِ پشت نوجوانی میں پیش آنے والا پُراسرار واقعہ ہو۔ اس نے مغربی یورپ میں قائم ایک ایسی سوسائٹی میں شمولیت اختیار کی جو اُڑن طشتریوں اور خلائی مخلوق پر تحقیق کرتی تھی۔ ان کی اپنی ویب سائٹ تھی اور اس کے ممبروں کی تعداد صرف یورپ میں چار ہزار سے زیادہ تھی۔ اسی سوسائٹی کی ویب سائٹ پر پہلی بار میلسی نے اپنے ساتھ پیش آنے والا واقعہ سنایا اور تب دنیا کو اس بارے میں پتا چلا تھا اور تب میلسی کو پتا چلا کہ اس کے ساتھ جو پیش آیا دنیا کے کم سے کم ایک درجن اور افراد کچھ ایسا ہی دعویٰ کرتے ہیں کہ انہیں غیر ارضی مخلوق اغوا کر کے لے گئی تھی اور پھر کچھ دن بعد انہیں آزاد چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس دوران میں وہ کہاں رہے؟ اور ان پر کیا گزری اس بارے میں زیادہ تر لوگ نہیں جانتے تھے البتہ کچھ افراد نے دعویٰ کیا انہوں نے یہ وقت ایسی مخلوق کے ساتھ گزارا جو اس دنیا کی نہیں تھی بلکہ کہیں باہر خلا سے آئی تھی اور وہ ہم انسانوں کی نسبت کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھی۔ ان کے اغوا کا مقصد انسانوں کا قریب سے مشاہدہ کرنا اور ان سے تعلق پیدا کرنا تھا۔ ان تمام افراد کو بعد میں بنا کسی نقصان کے

چھوڑ دیا گیا جن میں میلسی بھی شامل تھی۔

میلسی کی کہانی منظر عام پر آئی تو نیشنل جیوگرافک چینل کے ایک پروگرام میں اس کی کہانی کو پیش کیا گیا۔ اس میں میلسی کی زبانی اس کی کہانی بھی سنائی گئی تھی۔ مگر آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ میلسی کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا اسے لے جانے والے کون لوگ تھے اور ان کے کیا مقاصد تھے؟ تقریباً پچاس سالہ میلسی آج کل اس سوسائٹی کی سرگرم رکن ہے اور وہ اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ ہماری زمین پر غیر ارضی مخلوق آچکی ہے اور یہاں سرگرم ہے۔ اگر انسان کسی طرح ان سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو جائے تو ہم ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اسے یہ بھی یقین ہے کہ اسے لے جانے کا مقصد، انسانوں سے رابطے کی ایک کوشش تھی۔

اُڑن طشتریاں جو ہماری زمین کی فضاؤں میں حرکت کرتی نظر آتی ہیں۔ کئی ممالک کے فوجی ریڈاروں اور جنگی طیاروں نے انہیں دیکھا اور طیاروں کی مدد سے ان کا پیچھا بھی کیا گیا لیکن یہ اتنی تیز رفتار ہوتی ہیں کہ جدید ترین جیٹ طیارے بھی ان کا تعاقب نہیں کر پاتے ہیں۔ ڈنمارک کی فضائیہ کے ریڈار نے اپنی حدود میں چند نامعلوم اشیا کو تلاش کیا۔ یہ اپنی شناخت نہیں بتا رہی تھیں اس لیے فوری طور پر دو ایف سولہ اُڑائے گئے اور جب وہ ان چیزوں کے پاس پہنچے تو انہیں روشن اور گول ڈسک نما اجسام پایا۔ یہ آواز کی رفتار سے تیز اُڑ رہے تھے اور ان کا رُخ شمال سے جنوب کی طرف تھا۔ جیسے ہی ایف سولہ ان کے پاس پہنچے ان کی رفتار تیز ہوئی اور پھر یہ چند منٹ کے اندر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ دونوں ایف سولہ طیاروں نے ان کی ویڈیو بھی بنائی تھی جو اس وقت نیٹ پر دستیاب ہے اور یوٹیوب پر آسانی سے دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ اُڑن طشتریوں کی موجودگی کا واضح ترین ثبوت ہے جس میں کسی قسم کی جعلسازی کا کوئی امکان نہیں ہے۔

اس معاملے میں جعلسازی بہت عام ہے اور جو لوگ اُڑن طشتریوں کو دیکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں پھر ثبوت کے طور پر ان کی تصویریں یا ویڈیو پیش کرتے ہیں وہ بعد میں جعلی ثابت ہوتی ہیں۔ اس جعلسازی کا آغاز سویڈن کے ایک لڑکے نے کوئی چالیس سال پہلے کیا۔ اس نے اپنے گھر کی کھڑکی سے آسمان پر اُڑنے والی چند اُڑن طشتریوں کی تصاویر لی تھیں اور اس وقت ماہرین نے انہیں اصلی بھی مان لیا تھا لیکن بعد میں جدید آلات اور کمپیوٹر کی مدد سے ان تصاویر کا پول کھل گیا یہ تصاویر کھڑکی کے شیشے پر اسٹیکر چپکا کر لی گئی تھیں اور ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے آسمان پر اُڑن طشتریاں موجود ہیں۔ بعد میں لڑکے نے بھی اعتراف کر لیا کہ اس نے دھوکا کیا تھا۔ بدقسمتی سے اس قسم کے ننانوے فیصد دعوے بعد میں جھوٹ ثابت ہوئے۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد عام لوگوں کی طرف سے اُڑن طشتریاں اور غیر ارضی مخلوق دیکھنے کے دعووں کی بھرمار ہوگئی تھی۔ اس سلسلے میں دعویٰ کرنے والے افراد نے کچھ ثبوت بھی پیش کیے جیسے انہوں نے تصاویر اور ویڈیو بنائی تھیں یا خلائی مخلوق کی گفتگو ریکارڈ کی تھی۔ لیکن تحقیق سے ان میں سے اکثر جعلی نکلیں۔ بعض تصاویر اور ویڈیو کے بارے میں ماہرین کا کہنا تھا کہ اصل تھیں لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ان کا عینی گواہ وہی فرد ہوتا تھا جس نے تصویر یا ویڈیو بنائی تھی۔ حالانکہ ان میں سے بعض ویڈیوز میں اُڑن طشتریوں کو عمارتوں کے اوپر اُڑتے دکھایا گیا ہے لیکن سوائے ویڈیو یا تصویر بنانے والے کے کسی نے ان کو نہیں دیکھا تھا۔ اسی طرح جن لوگوں نے غیر ارضی مخلوق کو دیکھنے کا دعویٰ کیا اس کے واحد گواہ بھی وہی ہوتے تھے۔ اس طرح معاملہ شکوک اور یقین کی حد کے درمیان ہی رہ جاتا۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سارے ہی لوگ جو اس قسم کے دعوے رکھتے ہیں غلط بیانی سے کام لے رہے ہوتے ہیں ان میں سے کچھ یقیناً سچے بھی ہوتے ہیں لیکن جھوٹوں کے درمیان سچ بولنے والوں کو تلاش کرنا بہت دشوار ہے۔ دنیا کے تقریباً چالیس ممالک میں لوگوں نے اُڑن طشتریاں دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے اور حیرت انگیز بات ہے کہ انہوں نے ان اُڑن طشتریوں میں بہت ساری چیزیں مشترک بیان کی ہیں۔ جیسے گھومتی ہوئی روشنیاں، اُڑن طشتری کی گول یا اس سے ملتی جلتی ساخت، اس میں سے سیٹی نما یا پانی کے کھولنے کی سنسناہٹ جیسی آواز آنا اور ان کا اپنے مدار کے گرد گھومنا، نیز نہایت تیز رفتار ہونا کہ سیکنڈوں میں اُفق کے پار غائب ہو جانا۔ یہ باتیں تقریباً سارے بیانات میں مشترک ہیں۔

عجیب بات ہے کہ اُڑن طشتریاں دیکھنے یا ان کو ریکارڈ کرنے کے سارے واقعات ہی مغرب کے سائنسی لحاظ سے ترقی یافتہ ممالک میں پیش آئے۔ ایشیا اور افریقہ میں اس قسم کے واقعات دیکھنے میں نہیں آئے اور نہ ہی کوئی تصویر یا ویڈیو بنی ہے۔ البتہ بعض توہم پرست قبائل کا دعویٰ ہے کہ ان کے دیوتا آسمان سے آتے ہیں اور وہ عجیب و غریب سواریاں استعمال کرتے ہیں۔ لیکن جس طرح یہ بات مغربی ملکوں میں دکھائی دیتی ہے اس طرح ایشیا اور افریقہ کے ملکوں میں نہیں دکھائی دیتی ہیں۔ حالیہ دور میں چین میں بھی بعض افراد نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اُڑن طشتریاں دیکھنے اور غیر ارضی مخلوق سے ملاقات کرنے کا دعویٰ کیا ہے لیکن وہ بھی اس بارے میں کوئی ثبوت پیش نہیں کرسکے۔ غالباً یہ ترقی کے دوسرے شعبوں کی طرح مغرب سے چین میں آگئی ہے۔

ماہرین جو اُڑن طشتریوں اور غیر ارضی مخلوق پر تحقیق کررہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سائنسی ادب اور اس موضوع پر بننے والی فلموں نے اس معاملے میں بہت دشواریاں پیدا کر دی ہیں۔ کیونکہ ان کی وجہ سے اب ایک عام آدمی بھی جانتا ہے کہ غیر ارضی مخلوق کیسی ہوسکتی ہے یا اُڑن طشتریوں کی ساخت اور فنکشن کیا ہوتے ہیں اس لیے جب کوئی دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے اُڑن طشتری یا غیر ارضی مخلوق دیکھی ہے تو وہ اس کے بارے میں اتنی تفصیل اور درستگی سے بتاسکتا ہے کہ ماہرین بھی اس کا جھوٹ یا سچ نہیں پکڑ سکتے...... عام طور سے ننانوے فیصد دعووں میں جھوٹ ہوتا ہے اور یہ صرف شہرت حاصل کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ ماہرین کے لیے مسئلہ یہ ہے کہ وہ دعووں کی بھرمار کی وجہ سے جھوٹ اور سچ میں تمیز نہیں کرپاتے ہیں اور ایک فیصد لوگ جو سچ کہہ رہے ہوتے ہیں اور انہوں نے کچھ نہ کچھ دیکھا ہوتا ہے۔ وہ بھی جھوٹوں کی بھیڑ میں گم ہوکر رہ جاتے ہیں۔ اگر اس سلسلے میں جھوٹے دعوے نہ کیے جائیں اور صرف سچ بولنے والے لوگ سامنے آئیں تو اس سے ماہرین کے لیے تحقیق میں آسانی ہوسکتی ہے اور ممکن ہے وہ اس اسرار کی تہ تک پہنچ جائیں۔

اُڑن طشتریوں کی طرح غیر ارضی مخلوق کا معاملہ بھی ہے۔ جن لوگوں نے انہیں دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے وہ ان کا تقریباً وہی حلیہ بتاتے ہیں جو سائنسی ادب لکھنے والے برسوں پہلے اپنی کہانیوں میں بیان کرچکے ہوتے ہیں اور ان پر بننے والی فلمیں بچے بچے نے دیکھی ہوتی ہیں۔ اسی بنا پر غیر ارضی مخلوق یا ایلین کا ایک مخصوص حلیہ ایجاد کرلیا گیا ہے۔ چھوٹے جسم پر بڑا سا سر جیسے ناشپاتی کو اُلٹا کردیا جائے، اس چٹیل سر پر دو بڑی سیاہ آنکھیں، چھوٹا سا منہ اور ناک سرے سے غائب۔ بعض لوگوں نے ان کے سروں پر دو چھوٹے سینگ نما اینٹینا کی موجودگی بھی بیان کی ہے۔ عام طور سے ان کا رنگ سبز بیان کیا جاتا ہے لیکن بعض اوقات سرخ یا مٹیالا رنگ بھی بتایا گیا ہے۔ ان کے ہاتھ پاؤں چھوٹے اور ان میں چار یا تین انگلیاں ہوتی ہیں اور بعض اوقات مچھلی کے چپو جیسے ہاتھ ہوتے ہیں۔ دیکھنے میں یہ خوفناک کے بجائے مضحکہ خیز لگتے ہیں۔

غیر ارضی مخلوق کو دیکھنے یا ان سے ملاقات کا دعویٰ کرنے والے افراد نے ان کے بارے میں جو تصویری اور آواز والے ثبوت پیش کیے ہیں ماہرین نے انہیں مبہم قرار دیا ہے۔ اُڑن طشتریوں کی طرح غیر ارضی مخلوق کے بارے میں بھی ابھی تک کوئی سائنٹیفک شہادت سامنے نہیں آئی ..... جس پر سب متفق ہوں۔ اس سلسلے میں اب تک سب سے زیادہ دعوے امریکی شہریوں نے کیے ہیں اور سب جانتے ہیں کہ امریکی شہرت پر جان دینے والی قوم ہے۔ شہرت پانے کے لیے یہ جھوٹ بولنے سے لے کر اپنی جان پر کھیل جانے تک سب کرنے پر تیار رہتے ہیں۔

غیر ارضی مخلوق کے بارے میں بعض باتیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ انسان زمین کا باسی ہے اور اس کے ماحول کا عادی ہے۔ زمین کے ماحول میں انسان کو زندہ رکھنے اور اسے ترقی دینے والے تمام عناصر موجود ہیں۔ لیکن یہ انسان نظامِ شمسی کے کسی اور سیارے پر زندہ نہیں رہ سکتا ہے کیونکہ ان سیاروں پر وہ کرہ ہوائی، ہوا میں آکسیجن اور دوسری گیسوں کا مخصوص تناسب اور فضائی دباؤ نیز درجہ حرارت نہیں پایا جاتا.... جو زمین پر موجود ہے اس لیے انسان کا کسی اور سیارے پر زندہ رہنا ممکن نہیں ہے بالکل اسی طرح کسی دوسرے سیارے کی مخلوق اپنے سیارے کے ماحول میں ہی زندہ رہ سکتی ہے اور اس کا امکان بہت ہی کم ہے کہ اس کا ماحول زمین سے ملتا جلتا ہوگا اس لیے کوئی بھی غیر ارضی مخلوق زمین کے ماحول میں اسی وقت آرام و سکون سے رہ سکتی ہے جب وہ اس کے لیے مخصوص لباس اور آلات استعمال کرے۔ لیکن غیر ارضی مخلوق کو دیکھنے کا دعویٰ کرنے والے ایسی کوئی بات نہیں بتاتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غیر ارضی مخلوق کو لازمی ہی ایسے لوازمات درکار ہوں۔ اس کا امکان بھی ہے کہ انہوں نے کسی طرح سے خود کو زمین کے ماحول کے ہم آہنگ کرلیا ہو اور اب وہ اس میں آسانی سے اسی طرح رہ سکتے ہیں جیسے اپنے سیارے کے ماحول میں رہتے ہوں گے۔

امریکا میں اُڑن طشتریاں دیکھنے کے سب سے زیادہ واقعات برمودا نامی علاقے میں پیش آتے ہیں۔ فلوریڈا کے جنوب مشرق سے شمال مشرق تک پھیلے اس علاقے میں مشہور زمانہ برمودا ٹرائی اینگل ہے۔ جہاں عجیب و غریب واقعات پیش آتے ہیں۔ یہاں بحری جہاز اور اس کی حدود میں اُڑنے والے طیارے پُراسرار طور پر غائب ہوجاتے ہیں۔ یہاں عجیب و غریب مظاہر دیکھنے میں آتے ہیں جیسے ایک امریکی جنگی بحری جہاز کے عملے نے سمندر سے ایک بہت بڑا روشن کرہ برآمد ہوتے دیکھا جس کا قطر تیرہ میل سے زیادہ تھا اور یہ صرف آنکھ سے دکھائی دے رہا تھا جنگی جہاز کے حساس ترین آلات بھی اسے ریکارڈ نہیں کرسکے تھے اور نہ ہی یہ ریڈار پر ظاہر ہورہا تھا۔ عملے کے کم سے کم ایک درجن افراد نے اسے دیکھا اور عرشے پر ڈیوٹی دیتے پیٹی آفیسر نے اسے اپنی لاگ بک میں درج کیا۔ لیکن بعد میں بندرگاہ پر یہ لاگ بک ضبط کرلی گئی اور بحری جہاز کے عملے کو زبان بندی کا حکم دیا۔ یہ واقعہ اس پیٹی افسر کی ریٹائرمنٹ کے بعد سامنے آیا۔

صرف ایک امریکی جنگی جہاز ہی نہیں بلکہ متعدد امریکی نیوی سیلرز نے اس علاقے میں دورانِ سفر عجیب و غریب چیزوں کا مشاہدہ کیا۔ جیسے ایک پیٹرول بوٹ کے ارکان نے شام کے وقت برمودا کے شمال مشرق کے کھلے سمندر میں گشت کے دوران تین نہایت تیز رفتار اُڑن طشتریاں دیکھیں جو نہایت سرعت سے دس سیکنڈ کے وقفے میں ایک طرف سے نمودار ہوکر دوسری طرف غائب ہوگئیں۔ ان کے نیچے سے شعلے نکل رہے تھے۔ سورج چمک رہا تھا اور آسمان بالکل صاف تھا، اس لیے پیٹرول بوٹ کے عملے نے یہ منظر بالکل واضح دیکھا۔ ان کا کہنا ہے کہ اس سلسلے میں کسی دھوکے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ گول ساخت کی اُڑن طشتریاں تھیں جو سمندر سے کوئی ہزار فٹ کی اونچائی پر تھیں۔ ان کی رفتار کا اندازہ آواز سے چودہ گنا زیادہ لگایا گیا تھا۔ لیکن ان کے گزرنے سے نہ تو ساؤنڈ بیریر کا دھماکہ ہوا اور نہ ہی کسی قسم کی آواز آئی تھی۔ پیٹرول بوٹ کے ریڈار نے بھی ان اُڑن طشتریوں کو ریکارڈ نہیں کیا تھا۔ شاید وہ اتنی تیز رفتار چیزوں کو ریکارڈ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ یہ بات بھی برسوں بعد منظرِ عام پر آئی۔

اُڑن طشتریوں کی رفتار کے بارے میں ایک سائنسی وضاحت کردی جائے کہ جب کوئی جسم آواز کی رفتار سے زیادہ رفتار سے ہوا میں اُڑتا ہے تو اس سے ایک دھماکے دار آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہ دھماکہ آواز سے چار گنا زیادہ رفتار سے اُڑنے والی چیز سے پیدا ہوتا ہے لیکن جب کسی جسم کی رفتار آواز سے سات گنا ہو تو پھر فضا میں دھماکے کی بجائے ہلکی دھڑکن جیسی لہریں پیدا ہوتی ہیں اور ماہرین کہتے ہیں اگر رفتار آواز سے دس گنا ہوجائے تو یہ آوازیں بھی پیدا نہیں ہوتی ہیں بلکہ اُڑنے والی چیز بالکل بے آواز محسوس ہوتی ہے جیسا کہ اُڑن طشتریوں کے معاملے میں ہوتا ہے۔ ابھی زمین کے کرہ ہوائی میں آواز سے دس گنا رفتار سے اُڑنے والی چیز ایجاد نہیں ہوئی ہے۔ راکٹوں کی رفتار خلا کی طرف جاتے ہوئے اٹھارہ ہزار میل فی گھنٹا بھی ہوجاتی ہے جو آواز سے پچیس گنا زیادہ ہے لیکن عام طور سے جب راکٹ آواز سے دس گنا زیادہ رفتار پکڑتے ہیں تو عملاً وہ کرہ ہوائی سے باہر جاچکے ہوتے ہیں اس لیے ان کی آواز کا تجربہ نہیں ہوسکا...... کرہ ہوائی میں اتنی رفتار راکٹ کی نوک پر تین ہزار ڈگری سینٹی گریڈ کا درجہ حرارت پیدا کرکے اسے تباہ کردے گی۔

برمودا کے علاقے میں ایک امریکی آبدوز معمول کے گشت کے دوران حادثے کا شکار ہوئی لیکن ڈوبنے سے بچ گئی۔ اسے کسی غیر معمولی بڑی چیز نے سطح آب سے کوئی ہزار فٹ نیچے ٹکر ماری تھی اور اس تصادم نے آبدوز کو نقصان پہنچایا تھا۔ اس کے ایک حصے میں پانی بھر گیا لیکن اسے فوری طور پر سیل کرکے آبدوز کو ڈوبنے سے بچالیا گیا تھا۔ یہ چیز کیا تھی اس کا بھی پتا نہیں چل سکا کیونکہ آبدوز کے آلات کسی چیز کی نشاندہی کرنے سے قاصر رہے تھے جب کہ اس کا سونار اتنا طاقتور تھا کہ زیرِ آب حرکت کرنے والی چھوٹی سے چھوٹی چیز کا بھی سراغ لگا سکتا تھا۔

بے شمار جہاز رانوں نے اس علاقے میں سمندر سے اُڑن طشتریاں اور عجیب ساخت کے جہاز نکلتے دیکھے ہیں اور ان کی رپورٹ بھی کی لیکن ان کی رپورٹس کو نظر انداز کردیا گیا۔ سارا گٹو نامی ایک چھوٹی بحری کشتی کے کپتان بین مور نے برمودا کے جنوب میں کسی قدر گہرے سمندر سے ایک بہت ہی بڑا جسم برآمد ہوکر آسمان پر غائب ہوتے دیکھا۔ اس کا بیان ہے کہ یہ جسم کم سے کم بھی ایک میل طویل تھا اور اس کی ساخت کسی خلائی جہاز جیسی تھی۔ اس کی رفتار اتنی زیادہ تھی کہ وہ صرف ایک منٹ تک دکھائی دیا اور اس کے بعد غائب ہوگیا۔ دن کا وقت تھا اور خلائی جہاز کا ایک ایک نقش واضح دکھائی دے رہا تھا۔ یہ سامنے سے نوکیلا اور درمیان سے موٹا تھا لیکن اس کی ساخت بہت عجیب اور بیان سے باہر تھی۔ اس کے عقبی حصے سے نہ تو شعلے نکل رہے تھے اور نہ ہی کسی قسم کا دھواں تھا۔ وہ بنا کسی آواز اور دھماکے کے پانی سے نکلا اور دیکھتے ہی دیکھتے سیدھا آسمان پر غائب ہوگیا۔ بین کے ساتھ عملے کے چار افراد نے بھی اسے دیکھا۔ بعد میں جب بین نے بندرگاہ واپسی پر اس واقعے کی رپورٹ کی تو اسے جھٹلا دیا گیا۔ اس کی رپورٹ کو بندرگاہ کے ریکارڈ کا حصہ بنانے سے انکار کردیا گیا کیونکہ بہ قول سرکاری حکام کے کسی اور ذریعے سے اس رپورٹ کی تصدیق نہیں ہوئی ہے۔ اسی علاقے میں دوسری بے شمار کشتیاں موجود تھیں لیکن کسی نے اس عظیم الجثہ خلائی جہاز

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کو نہیں دیکھا جو ایک میل سے بھی زیادہ طویل تھا۔ بے چارہ بین اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

ایسے ایک اور واقعے میں ایک بحری جہاز کے عملے نے سمندر سے پانی کا جناتی دھارا نکل کر آسمان کی طرف جاتے دیکھا۔ یہ دھارا بالکل سیدھا تھا۔ اس سے نہ تو پانی گر رہا تھا اور نہ جہاں سے یہ نکل رہا تھا وہاں سمندر میں کوئی ہلچل تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے منجمد پانی کا ایک دھارا آسمان تک کھڑا کر دیا ہو اور کچھ دیر بعد یہ دھارا اچانک ہی غائب ہو گیا۔ اس کا معمولی سا نشان بھی باقی نہیں رہا۔ سمندر بالکل معمول کے مطابق ہو رہا تھا۔ اتفاق سے اس کو بھی صرف ایک ہی بحری جہاز کے عملے نے دیکھا اور اس سے پہلے کہ وہ اس کی تصویر لیتے یا ویڈیو بناتے وہ غائب ہو چکا تھا۔ بحری جہاز یا علاقے میں سرگرم کسی اور ریڈار نے بھی اس دھارے کو نہیں دیکھا۔

سارا گوسا کے سمندر کے ایک اور عجیب منظر کو اس علاقے میں پرواز کرنے والی امریکن ائر لائن کے طیارے کے کاک پٹ سے اس کے کپتان اور نائب کپتان نے دیکھا۔ انہوں نے دیکھا کہ کوئی تیس ہزار فٹ نیچے سمندر کسی عظیم بلبلے کی طرح اوپر اُٹھ رہا ہے اس بلبلے کا حجم کم سے کم بھی تین میل ہوگا اور کپتان کے اندازے کے مطابق یہ سمندر سے کوئی ایک میل کی اونچائی پر نکل آیا تھا۔ اس وقت کپتان کو خیال آیا کہ شاید یہ کوئی زیر آب ایٹمی تجربہ تھا لیکن چند لمحوں کے بعد بلبلا اچانک ہی غائب ہو گیا اور اس کی جگہ سمندر میں چند معمولی سے دائرے رہ گئے اور ایک منٹ سے بھی پہلے یہ دائرے ختم ہو چکے تھے۔ اگر یہ کوئی ایٹمی تجربہ تو اس کے اثرات لمحوں میں ختم نہیں ہو سکتے تھے۔ دوسرے نہ تو کوئی دھواں تھا اور نہ ہی مخصوص آتشیں بادل تھا جو ایٹمی تجربے کی صورت میں فضا میں بلند ہوتا ہے۔

برمودا کے علاقے میں اُڑن طشتریوں کا نظر آنا اور پھر ایسے عجیب واقعات ہونا جو دنیا کے کسی اور خطے میں وقوع پذیر نہیں ہوتے..... بہت سارے لوگوں کے خیال میں کسی غیر ارضی مخلوق کی کارستانی ہیں جو اس علاقے کو اپنا مرکز بنائے ہوئے ہے۔ اس خیال کی تصدیق کولمبس کے بیان کردہ واقعات سے بھی ہوتی ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ اُڑن طشتریاں اس علاقے میں ضرور ہیں لیکن یہ غیر ارضی مخلوق بکواس ہے کیونکہ اڑن طشتریاں اور عجیب ساخت کے جہاز اصل میں امریکی حکومت کے خفیہ پروجیکٹس کا نتیجہ ہیں جو اس نے اس علاقے میں چھپ کر قائم کر رکھے ہیں۔ یعنی یہاں جو ہوتا ہے اور جو نظر آتا ہے وہ امریکی جنگی بخار میں مبتلا سرکار کی کارروائی ہے اور اس کا مقصد امریکا کے دشمنوں سے چھپ کر ایسے ہتھیاروں کی تیاری ہے جو آنے والے وقت میں بھی امریکا کی سپر پاور حیثیت کو برقرار رکھ سکیں۔ ان ہتھیاروں میں سب سے اہم اُڑن طشتریاں ہیں۔

لیکن یہ گروہ اس بات کی کوئی وضاحت نہیں کرتا کہ .....

جب کولمبس یہاں آیا تھا تب تو یہاں پسماندہ ترین ریڈ انڈین آباد تھے تب بھی اس نے اُڑن طشتریاں دیکھی تھیں اور سمندر سے عجیب اجسام نکل کر آسمان کی طرف جاتے دیکھے تھے۔ نیز یہاں ایسے واقعات ہونا جو مادے کے قوانین کے خلاف ہیں عام وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ جیسے اشیا کا یکایک غائب ہو جانا، وقت کا آگے پیچھے ہو جانا، یا بنا کسی وجہ کے شدید ریڈیائی خلل واقع ہونا۔ ایک ناقابلِ یقین واقعے میں ایک غائب ہونے والے سیسنا طیارے کے پائلٹ کی آواز کنٹرول ٹاور کو اس وقت سنائی دی جب اس کے ایندھن کو ختم ہوئے بھی کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ ریڈار پر ایک طیارہ اچانک نمودار ہوا۔ کنٹرول ٹاور نے پائلٹ کی آواز سنی جو اپنے ساتھی سے بات کر رہا تھا پھر جس طرح یہ طیارہ نمودار ہوا تھا اسی طرح غائب بھی ہو گیا۔ طبیعات کے اصولوں کے مطابق یہ چیز ناممکن ہے کہ وقت کچھ دیر کے لیے خود کو اس طرح دُہرائے۔

اسی طرح ایک بڑے مسافر بردار طیارے نے برمودا کی فضاؤں کے اوپر ایک روشن بادل میں سفر کیا اور وہ دس منٹ تک سفر کرنے کے باوجود اسی مقام پر رہا تھا جہاں بادل میں گھستے وقت تھا۔ اس طیارے کے دس منٹ غائب ہو گئے تھے۔ طیارے کی تمام گھڑیاں اور حد یہ کہ مسافروں کی گھڑیاں بھی دس منٹ پیچھے پائی گئی تھیں۔ یہ کس طرح ممکن ہوا؟ ایک اور واقعے میں اینڈورس سے میامی آنے والا ایک چھوٹا طیارہ اسی طرح بادل میں سفر کرتے ہوئے وقت سے آدھا گھنٹہ پہلے میامی پہنچ گیا۔ یہ چیز ماہرین کو بھی چکرا دینے کے لیے کافی ہے۔ آخر اسی علاقے میں اس قسم کے واقعات کیوں پیش آتے ہیں؟

اُڑن طشتریوں اور غیر ارضی مخلوق کے حامی متفق ہیں کہ برمودا خلائی مخلوق کی سرگرمیوں کا مرکز ہے اور یہ بہت طویل عرصے سے یہاں اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے خیال میں کسی بعید سیارے کے یہ باسی خلا میں طویل سفر کسی ایسے طریقے سے کرتے ہیں جس سے یہ بہت کم وقت میں زمین تک آ جاتے ہیں اور یہاں سے اپنے سیارے پر واپس بھی چلے جاتے ہیں۔ یہاں ان کی خفیہ موجودگی کی

ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ انہیں زمین سے کسی چیز کی ضرورت ہے جو ان کے اپنے سیارے پر ختم ہو چکی ہے اور زمین پر وافر مقدار میں پائی جاتی ہے۔ یہ چیز کوئی دھات بھی ہو سکتی ہے، کوئی ایندھن بھی اور کوئی خاص عنصر بھی۔

بہت عرصے پہلے جب وہ زمین پر آئے تو انہوں نے انسانوں کو ہر جگہ پایا اور انہیں ترقی یافتہ ہونے کے باوجود یہ خطرہ ہوا کہ انسان ان کی موجودگی کے خلاف مزاحمت کریں گے۔ اس لیے انہوں نے متمدّن انسانوں سے دور ایک ایسے علاقے کو اپنا مرکز بنایا جہاں نہ صرف انسان کی رسائی بہت دشوار تھی اور متمدّن دنیا کے لوگ اس خطے سے بے خبر تھے، دوسرے اس علاقے میں بسنے والے انسان نہایت پسماندہ تھے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا تھا کہ ان کی زبان تحریری نہیں تھی۔ اس لیے باہر سے آنے والوں کو اطمینان تھا کہ وہ ان کو دیکھ بھی لیں تو ان کے بارے میں کسی کو بتا نہیں سکتے تھے۔ پھر انہوں نے دور دراز کے جزائر کو اپنا مرکز بنایا جہاں رہنے والے اتنے پُرامن تھے کہ ان کے پاس سرے سے ہتھیار ہی نہیں ہوتے تھے۔ ان کی آپس کی لڑائیاں ہاتھ پیروں سے ہوتی تھیں۔ یہاں ان کو مزاحمت کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔

مزید احتیاط کے طور پر انہوں نے زیر آب اپنے اڈے بنائے جہاں اس وقت تک انسانوں کی رسائی نہیں تھی۔ جنوبی امریکا اور کریبین کے علاقے میں بسنے والے انسان بہت محدود کشتی رانی کرتے تھے اور اپنے ساحلوں اور جزائر سے چند میل سے زیادہ دور نہیں جاتے تھے۔ اس لیے وہ خلا سے آنے والی مخلوق کی سرگرمیوں میں کسی طرح خلل نہیں ڈال سکتے تھے۔ برمودا کے علاقے کو چننے کی کچھ وجوہات اور بھی ہو سکتی تھیں۔ ایک یہاں زیر آب آتش فشاں پائے جاتے ہیں جن سے کثیر مقدار میں میتھین گیس نکلتی ہے جو نہایت اعلیٰ درجے کا ایندھن ہے۔ اب تک انسان توانائی کے اس لامحدود ذخیرے کو اپنے قابو میں کرنے کا کوئی آسان اور محفوظ طریقہ ایجاد نہیں کر سکا لیکن ضروری نہیں ... خلا سے آنے والوں کے لیے یہ کوئی مشکل کام ہو۔ اگر ان کو زمین پر رہنا ہے تو توانائی کی ضرورت تو ہوگی اور یہ ضرورت یہاں بآسانی پوری ہو سکتی تھی۔

دوسرے آتش فشاں ہونے کی وجہ سے وہ ایسی دھاتوں اور عناصر تک بھی رسائی حاصل کر سکتے تھے جو عام طور سے کرۂ ارض پر نایاب ہیں اور صرف پگھلے ہوئے میگما میں پائی جاتی ہیں جیسے بھاری دھاتیں جن میں سونا چاندی، یورینیم اور ریڈیم وغیرہ ہیں۔ یہ جتنی سطح زمین پر پائی جاتی ہیں اس سے کہیں ہزار گنا زیادہ مقدار میں زمین کے اندر پگھلے ہوئے میگما میں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح سمندر کے پانی سے وہ ہائیڈروجن اور آکسیجن بھی وافر مقدار میں حاصل کر سکتے ہیں۔ زمین پر ہائیڈروجن سب سے طاقت ور ایندھن ہے یہی وجہ ہے کہ خلائی راکٹوں کی پرواز میں مائع ہائیڈروجن کو آکسیجن کے ساتھ ملا کر استعمال کیا جاتا ہے جس سے بے پناہ توانائی پیدا ہوتی ہے اور یہ توانائی راکٹ کو بے پناہ رفتار سے خلا میں دھکیل دیتی ہے۔ ممکن ہے خلا سے آنے والوں کو بھی ہائیڈروجن درکار ہو۔

یہ تو طے ہے کہ اگر خلا سے کوئی مخلوق زمین پر آئی ہے تو اسے انسانوں سے کوئی سروکار نہیں ہے کیونکہ اس نے نہ تو انسانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے اور نہ ہی خود کو انسانوں پر ظاہر کیا ہے۔ اس کا مقصد کچھ اور ہے اور یہ اسی مقصد کے لیے چھپ کر سرگرم عمل ہے۔ یہ مخلوق ہمارے مقابلے میں اتنی ترقی یافتہ ہے کہ اب تک کامیابی سے خود کو خفیہ رکھا ہے۔ آج دنیا تلاش کے جدید ترین آلات سے لیس ہے۔ خاص طور سے ترقی یافتہ دنیا میں اب کوئی گروہ چھپ کر بڑے پیمانے پر اپنی سرگرمیاں جاری نہیں رکھ سکتا...... جاسوسی کے لیے ریڈیائی آلات ہیں۔ اس طرح آسمانوں سے زمین پر پڑی سوئی دیکھ لینے کی طاقت رکھنے والے مصنوعی سیارے ہیں۔ فضا میں ہمہ وقت اُڑتے جاسوس طیارے ہیں۔ زیر آب سننے اور دیکھنے کے آلات سے لیس جدید ترین آبدوزیں ہیں۔ زمین پر طاقت ور بصری اور ریڈیائی دوربینوں سے لیس بے شمار ایسی رصد گاہیں ہیں جہاں سے خلا پر ہمہ وقت نظر رکھی جاتی ہے اور اگر زمین کے قریب سے کوئی چند میٹرز قطر کا شہابیہ بھی گزرتا ہے تو یہ اسے ریکارڈ کر لیتی ہیں۔ تب کوئی مخلوق اتنے بڑے پیمانے پر نقل و حرکت کرتی ہے یہ اسے کیوں ریکارڈ نہیں کر پاتی ہیں۔ مثلاً لوگوں نے طیاروں اور بحری جہازوں سے عجیب و غریب چیزیں دیکھیں لیکن اس علاقے میں موجود امریکا کے جدید ترین جاسوسی کے آلات ان کو ریکارڈ نہیں کر سکے۔ حالانکہ ان کا حجم اتنا زیادہ تھا کہ ان کو لازمی ریکارڈ کرنا چاہیے تھا۔ جیسے پانی کا جناتی دھارا، یا امریکی جنگی جہاز سے نظر آنے والا عجیب و غریب چاند نما کرہ جو سمندر سے نکل رہا تھا یا پھر مسافر بردار طیارے کو دکھائی دینے والا سمندری بلبلہ جس کا قطر تین میل تھا۔ یہ سب چیزیں کبھی بھی ریکارڈ نہیں کی گئیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کے دو ہی معنی نکلتے ہیں یا تو امریکی کسی وجہ سے جان کر انجان بنے ہوئے ہیں یا پھر ان کو سرے سے پتا ہی نہیں چلتا ہے کہ ان کے پانیوں میں ان کی ناک کے عین تلے ہو کیا رہا ہے؟ یہ بھی ممکن ہے امریکی اعلیٰ حکام اور جاسوس ادارے اس بارے میں کچھ جان گئے ہوں لیکن کسی وجہ سے اسے چھپایا جا رہا ہو۔ اسی وجہ سے امریکی حکومت سرکاری طور پر کئی بار برمودا میں پیش آنے والے واقعات کی پُراسراریت سے انکار کر چکی ہے اور اس کا کہنا ہے کہ یہ واقعات معمول کے مطابق پیش آئے ہیں۔ حالانکہ یہاں غائب ہونے والے سینکڑوں بحری جہازوں اور سو سے زیادہ طیاروں کا سرے سے کوئی سراغ ہی نہیں ملا ہے۔ دنیا کے کسی حصے میں اتنی بڑی تعداد میں بحری جہاز اور طیارے غائب نہیں ہوئے.... شمال مشرقی اوقیانوس میں بھی نہیں جو دنیا کے چند مصروف ترین بحری راستوں میں شامل ہے اور یہاں سے روزانہ سینکڑوں کے حساب سے پروازیں گزرتی ہیں۔ مگر حادثات کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے اور ان میں سے کوئی بھی پُراسرار گم شدگی شامل نہیں ہے۔ ہر حادثے کے بعد ملبہ اور لاشیں بھی مل گئیں۔ جبکہ ... برمودا میں بحری جہاز، طیارے اور ان کے مسافر سرے سے کوئی نشان چھوڑے بغیر غائب ہو جاتے ہیں۔

اتنی ساری گم شدگیوں کی تحقیق کے بجائے ان کی... پُراسراریت سے مسلسل انکار کرنا بجائے خود نہایت مشکوک ہے۔ آخر امریکی حکومت اور سائنس دان جو ذرا ذرا سے واقعات کی کھوج کے لیے زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں، ان واقعات پر کیوں توجہ نہیں دیتے؟ کیا اس میں ان کا کوئی مفاد چھپا ہوا ہے؟ کیا امریکی حکومت جانتی ہے کہ اس علاقے میں کوئی خلائی مخلوق سرگرمِ عمل ہے اور وہ اتنی طاقت ور ہے کہ امریکا بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا.... کیا امریکی حکومت اور اس غیر ارضی مخلوق کے درمیان کسی قسم کا معاہدہ ہو گیا ہے جس کے تحت امریکی حکومت ان کی سرگرمیوں سے حرفِ نظر کرتی ہے اور انہیں خفیہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے؟ اس کے بدلے امریکی اس مخلوق سے وہ جدید ٹیکنالوجی حاصل کرنا چاہتی ہے جس کی مدد سے آنے والے وقتوں میں دنیا اور خلا پر بھی اپنا راج قائم کر سکے یا امریکی باوجود کوششوں کے اس راز کو نہیں جان سکے اور اپنی تضحیک کے باعث اس کے وجود سے ہی انکاری ہیں۔

امریکا میں ایریزونا کی ریاست میں ایک جگہ ایریا ففٹی ون کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا شمار امریکا کی چند خفیہ ترین جگہوں میں ہوتا ہے اور سوائے چند اعلیٰ حکام کے کوئی نہیں جانتا ہے کہ یہاں کن پروجیکٹس پر کام ہو رہا ہے اور یہاں کن چیزوں کو رکھا گیا ہے۔ امریکی صدر کو بھی اس جگہ کے بارے میں مکمل معلومات فراہم نہیں کی جاتیں اور جو سیاست دان یا سرکاری حکام جو براہِ راست یہاں سے تعلق نہیں رکھتے.... جب ایریا ففٹی ون کا دورہ کرنے آتے ہیں تو ان سے باقاعدہ حلف لیا جاتا ہے کہ وہ یہاں جو دیکھیں گے یا جانیں گے اس کے بارے میں کبھی زبان نہیں کھولیں گے۔ یہاں جو لوگ کام کرتے ہیں ان پر بھی ایسی ہی پابندی عائد کی جاتی ہے۔ عام طور سے ایک شعبے میں کام کرنے والے سائنس دانوں اور ٹیکنیشن حضرات کو دوسرے شعبے کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ .... یہاں کی نگرانی اور سیکورٹی کی ذمّے داری ایک الگ محکمے کے سپرد ہے جو براہِ راست پنٹاگون کے تحت کام کرتا ہے۔

مستقبل کے خفیہ ہتھیاروں جن میں کیمیائی اور حیاتیاتی ہتھیار شامل ہیں ان کے پروجیکٹ سال ہا سال سے ایریا ففٹی ون میں جاری ہیں۔ ان کو حتمی تیاری تک خفیہ رکھا جاتا ہے۔ پھر ان ہتھیاروں کو نہایت رازداری سے فوج کے مخصوص یونٹوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ لیکن گزشتہ کچھ عرصے سے ایریا ففٹی ون کے بارے میں چہ میگوئیاں جاری ہیں کہ یہاں پر امریکی حکومت نے کچھ ایسی چیزوں یا مخلوق کو رکھا ہے جن کا تعلق کرۂ ارض سے نہیں ہے۔ خلا سے آنے والی یہ مخلوقات کیسے امریکی حکام کے ہاتھ آگئی اس بارے میں کوئی نہیں جانتا، مگر ایریا ففٹی ون کے وہ گوشے جو نہایت خفیہ ہیں ان چیزوں کے لیے مخصوص ہیں۔ یہ مخلوق یا ایلین زندہ حالت میں ہیں یا مردہ حالت میں اس بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ ان پر امریکی کیا تحقیق کر رہے ہیں اس راز سے پردہ اُٹھنا ابھی باقی ہے لیکن یہ کب ہوگا یہ کوئی نہیں جانتا؟

اگرچہ آج ہمارے پاس کوئی حتمی ثبوت نہیں ہے کہ کبھی کوئی غیر ارضی مخلوق زمین پر آئی یا اب بھی یہاں قیام پذیر ہے لیکن یہ بات یقینی ہے کہ وقفے وقفے سے منظرِ عام پر آنے والے واقعات کی تہ میں کچھ نہ کچھ چھپا ہوا ہے۔ الہامی مذاہب ہمیں بتاتے ہیں کہ انسان ہی خالق کائنات کی اکمل ترین اور بہترین مخلوق ہے لیکن اس سے اس بات کی تردید نہیں ہوئی کہ کائنات میں کہیں کوئی اور ذہین مخلوق موجود نہیں ہے۔ ممکن ہے آنے والے سالوں یا دہائیوں یا پھر اگلی صدی تک ہم ایسی کسی مخلوق کے بارے میں جان جائیں اور اس سے رابطہ کر سکیں۔

شبِ رنگیں

مسعود عالم

سفر کہانی لکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں مگر مسعود عالم میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے۔ شگفتہ جملوں، چبھتے ہوئے لفظوں سے خوب تصویر کشی کرتے ہیں۔ آسان اندازِ بیاں کے سحر میں اسیر کر کے قاری کو ہمراہ لیے لیے پھرتے ہیں۔ اکتوبر و نومبر 2009ء میں ان کی دو سفر کہانیاں آپ کی بصارتوں کا رزق بنیں، اب ایک اور کتھا حاضرِ خدمت ہے۔ یہ سفر کہانی افریقا کی ہے مگر اس میں نہ آدم خور قبائل ہیں اور نہ ننگ دھڑنگ وحشی قبیلہ، یہ وہاں کی ایک جداگانہ عکاسی ہے۔ ایک ایسی رنگین دنیا کا نظارہ ہے کہ حرف آخر سے پہلے رکنے کا سوال ہی نہیں۔

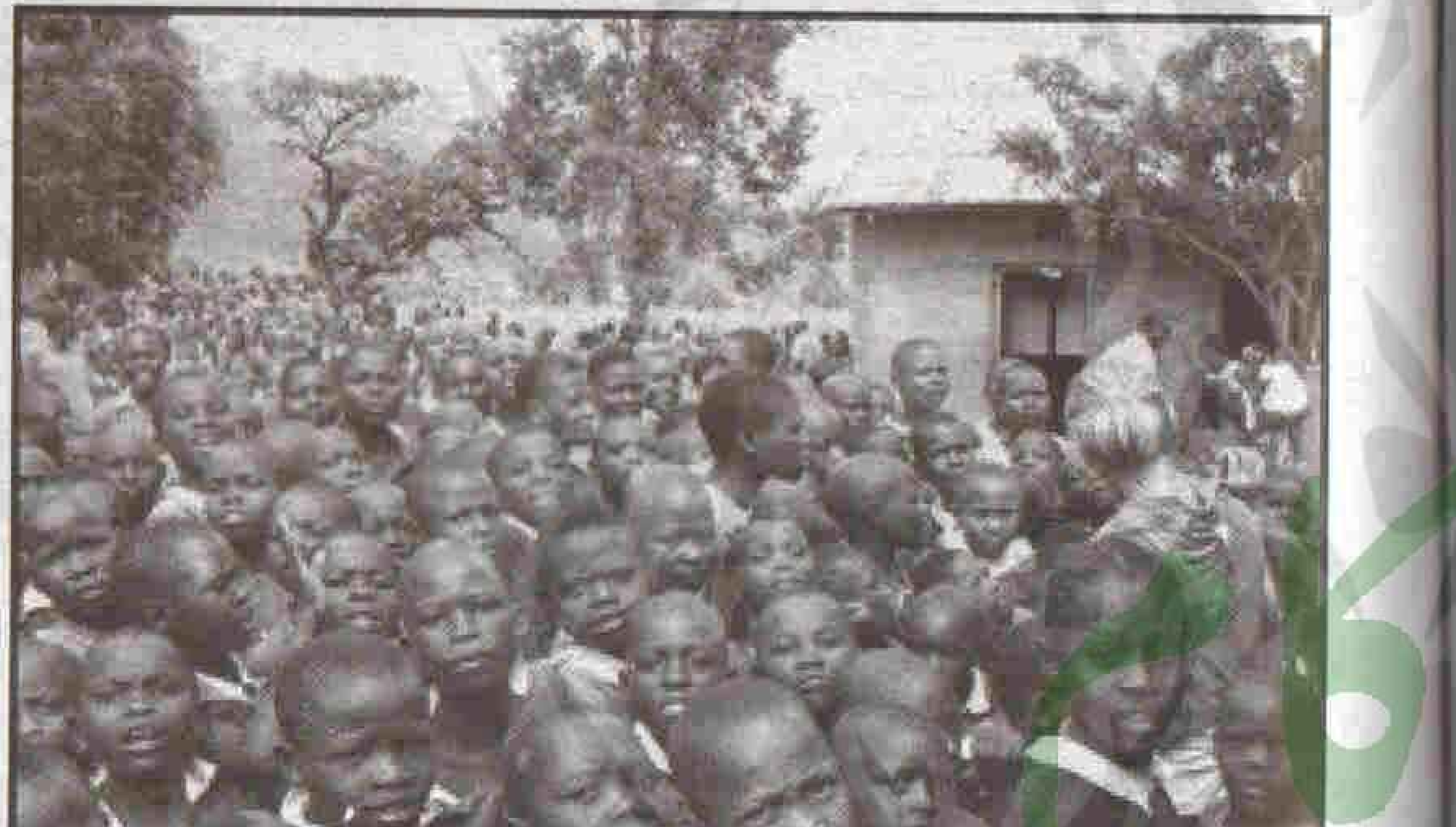

سفر کہانی کے شوقینوں کی مدارات، ایک الگ انداز کی کتھا

بصیر بھائی نے آنکھیں گھما کر میز پر بیٹھے آٹھ دس لوگوں کی جانب اشارہ کیا اور میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ”صرف ان لوگوں کی دولت اکٹھا کر لو تو پورا کینیا خرید سکتے ہو۔“

اس میز پر موجود ہر شخص، سوائے میرے اور بصیر بھائی کے، کروڑوں ڈالرز کی اسامی ہے۔ بصیر بھائی بھی کبھی ان کی برابری کرتے تھے لیکن آج کل مشکل حالات سے دوچار ہیں سو ان کا شمار بے چارے لکھ پتیوں میں ہونے لگا ہے۔ ان

WWW.PAKSOCIETY.COM

لوگوں میں ہر چیز مشترک ہے سوائے دولت کی مقدار کے۔ یہ سب یا ان کے والدین ہندوستان سے آئے تھے، سب مسلمان ہیں، ان کا تعلق ایک ہی فرقے سے ہے، سبھی غیر قانونی تجارت، جسے اسملنگ بھی کہا جاتا ہے، کر رہے ہیں یا کر چکے ہیں اور وہ سب کینیا کے غربا سے ڈرتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ بصیر بھائی نے ان لوگوں کی امارت کے بارے میں مبالغے سے کام نہیں لیا۔ میں خود بھی انہی میں سے ایک کا مہمان ہوں۔

میرا میزبان تیس کے پیٹے میں ہے اور دوستوں میں ہیرو کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جن کے ساتھ تکلف کا رشتہ ہوتا ہے وہ ہیرو بھائی کہہ کر بلاتے ہیں۔ انتہائی چست اور پھرتیلا، بہ مشکل دو گھنٹے کی نیند لینے کے بعد صبح تر و تازہ ملتا ہے۔

ہم دونوں کی یہ پہلی ملاقات ہے۔ دراصل وہ میرے ایک دوست کا دوست ہے اور اس کا اصول ہے کہ دوست کے حوالے سے آنے والے بھی دوست ہی ہوتے ہیں۔ اس کے اس اصول کی بدولت ہی میں کینیا میں سیاح کے بجائے ایک مہمان بن کر رہ گیا ہوں۔

وہ خود مجھے ائرپورٹ لینے آیا اور راستے میں اصرار کرتا رہا کہ میں اس کے موبائل فون سے خیریت سے پہنچ جانے کی اطلاع اپنے گھر دے دوں۔ میں نے اس سے کرنسی تبدیل کرنے کی بات کی تو اس نے شلنگز کی ایک گڈی میرے سامنے رکھ دی اور جب میں نے اس کے برابر ڈالرز دینے چاہے تو وہ ناراض ہو کر چلا گیا اور کہلا بھیجا کہ وہ تو مجھے دوست سمجھ کر گھر لایا تھا تو پھر میں اس کی بے عزتی کیوں کر رہا ہوں؟

نیروبی میں اس کا ایک بڑا سا حویلی نما گھر ہے۔ جس کے دربان، خاکروب، خانساماں اور ڈرائیور سب سیاہ فام افریقی ہیں۔ ایک دیسی بیوی اور دو بچے بھی ہیں لیکن وہ کہیں گھر کی اندرونی تہوں میں چھپے رہتے ہیں۔

گھر کے باہر چمکتی ہوئی نئے ماڈلز کی پانچ گاڑیاں کھڑی ہیں، تین سیڈان اور دو فور وہیل ڈرائیو۔ پہلے دن ہم شہر گھومنے کے لیے نکلے تو ہر دو چار گھنٹے کے بعد وہ واپس گھر آتا، ہم لوگ پہلی گاڑی سے نکل کر دوسری میں بیٹھتے اور پھر چل پڑتے۔ تین چار مرتبہ یہ سلسلہ دیکھ کر مجھ سے رہا نہیں گیا تو میں نے پوچھ لیا کہ آخر گاڑیاں بدلتے رہنے میں کیا رمز ہے؟ کہنے لگا ”موبائل فون بہت زیادہ استعمال کرتا ہوں نا تو بیٹری ختم ہو جاتی ہے۔ اب کون بار بار چارج کرے، اس لیے فریش بیٹری والی گاڑی لے لیتا ہوں۔“

بعد میں بصیر بھائی نے اس رویے کی ایک اور ممکنہ وجہ بتائی کہ ہیرو کو اپنی سیکورٹی کی بہت فکر رہتی ہے اس لیے وہ کسی کو یہ معلوم نہیں ہونے دیتا کہ کس وقت وہ کون سی گاڑی میں ہوگا۔

نیروبی میں ہیرو خود مجھے ہر جگہ لے جاتا یا اپنے کسی دوست کو یہ ذمے داری سونپ دیتا، اس ہدایت کے ساتھ کہ مجھے کہیں اکیلا نہیں جانے دیں۔ اور گاڑی ہیرو کی ہو یا اس کے کسی امیر ہندوستانی نژاد دوست کی، سب اچھے موسم میں بھی ڈرائیو کے دوران کھڑکی کے شیشے بند رکھتے ہیں اور دروازے لاک کرنا کبھی نہیں بھولتے۔ گلیوں، بازاروں میں چلتا پھرتا ہر غریب افریقی چور، لٹیرا اور قاتل ہو سکتا ہے اس لیے اسے ایک فاصلے پر رکھنا ضروری ہے۔

ایک دفعہ ہیرو کے ساتھ گاڑی بدلنے کے لیے اس کے گھر جانا ہوا تو گارڈن میں ایک صاحب ٹہل رہے تھے جو ہیرو کو دیکھتے ہی خوشامدانہ مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ ملانے کو آئے۔ ہیرو نے ان سے حال احوال پوچھا اور رات میں ملنے کا کہہ کر رخصت کر دیا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ کینیا کی پارلیمان کے ایک ہندوستانی نژاد رکن ہیں اور ہیرو کے در پر ماتھا ٹیکنے آتے رہتے ہیں۔

عیش و آرام کی اس میزبانی میں جکڑا ہوا میں ایک قیدی سیاح ہوں۔ میں بازاروں سے گزرتے ہوئے حسرت سے ان لوگوں کو دیکھتا ہوں جو آزادی سے چل پھر رہے ہیں، بھاؤ تاؤ کر رہے ہیں یا دکانوں کے تھڑوں اور گلی کی نکڑوں پر کھڑے یونہی آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہے ہیں۔ ائرکنڈیشنڈ گاڑی کے شیشے سے پار دیکھتے ہوئے مجھے اس ویگن میں بیٹھنا بھی رومانوی سا لگا جسے مقامی لوگوں نے متاتو کا نام دے رکھا ہے۔ متاتا کا مطلب مسئلہ یا پریشانی ہے (کارٹون فلم لوائن کنگ کے گانے ہکونا متاتا کا مطلب ہے غم نہ کر) اور یہ نام اس لیے کہ اس ویگن میں لوگوں کو بٹھایا نہیں جاتا بلکہ ٹھونسا جاتا ہے۔

میں نے پنڈی اور لاہور کی ویگنوں میں بھی انسانیت سوز سلوک دیکھا اور بھگتا ہے لیکن نیروبی میں ویگن کے کلینرز بہت ہی باکمال لوگ ہیں۔ مسافر کو یوں اندر دھکیلتے ہیں کہ وہ خود بہ خود تہہ ہو کر نشست اور چھت کے بیچ جتنی بھی جگہ میسر ہے، اس میں فٹ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اترتے ہوئے، مسافر کو کھینچ کر دروازے کے قریب لایا جاتا ہے اور پھر اس کی تہیں کھول کر باہر لڑھکا دیا جاتا ہے۔ متاتو سے نکل کر کیا احساس ہوتا ہے، میں اس کا تجربہ خود کرنا چاہتا ہوں۔ گلیوں میں کیسی باس ہے اور لوگوں کے لہجے میں کتنی کھنک ہے، میں قریب

سے جاننا چاہتا ہوں۔

میرے لیے یہ افریقا کا پہلا تجربہ ہے۔ اس سے پیشتر میں نے افریقا صرف ٹی وی کی اسکرین پر دیکھ رکھا ہے۔ بھوک، غربت اور بیماریوں والا افریقا۔ لیکن یہ ملک سرسبز ہے اور بے انتہا خوبصورت۔ میں اس کی گھاس پر ننگے پاؤں چلنا چاہتا ہوں، اس کے درختوں پر بیٹھے پرندوں کی آوازیں سننا چاہتا ہوں، اس کے ڈھابوں پر بیٹھ کر کھانا چاہتا ہوں......!

لیکن کینیا کے اس سفر میں کچھ بھی میرے اختیار میں نہیں۔ جب میں ہیرو کی ”دل آزاری“ کر کے اس کے گھر سے ہوٹل منتقل ہو گیا تو بھی اس کی مخصوص میزبانی جاری رہی اور میں کینیا کو صرف اسی کی نظر سے دیکھ پاتا۔ قریباً دو ہفتے کے اس قیام میں ہیرو اور اس کے دو ایک دوست مسلسل میرے ساتھ رہے۔ صبح میرے جاگنے سے پہلے وہ آ جاتے اور میرے سونے کے بعد ہی واپس جاتے۔ ان کے کاروبار اور گھر کیسے چلتے ہیں، میں خواہش کے باوجود نہیں جان پایا کیونکہ ان موضوعات کو ہمیشہ ہنسی میں ٹال دیا جاتا تھا۔

ہزاروں میل پر پھیلے جنگلات اور ان میں پلنے والی حیات کے حوالے سے جانا جانے والا کینیا میرے میزبانوں کے لیے صرف نائٹ لائف کی رنگینیوں سے مزین ایک غریب ملک ہے جہاں ہر وہ شخص بادشاہ ہے جس کے دل میں ایک رات کی بادشاہت کی تمنا ہو اور جیب میں پیسا اور میرے میزبانوں کی جیب میں بہت پیسا ہے۔

☆☆☆

یہ نائٹ کلب اتنا وسیع ہے کہ ڈانس کے لیے ایک نہیں کئی چار فلور بنائے گئے ہیں۔ ہیرو اور اس کے دوست حسبِ دستور سنگل مالٹ وہسکی کی بوتل سامنے رکھے لوگوں کو ناچتے ہوئے دیکھ رہے ہیں اور تمتماتے چہروں اور بے چین ہاتھوں کے اشاروں سے ناچنے والیوں کے بارے میں اپنے عزائم ایک دوسرے تک پہنچا رہے ہیں۔

کان پھاڑنے والا کلب میوزک، چھت اور دیواروں کے ہر حصے سے پھوٹا پڑتا ہے اور ایسے میں بات چیت کی صرف ایک صورت ہے کہ کہنے والا اپنا منہ سننے والے کے کان کے عین اوپر رکھ کر بات کرے اور پھر جواب سننے کے لیے اپنا کان اس کے لبوں پر جا رکھے۔ گفتگو کا یہ انداز ظاہر ہے باہمی قربت بڑھانے کا باعث بنتا ہے اور شاید یہی کلبنگ کی منشا بھی ہوتی ہے۔

فلور پر بہت سے جوڑے اسی قسم کی گفتگو کر رہے ہیں۔ جب وہ ڈانس کے نام پر ہونے والی فری اسٹائل اُچھل کود

ان دنوں صدر مقام لاڑکانہ ہے (لاڑ کا معنی سنسکرت میں لعاب ہے اور کانہ بہ معنی خانہ یا گھر۔ اگر ہم لعاب کا مفہوم دریا کی گاد لیں تو ایک مقامی حقیقت کا مظہر ہے کیونکہ مقامی لوگ آس پاس کے علاقے میں اسی کی کھاد ڈالتے ہیں) جو اپنے ہمنام دریا پر واقع ہے اور سندھی امیروں کے لیے نہایت اہم چوکی ہے کیونکہ وہ اپنی سلطنت میں داخل ہونے والے سوداگروں سے پہلی دفعہ یہیں چنگی وصول کرتے ہیں اور اس کے علاوہ کچھ گنداوا کے بلوچوں کی دستبرد سے بچنے کے لیے یہیں ایک بڑی فوج متعین رکھتے ہیں۔

لیفٹیننٹ ہنری پوٹنگر کے 1816ء میں لکھے گئے ”سفرنامہ بلوچستان اور سندھ“ سے اقتباس

تلاش: اظہر جمیل صدیقی، کراچی

سے تھک جاتے ہیں تو راز و نیاز کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ دونوں میں سے ایک سرگوشی کرتا ہے، دوسری طرف سے ہنسی کا فوارہ پھوٹتا ہے، اِدھر آنکھوں میں چمک آتی ہے، اُدھر سے ایک خوابیدہ سی سرگوشی ہوتی ہے۔ اِدھر سے ہاتھ حرکت میں آتے ہیں۔ اُدھر شانوں سے لباس کھسک کر بازوؤں پر آ گرتا ہے۔ اِدھر سے جذبے امڈے آتے ہیں، اُدھر خود سپردگی طاری ہوتی ہے...... اتنی دیر میں میوزک ایک انگڑائی لیتا ہے اور دونوں پھر ایک دوسرے سے الگ ہو کر ناچنے لگتے ہیں۔

ہیرو تھوڑی دیر بعد اشارے سے مجھ سے پوچھتا ہے کہ مزہ آ رہا ہے؟ میں دائیں ہاتھ کا انگوٹھا اوپر کر کے جواب دیتا ہوں کہ خوب آ رہا ہے۔ وہ تسلی سے وہسکی کا ایک اور گلاس خالی کرتا ہے اور پھر سے ناچنے والیوں کے چکنے بدنوں پر سے پھسلتے پسینے کے قطرے گننے لگتا ہے۔

پھر وہ میرے کان میں گھس کر چیخا ”تم فلور پر جا کر ناچتے کیوں نہیں؟“ میں نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا، پھر ایک آنکھ میچ کر دائیں ہاتھ کا انگوٹھا بلند کیا کہ بھائی میں ایسے ہی ٹھیک ہوں اور بہت مزے میں ہوں لیکن ہیرو کی سوئی اٹک چکی ہے۔

اب وہ ہر پانچ منٹ کے بعد اپنا سوال دُہرانے لگا۔ تنگ آ کر میں نے کہا، میں یہاں کسی کو جانتا نہیں، ڈانس کس کے ساتھ کروں؟

اپنی بات مکمل ہوتے ہی مجھے اپنی حماقت کا احساس

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوا۔ اب یہ ضرور اپنے دھت دوستوں کے ساتھ مجھے بھی فلور پر لے جانے کے لیے اصرار کرے گا۔ میں صرف یہ سوچ کر ہی دہل رہا ہوں کہ موٹی توندوں اور ڈگمگاتے قدموں والے ان حضرات کے ساتھ مل کر ہم سب کیا تماشا بننے والے ہیں۔ لیکن ہیرو کا دماغ کسی اور لائن پر کام کر رہا ہے۔

ان میں سب سے خوبصورت لڑکی کون سی ہے؟ ہیرو نے ڈانس فلور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، میز کے گرد بیٹھے سب لوگوں کے کان میں باری باری چلّاتے ہوئے پوچھا۔ اپنی باری پر میں نے بھی ایک کی طرف اشارہ کردیا۔ شوخ پیلے رنگ کے بالوں والی یہ افریقی حسینہ اکیلی ہے اور بہت نزاکت سے ہلکے ہلکے کمر کو لچکاتے ہوئے ناچ رہی ہے۔

میں نے پائپ سلگانے کے لیے دو تین لمبے کش لیے اور میز پر بیٹھے لوگوں کو بچاتے ہوئے گردن دوسری جانب موڑ کر دھواں چھوڑا۔ ہال کے نیم اندھیرے میں مجھے لگا ایک ہیولا میرے بالکل پاس آنے کو تھا اور اب ہاتھ کا پنکھا بنائے دھوئیں کے اس مرغولے کو منتشر کر رہا ہے جو سیدھا اس کے چہرے سے آ ٹکرایا تھا۔ دھواں چھٹا تو مجھے اس کا چہرہ نظر آیا۔ وہ پیلے بالوں والی ڈانسر تھی۔

”اوہ، معاف کرنا، میں نے آپ کو یہاں دیکھا نہیں تھا۔“ میں نے معذرت کی۔

وہ یقیناً میری آواز نہیں سن پائی تھی اور وہیں کھڑی مجھے دیکھ کر مسکراتی رہی۔

میں ذرا بدحواس ہو کر کھڑا ہو گیا۔

وہ ہنس دی۔

اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور کچھ کہا جس میں سے مجھے صرف ”ڈانس“ سمجھ میں آیا۔

میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا، وہ بھی ہم دونوں کو دیکھ کر ذو معنی اشارے کر رہے تھے، ہیرو نے حوصلہ افزائی کے انداز میں ڈانس فلور کی طرف اشارہ کیا اور میں پیلے بالوں والی کا ہاتھ تھام کر فلور پر آ گیا۔

کلب کے ڈی جے کا رجحان اسی کی دہائی کی جانب ہے۔ ڈسکو جو بعد میں راک اور پھر پاپ کے پیروں تلے روندا گیا، یہاں اب بھی مجمع لوٹ رہا ہے۔ ”آئی ول سروائیو“ یہ گانا تو میں نے سن رکھا ہے لیکن یہاں کلب کے ماحول میں فٹ کرنے کے لیے اس کے سازوں کو ذرا تیز کر دیا گیا ہے اور ڈرم کی ایک بیٹ ہے جو اس میں صرف ڈانس کا تسلسل رکھنے کے لیے بڑھا دی گئی ہے۔

ہم دونوں ناچنے لگے۔ وہ پھر مسکرانے لگی۔

اس نے اسکرٹ اور ایک چھوٹا سا ٹاپ پہن رکھا ہے۔ اس کا جسم پسینے کی باریک سی تہ میں چمک رہا ہے۔ اس کے کانوں میں بلوریں آویزے ہیں جو مختلف رنگوں کی روشنیوں کو منعکس کرتے ہوئے جگمگ کرتے ہیں۔

اس کی خفیف سی حرکت سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بہت اچھا ناچنے والی ہے لیکن اس وقت وہ اپنا کمال نہیں دکھا رہی بلکہ صرف میرا ساتھ دے رہی ہے لیکن پھر بھی میرے ”محنت“ سے گھڑے ہوئے اسٹیپس کے مقابلے میں اس کی حرکت بہت فطری محسوس ہوتی ہے۔

کچھ دیر ناچنے کے بعد میری سانس پھولنے لگی تو میں نے بھی مروجہ طریقے سے گفتگو کا آغاز کیا۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر میں نے اپنا منہ اس کے کان سے جا لگایا۔ لیکن پھر میری سمجھ میں نہیں آیا، میں کیا کہوں؟

”تم نے بالوں کو بڑا اچھا رنگ دیا ہے۔“ مجھے اور کچھ نہ سوجھا تو میں نے کہہ دیا۔

”میں نے بال رنگے نہیں، یہ ان کا اصلی رنگ ہے۔“ اس نے میرے کان تک پہنچنے کے لیے اپنے کھلے بال میرے چہرے پر بکھیرتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے بال مونجھ کی طرح مضبوط اور کھردرے ہیں لیکن ان سے خوشبو کی لپٹیں بھی اٹھ رہی ہیں۔

”کیا کینیا کی خواتین میں اس رنگ کے بال عام ہیں؟“

”میں صومالی ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں اب تمسخر کی جھلک ہے۔

میں اور بھی خجل ہو گیا۔ اب کیا بات کروں؟

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”جیین۔“ پھر اپنی دلکش مسکراہٹ سجا کر بولی ”ویسے تمہیں صبح تک میں یاد رہوں گی نہ میرا نام۔ اس لیے جس نام سے چاہو مجھے پکار سکتے ہو۔“

”تم بہت اچھا ناچتی ہو، صرف شوق ہے یا پروفیشن؟“

”کام مائی ڈیئر...... یہ میرا کام ہے۔“

”یعنی......؟“

”یعنی میں ایک ”میزبان ڈانسر“ ہوں۔ جب بھی ڈانس فلور پر عورتوں سے زیادہ مرد دکھائی دینے لگتے ہیں تو میزبان لڑکیوں کو توازن بحال کرنے کے لیے بھیجا جاتا ہے لیکن تمہارے ساتھ ناچنے کے لیے تو مجھے تمہارے دوستوں نے بہت اچھی ٹپ بھی دی ہے۔“

میں نے کہا ”چلو، کچھ دیر تازہ ہوا میں سانس لینے

اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ہجوم میں سے راستہ بناتے ہوئے [illegible] آ گیا۔

ہیرو یا اس کے کسی دوست نے میری اس خوش فہمی کا [illegible] کیا ہے کہ صومالیہ کی یہ فاختہ اپنی مرضی، میری کشش یا [illegible] اتفاق سے میرے گھونسلے میں آ اتری تھی۔ اب میری [illegible] ہے، اپنے میزبانوں کو ایک سرپرائز دینے کی۔

ایک لمبے سے برآمدے کے دوسرے سرے پر گھاس کا [illegible] ہے جس میں جانے کے لیے دو سیڑھیاں نیچے اترنا پڑتی [illegible]۔ ہم انہی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ موسم انتہائی خوشگوار ہے [illegible] میرے لیے تو حیران کن حد تک خوشگوار ہے کیونکہ یہ جون کا مہینا ہے اور میں جہاں سے جہاز پر سوار ہوا تھا، وہاں سخت لو چل رہی تھی اور جب یہاں پہنچا تو سہ پہر کے وقت بھی درجۂ حرارت آرام دہ بیس ڈگری کے قریب تھا۔ اس وقت آدھی رات کو پسینے سے تر ہو کر باہر آئے تو باقاعدہ سردی کا احساس ہوا۔

”کیا یہ ممکن ہے کہ پندرہ منٹ ایک ساتھ ڈانس کرنے سے دو اجنبی دوست بن جائیں؟“ میں نے بات شروع کی۔ اس کے چہرے پر اب بھی مسکراہٹ تھی لیکن ویسی پروفیشنل قسم کی نہیں جو میں نے ڈانس فلور پر دیکھی تھی۔

”میری دنیا میں کچھ بھی ممکن ہے...... اب میں تم سے ایک سوال پوچھوں...... تم دوست کسے کہتے ہو؟“

”میری دنیا میں ہر وہ شخص دوست ہے، جس سے بات کی جا سکے۔“

”یہ بات...... تو پھر ہو جائے دوستی!“ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

اس کے ہاتھ میں حرارت ہے، زندگی ہے۔ اس لمس نے مجھے بتایا کہ میرا ہاتھ اس کے مقابلے میں کتنا خنک ہے۔

”تو اب ہم دوست ہیں...... ہیں نا؟“ میں نے تسلی چاہی۔

”میں حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ......“ وہ ہنسنے لگی۔

”پھر میرا ایک کام کرو۔ تمہیں جتنے پیسے دیے گئے تھے، [illegible] مجھ سے لو اور میرے دوستوں کو واپس کر دو۔ ان سے کہنا...... کچھ بھی کہہ دینا لیکن پیسے انہیں لوٹا دینا۔“ میں نے [illegible] نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

اس کے چہرے پر سنجیدگی آ گئی۔ ”میں سمجھ گئی ہوں، تمہارا مسئلہ کیا ہے۔ تمہارے دوستوں نے تمہاری مردانہ انا کو ٹھیس لگائی ہے اور تم اس کا بدلہ میرے ذریعے سے لینا چاہتے ہو......“

1810ء میں شہر کرمان کے سالانہ محاصل صرف پچیس ہزار تومان (ایک تومان آٹھ روپے یا ایک پاؤنڈ کے برابر ہے) تھے لیکن یوماً فیوماً اضافہ پذیر تھے۔ زیادہ تر بازار کے بھاری محصولات اور شالوں اور بندوقوں پر ٹیکس سے وصول ہوتے ہیں۔ شالوں پر ٹیکس پرانا نہیں اور اس سے ایک ایسا واقعہ منسوب ہے جو نہ صرف کرمان بلکہ ایران کی موجودہ حکومت کے فکروعمل کا مظہر ہے۔ شالوں کی روزافزوں پیداوار دیکھ کر شہزادے نے حکم دیا کہ آئندہ جو شخص سرکاری مہر کے بغیر شال خریدے گا اس پر بھاری جرمانہ عائد ہوگا۔ مہر لگوانے کے لیے ایک دفتر کھولا گیا اور خریدار کے لیے ضروری قرار دیا گیا کہ وہ خریدنے سے پہلے اس پر مہر لگوائے۔ لوگ ماقبل حکم دور کے شال ویسے ہی اوڑھتے رہے کہ حکم پیچھے سے تو لاگو نہیں ہو سکتا۔ شہزادے کا مطلب اور تھا اور جب مقررہ مدت گزر گئی تو اس نے سارے شہر کی تلاشی کا حکم دیا اور ہر اس شخص کو جرمانہ کر دیا جس کے ہاں ایک بھی بے مہر شال ملی۔ حکمت عملی کے اس شوشے سے اس نے ایک لاکھ روپے سے بھی زیادہ بٹور لیے جن میں ان شالوں کی قیمت بھی شامل تھی جو سرکاری عمال نے قبضے میں لے کر بیچ دی تھیں۔

لیفٹیننٹ ہنری پوٹنگر کے 1816ء میں لکھے گئے ”سفرنامہ بلوچستان اور سندھ“ سے اقتباس

تلاش: اظہر جمیل صدیقی، کراچی

میاں معروف فرملی عہد سکندر لودھی کا نہایت مشہور راجا تھا۔ اپنے زہد و ورع، ہمت و شجاعت، فیاضی و سخاوت کی وجہ سے بہت ممتاز درجہ رکھتا تھا۔ یہ سلطان لودھی کے زمانے سے لے کر اسلام شاہ کے عہد تک سیکڑوں لڑائیوں میں شریک رہا لیکن کبھی زخمی نہیں ہوا۔ اس نے تمام عمر بھی کوئی انعام یا تحفہ بادشاہ کی طرف سے قبول نہیں کیا۔ جب شیر شاہ اور مال دیو کے درمیان جنگ ہوئی تو یہ بھی تلوار سے زخمی ہوا۔ اس وقت اس کی عمر 107 سال تھی۔ شیر شاہ نے اس کے زخمی ہونے کے بعد 3 لاکھ تنکہ (سکۂ وقت یعنی اس وقت کا روپیہ) اس کے پاس بھیجے لیکن اس نے واپس کر دیے اور کہلا بھیجا کہ میں نے آج تک کبھی سلطانی انعامات کو قبول نہیں کیا کیونکہ جو کچھ مجھے ملتا ہے وہی میری خدمات سے زائد ہے۔ رہا زخم کھانا سو اس کا معاوضہ میں کیا لوں جبکہ وہ صرف اللہ کی راہ میں، میں نے حاصل کیا۔

مرسلہ: شیث بن سجاد، الخبر، سعودی عرب

WWW.PAKSOCIETY.COM

"میرا یہ مطلب ہرگز......"

اس نے ہاتھ اٹھا کر میری بات کاٹ دی۔ "ہمارے درمیان چند لمحوں کی ہی سہی، دوستی تو ہے۔ میں تمہارا کام کردوں گی لیکن مجھے پیسے دے کر تم اس دوستی کو ابھی اسی وقت توڑ دو گے۔ مت کرو ایسا۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "پھر ملیں گے دوست!" اس نے آنکھ مار کر کہا اور کلب کے اندر چلی گئی۔

ہیرو یا کسی اور سے رخصت چاہے بغیر میں وہاں سے اٹھا اور پیدل ہی اپنے ہوٹل کی طرف چلنا شروع کردیا۔ مجھے ٹھیک سے راستہ نہیں معلوم، ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے، رات بھی آدھی سے زیادہ بیت چکی ہے لیکن مجھے اس وقت کوئی فکر ہے نہ کوئی ڈر۔ مجھے ہیرو کی ناراضی کی بھی پروا نہیں، میں صرف چلنا چاہتا ہوں...... پیدل...... اور اکیلا۔

☆☆☆

ہفتے بھر میں نیروبی کا ہر معروف کلب، مجرا، قمار خانہ اور ریستوران میں دیکھ چکا ہوں اور ہیرو کے خیال میں وہاں اس کے علاوہ کچھ خاص ہے بھی نہیں دیکھنے کو۔ میں نے اسے یاد دلایا کہ کینیا وائلڈ لائف کے حوالے سے بھی جانا جاتا ہے تو اسے اچانک کچھ سوجھا۔ کہنے لگا "چلو کل کا دن وائلڈ لائف کے نام۔"

اگلے دن تین چار گاڑیوں کے قافلے میں ہم نکلے تو میں نے سوچا، چلو دیر سے ہی سہی لیکن جنگلوں کی باری تو آئی۔ لیکن شہر سے باہر نکلتے ہی یہ قافلہ سڑک سے اُتر کر قیام کرنے لگا تو میں نے حیرانی اور پریشانی سے آس پاس دیکھا۔ یہاں کوئی جنگل نہیں ہے بلکہ ایک وسیع و عریض ریستوراں ہے، نام جس کا نام ور ہے اور جو اسم بامسمیٰ گوشت خوروں کی جنت ثابت ہوا۔

یہاں آپ میز کرسی پر بیٹھ کر نیل گائے، بارہ سنگھے یا کسی اور معدوم ہوتی نسل کے جانور کے کباب بھی آرڈر کرسکتے ہیں اور اگر چاہیں تو سرسبز میدان میں بنے رنگ برنگے چھپروں میں سے ایک تلے جا بیٹھیں، اپنی مرضی کا کھانا پکانے کے اجزا آپ کو مہیا کر دیے جائیں گے اور ویٹر آپ کا چولہا جلا کر برتن آپ کو تھما کر چلا جائے گا، اب آپ جانیں اور آپ کی کچی یا پکی وائلڈ لائف!

ہیرو کے دوست اکثر اس کی کوکنگ کے قصیدے پڑھتے رہتے ہیں اس لیے مجھے حیرانی نہیں ہوئی جب ہم سجے سجائے میز کے بجائے ایک چھپر کے نیچے بچھی چٹائی پر جا بیٹھے۔ ہیرو نے ہرن کڑاہی بنانے کے لیے سیروں کے حساب سے گوشت اور مصالحوں کا آرڈر دیا اور پھر سب ٹھنڈی یخ بیئر پر ٹوٹ پڑے۔

ہیرو کے بیشتر دوست اپنی گرل فرینڈز کو بھی ساتھ لائے ہیں۔ شروع میں، میں نے یاد رکھنے کی کوشش کی تھی کہ کون کس کی دوست ہے لیکن یہ حساب رکھنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ ایک دن نسیم بھائی کے ساتھ کومل ہوتی اور بابو بھائی کے ساتھ شبنم تو دوسرے دن نسیم بھائی کی بغل میں نینا ہوتی تو بابو بھائی کی بانہوں میں کومل۔

یہ لڑکیاں عموماً کینیا کے مجروں میں ناچنے کے لیے بھارت سے چند مہینوں کے لیے درآمد کی جاتی ہیں اور اس دوران ان میں سے کچھ جیب خرچ بنانے کے لیے بھائی لوگوں کی گرل فرینڈز کے طور پر اوور ٹائم لگاتی ہیں۔

ان لڑکیوں نے ہمارے چھپر کے سامنے گھاس پر دریاں بچھائیں اور انتاکشری شروع کردی۔ مجھ سمیت کچھ مرد بھی ان کے ساتھ شامل ہوگئے جبکہ باقی لوگ چولہے کے گرد بیٹھ کر دھندے کی باتیں کرتے رہے۔ ہیرو نے کوٹ اُتار کر کھونٹی سے لٹکایا اور سفید شرٹ کے بازو چڑھاتے ہوئے حکم دیا کہ کڑاہی میں گھی انڈیلا جائے۔ کچھ ہی دیر میں بھنے گوشت کی خوشبو لڑکیوں کے گانے اور مردوں کے قہقہوں سے پورا میدان بھر گیا۔

اچانک چھپر سے ایک بلند اور کرخت آواز آئی اور سب خاموش ہوگئے۔ یہ ہیرو کی آواز ہے جو اب ناگواری سے کڑاہی میں پکتے ہوئے گوشت کا جائزہ لے رہا ہے اور ساتھ ساتھ درشت نظروں سے ٹونی کو دیکھ رہا ہے۔ وہ ٹونی کو کڑاہی کی نگرانی پر بٹھا کر تاش کی ایک بازی لگانے گیا تھا اور اسی میں گوشت ذرا سا جل گیا ہے۔

ٹونی کے والد شبر بھائی ہیرو کے دوستوں میں سے ہیں لیکن اس وقت باپ وہاں نہیں ہے اور ٹونی سخت خوف زدہ نظر آتا ہے۔ میں نے کبھی ہیرو کو غصہ کرتے نہیں دیکھا تھا لیکن پھر بھی ہر کوئی اس سے ڈرتا ہے۔ وہ صرف گھور کر کسی کو دیکھ لیتا تو دوسرا شخص گڑبڑا جاتا۔ بیشتر لوگ اس سے صرف خوشامدانہ گفتگو کرتے ہیں اور جب وہ خراب موڈ میں ہوتا تو بہت نزدیکی دوست بھی اس سے بات کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔

اس وقت جب وہ ٹونی کو گھور رہا ہے تو باقی سب لوگ بھی سانس روکے کچھ ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔

لیکن خیریت رہی۔ ہیرو نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے اعلان کیا کہ یہ کھانا خراب ہوچکا ہے اس لیے لنچ ہم ریستوران میں بیٹھ کر کریں گے اور سب نے اطمینان کی سانس لی۔

ایک دن یونہی بیٹھے بٹھائے ممباسا جانے کا پروگرام بن گیا۔ برہان بھائی ممباسا کی ہندوستانی نژاد کمیونٹی میں وہی مقام رکھتے ہیں جو نیروبی میں ہیرو کا ہے۔ میرے نیروبی میں آنے کے بعد ایک دن ہوئے برہان بھائی کسی کام سے وہاں آئے تھے تو ہیرو ہم سب کو رات کے کھانے کے لیے ایک ریستوران میں لے گیا تھا جہاں صرف حلیم ملتی ہے۔

وہیں بصیر بھائی نے اس گروپ کو پورے کینیا کا مالک کہا تھا اور وہیں برہان نے ہیرو کو اپنے مہمان یعنی مجھ سمیت ممباسا آنے کی دعوت دی تھی۔ اس کے بعد بھی برہان دو ایک مرتبہ ہیرو کو فون پر یاد دہانی کرا چکا تھا اور اب ہیرو نے جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ پورے گروپ سمیت۔

ممباسا کے سب سے مہنگے ہوٹل میں ہمارا قافلہ جاکر ٹھہرا۔ پانچ لوگ ہم نیروبی سے چلے تھے اور کوئی چھ آٹھ لوگ ہمارے استقبال کو اس ہوٹل میں موجود ہیں اور یہاں بھی سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں، سوائے گرل فرینڈز کے...... اور میرے۔

ہم ہوٹل پہنچے تو انتظامیہ کا ایک اہلکار ہمیں سیدھا کیسینو میں لے گیا جہاں برہان ایک بڑی سی میز پر رنگ برنگے مشروب سجائے ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ ایک خوش شکل نوجوان افریقی ملازمہ نے ہر مہمان کو گلاب کا ایک ایک پھول اور ایک سو ڈالر کے برابر چپس پیش کیے جن سے ہم جوا کھیل سکتے ہیں۔ یہ برہان بھائی تو ہیرو سے بھی بڑی چیز نکلے!

برہان کی موجودہ گرل فرینڈ مارتھا ایک پچاس ساٹھ سال کی برطانوی عورت ہے۔ برہان کے تعلق کی وجہ سے باقی سب اس سے فاصلے پر رہتے ہیں اور پھر عمر اور زبان کی دوری بھی اسے باقیوں سے الگ تھلگ رکھتی ہے۔ برہان کے سامنے تو کوئی جرأت نہیں کرتا لیکن اس کی غیر موجودگی میں اس کی "بوڑھی میم" پر خوب پھبتیاں کسی جاتی ہیں۔

ابھی رات ڈھلی نہیں ہے اور شراب کے دور چل رہے ہیں کہ میں نے جانے کی اجازت چاہی۔ برہان نے وجہ جاننا چاہی تو میں نے بتایا کہ میرے سر میں بہت درد ہے۔ شاید سفر اور بے خوابی کی وجہ سے۔ برہان نے مارتھا کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

"یہ تمہیں دس منٹ میں بالکل ٹھیک کردے گی۔" اور پھر مارتھا سے مخاطب ہوا "ڈارلنگ! آئی وانٹ ہم فٹ فاٹ ان ٹین منٹس۔"

میں نے بغیر کسی سوال کے خود کو مارتھا کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ میرے سر میں بہت وزنی ہتھوڑے ایک تسلسل سے برس رہے ہیں۔ میں ذرا سی حرکت کرتا ہوں تو ہتھوڑوں کے برسنے کی رفتار اور تیز ہوجاتی ہے۔ میں صرف سر کو ایک جگہ ٹکا کر سو جانا چاہتا ہوں۔

مارتھا میرے ساتھ میرے کمرے میں آگئی اور مجھے ایک آرام دہ کرسی پر بٹھا کر میری پشت پر آ کھڑی ہوئی۔ اب تک اس نے مجھے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، اس کے مطابق وہ کوئی پہنچی ہوئی شخصیت ہے جو آکوپنکچر، ارومانھیراپی، شیاتسو مساج اور جانے کتنے اور عجیب و غریب فنون سیکھ چکی ہے اور ان سب کے امتزاج سے بیشتر جسمانی اور دماغی عارضوں پر قابو پا سکتی ہے۔ اس نے میرے

سلطان محمد قلی نے شہر حیدر آباد (دکن) آباد کیا اور اس کو عالی شان عمارتوں، خوبصورت ایوانوں، سرسبز و خوش نما باغوں اور نہروں سے آراستہ کیا۔ اس شہر کی تنظیم اور عمرانی لوازم کو نہایت سلیقے اور ہنرمندی کے ساتھ جمع کرایا۔ شہر حیدر آباد میں اس زمانے کے لحاظ کے مطابق کشادہ راستے بنائے گئے، شہر کے وسط میں چار مینار تعمیر ہوا جو ایک کالج کی حیثیت رکھتا تھا۔ شاہی عمارتیں اپنی وسعت، بلندی، خوبصورتی اور شان و شوکت کے لحاظ سے ممتاز تھیں۔ مریضوں کے لیے دارالشفا، سوداگروں کے لیے کارواں سرا اور وسیع بازار بنائے گئے۔ دل بستگی، شگفتگی اور زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے باغات لگائے گئے، حمام تعمیر ہوئے اور تلنگانہ کے طول و عرض میں بہترین اجتماعی زندگی کی بنیاد ڈالی، اس کو فنونِ لطیفہ کی ہر ایک شاخ سے دلچسپی تھی جس کی وجہ سے زندگی میں شگفتگی پیدا کرنے کے اسباب جمع کیے گئے۔ شاعری اور موسیقی سے دلچسپی تھی، خوبصورت عالی شان قصر و ایوان تعمیر کر کے ان میں نقش و نگار اور مصوری کے شاہکار جمع کر دیے گئے تھے۔ سلطان قلی کے دور میں نہ صرف علوم اسلام کو فروغ ہوا، عربی اور فارسی کے شہکار مرتب ہوئے بلکہ دکھنی اور تلنگی ادب کو بھی ترقی ہوئی۔ اس نے دکھنی اور تلنگی ادب کی نہ صرف سرپرستی کی بلکہ خود بھی ان زبانوں میں شعر موزوں کر کے شاعری کو زندگی جاوید عطا کی۔

اقتباس: دکنی کلچر از محمد نصیر الدین ہاشمی
انتخاب: نبیلہ اظہر، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کندھوں کے پیچھے ایک کشن رکھا اور میرے سر، ماتھے اور گردن کا مساج کرنے لگی۔

کمرے میں روشنی بہت مدھم ہے اور ائرکنڈیشنر کی سبک سی گھر گھر کے علاوہ کوئی آواز نہیں۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور مارتھا کی انگلیوں سے نکلنے والے کسی معجزے کا انتظار کرنے لگا۔ کبھی کبھی وہ کسی ایک نقطے پر انگلی رکھ کر پوچھتی ''یہاں درد ہوتا ہے؟'' اور میں اسی غنودگی کی حالت میں اسے ہاں یا نہ میں جواب دیتا رہا۔

پھر وہ غنودگی لحاف بن کر مجھ سے لپٹ گئی اور میں مارتھا کی آواز سنتے ہوئے بھی کچھ بولنے کے قابل نہ رہا۔ پتا نہیں اس کی انگلیوں کا کمال تھا یا میں ہی اتنا تھکا ہوا تھا کہ میں کرسی پر ہی سو گیا اور صبح تبھی اُٹھا جب فون کی گھنٹی بجتی ہی چلی گئی۔

ہیرو نے کہا کہ سب لوگ نیچے سوئمنگ پول پر ناشتے کے لیے جمع ہیں اور میرا انتظار ہو رہا ہے۔ میرے سر کا درد ٹھیک ہو چکا ہے لیکن کرسی پر سونے سے کندھے اکڑ چکے ہیں۔ میں ابھی بہت دیر تک سونا چاہتا ہوں لیکن ہیرو کی مہمان نوازی میں شدت پسندی کے رجحان کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ تقریباً ناممکن ہے، اس لیے میں سوجی آنکھوں پر چشمہ چڑھا کر کمرے سے نکل آیا۔

پول کے کنارے پلاسٹک کی لمبی کرسیاں رکھی ہیں جن کی پشت کو اوپر نیچے کرکے لیٹنے اور بیٹھنے کے درمیان کوئی بھی حالت اختیار کی جاسکتی ہے۔ یہ ایک روشن اور خوشگوار دن ہے۔ جون کے مہینے میں یہاں بہار کا موسم ہے۔ دھوپ اچھی لگتی ہے اور سائے میں ہلکی سی سردی محسوس ہوتی ہے۔ گروپ کے دو چار لوگ پول میں ہیں، باقی سبھی مرد لاؤنج چیئرز پر مختلف حالتوں میں دراز ہیں اور ان کی گرل فرینڈز ان کے لیے کھانے کی میز سے پھل اور شیمپین کے گلاس لا رہی ہیں۔

برہان کچھ وقت مہمانوں کے ساتھ گزار کر کسی کام سے نکلا تو باتوں کا رُخ پھر بوڑھی میم کی طرف ہو گیا۔ ''اب تو مسعود بھائی کو بھی پتا چل گیا ہوگا کہ اس مائی میں کیا خاص بات ہے؟'' نسیم بھائی نے ایک آنکھ دبا کر کہا تو اس پر ایک قہقہہ پڑا۔ ہیرو کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں میری جانب دیکھنے لگا تو نسیم بھائی نے اپنے مخصوص لچر انداز میں بتایا کہ گزشتہ رات مارتھا میری طبیعت ٹھیک کرنے پر مامور کی گئی تھی۔

میں نے احتجاج کرنا چاہا لیکن ہیرو اتنی دیر میں برا مان چکا ہے۔ شکایتی لہجے میں کہنے لگا ''آپ کی پسند ناپسند اپنی جگہ لیکن میری مہمان نوازی پر تو دھبا لگا دیا نا؟ ہیرو کے دوست کے لیے وہ جادوگرنی بڑھیا ہی رہ گئی تھی کیا؟''

اتنے میں برہان واپس آگیا۔ اس نے اعلان کیا کہ سب سفاری پارک جا رہے ہیں اور سفر کے لیے فور وہیل ڈرائیو گاڑیاں منگوائی گئی ہیں جو ہوٹل کی ڈرائیو وے پر موجود ہیں۔ ''اور انہی میں سے ایک گاڑی میں آپ سب کے لیے ایک سرپرائز ہے۔ لیڈیز اینڈ جنٹلمین، کم اینڈ فائنڈ اٹ آؤٹ فار یورسیلوز۔'' اس نے ڈرامائی انداز میں دعوت دی تو سبھی گاؤن اور تولیے لپیٹ کر اس کے ساتھ ہو لیے۔

سبز گھاس کا قطعہ پار کرکے ہم ایک پختہ روش تک پہنچے جس پر کالے شیشوں والی ایک لینڈ کروزر کھڑی ہے۔ برہان نے سب کو گاڑی کے سامنے نیم دائرے میں کھڑا کیا اور خود گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ہاتھ رکھ کر مڑا اور چمکتی آنکھوں سے سب کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''ریڈی......؟'' ایک جھٹکے سے اس نے دروازہ کھولا تو تحیر اور خوشی کی کئی چیخیں بلند ہوئیں۔ اندر ایک لمبا تڑنگا شخص بیٹھا ہنس رہا ہے۔ اس نے ٹی شرٹ اور نیکر پہن رکھی ہے اور اس کی ایک ٹانگ پر گھٹنے سے نیچے تک پلستر چڑھا ہوا ہے۔

یہ جبران ہے، درمیانی عمر کے کاروباری مردوں کے اس گروہ میں واحد اسپورٹس مین اور باقیوں کی نسبت جوان اور چھبیلا۔ وہ آف روڈ ریس ڈرائیور ہے، ریتیلے، ناہموار اور پتھریلے راستوں پر گاڑی بھگانا اس کا شوق بھی ہے اور کمائی کا ذریعہ بھی۔

ایک ایکسیڈنٹ میں اس کا جسم ایسے ٹوٹا تھا کہ کسی کو اس کے بچنے کی امید نہیں تھی۔ مقامی ڈاکٹروں سے ابتدائی علاج کے بعد اسے ایک چارٹرڈ فلائٹ سے جرمنی بھجوا دیا گیا جہاں وہ کئی ماہ زیرِ علاج رہا اور حال ہی میں تقریباً صحت یاب ہو کر واپس ممباسا پہنچا تھا۔ اس کی واپسی کو نیروبی والوں سے پوشیدہ رکھا گیا تھا تاکہ سرپرائز کو جاندار بنایا جاسکے۔

سب لوگ دروازے میں کھڑے ہو کر جبران سے گلے مل چکے، اس کی پلستر والی ٹانگ کو پیار سے تھپتھپا چکے اور اس کے گال چوم چکے تو اس نے اپنے ساتھ بیٹھی لڑکی کا تعارف کروایا ''دس از مونیکا۔ اس کا تعلق ہنگری سے ہے لیکن ہماری ملاقات میونخ کے ایک اسپتال میں ہوئی جہاں میں مریض تھا اور یہ نرس۔'' مونیکا خوبصورت ہے، نوجوان ہے اور خوش مزاج بھی لگتی ہے۔ اس نے مسکرا کر سب کو دیکھا اور ہاتھ کی انگلیاں لچکا کر ہیلو کہا۔

کچھ دیر بعد ہم چار گاڑیوں میں سوار ہو کر تساوو نیشنل پارک کی طرف رواں دواں ہوئے جو کینیا میں جنگلی حیات کا سب سے بڑا مرکز ہے اور دنیا بھر میں جانوروں کی نگہداشت والے معروف مقامات میں سے ایک۔

[...] گھنٹے کا یہ سفر ہم نے کوئی پانچ چھ گھنٹوں میں طے کیا [...] ذرا ذرا دیر میں یا تو کسی کو ٹوائلٹ جانے کی ضرورت [...] آجاتی یا کچھ کھانے پینے کی اور یا جبران اپنی ٹوٹی ہوئی [...] کو آرام دینے کے لیے رکنے کی درخواست کر دیتا۔ ہر [...] قافلہ رکتا تو برف میں لگی بیئر کے کریٹ اُتارے [...]، سفری کرسیاں ان فولڈ کی جاتیں، مرد اطمینان سے [...] یا سگار سلگاتے اور خواتین چھوٹی چھوٹی دوربینوں [...] آس پاس کی جھاڑیوں میں شیر چیتے تلاش کرنے لگتیں۔

ممباسا اور نیروبی کو ملانے والی ہائی وے مشرق اور [...] تساوو نیشنل پارکس کے درمیان سے گزرتی ہے۔ اسی [...] کے ساتھ ساتھ ریلوے لائن بھی چلتی ہے جس پر رات [...] بہت رومانوی سمجھا جاتا ہے کہ یونہی باہر نظر پڑتی تو کوئی [...] اکڑ کی سے منہ لگائے آپ کی توجہ مانگ رہا ہے یا کسی [...] نے موڈ میں آکر ریل گاڑی کے ساتھ دوڑ لگا دی، یا [...] اپنے بچوں کے ساتھ ندی سے پانی پیتے ہوئے [...] دے گئیں۔

اس رومانویت کی راہ میں ایک رکاوٹ بھی ہے اور وہ یہ [...] جرائم پیشہ افراد بھی ان مسافروں کی تاڑ میں رہتے ہیں جو [...] کے پیار میں یہ بھول جاتے ہیں کہ انسان ایک [...] کو کتنا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

ہم پارک میں داخل ہونے کے لیے اپنے مطلوبہ گیٹ [...] پہنچے تو شام ہونے والی ہے۔ برہان نے کہا، اس وقت [...] میں جانے کا کوئی فائدہ نہیں، ہاں پاس میں ایک [...] ران ہے جہاں شام گزاری جاسکتی ہے لہٰذا آٹھ ہزار [...] میل پر پھیلے اس جنگل میں ہمیں پڑاؤ ملا تو اس ریستوران [...] جو شاید ہم ایسے لوگوں کے لیے ہی بنایا گیا ہے جو تساوو [...] پارک کو اپنی سفری ڈائری میں تو شامل کرنا چاہتے ہیں [...] جانوروں سے قریبی تعلق پیدا کرنا جن کا مقصد نہیں [...]۔

[...] ریستوران ایک طرح کا چڑیا گھر بھی ہے۔ چرند پرند [...] پنجروں میں بند بھی دکھائی دیتے ہیں اور میزوں پر رکھی [...] میں بھی۔ عین وسط میں ایک ڈانس فلور ہے جس پر [...] ابھی مہربان نہیں ہوئے لہٰذا ریستوران کی اپنی ڈانسرز [...] بانی ادا کر رہی ہیں۔

دو تین قسم کے ڈھول مل کر ایسی تھاپ دے رہے ہیں کہ [...] ہی اس پر حرکت کرنے لگتا ہے۔ لیکن ان افریقی [...] والیوں کا ہلنا جلنا کچھ الگ ہی قسم کا ہے۔ جیسے ان کے جسم پر خود ان کا کوئی اختیار نہیں بلکہ وہ ڈھول بجانے والوں کے کنٹرول میں ہوں۔ اِدھر تھاپ پڑی اُدھر کمر لچکی، اِدھر دف کے گھنگھرو بجے اُدھر کولہوں میں ایسی لرزش آئی کہ دیکھنے والوں کے حلق سوکھنے لگے۔ اس پر ان کا لباس جو صرف سفید ململ کے دو ٹکڑوں پر مشتمل ہے، مے نوشوں کی پیاس مزید بڑھا رہا ہے۔

> بچوں کی دیکھ بھال اور تربیت والدین کا فرض ہے۔ پاکستانی معاشرے میں تو یہ فریضہ عام طور پر ماں کو تنہا ہی انجام دینا پڑتا ہے۔ والد کا کام صرف گھر کی معاشی ضروریات کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ ماں اگر سرکاری ملازمت وغیرہ کرتی ہو تو اسے صرف زچگی کے لیے چھٹیاں مل پاتی ہیں لیکن سویڈن ایسا ملک ہے جہاں نومولود بچے کی دیکھ بھال کے لیے باپ بھی چھٹیاں لے سکتا ہے۔ اس عرصہ میں اسے باقاعدہ تنخواہ ملتی رہتی ہے۔ اس طرح وہ خاتونِ خانہ کے ساتھ مل کر بچے کی پرورش کا فریضہ انجام دیتا ہے۔
>
> مرسلہ: نوروز عالم، لاہور

برہان، جبران اور دو ایک ممباسا والے ساتھی باقی سب سے الگ ایک میز پر بیٹھے کوئی سنجیدہ بات کر رہے ہیں۔ ہماری میزوں پر پھولوں کے بہت سے ہار ڈھیر کیے رکھے ہیں جنہیں ہیرو فراخ دلی سے ناچنے والیوں پر نچھاور کر رہا ہے۔

مہمان یہ ہار انتظامیہ سے خریدتے ہیں اور ڈانسرز اور موسیقار اپنے فن کا خراج سمجھ کر انہیں وصول کرتے ہیں۔ بعد میں فنکار لوگ یہ ہار انتظامیہ کو لوٹا کر کیش رقم لے لیتے ہیں۔ یہ ہار برہان کی میزبانی کا حصہ ہیں لیکن ہیرو انہیں اپنا ہی سمجھ کر لٹا رہا ہے۔ نیروبی میں ایسی ہی میزبانی ہیرو بھی برہان کے لیے کر چکا تھا اور شاید دونوں اس طریق کار کے عادی ہیں۔

ڈانسرز سے ہیرو کا دھیان ہٹتا تو جبران کی گرل فرینڈ مونیکا پر مرکوز ہو جاتا جو لباس اور بات چیت میں باقی ''گرل فرینڈز'' سے بہت ممتاز دکھائی دیتی ہے۔ کچھ تو رعبِ حسن ہے، کچھ ہیرو کے خون میں دوڑتی شراب کا اثر اور کچھ انگریزی زبان میں چھیڑ چھاڑ کا تجربہ نہ ہونے کے برابر!

ان سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہیرو مذاق کرنے کی کوشش کرتا تو بہت لچر اور بے ہودہ ہو جاتا اور فلرٹ کرنے کی سوچتا تو ٹرک ڈرائیوروں کے سے انداز میں۔ کچھ دیر تک تو مونیکا ہیرو کی حرکتوں پر ہنستی رہی پھر جب زبان کے ساتھ ہیرو کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہاتھ بھی کھلنے لگے تو وہ باتھ روم جانے کے بہانے اُٹھی اور واپسی پر میز کے دوسرے سرے پر ساڑی والی گرل فرینڈز کے ساتھ جا بیٹھی۔

ویٹر نے مؤدبانہ طور پر ایک پیکٹ لا کر ہیرو کو دیا جسے اس نے جیب میں رکھ کر ویٹر کو ٹپ دی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''مسعود، باہر آؤ ذرا۔'' ریستوران ایک گاؤں میں ہے جسے خاص طور پر سیاحوں کے لیے بسایا گیا ہے۔ بانس کے بنے دس بارہ جھونپڑے، پان سگریٹ کا کھوکھا اور یہ شاندار ریستوران۔ نکڑ پر لگے لکڑی کے کھمبے پر جلنے والے بلب کی پیلی روشنی اندھیرے کو اور بھی پُراسرار بنا رہی ہے۔ ہیرو کی آنکھوں میں ایک ''فخریہ پیشکش'' والی چمک ہے۔ ''یو مسٹ ٹرائی دس۔'' اس نے پیکٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں اتنا اشتیاق اور خلوص ہے کہ میں صرف ہاؤ میں جواب دے سکا۔

''پائپ میں پیونا۔''

''ہے کیا یہ؟'' میں نے خشک بوٹی کو مسل کر پائپ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ افریقا کا امرت ہے۔''

''گانجا؟''

اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔ ''صرف سیاح لوگ اسے گانجا کہتے ہیں۔ یہ افریقا کا امرت ہے...... کیسا لگا؟''

''ایک تو اس کا دھواں باقاعدہ خوشبودار ہے، دوسرا اس کا نشہ اگر کچھ ہے تو اتنا ہلکا کہ ابھی مجھے اس کا احساس تک نہیں ہوا۔''

اس کے چہرے پر ایک طمانیت بھری مسکراہٹ آئی۔ ''بس آپ کو اور پینے کی ضرورت نہیں۔''

میں نے جلتا ہوا پائپ اس کی طرف بڑھایا۔

''نہیں نہیں، میں نہیں پیتا۔''

''کیا مطلب...... آپ یہ امرت مجھے اتنی چاہت سے پلا رہے ہیں اور خود اس سے محروم رہتے ہیں؟''

''بس یار، ایک بار طے کرلیا تھا...... نشہ ہوگا تو صرف ایک، شراب!'' اس نے ہاتھ میں تھاما ہوا ڈرنک فلمی انداز میں بلند کیا۔ ''باقی سب موالیوں کے نشے ہیں۔''

''شکریہ! آپ نے مجھے موالی کا درجہ دیا۔''

''ارے نہیں یار! تم تو مہمان ہو۔ ہر چیز ٹرائی کرنا تمہارا حق ہے اور تمہیں مہیا کرنا میرا فرض۔ ابھی تمہیں یہاں کا مقامی ٹھرا بھی پلاؤں گا۔ چلو، اندر چلتے ہیں۔''

رات بھیگ چلی ہے اور خون میں دوڑتی چنگاریوں کو ہوا دینے کے لیے بیشتر مہمان ڈانس فلور پر ہیں۔ جلتی بجھتی بتیوں اور افریقی ڈرم بیٹ نے سماں باندھ رکھا ہے۔ ناچنے والے آنکھیں موندے بے خودی کے عالم میں موسیقی کے ساتھ بہتے جا رہے ہیں۔

میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں اور تصور میں اس زندگی کو دیکھنے لگا جو مجھ سے صرف چند سو دور ہے لیکن جسے دیکھے بغیر میں چلا جاؤں گا اور شاید پھر کبھی یہاں آنا نہ ہو۔ مجھے جانوروں سے پیار کبھی نہیں ہو پایا لیکن جن کے ساتھ میرا واسطہ پڑا، ان سے میرا ایک ذاتی تعلق بھی ہے۔ میں ان سے باتیں کرتا ہوں اور ان کی سنتا ہوں۔ میں لفظوں میں بولتا ہوں، وہ آنکھوں سے بولتے ہیں۔

میں کسی ایسے جانور کی آنکھوں میں جھانکنا چاہتا ہوں جو سلاخوں کے پیچھے نہ ہو، جس کی گردن میں جز وقتی پٹہ بھی نہ ہو، جس کو پالنا انسان کی ذمے داری نہ ہو۔ اپنی زمین پر مان سے چلتا ہوا جانور۔ پنجروں کے اندر ان کی آنکھیں زیادہ تر وقت پتھرائی رہتی ہیں اور پالتو جانوروں کو انسان کی توجہ لینے کے لیے آواز کا سہارا لینا پڑتا ہے لیکن آپس میں یہ سب باتیں آنکھوں ہی آنکھوں میں کرتے ہیں۔ یہاں اپنی دنیا میں اس کی آنکھ مجھے کیسا دیکھتی ہے؟ کیا میں لاکھوں قسم کے جانوروں میں سے ایک عام سا دو پایہ ہوں؟ یا جنگل کے بادشاہوں میں سے ایک جو جیپوں میں بیٹھ کر راجدھانی کی سیر کو آتے ہیں؟ یا ستر کلوگرام تازہ گوشت، چربی اور ہڈی! کھانا لگ رہا ہے۔ آٹھ دس قسم کے پکوان ہیں، سب زمینی جانوروں سے بنے۔ میرے برابر والی میز پر رکھی واڈکا کی بوتل میں ایک زندہ بچھو ہے جسے آخری جام لینے والا خوش نصیب بغیر چبائے نگل لے گا۔

اچھا ہی ہوا، میں نے کسی ہرن کی آنکھیں نہیں پڑھ ڈالیں ورنہ میں کبھی ہرن کا بھنا گوشت نہ کھا سکتا اور اس ذائقے سے بھی محروم رہ جاتا جو بے مثال ہے اور جو نساو و نیشنل پارک کے داخلہ گیٹ کے قریب ہی واقع ریستوران میں میرے سامنے دسترخوان پر رکھا تھا۔ یہاں بیل کی دم کا سوپ بھی ہے اور کچے جھینگوں کا سلاد بھی۔ گوشت والی ڈشز میں سے دو کے بارے میں ہیرو نے تاکید سے کہا کہ اپنی رائے بعد میں بتانا۔ معلوم ہوا، وہ معدوم ہوتی نسلوں کے جانور تھے جن کے شکار پر پابندی ہے۔

نہیں، مجھے نہیں جانا جانوروں کی سرزمین پر۔ ان سے ملوں گا تو دوستی بھی ہو ہی جائے گی...... تو پھر میں کھاؤں گا کیا؟

بھگوان شکاری

مسعود کھدر پوش
ترجمہ: ابراہیم جمالی

شکار کرنا دورِ گزشتہ کا محبوب مشغلہ تھا۔ راجے مہاراجے، نوابین اور اعلیٰ عہدے دار شکار کھیلنا شان کی بات سمجھتے تھے کیونکہ اس کھیل میں سنسنی بھی ہے، شملہ اونچا رکھنے کا بہانہ بھی اور شان کا مظاہرہ بھی، انگریزوں کے دورِ اقتدار میں اعلیٰ منصب پہ فائز سرکاری عہدے داروں میں مسعود کھدر پوش کا اپنا ایک الگ مقام تھا۔ انہوں نے شکار بیتی بیان کرتے ہوئے ہر قسم کی معلومات قارئین تک پہنچانے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ ان کے قلم کی جادوگری آپ بھی ملاحظہ کریں۔

خوش ذوق قارئین کے لیے ایک بہت ہی منفرد انداز کی شکار کتھا

یہ 1939ء کی بات ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے مجھے آکسفورڈ یونیورسٹی سے آئی سی ایس کرنے کا موقع ملا۔ وہ انگریزوں کا دور تھا۔ انگلینڈ جا کر تعلیم حاصل کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی۔ جب میں لندن پہنچا تو اس وقت میری عمر کافی کم تھی لیکن میں نے اپنی پوری توجہ تعلیم حاصل کرنے پر مرکوز رکھی اور دل لگا کر پڑھتا رہا۔ میں نے خود کو اس نئی اور انوکھی دنیا میں جلد ہی ایڈجسٹ کرلیا۔ ان ہی ایام میں ہندوستان کو آزاد کرانے کی جدوجہد اپنے عروج پر تھی لیکن مجھے اس کا کوئی احساس نہیں تھا۔

ایک دن مجھے کیمبرج یونیورسٹی جانے کا موقع ملا۔ وہاں میری ملاقات چودھری رحمت علی سے ہوئی۔ ان کی باتیں سن کر میری آنکھیں کھل گئیں۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ آزادی حاصل کرنا ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے کیوں ضروری ہے اور یہی موقع ہے کہ اس کے لیے کچھ کیا جائے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بعد میں بھی چودھری صاحب سے میری کئی ملاقاتیں ہوئیں اور میرے ذہن میں ہر بات روزِ روشن کی طرح واضح ہوگئی۔ یہ وہی چودھری رحمت علی تھے جنہوں نے ہندوستان میں بننے والے مسلمانوں کے نئے ملک کا نام ''پاکستان'' تجویز کیا تھا۔

بعد میں مجھے تقریباً تمام بڑے مسلمان رہنماؤں سے ملنے کا موقع ملا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جتنا چودھری رحمت علی پاکستان بنانے کے لیے مخلص اور جذباتی تھے، شاید ہی کوئی اور ہوگا۔ میرے خیالات پر چودھری صاحب کی باتوں کا بہت اثر پڑا تھا۔ اس لیے جب میں آئی سی ایس کر کے واپس ہندوستان آیا تو ہر ملنے جلنے والے کے ساتھ پاکستان بنانے ہی کی باتیں کرتا رہتا تھا۔

بحیثیت اسسٹنٹ کمشنر میری پوسٹنگ سب سے پہلے بمبئی (ممبئی) شہر میں ہوئی۔ وہاں میرے علاوہ تمام افسر انگریز یا ہندو تھے۔ ایک تو میں سب سے کم عمر تھا اور اس پر میری پاکستان کے بارے میں باتیں سن سن کر دیگر تمام افسر مجھ سے خار کھانے لگے تھے لیکن میں کم ہی کسی کی پروا کرتا اور ہر ایک کو مسلمانوں کے لیے ایک الگ ملک کی ضرورت پر دلائل دیتا رہتا۔ رفتہ رفتہ مجھے احساس ہونے لگا کہ دوسرے افسر مجھ سے بہت تنگ ہیں لیکن اب وقت گزر چکا تھا۔

انہی دنوں بھیل قوم نے بغاوت کردی، کئی سرکاری افسروں کو قتل کردیا۔ بھیلوں کے علاقے میں جانے کے لیے کوئی افسر آمادہ نہ تھا۔ کیونکہ وہاں جان کا خطرہ تھا۔ میری انتظامی صلاحیتوں کی تعریف انگریز بھی کرتے تھے۔ ہندو افسر ویسے بھی مجھ سے اپنی جان چھڑانا چاہتے تھے۔ اس لیے کچھ سرکاری افسروں نے بمبئی کے گورنر جان کالول کو مشورہ دیا کہ مسعود ہی بھیل قوم کو راہِ راست پر لاسکتا ہے۔ انگریز میری بہادری کے قائل تھے اور ہندو افسر مجھے میرے نظریات کی سزا دینا چاہتے تھے۔ انہیں اس سے بہتر کوئی دوسرا موقع نہیں مل سکتا تھا۔

آخرکار ان کی سفارش قبول کرلی گئی اور گورنر نے میری پوسٹنگ بمبئی ویسٹرن گھاٹ کے خان دیش ڈسٹرکٹ میں کردی۔ وہاں کی آبادی چار لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ دھاپکی اور نربدا دریاؤں کے درمیان واقع وہ علاقہ ست پڑھا نامی پہاڑی سلسلے پر مشتمل تھا اور اس کی تین تحصیلیں تھیں۔ اس زمانے میں اس علاقے کو "Bad Climate Area" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

1945ء کے آغاز ہی میں مجھے ''بھیل سدھار افسر'' کے طور پر خان دیش بھیج دیا گیا۔ میری تنخواہ میں ڈھائی روپے کا اضافہ بھی کردیا گیا تھا۔ اس زمانے کے ڈھائی آج کے ڈھائی ہزار سے بھی زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ میرا اسپیشل ملیریا الاؤنس بھی مقرر کیا گیا۔

جب میں خان دیش پہنچا تو مجھے ہر طرف دور دور تک چھوٹی بڑی پہاڑیاں، چٹانیں اور گھنا جنگل ہی دکھائی دیا۔ میرا بنگلا بھی ایک ویران اور اُجاڑ مقام پر تھا۔ خود بھیل جنگل ہی میں بانس کی جھونپڑیوں میں رہتے تھے۔ ایک جگہ پر زیادہ سے زیادہ بیس، پچیس اس طرز کی جھگیاں بنی ہوتی تھیں۔ بھیل لوگ بالکل وحشی تھے اور جانوروں کی طرح زندگی گزار رہے تھے۔ کٹر ہندو انہیں اپنا ایک فرقہ قرار دیتے تھے۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ بھیل قوم کا کوئی خاص مذہب یا دھرم نہیں تھا۔ وہ کبھی آسمانی بجلی کو پوجنا شروع کردیتے اور کبھی سورج کو سجدہ کرنے لگتے تھے۔ انگریزوں نے انہیں Nature Worship People کا نام دے دیا تھا۔

بھیل عام طور پر جنگلی پھل، سبزیاں، پودوں کی جڑیں اور جانوروں کا گوشت کھا کر گزارہ کرتے تھے۔ عموماً کچا گوشت کھاتے تھے۔ انہیں اپنے تن ڈھانپنے کا بھی شعور نہیں تھا۔ کئی لوگ فطری لباس میں نظر آتے تھے۔ کوئی ''سیانہ'' بندہ ہوتا تھا جو کہیں سے کوئی کپڑا یا درخت کے پتے باندھ کر اپنا زیریں دھڑ ڈھانپنے کی ناکام کوشش کرتا تھا۔ عورتیں بھی مردوں کے ساتھ جنگل میں شکار کرتی تھیں۔ وہ مرد وزن میں کوئی خاص تفریق نہیں رکھتے تھے۔ تمام عورتوں کا بالائی دھڑ لباس سے بے نیاز ہوتا البتہ زیریں حصے کو تھوڑا بہت چھپایا جاتا تھا۔ پھر بھی کئی عورتیں کسی قسم کے لباس کے تکلف کے بغیر جنگلوں میں دوڑتی بھاگتی نظر آتی تھیں۔

کچھ دن بھیل قوم کے درمیان گزارنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ لوگ کسی اجنبی اور نئے آنے والے کو زیادہ پسند نہیں کرتے۔ اس لیے وہ اس سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن میں نے اپنے دل میں پختہ ارادہ کرلیا تھا کہ میں بھیلوں تک مہذب دنیا کی باتیں ضرور پہنچاؤں گا۔ میں نے ایک اور بات نوٹ کی کہ بھیل وحشی ہونے کے باوجود بہادر اور طاقتور جوان کی بہت قدر کرتے ہیں۔

اس علاقے میں بے شمار جنگلی درندے موت کے فرشتے بن کر انسانوں پر حملہ کرتے رہتے تھے۔ اس لیے ان کی بہادری کا معیار بھی خونخوار جانوروں کے شکار کرنے پر منحصر تھا۔ شیر کے شکاری کو وہ اپنا سب سے بڑا محسن سمجھتے تھے۔ میں نے سوچا کہ میں صرف اسی طرح اس قوم میں گھل مل سکتا ہوں

کہ جنگلی جانوروں کے ہاتھوں ہونے والے ان کے جانی نقصان کے خطرے کو کم کردوں۔ اس خیال کے تحت میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار جنگلی جانوروں کا شکار کرنا شروع کیا۔

بھیل پہلے تو دور دور سے مجھے درندوں پر گولیاں چلاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ پھر رفتہ رفتہ کئی لوگ میرے ساتھ آملے اور میں نے انہیں بھی اپنی شکاری پارٹی میں شامل کرلیا۔ اس طرح میں انہیں اپنے قریب لانے میں کامیاب ہوگیا۔

میں نے سوچا کہ اگر میں نے شیر کا شکار کرلیا تو بھیل قوم کی نظر میں میری اہمیت مزید بڑھ جائے گی۔ اس طرح مجھے اپنے مقصد کے حصول میں آسانی پیدا ہوجائے گی۔ میں نے اس سلسلے میں اپنے کچھ شکاری دوستوں سے مشورے کرنا شروع کردیے۔ سب سے پہلے 375ونچسٹر رائفل منگوائی گئی۔ جب دیگر تمام تیاریاں مکمل ہوگئیں تو اس کے بعد شکار کے طریقہ کار پر بحث شروع ہوگئی۔ مجھے شیر کے شکار کے لیے دو مختلف طریقوں کے بارے میں بتایا گیا۔ میں چونکہ پہلی مرتبہ شیر کا شکار کرنے لگا تھا اس لیے میں نے ایک قدرے محفوظ طریقے کو اپنانے کا پروگرام بنایا۔

بھیل قوم کے تقریباً تمام ہی لوگ بہترین کھوجی تھے۔ وہ ہر قسم کا کھرا دیکھ کر جانور کا نام بتاسکتے تھے۔ اس لیے میں نے کچھ بھیلوں کو جنگل میں اندر جا کر کسی بڑے شیر کے پنجوں کے نشان تلاش کرنے کے لیے بھیج دیا۔ یہ پوری قوم شیر کے شکار کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی تھی۔ انہوں نے دوسرے قبائلیوں کو بھی اپنے ساتھ ملالیا اور اگلے ہی دن آکر مجھے بتایا کہ کالی پہاڑی کے قریب گھنے درختوں کے درمیان شیر کے کھروں کی بجائے ایک جیتے جاگتے شیر کو دیکھا گیا ہے۔

میں یہ خبر سن کر اسی وقت اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ ان کے ساتھ چل دیا۔ انہوں نے ہمیں شیر کے پنجوں کے نشانات دکھائے۔ وہ کسی جوان شیر کے پنجوں کے نشان تھے۔ تجربہ کار شکاری کھرا دیکھ کر شیر کی عمر کا اندازہ کرلیتے ہیں۔

پروگرام کے مطابق میں نے اس جگہ کے قریب ہی ایک بلند درخت تاڑ لیا اور اگلے دن ایک صحت مند کٹا خرید کر اس درخت کے قریب ایک دوسرے چھوٹے درخت کے تنے سے بندھوا دیا۔ پھر ہم تمام شکاری اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوگئے۔ اگلے دن ان میں سے دو بھیل شکاریوں نے میرے پاس آکر یہ خبر دی کہ کسی درندے نے کٹے کو ہلاک کردیا ہے اور اس کا کچھ گوشت کھا گیا ہے۔ کٹے کی لاش کے اردگرد شیر کے پنجوں کے نشان دیکھے گئے تھے۔

مجھے یقین ہوگیا کہ یہ اس علاقے میں دیکھے جانے والے شیر ہی کا کام ہے کیونکہ شیر فطری طور پر انتہائی سست جانور ہے۔ اسے جتنی آسانی سے شکار ملتا ہے، وہ اسے اتنا ہی خوش ہو کر شکار کرتا ہے۔ پھر وہ اپنے بچے کھچے شکار کو کھانے کے لیے اگلے دن ضرور آتا ہے۔

میں نے اپنے نوکروں سے ایک چارپائی منگوائی اور اس جگہ پر جا پہنچا۔ ہم نے کوئی بائیس فٹ کی بلندی پر چارپائی کو اس طرح درخت کی شاخوں سے باندھ دیا کہ وہ پتوں میں بالکل چھپ گئی۔ نیچے سے دیکھ کر یہ بالکل معلوم نہیں ہوتا تھا کہ درخت پر مچان بنایا گیا ہے۔ پھر ہم واپس بنگلے پر آگئے۔ میں نے اپنی رائفل کو اچھی طرح چیک کیا۔ ایک فائر بھی کر کے دیکھا۔ رائفل بالکل ریڈی تھی۔

ہم پچھلے پہر جنگل کی طرف چل دیے۔ میرے ساتھ دو سیانے بھیل شکاری بھی تھے۔ ساتھ رہتے ہوئے وہ میری اور میں ان کی باتیں سمجھ لیتا تھا۔ سورج غروب ہونے سے پہلے ہم مچان کے قریب جا پہنچے اور پھر باری باری اوپر چڑھ گئے۔ اس وقت تاریکی نے جنگل پر اپنی سیاہ چادر پھیلانا شروع کردی تھی۔ بھیلوں کی نظر بہت تیز ہوتی تھی۔ وہ گھپ اندھیرے میں بھی خاصا کچھ دیکھ لیتے تھے۔ میں نے ایک بھیل کو یہ ذمے داری سونپی کہ وہ چاروں طرف دھیان رکھے اور شیر کی آمد پر مجھے اشارہ کرے۔ دوسرے بھیل کا کام خاصا اہم تھا۔ اسے ایک خاص انداز میں میری رائفل کی نال کے اوپر سے اس طرح شیر پر ٹارچ کی روشنی ڈالنی تھی کہ میں بیک وقت اپنی رائفل کی نال اور شیر کو سیدھ میں دیکھ کر فائر کرسکوں۔

اہلِ پرتگال ملیبار میں پہلے پہل 904 ہجری میں آئے اور موسم بارش کے اختتام پر کشتیوں کے ذریعے قندریہ میں پہنچے۔ اس کے بعد انہوں نے خشکی کے راستے سے بندرگاہ کالی کٹ کی طرف کوچ کیا، وہاں چند ماہ کے لیے اقامت اختیار کی اور ملیبار کے متعلق ہر قسم کے حالات دریافت کر کے پرتگال کو واپس چلے گئے۔ اہلِ پرتگال پھر دو سال کے بعد چھ کشتیوں میں سوار ہو کر تجارت کی غرض سے سن 906 ہجری میں کالی کٹ میں داخل ہوئے اور کالی مرچ کی تجارت کرنے لگے۔ ایک پرتگالی مورخ فاریا ی سوزا کا بیان ہے کہ واسکوڈی گاما پرتگال کے دارالحکومت لزبن سے 7 جولائی 1497ء کو روانہ ہوا اور افریقہ کے گرد ہو کر 20 جولائی 1498ء میں اس کا جہاز ملیبار پر لنگر انداز ہوا۔

اقتباس: دکنی کلچر از محمد نصیر الدین ہاشمی
انتخاب: نبیلہ اظہر، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ کام خاصا مشکل ہوتا ہے کیونکہ بعض اوقات شیر صرف زخمی ہو پاتا ہے۔ اس حالت میں وہ انتہائی خطرناک ہو جاتا ہے اور حملہ بھی کرسکتا ہے۔ اس لیے وہ لمحات شکاری کے لیے زندگی اور موت کا معاملہ بن جاتے ہیں۔ مجھے آج بھی ایسے واقعات یاد آتے ہیں تو جسم میں سردی لہر دوڑ جاتی ہے۔

شیر کو ہلاک کرنے کے لیے کم از کم دو بالکل درست نشانے مارنا ضروری ہوتا ہے۔ کئی مرتبہ شیر طاقتور رائفل کی کئی گولیاں کھا کر بھی بچ جاتا ہے اور شکاری کی موت بن کر اس کے سر پر جا پہنچتا ہے۔

ہم تینوں مچان پر بیٹھے شیر کا انتظار کررہے تھے۔ چھوٹے شیر کو جلدی بھوک لگتی ہے اور وہ تاریکی پھیلتے ہی شکار کی جانب چل دیتا ہے۔ پرانا، یعنی عمر رسیدہ شیر اس وقت تک اپنی کچھار سے باہر نہیں آتا جب تک پوری طرح تاریکی نہ پھیل جائے۔ اس لیے شکاری عام طور پر بڑے شیر کی آمد کا وقت رات کے نو، دس بجے ہی بتاتے ہیں۔

ہر جانب خاموشی کا راج تھا۔ کبھی کبھی بہت دور سے بندروں کے چیخنے کی سخت آواز کانوں سے آٹکراتی تھی۔ انتظار کے لمحات بہت کٹھن ہوتے ہیں اور شیر کا انتظار تو بہت ہی ظالم شے ہے۔ کیونکہ اس وقت انسان نہ تو کسی سے بات کرسکتا ہے اور نہ اپنے جسم کو ہلا جلا سکتا ہے۔ اگر جسم میں کہیں کھجانے کی ضرورت درپیش ہو تب بھی ہاتھ تک ہلانے کی اجازت نہیں ہوتی۔

شیر انتہائی عقلمند جانور ہے۔ معمولی سے کھٹکے اور حرکت کو دیکھ لینا اس کی خاص صفت ہے۔ بعض اوقات وہ دور ہی سے انسان کی بو سونگھ کر واپس ہو جاتا ہے۔

ہم انتظار کر کر کے تھک گئے تھے۔ مچھروں نے بھی کاٹ کاٹ کر ہمارے منہ ہاتھ لال کردیے تھے۔ وہاں ٹھیک طرح سے ٹانگیں سیدھی کرنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ کئی گھنٹے ایک جگہ اور ایک ہی پوزیشن میں بیٹھنے کی وجہ سے میری ٹانگیں سن ہوگئی تھیں، بیٹھے بیٹھے مجھے اونگھ سی آگئی۔ یکایک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے خواب میں سخت ہاتھوں سے جھنجوڑ دیا ہو۔ میں نے اپنی غنودہ آنکھوں کو پوری طرح کھول دیا۔ میرے قریب بیٹھا بھیل شکاری ہاتھ کے اشارے سے مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کا اشارہ کچھ دور موجود درختوں کی جانب تھا۔ اس کے جوش سے معلوم ہوتا تھا کہ اس نے کوئی خاص چیز دیکھ لی ہے۔

میں نے نظریں جما کر اس کی طرف دیکھا۔ لیکن مجھے تاریکی میں ڈوبے ہوئے گھنے درخت اور جھاڑیوں کے علاوہ کچھ دکھائی نہ دیا۔ بھیلوں کو خدا نے ایک بڑی نعمت یہ دی ہے کہ وہ گھپ اندھیرے میں بھی بلیوں کی طرح دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن میرے جیسے شخص کے لیے ان گھنے جنگلوں میں جہاں دن کے وقت بھی رات جیسی تاریکی چھائی ہوتی ہے، قریب موجود چیز کو دیکھنا بھی مشکل ہوتا تھا۔

جب میں بالکل ناکام ہوگیا تو بھیل کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں اس طرح حرکت کررہی تھیں جیسے وہ کسی متحرک چیز کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھ رہا ہو۔ اس نے بڑے عجیب طریقے سے اپنے منہ پر ایک ہاتھ رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اس درخت کی طرف اشارہ کیا، جس کے نیچے کٹے کی ادھڑی ہوئی لاش رکھی تھی۔ دوبارہ میں نے بڑے غور سے اس طرف دیکھا لیکن مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ اچانک ہڈی ٹوٹنے کی سخت آواز تیر کی طرح میری سماعت سے ٹکرائی۔ میرے پورے وجود میں سردی لہر دوڑ گئی اور میں پوری طرح چوکس ہو کر بیٹھ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ ہم جس کے انتظار میں بیٹھے تھے، وہ شیر نیچے پہنچ گیا ہے اور اپنے شکار سے شکم سیری میں مصروف ہے۔

اب میں نے پوری توجہ اور یکسوئی کے ساتھ اس درخت کے نیچے دیکھا۔ گویا میری تمام حساسیت سمٹ کر بصارت کو قوت فراہم کرنے لگی تھیں۔ درخت کے نیچے مجھے کچھ سائے حرکت کرتے ہوئے محسوس ہوئے۔ شیر اس غیر محسوس انداز میں چلتا ہوا ہمارے بالکل قریب آگیا تھا کہ پوری کوشش کے باوجود ہم اس کے قدموں کی آواز نہیں سن سکے تھے۔

میں نے بہت آہستگی سے اپنی رائفل اٹھائی جو مجھے اس وقت بہت سرد اور وزنی محسوس ہورہی تھی۔ میں نے اس کی بیرل اندازاً شیر کی جانب سیدھی کی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ٹارچ والے بھیل کو ہلکا سا ہاتھ مارا جو گھپ اندھیرے میں شیر کو دیکھ کر مست ہو رہا تھا۔ اس نے اس طرح جھرجھری لی کہ میں بھی اسے محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ فوراً ہی اس نے خود کو سنبھال لیا اور ٹارچ والا ہاتھ شیر کی جانب دراز کرکے دوسرا ہاتھ میرے زانو پر رکھ دیا۔

شیر کے شکاری اور ٹارچ کی روشنی ڈالنے والے کے لیے یہ سب سے مشکل اور فیصلہ کن مرحلہ ہوتا ہے۔ کیونکہ محض اندازے ہی سے ٹارچ والے کو رائفل کی نال کے اوپر سے اس طرح روشنی پھینکنی ہوتی ہے کہ شکاری کو شکار اور اپنی رائفل کی نال صاف دکھائی دے۔ شکاری کے لیے یہ بہت مشکل گھڑی ہوتی ہے کہ وہ چالاک درندے کو فرار ہونے یا حملہ کرنے سے پہلے اسے گولی سے اڑا دے۔ اس لیے ٹارچ

والا اور شکاری کو تجربہ کار اور بہت زیادہ قوت ارادی کا مالک ہونا چاہیے۔

بھیل نے میرے زانو پر ہاتھ کا دباؤ بڑھایا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ٹارچ روشن کرنے کے لیے بالکل تیار ہے۔ میں نے دھیرے سے سر ہلایا۔ یکدم جنگل کا وہ حصہ روشن ہوگیا۔ میں روشنی میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ کوئی شیر نہیں بلکہ ایک شیرنی تھی اور اس کے ساتھ دو صحت مند بچے بھی تھے۔ اس منظر نے مجھے ایک لمحے کے لیے مبہوت کردیا تھا۔ شیرنی نے فوراً سر اٹھا کر مچان کی طرف دیکھا۔ مجھے اس کی آنکھیں بجلی کے چھوٹے چھوٹے تیز، چمک دار سرخ بلبوں جیسی محسوس ہوئیں۔ میں بت بنا وہ منظر دیکھ رہا تھا۔ پھر جلد ہی ہوش میں آکر میں نے لبلبی دبا دی۔ فائر کے دھماکے کے ساتھ شیرنی کی زبردست دہاڑ سے جنگل ہل کر رہ گیا۔ اردگرد کے درختوں سے بے شمار پنچھی ڈراؤنی آواز نکالتے ہوئے اپنے آشیانوں سے اڑے۔

میں نے فائر تو کردیا تھا لیکن گولی شیرنی کو نہیں لگی تھی۔ ہم نے ہر طرف روشنی ڈال کر دیکھا لیکن کہیں کوئی چیز نظر نہ آئی۔ دور سے شیرنی کی غراہٹیں سنائی دے رہی تھیں جو ہم سے دور گھنے جنگل میں گم ہوتی جارہی تھیں۔

میں شکار کرنے میں ناکام ہوگیا تھا۔ اس وقت ہم نیچے بھی نہیں اتر سکتے تھے۔ کیونکہ درندے کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ وہ کسی وقت بھی واپس آسکتا ہے۔ ہم رات بھر مچان پر بیٹھے مچھروں سے لڑتے رہے۔ سپیدہ سحر نمودار ہوتے ہی ہم مچان سے نیچے آئے اور اپنے کیمپ پہنچے جو دریا کے کنارے لگایا گیا تھا۔

میں نے بعد میں چھوٹے بڑے کئی جانوروں کا شکار کیا لیکن شیر کو مارنا فی الحال میرے مقدر میں نہیں تھا۔ میرے دل میں شیر کا شکار کرنے کی خواہش دن بہ دن شدت اختیار کرتی جارہی تھی۔

اس کے تین ماہ بعد خبر ملی کہ آج کل ایک بہت بڑا شیر ہمارے بنگلے کے قریب جنگل میں دیکھا گیا ہے۔ اس کے قدموں کے نشانات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خاصی بڑی عمر کا جانور ہے۔ اس مرتبہ میں نے شیر کو شکار کرنے کے لیے دوسرا اور سب سے پرانا طریقہ بروئے کار لانے کا فیصلہ کیا۔ میں ہر حال میں اس شیر کا شکار کرنا چاہتا تھا کیونکہ پہلی ناکامی کے بعد بھیل قبائلی مجھ سے زیادہ خوش نہیں تھے۔

میں سو ڈیڑھ سو بھیلوں کو کنستر اور ڈھول دے کر جنگل کے اس حصے میں پھیلا دیا جہاں آخری بار شیر کو دیکھا گیا تھا۔ وہ لوگ دائرے کی صورت میں ڈھول اور کنستر بجاتے اور چیختے چلاتے اپنا گھیرا اس طرح تنگ کرتے رہے کہ شیر کو اس طرف جانے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں مل سکتا تھا جہاں میں ایک درخت پر موجود رائفل تھامے اس کا انتظار کررہا تھا۔

اس طریقے کو ہانکا کرانا کہتے ہیں۔ ہانکا عام طور پر صبح سویرے یا شام ڈھلنے سے پہلے کرایا جاتا ہے۔ ہانکا کرنے والوں کے لیے یہ بڑا خطرناک موقع ہوتا ہے کیونکہ وہ شیر کے آرام کرنے کا وقت ہوتا ہے۔ اگر معمولی سی بے احتیاطی کی جائے تو شیر غضب ناک ہو کر ہانکا کرنے والوں کی موت کا سامان بن سکتا ہے۔

وہ شام کا ہانکا تھا۔ میں ایک مضبوط درخت پر چڑھ گیا۔ میرے ساتھ وہی دونوں بھیل بیٹھے تھے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد مجھے ڈگ ڈگ اور ہا، ہو کی آوازیں سنائی دینا شروع ہوگئیں۔ شیر کا رخ شکاری کی جانب کرنے کے لیے راستے میں کئی بلند درختوں پر بھیل قبائلی بٹھائے گئے تھے۔ ان کے پاس پٹاخے تھے اور ان کا کام یہ تھا کہ اگر شیر کسی دوسری سمت میں نکلنے لگے تو وہ پٹاخے چلا کر اس کا رخ میری طرف موڑ دیں۔ انہیں اسٹاپر کہا جاتا ہے۔ وہ لوگ رومال کے ذریعے اشارہ کرکے اگلے لوگوں یا شکاری کو آگاہ کرتے تھے کہ اب وہ شیر کس طرف سے آرہا ہے۔

ان ایام میں جنگلوں میں سخت گرمی تھی۔ یہ بھیلوں کے لیے پہلا ہانکا تھا۔ اس لیے انہوں نے اس قدر زور سے ڈھول پیٹا اور اتنا شور مچایا کہ شیر گھبرا گیا۔ ہانکے کا یہ اصول ہے کہ ہلکی آوازیں نکالی جائیں اور ڈھول آہستہ آہستہ بجایا جائے۔ اس طرح درندہ جوش میں آئے بغیر اپنی کچھار سے نکل آتا ہے لیکن یہاں تو سب ہی ناتجربہ کار تھے۔ قبائلیوں نے چیخ چیخ کر جنگل کو سر پر اٹھا لیا تھا۔

اچانک شیر کی زبردست دہاڑ سنائی دی۔ اس کے بعد مسلسل اس کی بڑھکیں سنائی دیتی رہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شیر لاؤڈ اسپیکر پر منہ رکھ کر ہمیں للکار رہا ہو۔ اس کی آوازیں بالکل قریب سے آرہی تھیں لیکن ہنوز وہ مجھے نظر نہیں آیا تھا۔ میرے سامنے والے اسٹاپر نے اچانک بڑے پرجوش انداز میں قریب ہی شیر کی موجودگی کا اشارہ کیا اور اس بے وقوف نے زور سے ہنکارہ بھی مارا۔ وہ بدنصیب بیٹھا بھی درخت کی انتہائی نچلی شاخ پر تھا۔

اس دوران میں میری نظر شیر پر پڑ چکی تھی۔ وہ گھنی جھاڑیوں میں سے نکل کر اچانک سامنے آگیا تھا۔ وہ سخت گھبرایا ہوا تھا اور ادھر ادھر دیکھ کر غرا رہا تھا۔ وہ ڈھکی چال چلتا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

میری ہی طرف آرہا تھا۔ میں پہلے ہی رائفل تھامے اس کا انتظار کررہا تھا۔ میں نے اس کی طرف نال سیدھی کی اور نشانہ لے کر اسے مزید قریب آنے کا موقع دیا...... اسی وقت بھیل اسٹاپر نے جوشیلی آواز نکالی تھی اور شیر نے یکدم اپنا رُخ بدلا اور بڑی تیزی سے اس درخت کی جانب بڑھا جس پر وہ اسٹاپر بیٹھا تھا۔

شاید وہ شیر کو نظر آ گیا تھا۔ اس لیے اس نے زقند بھری اور اسٹاپر کے اوپر جاپڑا۔ یہ سب کچھ اس قدر اچانک اور تیزی سے ہوا کہ مجھے ٹرائیگر دبانے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ اگلے ہی لمحے شیر، اسٹاپر کے ساتھ زمین پر آن گرا۔ بھیل کی دردناک چیخوں اور شیر کی غضبناک غراہٹوں سے جنگل کا وہ حصہ گونج اُٹھا۔

اردگرد کے اسٹاپرز نے پٹاخے چلائے، میں نے بھی تین چار ہوائی فائر کیے کیونکہ شیر کو سیدھی گولی مارنے سے قبائلی کی جان بھی خطرے میں پڑسکتی تھی جو اب بھی کم خطرے میں نہیں تھی۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ گولیوں اور پٹاخوں کے دھماکے سن کر شیر نے قبائلی کو چھوڑ دیا اور ایک جانب چھلانگ مار کر جنگل میں غائب ہوگیا۔

بے چارہ اسٹاپر لہولہان حالت میں گھاس پر بے حس وحرکت پڑا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد تمام ہانکا کرنے والے بھیل آ کر وہاں جمع ہوگئے۔ وہ اپنے زخمی ساتھی کو دیکھ کر عجیب آوازیں نکال رہے تھے۔ شیر کے ہاتھوں زخمی ہونا ان وحشی قبائلیوں کے لیے بہت بڑی بدشگونی تھی۔ ہر جانب خوف وہراس پھیل گیا تھا۔ میں نے زخمی کو اٹھوا کر اس علاقے کی اکلوتی ڈسپنسری میں پہنچایا۔ وہاں کئی دنوں تک اس کا علاج ہوتا رہا پھر کہیں وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوا۔

میں اس مرتبہ بھی شکار میں بُری طرح ناکام ہوا تھا۔ سب سے بڑا ظلم یہ ہوا کہ ایک قبائلی، شیر سے اپنا جسم مجروح کرا بیٹھا تھا۔ پوری بھیل قوم پر اس کا بہت بُرا اثر پڑا۔ شکار کی ایک ایک بات بہت تیزی سے قبائلیوں میں پھیل جاتی تھی۔ ہر طرف میری ناکامی کے چرچے ہونے لگے۔ اندر ہی اندر بہت سے بھیل میرے خلاف ہوگئے تھے۔ روز مجھے نئی افواہیں سنائی جاتیں لیکن اب بھی میں نے ہمت نہیں ہاری تھی۔

جب حالات کچھ بہتر ہوئے تو میں نے تیسری بار شکار کا منصوبہ بنایا۔ ان دنوں میں سخت گرمی اور کڑاکے کی دھوپ سے جنگل کی گھاس، پودے سوکھ چکے تھے۔ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی تھی۔ اب وہ گھنا جنگل کافی چھدرا چھدرا سا دکھائی دینے لگا تھا۔ اس لیے جنگل میں دور تک کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔

اس مرتبہ میں نے صبح کے ہانکے کا بندوبست کیا۔ ساتھ ہی میں نے تمام ہانکا کرنے والوں کو اچھی طرح ٹریننگ دی۔ اسٹاپرز کو مضبوط درختوں اور مناسب بلندیوں پر بٹھانے کے لیے میں نے خود جنگل میں گھوم پھر کر ایک ایک درخت انتخاب کیا۔ جب میرے حساب سے ہر چیز فٹ ہوگئی تو میں نے سب کو اچھی طرح سمجھا کر انہیں اپنے اپنے ٹھکانے پر کھڑا کیا اور خود بھی ایک بلند درخت پر پوزیشن لے کر بیٹھ گیا۔

میرے سامنے کا جنگل، جھاڑیوں اور جھنڈوں سے کافی صاف تھا اور درخت بھی کم تھے اس لیے میں بہت دور تک دیکھ سکتا تھا۔ میں دل میں دعا مانگتا رہا کہ اے پروردگار! اس مرتبہ میری عزت رکھنا۔ اتنی محنت کا کچھ تو صلہ ملنا چاہیے۔

ہانکا کرنے والوں کے ڈھول اور کنستر بجانے کی دھیمی دھیمی آوازیں سنائی دینے لگیں جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جارہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی میرے جسم میں لہو کی گردش تیز ہوگئی۔ یہ تیسرا موقع تھا کہ میں شیر کا شکار کرنے کے لیے جان توڑ کوشش کررہا تھا۔ اچانک بھیلوں کے چیخنے اور ڈھول کی ڈم ڈم کے ساتھ شیر کی ہلکی سی دہاڑ سنائی دی۔ پھر دور ہی سے مجھے ایک اسٹاپر کا اشارہ بھی نظر آیا کہ شیر میری ہی طرف آرہا ہے۔

ڈھول کی آوازیں ہر طرف سے ہمارے قریب آتی جارہی تھیں لیکن اب شیر خاموش ہوچکا تھا۔ اس لیے اندازہ نہیں ہو پارہا تھا کہ وہ کس طرف ہے۔ میں دم سادھے بہت غور سے اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک کافی دور درختوں کے عقب سے شیر نکل کر سامنے آ گیا۔ وہ مجھ سے خاصے فاصلے پر تھا لیکن میں اسے شاہانہ چال چلتے ہوئے صاف دیکھ رہا تھا۔

جب شیر قریب آ گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ انتہائی خوبصورت اور صحت مند جانور ہے۔ صبح کی دھوپ میں اس کی سنہری جلد پر بنی کالی دھاریاں چمک رہی تھیں۔ جانور جس قدر صحت مند اور مضبوط ہوتا ہے، اتنا ہی چوکنا، خبردار اور خونخوار ہوتا ہے۔ وہ شیر چاروں طرف دیکھتا ہوا مطمئن انداز میں چلتا آرہا تھا۔

میں نے اپنی رائفل اس کی جانب سیدھی کی اور انتظار کرنے لگا کہ وہ کم از کم پچھتر گز میرے قریب آجائے۔ اس وقت مجھے نہ جانے کیا ہوگیا تھا کہ شیر مطلوبہ رینج میں آ گیا لیکن اس کے باوجود میں نے گولی نہیں چلائی۔ میں گویا اس جنگل کے بادشاہ کے سامنے مبہوت سا ہوگیا تھا۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں ایک جنگلی شیر کو اس قدر قریب آزاد حالت میں

نہیں دیکھا تھا۔ وہ مجھ سے پچاس گز کے فاصلے پر پہنچ چکا تھا اور ایک دم رک گیا۔ شاید اسے اپنے قریب میری موجودگی کا احساس ہوگیا تھا۔ یکا یک اس کا جسم تن گیا۔ وہ نیم وا جبڑے سے کچلیاں نکالتا ہوا اِدھر اُدھر دیکھنے لگا...... اور پھر سامنے ہی اونچے درخت پر اس نے مجھے دیکھ لیا۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں۔ مجھے اس کی آنکھوں میں حیرت اور غصے کے جذبے ابلتے ہوئے محسوس ہوئے۔ میں ایک لمحے کے لیے اپنی جگہ برف کی طرح جم گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے موت میرے سامنے کھڑی ہے۔ اس کی آنکھوں کی چمک میرے وجود میں جھرجھریاں سی دوڑا گئی۔ میری رائفل کی بیرل بہ دستور اس کی طرف تھی۔ میری نگاہ اس پر گڑی ہوئی تھی۔ میری انگلی ٹریگر پر تھی لیکن اب تک میں نے اسے جنبش نہیں دی تھی۔

اچانک میرے جسم میں ایک گرم سی لہر دوڑ گئی اور میں نے فوراً ٹریگر پر رکھی انگلی پر دباؤ بڑھا دیا۔ فائر کا زبردست دھماکا ہوا اور اس کے ساتھ ہی شیر کی دہاڑ سنائی دی۔ تھوڑی دیر کے لیے میں اپنے حواس میں نہ رہا۔ اچانک بھیلوں کے شور نے گویا مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

''کوٹھے گیلا......کوٹھے گیلا واگھ ؟'' (کہاں گیا......کہاں گیا شیر؟)

میں نے ہڑبڑا کر نیچے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ نیچے کہیں بھی شیر کا وجود نہیں تھا۔ نہ ہی کسی نے اسے وہاں سے بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ کسی میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ درخت سے اتر کر شیر کو تلاش کرے کیونکہ زخمی درندے کے قریب جانا موت کے منہ میں جانے کے مترادف ہے۔ اچانک ایک بھیل نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی زبان میں کہا۔

''اِدھر......گھاس ہل رہی ہے۔''

اس کے ساتھ ہی تمام بھیلوں کے شور سے جنگل گونج اُٹھا۔

''واگھ ویلا......واگھ ویلا۔'' (شیر مرگیا......شیر مرگیا)

اس کے باوجود کوئی بھی درخت سے نیچے نہ آیا۔ میں نے خشک گھاس کے ٹیلے میں دو فائر کیے لیکن وہاں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ یہ دیکھ کر دو بھیل چھلانگ مار کر درخت سے اُترے۔ میں بھی نیچے آ گیا۔ ہم گھاس کے قریب گئے تو ہمیں بیس گز دور ہی سے شیر کا لرزتا ہوا زخمی وجود نظر آ گیا۔ وہ جان کنی کے عالم میں تھا۔ اس کا جسم بُری طرح کانپ رہا تھا۔ میں نے وہیں سے ایک گولی چلائی اور اس کا جسم ایک جھٹکا لے کر زور سے کانپا اور پھر ساکت ہوگیا۔

سب کو یقین ہوگیا کہ اب شیر میں بالکل جان نہیں رہی۔ اس لیے تمام بھیل قبائلی شیر کے اردگرد جمع ہوگئے۔ ہر ایک کا جوش دیکھنے کے قابل تھا۔ ایک بھیل نے جوشیلے انداز میں ڈھول بجانا شروع کردیا اور دوسرے لوگ شیر کے گرد ناچنے اور شور مچانے لگے۔ یہ بھیلوں کے لیے خوشی کا دن تھا۔ وہ شیر کے شکار کے بعد خوب جشن مناتے تھے۔ وہ ایسا رقص اسی وقت کرتے تھے جب ان کا کوئی بہادر جوان شیر جیسے درندے کا شکار کرتا تھا۔ اس رقص کو وہ ''واگھ دیوناچ'' کہتے تھے۔

اچانک ایک بوڑھے بھیل نے آگے بڑھ کر اپنے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا شیر کے خون سے تر کر کے میرے ماتھے پر گول نشان بنادیا۔ میری پہلی گولی شیر کی آنکھوں کے درمیان کھوپڑی میں لگی تھی۔ اس کے ساتھ ہی شیر کا کام تمام ہوگیا تھا۔ اسے ایک نایاب نشانہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ شیر کی کھوپڑی میں گولی لگ جائے تو پھر اسے مزید گولی نہ ماری جائے تب بھی وہ نہیں بچ سکتا۔ اس قسم کا نشانہ لگانے والے کو شکاری زبان میں ''کنگ ہنٹر'' کا خطاب دیا جاتا ہے۔

قبائلیوں کا ناچ گانا اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ میں بھی ان کے ساتھ مل کر بھنگڑا ڈالنے لگا۔ جب تمام لوگ تھک گئے تو میں شیر کو اٹھوا کر اپنے خیمے میں لے گیا۔ میں نے اس کی پیمائش کی۔ اس کا قد، سر سے دم تک 9 فٹ 6 انچ تھا۔ میں نے اس کی چھاتی ناپی اور پھر اپنا سینہ ناپا۔ شیر کی چھاتی میرے سینے سے چار انچ زیادہ چوڑی تھی۔ اگرچہ وہ میری جوانی کا دور تھا۔ اس وقت میں پہلوانی اور باکسنگ کرتا تھا اور کافی جان بنائی ہوئی تھی لیکن شیر کا دھڑ مجھ سے کافی چوڑا تھا۔ اب میں اپنی اس حرکت کے بارے میں سوچتا ہوں تو بہت ہنسی آتی ہے کہ مجھے اپنی اور شیر کی چھاتی کا موازنہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

بہرحال جو کچھ بھی ہوا، اس کے بعد میں بھیلوں میں بہت مقبول ہوگیا۔ اب تمام بھیل میری بات غور سے سننے لگے تھے۔ اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ ہندوستان کی یہ قدیم ترین قوم اپنی زبان اور کلچر کے حوالے سے سخت احساس کمتری کا شکار تھی۔ غربت اور پسماندگی نے انہیں سب سے پیچھے کردیا تھا۔ میں نے بھیلوں کو شہری زندگی سے واقف کرانے کے لیے بے حد کوششیں کیں۔ میں نے گورنمنٹ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اس پچھلی ہوئی قوم کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دی جائے۔

بھیل قوم کے تمام باشندے مجھ سے بہت زیادہ متاثر ہوگئے تھے۔ انہوں نے مجھے ''مسعود مہاراج'' کا نام دیا۔ ہر شخص بڑی عزت کے ساتھ مجھے مہاراج کہنے لگا تھا۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

لگے ہاتھوں یہ مزید تفصیل سے بتادوں کہ ہندوستان کے قدیم باشندوں میں بھیل نامی یہ قبیلہ بہت مشہور ہے۔ پورے ہندوستان میں ان کی آبادی پانچ لاکھ کے لگ بھگ ہوگی۔ یہ مختلف بھیل قبیلے ہندوستان کے وسیع علاقے میں بے ترتیبی سے پھیلے ہوئے ہیں۔ دکھن کی جانب اجمیر راجستھان کے زیریں علاقوں سے لے کر جنوبی ہندوستان کے صوبے مہاراشٹر کے ضلع تھانہ تک یہ پائے جاتے ہیں۔ بالائی علاقوں، مدھیہ پردیش کے دوردراز حصوں میں بھی بھیلوں کے خاندان منتشر اور جنگلی انداز کی زندگی گزارتے ہوئے ملیں گے۔

ہندوستان کے عام لوگ بھیلوں کو ایک اکھڑ مزاج مگر صاف دل جنگلی قوم کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ کئی بار ان پر راہزن اور ڈکیت ہونے کے الزامات بھی لگائے گئے ہیں۔ زیادہ تر بھیل کھیتی باڑی کرکے یا ڈھور ڈنگر پال کے گزارہ کرتے ہیں۔ ان کا ہندومت سے دور کا بھی واسطہ نہیں جبکہ ورثے میں بھی انہیں کوئی خاص دھرم نہیں ملا۔ قدیم نسل سے تعلق رکھنے والے یہ باشندے اپنی اپنی مرضی کے مقامی دیوی دیوتاؤں کو پوجتے ہیں۔ بیرونی مداخلت کے باعث اب جاکر کچھ بھیلوں نے ہندومت یا اسلام قبول کرلیا ہے لیکن اکثریت اب بھی سورج، چاند، ستاروں، شیر، چیتوں، سانپوں اور دیگر بے شمار ایسے جنگلی درندوں کی پوجا کرتے ہیں جن سے انہیں خوف محسوس ہوتا ہے۔

بھیل قوم کا کلچر اور دھرم کوئی مختلف چیزیں نہیں ہیں۔ ان کی ثقافتی جشن، میلے اور گانا بجانا ہی گویا ان کے مذہب ہیں۔ اس لیے وہ نہایت مختلف انداز کی زندگی گزارتے ہیں۔

انگریز ہندوستان کی ہر چیز کو اپنی ملکیت سمجھتے تھے اور وہ یہاں کے باشندوں کو بھی ایک خاص معیار کی زندگی گزارتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے جنگلی لوگوں کو آداب سکھانے اور جدید تہذیب سے آشنا کرنے... کا پروگرام بنایا۔ اس طرح جہاں قبائلیوں کو نئے زمانے میں خود کو ایڈجسٹ کرنے میں بہت مدد ملی۔ وہیں ان کی نیچرل انداز کی گزرتی قبائلی زندگی بھی بُری طرح متاثر ہوئی۔

وحشی لوگوں کو مہذب بنانے کے سلسلے میں بھیل قبائلی بھی انگریزوں کی نظر میں آگئے تھے۔ انتہائی بدحالی اور غربت میں جکڑی اس قوم کو جدید زمانے کے ساتھ ملانے کے لیے انگریزوں نے ایک جامع پروگرام مرتب کیا۔ اس مقصد کے لیے ایک خصوصی شعبہ قائم کیا گیا اور اس شعبے کا انچارج کوئی آئی سی ایس افسر ہوتا تھا۔ اسے ”بھیل اپ لفٹ آفیسر“ کہا جاتا تھا۔ مجھے اسی عہدے پر فائز کرکے خاندیش تعینات کردیا گیا تھا۔

میری پوسٹنگ خاندیش ضلع کے ایک جنگلی اور پہاڑی ہیڈکوارٹر ڈھولیا میں ہوئی تھی۔ اس قصبے کے قریب خاصی بڑی تعداد میں بھیل جنگلی زندگی گزار رہے تھے۔ ان قبائلیوں کے ساتھ کچھ وقت گزار کر میں ان کے مسائل کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ جن جنگلی اور پہاڑی علاقوں میں بھیل وحشیانہ زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے اردگرد کے گاؤں میں رہنے والے برہمنوں، مارواڑیوں اور ہندو پنڈتوں نے ذات پات کی تفریق کا ایک ایسا ماحول پیدا کرلیا تھا کہ اس میں بھیلوں کے لیے کوئی باعزت مقام تھا ہی نہیں۔

ان کے درمیان بھیل قوم اپنی زبان اور ثقافت کے سبب سخت احساسِ کمتری کا شکار تھی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ مفاد پرست دیہاتی طبقہ بھیلوں کی معاشی اور معاشرتی بدحالی سے بُری طرح فائدہ اٹھا رہا تھا۔ گھنے جنگلوں کے اندر بسنے والے اور دوردراز کے پہاڑی غاروں اور کھوہ میں رہنے والے قبائلی تو ساری دنیا سے بے خبر بڑے قدرتی ڈھنگ سے جنگلی زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن دیہاتوں کے قریب رہنے والے بھیل پوری طرح ہندو ساہوکاروں اور مارواڑی سیٹھوں کے ہتھے چڑھے ہوئے تھے۔ اپنے آپ کو بھگوان کا نمائندہ قرار دینے والے برہمنوں نے بھیلوں کو اس طرح ذہنی طور پر مفلوج کیا ہوا تھا کہ وہ بے چارے ان ظالموں کے بے دام غلام بن گئے تھے۔

ہندو بنیوں نے سود در سود قرض دے کر انہیں اس طرح نتھ ڈال دی تھی کہ وہ تڑپنے کے قابل بھی نہیں رہے تھے۔ انگریزوں کے بھیل سدھار پروگرام سے بھی ان چالاک اور مکار لوگوں نے بڑا فائدہ اُٹھایا تھا۔ بھیلوں کو نئی دنیا سے روشناس کرانے کے بہانے ہندو زمیندار اور مارواڑی سیٹھ جنگلوں سے بھیلوں کو وحشی جانوروں کی طرح پکڑ کر اپنے گھروں میں لانے لگے۔ زمیندار ان سے زبردستی زمینوں پر مشقت کراتے اور ہر وہ مشکل کام لیتے جو کسی زرخرید غلام سے لیا جاسکتا تھا۔

اسی طرح مارواڑی سیٹھوں نے گاؤں میں چھوٹی چھوٹی کھڈیاں لگائی ہوئی تھیں۔ پہلے وہ رسیوں میں جکڑے بھیلوں کو مار مار کر تمام کام سکھاتے پھر ان سے کھیس اور قالین بنواتے۔ اگر بھیل مرد قابو میں نہ آتے تو ان جنگلیوں کی عورتوں کو اُٹھوا لیا جاتا تھا۔ ان کی عزت پامال کی جاتی اور پھر انہیں بھی بیگار پر لگا دیا جاتا۔ اس طرح بھیلوں کے تن من

دل و دماغ، سوچ، ضمیر کے ساتھ ساتھ ان کی عزتیں بھی اونچی ذات کے لوگوں کے پاس گروی رکھی تھیں۔

اگر کوئی غیرت مند بھیل اس ظلم کے خلاف آواز بلند کرتا تو اسے یہ مکار لوگ ملک کا غدار اور سرکار کا باغی مشہور کرکے مروادیتے تھے۔ اس طرح سرکار بھی انجانے میں بھیلوں پر بے انتہا ظلم کررہی تھی اور بھیل سدھار منصوبہ عملی طور پر بھیل اُجاڑ مشن بن گیا تھا۔ بھیلوں کے اصل حالات آج تک کسی نے گورنمنٹ تک نہیں پہنچائے تھے۔

اس مظلوم قوم کی معاشی، معاشرتی اور ذہنی بدحالی دن بہ دن بڑھتی جارہی تھی۔ کسی بھی قوم میں بیداری اور آگاہی پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی عزتِ نفس بحال کی جائے۔ جب کسی شخص کا اپنی ہی نظر میں اپنا وقار بلند ہوتا ہے تو وہ اپنے آپ، اپنی ثقافت اور اپنی زبان کو کسی دوسری قوم کی ثقافت اور زبان سے ہم آہنگ کرتے ہوئے برابری کی بنیاد پر آگے بڑھنے کے لیے کام کرتا ہے۔ اس کے الٹ کسی قوم کو ذہنی طور پر غلام بنانے کے لیے اس سے اس کی زبان اور ثقافت چھین لی جاتی ہے۔

یہ تمام باتیں جگت اصولوں کے طور پر تسلیم کی جاتی ہیں۔ اسی طرح صرف ہندوستان کی بات کی جائے تو ہمیں صاف معلوم ہوگا کہ شروع ہی سے ایک خاص طبقے نے ہندوستانی عوام کو ذہنی طور پر غلام بنانے کے لیے بہت کام کیا ہے۔

لسانی بنیادوں پر جتنا ظلم ہندوستان کی مختلف قوموں پر ہوا، شاید ہی کسی دوسرے ملک میں ہوا ہو۔ ہندوستان کا جغرافیہ اور عوامی رہن سہن ایک دوسرے سے انتہائی مختلف اور عجیب ہے۔ یہاں بے شمار نسلوں اور قوموں سے تعلق رکھنے والے لوگ مختلف بولیاں بولتے ملیں گے۔ ہم ہندوستان کو ایک کثیر الزبان ملک کہہ سکتے ہیں۔ آج کل کے ہندوستان میں چودہ بڑی زبانیں اور چھ سو مختلف بولیاں بولی جاتی ہیں۔

زبانوں میں فرق کا یہ عالم ہے کہ شمالی اور جنوبی ہندوستان کی زبانوں کے رسم الخط بھی مختلف ہیں۔ شمالی ہندوستان کی زبانیں سنسکرت سے نکلی ہیں جو آریہ باہر سے اپنے ساتھ ہندوستان لائے تھے۔ سنسکرت کا رشتہ دور کہیں یورپین زبانوں سے جاملتا ہے۔

جنوبی ہندوستان کی زبانوں کی بنیاد تامل ہے۔ تامل زبان ہندوستان ہی میں پیدا ہوئی اور اسے بولنے والے لوگ دراوڑ نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ دراوڑوں کو ہندوستان میں دھرتی ماتا کے سپوت ہونے کا شرف حاصل ہے۔ پُرانے زمانے میں یہ لوگ بھارت پر حکمرانی کرتے تھے۔ ہزاروں برس قبل آریہ نسل کے جنگجوؤں نے ہندوستان فتح کرلیا تو انہوں نے دراوڑوں کا قتل عام شروع کردیا۔ ان کے خوف سے کئی دراوڑ قبیلے اپنی جان بچانے کے لیے جنگلوں میں روپوش ہوگئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ انہوں نے جنگلوں ہی کو اپنی اصل پناہ گاہ بنالیا۔ آج کل بھی زیادہ تر دراوڑ نسل کے لوگ گھنے جنگلوں اور پہاڑی علاقوں میں قبائلی زندگی گزارتے نظر آتے ہیں۔

موجودہ ہندوستان کے صوبوں، اڑیسہ، بہار، مدھیہ پردیش اور مہاراشٹر کے جنگلی اور پہاڑی علاقوں کو دراوڑوں ہی نے آباد کیا ہوا ہے۔ اب دراوڑ قوم کی کئی شاخیں بن چکی ہیں۔ مثلاً گونڈ، بھاٹرا، کویا، کونڈ، کنتیا کونڈ، جانگ، بانڈ، گباڈا اور ساورا، وغیرہ۔

☆☆☆

ہندوستان کے کروڑوں افراد کے ساتھ ساتھ ان اصل بھارت باسیوں کے ساتھ جو لسانی ظلم ہوا، اس کی داستان بہت عجیب ہے۔ چونکہ انگریزوں کے دور میں یوپی، سی پی کا ہندی بولنے والا طبقہ ہندوستان کی سیاست میں باقی لوگوں سے آگے تھا۔ اس لیے انہوں نے انگریزوں کے جانے کے بعد تمام لوگوں پر اپنی زبان اور ثقافت طاری کرکے تمام ہندوستانی عوام کو اپنا ذہنی غلام بنانے کی سازش کی۔

اس مقصد کے لیے بڑے پیمانے پر جنوبی ہندوستان میں جہاں کبھی کسی نے ہندی کا ایک لفظ بھی نہیں سنا تھا، ہندی پڑھانا اور بولنا سکھانے کے منصوبے شروع کیے گئے۔ جب ملک کی تقسیم ہوئی تو عوام کی منشا جانے بغیر ہندی کو پورے ہندوستان کی قومی زبان کے طور پر لاگو کردیا گیا۔ فوراً ہی جنوبی ہندوستانیوں کی جانب سے کھل کر اس فیصلے کی مخالفت کی گئی۔ ان کا موقف درست تھا کیونکہ ان کے لیے ہندی بھی انگریزی اور فرنچ جیسی غیر ملکی زبانوں کی طرح بالکل اجنبی زبان تھی اس لیے جب مدراس کے عوامی جلسے میں پنڈت جواہر لال نہرو پر اس فیصلے کے خلاف احتجاج کرنے والوں نے گندے انڈے، سڑے ہوئے ٹماٹر اور جوتے پھینکے تو تب انہیں عوام کے شدید غم و غصے کا احساس ہوا۔ چونکہ نہرو سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے لیڈر اور اپنے ملک کے سچے خیر خواہ تھے۔ اس لیے انہوں نے اسی موقعے پر اعلان کردیا کہ ہندوستان کی چودہ بڑی زبانیں ہی پورے ملک کی قومی زبانیں ہوں گی۔ اس طرح انہوں نے تحمل مندی سے کام لیتے ہوئے ہندوستان کی یکجہتی کو درپیش ایک زبردست

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

خطرے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تھا۔

نہرو نے تو عوام کا زبردست احتجاج دیکھ کر لسانی مسئلہ حل کر دیا تھا۔ جس کے ساتھ انہوں نے کروڑوں ہندوستانیوں کا دل جیت لیا تھا لیکن میں اس سے بہت پہلے اس سنگین مسئلے کے اصل حل تک پہنچ گیا تھا۔ ڈھولیا خاندیش میں بسنے والے بھیلوں کی زبان اور ثقافت کو جس طرح دبایا جا رہا تھا، اس کے ساتھ وہ دن بہ دن سرکار سے بدظن ہوتے جا رہے تھے۔ ساہوکاروں کے ظالمانہ سلوک نے ان کے دلوں میں سے یہ جذبہ ہی کھرچ کے پھینک دیا تھا کہ وہ بھی نئے اور جدید زمانے میں رچ بس سکتے ہیں۔

لیکن جب میں ''بھیل اپ لفٹ افسر'' بن کے وہاں پہنچا تو ان کا مسئلہ سمجھتے ہوئے میں نے اپنے کام کا آغاز بھیلوں کی زبان، دھرم، رسوم ورواج اور ناچ گانے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے سے کیا۔ پھر میں نے افسری کو بھول بھال کر ان کے طور طریقوں کے مطابق ان کے ساتھ رہنا شروع کر دیا۔ میں نے ان کی اوٹ پٹانگ رسموں کی کبھی مخالفت نہیں کی۔ اور نہ ہی ان کے وحشیانہ رہن سہن کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ میں ان کے ہر جشن میں بھرپور حصہ لیتا۔ یہاں تک کہ میں ان کے پُرجوش جنگلی ناچ میں بھی جی جان سے ان کا ساتھ دیتا تھا۔

میں انہی کی طرح مختصر سا لنگوٹ باندھ کر جنگل میں کھجل خوار ہوتا اور انہیں خوش کرنے کے لیے جنگلی جانوروں کا شکار کرتا تھا۔ ان جنگلیوں کے ساتھ ہی میرا رات دن کا اُٹھنا بیٹھنا تھا۔ ان کا پکایا ہوا وہ کچاپکا گوشت، جسے پہلے دیکھتے ہی مجھے اُبکائی آتی تھی۔ ''اسی ماس'' کی بڑی بڑی بوٹیاں مزے لے لے کر کھانے لگا۔ معلوم نہیں کیا وجہ تھی کہ اب مجھے بھیلوں کا ہر کھانا لذیذ لگتا تھا۔

کبھی کوئی میرا شناسا سرکاری ملازم یا عام پڑھا لکھا آدمی اس الگ تھلگ واقع بستی میں آ نکلتا تو اس کے لیے ننگ دھڑنگ قبائلیوں میں مجھے شناخت کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ جب اسے اصل صورتِ حال معلوم ہوتی تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتا۔

''مسعود صاحب!'' وہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھتا ''جنگل میں آ کر آپ کو کیا ہو گیا ہے؟''

میں ہمیشہ ہنس کر ٹال دیتا۔ میں نے کبھی سرکاری لگے بندھے اور ''کام چلاؤ'' اصولوں پر عمل نہیں کیا۔ میرے دل میں شروع ہی سے صرف انسان کی قدر رہی ہے۔ اس لیے میں کسی کے ریمارکس کی پروا نہیں کرتا تھا۔

اس شغل میلے کے ساتھ ساتھ میں نے بھیلوں کو ڈھیرے ڈھیرے جدید دور کی ترقی کے قصے سنانا شروع کر دیے۔ اکثر کسی شکاری مہم کے دوران یا کسی اور اکٹھ میں بھیل میرے اردگرد بیٹھ جاتے اور حیران ہو کر مجھ سے نئے زمانے کے تذکرے سنتے۔ اس کے ساتھ ہی ان کے ذاتی مسائل پر بھی بات چیت ہوتی رہتی۔ چار پانچ بھیل نوجوان میری باتوں سے اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ ہر وقت میرے ساتھ رہنے لگے۔ میں جہاں جاتا، وہ میرے ہمراہ ہوتے۔ میں جو بات کرتا وہ اسے بہت غور سے سنتے اور پھر آگے اپنے قبیلے کے دوسرے لوگوں تک پہنچاتے۔

میں ان نوجوانوں کے ذہن میں بھیل زبان اور ثقافت کی ترقی کے لیے کام کرنے کا شعور پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ دیگر قبائلی بھی کسی نہ کسی حد تک اپنا بنیادی مسئلہ سمجھ گئے تھے۔ جب لسانی اور معاشرتی مسائل سمجھنے کا کچھ ماحول بنتا نظر آیا تو میں نے سرکار کو مجبور کرنا شروع کر دیا کہ بھیل قوم کو ان کی مادری زبان میں تعلیم وتربیت دینے کا بندوبست کیا جائے۔ میری اسکیم چونکہ سخت ذاتی محنت اور عملی کھوج کا نچوڑ تھی۔ اس لیے گورنمنٹ نے پورے اعداد وشمار لے کر اس کی منظوری دے دی۔

تاریک جنگلوں میں رہنے والے وحشی بھیل بڑے اکھڑ مزاج مشہور تھے۔ انہوں نے کسی اجنبی کو کبھی اپنے قریب نہیں آنے دیا لیکن میری دن رات کی بھاگ دوڑ کام آئی تھی اور وہ جنگلی لوگ ملنسار بن گئے تھے۔ اس لیے جب سرکار نے پہلا آزمائشی گشتی اسکول قائم کیا تو انہوں نے کوئی پنگا کرنے کی بجائے ہر طرح میرا ساتھ دیا۔ خاص طور پر میرے ساتھ رہنے والے ان پانچ بھیل لڑکوں نے بڑی محنت کی۔ انہوں نے پہلے خود پڑھنا لکھنا سیکھا پھر دوسرے قبائلیوں تک علم کی روشنی پہنچانے میں میری بہت مدد کی۔ دراصل بھیل نیم وحشی ہونے کے باوجود انتہائی ذہین تھے۔ انہوں نے انتہائی قلیل وقت میں اتنا کام کر دکھایا کہ میں خود حیران رہ گیا تھا۔

بھیل زبان میں آزمائشی پڑھائی کا سلسلہ اتنا کامیاب ہوا کہ گورنمنٹ نے اس پراجیکٹ پر لمبی رقم خرچ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور جنگلی علاقے میں باقاعدہ اسکول قائم کرنے کی منظوری دے دی۔ اس طرح میں ہندوستان کی اس پچھلی ہوئی قدیم قوم میں ذہنی بیداری کی لہر پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

بھیل قوم کی سنبھلتی حالت دیکھ کر جہاں انگریز سرکار مجھ سے خوش تھی وہیں مقامی ہندو لابی بہت خفا تھی۔ میرا یہ

کارنامہ دیکھ کر انہیں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ پہلے تو ہندو، برہمن اور مارواڑی سیٹھ میرے پاس آ کر مجھے طرح طرح کے لالچ دے کر اس مشن سے دستبردار ہونے کی ترغیب دیتے رہے لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ مجھے رام کرنا ان کے بس کی بات نہیں تو پھر انہوں نے محکمے کے اعلیٰ افسروں کو میرے خلاف جھوٹی شکایتوں کے خطوط لکھنا شروع کر دیے۔

ان کا دعویٰ تھا کہ چونکہ صوبے میں ہر جگہ مراٹھی زبان پڑھائی جاتی ہے اس لیے بھیلوں کو اپنی مادری زبان میں تعلیم دینے کا مقصد صوبے کے لوگوں میں پھوٹ ڈالنا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ شور مچانا بھی شروع کر دیا کہ میں اپنا اثر رسوخ غلط طور پر استعمال کرتے ہوئے وحشی بھیلوں کو زبردستی مسلمان بنا رہا ہوں۔

میں نے ان کے بے بنیاد الزامات کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ میں ان لوگوں کے اختلاف کا سبب بہ خوبی جانتا تھا۔ درحقیقت بھیل لوگوں کو انہوں نے مفت کے غلام سمجھ لیا تھا۔ اب تعلیم کے آنے سے ان میں خود شناسی کا شعور بیدار ہو رہا تھا اور وہ ان ساہوکاروں اور زمینداروں کے ساتھ اکڑ کر بات کرنے لگے تھے۔ پہلے ہندو بنیا ان کی جہالت سے بھرپور فائدہ اُٹھا رہا تھا۔ اب اس سے اپنے لین دین کا حساب طلب کیا جانے لگا تھا۔ برہمنوں نے خود کو ایشور کا خاص بندہ مشہور کر رکھا تھا۔ اب بھیلوں نے انہیں بھی اپنے جیسا عام انسان سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ سب کچھ میرے ''بھیل سدھار تعلیمی پروگرام'' کا ثمر تھا۔ اس لیے متذکرہ ہندو لابی کو میرا یہ فلاحی کام ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔

ہندو، پنڈتوں، برہمنوں اور مارواڑی دولت مندوں نے اپنے مشترکہ مفاد کے لیے میرے خلاف ایک مضبوط محاذ قائم کر لیا۔ وہ منصوبہ بندی کے تحت وہاں سے میرا تبادلہ کرانے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ مجھے اپنے خلاف ہونے والی اس منظم سازش کا فی الحال علم نہیں ہو سکا تھا۔ لیکن ایک دن میں نے روزنامہ ''بمبئی کرانیکل'' میں مہاراشٹر کے وزیراعلیٰ مرار جی ڈیسائی کی صوبائی اسمبلی میں کی جانے والی تقریر کا متن پڑھا تو میری آنکھیں کھل گئیں۔

مرار جی ڈیسائی نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے انگریزی سرکار کو گویا خبردار کیا۔ انہوں نے کہا۔ ''ایک مسلمان آئی سی ایس افسر مادری زبان کا تنازعہ کھڑا کر کے بھیلوں میں معاشرتی بغاوت کی راہ ہموار کر رہا ہے۔''

یہ پہلا اخباری بیان تھا جسے پڑھ کر مجھے ہندوؤں کی سخت متعصب سوچ کا یہ نیا روپ دیکھنے کو ملا۔ مجھے احساس ہوا کہ ہندوؤں کے بڑے لیڈر بھی کسی مسلمان افسر کو ترقی کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔

ڈیسائی کے بعد کانگریس کے ''مردِ آہن'' سردار پٹیل تو ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے۔ بھیل قوم کو نئی تعلیم سے آراستہ کرنا اور ان میں بیداری کا شعور پیدا کرنا گویا ان کی نظر میں میرا ناقابلِ معافی جرم قرار پایا تھا۔ آئے دن میرے کام کی سخت مذمت کی جاتی تھی۔ صوبے کا تمام پریس ہندوؤں کے کنٹرول میں تھا۔ انہوں نے میرے خلاف لکھ لکھ کر اس معاملے کو اچھا خاصا ایشو بنا دیا۔

ہر دوسرے دن کسی نہ کسی مشہور سیاست داں یا دانشور کا گھسا پٹا بیان شائع ہو جاتا کہ صوبے میں مراٹھی زبان کا مستقبل خطرے میں پڑ گیا ہے۔ مادری زبان میں تعلیم دینے کا زہر عوام میں موجود بھائی چارے اور امن وامان کو سخت نقصان پہنچائے گا۔

اس زبردست مخالفت کے باوجود میں دلجمعی کے ساتھ اپنے کام میں مگن رہا۔ اب مجھے پہلے سے زیادہ اپنے مشن کی اہمیت کا احساس ہو گیا تھا۔ مجھے اس بات کا شدید افسوس ہوا کہ کچھ لوگ اپنے ذاتی مفاد کو مدِنظر رکھ کر مذہبی تعصب کو ہوا دے کر بھیلوں کے فلاح وبہبود کے منصوبے کو بڑے گھٹیا طریقے سے ناکام بنانا چاہتے ہیں۔

ساری دنیا سے بے خبر بھیل قبائلی رفتہ رفتہ ترقی کی منازل طے کرتے رہے۔ بھیلوں کے درمیان آ کر، ان کے جیسا بھیس اپنا کر میں اس قوم میں اس طرح گھل مل گیا تھا کہ وہ مجھے اپنے ہی قبیلے کا ایک اہم فرد سمجھنے لگے تھے۔ وہ بھیل نوجوان، جنہوں نے رضاکارانہ طور پر میرے ساتھ کام کر کے تمام بھیلوں تک علم کی دولت پہنچانے میں میری مدد کی تھی، وہ دیوانگی کی حد تک میرے پرستار ہو گئے تھے۔ وہ اس قدر ذہین تھے کہ میرے ساتھ رہ کر انہوں نے مجھ سے پنجابی زبان سیکھ لی تھی۔ جب میں پریشان ہوتا تو وہ اُلٹی سیدھی حرکتیں کر کے مجھے خوش کرنے کی کوشش کرتے، کبھی اپنے لہجے میں پنجابی بولنا شروع کر دیتے، خاص طور پر انہوں نے ایک جملہ رٹ لیا تھا ''اشکے وائی، اشکے جوانا!''

یہ سن کر مجھے بے اختیار ہنسی آ جاتی تھی۔ زمانے کے غلط رویّے سے پریشان اور آزردہ ہو کر میں مایوس اور خاموش رہنے لگتا تو ان کی باتیں اور خاص طور پر یہ جملہ مجھے ایک دم تازہ دم کر دیتا تھا۔ مجھے خوش دیکھ کر ان کے معصوم چہرے مزید روشن ہو جاتے تھے۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھیلوں کے ساتھ جنگل میں رہنے کے دوران مجھے ایک مرتبہ اپنی آنکھوں سے قہرِ الٰہی دیکھنے کا موقع ملا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ایک لمبے عرصے سے جنگل میں بارش نہیں ہوئی تھی۔ خشک سالی کے سبب جنگل کی گھاس اور پودے جھلس کر ختم ہو گئے تھے۔ پانی کی شدید قلت پیدا ہو گئی تھی۔ تمام جوہڑ، تالاب اور چھوٹی بڑی جھیلیں خشک ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ بھیل قبائلیوں کو پینے کا پانی حاصل کرنے کے لیے میلوں دور جانا پڑتا تھا۔

یہ خشک سالی پالتو اور جنگلی جانوروں کے لیے بھی انتہائی نقصان دہ ثابت ہوئی۔ قبائلی اپنی سادہ رسموں اور مذہبی طریقوں سے بادل برسنے کی دعائیں مانگتے رہے لیکن کسی جانب سے بھی کوئی بادل کا ٹکڑا آتا ہوا دکھائی نہ دیا۔ نوبت یہاں تک جا پہنچی کہ کڑاکے کی دھوپ نے جنگل کے تمام جوہڑوں اور جھیلوں کا پانی اڑا کر ان کی تہ دکھا دی۔

میں نے اپنی پوری زندگی میں اس قدر سخت گرمی اور جھلسا دینے والی دھوپ کا نظارہ نہیں کیا تھا۔ جنگلی درختوں پر بھی اس گرمی کا بہت بُرا اثر پڑا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بے شمار پودے نابود ہو گئے تھے اور کئی بڑے اور بلند درخت بھی شدت کی دھوپ کا مقابلہ نہ کر سکے اور اس کی تپش کا ایندھن بن گئے تھے۔

جانوروں کا یہ حال ہو گیا تھا کہ ہرن اور نیل گائے جیسے چست اور کسی کو قریب آتے دیکھ کر بدک جانے والے جانور بھی گردن ڈالے ایک طرف پڑے ہوئے نظر آنے لگے تھے۔ سخت گرمی اور پانی کی قلت نے ہر جاندار کو تھکا دیا تھا۔ سب کی چستی اور چالاکی ہوا ہو گئی تھی۔ سخت جان درندے بھی بولائے بولائے پھرتے تھے۔ بے شمار معصوم اور کمزور جانور صرف گرمی کی زیادتی اور پانی کی کمی کے سبب مر گئے تھے۔

بھیل جسمانی طور سے بہت مضبوط اور سخت جان تھے۔ ان کی سخت جانی کا یہ عالم تھا کہ ننگے پاؤں جنگلی کانٹوں، خاردار جھاڑیوں اور نوکیلے پتھروں پر دوڑتے پھرتے تھے۔ خنجر کی طرح تیز کانٹے ان کے تلوؤں میں چبھنے کے بجائے کڑک کر ٹوٹ جاتے تھے۔ خاص طور پر ان کی جِلد کا تو کوئی جواب نہ تھا۔ انہیں دیکھ کر معلوم ہوتا تھا جیسے رب نے انسانی جِلد کی بجائے فوجی بوٹوں کا موٹا چمڑا، ان کے وجود پر چڑھا دیا ہے۔ اس لیے یہ جنگلی لوگ شدید گرمی اور کڑاکے کی دھوپ میں بھی دوڑتے پھرتے تھے اور ان کا کچھ نہیں بگڑتا تھا۔ البتہ اس مرتبہ یہ ضرور ہوا کہ قیامت خیز لو کے سبب ان کے جسم چیخ گئے تھے۔ میں نے دیکھا تھا کہ ان کے چیختے ہوئے جسم سے ماس اور جلد کے ٹکڑے الگ ہو جاتے تھے لیکن وہ سخت جان قوم ان تکالیف سے بے نیاز زندہ رہنے کی جستجو اور ضروریاتِ زندگی کی اشیا کے حصول میں مگن نظر آتی تھی۔

بھیلوں اور جنگلی جانوروں کا بُرا حال دیکھ کر مجھے بہت ترس آیا لیکن قدرت کے کاموں میں میرا کوئی اختیار نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں ان کے لیے حتی المقدور کچھ نہ کچھ کرتا رہتا تھا۔

☆☆☆

اس دن سخت گرمی کے باوجود میں نے چند بھیلوں کو اپنے ساتھ لیا اور قریبی جنگل کا سروے کرنے کے لیے چل دیا۔ اس تکلیف دہ جنگلی دورے کے دوران جانوروں کی بُری حالت دیکھ کر کلیجا منہ کو آتا تھا۔ جہاں ہرن اور دیگر معصوم جانور پانی کے نہ ہونے سے کمہلائے پھرتے تھے، وہیں بھیڑیے اور چیتے جیسے خونخوار درندوں نے درندگی کی انتہا کر دی تھی۔ یہ طاقتور درندے محض خون چاٹنے کے لیے کمزور اور معصوم جانوروں کو ادھیڑتے پھر رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے کئی چھوٹے چھوٹے جانوروں کی تازہ اُدھڑی ہوئی لاشیں دیکھیں۔ ان کا گوشت نہیں کھایا گیا تھا۔ بس خون چاٹ کر اپنی پیاس بجھائی گئی تھی۔

اس درندگی کا سب سے بڑا مرکز وہ لمبی چوڑی جھیل تھی جو اب خشک ہو کر محض ایک جوہڑ بن چکی تھی۔ جنگل میں ہر جانب پانی ختم ہو چکا تھا۔ صرف اس جھیل کی تہ میں کچھ پانی موجود تھا۔ اس لیے سارے جنگل کے جانور دور دور سے آ کر یہاں اپنی پیاس بجھانے کی کوشش کرتے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خونخوار درندوں نے جھیل کے اردگرد اپنے ٹھکانے بنا لیے ہیں۔ جب ان کی مرضی ہوتی، پانی پینے کے لیے آنے والے جانور کو بھنبھوڑ ڈالتے تھے۔

یہ خدشا پیدا ہو گیا تھا کہ بے ضرر جانور پانی کی کمی اور درندوں کی چیرہ دستیوں سے عاجز آ کر نقل مکانی شروع کر دیں گے۔ اس طرح یہ خوبصورت جنگل، جانوروں سے خالی ہو جائے گا۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے میرے ذہن میں ایک تجویز آئی۔ جب میں نے اس کا تذکرہ بھیلوں کے سامنے کیا تو وہ بہت حیران ہوئے۔ جنگلی جانوروں سے میری محبت کا یہ روپ ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ میں نے منصوبہ بنایا تھا کہ جھیل کے اردگرد گھات لگا کر بیٹھنے والے دو چار خونی درندوں کا کسی طرح شکار کر لیا جائے۔ عین ممکن ہے کہ اس کے بعد دوسرے چالاک درندے بھی جھیل کی جان چھوڑ کر فرار ہو جائیں گے۔ اس طرح عام جانوروں کو تحفظ حاصل ہو گا۔ پھر وہ آزادی کے ساتھ جھیل سے پانی پی سکیں گے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

کسی درندے کی گزرگاہ اور اس کا ٹھکانا معلوم کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ اگر کسی جانور کی موجودگی کا علم ہو پھر وہ کتنا ہی مکار اور پھرتیلا ہو، اسے مارنا آسان ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

ہم نے تمام ضروری انتظامات کر لیے۔ ایک مسطح میدان میں کیمپ لگایا گیا۔ آخر میں جھیل کے قریب ایک درخت کے ساتھ موٹا تازہ کتا باندھ دیا گیا۔ واپسی پر دور تک کتے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ اس لیے ہمیں یقین ہو گیا کہ ان کی آوازوں کو سن کر ضرور کوئی نہ کوئی درندہ کتے کے خون سے اپنی پیاس بجھانے کے لیے آئے گا۔ کتے کی جان کے عوض ہمیں درندے کی نسل، قد کاٹھ اور اس کے ٹھکانے کے کچھ اشارے مل سکتے تھے۔ دوسری بات یہ کہ اکثر درندے اپنے بچے کھچے شکار کو ایک نظر دیکھنے اور چکھنے کے لیے اگلی رات ضرور چکر لگاتے ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو ہمیں درندے کو تلاش کرنے کی زحمت بھی نہیں اٹھانی پڑے گی۔

اگلی صبح میں دو بھیلوں کے ساتھ جھیل کے قریب اس جگہ پہنچا۔ مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ہمارا اندازہ درست نکلا ہے۔ کتا واقعی کسی درندے کا شکار ہو چکا تھا۔ اس کی اُدھڑی ہوئی لاش درخت سے کچھ فاصلے پر پڑی تھی۔ درندے نے اسے گھسیٹ کر جھلسی ہوئی جھاڑیوں میں چھپانے کی کوشش کی تھی لیکن رسّی کی وجہ سے وہ اس میں ناکام رہا تھا جو کتے کے گلے میں تھی جس کا دوسرا سرا درخت کے تنے سے بندھا ہوا تھا۔

کتے کی لاش کے اردگرد درندے کے پنجوں کے واضح نشان موجود تھے۔ ان کا جائزہ لے کر بھیل شکاریوں نے مشترکہ فیصلہ دیا کہ یہ کسی خونخوار چیتے کے پنجوں کے نشان ہیں۔ اپنی اس کھوج پر قبائلی سخت پریشان اور خوف زدہ دکھائی دیتے تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ چیتے کو "موت کا دیوتا" سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق چیتے کا شکار کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔

اصل بات یہ تھی کہ چیتے اکثر بھیل باشندوں کو اپنی خونریز شرارتوں کا نشانہ بناتے رہتے تھے جبکہ بھیل اپنے روایتی ہتھیار تیر کمان سے اس برق رفتار درندے کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنی توہم پرستی کے باعث چیتے کو "موت کا دیوتا" تسلیم کر لیا تھا۔ اس بات سے مجھے بھی اختلاف نہیں کہ چیتا، شیر سمیت دیگر تمام درندوں سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ بہت کم دیکھا گیا ہے کہ کسی شیر نے بلاوجہ کسی انسان پر حملہ کیا ہو۔ آدم خور کے علاوہ عام شیر انسانوں سے کتراتا ہے اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی انسان سے سامنا نہ ہو۔

چیتا آدم خور ہو یا نہ ہو۔ وہ اکثر شرارتاً ہی انسان پر حملہ کر دیتا ہے۔ اس کی پھرتی اور چالاکی کا مقابلہ کرنا کسی عام انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ چیتا اس لیے بھی بہت زیادہ خطرناک ہوتا ہے کہ وہ پھرتیلے وجود کے ساتھ طاقتور گرفت رکھنے والے پنجوں کی مدد سے بڑی آسانی سے بلند درختوں پر چڑھ جاتا ہے۔ اس لیے جنگل میں چیتے سے اپنے آپ کو بچانا عام انسان کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے۔

یہ میرے لیے چیتے کو شکار کرنے کا پہلا موقع تھا۔ اس لیے میں بھی کچھ Concious تھا۔ لیکن میں نے اپنا معمولی سا بھی خوف پہلے ہی سے ڈرے ہوئے بھیلوں کے سامنے ظاہر نہیں ہونے دیا بلکہ میں انہیں یہ کہہ کر حوصلہ دیتا رہا۔ "دنیا کا سب سے خطرناک جاندار خود انسان ہے۔"

میرے خیالات ان کے لیے بالکل ناقابلِ فہم تھے لیکن ان کے دل میں میرا جو احترام پیدا ہو چکا تھا اس کے سبب انہوں نے میری کسی بات سے اختلاف نہیں کیا۔ البتہ یہ میرے لیے بڑی حیران کن بات تھی کہ وہ جنگلی جانوروں کے درمیان رہنے کے باوجود چیتے سے خوف زدہ رہتے ہیں۔

میں نے اپنی نگرانی میں کتے کی لاش کے قریب موجود ایک بلند اور مضبوط درخت پر مچان بندھوا دیا۔ پھر ہم سب لوگ واپس کیمپ میں آ گئے۔

اس دن شام کو کھانا کھا کر دو ماہر بھیل شکاریوں سمیت سورج غروب ہونے سے پہلے ہی میں مچان پر جا بیٹھا تھا۔ وہاں سورج غروب ہوتے ہی ایکدم تاریکی چھا جاتی تھی۔ کیونکہ چاروں طرف پہاڑیاں تھیں۔ ان کے عقب میں جاتے ہی سورج کی کرنیں بالکل ختم ہو جاتی تھیں اور دیکھتے

نیوگنی بحرالکاہل میں واقع وہ واحد جزیرہ ہے جہاں ایک ہزار کے لگ بھگ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان زبانوں میں سے آدھی زبانیں صرف ایک ہزار لوگ ہی بولتے ہیں۔ مطلب یہ کہ وہاں صرف دو افراد ایسی زبانیں بولتے مل سکتے ہیں جو دنیا میں نہ تو کوئی بول سکتا ہو اور نہ سمجھ۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ آج نیوگنی میں ہزاروں سال پُرانی زبان بولنے والا بھی مل جائے۔

اقتباس: سمندر گرد از طارق عزیز خان

مرسلہ: ایمن سلطانہ، مظفر گڑھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہی دیکھتے رات اتر آتی تھی۔ اس شام بھی یکدم گھپ اندھیرا ہوگیا تھا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے سورج کا فیوز اڑ جانے کی وجہ سے ہر جانب بلیک آؤٹ ہوگیا ہے۔

نصف گھنٹے کے بعد ہی فلک پر چاند کا روشن چہرہ نمودار ہوا اور اس کی مدھم روشنی سے سارا جنگل سنہری دکھائی دینے لگا۔ طویل عرصے سے بارش نہ ہونے کے سبب جہاں جانوروں کی جان نکلی جارہی تھی، وہیں ٹہنیوں سے پتے جھڑ کر گھنے درخت ٹنڈ منڈ ہوگئے تھے۔ اس لیے ہم بلند درخت پر بیٹھے جنگل میں دور تک دیکھ سکتے تھے جس درخت پر ہم مچان بندھوا کر بیٹھے تھے، اس پر اب بھی کافی پیلے پتے لگے ہوئے تھے۔ اس کی ٹیڑھی میڑھی ٹہنیاں ہمارے گرد اس طرح پھیلی ہوئی تھیں کہ درندے کے لیے ہمیں دیکھنا اور ہم پر حملہ کرنا آسان نہیں تھا۔

چاند رفتہ رفتہ بلند ہورہا تھا اور ہر جانب دودھیائی چاندنی پھیلتی جارہی تھی۔ جو چیزیں اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اب ان کی دھندلی شکلیں دکھائی دینے لگی تھیں۔ ہمارے بالکل سامنے وہ خوبصورت جھیل تھی جو اب دلدل اور لمبی گھاس سے بھری ایک کھڈے کا نظارہ پیش کررہی تھی لیکن اس کے درمیان میں پانی کی کچھ مقدار موجود تھی اور یہ مقدار کافی تھی۔ اندازہ تھا کہ خشک سالی کے دن گزارنے کے لیے یہ پانی جنگلی جانوروں کے لیے کافی سودمند ثابت ہوگا۔ اس لیے اس کا گدلا پانی جانوروں کے لیے بڑی قیمتی اور نایاب چیز بن گیا تھا۔

عام دنوں میں جنگل کے معروف اصول کے مطابق ہر نسل کا جانور ایک باہم خاموش معاہدے پر عمل کرتے ہوئے اپنی ٹولی کے ساتھ ایک خاص وقت پر ہی آکر جھیل سے پانی پیتا تھا۔ اس وقت دوسرے جانور اسے تنگ نہیں کرتے تھے لیکن ان قحط کے دنوں میں بھی جنگلی ڈسپلن دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی۔ سب سے پہلے مور کی ایک ڈار کلغیاں ہلاتی اور پر پھیلاتی اس خشک ہوتی ہوئی جھیل پر اتری۔ سب نے رک رک کر بڑے آرام سے پانی پیا اور پھر ہمارے سروں پر سے اڑتے ہوئے اندھیرے میں غائب ہوگئے۔ ان کے اڑتے ہی ایک جانب سے ہرن چھلانگیں مارتے ہوئے اور ایک دوسرے سے اٹکھیلیاں کرتے نمودار ہوئے۔ انہوں نے بھی جلدی جلدی پیاس بجھا کر اپنی راہ لی۔ ان کے بعد نیل گائے کا پورا ریوڑ ادھر ادھر گھاس پر منہ مارتا جھیل میں داخل ہوگیا۔ انہوں نے پانی میں اتر کر اپنے جسے بھی ٹھنڈے کیے اور پانی پی کر روانہ ہوگئے۔

اس طرح دیگر بے شمار جنگلی جانور اپنی اپنی ٹولیوں کے ساتھ باری باری وہاں آتے رہے۔ ان کے درمیان کچھ گیدڑ، سور اور اودبلاؤ جیسے اوچھے اور پلیت جانور اکیلے آکر اپنی پیاس بجھاتے رہے۔ میں نے سب سے آخر میں بندروں کی ایک ٹولی کو چیختے چلاتے، اچھلتے کودتے ہوئے آتے دیکھا۔ عام دنوں میں بندر ہر روز جھیل پر پانی پینے کے لیے نہیں آتے کیونکہ وہ ایسے جنگلی پھل کھاتے ہیں جن میں کافی پانی موجود ہوتا ہے۔ اس لیے انہیں پانی پینے کی زیادہ ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن اس شدید گرمی نے جنگل کے تمام پھلوں کو بھی ''خشک میوے'' کی شکل دے دی تھی۔ اس لیے بندروں کو بھی پانی میں سے اپنا حصہ حاصل کرنے کے لیے باقاعدگی سے جھیل پر آنا پڑتا تھا۔

بندر ایک انتہائی سیانا اور عقل مند جانور ہے۔ وہ جنگل میں اس طرح گروپ بندی کرکے رہتا ہے کہ کسی خطرناک درندے کو بھی حملہ کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اس رات بھی ہم نے یہ خوبصورت منظر دیکھا۔ سارے بندر تو بڑے مزے سے بے فکر ہوکر پانی پی رہے تھے۔ لیکن دو بڑے اور لیڈر ٹائپ کے بندر ان کے اردگرد چھلانگیں مارتے، گردن اٹھاتے گہری نظروں سے ہر طرف دیکھتے رہے۔ جب دوسرے سب بندروں نے پانی پی لیا تو پھر انہوں نے خود پانی کی طرف رخ کیا۔ پیاس بجھا کر تمام بندر چیختے چلاتے اور اچھلتے کودتے جنگل میں غائب ہوگئے۔ بندروں کی چیخیں اس قدر تیز ہوتی ہیں کہ تیر کی طرح سماعت سے ٹکراتی ہیں۔

اچانک دور سے آنے والی بندروں کی چیخ وپکار کا شور تھم گیا۔ ہر طرف موجود راہگیر جانوروں کو بھی چپ لگ گئی۔ جیسے انہوں نے موت کا فرشتہ دیکھ لیا ہو۔ اس گمبھیر خاموشی میں ایک دوسرے کی سانسوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ یقیناً جنگل کا یہ سناٹا درندے کی آمد کی نوید دے رہا تھا۔ ہم سنبھل کر بیٹھ گئے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد درختوں کی اوٹ سے مچھلی کی طرح پھسل کر باہر آتا ہوا ایک صحت مند اور خوبصورت چیتا صاف نظر آگیا۔ میرے ساتھ بیٹھا ہوا ایک قبائلی اس طرح تڑپا جیسے اسے گولی لگ گئی ہو۔ اگر میں لپک کر اس کے منہ پر مضبوطی سے ہاتھ نہ رکھ دیتا اور دوسرے بھیل نے اسے اپنی گرفت میں لے کر پکڑ نہ لیا ہوتا تو شاید وہ چیخ مار کر درخت سے کود جاتا اور بے موت مارا جاتا۔ موت کے اس خوبصورت دیوتا کو دیکھ کر اس کی جان نکلی جارہی تھی۔

(بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ کریں)

WWW.PAKSOCIETY.COM

سیریز کلر

ابن کبیر

مقصد حیات کا تعاقب سہل نہیں ہوتا۔ اس راہ میں کئی مسافر لڑکھڑا جاتے ہیں، ہانپنے لگتے ہیں کہ اکثر ارادوں کو حقیقت کا روپ اختیار کرنے میں برسوں لگ جاتے ہیں۔ کامرانی فقط ان خوش نصیبوں کے قدم چومتی ہے، جو قوت ارادی کے سہارے، کامل یقین کے ساتھ آگے بڑھتے رہتے ہیں، چلتے رہتے ہیں، چاہے برسوں بیت جائیں اور آخرکار منزل پا لیتے ہیں۔ ڈیوڈ جارج کا شمار بھی ان کمیاب انسانوں کی صف میں ہوتا ہے، جس نے 20 برس کے طویل، اذیت ناک انتظار کے بعد بالآخر اس درندے کو پکڑ ہی لیا، جس کی بربریت نے ''سیاٹل'' شہر کو خوف میں مبتلا کر رکھا تھا۔

61 سالہ ڈیوڈ کو آج واشنگٹن میں ہیرو کا درجہ حاصل ہے، وہ ری پبلکن پارٹی سے منسلک ہے اور ملکی سطح پر اپنی ریاست کی نمائندگی کر رہا ہے۔ 1950ء میں پیدا ہونے والا ڈیوڈ طویل عرصے تک کنگ کائونٹی پولیس ڈیپارٹمنٹ سے وابستہ رہا اور 2005ء میں شیرف کی حیثیت سے ریٹائر ہوا۔ اسے کئی اعزازات سے نوازا گیا، جس کا وہ حقدار تھا، کیونکہ اس نے کٹھن انتظار کے بعد 70 سے زائد قتل کرنے والے اس درندے کو ڈھونڈ نکالا جس کی ہیبت نے لوگوں کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔

''ایک پاگل بھکاری گزشتہ کئی ماہ سے شہر کی سڑکوں پر راہ گیروں کو زخمی کر رہا ہے، ڈیوڈ چھٹی پر ہے، میں چاہتا ہوں، تم اس کیس پر کام کرو!'' شیرف نے ایک فائل میسن جونز کی میز پر پھینکتے ہوئے کہا۔

''بھکاری؟'' لہجے میں حیرت تھی۔ ''ایک بدحال شخص لوگوں کا بھلا کیا نقصان پہنچا سکتا ہے؟'' اس نے اپنے سنہری گھنگریالے بال ماتھے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

''یہی تو معلوم کرنا ہے، چند شکایات ملی ہیں۔ لوگوں کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہنا ہے کہ وہ ان کے سامنے آن کھڑا ہوتا ہے، مدد کی درخواست کرتا ہے اور جب لوگ انکار کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں تو وہ پیچھے سے ان پر وار کر دیتا ہے۔'' شیرف نے گال کھجاتے ہوئے بیزاری سے کہا۔ ''غالباً وہ چھوٹے نوکیلے پتھر کو بہ طور اوزار استعمال کرتا ہے جسے اس نے مٹھی میں چُھپا رکھا ہوتا ہے۔''

''عجیب ہے۔ خیر، میں اس کیس پر کام شروع کر دیتی ہوں۔'' اس نے فائل کے ورق پلٹتے ہوئے کہا۔

میسن تین ہفتے تک اُس بھکاری کی تلاش میں سیاٹل کی تاریک گلیاں کھنگالتی رہی لیکن اُس کا سامنا کسی مخبوط الحواس شخص سے نہیں ہوا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ اس عرصے میں کوئی شکایت بھی سامنے نہیں آئی۔

اسی دوران ڈیوڈ تفریحی سفر سے لوٹ آیا۔ اس نے اس کیس کو ''احمقانہ'' قرار دیتے ہوئے یہ ریمارکس لکھ کر فائل شیرف کو لوٹا دی کہ ''وہ بدحال بدمعاش شہر چھوڑ چکا ہے!''

☆☆☆

15 جولائی 1982:

ڈیوڈ اپنی کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ گزشتہ دنوں ایک جنونی شخص کو گرفتار کرنے کی کوشش میں وہ چاقو کے وار سے زخمی ہو گیا تھا جس کے بعد شیرف نے اُس کی مہم جُو طبیعت کو اعتدال پر لانے کے لیے اُسے عوامی شکایت سننے کی ذمّے داری سونپ دی۔

ڈیوڈ خوش نہیں تھا، وہ حقیقی زندگی میں ملزمان کا تعاقب کرنا چاہتا تھا، سو اب وہ بیزاری سے ٹیلی فون پر شکایت سُنا کرتا تھا اس وقت بھی وہ کرسی پر بیٹھا بیزاری سے پیر ہلا رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ ڈیوڈ نے ریسیور اُٹھایا۔ اگلے ہی لمحے اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

کچھ دیر بعد اُس کی گاڑی ہینسم ڈیم کے طرف دوڑ رہی تھی جہاں دریا میں تیرتی ہوئی ایک لڑکی کی نیم برہنہ لاش ملی تھی۔ ساتھی سراغ رساں میسن جونز پہلے ہی موقع واردات پر پہنچ گئی تھی۔

ڈیوڈ نے باریک بینی سے اُس حصے کا جائزہ لیا جہاں سے لاش ملی تھی۔ اپنی نگرانی میں تمام شواہد اکٹھے کیے، فوٹو گرافر نے تصاویر اتاریں اور لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دیا۔

اُسی روز لاش کی شناخت 16 سالہ وینڈی کوفیلڈ کی حیثیت سے ہو گئی جو جسم فروشی کے کاروبار سے منسلک تھی۔

ڈیوڈ اور اُس کی ٹیم نے روایتی طریقۂ کار کے مطابق تحقیقات شروع کر دی تاہم سر توڑ کوشش کے باوجود کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ البتہ وہ مایوس نہیں ہوا کیونکہ اِس قسم کے کیس میں عام طور سے خاصا وقت لگ جاتا ہے۔

12 اگست کی دوپہر جب فون بجا ڈیوڈ وینڈی کوفیلڈ ہی کے کیس کا جائزہ لے رہا تھا۔

دوسری طرف میسن تھی جس نے اُسے فوراً دریا کے اُس حصے کی جانب پہنچنے کی ہدایت کی جہاں سے جنگل شروع ہوتا تھا۔

کچھ دیر بعد ڈیوڈ آنکھوں میں پریشانی لیے ایک اور نیم برہنہ لاش کو تک رہا تھا۔ یہ ایک پختہ عمر کی عورت تھی۔ نہ جانے کیوں، ڈیوڈ کو شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ دونوں عورتوں کا قاتل ایک ہی ہے۔

''کچھ گڑبڑ ہے۔'' ڈیوڈ دریا کو گھورتے ہوئے بڑبڑایا۔

''گڑبڑ تو ہے۔'' میسن نے شواہد اکٹھے کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک ماہ کے دوران ہونے والا یہ دوسرا قتل ہے۔''

لاش پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کر دی گئی۔ مقتول کی شناخت مارسور ہیلر کے نام سے ہوئی۔ یہ بھی ایک پیشہ ور عورت تھی جو سیاٹل کے نواحی علاقے کی رہائشی تھی۔ اُسی شام ڈیوڈ، مارسور کی بوڑھی ماں سے ملا۔ اُس سیاہ فام عورت کی آنکھوں میں کرب کا دریا بہہ رہا تھا۔

پوری رات وہ کیس کے مختلف پہلوؤں پر کام کرتا رہا جب بھی اُس کی خوب رو بیوی جولیا آرام کرنے کا مشورہ دیتی وہ مسکرا کر ٹال دیتا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ کیس اُس کے اعصاب پر سوار ہو چکا تھا۔ دوسری جانب عوام میں سراسیمگی پھیل گئی تھی اور اخبارات میں شائع ہونے والی سنسنی خیز خبروں کے ساتھ عدم تحفظ کے احساس میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

15 اگست:

آج چھٹی کا دن تھا۔ ڈیوڈ گھر ہی پر تھا۔ اچانک فون بجنے لگا۔ جو اطلاع اُسے ملی، اُس نے ڈیوڈ کو متحرک کر دیا۔ کچھ دیر بعد پولیس کار اُس کے گھر کے سامنے آن کر رکی۔

''مجھے جانا ہوگا۔'' ڈیوڈ نے اپنی بیوی سے کہا جس کے چہرے سے ناگواری عیاں تھی۔

''دو مزید لاشیں ملی ہیں!'' میسن نے ڈیوڈ سے کہا جو دروازہ کھول کر کار میں بیٹھ چکا تھا۔

''کہاں؟'' ڈیوڈ نے سوال کیا۔ میسن کی نیلی آنکھوں

میں خاموشی تیر رہی تھی۔

''گرین ریور...''

دونوں لاشوں کو دوپہر میں ایک ماہی گیر نے دیکھا تھا وہ خاصا گھبرایا ہوا تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ آج کشتی لے کر مچھلی کے شکار کے لیے نکلا تھا، واپسی میں اُسے دریا کے کنارے ایک شخص دکھائی دیا جو اگلے ہی پَل جنگل میں غائب ہو گیا۔ جب کشتی کنارے تک پہنچی، پانی کے اوپر تیرتی جھاڑیوں میں سے اچانک لاش کا چہرہ ظاہر ہوا، اسے دیکھتے ہی اُس کے اوسان خطا ہو گئے۔ ابھی وہ اپنا سانس بحال کرنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ اُس کا سامنا ایک اور نیم برہنہ لاش سے ہو گیا۔

''اُس شخص کا حلیہ بتا سکتے ہو؟'' ڈیوڈ نے سوال کیا۔

''وہ ٹرک ڈرائیور معلوم ہوتا تھا۔'' ماہی گیر نے تھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔ ''بدقسمتی سے میں چہرہ نہیں دیکھ سکا۔''

''یہ سب ہیبت ناک ہے۔'' میسن نے دھیرے سے کہا۔ ڈیوڈ دریا پر نظریں گاڑے کھڑا تھا جس کا ساکن پانی گزشتہ چند دنوں میں چار لاشیں اُگل چکا تھا۔

''ہاں!'' اُس نے دھیرے سے کہا۔

☆☆☆

رات کا وقت تھا۔ سڑکوں پر روشنی بکھری تھی۔ کئی حسین لڑکیاں، مختصر لباس میں گاہکوں کے انتظار میں سڑک کے کنارے کھڑی تھیں۔ اُن میں ہر رنگ، ہر عمر کی عورتیں تھیں۔ کسی کی عمر پندرہ برس تو کسی کی پینتیس برس! کوئی پتلی دبلی تو کوئی فربہ! ایک دو حاملہ خواتین بھی ٹہل رہی تھیں۔

وہ وقفے وقفے سے سڑک پر دوڑتی گاڑیوں کو اشارہ کرتی رہیں۔ اگر کوئی گاڑی رک جاتی تو کھڑکی پر جھک کر معاوضہ طے کرتیں اور گاڑی میں بیٹھ جاتیں۔ یہ سیاٹل کے مشہور ''اسٹرپ کلب'' کا بیرونی منظر تھا جو جسم فروش خواتین کا مرکز تصور کیا جاتا تھا۔

یہاں کئی بھکاری بھی گھوم رہے تھے جو ان پیشہ ور عورتوں میں ہمدردی کے جذبات جگا کر کے چند سکے حاصل کرنے کی کوشش میں رات بھر سڑکوں کی خاک چھانتے تھے۔

اِسی اثناء میں روشنیوں کو چیرتا ہوا ایک چھوٹا پک اپ ٹرک سڑک کے کنارے آکر رکا۔ ایک انتہائی کم عمر لڑکی جو بہ مشکل پندرہ برس کی ہوگی، اُس میں سوار ہو گئی۔

یہ کوئی انوکھا منظر نہیں تھا۔ امریکا میں اس قسم کے لاتعداد اسٹرپ کلبس ہیں، تاہم سیاٹل میں حالات تیزی سے گزر رہے تھے۔

ڈیوڈ جارج نے اپنی طویل جدوجہد اور اِس پیچیدہ کیس کو Chasing the Devil نامی کتاب میں تفصیل سے بیان کیا۔ 2004ء میں شائع ہونے والی اِس دستاویز کو ملزمان کا تعاقب کرنے والوں کے لیے درسی کتاب کا درجہ حاصل ہے کہ اِس کا ہر ورق اُنہیں مشکلات کا مقابلہ کرنے اور مایوسی سے نبرد آزما ہونے کا درس دیتا ہے۔ اس کتاب کو سیکڑوں تحریروں، درجنوں کہانیوں کا موضوع بنایا گیا، نیشنل جیوگرافک اور ڈسکوری جیسے چینلز نے اِس پر دستاویزی پروگرام پیش کیے۔ ساتھ ہی اِسے ایک ٹیلی فلم The Green River Killer کی صورت بھی پیش کیا گیا۔

☆☆☆

ایک اور نیم برہنہ لاش! تاہم اِس بار لاش جنگل میں ملی تھی، لاش پر صبح ہی صبح ایک لکڑہارے کی نظر پڑی تھی۔

اُس کی شناخت اوپل میلز کی حیثیت سے ہوئی۔ عمر فقط پندرہ برس تھی۔ وہ کچھ ماہ قبل گھر سے بھاگ گئی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ مردہ خانے میں تھے۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر پوسٹ مارٹم کے بعد ڈیوڈ کو ابتدائی معلومات فراہم کر رہا تھا۔

پوسٹ مارٹم سے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ پانچوں عورتوں کو گلا گھونٹ کر قتل کیا گیا تھا۔ رپورٹ کے مطابق قتل کرنے سے قبل قاتل نے اُن کے ساتھ رات بسر کی تھی۔ لاشوں پر کسی زخم کا نشان نہیں تھا۔ یہاں تک کہ ناخنوں کی خراشیں بھی نہیں۔

''یعنی کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی گئی، یا شاید اُنہیں موقع ہی نہیں ملا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''کیا قاتل ایک ہی شخص ہے؟'' ڈیوڈ نے سوال کیا۔

''شاید!'' ڈاکٹر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''ممکن ہے کہ یہ دو افراد پر مشتمل گروہ ہو۔ پوسٹ مارٹم کے مطابق یہ عصمت دری کا کیس نہیں، تمام لڑکیاں پیشہ ور تھیں اور اُنہیں تقریباً یکساں انداز میں قتل کیا گیا۔''

پانچ لاشیں ملنے کے بعد پورا پولیس محکمہ متحرک ہو گیا۔ ایف بی آئی واشنگٹن آفس سے بھی رابطہ کیا گیا جس سے منسلک آفیسر آرنلڈ کو اعلیٰ حکام نے ڈیوڈ کی مدد کرنے کی ذمّے داری سونپی۔

دونوں افسران کا ٹیلی فونک رابطہ تھا۔ آرنلڈ نے اپنے تجربے کی بنیاد پر یہ خیال ظاہر کیا کہ قاتل کوئی دراز قد، مضبوط

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جسم کا آدمی ہے۔ قوی امکان ہے کہ وہ بے روزگار اور غیر شادی شدہ ہو۔

''اُس کی زندگی انتہائی پُراسرار ہوگی، پڑوسی اُس کی سرگرمیوں سے یکسر لاعلم ہوں گے، تمہیں ایسا ایک مشکوک شخص تلاش کرنا ہوگا۔'' آرنلڈ نے کہا اور فون بند کردیا۔

☆☆☆

''ہیلو، پولیس اسٹیشن... میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں، میں جانتا ہوں کہ گرین ریور کلر کون ہے؟'' 8 ستمبر کی شام جونہی یہ ٹیلی فون کال موصول ہوئی پولیس ہیڈکوارٹر میں کھلبلی مچ گئی۔

''اُس سے کہو، سیدھا پولیس ہیڈکوارٹر چلا آئے۔'' ڈیوڈ نے ٹیلی فون ریسو کرنے والے آفیسر کو ہدایت کی۔

کچھ دیر بعد جیب ڈیلز نامی ٹیکسی ڈرائیور ڈیوڈ کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ مضبوط جسم کا مالک ایک چالیس سالہ شخص تھا۔

''کیا تم جانتے ہو کہ گرین ریور کلر کون ہے؟'' ڈیوڈ نے سوال کیا۔

''ہاں میں نے اندازہ لگایا ہے، وہ... آفیسر کیا ایک کپ کافی مل سکتی ہے؟'' اُس نے انگلیوں سے ٹیبل بجاتے ہوئے کہا۔

''ضرور!'' ڈیوڈ نے جونیر آفیسر کو اشارہ کیا۔ چند لمحوں بعد جیب کافی کے گھونٹ لے رہا تھا۔

''وہ بھی میری طرح ایک ٹیکسی ڈرائیور ہے، اُس کا نام جو ہے۔ میں اُسے جانتا ہوں۔''

''اوہ، مجھے لگا، تم کہو گے، وہ ایک مخبوط الحواس بھکاری ہے، لیکن تم ایک ٹیکسی ڈرائیور کا ذکر کر رہے ہو۔'' ڈیوڈ کے ساتھ بیٹھی میسن مسکرائی۔ ''تو کیا تمہیں یقین ہے؟''

''یقین...'' وہ چھت کو گھورنے لگا۔ پھر سر جھٹک کر میسن کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''خاتون، وہ لڑکیوں کو قتل کر رہا ہے۔ وہ مذہبی جنونی ہے، یہ انسانی قربانیوں کا معاملہ ہے۔ اُسے فوراً پکڑلو۔''

ڈیوڈ اور میسن نے جیب سے کئی سوالات کیے، پھر جونیر آفیسر فیری کو اُس کا بیان قلم بند کرنے کی ذمّے داری سونپ کر کمرے سے باہر آگئے۔

''کیا خیال ہے ڈیوڈ؟'' میسن نے دریافت کیا۔

''بے شک ہمیں جو سے ملنا ہوگا لیکن مجھے یہ شخص بھی ٹھیک نہیں لگتا۔''

''یہ خود بھی نفسیاتی معلوم ہوتا ہے۔'' وہ مسکرائی۔

دوسرے روز ڈیوڈ، جیب ڈیلز کی سابق بیوی سے ملا جس نے اسے عجیب و غریب شخص قرار دیا۔ وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی ایک تیس سالہ عام سی عورت تھی جو ایک بیئر بار میں ویٹر کی حیثیت سے ملازمت کرتی تھی۔

ڈیوڈ سر جھکائے نوٹ بک پر قلم چلا رہا تھا۔ چند ساعت اُس کی بیوی خاموش رہی۔

''دراصل...'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ ''وہ... ہم بستری سے قبل دعائیں پڑھا کرتا تھا۔ اُس کا رویّہ عجیب تھا۔ شادی کے کچھ ہی عرصے بعد اُس نے دیگر عورتوں سے تعلقات قائم کرلیے۔ وہ تشدد پسند بھی تھا، بس... اِسی سبب میں اُس سے الگ ہوگئی۔'' اتنا کہہ کر وہ چپ ہوگئی۔ اُس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

''کیا اُس نے پھر کبھی آپ سے رابطہ کیا؟'' ڈیوڈ نے سوال کیا۔

''ہاں، لیکن میں اب اس پاگل شخص کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔'' اُس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد ڈیوڈ اور میسن شیرف کے سامنے بیٹھے تھے۔

''ہمیں اِس شخص کے خلاف وارنٹ چاہییں؟'' اُس نے شیرف سے کہا۔

''اور اُس شخص کے بارے میں کیا کارروائی کرنے کا ارادہ ہے جس کی بابت جیب نے شک کا اظہار کیا ہے؟'' شیرف نے پوچھا۔

''ہم اسے بھی چیک کریں گے لیکن پہلے ہمیں جیب کا ماضی کھنگالنا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے، اُسے گرفتار کرلو لیکن مجھے نتائج چاہییں۔ پریس بہت شور مچا رہا ہے۔'' شیرف نے کاندھے اُچکائے۔

چند گھنٹوں بعد جیب ڈیلز پولیس کی تحویل میں تھا۔

''تم غلطی کر رہے ہو آفیسر، میں قاتل نہیں ہوں۔'' ڈیوڈ کو دیکھتے ہی اُس نے چیختے ہوئے کہا۔

''جلد پتا چل جائے گا۔'' ڈیوڈ نے جواب دیا۔

پولیس نے اُس کے گھر اور ٹیکسی کی تلاشی لی۔ ٹیکسی کی سیٹ کے نیچے سے اُنہیں دو زنانہ زیر جامے ملے۔ اُس کے اپارٹمنٹ کی دیواروں پر بھی نیم برہنہ تصاویر چسپاں تھیں۔

اُنہوں نے جیب کے گھر سے ملنے والی مشکوک اشیاء کے بارے میں اُس سے کئی سوالات کیے جن کے وہ قابلِ تشفی جواب نہیں دے پایا۔ اب اُنہوں نے پولی گراف (lie detector) مشین کی مدد سے ٹیسٹ لینے کا فیصلہ کیا تاکہ

اُس کے لہجے میں آنے والی تبدیلیوں کی بنیاد پر سچ جھوٹ کا فیصلہ کیا جائے۔

کئی چھوٹے بڑے آلات اُس کے جسم سے لگا دیے گئے، جن سے مجوی رنگین تاریں مشین سے منسلک تھیں۔

نتائج مثبت رہے، مشین نے اس کے ہر جواب میں چھپے ارتعاش کی نشان دہی کردی۔

''پولی گراف مشین اُس کے خلاف گواہی دے رہی ہے۔'' میسن نے کہا۔

''ہاں، لیکن یہ کافی نہیں۔ کورٹ میں اِس ٹیسٹ کی کوئی حیثیت نہیں۔ ہمیں مزید ثبوت تلاش کرنے ہوں گے۔'' ڈیوڈ نے کہا۔

وہ مزید ثبوتوں کی تلاش میں تھا لیکن اخبارات میں یہ خبریں آنے لگیں کہ گرین ریور کلر کو گرفتار کرلیا گیا ہے اور اب وہ پولیس کی تحویل میں ہے۔

میڈیا نے ڈیوڈ سے بھی رابطہ کیا، تاہم اس نے ہر بار یہی کہا کہ ابھی تحقیقات جاری ہیں۔ اُس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ جیب قاتل نہیں ہے۔

یہ نومبر کی ایک سرد صبح تھی۔

ڈیوڈ آنکھوں میں تذبذب لیے اُس ڈھانچے کو تک رہا تھا جو مٹی تلے دبا ہوا تھا۔ اُس وقت وہ دریا سے چند فرلانگ کے فاصلے پر واقع جنگل میں کھڑا تھا جہاں چند گھنٹوں قبل دو نوجوانوں کو مٹی تلے ایک کھوپڑی نظر آئی تھی۔

''لاش کافی پُرانی ہے۔'' میسن نے کہا۔ اُس نے ماسک پہن رکھا تھا اور وہ لاش پر جھکی ہوئی تھی۔

''ہاں!'' ڈیوڈ نے گہرا سانس سینے میں اُتارا۔ ''غالباً اِسے جولائی یا اگست میں قتل کیا گیا ہے۔'' اُس کی نظریں دریا کے دوسرے کنارے پر کھڑے ایک پھٹے حال شخص پر گڑی تھیں جو بڑی دلچسپی سے پولیس کی کارروائی دیکھ رہا تھا۔

پوسٹ مارٹم کے بعد یہ واضح ہوگیا کہ یہ ایک بائیس سالہ لڑکی لیور میک کی لاش ہے۔

ایک بار پھر گرین ریور کلر کی کہانی اخبارات کا موضوع بن گئی۔ ڈیوڈ کو جیل سے جیب ڈیلز کا پیغام موصول ہوا جس میں اُسے یقین دلانے کی کوشش کی گئی تھی کہ وہ قاتل نہیں۔ جیب نے یہ خدشا بھی ظاہر کیا کہ آنے والوں دنوں میں مزید لاشیں ملیں گی۔

اُس کا خدشا درست ثابت ہوا۔ تین روز بعد ہائی وے کے نزدیک پولیس کو ایک لڑکی کی نیم برہنہ لاش ملی۔

اِس واقعے نے سنسنی پھیلا دی۔ حکومت کی کارکردگی پر انگلیاں اُٹھنے لگیں جس کے پیشِ نظر پولیس نے تحقیقات کا دائرہ وسیع کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اب لاپتا لڑکیوں کے کیس کا بھی نئے پہلوؤں سے جائزہ لیا جا رہا تھا۔

اکتوبر کے اواخر تک پولیس کو کل چھے لاشیں مل چکی تھیں، جب کہ آٹھ لڑکیوں کی گمشدگی کی اطلاع تھی۔

☆☆☆

میسن کی ڈائری سے ایک ورق: 4 اکتوبر بہ روز منگل

''میری گرل فرینڈ لاپتا ہے، مجھے یقین ہے کہ وہ گرین ریور کلر کا شکار بن گئی ہے!''

یہ وہ جملہ تھا، جسے سننے کی آج صبح میں قطعی توقع نہیں کر رہی تھی، لیکن یہ میری سماعتوں سے ٹکرایا۔ میرے سامنے ایک نوجوان کھڑا تھا جس کی آنکھوں سے غصہ جھلک رہا تھا۔

''تفصیلات بتانا پسند کرو گے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، 30 نومبر کی رات ہمارا جھگڑا ہوا تھا۔ ہم اس وقت بل ہول ڈانس کلب کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ مجھ سے بہت ناراض تھی، اس نے پاس سے گزرتے ایک سبز رنگ کے ٹرک کو اشارہ کیا، اس میں سوار ہوئی اور وہاں سے چلی گئی۔ گزشتہ چار روز سے وہ نہیں لوٹی، شاید وہ مر چکی ہے۔'' اُس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

''یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنی مرضی سے تمہیں چھوڑ کر چلی گئی ہو۔'' میں نے ایک روایتی سرکاری سراغ رساں کے لہجے میں اپنا خیال ظاہر کیا۔

''ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں آفیسر۔ وہ مجھ سے ناراض ضرور تھی لیکن اس طرح غائب ہو جانا... یہ بہت عجیب ہے۔'' وہ چند ساعت خاموش رہا۔ پھر بولا۔ ''میں نے یہ چار دن اسے تلاش کرنے میں صرف کیے، تاہم کوئی سراغ نہیں ملا۔ البتہ میں نے جنوبی علاقے میں ایک گھر کے باہر بالکل ویسا ہی ٹرک کھڑا دیکھا ہے جس میں وہ سوار ہوئی تھی۔''

''ہم دیکھتے ہیں کہ اِس سلسلے میں کیا ہوسکتا ہے۔ تم اپنا ایڈریس اور رابطہ نمبر مجھے نوٹ کروا دو۔'' اب میرے ہاتھ میں قلم تھا، گو کہ میں نے اپنا لہجہ کسی بھی تاثر سے عاری رکھا لیکن میرا دل جانتا تھا کہ میں اُس لاپتا لڑکی کے لیے پریشانی محسوس کر رہی تھی۔ میں نے اس ضمن میں ڈیوڈ کو مطلع کردیا۔

☆☆☆

نوجوان کی میسن سے ملاقات کے ٹھیک تین گھنٹے بعد پولیس کار سیاٹل کے جنوبی علاقے کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اُس وقت تک شک کی بنیاد پر گرفتار کیے جانے والے جیب

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ڈیلز کو رہا کیا جا چکا تھا۔

کچھ دیر بعد کار اس مکان کے سامنے جا کر رکی جس کا پتا اُس نوجوان نے بتایا تھا۔ ڈیوڈ اور جونیر آفیسر فیری کار سے اترے۔

پارکنگ ایریا میں ایک سرمئی رنگ کا پک اپ ٹرک کھڑا تھا۔ ایک پستہ قد آدمی لان میں پودوں کو پانی دے رہا تھا۔

''ہیلو سر، میں پولیس آفیسر فیری ہوں، کیا میں کچھ سوال کرسکتا ہوں؟''

''ضرور کیوں نہیں، مجھے گیری کہتے ہیں۔ گیری رج وے۔'' اُس شخص نے قمیص کی آستینیں نیچے کرتے ہوئے پانی کا پائپ ایک جانب رکھ دیا۔

''30 نومبر کی رات آپ کہاں تھے؟''

''میں... میں اپنے گھر ہی میں تھا۔'' اُس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''کیا کوئی گواہی دے سکتا ہے؟'' فیری نے سوال کیا۔ ڈیوڈ اس عرصے میں اردگرد کا جائزہ لیتا رہا۔

''ہاں میرا آٹھ سالہ بیٹا۔ کیا آپ اُس کا بیان لینا چاہیں گے؟'' اُس نے سوال کیا۔

''نہیں فی الحال ضرورت نہیں۔ ممکن ہے کہ پولیس آپ سے بعد میں رابطہ کرے۔''

''ضرور!'' اُس نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

نئے سال کے ابتدائی چند ماہ خاموشی رہی۔ لاشیں ملنے کا سلسلہ تقریباً تھم گیا تھا۔ اخبارات میں بھی قتل کی ان وارداتوں کا ذکر گھٹنے لگا، یہاں تک کہ سیاٹل کے آسمان پر 8 مئی کا سورج طلوع ہوا اور گرین ریور کے اردگرد بسنے والوں میں ایک بار پھر کھلبلی مچ گئی۔

علی الصباح دریا کے کنارے پولیس کو ایک لاش ملی۔ یہ بھی قتل کی واردات تھی۔ مرنے والی بائیس سالہ لڑکی تھی جسے گلا گھونٹ کر قتل کیا گیا تھا لیکن پریشان کن بات یہ تھی کہ اُس کے سینے پر بڑے ہی پُراسرار انداز میں دو مچھلیاں رکھی ہوئی تھیں اور ایک ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی۔

ڈیوڈ آنکھوں میں اضطراب لیے اس لاش کو تک رہا تھا اور تبھی اُسے دور درختوں کے جھنڈ میں کچھ ہلچل نظر آئی۔ اس نے غور سے دیکھا، وہاں ایک شخص کھڑا تھا جسے غالباً ڈیوڈ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔

اس نے..... فیری کو اس سے پوچھ گچھ کے لیے روانہ کیا۔ چند منٹوں بعد وہ لوٹ آیا۔ ''سر وہ شخص ایک مخبوط الحواس، لنگڑا بھکاری ہے!''

''ہوں!'' ڈیوڈ نے دھیرے سے کہا۔

جُونہی یہ خبر ٹی وی چینلز پر نشر ہوئی، عوام میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

''میں نے ایف بی آئی کو اس معاملے میں شامل کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔'' شیرف نے اسے مخاطب کیا۔

''مگر...'' وہ احتجاج کرنا چاہتا تھا، تاہم شیرف نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''دیکھو، تم قابل آدمی ہو، لیکن حالات قابو سے باہر ہوگئے ہیں، پولیس محکمے کی بہت سبکی ہوچکی ہے، بہتر ہے کہ اب ایف بی آئی اسے دیکھے۔ میں آرنلڈ سے بات کرچکا ہوں، وہ جلد تم سے رابطہ کرے گا۔''

''ٹھیک ہے، جو آپ بہتر سمجھیں۔'' ڈیوڈ کے لہجے سے بیزاری عیاں تھی۔ دراصل اُسے شیرف کے فیصلے سے مایوسی ہوئی تھی۔ واضح تھا کہ اب اسے ڈیوڈ پر اعتبار نہیں۔

پریشانی کا ایک سبب آرنلڈ بھی تھا۔ بے شک وہ قابل آفیسر تھا لیکن اُس میں تکبر بہت تھا جس کی وجہ سے ڈیوڈ اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ اسی اثنا میں ایک جونیر آفیسر کمرے میں داخل ہوا اور ڈیوڈ کو بتایا کہ اُس کے لیے فون ہے۔

''ہیلو۔'' اُس نے ریسیور کان سے لگایا۔

''ہیلو مسٹر ڈیوڈ...'' ایک لڑکھڑاتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''میں جیب ڈیلز بول رہا ہوں، میں نے کہا تھا ناں یہ مذہبی قربانی کا معاملہ ہے۔ یہ شخص جنونی ہے، تمھیں میری مدد درکار ہوگی۔''

دوسرے روز ڈیوڈ ایک ریسٹورنٹ میں جیب سے ملا جو اُسے مذہب کی بنیاد پر دی جانے والی انسانی قربانیوں کی اُکتاہٹ سے بھرپور تفصیلات فراہم کرتا رہا۔ گھر آتے ہوئے وہ لائبریری سے اِس موضوع پر چند کتابیں ساتھ لے آیا۔ وہ رات کیس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے گزری۔

☆☆☆

میسن کی ڈائری سے ایک ورق: 12 مئی بہ روز ہفتہ

آج گرینڈا نامی ایک لڑکی پولیس اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ وہ مجھ سے ملاقات کرنے کی خواہاں تھی۔ وہ ایک پیشہ ور تھی اور گرین ریور کلر کے تعلق سے گفتگو کرنا چاہتی تھی۔ میں سراپا کان بن گئی تاکہ اُسے کامل توجہ سے سن سکوں۔

اس نے بتایا کہ ایک ٹیکسی ڈرائیور نے کل رات ہم بستری کے بعد اُسے تشدد کا نشانہ بنایا اور وہ بہ مشکل اپنی جان بچا کر اُس کے اپارٹمنٹ سے فرار ہوئی۔

''کیا تم اسے پہچان سکتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل، وہ انتہائی موٹا شخص تھا، مجھے اس کا نام تو نہیں معلوم لیکن گھر کا ایڈریس بتا سکتی ہوں۔''

اُس شخص کے اپارٹمنٹ کا ایڈریس سن کر میں چونک اُٹھی کیونکہ یہ جو نامی اُسی شخص کے گھر کا پتا تھا جس کی بابت جیب ڈیلز نے شک کا اظہار کیا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔

''مجھے ڈیوڈ کو مطلع کرنا ہوگا۔'' میں نے خود سے کہا۔

کچھ دیر بعد ڈیوڈ لائن پر تھا۔ میں نے اسے تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

''ہمیں اُسے گرفتار کرنا ہوگا ڈیوڈ، میں شیرف سے بات کرتی ہوں۔'' یہ کہہ کر میں شیرف کے کمرے کی جانب بڑھ گئی، اس یقین کے ساتھ کہ وہ جو کی گرفتاری کے احکامات جاری کردے گا اور ایسا ہی ہوا۔

☆☆☆

اسٹرپ کلب کا بیرونی منظر آج زیادہ روشن نہیں تھا۔ ہر منظر بھیگا ہوا تھا، گزشتہ ایک گھنٹے سے بارش ہو رہی تھی۔ یہ علاقہ جسم فروش خواتین کا مرکز تصور کیا جاتا۔

ان میں ایک حاملہ عورت بھی تھی جس کا نام میری میھن تھا۔ یہ بھی ایک پیشہ ور عورت تھی۔ وہ کافی دیر سے گاہک کی تلاش میں تھی۔ ایسے میں اُسے کچھ فاصلے پر ایک شخص اپنے پک اپ ٹرک کا بونٹ اُٹھائے، اسکرو ڈرائیور ہاتھ میں لیے انجن پر جھکا ہوا نظر آیا۔ وہ اسے آزمانے کا فیصلہ کرکے دھیرے دھیرے اس کی جانب بڑھنے لگی۔

''بارش ہو رہی ہے، کیا تم مجھے لفٹ دے سکتے ہو؟'' وہ چہرے پر پیشہ ور مسکراہٹ سجا کر بولی۔

اس شخص نے پانی سے تر چہرہ اُٹھا کر کہا۔ ''ضرور!'' پھر بونٹ بند کرکے ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ میری میھن دروازہ کھول کر پک اپ میں سوار ہوگئی۔

☆☆☆

میسن کی ڈائری سے ایک ورق: 18 اگست بہ روز منگل

آج میری آنکھوں نے جو منظر دیکھا، اسے شاید میں ساری زندگی نہ بھلا پاؤں!

اب تک ہمیں بارہ عورتوں کی لاشیں ملی تھیں کہ آج صبح ایک اور اضافہ ہوگیا۔ پولیس کو دریا کے کنارے، مٹی میں دبا ہوا ایک ڈھانچا ملا تھا۔ ڈیوڈ اور میں فوراً اُس مقام پر پہنچ گئے جہاں کراہت اور تعفن ہمارے منتظر تھے۔

شواہد اکٹھے کرنے کا عمل مردہ جسم کی سڑاند کی وجہ سے انتہائی دشوار ثابت ہوتا ہے، تاہم ہمیں اپنا کام کرنا تھا۔ دو آفیسر چھوٹے بڑے برش ہاتھ میں تھامے ڈھانچے سے مٹی ہٹانے میں مصروف تھے۔

پہلے ڈھانچے کا سر برآمد ہوا پھر گردن کی ہڈیاں، پسلیوں کا پنجر اور پھر ایک خوفناک منظر ہمارے سامنے تھا۔ ڈھانچے کے پہلو سے ایک انتہائی چھوٹی کھوپڑی برآمد ہوئی تھی۔

''یہ... یہ کیا بلا ہے؟'' ڈیوڈ کے منہ سے نکلا۔

میں جھک کر دونوں ڈھانچوں کا بہ غور جائزہ لینے لگی۔ یک دم خوف کی سرد لہر میری ریڑھ کی ہڈی کو بے جان کر گئی۔ جو کچھ میرے سامنے تھا، وہ ناقابلِ یقین تھا۔ میرے منہ سے فقط اتنا ہی نکلا۔ ''اوہ خدایا، یہ... عورت تو... حاملہ تھی... یہ تو بچے کا ڈھانچا۔''

باقی آفیسر گھبرا کر ڈھانچے سے دُور ہٹ گئے۔ ان کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ میں نے دہشت کے زیرِ نظر اٹھا کر ڈیوڈ کی طرف دیکھا جو اُس لمحے سکتے میں تھا۔

شام تک شناخت ہوگئی، وہ لاش میری میھن نامی ایک پیشہ ور عورت کی تھی۔

☆☆☆

ڈیوڈ کی ناکامیوں نے شیرف کو آگ بگولا کردیا تھا۔

''تم قاتل کو پکڑنے میں ناکام رہے اور مزید اختیارات کا تقاضا کر رہے ہو؟'' شیرف نے دہاڑتے ہوئے کہا۔

''اس شخص کو پکڑنے کے لیے ہمیں سنجیدہ اقدامات کرنے ہوں گے شیرف۔ ہمیں اپنی ٹیم میں ماہرین کا اضافہ کرنا ہوگا۔'' ڈیوڈ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''میں سمجھ نہیں پا رہا کہ تم دوبارہ اُن افراد کو کیوں گرفتار کرنا چاہتے ہو جو بے گناہ ثابت ہوچکے ہیں؟ میرے خیال میں ہمیں ایف بی آئی کو اس میں شامل کرلینا چاہیے۔''

''ایف بی آئی کو اس کیس کے بارے میں کوئی آئیڈیا نہیں۔'' ڈیوڈ کے لہجے میں ناگواری تھی۔

چند ساعت شیرف خاموشی سے اُسے گھورتا رہا۔

''ٹھیک ہے، کرو جو کرنا ہے لیکن مجھے نتیجہ چاہیے۔''

اجازت ملتے ہی ڈیوڈ متحرک ہوگیا۔ اب تک اس معاملے میں تین افراد پر شک ظاہر کیا گیا تھا۔ ایک تو جیب ڈیلز تھا جو ایک ٹیکسی ڈرائیور تھا اور پولی گراف مشین کے ٹیسٹ میں ناکام رہا تھا۔ دوسرا ایک شادی شدہ شخص گیری رج وے تھا، جب کہ تیسرا جو جیکس تھا۔ جو کے حوالے سے ایک لڑکی تشدد کرنے کی شکایت کے ساتھ سامنے آئی تھی۔ اسی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

شخص کی بابت جیب ڈیلز نے شک کا اظہار کیا تھا۔

اگلے ایک ہفتے تک ڈیوڈ ان تینوں افراد کے تعلق سے تفتیش کرتا رہا۔ انہیں عارضی طور پر گرفتار کیا گیا۔ ان کا ڈی این اے اور انگلیوں کے نشانات محفوظ کیے گئے۔ دوبارہ پولی گراف ٹیسٹ ہوا اور جیب ڈیلز ٹیسٹ میں پھر ناکام ہوگیا۔

تفتیش مکمل ہونے تک ہر کوئی یہ سوچنے لگا تھا کہ جیب ہی قاتل ہے، تاہم ڈیوڈ کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ وہ قاتل نہیں۔

اُس روز وہ کئی گھنٹوں تک دفتر میں کام کرتا رہا۔ رات گئے، جب وہ گھر پہنچا۔ دہلیز پر ایک حیرت اس کی منتظر تھی۔

دروازے پر ایک کاغذ چسپاں تھا۔ ”میں تمہیں اور تمہارے خاندان کو ختم کردوں گا!“

ان الفاظ نے اُسے چونکا دیا۔ وہ گھر میں داخل ہوا، تاہم خوش قسمتی سے وہاں کسی گڑبڑ کے آثار نہیں تھے۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ یہ پاگل شخص اُس کے خاندان کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس نے فوراً پولیس ہیڈ کوارٹر کا نمبر ڈائل کیا۔ ”ہیلو میں، سارجنٹ ڈیوڈ بول رہا ہوں۔ مجھے تحریری دھمکی ملی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے خاندان کی حفاظت کے لیے چند پولیس اہل کار میرے گھر کے باہر تعینات کیے جائیں۔“

☆☆☆

فروری 84ء میں ڈیوڈ کو ایک ٹائپ شدہ خط ملا۔ لکھنے والے نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہی گرین ریور کلر ہے۔ پولیس آفس میں کھلبلی مچ گئی۔

یہ خط بے حد پیچیدہ اسلوب میں تھا۔ اس میں مقدس کتابوں میں برتے جانے والے الفاظ کو نئے انداز میں لکھا گیا تھا اور قاتل تک پہنچنے کے لیے عجیب اور بھونڈے اشارے کیے گئے تھے۔

یہ خط ایف بی آئی، واشنگٹن آفس روانہ کر دیا گیا۔ دوسرے روز اُسے آفیسر آرنلڈ کی کال موصول ہوئی۔ ”ڈیوڈ، میرے دوست وہ خط بے کار ہے۔“

”کیا... کیا مطلب، بے کار ہے؟ تحریر شناس کیا کہتے ہیں؟“

”بھول جاؤ، اس میں کچھ خاص بات نہیں۔ یہ صرف گمراہ کرنے کی کوشش ہے۔ خیر، میں ایک منصوبہ بنا رہا ہوں، انتظار کرو۔“ یہ کہہ کر آرنلڈ نے فون رکھ دیا۔

ڈیوڈ شدید مایوسی کا شکار تھا اور یہ مایوسی صرف دفتر تک محدود نہیں رہی۔ گھر میں بھی تناؤ رہنے لگا۔ میاں بیوی میں کشیدگی بڑھتی جا رہی تھی لیکن وہ اپنے بچوں کی وجہ سے خاموش تھے۔ ساتھی سراغ رساں، میسن نے بھی سمجھایا کہ اُسے چند روز کے لیے چھٹی لے لینی چاہیے، لیکن ڈیوڈ نے یہ مشورہ قبول نہیں کیا۔ وہ دھیرے دھیرے یاسیت کی جانب بڑھ رہا تھا۔

گزشتہ چند ماہ سے کوئی لاش نہیں ملی تھی لیکن قاتل آزاد تھا اور ڈیوڈ کو یقین تھا کہ وہ جلد اگلا وار کرے گا۔ ایسا ہی ہوا۔ 22 مارچ 84ء کو ایک اور ڈھانچا ملا۔ یہ جنگل میں ہائی وے کے نزدیک ملا تھا۔ اس واقعے نے طوفان کھڑا کر دیا۔ میڈیا نے پولیس کی کارکردگی کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔

اس واقعے کے بعد ڈیوڈ بہت چڑچڑا ہوگیا۔ اسے یوں لگتا تھا کہ اگر وہ گرین ریور کلر تک نہیں پہنچ پایا تو پاگل ہوجائے گا۔

پھر ایک روز، جب تیز بارش نے سب اتھل پتھل کر دیا تھا، ڈیوڈ اور میسن رین کورٹ پہنے ایک کارخانے کے احاطے میں کھڑے تھے جہاں سے دو ڈھانچے ملے تھے۔ یہ کارخانہ کافی عرصے سے بند تھا۔

اس بار بھی وہی اُکتا دینے والا عمل دُہرایا گیا۔ شواہد اکٹھے کیے گئے اور ڈھانچوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال روانہ کر دیا گیا۔ عین اُس وقت، جب ڈیوڈ کارخانے کے مالک سے پوچھ گچھ کر رہا تھا، میسن کو کچھ فاصلے پر ایک پک اپ ٹرک نظر آیا جو دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔

☆☆☆

ڈیوڈ کی ڈائری سے ایک ورق: 16 نومبر 84ء

آج میں اور آفیسر آرنلڈ فلوریڈا کے جیل خانے کے یاسیت سے بھرپور اُس خاموش حصے میں موجود تھے جسے انتہائی حساس تصور کیا جاتا ہے۔ یہاں فقط اُن قیدیوں کو رکھا جاتا ہے جنہیں موت کی سزا سُنائی جا چکی ہو۔

ہم دونوں بدنام زمانہ سیریل کلر ٹیڈ بینڈی سے ملنے آئے تھے جس نے ایف بی آئی کی مدد کرنے کی درخواست قبول کرلی تھی۔

چند لمحات بعد ایک انتہائی وجیہہ شخص ہمارے روبرو تھا جسے 35 خواتین کی عصمت دری اور قتل کرنے کے الزام میں موت کی سزا سنائی گئی تھی۔

اُسے مطمئن، مسکراتا دیکھ کر میں بے چین ہوگیا..... میں ٹیڈ کے اصل چہرے سے واقف ہوں جس پر چھائی معصومیت اور حسن نے کئی عورتوں کو اپنا نشانہ بنایا۔

ٹیڈ اپنے مخصوص مطمئن انداز میں ٹھہر ٹھہر کر بات کر رہا تھا۔ اِس دوران اس کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی، جس نے مجھے مضطرب کر دیا۔

”وہ تمہاری سوچ سے یکسر مختلف ہے، یہی وجہ ہے کہ تم اس تک پہنچ نہیں پا رہے۔“ اس نے سگریٹ کا ایک کش لیتے ہوئے کہا، جو اسے آرنلڈ نے پیش کی تھی۔ ”تمہارے اندازے غلط ثابت ہو رہے ہیں جس کی وجہ واضح ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ وہ تمہیں تعاقب پر اُکسا رہا ہے اور چاہتا ہے کہ اُسے گرفتار کرلیا جائے لیکن میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ...“ اتنا کہہ کر وہ ٹھہر گیا اور چند ساعت میری بے چینی سے لطف ہوتا رہا۔ پھر بولا۔ ”وہ تمہیں فقط بیوقوف بنا رہا ہے۔ وہ گرفتار ہونے کا خواہش مند نہیں۔ وہ اس عمل سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ وہ تڑپتی، سسکتی لڑکیوں کو دیکھ کر محظوظ ہوتا ہے۔“ ٹیڈ کی نظریں میرے تنے ہوئے چہرے پر ٹکی تھیں۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ”یہ تمہارے لیے زندگی اور موت کا معاملہ ہے مسٹر ڈیوڈ؟ کیا میں درست نہیں کہتا؟“

وہ سچ کہتا تھا، میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ ٹیڈ چند ساعت سوچتا رہا، پھر بولا۔ ”ہوسکتا ہے کہ وہ عام سا انسان ہو، اتنا عام کہ تمہارے سامنے سے گزر جائے اور تم اسے نظر انداز کر دو، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ کوئی پولیس والا ہو۔ دیکھو، میرا مشورہ ہے کہ اس کی شخصیت کے بارے میں زیادہ اندازے مت لگاؤ۔ خود کو محدود مت کرو، کوشش جاری رکھو!“

”میں کوشش جاری رکھوں گا!“ میں نے دھیرے سے کہا۔ اور ڈائری کے یہ ورق گواہ ہیں، میں تادم مرگ اپنی جدوجہد جاری رکھوں گا۔

☆☆☆

میسن کی ڈائری سے ایک ورق: 10 مئی 85ء

آج ایک پچیس سالہ لڑکی نے کنگ کاؤنٹی پولیس اسٹیشن میں آکر بتایا ہے کہ کسی زمانے میں وہ جسم فروشی کے کاروبار سے متعلق تھی لیکن پھر اچانک اِس سے الگ ہوگئی۔

اُس نے جو سبب بتایا، اُس نے مجھے چونکا دیا۔

”میرا اُس سے سامنا ہوا تھا۔ یہ تین برس پہلے کی بات ہے۔ وہ درندہ مجھے قتل کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے اپنے ناخن اُس کے بازو میں گاڑ دیے اور وہاں سے بھاگ آئی۔“ یہ اُس کے الفاظ تھے، جو بے شک انتہائی اہمیت کے حامل تھے۔

”کیا تم اُس کا اسکیچ بنوا سکتی ہو؟“ میں نے سوال کیا۔

”ہاں، گو کہ اُس رات بارش ہو رہی تھی اور میں نشے میں تھی لیکن میرے ذہن میں اس کا عکس ہے۔“

”گڈ، تو اب ہم اس کا اسکیچ بنواتے ہیں۔“ اس کے جواب نے مجھے تجسس سے بھر دیا تھا۔

لڑکی کے بیان نے ڈیوڈ کو پھر متحرک کر دیا تھا۔

☆☆☆

مغرب، خصوصاً امریکا میں جسم فروشی کا کاروبار عام ہے۔ کئی لڑکیاں عارضی طور پر اچھے پیسے کمانے کے لیے اسے اپنا لیتی ہیں۔

جس زمانے میں گرین ریور کلر کی کہانی موضوع بحث بنی ہوئی تھی، اس وقت بھی کئی لڑکیوں نے اس پیشے کو اختیار کیا اور اپنی لاعلمی کے سبب موت کے منہ میں چلی گئیں۔

ایسی ہی دو سیاہ فام لڑکیاں، روزا اور اینی ایک روز پیشہ ور خواتین جیسے کپڑے پہنے اسٹرپ کلب پہنچ گئیں۔

روزا فٹ پاتھ پر، نسبتاً تاریک گوشے میں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی، جبکہ اینی سڑک کے درمیانے حصے میں سگنل کے نیچے پہنچ گئی۔ کچھ دیر بعد ایک ٹرک سگنل کے نزدیک آکر رکا۔ اگلے ہی لمحے اینی اُس میں سوار ہوگئی اور ٹرک آگے بڑھنے لگا۔

”یہ ٹرک...“ روزا کے نزدیک کھڑی ایک عورت نے آنکھوں میں خوف لیے اُس کی جانب اشارہ کیا۔ ”یہ تو وہی ہے... گرین ریور کلر!“

یہ سنتے ہی روزا کے اوسان خطا ہوگئے، وہ ٹرک کی جانب دوڑی تب تک وہ اندھیرے میں غائب ہو چکا تھا۔

ٹھیک ان لمحات میں تاریک گوشے میں کھڑی سیاہ کار میں بیٹھا آفیسر فیری حیرت سے اس سیاہ فام لڑکی کو سڑک پر دوڑتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

لاشیں ملنے کا سلسلہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا جس کی وجہ سے میڈیا پولیس ڈیپارٹمنٹ کے خلاف ہوگیا، عوامی دباؤ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ بالآخر ایف بی آئی کو میدان میں کودنا پڑا۔

اب کنگ کاؤنٹی پولیس ہیڈ کوارٹر میں ایف بی آئی اہل کاروں کی آوازیں گونجنے لگیں جو قاتل کے تعاقب کے تعلق سے خاصے پُرجوش نظر آتے تھے۔ وہ عوام سے یہ وعدہ کرچکے تھے کہ قاتل جلد پولیس کی گرفت میں ہوگا۔

اس ضمن میں خاصی گہما گہمی رہی۔ کئی افراد کے بیانات قلم بند کیے گئے، پیشہ ور خواتین سے بھی بات کی گئی لیکن کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ چند روز بعد اخبارات میں یہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

سرخی قانون نافذ کرنے والے اداروں کا منہ چڑا رہی تھی: ''ایف بی آئی بھی ناکام رہی!''

پھر ایک صبح یہ سنسنی خیز خبر اخبارات کی زینت بنی کہ جو جیکس نامی ٹیکسی ڈرائیور نے جس پر گرین ریور کلر ہونے کا شک ظاہر کیا گیا تھا، خودکشی کرلی ہے۔

جائے وقوعہ پر پہنچنے کے بعد پولیس کا ایک حیرت سے سامنے ہوا۔ اُس کے تاریک کمرے کی ایک دیوار گرین ریور کلر کے تعلق سے شائع ہونے والی خبروں کی کٹنگ سے بھری ہوئی تھی اور بستر پر کئی پیشہ ور عورتوں کی نیم برہنہ تصاویر تھیں۔

یہ خبر عوام کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ منتخب نمایندوں کی جانب سے بیان سامنے آیا کہ گرین ریور کلر کا قصہ تمام ہوگیا ہے۔ پولیس کے بیش تر افسران بھی اسی خیال کے حامل تھے لیکن ڈیوڈ کا معاملہ مختلف تھا۔ اُسے یقین تھا کہ شاطر قاتل ابھی بھی سڑکوں پر معصوم لڑکیوں کا شکار کر رہا ہے۔

☆☆☆

ڈیوڈ اپنے ساتھیوں کے رویے کی وجہ سے اکتاہٹ کا شکار تھا۔ بیشتر پولیس اہل کاروں کو یقین تھا کہ جو جیکس ہی قاتل تھا جس نے پولیس سے بچنے کے لیے خودکشی کرلی لیکن ڈیوڈ کا خیال مختلف تھا، جو جلد صحیح ثابت ہوا۔

مارچ کی ایک خاموش صبح، پولیس کو دریا کے کنارے ایک پختہ عمر کی عورت کی نیم برہنہ لاش ملی۔ یہ خبر جنگل میں آگ کی طرح شہر میں پھیل گئی۔

ڈیوڈ اپنی ٹیم کے ساتھ موقع پر پہنچ گیا۔

جونہی طبی عملے نے لاش اٹھائی، ڈیوڈ ٹھٹک گیا۔ اُس کی نظریں اُس مقام پر ٹکی تھیں جہاں چند ساعت قبل لاش پڑی تھی۔ اُسے ایک مڑا تڑا کاغذ کا ٹکڑا نظر آ گیا تھا جسے کھولتے ہی اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

''یہ سنیما کا ٹکٹ ہے۔'' کاغذ میسن کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے اس نے کہا۔ ''اور اس میں جو جیکس کی خودکشی سے ٹھیک چار روز بعد کی تاریخ درج ہے، یعنی...'' اس نے گہرا سانس لیا۔ ''یعنی... کم از کم اسے جو نے قتل نہیں کیا اور مجھے یقین ہے کہ وہ گرین ریور کلر نہیں تھا۔''

''تو کمر کس لیتے ہیں۔'' میسن نے کہا۔

☆☆☆

روزا کی ڈائری سے ایک ورق: یکم اپریل 87ء

اینی کو غائب ہوئے ایک ماہ گزر گیا ہے اور اب مجھے شدت سے یہ احساس ستانے لگا ہے کہ میری پیاری دوست کسی حادثے کا شکار ہوگئی ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ میں اِس معاملے میں خود کو ذمے دار ٹھہراتی ہوں۔

آج شام میں نے پھر اسٹرپ کلب کا رُخ کیا، اس امید پر کہ شاید وہ زندہ ہو اور لوٹ آئی ہو۔

عین اُس لمحے، جب میں ایک لڑکی سے اینی کے بارے میں پوچھ رہی تھی، مجھے سائرن سنائی دیا۔

ایک پولیس کار وہاں آ کر رکی جس میں سے ایک پولیس اہل کار برآمد ہوا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بلا کی کاٹ تھی۔

ایک لڑکی آگے بڑھی اور کار میں بیٹھ گئی۔ چند سیکنڈ بعد کار سائرن بجاتے ہوئے سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی۔

''مجھے پولیس سے رابطہ کرنا چاہیے۔'' اُس شخص کو دیکھ کر اسے خیال آیا۔

کل میں پولیس اسٹیشن جاؤں گی اور سراغ رساں، ڈیوڈ کو گمشدگی کے تعلق سے مطلع کروں گی، کیوں کہ وہی اس کیس پر سنجیدگی سے کام کر رہا ہے... باقی پولیس اہل کاروں کے رویے سے تو یوں لگتا ہے، جیسے گرین ریور کلر حقیقت نہیں، فسانہ ہے!

☆☆☆

اس رات، جب روزا پولیس اسٹیشن جانے کا منصوبہ ترتیب دے رہی تھی، ڈیو اور جولیا کے درمیان پھر تکرار ہوئی جس کا اختتام یاسیت اور تنہائی پر ہوا۔

اسی رات، ایک درندے نے اپنے بازوؤں کی پوری قوت صرف کرتے ہوئے ایک لڑکی کا گلا گھونٹ دیا!

دوسری صبح روزا اپنی دوست اینی کی تصویر کے ساتھ پولیس اسٹیشن پہنچ گئی۔ ڈیوڈ سے تو ملاقات نہیں ہو سکی لیکن اس نے ڈیوٹی پر موجود اہل کار کو اپنے خدشات سے آگاہ کرتے ہوئے ٹھوس اقدامات کرنے کا تقاضا کیا۔ آفیسر نے بیزاری سے اس کا رابطہ نمبر اور دیگر تفصیلات نوٹ کرلیں۔

ڈیوڈ کے ہاتھ تاحال کوئی سراغ نہیں لگا تھا اور قاتل سڑکوں پر آزاد گھوم رہا تھا۔ اس وقت تک قتل ہونے والی لڑکیوں کی تعداد 40 ہوگئی تھی، جبکہ 17 کے قریب لاپتا تھیں۔ اس بات کا قوی امکان تھا کہ انہیں بھی قتل کر دیا گیا ہے۔

وہ رات رات بھر دفتر میں بیٹھا رہتا۔ اس عمل نے اس کی ازدواجی زندگی کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اُس کے اور جولیا کے درمیان کشیدگی بڑھتی جا رہی تھی۔ میسن نے اُسے سمجھانے کی بھرپور کوشش کی لیکن ڈیوڈ پر تو جیسے ایک بھوت سوار تھا۔

☆☆☆

دوسری صبح وہ اور میسن شیرف کے سامنے بیٹھے تھے۔

''یہ بکواس ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ جو جیکس ہی سیریل کلر تھا۔ وہ مر چکا ہے، اب اس کیس کا پیچھا چھوڑ دو۔''

''نہیں شیرف، وہ شخص ابھی سڑکوں پر آزاد گھوم رہا ہے... لڑکیوں کو اپنے پاگل پن کا نشانہ بنا رہا ہے، وہ رکنے والا نہیں!'' ڈیوڈ نے کہا۔

''تم کیا چاہتے ہو؟'' شیرف نے زچ ہوتے ہوئے سوال کیا۔

''جو کے علاوہ ہم نے ماضی میں گیری اور جیپ نامی دو افراد کو شامل تفتیش کیا تھا، میں چاہتا ہوں کہ اُن کے وارنٹ گرفتاری جاری کیے جائیں اور اُن کے گھر کی تلاشی کی اجازت دی جائے۔ یہ معصوم لڑکیوں کی زندگی کا سوال ہے شیرف!'' اُس نے باس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، جاؤ، انہیں گرفتار کرلو، تلاشی لو ان کے گھر کی، لیکن اب کُلی طور پر تم ذمے دار ہو۔''

چند گھنٹوں بعد گیری رج وے اور جیپ کو گرفتار کرلیا۔ ایک بار پھر ڈی این اے ٹیسٹ کیا گیا، وہ پولی گراف ٹیسٹ کے مرحلے سے بھی گزرے۔

ہاں، اِس بار دونوں ہی نے اعتراف کیا کہ وہ قتل ہونے والی چند لڑکیوں کو جانتے ہیں اور اُن کے ساتھ رات گزار چکے ہیں، تاہم اُن کے قتل کے بابت دونوں ہی نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

تین دن پر مشتمل تحقیقات بے نتیجہ ثابت ہوئیں۔ اس ناکامی سے ڈیوڈ ٹوٹ گیا۔

اگلے روز ٹی وی چینل سے سیاٹل کے شہریوں کے نام ایک اپیل نشر ہوئی جس میں ڈیوڈ جارج نے عوام سے یہ درخواست کی کہ اگر ان کے پاس گرین ریور کلر کے بارے میں معلومات ہے، تو سامنے آئیں اور پولیس کی مدد کریں۔

اُسی رات جولیا کو ایک فون کال موصول ہوئی، تاہم فون کرنے والے نے بات کیے بغیر لائن کاٹ دی۔ جولیا نے اس بارے میں ڈیوڈ کو بتانے سے گریز کیا کہ کہیں وہ پھر پولیس اہل کار گھر کے باہر نہ تعینات کرا دے۔

روزا نے اپنے طور پر اینی کی تلاش جاری رکھی۔ اس دوران اس کا جسم فروش عورتوں سے تعلق رکھنے والے کئی عجیب و غریب افراد سے سامنا ہوا، جن میں سے کوئی ٹرک ڈرائیور تھا، کوئی شرابی، کوئی بزنس مین... سب ہی نے روزا کو اپنے ساتھ رات بسر کرنے کی پیش کش کی لیکن جب انہیں پتا چلا کہ وہ اپنی کسی دوست کو تلاش کر رہی ہے تو وہ کاندھے اچکا کر آگے بڑھ گئے۔

اگلی صبح روزا کی نظروں سے ڈیوڈ کی اپیل گزری۔ اُس نے ڈیوڈ کو فون کرنے کا فیصلہ کیا۔

''مجھے خدشا ہے کہ وہ اُس پاگل سیریل کلر کا نشانہ بن گئی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ہچکیاں لینے لگی۔

''میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں اسے تلاش کرلوں گا!'' ڈیوڈ نے اُسے دلاسا دیتے ہوئے کہا، تاہم اُسے اپنا لہجہ کھوکھلا محسوس ہوا۔ وہ گزشتہ چند برسوں میں درجنوں والدین سے یہ وعدہ کر چکا تھا کہ وہ اُن کی بیٹیوں کے قاتل کو گرفتار کر لے گا لیکن وہ کامیابی سے کوسوں دُور تھا۔

''میں آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں۔'' روزا نے سانس بحال کرتے ہوئے کہا۔

''کہو!'' ڈیوڈ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

''اینی کو تلاش کرتے ہوئے میرا ایک انتہائی مشکوک شخص سے بھی سامنا ہوا... وہ... مضبوط جسم کا مالک تھا، اس کے بال لمبے تھے اور سب سے عجیب بات یہ کہ وہ پولیس کی وردی میں تھا۔'' اُس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

''اچھا!'' ڈیوڈ چوکنا ہوگیا۔ ''ذرا اس کا حلیہ تفصیل سے بتاؤ!'' اب وہ نوٹ بک پر جھکا ہوا تھا۔

اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ ٹیڈ نے گرین ریور کلر کی پولیس ڈیپارٹمنٹ سے وابستہ ہونے کا خدشا ظاہر کیا تھا۔

اس وقت تک ٹیڈ کی سزائے موت پر عمل درآمد ہو چکا تھا اور وہ الیکٹرک چیئر پر دم توڑ چکا تھا۔

☆☆☆

ڈیوڈ کی ڈائری سے ایک ورق: 14 مارچ 89ء

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سیاٹل کے شہریوں سے میری اپیل کُلی طور ناکام گئی، حقیقتاً اس کا ردِّعمل خاصا حوصلہ افزا رہا۔ پولیس کو کئی پیشہ ور عورتوں کے ٹیلی فون موصول ہوئے جن میں سے چند تو بے معنی تھے، تاہم چند نے ایک عجیب بات بتائی۔ جب آج شام جونیئر آفیسر، فیری نے مجھے اس بابت مطلع کیا، میں چونک اُٹھا۔

دراصل کئی پیشہ ور لڑکیوں نے ایک ایسے شخص کے بارے میں پولیس کو مطلع کیا تھا جس نے اگرچہ انہیں تشدد کا نشانہ نہیں بنایا، نہ ہی ہراساں کیا لیکن وہ اُن کی ویڈیو فلم بنایا کرتا تھا۔

میرے ذہن میں ٹیڈ کے الفاظ گونج رہے تھے۔ ''... وہ تڑپتی، رحم کی بھیک مانگتی لڑکیوں کو دیکھ کر محظوظ ہوتا ہے!''

مجھے لگا، میں قاتل کے قریب پہنچ گیا ہوں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ خوشی کا لمحہ تھا لیکن میں رات بھر سو نہیں سکا، دراصل میں سورج طلوع ہونے کا منتظر تھا، میں صرف اسی وقت سکون سے سو سکتا تھا، جب وہ درندہ سلاخوں کے پیچھے ہوتا!

☆☆☆

15 مارچ 89ء کو ہتھیاروں سے لیس پولیس ٹیم نے ایوریٹ ہالووے کے گھر چھاپا مارا۔ گو کہ وہ اُسے گرفتار کرنے میں ناکام رہے، تاہم اُس کے گھر سے ملنے والے مواد نے پولیس کو یقین دلا دیا کہ ہالووے ہی قاتل ہے۔ اُس کے کمرے کی ایک دیوار اُن تمام خبروں کی کٹنگ سے سجی تھی، جن کا تعلق گرین ریور کلر سے تھا۔ وہاں ایسی کئی لڑکیوں کی تصاویر موجود تھیں جو قتل ہو چکی تھیں۔

ہالووے کچھ عرصہ فوج میں رہا تھا، اُس نے نفسیات کے مضمون میں ماسٹرز کیا تھا۔ یعنی وہ مضبوط جسم اور اعصاب کا مالک تھا۔ سب سے اہم چیز وہ ویڈیوز تھیں جو الماری کے خفیہ خانے میں چھپائی گئی تھیں۔

ڈیوڈ وہ ویڈیوز گھر اٹھا لایا جنہیں دیکھ کر اُس کا خون کھول اُٹھا۔ ان ویڈیوز میں وہ پاگل شخص، رات گزارنے سے پہلے کیمرا اٹھائے لڑکیوں سے مختلف سوالات کرتا نظر آیا۔ اُن میں ہر عمر، ہر رنگ کی لڑکیاں تھیں۔ چند پریشان نظر آ رہی تھیں، جب کہ چند اسے تفریح سمجھ رہی تھیں۔

اِن ویڈیوز نے ہالووے کی درندگی عیاں کر دی۔ غصے کے زیرِ اثر ریموٹ کنٹرول ٹی وی پر دے مارا۔

دوسری صبح ہر اخبار، ہر ٹی وی چینل ہالووے کے بارے میں بات کر رہا تھا، تاہم اس کی تلاش میں اب تک کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ پولیس نے نفری بڑھا دی۔ شہر کو سیل کر دیا۔ اُنہیں ہر صورت میں اس شخص کو ڈھونڈ نکالنا تھا۔

اور تب ڈیوڈ کو جو اُس روز گھر پر ہی تھا، فیری کی کال موصول ہوئی۔ ”ہالووے پولیس اسٹیشن میں ہے اور آپ سے ملنا چاہتا ہے سر۔“

کچھ دیر بعد وہ پولیس اسٹیشن میں تھا، جہاں اُس کے سامنے چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا ہالووے بیٹھا تھا۔

”ہم نے تمہیں پکڑ ہی لیا۔“ ڈیوڈ نے اپنا غصہ چھپاتے ہوئے کہا۔

”تم غلط سمت میں جا رہے ہو، میں نے اُن لڑکیوں کو قتل نہیں کیا!“ اس کے چہرے پر بلا کا اطمینان تھا۔

”ہمارے پاس ثبوت ہیں۔“ ڈیوڈ چلّایا۔

”کیا ثبوت ہے؟ ذرا میں بھی سنوں!“ چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ تھی۔

”ان تمام لڑکیوں کی ویڈیوز، جنہیں تم نے قتل کیا۔“

”بکواس میں گرین ریور کلر کے ہاتھوں قتل ہونے والی ایک ایک لڑکی کے نام سے واقف ہوں۔ میرے گھر سے ویڈیوز برآمد ہوئی ہیں، ان میں کوئی ایسی لڑکی نہیں جو اس سیریل کلر کا نشانہ بنی ہو۔“

”یہ بہانہ نہیں چلے گا، ہم ثابت کر دیں گے کہ تم ہی قاتل ہو۔“ ڈیوڈ نے کہا۔

”اچھا!“ وہ ڈھٹائی سے مسکرا رہا تھا۔ ”جو ویڈیوز تمہیں ملی ہیں، وہ میں نے زبردستی نہیں بنائیں، ان لڑکیوں کی مرضی اس میں شامل تھی۔ میں نے انہیں معاوضہ دیا۔ میں نے ان پر تشدد نہیں کیا، نہ ہی انہیں ہراساں کیا اور یاد رکھو ان ویڈیوز میں موجود ہر لڑکی زندہ ہے۔“

”ایک بات سمجھ لو ہالووے، ہم نے تمہیں پکڑ لیا ہے۔ اب تم کہیں نہیں جانے والے!“ ڈیوڈ نے اپنی کہنیاں میز پر ٹکاتے ہوئے کہا۔

”تم ثبوت ڈھونڈنے میں ناکام رہو گے دوست۔“ اس نے دانت پھاڑتے ہوئے کہا۔

بدقسمتی ڈیوڈ کے تعاقب میں تھی، اس کی تمام تر کوشش کے باوجود ہالووے چند روز بعد رہا ہو گیا۔ اس کے خلاف ثبوت اکٹھے کرنے میں پولیس ناکام رہی۔ جتنی بھی لڑکیوں کی اس نے ویڈیوز بنائی تھیں، وہ تمام زندہ تھیں۔

وہ دن اُکتاہٹ اور بیزاری سے بھرپور تھے۔ اس عرصے میں جتنے بھی تہوار آئے، وہ ڈیوڈ کو خوشیوں سے بھر نہ سکے، مگر اس بار کرسمس پر جب موسم ابر آلود تھا اور وہ گھر میں بیٹھا فائلوں میں گم تھا، جولیا اس کے قریب آن کھڑی ہوئی۔

وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ اگرچہ گزشتہ چند برسوں میں ان کے تعلقات سے محبت کا لطیف احساس خارج ہو گیا تھا، تاہم یہ بھی سچ ہے کہ وہ ہنوز جذبۂ اُلفت سے بندھے تھے۔

”میری کرسمس ڈیئر!“ جولیا نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”شکریہ!“ ایک طویل عرصے بعد ڈیوڈ مسکرایا۔

وہ ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی اور بڑی محبت سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

”ڈیوڈ!“ اس نے آہستگی سے کہا۔ ”میں جانتی ہوں کہ اس شہر کے باسی، تمہارے اپنے ساتھی تم سے ناراض ہیں۔ وہ تمہارا ساتھ چھوڑ چکے ہیں لیکن میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس درندے کو ضرور پکڑ لو گے۔“

ڈیوڈ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”مجھے خوشی ہے میں تنہا نہیں!“

لیکن ڈیوڈ تنہا ہو رہا تھا... پولیس ڈیپارٹمنٹ اس کیس میں دلچسپی... کھو بیٹھا تھا۔ شہری انتظامیہ کا بھی یہی خیال تھا کہ قاتل کبھی گرفتار نہیں ہو سکے گا، اس لیے گرین ریور کلر کا تعاقب کرنے والی اسپیشل ٹیم، جو کبھی پچاس افراد پر مشتمل تھی، وہ گھٹتے گھٹتے دو افراد تک محدود ہو گئی، یعنی ڈیوڈ اور میسن!

☆☆☆

میسن کی ڈائری کا ایک ورق: **16 نومبر 89ء**

تاریکی میں ڈوبی سنسان سڑک پر میرے قدموں کی چاپ ایک ایسی ہیبت ناک صورت حال تخلیق کر رہی تھی جو میری توقع سے یکسر مختلف تھی۔

ہاں، رات کا وقت تھا، موسم سرد تھا، لیکن.... اتنا سناٹا؟

”کیا سیاٹل بدل گیا ہے؟“ میں نے خود سے سوال کیا۔

اور ٹھیک تب، ایک انتہائی تاریک گوشے میں ایک سایہ میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ میں چونک گئی۔

میں نے اس شخص کو دیکھا، وہ خستہ حال لباس میں ملبوس تھا اور لنگڑا رہا تھا۔

”کیا آپ میری کچھ مدد کر سکتی ہیں؟“ اس نے کرخت آواز میں کہا۔

ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میرا ذہن ماضی میں پہنچ گیا۔ مجھے وہ بھکاری یاد آیا جس کے حوالے سے شہریوں نے شکایت کی تھی کہ وہ انہیں حملہ کر کے زخمی کر چکا ہے۔

”کیا یہ وہی ہے؟“ میں نے خود سے سوال کیا۔ میں نے اس کے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ اس کی مٹھی بند تھی۔

”کیا اس میں نوکیلا پتھر ہے؟ جس سے وہ مجھ پر وار کرنے والا ہے؟“ خوف نے مجھے آلیا۔

”سوری، میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔“ میں نے خود کو بہادر ثابت کرتے ہوئے کہا۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ اس کا ردعمل کیا ہوتا ہے۔

میرے اس جملے کو سنتے ہی اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اب اس کی نظریں مجھ پر ٹکی تھیں۔ میں نے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا، لیکن وہ میرے سامنے کھڑا تھا، کسی دیوار کی مانند!

میرا ہاتھ کوٹ کی جیب میں ریوالور تک گیا، شاید میں ریوالور اُس پر تان ہی دیتی لیکن عین اسی وقت ہارن سنائی دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ سڑک کے کنارے ایک پک اپ ٹرک کھڑا تھا۔ اس کے سوار نے جس کا چہرہ میں تاریکی کے سبب نہیں دیکھ سکی، بھکاری کو پکارا۔

”ہاں ہیلو، ادھر!“

اور وہ مشکوک شخص مجھے نظر انداز کرتا ہوا ٹرک کی طرف چلا گیا۔ میں نے خود کو سنبھالا اور دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگی۔ میں نے خود کو سمجھایا کہ مجھے مزید ہمت اور بہادری کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔

اور تب، دفعتاً مجھے اس بھکاری اور پک اپ ٹرک میں ایک تعلق نظر آنے لگا۔ میں فوراً مڑی لیکن اب اس سنسان اور تاریک سڑک پر میں ایک بار پھر تنہا تھی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

☆☆☆

یہ عام خیال تھا کہ لاشیں ملنے کا سلسلہ رک گیا ہے اور گرین ریور کلر نے سیاٹل شہر چھوڑ دیا ہے، تاہم ایسا نہیں تھا! 89ء کے اواخر میں پولیس کو ایک اور لاش ملی جس کی شناخت ایک پیشہ ور عورت ہولی ٹین کی حیثیت سے ہوئی۔ یہ اطلاع اسے فیری نے دی جو جائے وقوع پر سب سے پہلے پہنچا تھا۔

ڈیوڈ دوبارہ پُرانی فائلوں میں کھو گیا ہے۔ وہ ایک ایک کر کے تمام واقعات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے اُن تمام لوگوں کے بیانات دوبارہ پڑھے جنہوں نے مختلف اشخاص کی بابت گرین ریور ہونے کا خدشہ ظاہر کیا تھا۔ اس مشکوک، ٹائپ شدہ خط کا بھی جائزہ لیا، جو اسے بذریعہ پوسٹ ملا تھا۔ ٹیلی فون کالز کے ریکارڈ چیک کیے۔ ساتھ ہی اُس نوٹ کو بھی باریک بینی سے پرکھا جو دھمکی کے طور پر اس کے گھر کے دروازے پر چسپاں کر دیا گیا تھا۔

وہ آفس میں بالکل تنہا تھا، اس پر تھکن طاری تھی۔ اور تب غیر متوقع طور پر، غالباً خواب میں اُس نے خود کو اپنے مرحوم باپ کے روبرو پایا جو اس کارخانے کے گیراج میں کھڑا تھا جہاں وہ ملازمت کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رنگ کرنے والا برش تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے گردن موڑ کر ڈیوڈ کی طرف دیکھا۔ ”میرے... بیٹے...“

اچانک اسے جھٹکا لگا، وہ ہوش میں آ گیا اور تب اُسے واقعات میں ترتیب نظر آنے لگی۔

اُسے ٹیڈ کے جملے یاد آئے۔ اُس نے کہا تھا۔ ”وہ تمہاری سوچ سے یکسر مختلف ہے، یہی وجہ ہے کہ تم اس تک پہنچ نہیں پا رہے۔“

اس نے غور کیا۔ ”ایک ٹرک ڈرائیور... ایسا شخص جس کا جسم فروش خواتین سے ماضی میں بھی تعلق رہا ہو جو پہلی نظر میں کسی زاویے سے قاتل نہیں لگتا اور بہ آسانی لڑکیوں کا اعتماد حاصل کر لیتا ہے... کون ہو سکتا ہے؟“

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ڈیوڈ نے ان تمام افراد کا ماضی کھنگالا، جنہیں گرین ریور کلر ہونے کے شک میں گرفتار کیا گیا تھا۔

اسٹیو ایلز، ہالووے اور گیری رج وے! تینوں ہی مختلف اوقات میں چھوٹے بڑے الزامات کے تحت گرفتار ہو چکے تھے۔ اُن کا جسم فروش خواتین سے تعلق بھی ثابت تھا۔

ڈیوڈ نے اُن کی میڈیکل رپورٹس چیک کیں۔ کس کی نظر کم زور ہے؟ کس کو کم سُنائی دیتا ہے؟ کون حادثات کا شکار ہو چکا ہے؟ کس کا معدہ ٹھیک کام کر رہا ہے؟ کون معذور ہے؟ کس کے جسم پر جلنے کے نشانات ہیں اور...

فائلوں کی ورق گردانی کرتے کرتے اچانک وہ ٹھٹک گیا۔ اُسے وہ اکلوتی خوش نصیب لڑکی یاد آئی جو برسوں قبل اُس درندے کے چنگل سے بچ کر بھاگ آئی تھی، جس نے میسن کو بتایا تھا کہ اُس نے گرین ریور کلر کے بائیں بازو پر ناخن گاڑ دیے تھے۔

اسے یاد آیا، ایک بار جب وہ فیری کے ہمراہ شک کی بنیاد پر ایک شخص سے ملنے گیا تھا، اُس نے فوراً آستینیں نیچے گرا لی تھیں، وہ ضرور زخم چھپانے کی کوشش کر رہا ہوگا۔

وہ اس شخص کی میڈیکل رپورٹس پر جھک گیا۔ اگلے ہی لمحے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، کیوں کہ میڈیکل رپورٹ کے مطابق چند برس قبل اس کا بائیں بازو تیزاب سے جل گیا تھا۔

ڈیوڈ نے کرسی سے ٹیک لگالی۔

اس کی آنکھوں کے سامنے ایک پستہ قد، دھیمے لہجے میں گفتگو کرنے والے ایسے شادی شدہ شخص کی تصویر گھوم رہی تھی جو ایک اچھے ادارے میں ملازمت کرتا تھا اور جس کا ایک بچہ بھی تھا۔

☆☆☆

ڈیوڈ کی ڈائری سے ایک ورق: 19 دسمبر 89ء

میں قاتل تک پہنچ گیا... خدایا، وہ میرے آنکھوں کے سامنے تھا، لیکن میں اسے دیکھ نہیں سکا.... بالآخر میں نے اس درندے کو کھوج نکالا۔ وہ... گیری رج وے ہی ہے!!

اپنے تئیں وہ قاتل کی تلاش میں کام یاب رہا تھا، لیکن امریکی قوانین ثبوت کا تقاضا کرتے ہیں، جن کے بغیر کسی شہری کو مجرم نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اُس نے فقط میسن کو اس بارے میں مطلع کیا اور اسے اعتماد میں لیتے ہوئے ثبوت اکٹھے کرنے میں جُٹ گیا۔

اس نے خفیہ طور پر گیری رج وے کا ماضی کھنگالنا شروع کیا۔ اس کی پہلی بیوی سے بھی ملاقات کی، یوں گتھی سلجھتی گئی۔

گیری کا بچپن خاصا تلخ تھا۔ اُس کی پرورش سخت گیر شرابی ماں نے کی جو اُسے خود پر بوجھ تصور کرتی تھی۔ اس کا باپ انہیں چھوڑ کر چلا گیا تھا جس کی وجہ سے ماں بیٹے کو کسمپرسی میں زندگی گزارنی پڑی۔

وہ خاصی عمر تک رات میں بستر گیلا کرنے کی عادت میں مبتلا رہا جس کی وجہ سے اسے اپنی ماں کی جھڑکیاں سننی پڑتیں، کبھی کبھار وہ اسے سخت سزا بھی دیتی جس کی وجہ سے اسے اپنی ماں سے نفرت ہوگئی۔ الغرض، اسے بچپن میں خوشی نصیب نہیں ہوئی۔ وہ اوسط درجے کا طالب علم تھا اور کبھی اسکول میں نمایاں نہیں ہو سکا۔ جب وہ 16 برس کا تھا، اس کا پاگل پن پہلی بار ظاہر ہوا۔

گیری کی پہلی بیوی نے بتایا کہ اُس کے سابق شوہر نے ایک چھ سالہ بچے کو جنگل میں لے جا کر چھری کے وار سے زخمی کر دیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب اُس کی زندگی میں قتل کرنے کی شدید خواہش کا اظہار ہوا۔ چونکہ اس واقعے کے بعد اُس نے علاقہ چھوڑ دیا تھا، اس وجہ سے پولیس اس تک نہیں پہنچ سکی۔ پھر زخمی ہونے والا بچہ بھی اُسے نہیں جانتا تھا۔

گریجویشن کرنے کے بعد کچھ عرصے وہ نیوی کا حصہ رہا۔ امریکی فوج کے ساتھ ویتنام میں بھی وقت گزارا جہاں تشدد اور موت کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا۔

پھر اس نے اپنی ہائی اسکول کی ساتھی کلاڈیا بیروز سے شادی کر لی۔ ابتدائی برس خوش گوار گزرے، تاہم کچھ ہی عرصے بعد وہ غیر عورتوں میں دلچسپی لینے لگا جس کی وجہ سے رشتے میں دراڑ آ گئی اور وہ علیحدہ ہو گئے۔

وہ گیری کے لیے انتہائی کرب ناک لمحات تھے لیکن یہ واقعہ اسے قاتل بنانے کے لیے کافی نہیں تھا۔ اُس نے عام انسان کی حیثیت سے مارکیا ونسلو نامی عورت سے دوسری شادی کر لی۔ 75ء میں اُس کے ہاں بیٹے کی پیدائش ہوئی۔ اُس زمانے میں وہ بہت مذہبی ہو گیا۔ گیری واشنگٹن کے علاقہ رین ٹن میں واقع کین ورتھ ٹرک کمپنی سے منسلک تھا جہاں اُسے اچھا معاوضہ ملتا تھا۔ وہ ٹرک کو رنگنے میں ماہر تھا اور اکثر اپنے پک اپ ٹرک کا رنگ بدل دیا کرتا تھا۔

اچھی ملازمت اور شادی شدہ زندگی کے باوجود جنسی خواہشات نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ وہ جسم فروش خواتین کے پاس باقاعدگی سے جاتا رہا جہاں وہ اُن سے عجیب و غریب تقاضے کرتا۔ دوسری شادی بھی زیادہ عرصے نہیں چل سکی۔ 82ء میں ایک جسم فروش عورت نے اُس کے تشدد پسند رویّے کی پولیس میں شکایت کر دی، یوں اسے پہلی بار گرفتار کیا گیا۔ غالباً اس واقعے کے بعد اُس نے پیشہ ور عورتوں کو قتل کرنا شروع کیا۔ ابتدائی شکاروں کی لاشوں کو اس نے دریا کے حوالے کر دیا بعد میں وہ لاشیں ہائی وے کے ساتھ پھیلے جنگل میں پھینکنے لگا۔

جب پہلی بار ڈیوڈ جارج اُس سے ملا تھا، گیری نے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے اپنے بائیں بازو پر جو ایک عورت کے ناخنوں سے زخمی ہو گیا تھا، تیزاب ڈال لیا۔ اُسی نے 84ء میں ڈیوڈ کے نام ایک ٹائپ شدہ خط بھیجا جس کا مقصد فقط اسے گمراہ کرنا تھا۔

85ء میں اُس کی جوڈتھ ماسن نامی ایک عورت سے ملاقات ہوئی جس سے 88ء میں اس نے شادی کر لی۔ چند نامعلوم وجوہات کی وجہ سے شادی کے بعد وہ دھیرے دھیرے پیشہ ور خواتین کو قتل کرنے کے مکروہ عمل سے دور ہوتا گیا۔ شاید اس کا اکلوتا سبب یہ رہا ہو کہ وہ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا۔ اُس کی بیوی بھی اُس کا ہر طرح سے خیال رکھتی اور اس کے تمام تقاضے پورے کرتی۔ ایک تھیوری یہ بھی تھی کہ پولیس محکمے سے تعلق رکھنے والے کسی شخص نے اسے مطلع کر دیا تھا کہ ڈیوڈ اس کے بے حد نزدیک پہنچ چکا ہے.... خیر یہ مکروہ عمل معطل نہیں ہوا، وہ وقفے وقفے سے 98ء تک قتل کرتا رہا۔

☆☆☆

وقت گزرتا رہا، ڈیوڈ کی ترقی ہو گئی۔ وہ پولیس چیف بن گیا۔ اب اس کے کاندھوں پر فقط ایک قاتل کا تعاقب کرنے کا ذمہ نہیں تھا بلکہ اُسے پورے شہر کی حفاظت کرنی تھی اور وہ دل جمعی سے اپنا کام کر رہا تھا، تاہم گیری رج وے اس کے ذہن سے اترا نہیں تھا۔

2001ء میں اُس کی نظر سے ایک خبر گزری جس کے مطابق برطانوی پولیس نے انتہائی جدید ٹیکنالوجی استعمال کرتے ہوئے قاتل اور مقتول کا ڈی این اے میچ کر کے اُسے عدالت میں مجرم ثابت کر دیا تھا۔

یہ اپنی نوعیت کے ابتدائی واقعات میں سے ایک تھا اور طبی ماہرین نے ڈی این اے ٹیسٹ کی مدد سے ملزم کو پکڑنے کے عمل کو مستند قرار دے دیا تھا۔

اِس خبر نے ڈیوڈ کو ولولے سے بھر دیا۔ وہ فوراً میسن کے پاس پہنچا جو اب سینئر آفیسر کے عہدے پر فائز تھی۔

''ہمارے پاس گیری کا ڈی این اے ہے؟'' اُس نے سوال کیا۔

''ہاں!'' وہ تھوڑی حیران تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ ڈیوڈ اس واقعے کو بھول چکا ہے۔

''اور مقتولین کا ڈی این اے بھی ہمارے پاس محفوظ ہے۔ ہم جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے اُسے میچ کریں گے۔''

''کیا عدالت اسے بہ طور ثبوت قبول کر لے گی؟'' میسن نے پوچھا۔

''ہاں، اس طرح کے چند کیسز سامنے آ چکے ہیں۔ پُرانے سیمپل نکالو، مقتولین کے جسم پر کوئی خراش، کوئی بال، کوئی بھی شے... کچھ نہ کچھ ایسا ہوگا، جو قاتل کی نشانی ثابت ہو۔ دونوں کا ڈی این اے ملا کر دیکھتے ہیں۔''

اُنہوں نے ایسا ہی کیا۔ پُرانے سیمپل کھنگالے۔ طبی ماہرین، خصوصاً ڈی این اے پر تحقیق کرنے والوں سے رابطہ کیا، جدید کمپیوٹر سسٹم استعمال کیے اور بالآخر چار لڑکیوں کے جسم سے حاصل ہونے والے قاتل کے ڈی این اے کا نقشہ گیری کے ڈی این اے سے مل گئے۔

ڈیوڈ خوشی سے بھر گیا۔ اس نے میئر سے رابطہ کر کے تمام تفصیلات سے آگاہ کیا اور طبی ماہرین کی سند کو سامنے رکھتے ہوئے اُسے راضی کر لیا۔ قانون دانوں نے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا اور ثبوت کو کافی قرار دیتے ہوئے وارنٹ جاری کر دیے۔

30 نومبر 2001ء کو ڈیوڈ کا اذیّت ناک انتظار ختم ہوا۔ جب گیری کام ختم کر کے اپنی ٹرک فیکٹری سے نکل رہا تھا، پولیس نے اُسے قتل کے جرم میں گرفتار کر لیا۔

پُرہجوم پریس کانفرنس ہوئی، جس میں ڈیوڈ نے عوام کو تفصیلات سے آگاہ کیا۔ کانفرنس کے بعد صحافیوں نے کھڑے ہو کر تالیاں بجاتے ہوئے اُسے خراجِ تحسین پیش کیا۔

چند گھنٹوں بعد ہر گھر میں ڈیوڈ کا ذکر ہو رہا تھا، لوگ اُسے ہیرو کے طور پر دیکھ رہے تھے۔

''تم کام یاب رہے۔'' میسن کی آنکھوں میں نمی تھی۔

''ابھی نہیں، بہت سے کام کرنے باقی ہیں۔''

دوسری جانب گیری رج وے کے وکیل کو یقین تھا کہ اُس کا موکل قاتل نہیں، جس کی سادہ سی وجہ تھی کہ پستہ قد، معصوم چہرے والا گیری ہر قتل سے انکاری تھا۔ وکیل کا خیال تھا کہ ڈی این اے میچنگ کے عمل کو عدالت میں چیلنج کیا جا سکتا ہے جسے کمزور شہادت قرار دے کر اُسے بری کر دیا جائے گا۔

ڈیوڈ کو اس بات کا اندازہ تھا، اس لیے اس نے تحقیق جاری رکھی۔ اس نے اپنی ٹیم کے ساتھ ان سرد خانوں میں خاصا وقت صرف کیا جہاں گرین ریور کلر کا شکار بننے والی لڑکیوں کی برسوں پُرانی لاشیں رکھی گئی تھیں۔ محنت رائیگاں نہیں گئی۔ دو لاشوں پر اسے گاڑیوں پر کرنے والے رنگ کے دھبے ملے جسے کین ورتھ ٹرک فیکٹری میں استعمال ہونے والے رنگ سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ملایا گیا۔ نتیجہ مثبت رہا۔ ان دونوں لڑکیوں کو اس نے فیکٹری کے احاطہ ہی میں جہاں ٹرکوں پر رنگ کیا جاتا ہے قتل کیا تھا۔

اس انکشاف کے بعد گیری رج وے کے وکیل نے اُسے جواب دے دیا۔

''سچ بتاؤ، کیا تم نے قتل نہیں کیے؟ اب اُن کے پاس ٹھوس ثبوت ہیں۔'' وہ غصے سے چلّا رہا تھا۔

''میں...'' گیری کی آواز میں لرزش تھی۔'' بس... مرنا نہیں چاہتا!''

''اب صرف ایک راستہ ہے۔'' وکیل نے کہا۔ ''تم اعتراف کرلو، پولیس سے تعاون کرو، اُنہیں اُن لاشوں تک لے جاؤ، جو اب تک نہیں مل سکی ہیں۔ ہم تمہارے تعاون کو بنیاد بنا کر سزائے موت سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔''

ڈیوڈ نے گیری کی جانب سے پولیس سے تعاون کرنے کی پیش کش قبول کرلی۔ اب وہ اُس درندے سے ملاقات کے لیے جیل جارہا تھا۔

وہ عجیب کیفیت تھی۔ اُسے ایک ایسے سفّاک شخص کا سامنا کرنا تھا، جس نے درجنوں عورتوں کو بے دردی سے قتل کیا جس نے اُس کی نیندیں حرام کردیں، زندگی کو اتھل پتھل کردیا۔

ڈیوڈ جیل کے اُس کمرے میں پہنچا، جہاں اُسے گیری سے ملاقات کرنی تھی۔ کچھ دیر بعد گیری رج وے اُس کے سامنے تھا۔

اُس کے پاس بہت سے سوال تھے۔ وہ بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔

''تمہیں یاد ہے کہ گیری تم نے کتنی لڑکیوں کو قتل کیا؟''

''کچھ... کچھ کہہ نہیں سکتا۔'' اس نے کاندھے اُچکائے۔ ''تعداد یاد نہیں۔''

''تم اُن کا اعتماد کیسے حاصل کرتے تھے؟ اُنہیں قتل کیسے کرتے تھے؟ میں تفصیلات جاننا چاہتا ہوں۔''

چند ساعت گیری ڈری ہوئی نظروں سے ڈیوڈ کو گھورتا رہا پھر اس نے اپنی کہانی بیان کرنی شروع کی۔ ''میں ہمیشہ صبر سے کام لیتا... کبھی خود اُن تک نہیں جاتا... ہمیشہ انتظار کرتا، کبھی ٹرک کا بونٹ کھول کر کھڑا ہوجاتا، کبھی یونہی گھنٹوں پیشہ ور خواتین کے علاقے میں گھومتا تھا۔ انتظار کرتا تاوقت وہ خود مجھ سے رابطہ نہ کرلیں۔ میں اُنہیں کبھی اپنے گھر لے جاتا، کبھی کارخانے، کبھی گیراج... اور ہم بستری کے بعد پیچھے سے ان پر حملہ کرتا اور پوری قوت صرف کرتے ہوئے گلا گھونٹ دیتا۔''

''اس عمل میں تو بہت طاقت خرچ ہوتی ہوگی؟'' ڈیوڈ نے سوال کیا۔

''اوہ ہاں... کبھی کبھار تو مجھے بہت محنت کرنی پڑتی۔ ان کی لاشوں کو ٹھکانے لگانا بھی ایک مسئلہ تھا۔'' اس کی آنکھوں میں دیوانگی کی چمک تھی۔ ''کئی بہت بھاری ہوتیں، میں اُنہیں کپڑے میں یا کارپیٹ میں لپیٹ کر جنگل میں یا دریا کے کنارے پھینک آتا۔ اور کئی بار تو... میں بال بال بچا۔ ایک بار میں دریا کے قریب لاش کو... ٹھکانے لگا رہا تھا تو ایک بیوقوف ماہی گیر وہاں آگیا، خوش قسمتی سے وہ میرا چہرہ نہیں دیکھ پایا۔''

اس نے ہلکا سے قہقہہ لگایا اور بات جاری رکھی۔ ''میں نے پولیس کو بھٹکانے کے لیے چالیں بھی چلیں۔ میں نے ایک بے معنی خط لکھا، ایک لاش پر مچھلیاں رکھ دیں، تک لوگ گمراہ ہوجائیں اور شاید... میں کامیاب رہا۔''

''تم نے اندازاً کتنی عورتوں کو قتل کیا ہے گیری؟ ذرا سوچ کر بتاؤ!''

''کچھ کہہ نہیں سکتا، شاید 71، ہاں اتنی ہی۔'' اس نے پھر کاندھے اُچکائے۔

ڈیوڈ نے بہ مشکل ضبط کیا، غصے کو دبائے رکھا، برداشت کیا۔

''تو گیری...'' اس نے لفظ چباتے ہوئے کہا۔ ''کبھی تمہیں شرمندگی نہیں ہوئی... افسوس نہیں ہوا، اپنے کیے پر؟''

''سچ کہوں تو...'' اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''نہیں... قتل کرنا ہی میرا کیریر تھا... معاف کرنا ڈیوڈ، مجھے کبھی شرمندگی نہیں ہوئی۔ کبھی... نہیں۔''

''تم ایک درندے ہو۔'' ڈیوڈ نے میز پر مکّا مارتے ہوئے کہا اور کھڑا ہوگا۔ ''تم ایک پاگل انسان!''

''ہاں، آفیسر...'' گیری نے نحیف آواز میں کہا۔ ''میں واقعی پاگل ہوں۔''

گیری کی نشان دہی پر مزید لاشیں مل گئیں مگر چند معاملات میں اُس کی یادداشت نے ساتھ دینے سے انکار کردیا۔

ڈیوڈ خوش تھا کہ اس نے مقتولین کے خاندانوں سے کیا وعدہ پورا کیا اور اب گیری رج وے جیل میں ہے۔

62 سالہ گیری سزائے موت سے تو بچ گیا لیکن اس وقت وہ سلاخوں کے پیچھے زندگی گزار رہا ہے۔ پولیس کی جانب سے ثبوتوں کی بنیاد پر اس پر 49 عورتوں کو قتل کرنے کا الزام عائد کیا گیا، جبکہ اُس نے 71 کو قتل کرنے کا اعتراف کیا۔ چند حلقوں کے مطابق یہ تعداد 90 کے قریب ہے۔ وہ 82ء سے 98ء تک باقاعدگی سے قتل کرتا رہا۔ اس وقت وہ واشنگٹن کے مرکزی جیل میں قید ہے۔

پُراسرار سیارہ

ایاز راہی

قدرت نے کس خوبی سے اس کائنات کو خلق کیا ہے کہ بے ساختہ ورد زباں ہوجائے، اور تم کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤگے۔ افلاک پر پھیلی دنیا میں کیسے کیسے اسرار اپنے اندر سموئے ہے۔ کیسے کیسے بھید چھپائے ہوئے۔ خاص کر عجیب عجیب سے، اسرار بھرے سیاروں وستاروں سے بھری ہوئی ہے وہ دنیا۔

مختصر پیرائے میں معلومات کا خزانہ، ایک معلوم سیارے کا تذکرہ

''اے میری زہرہ جبیں تجھے معلوم نہیں، تو ابھی تک ہے حسیں اور میں جواں قربان میری جاں میری جاں'' یہ فلمی گانا آپ نے بھی سنا ہوگا اور یقیناً ذہن میں سوال پیدا ہوا ہوگا کہ ''زہرہ جبیں'' یعنی زہرہ جیسی پیشانی والی کیوں قرار دیا۔ زہرہ عربی کا اشارہ ہے جو ایک چمکدار سیارہ ہے اسے فارسی میں ناہید کہتے ہیں اور سنسکرت وہندی میں سوک (سوکھ) شکر (سکر) اور انگریزی میں Venus کہتے ہیں۔ فارسی لفظ ناہید کے بارے میں سید عابد علی عابد مرحوم اپنی تصنیف اصولِ انتقاد ادبیات میں رقم طراز ہیں کہ ''ناہید۔ فارسی زبان قدیم کا بہت پُر اسرار لفظ ہے۔ آریائی زبان میں قاعدہ ہے کہ الفاظ کے آغاز میں الف نافیہ لگا کر کسی صفت کی نفی کرتے ہیں یا اس کے عدم موجود ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ دیوی ناہید زرخیزی سے حسن وعشق اور ناز ونیاز کے تمام کوائف کی دیوی ہے۔ ایرانیوں کے ہاں بھی پوجی جاتی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھی۔ اردشیر بکان کا خاندان اسی ناہید دیوی کے مندر کا۔۔۔ پجاری تھا جس نے ساسانی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ مسلمانوں نے انہی سے ایران کی مسند چھینی تھی۔ ناہید اصلاً کلمہ۔ آہتیہ۔ پر مبنی ہے اس کے معنی عیب (بُرائی) کے ہیں۔ آہو گرفتن، عیب نکالنا۔ اب تک اس کلمے کے صحیح معنی کی دلالت دکھا رہا ہے۔ آہتیہ۔ پر الف نافیہ لگانے سے یہ لفظ بہت ثقیل (دشوار) ہو جاتا۔ ایسے موقعوں پر الف نافیہ اور اصل کلمے کے الف آغاز کے درمیان حرف نون بڑھا دیتے ہیں۔ کلمے کی پُرانی شکل ''اناہتیہ'' تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ''اناہتیہ'' کا الف گر گیا۔ 'ناہتیہ'' کی آخری ''ہ'' بھی ناپید ہوئی۔ ناہیت کی ت کا حرف د سے تبادلہ ہوا اور یوں کلمہ ناہید (جدید فارسی) برآمد ہوا۔ اس (ناہید) کے لغوی معنی ہیں بے عیب، پاکیزہ، معرّیٰ از بدی۔ گناہوں سے پاک۔ اسد اللہ خاں غالب کا شعر ہے۔

از رشکِ خوش نوائی ساز خیال من
مضراب نے بہ ناخن ناہید بودہ است

اس شعر میں تمام اصطلاحات موسیقی سے متعلق ہیں یعنی خوش نوائی۔ مضراب وغیرہ۔ چنانچہ ناہید، لولوئے فلک (آسمان کا موتی) ہے اور رقاص فلک یا رقاصد آسمان بھی یہی ہے۔''

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

عربی زبان میں اسی سیارے ناہید کو زہرہ کہا گیا۔ قرآن پاک میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت کا ذکر ہے۔ جس کی تفصیل احادیث اور اسلامی روایات میں ملتی ہے۔ قرآن پاک کے پہلے پارے بارہویں رکوع کی آیت 102۔ کا ترجمہ ہے ''اور یہودی اس علم کے پیچھے ہو لیے جو شہر بابل میں ان دو فرشتوں پر اترا تھا جن کا نام ہاروت و ماروت تھا اور وہ دونوں فرشتے کسی کو سحر نہیں سکھاتے تھے جب تک صاف طور پر یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو ذریعۂ آزمائش ہیں۔ پس اے طالب سحر، تو کافر نہ بن۔ کفر میں نہ پڑ۔ لیکن اس کے باوجود یہودی ان سے سحر سیکھتے جس سے میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈال دیتے۔'' تفسیر عزیزی نے بہ حوالہ ابنِ جریر۔ ابنِ ابی حاتم، حاکم اور دیگر تفاسیر نے حضرت علی المرتضیٰؓ، حضرت ابن عباسؓ اور عبد اللہ بن مجاہدؒ سے بیان کیا کہ حضرت ادریسؑ، حضرت آدم علیہ السلام کی پانچویں پشت اور حضرت شیثؑ کی اولاد میں سے ہیں۔ ان کے عہد میں لوگ

۔۔۔ گمراہ ہو گئے۔ فرشتوں نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ مولیٰ! انسان بہت بدکار ہے۔ یادش بخیر، فرشتوں نے پیدائش آدمؑ سے پہلے بھی اپنا استحقاق خلافت بیان کیا تھا کہ یہ انسان خلافت کے لائق نہیں، نا اہل ہے اور اگر انسان کو اپنا نائب یا خلیفہ بنانا ہی ہے تو اس کا وزیر و مشیر ہم فرشتوں کو بنایا جائے تاکہ ہم ان کے بگڑے کام سنبھال لیں۔ بہر حال ارشاد باری ہوا کہ اس زمانے کے انسان کو غصہ اور شہوت دیا گیا ہے جس سے گناہ زیادہ کرتا ہے، لہٰذا اے فرشتو! اگر یہ چیزیں تمہیں ملیں تو تم بھی گناہ کرنے لگو گے۔ فرشتے بولے کہ مولیٰ کریم! ہم تو گناہ کے قریب بھی نہ جائیں گے۔ خواہ کتنا ہی غصہ اور شہوت کیوں نہ ہو۔ اس پر حکم ربی ہوا کہ اچھا، تم اپنی جماعت میں سے اعلیٰ درجے کے پرہیز گار فرشتے چن لو۔ ان کو غصہ اور شہوت دے دیتے ہیں پھر امتحان ہو جائے گا چنانچہ ہاروت و ماروت جو بڑے ہی عبادت گزار فرشتے تھے، انتخاب میں آ گئے۔ حق تعالیٰ نے ہاروت و ماروت کو دونوں چیزیں (غصہ اور شہوت) دے کر شہر بابل میں اُتار دیا اور فرمایا کہ تم قاضی بن کر لوگوں کے فیصلے کیا کرو اور ہر شام اسم اعظم پڑھ کر آسمان پر آ جایا کرو۔ سو یہ دونوں فرشتے اسی طرح ایک ماہ تک آتے جاتے رہے اور ان کے عدل و انصاف کا چرچا عام ہو گیا۔ بہت سے مقدمے ان کے پاس آنے لگے۔ ایک روز زہرہ نامی ایک حسین و جمیل عورت مقدمہ لے کر آئی۔ اس عورت کا نام بیدخت تھا، زہرہ لقب تھا۔ ملک فارس کی رہنے والی تھی اور اپنے خاوند کے خلاف مقدمہ لے کر آئی تھی۔ چنانچہ ہوا کچھ یوں کہ اس عورت زہرہ کو دیکھتے ہی دونوں فرشتے بے اختیار ہو گئے اور اس سے صحبت کی خواہش کی۔ زہرہ نے کہا کہ میرا دین کچھ اور ہے تمہارا دین کچھ اور، لہٰذا یہ نہیں ہو سکتا نیز میرا شوہر بہت غیرت مند ہے اگر اسے پتا چل گیا تو مجھے قتل کر دے گا۔ سو پہلے تو میرے بت کو سجدہ کرو، دوئم میرے شوہر کو قتل کر دو پھر میں تمہاری اور تم میرے۔ فرشتوں نے انکار کر دیا اور زہرہ چلی گئی مگر فرشتے زہرہ کے دام میں گرفتار ہو چکے تھے، انہیں خود پہ اختیار نہیں رہا تھا۔ آخر فرشتوں نے زہرہ کو پیغام بھیجا کہ ہم تیرے گھر آنا چاہتے ہیں۔ زہرہ نے جواب کہلا بھیجا کہ بہ سرو چشم۔ دونوں فرشتے زہرہ کے گھر پہنچے تو بنی سنوری حسین زہرہ نے والہانہ استقبال کیا اور چار شرائط ان کے سامنے رکھیں۔ 1) مجھے اسم اعظم بتا دیں۔ 2) میرے بت کو سجدہ کریں۔ 3) میرے شوہر کو قتل کر دیں۔ 4) یا پھر شراب پی

لیں۔ فرشتوں نے باہم سوچ بچار اور مشورہ کیا کہ اسم اعظم تو ہم کسی صورت نہیں بتا سکتے۔ بت کو سجدہ شرک ہے اور قتل گناہ کبیرہ ہے۔ سو آخری شرط ہی ہلکی پھلکی ہے چنانچہ فرشتوں نے جی بھر کر شراب پی لی جب بدمست ہو گئے تو زہرہ نے ان سے اپنے بت کو سجدہ کروایا۔ مزید شہ دے کر شوہر کو مروا ڈالا اور بہلا پھسلا کر ناز و ادا سے اسم اعظم بھی اگلوا لیا۔ نتیجہ یہ کہ وہ تو خود اسم اعظم پڑھ کر صورت بدل کے آسمان کی طرف پرواز کر گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی روح کو زہرہ سیارہ سے متصل کیا اور اس کی شکل زہرہ سیارے کی طرح ہو گئی۔ ادھر فرشتے جب ہوش و حواس میں آئے تو ندامت اور شرمندگی کے بوجھ سے لرزتے کانپتے حضرت ادریس علیہ السلام کی بارگاہ میں پہنچے۔ سارا ماجرا کہہ کر دعائے مغفرت کے طالب ہوئے۔ حضرت ادریس علیہ السلام نے دعا کی تو بہت دنوں بعد بارگاہِ الٰہی سے جواب آیا کہ یا تو یہ فرشتے دنیوی عذاب قبول کر لیں یا آخرت کا۔ اس پر فرشتوں نے اس فانی دنیا کا عارضی عذاب قبول کیا چنانچہ دونوں فرشتے ہاروت و ماروت شہر بابل کے کنویں میں زنجیروں سے باندھ کر اُلٹے لٹکا دیے گئے۔ فرشتے باری باری انہیں کوڑے مارتے ہیں۔ یہ قصہ سنن بیہقی، مسند امام احمد و دیگر کتب احادیث میں بہ اسناد صحیح مروی ہے۔

وفعتاً کیا دونوں آنکھیں محو جاناں ہو گئیں
پس گئے ہاروت و ماروت ایک آدم زاد پر
(قدر)

امام فخر الدین رازی اس واقعے کی صحت سے یکسر انکاری ہیں۔ جبکہ اسرائیلی روایت کے مطابق ہاروت و ماروت ایک طوائف زہرہ کے جال میں آ کر عذاب الٰہی سے دوچار ہیں۔

عربی زبان میں زہرہ کے معنی چمک دار۔ سفید رنگ اور حسن و جمال ہیں۔ اس کے علاوہ عربوں کا ایک قبیلہ بھی اسی نام (زہرہ) سے موسوم ہے۔ سنسکرت اور ہندی میں اس سیارے کو شکر (سکر) اور سوک (سوکھ) کہا جاتا ہے۔ شکروار۔ یوم آدینہ یعنی جمعہ کے دن کا نام ہے۔ چونکہ ہندو لوگ اس سوک سیارے کا متقابل آنا یا ہونا، منحوس سمجھتے ہیں اور کوئی نیک یا اچھا کام نہیں کرتے کہ یہ گھڑی نحس ہوتی ہے اس لیے ایک محاورہ ہے کہ مرن چلی اور سوک سامنے۔ یعنی طنزاً کہتے ہیں کہ مرنے کو جانے میں کیا شگون یا شگن دیکھنا۔ سوک ایک منی کا نام بھی ہے جو بھرگو کا بیٹا اور راکھشسوں کا گرو تھا۔ اسی سیارے کا سنسکرت اور ہندی میں رتی نام بھی ہے۔ رتی جو عشق کی دیوی اور کام دیوتا کی استری (بیوی) ہے بلکہ رتی اور پتی۔ کام دیوتا کی دو بیویاں ہیں۔ اس پُراسرار سیارے کے دیگر نام کچھ یوں ہیں۔ مطربۂ فلک، لولوئے گردوں، لولوئے چرخ۔ عام لوگ اسے آسمان کی ڈومنی بھی کہتے ہیں۔ شکر کے معنی آگ، تخم، دولت بھی ہیں۔ رومیوں نے اسے Venus کا نام دیا جسے یونانی دیوی افروڈائٹ سمجھا جاتا ہے۔ رومیوں کے ہاں بھی یہ حسن و محبت کی دیوی ہے جو عشق کی علامت ہے۔ جدید تحقیق کی رو سے زہرہ یا ناہید نظام شمسی کا سب سے روشن سیارہ ہے۔ سورج سے فاصلہ 108 ملین کلومیٹرز اور اس کا قطر 12100 کلومیٹرز ہے۔ اس سیارے کا کوئی چاند نہیں۔ سطح کا درجۂ حرارت 480 سینٹی گریڈ ہے۔ محوری گردش 243 زمینی دن اور مدار کا دورانیہ 255 زمینی دن ہے۔ زہرہ یا ناہید سیارے کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ دوسرے سیاروں کے مخالف سمت میں گردش کرتا ہے فضا میں کاربن ڈائی آکسائڈ ہے چنانچہ درجۂ حرارت بہت زیادہ ہے۔ رب زدنی علماہ

☆☆

چین آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔ اس کی تاریخ صدیوں پُرانی ہے۔ مختلف ادوار میں اس کے مختلف نام رہے۔ 249 قبل مسیح میں یہاں ''چی ن'' خاندان کی حکومت تھی۔ اس کے نام پر یہ چین کہلانے لگا۔ 1949ء کے انقلاب کے بعد عوامی جمہوریہ چین بن گیا۔

اسلام کی روشنی اول اول جن ملکوں میں پہنچی، ان میں سے ایک چین بھی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت باسعادت سے قبل ہی عرب اور چین کے درمیان تجارتی تعلقات استوار ہو چکے تھے۔ اسلام ساتویں صدی عیسوی میں تھانگ دور میں چین پہنچا۔ ایک چینی اسکالر جنرل تیرساں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ آنحضرتؐ نے حضرت مالک ابن وہیبؓ کو سفیر بنا کر پہلی بار شہنشاہ چین کے پاس بھیجا تھا۔ آپؓ 6 ہجری 628ء کو کینٹن پہنچے۔ آپؓ کا مزار بھی کینٹن میں ہے۔

اقتباس: چین میں اسلام
مرسلہ: نوید احمد، کوئٹہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

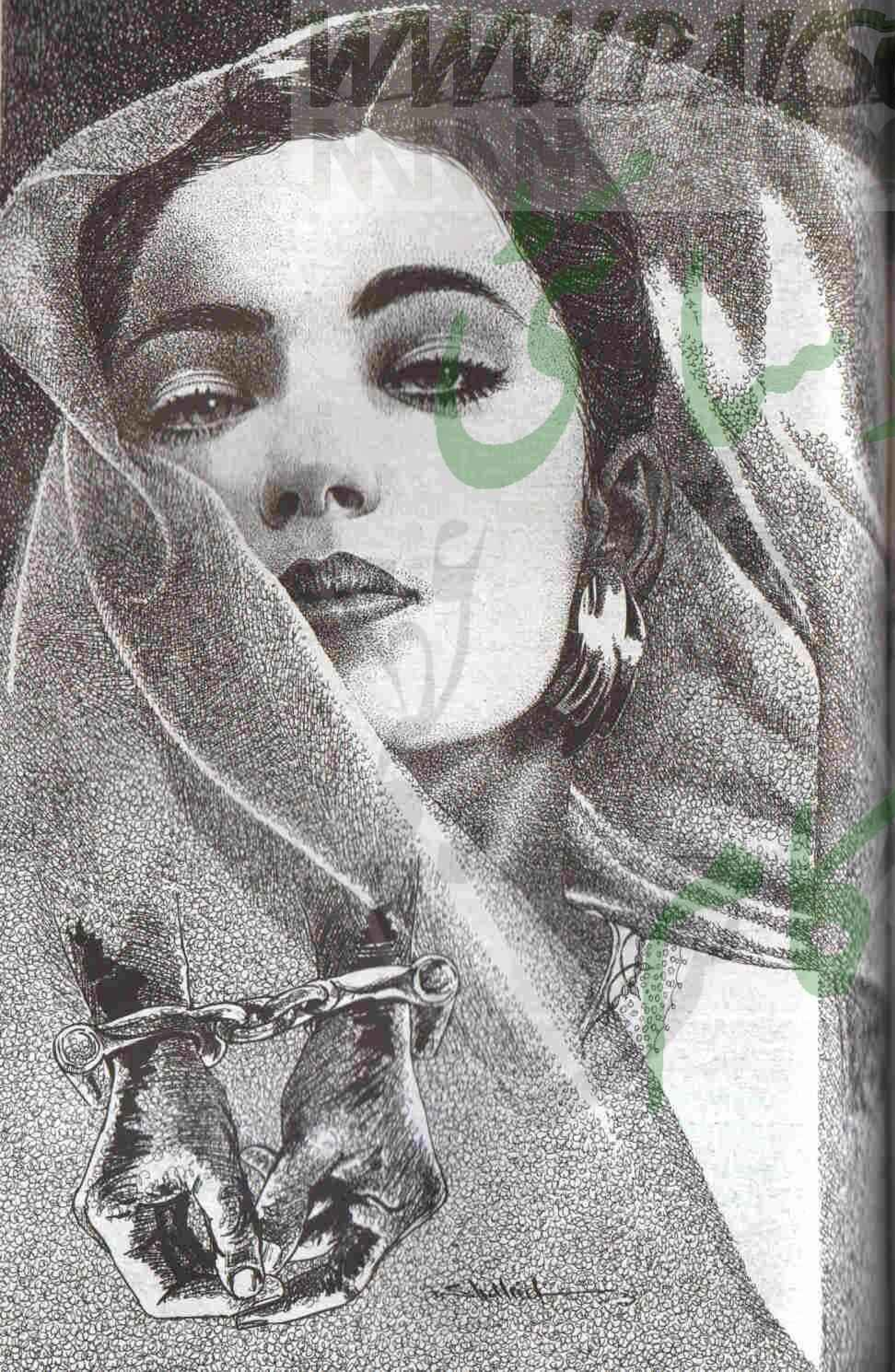

سراب

راوی : شہبازملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط: 59

وہ پیدایشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب ...... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس دور میں میرے لیے واحد اچھی یادسویرا ہے جو میرے دل کا حصہ تھی لیکن اس سے پہلے کہ میں اس کے لیے ماں جی کے سامنے دست سوال دراز کرتا وہ میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی اور میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ یہاں سے زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ تعلیم مکمل کر کے میں نے کاروبار شروع کیا۔ سفیر، مونا اور ندیم جیسے دوست ملے لیکن ایک روز مری سے واپس آتے ہوئے نادر علی کا اپنے اوباش دوستوں سمیت ہم سے ٹکراؤ ہوگیا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ دشمنی اور دربدری کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو دراز ہوتا چلا گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے لوگ میرے دشمن ہو رہے تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست بھی تھے۔ اس کے بعد ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئی تھیں۔ میں دوبارہ اپنے وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہوگیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرون ملک آ گیا۔ میری بھانجی ثمی اپنے ددھیال جارہی تھی کہ اس کی کار پر فائرنگ ہوئی۔ فائرنگ سے اس کا منگیتر بری طرح زخمی ہوگیا۔ پھر ایک روز ہم سب عتیق کو

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اسپتال سے لانے پہنچے تاکہ اس کا علاج حکیم قاؤس سے کراسکیں۔ حکیم قاؤس اس کا علاج کرنے لگا۔ زرین نے فرمائش کردی کہ میں یہاں بندرہ کر خود کو قیدی محسوس کررہی ہوں۔ میں اسے لے کر سیر کے لیے نکلا تھا کہ دشمنوں نے گھیر لیا۔ ان سے بچتے بچاتے ہم نکلے تو راستہ بھٹک کر ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے جو مری وغیرہ کی طرف جاتا تھا۔ ہماری گاڑی بھی خراب ہوگئی۔ ایک ڈاکٹر نے آبادی تک پہنچانے کا وعدہ کرلیا۔ ہم اس کے ساتھ اس کے بنگلے پر پہنچے تو احساس ہوا کہ ہم قید ہوچکے ہیں۔ زرین کی طبیعت بھی خراب ہوگئی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ ڈاکٹر نے ہم پر ایک خطرناک وائرس کا تجربہ کیا ہے۔ زرین جانبر نہ ہوسکی۔ تبھی ڈیوڈ شا آگیا۔ وہ ڈاکٹر کا فنانسر تھا۔ اس نے مجھے رہا کرالیا اور کہا کہ اگر تم مجھے پُراسرار وادی تک پہنچادو تو میں مرشد سے بھی گلو خلاصی کرادوں گا۔ اس کے بعد شا نے مجھے اپنے ایک آدمی کے ساتھ کردیا کہ وہ مجھے شہر چھوڑ آئے مگر راستے میں ہی اس کی نیت بدل گئی۔ وہ دروازہ کھول کر نیچے کودا۔ وہ پستول سے فائر کرتا کہ ایک کتے نے مارشل کے پستول والے ہاتھ پر منہ مارا تھا۔ براؤن نامی وہ کتا موناکا تھا۔ سفیر وغیرہ اس کی مدد سے مجھ تک پہنچے تھے۔ ان کے ساتھ میں شہر آگیا۔ ہم اس بنگلے میں پہنچے جہاں وہ لوگ ٹھہرے ہوئے تھے پھر اسلحہ وغیرہ پہنچانے کا انتظام کیا اور مونا وسادھنا کو عبداللہ والے بنگلے پر پہنچانے کا انتظام کیا پھر شہلا کی تلاش میں نکلے۔ اس نے بتایا کہ اس سے ہوٹل میں آکر ملوں۔ میں اس سے ملنے پہنچا تھا بائیک کھڑی کررہا تھا کہ نال کی چبھن محسوس ہوئی اور آواز آئی "ادھر سے چلو اس سے پہلے کہ یہ چل جائے۔" یہ آواز فتح خان کی تھی۔ وہ مجھے نزدیکی پارک میں لایا اور بولا کہ میں دشمنی ختم کررہا ہوں۔ تمہیں ایمن کو پاکستان بلانا ہوگا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ ایمن کو قبضے میں کرکے اس کے باپ سے ہیروں کے متعلق معلومات چاہتا ہے۔ ہم نے وسیم اور سعدیہ کی شادی کرادی اور واپس آرہے تھے کہ ایک لڑکی کو اغوا کرنے والے نظر آئے۔ ہم نے ان کے قبضے سے لڑکی کو برآمد کیا۔ گھر آئے تو رات کے وقت کچھ لوگ کتوں کو بوسنگھا کر لاتے نظر آئے۔ وہ فتح خان کے آدمی تھے اور شہلا کے کپڑوں کی بو سونگھ کر وہاں پہنچے تھے۔ ان سے نمٹنے کے بعد میں نے شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچادے تاکہ میں چائنیز بریف کیس حاصل کرلوں۔ وہ مجھے لے کر اپنے بنگلے پر پہنچی۔ ہم دیوار پھاند کر اندر پہنچے تھے کہ شہلا نے پستول نکال کر کہا کہ تمہارا کھیل ختم ہوگیا۔ میں نے اسے قابو کیا اور راضی کرلیا کہ وہ بینک کا لاکر کھلوانے میں ہماری مدد کرے گی مگر اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا تھا اس لیے اس کے پیروں میں نقلی بم باندھ کر کہا کہ یہ ریموٹ سے پھٹ سکتا ہے اگر تم نے غلط حرکت کی۔ تبھی اس نے عجیب حرکت کی اور اپنا پیر میرے پیروں میں پھنسا کر بولی "میرے ساتھ تم بھی مروگے۔" بڑی مشکلوں سے اسے سمجھایا کہ یہ صرف احتیاطاً کیا ہے کیونکہ گزشتہ بار اس نے دھوکا کیا تھا۔ وہ اسی حالت میں بینک جانے کے لیے راضی ہوگئی۔ ہم بینک میں سیف سے بریف کیس نکال چکے تھے کہ باہر سے اطلاع آئی کہ کچھ لوگ ہمیں گھیر رہے ہیں۔ ہم باہر نکلتے کہ شہلا نے پستول سے وسیم کو نشانے پر لے لیا۔ تب پتا چلا کہ شہلا نے فتح خان کے آدمیوں کو بلایا۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ وہ ایک ویران علاقے میں بنی عمارت تھی۔ وہاں ایک خانہ بدوش عورت کو فتح خان کے آدمی پکڑ لائے تھے اور اس کی عزت سے کھیل رہے تھے کہ خانہ بدوش چڑھ دوڑے، انہوں نے لڑکی کو بھی برآمد کرلیا تھا۔ وہ عورت کی عزت لوٹنے والے کو قتل کرکے ہمیں سزا سنانے آئے تھے کہ ایک جیپ آندھی طوفان کی طرح داخل ہوئی۔

> ۔۔۔ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میرے اوپر جیسے گھنے بادل چھائے ہوئے تھے ان سے ہلکی ہلکی نمی پھوار کی طرح برس رہی تھی۔ میرے سر تلے شاید ریشم کا تکیہ تھا جس میں گلاب کے پھول بھرے تھے۔ ایسی خوشبو تھی جو رگ جاں میں اُتری جارہی تھی۔ میرے بالوں میں کوئی بہت نرم اور برقی رو کی سی خاصیت رکھنے والی چیز سرسرا رہی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد سر میں درد محسوس ہوا تھا لیکن اس کیفیت نے درد بھلا دیا تھا۔ میں نہ جانے کتنی دیر اس کیفیت سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ پھر کسی کی ہلکی سی سسکی گونجی اور سسکی کے دوران کسی نے میرا نام پکارا۔

"شہباز..."

میں چونک کر ہوش میں آگیا۔ تب میں نے سویرا کو دیکھا۔ اسی سویرا کو جو ہمیشہ مجھے اپنے وجود سے بہت پاس محسوس ہوئی لیکن عملاً ہمیشہ مجھ سے بہت دور رہی۔ کسی سراب کی طرح جو دکھائی تو دیتا ہے لیکن کوئی وجود نہیں رکھتا۔ پیاسا ہمیشہ سراب کی طرف دوڑتا ہے۔ مگر وہ پانی کے اس چشمے کو پا نہیں سکتا جو اسے اس کی خواہش دکھارہی ہوتی۔ وہ ہمیشہ تشنہ اور ناکام رہتا ہے۔ سویرا کے معاملے میں مجھے یہی لگتا تھا کہ میں تشنہ اور ناکام رہوں گا۔ میں ہمیشہ اس سراب کے پیچھے بھاگتا رہوں گا اور میرے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ لیکن پھر

اچانک بدلا۔ شاہد بھائی اس دنیا میں نہ رہے۔ سویرا کی ان سے نہیں بنی تھی، دونوں ایک ایسے دریا کی طرح تھے جس کے کنارے کبھی آپس میں نہیں ملتے ہیں۔

بے ہوش ہونے سے پہلے میں نے فتح خان کی گاڑی میں سویرا کو دیکھا تھا اور بے ہوش ہوتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ کہیں چوٹ کی وجہ سے میرا دماغ مجھے سراب تو نہیں دکھا رہا اور ہوش میں آنے کے بعد میں سوچ رہا تھا کہ کیا میں اب بھی سراب دیکھ رہا ہوں۔ میرا سر سویرا کے زانوں پر تھا اور اس کی زلفیں مجھ پر سایہ فگن تھیں۔ برسنے والی نمی اس کی آنکھوں سے نکلے شفاف موتی تھے۔ میرے بالوں میں سرسراتی اس کی موی انگلیاں اور اس کے وجود سے اُٹھنے والی مہک میرے ہر درد اور ہر تکلیف کا علاج تھی۔ اس وقت میں نے شدت سے خواہش کی کہ اگر یہ سراب ہے تب بھی ہمیشہ جاری رہے، میں ساری عمر اس کے پیچھے بھاگنے کو تیار تھا۔ مجھے ہوش میں آتا... دیکھ کر سویرا نے پھر میرا نام پکارا۔

"شہباز..."

اس بار اس کے لہجے میں سسکی نہیں بلکہ خوشی تھی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ "سویرا یہ تم ہو؟"

"ہاں یہ میں ہوں۔" اس کی آنکھیں پھر برسنے لگیں۔ "خدا کا شکر ہے آپ کو ہوش آگیا۔"

تو یہ سراب نہیں ہے۔ میں نے کسی قدر مایوسی سے سوچا۔ سویرا سچ مچ میرے پاس تھی۔ فتح خان اسے لینے گیا تھا اور شہلا اسی وجہ سے مجھے سرپرائز دینا چاہ رہی تھی۔ میرا ذہن اس طرف نہیں گیا تھا کہ وہ سویرا کو بھی لاسکتے ہیں۔ پھر صورت حال کا احساس ہوتے ہی میں اُٹھ بیٹھا، اگرچہ مجھے سویرا سے دور ہونے کے لیے خود پر جبر کرنا پڑا۔ میں اور سویرا ایک اجنبی کمرے میں تھے۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا اور ایک طرف آتش دان میں آگ جل رہی تھی۔ دیواروں پر جدید قسم کا میٹ فنش پینٹ تھا اور آتش دان کے اطراف میں پتھر نما ساخت سے آرائش کی گئی تھی جس پر پتھر کا تاثر دینے کے لیے سرخ رنگ بھی کیا گیا تھا۔ قالین پر چند عدد گاؤ تکیے تھے لیکن ان کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

"اب آپ کیسے ہیں؟"

"میں ٹھیک ہوں۔" میں نے اپنا سر ٹٹولا جو ذرا سا پھٹ گیا تھا لیکن شاید خون صاف کردیا گیا تھا اور زخم پر کسی مرہم کی ہلکی سی چکناہٹ تھی۔ مگر زخم سے زیادہ مجھے دوسری باتوں کی فکر تھی۔ سویرا معمولی سے لباس میں تھی۔ اس نے کاٹن کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ سردی سے بچاؤ کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ "سویرا تم یہاں کیسے آئیں حویلی میں کیا ہوا ہے؟"

"میں نہیں جانتی۔" اس نے بے بسی سے کہا۔ "میں کل رات اپنے بستر پر سوئی تھی اور جب میری آنکھ کھلی تو میں بندھی حالت میں ایک گاڑی میں سفر کررہی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں اور منہ بندھا ہوا تھا۔ میں آواز بھی نہیں نکال سکتی تھی۔"

میں اُٹھ کر بیٹھا پھر تکیے سے ٹیک لگالی۔ میرے کپڑوں میں سے جیکٹ غائب تھی اور میں صرف پینٹ اور شرٹ میں تھا۔ لیکن آتش دان کی وجہ سے اندر کمرے میں مناسب گرمی تھی اور موسم اتنا سرد محسوس نہیں ہورہا تھا۔ ورنہ جنوری کا آخر بہت سخت ٹھنڈا ہوتا ہے اور اگر ہم کھلی جگہ ہوتے تو جم کر رہ جاتے۔ بیٹھ کر میں نے سویرا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور نرمی سے کہا۔ "پھر کیا ہوا؟"

"پتا نہیں میں کتنی دیر بندھی رہی پھر ایک چھوٹے قد کے، صورت سے خوفناک نظر آنے والے آدمی نے میرے ہاتھ پاؤں کھولے۔ اس نے میرا منہ بھی کھول دیا تھا لیکن دھمکی دی کہ اگر میں نے کوئی آواز نکالی تو وہ مجھے پھر باندھ دے گا اور دوبارہ نہیں کھولے گا۔"

میں سمجھ گیا، وہ فتح خان کی بات کررہی تھی۔ "جب اس نے تمہیں کھولا تو اس وقت کہاں تھے؟"

"ایک ویران سڑک پر تھے اور دن کا وقت ہوگیا تھا شاید دوپہر کا وقت تھا۔"

فتح خان نے میری سب سے نازک رگ پر وار کیا تھا۔ سویرا میری محبت ہی نہیں عزت بھی تھی۔ یہ سوچ کر میرا خون کھولنے لگا تھا۔ لیکن میں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو رکھا۔ "سویرا انہوں نے تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں دی، خدا کی قسم اگر انہوں نے ذرا سا بھی کچھ غلط......"

سویرا نے میری بات کاٹ کر کہا۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں جسمانی طور پر انہوں نے مجھے کوئی تکلیف نہیں دی۔ اس خوفناک آدمی کے ساتھ صرف ایک آدمی اور تھا جو گاڑی چلا رہا تھا۔ اس وقت تو میں ڈر گئی۔ نہ جانے وہ میرے ساتھ کیا سلوک کریں، میں ان کے رحم و کرم پر تھی لیکن انہوں نے میرے ساتھ کوئی بُرا سلوک نہیں کیا۔ بُری نظر سے بھی نہیں دیکھا۔"

سویرا کی وضاحت نے میرے اندر کی حدت کو کم کیا تھا لیکن فتح خان نے سویرا کو اُٹھا کر مجھے براہ راست للکارا تھا۔ اب تک میرے اور اس کے تعلقات نرم گرم سے تھے لیکن پہلی بار میں نے اسے ایسا دشمن محسوس کیا جسے میں قتل کر دینا چاہتا تھا۔ پہلے بھی وہ میرے خلاف کارروائیاں کرتا رہا تھا لیکن اس بار تو وہ حد سے گزر گیا تھا۔ مگر اس وقت میں خود کو

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ٹھنڈا رکھتے ہوئے جلد از جلد صورتِ حال جان لینا چاہتا تھا۔

''سویرا اس کے بعد کیا ہوا؟''

''مجھے کھول کر انہوں نے پینے کے جوس اور بسکٹ کے ڈبے بھی دیے تھے لیکن میں کچھ کھا نہیں سکتی تھی۔ پیاس لگ رہی تھی اس لیے جوس لے لیا۔ یہ آگے روانہ ہو گئے۔ آپ جانتے ہیں مجھے راستوں کا زیادہ پتا نہیں چلتا ہے لیکن میں نے محسوس کیا کہ ہم میانوالی سے بہت دور نکل آئے ہیں اور پوٹھوہار کے علاقے میں سفر کر رہے ہیں۔ میں نے خوفناک آدمی سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور مجھے کہاں لے جا رہا ہے تو اس نے کہا کہ میں خاموش بیٹھوں، ابھی سب سامنے آجائے گا لیکن شہباز مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ عورت کی سب سے قیمتی چیز اس کی عزت ہوتی ہے اور عزت خطرے میں ہو تو جان قربان کر دینی چاہیے۔ مجھے خیال آیا کہ میں چلتی گاڑی سے کود جاؤں۔ مگر یہ لوگ بہت چالاک ہیں۔ میں پچھلی سیٹ پر اکیلی تھی اور جب میں نے دروازے کا ہینڈل دیکھنا چاہا تو وہ اپنی جگہ تھے ہی نہیں ان لوگوں نے دروازے سے تمام چیزیں نکال لی تھیں۔ اب یہ صرف باہر سے کھل سکتے تھے۔ کئی گھنٹے سفر کے بعد میں نے راولپنڈی کا شہر دیکھا۔ میں یہاں شاہد کے ساتھ کئی بار آچکی ہوں اس لیے پہچان لیا۔ جب گاڑی شہر پہنچی تو خوفناک آدمی کو موبائل پر کسی کی کال آئی اور کال سن کر اس نے ڈرائیور سے تیزی سے گاڑی چلانے کو کہا۔ میں نے محسوس کیا وہ پریشان ہو گیا تھا۔ شام ہو رہی تھی پھر سڑک کے کنارے انہوں نے گاڑی روک دی۔ وہاں ایک جیپ میں کئی افراد اور بھی تھے۔ خوفناک آدمی اُتر کر ان کے پاس چلا گیا اور وہ کچھ دیر بات کرتے رہے۔ مجھے خوف تھا شاید وہ میرے بارے میں بات کر رہے تھے۔ پھر وہ دونوں گاڑیوں میں سوار ہوئے۔ خوفناک آدمی میرے ساتھ پچھلے حصے میں آگیا اور پھر گاڑیاں کچے میں سفر کرنے لگیں۔ اس نے دروازہ باہر سے کھولا تھا پھر اپنی جیب سے ہینڈل نکال کر اپنی طرف کا شیشہ نیچے کر دیا۔

ہم جنگل کے درمیان میں اس مکان تک آئے تو وہاں بہت سارے لوگ جمع تھے۔ میں سمجھی کہ خوفناک آدمی کے ساتھی ہوں گے لیکن اس نے مجھ سے کہا۔ ''سر نیچے کر کے بیٹھو ابھی یہاں فائرنگ ہوگی۔''

میں نے ڈر کر سر نیچے کرنا چاہا تھا کہ میری نظر آپ پر پڑی اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔ خوفناک آدمی نے ٹھیک کہا تھا اس کے نیچے اُترتے ہی بہت زور سے فائرنگ ہوئی تھی۔ وہ اور اس کے ساتھی وہاں موجود لوگوں پر فائر کر رہے تھے اور مجھے لگا جیسے وہ آپ پر بھی فائر کر دیں گے۔ ابھی اس کا دروازہ بند نہیں کیا تھا اس لیے میں گاڑی سے اُتر آئی اور آپ کو....'' سویرا بولتے بولتے رُک گئی اس کے صبیح چہرے پر سرخی چھا گئی تھی۔

''کیا آپ کو؟'' میں نے انجان بن کر پوچھا۔ ویسے میں سمجھ گیا تھا کہ وہ میری حفاظت کے لیے اپنے نازک وجود سے میری ڈھال بن گئی ہوگی اور اب یہ بات مجھے بتاتے ہوئے اسے شرم آرہی تھی۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''میں آپ کو دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی۔''

سویرا صرف اپنے اور میرے بارے میں بتا رہی تھی۔ میرے بے ہوش ہونے کے بعد وہاں کیا ہوا یہ اس نے مجھے یاد کر کے بتایا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے حواس بھی گم ہو گئے تھے اور اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ اس نے بتایا کہ خوفناک آدمی یعنی فتح خان اور اس کے چار پانچ مسلح ساتھی وہاں جمع لوگوں پر اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے اور وہ لوگ بدحواسی میں فرار ہو رہے تھے لیکن کچھ دیر بعد جب فائرنگ تھمی تو وہاں چار پانچ افراد کے سوا کوئی نہیں تھا۔ صرف ایک آدمی مارا گیا تھا اور یہ مہرو کا شوہر تھا جس نے شہلا کو پکڑ رکھا تھا۔ فتح خان یا اس کے کسی آدمی نے اسے مار دیا تھا۔ باقی افراد صرف زخمی تھے اور ان میں سے کوئی نہیں مرا تھا۔ صاف ظاہر تھا فتح خان اور اس کے آدمیوں نے خانہ بدوشوں پر ڈرانے کے لیے فائرنگ کی تھی اور ان کو وہاں سے بھگا دیا تاکہ وہ ان کے فرار کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں۔

جیسے ہی خانہ بدوش اس مکان سے دور ہٹے فتح خان اور اس کے ساتھیوں نے اندر جا کر اپنا ضروری سامان سمیٹا جس میں سب سے اہم یقیناً وہ بریف کیس تھے جو ہم نے لاکر سے حاصل کیے تھے۔ دس منٹ بعد وہ وہاں سے نکل گئے تھے۔ اب ان کے پاس دو گاڑیاں تھیں۔ شہلا، سویرا سمیت ایک گاڑی میں آئی مجھے اسی کے عقبی حصے میں ڈال دیا گیا تھا۔ فتح خان اور اس کا ساتھی ڈرائیور تھے۔ باقی لوگ دوسری گاڑی میں تھے۔ وہ وہاں سے نکلے اور مین روڈ تک آئے۔ سویرا نے بتایا کہ مین روڈ تک وہ آدھے گھنٹے میں پہنچے تھے یعنی جنگل والا مکان سڑک سے خاصے فاصلے پر تھا اور راستے میں سویرا نے کوئی آبادی نہیں دیکھی تھی۔ سڑک پر آنے کے بعد شہلا نے سویرا کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی تاکہ وہ راستہ نہ دیکھ سکے۔ جیپ کے شیشے سیاہ تھے اس لیے کوئی سویرا کی آنکھوں پر بندھی پٹی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ تقریباً ایک گھنٹے کے

بعد اس جگہ پہنچے۔ سویرا یہاں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی کیونکہ اس کی آنکھوں کی پٹی یہاں آنے کے بعد کھلی تھی۔ البتہ اس نے ایک عجیب بات بتائی کہ جب اسے اندر لایا جا رہا تھا تو اس نے کسی عورت کے چلانے کی آواز سنی تھی۔ وہ شہلا نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ شہلا خود سویرا کو ہاتھ سے تھام کر اندر لا رہی تھی۔ یعنی اس جگہ کوئی اور عورت بھی تھی اور وہ ان لوگوں کی قیدی تھی ورنہ اسے چلانے کی کیا ضرورت تھی۔

سویرا کمزور عورت تھی لیکن مجھے دیکھ کر حوصلہ پا رہی تھی اور میں اسے دیکھ کر حوصلہ ہار رہا تھا۔ میں اکیلا تھا تو دشمن کا ہر ستم اور ہر اذیت سہہ سکتا تھا۔ لیکن سویرا کی ذات کو ذرا سا بھی نقصان ہو یہ مجھے کسی صورت گوارا نہیں تھا اور شاید اسی وجہ سے فتح خان اسے یہاں لایا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں سویرا کے ہوتے ہوئے انکار کر ہی نہیں سکتا تھا۔ جو کام مرشد پوری کوشش کے باوجود نہیں کر سکا تھا وہ فتح خان کر گزرا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس نے کس طرح حویلی تک رسائی حاصل کی اور اندر گھس کر سویرا کو اُٹھا لایا تھا۔ مجھے بابا اور ماں جی کی فکر ہو رہی تھی اور ان کے بارے میں مجھے فتح خان ہی بتا سکتا تھا۔ کمرے کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ سویرا پہلے ہی اسے دیکھ چکی تھی جو خیال مجھے آیا تھا وہی اس کے ذہن میں بھی تھا۔

''شہباز یہ حویلی میں کیسے آئے بابا نے اتنا سخت پہرہ لگوایا ہے اور خود بھی مسلح رہنے لگے ہیں۔ اندر داخل ہونے والے تمام دروازے وہ رات کو خود بند کر کے سوتے ہیں۔ مجھے.... ڈر لگ رہا ہے۔''

''اللہ پر بھروسا رکھو۔'' میں نے اپنے خدشات کو پرے جھٹک کر کہا۔ ''وہ بہتر کرنے والا ہے۔ بابا اور ماں جی خیریت سے ہوں گے۔''

سویرا کو تسلی دیتے ہوئے میرے اندر مختلف خدشات سر ابھار رہے تھے اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ دروازہ پیٹ کر فتح خان سے بات کروں۔ مگر میں خود پر قابو رکھے ہوئے تھا۔ اگر میں اپنا ضبط کھو دیتا تو سویرا بالکل حوصلہ چھوڑ دیتی۔ وہ ویسے ہی بہت ڈری ہوئی تھی۔ اگرچہ اسے کوئی نقصان نہیں ہوا تھا لیکن اس نے پہلے اس قسم کے حالات بھی نہیں دیکھے تھے۔ اس لیے میں اسے تسلی دیتا رہا حتیٰ کہ وہ پُرسکون ہو گئی۔ اسے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ خوفناک آدمی فتح خان تھا۔

''وہ فتح خان ہے۔'' سویرا نے حیرت سے کہا۔ ''میں تو سمجھی تھی یہ مرشد کے آدمی ہوں گے اور یہ سوچ کر ہی ہوش میں آنے کے بعد میری جان نکل گئی تھی۔''

''نہیں یہ فتح خان ہے اور اب یہ بھی مرشد کی طرح میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''کل تک سب ٹھیک تھا لیکن اب میں اور تم دشمن کی قید میں ہیں۔''

کمرے میں پانی کی ایک بوتل موجود تھی لیکن گلاس کوئی نہیں تھا اس لیے مجبوراً اس سے منہ لگا کر پینا پڑا۔ سویرا نے بتایا کہ مجھے کوئی چار گھنٹے بعد ہوش آیا تھا۔ یعنی رات کے نو یا دس بج رہے تھے۔ حالات کی سنگینی نے میری بھوک اُڑا دی تھی۔ حالانکہ میں نے صبح کا ناشتا کیا ہوا تھا۔ سویرا کو بھوک لگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مجھے معلوم تھا اس وقت اس کے سامنے کچھ آیا تب بھی وہ نہیں کھا سکے گی۔ حویلی میں ذرا سی ٹینشن میں اس کی بھوک مر جاتی تھی۔ خاص طور سے امتحان کے دنوں میں وہ بہت کم کھاتی تھی اور اسے کھلانے کے لیے ماں جی اور بابا کو باقاعدہ حکم دینا پڑتا تھا۔

ہوش میں آنے کے بعد سر میں اتنا درد نہیں تھا لیکن اُٹھنے کے بعد اس میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس سے توجہ ہٹانے کے لیے میں سویرا سے بات کرنے لگا۔ ''ہمیں اس کمرے میں بند کرنے کے بعد کوئی یہاں آیا تھا؟''

سویرا چونک گئی۔ ''میں بتانا بھول گئی وہی عورت دوبارہ آئی تھی۔''

''اس کا نام شہلا ہے۔''

سویرا کے چہرے پر ناپسندیدہ تاثرات نمودار ہوئے۔ ''اسی نے آپ کے سر کا زخم صاف کر کے کوئی مرہم لگایا اور مجھ سے کہا۔ میں آپ کو اس کام کے لیے راضی کروں جو وہ آپ سے لینا چاہتے ہیں، اس نے کہا۔ اگر میں نے آپ کو راضی کر لیا تو مجھے بغیر کسی تکلیف کے عزت کے ساتھ واپس حویلی پہنچا دیا جائے گا ورنہ.....''

''ورنہ کیا؟''

''یہ تو اس نے بھی نہیں بتایا۔'' وہ بولی۔ ''لیکن آپ جانتے ہیں وہ دشمن ہے، کچھ بھی کر سکتا ہے۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''ہاں وہ کچھ بھی کر سکتا ہے، اس نے اور کچھ کہا؟''

''ہاں جاتے جاتے اس نے عجیب سی بات کی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آئی، اس نے کہا آپ کو بتا دیا جائے کہ پیچھے سب خیریت ہے اور آپ پیچھے والوں کی فکر نہ کریں۔''

میں سوچ میں پڑ گیا پیچھے والوں سے کیا مراد تھی؟ اس کا اشارہ میرے ساتھیوں کی طرف تھا تو مجھے ان کی فکر نہیں تھی۔ فتح خان کو ان سے کوئی مطلب نہیں تھا، خاص طور سے اس صورت میں جبکہ میں اس کے قبضے میں تھا۔ دوسرے میرے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ساتھی تر نوالہ نہیں تھے جو آسانی سے اس کی کسی مکاری میں آجاتے۔ تو کیا شہلا کا اشارہ حویلی کی طرف تھا؟ وہ سویرا کے توسط سے مجھے بتا رہا تھا کہ وہاں سب خیریت ہے اور اس نے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ سوچنے پر بھی بات واضح نہیں ہوئی، یہ معما فتح خان ہی حل کر سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ فتح خان سے بات کر لی جائے۔ میں اُٹھا تو سویرا بے قرار ہو گئی۔

"آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"کچھ نہیں فتح خان سے بات کروں گا۔"

"وہ آپ سے کیا کام لینا چاہتا ہے؟"

"تمہیں بتاؤں گا۔" میں نے کہا اور دروازہ بجایا۔ ایک دفعہ بجانے پر کوئی ردِعمل نہیں ہوا لیکن دوسری بار بجانے پر شہلا کی آواز آئی۔

"کیا بات ہے شہباز؟"

"میں فتح خان سے ملنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"وہ خود بھی تم سے بات کرنا چاہتا ہے لیکن ابھی یہاں نہیں ہے۔" شہلا بولی۔ "اس وقت تک تم آرام کرو اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو، کھانا ایک گھنٹے بعد ملے گا۔"

میں نے سر دبایا۔ "اگر کافی کے ساتھ پین کلر مل جائے تو....."

"میں ابھی بھیجتی ہوں۔"

میں واپس آیا تو سویرا مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ "لگتا ہے اس عورت سے آپ کی پُرانی واقفیت ہے؟"

اس کے لہجے میں مخصوص نسوانی حسد نہیں تھا لیکن مجھے محسوس ہوا کہ اسے یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔ "ہاں یہ بھی میرے حریفوں میں سے ایک ہے اور دو دن پہلے یہ میری قید میں تھی۔ لیکن قسمت کا پہیہ اُلٹ گیا اب میں اس کی قید میں ہوں۔"

سویرا کہتے ہوئے ہچکچائی۔ "نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر مجھے لگتا ہے یہ کوئی اچھی عورت نہیں ہے۔"

"یہ درست ہے، کردار کے لحاظ سے یہ اچھی عورت نہیں ہے۔ مگر فی الحال اس جگہ یہی واحد شخصیت ہے جو میرے لیے نرم رویّہ رکھتی ہے ورنہ فتح خان اور اس کے ساتھی بہت سفاک اور انسانیت سے عاری لوگ ہیں۔"

سویرا نے ایک بار پھر غور سے مجھے دیکھا۔ "یہ نرم رویّہ صرف آپ کے لیے ہے یا وہ دوسروں سے بھی اسی مہربانی سے پیش آتی ہے؟"

"کیا تم اس سے جیلس ہو رہی ہو۔" میں مسکرایا۔ "ویسے فکر مت کرو وہ ان چکروں میں پڑنے والی عورت نہیں ہے۔"

سویرا میری بات سے متفق نہیں تھی۔ "وہ عورت ہے اور میں نے اسے کسی سے کہتے سنا تھا وہ آپ کے لیے فکر مند ہے۔"

"کیونکہ میں نے اسے بچانے کی کوشش کی تھی اور اسی لیے سر پر چوٹ کھائی۔ اس لیے اس کی ہمدردی فطری بات ہے۔"

سویرا کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اسی لمحے دروازہ کھلا اور فتح خان کا ساتھی اندر آیا۔ یہ امیر مقام کے ساتھ ہوتا تھا لیکن اس کی جان بچ گئی تھی۔ اس نے ایک ٹرے دروازے کے پاس رکھی اور فوراً باہر جا کر دروازہ بند کر دیا۔ سویرا جا کر ٹرے اٹھا لائی۔ اس میں دو کپ کافی تھی اور ساتھ میں پین کلر گولیوں کا ایک پتا تھا۔ میں نے دو گولیاں نکال کر پانی سے لیں اور پھر کافی پینے لگا۔ اس بات کا امکان تھا کہ کافی میں مجھے اور سویرا کے بے ہوشی کی دوا دی گئی ہو لیکن ہم مجبور تھے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اگر ہم دھوکے سے بے ہوش نہ ہوتے تو شہلا اپنے آدمیوں کی مدد سے ہمیں گن پوائنٹ پر بھی کافی پینے پر مجبور کر سکتی تھی۔ سویرا نے پوچھا۔

"آپ نے اسے کیوں بچایا؟"

میں نے سویرا کو اس مکان پر پیش آنے والے واقعات سنائے۔ "شہلا بُرے کردار کی عورت سہی لیکن مجھ سے برداشت نہیں ہوا کہ اسے یوں سرِعام بے عزت کیا جائے یہ اصل میں اس کی نہیں بلکہ عورت کی تذلیل ہوتی۔ اس لیے میں نے اسے بچانے کی کوشش کی اور سر پر چوٹ کھائی۔"

"آپ نے بالکل ٹھیک کیا۔" سویرا کی آنکھیں چمکنے لگیں ان میں فخر آ گیا تھا۔ "تو اس لیے آپ کے ساتھ نرم رویّہ رکھ رہی ہے۔"

میں نے سر ہلایا۔ "بالکل ورنہ اسے کم مت سمجھو، یہ فتح خان سے کم سفاک نہیں ہے، اس کے ایک آدمی کو اس نے اپنے ہاتھ سے گلا گھونٹ کر مارا تھا۔"

سویرا دہشت زدہ گئی۔ "اپنے ہاتھ سے؟"

میں بھول گیا تھا کہ سویرا ایک عام سی لڑکی تھی جس نے کبھی قتل و غارت گری نہیں دیکھی اور نہ ہی اس بارے میں بات کی۔ وہ سچ مچ ڈر گئی تھی۔ "ہاں اپنے ہاتھ سے۔"

"لیکن کیوں یہ تو فتح خان کی ساتھی ہے؟"

"اب ہے، اس وقت ان دونوں میں بھی دشمنی تھی۔"

"آپ کی بات سن کر مجھے اس عورت سے ڈر لگنے لگا ہے۔"

"تمہیں اس سے یا کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں .... جب تک میں زندہ اور تمہارے ساتھ ہوں۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

اس نے سر اُٹھا کر مجھے دیکھا۔ "شہباز آپ نہیں جانتے آپ کا تصور ہی مجھے تحفظ کا احساس دیتا ہے۔ میں آپ کے ساتھ خود کو ہمیشہ محفوظ محسوس کرتی ہوں۔"

پین کلر اور کافی نے حیرت انگیز اثر کیا تھا اور سر کا درد دس منٹ میں اتنا کم ہو گیا تھا کہ اب توجہ نہیں کھینچ رہا تھا۔ اب میں بہتر طور پر سوچنے سمجھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ یہ کمرا بتا رہا تھا کہ ہم کسی باقاعدہ گھر میں تھے اور یہ گھر شاید کسی آبادی میں تھا کیونکہ یہاں بجلی تھی۔ یعنی یہ جگہ فتح خان کے باقاعدہ ٹھکانوں میں سے تھی۔ شاید ہمیں یہاں چھوڑ کر وہ کسی ضروری کام سے کہیں گیا تھا ورنہ شہلا نے بتایا تھا کہ وہ مجھ سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔ ظاہر ہے وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ سویرا کو یہاں دیکھ کر میرا کیا ردِعمل تھا۔ یہ تو طے تھا کہ اس نے ایک بڑی کامیابی حاصل کر لی تھی اور اب وہ مجھ پر حاوی ہو سکتا تھا۔

ایک گھنٹے بعد شہلا کھانا لے آئی۔ اس بار وہ خود ٹرے لے کر آئی تھی اور فتح خان کا ساتھی کمرے کے باہر موجود تھا۔ شہلا نے دروازہ بند کیا اور کھانے کی ٹرے قالین پر رکھتے ہوئے بولی۔ "اب طبیعت کیسی ہے؟"

"بہتر ہے، کافی اور پین کلر کا شکریہ!" میں نے جواب دیا۔

"شکریے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔ "شہباز مجھے اعتراف ہے تم دشمن ہو لیکن بہت اعلیٰ ظرف والے ہو۔ تم نے موقعے سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ جب وہ خبیث مجھے لے جا رہا تھا تو تم نے مجھے بچانے کی کوشش بھی کی۔ درحقیقت میں تمہاری شکر گزار ہوں۔"

"ہاں اس کا ایک عملی اظہار تو میں دیکھ رہا ہوں۔" میں نے سویرا کی طرف اشارہ کیا۔ "تم لوگوں کا شکریہ سانپ سے مختلف نہیں ہوتا..... جس کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہو اسے ڈس لیتے ہو۔"

شہلا کا چہرہ معمولی سا سرخ ہوا تھا۔ "تم جانتے ہو یہ فتح خان کا کام ہے؟"

مجھے غصہ آنے لگا تھا۔ "اور تم اس کی ساتھی ہو اس لیے برابر کی شریک ہو۔ شہلا مہربانی کر کے مجھے بے وقوف بنانے کے بجائے کھل کر بات کرو۔ تم لوگوں سے اچھا تو مرشد ہے جو اپنی دشمنی کو کسی منافقت کے پردے میں نہیں چھپاتا۔"

شہلا ہچکچائی۔ "درحقیقت مجھے بھی یہ سب اچھا نہیں لگ رہا.... لیکن تم نے ٹھیک کہا ہے، میں فتح خان کی ساتھی ہوں اور اس کی بات ماننے پر مجبور ہوں۔ لیکن اس سے ہٹ کر مجھ سے تمہارے لیے جو ہو سکا وہ میں کروں گی۔"

"تم میرے لیے گزشتہ دو دن سے جو کر رہی ہو اس کے لیے میں پہلے ہی تمہارا شکریہ ادا کر چکا ہوں۔" میں نے ٹرے کی طرف دیکھا تو وہ سمجھ گئی۔

"فکر مت کرو اس بار کھانے میں کوئی دوا شامل نہیں ہے۔"

"اگر ہوئی بھی تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ سویرا بالکل خاموش بیٹھی تھی، اس نے گفتگو سے گریز کیا۔ "یہ بتاؤ کہ میرے بے ہوش ہونے کے بعد کیا ہوا تھا؟"

اس بار شہلا مسکرائی۔ "ہم نے تمہیں بڑی مشکل سے اس کی گرفت سے نکالا تھا۔" اس نے سویرا کی طرف دیکھا۔ "یہ سمجھ رہی تھی کہ شاید ہم تمہیں مارنا چاہتے ہیں۔"

سویرا کا چہرہ سرخ ہو گیا، اس نے مجھے ڈھکے چھپے انداز میں بتایا تھا لیکن شہلا نے کھل کر کہہ دیا کہ وہ میری ڈھال بن گئی تھی۔ سویرا کی جھینپ محسوس کرتے ہوئے میں نے شہلا کو ٹوک دیا۔ "کام کی بات کرو۔"

"کام کی بات کچھ نہیں ہے۔ فتح خان نے اس حرامزادے کو شوٹ کر دیا جو فائرنگ میں بھی مجھ سے چمٹا ہوا تھا۔ بس وہی ایک مارا گیا۔ کچھ زخمی ہوئے تھے۔ میرا خیال ہے فتح خان نے جان بوجھ کر ان لوگوں کو مارنے سے گریز کیا تھا ورنہ اس کے ساتھیوں کے پاس اتنا اسلحہ تھا کہ خانہ بدوشوں میں سے ایک بھی بچ کر نہ جاتا۔ پھر ہم نے اپنا سامان سمیٹا اور وہاں سے رخصت ہو گئے۔"

"سامان میں سلور کلر بریف کیس بھی شامل ہوگا۔"

"آں.... ہاں، تم کھانا کھاؤ ٹھنڈا ہو جائے گا۔" اس نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

"شہلا اس وقت ہم سے کچھ نہیں کھایا جائے گا۔ فتح خان سویرا کو حویلی سے سوتے میں اُٹھا لایا ہے۔ بے شک اس نے سویرا کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا..... لیکن مجھے حویلی والوں کی فکر ہے وہاں میری ماں اور باپ بھی ہیں۔"

"سویرا نے بتایا ہوگا میں نے کہا تھا کہ پیچھے والوں کی فکر نہ کرو وہ بالکل محفوظ ہیں۔ تفصیل تو فتح خان ہی بتائے گا لیکن اس کا کہنا ہے کہ حویلی میں کسی معمولی سی چیز کا بھی نقصان نہیں ہوا..... اور سب محفوظ ہیں۔"

"میں اس حویلی کی عزت ہوں۔" سویرا پہلی بار بولی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور تلخ لہجے میں بولی۔ ”اگر میں ہی وہاں نہیں ہوں گی تو کیا اس سے حویلی کو کوئی نقصان نہیں ہوگا؟“

شہلا نے تحمل سے جواب دیا۔ ”میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی، مجھے فتح خان نے جو بتایا ہے وہ میں نے.... بتا دیا ہے باقی وہ خود آکر بتائے گا۔“

”فتح خان کہاں گیا ہے؟“

”وہ دوبارہ خانہ بدوشوں کی طرف گیا ہے تا کہ ان کو پولیس کچہری سے روک سکے۔ ان کا بندہ مارا گیا ہے اور فتح خان کا ساتھی بھی مارا گیا ہے۔“

”فتح خان کو کیا خوف ہے پولیس کا؟“

”پولیس کا تو خوف نہیں ہے لیکن میرے خیال میں یہ ٹھکانا فتح خان کے لیے اہم ہے اور وہ اسے ضائع ہونے سے بچانا چاہتا ہے۔“

”وہ خانہ بدوشوں کے ساتھ مذاکرات کرے گا؟“

”شاید وہ دھمکی اور لالچ دے کر انہیں وہاں سے بھگانے کی کوشش کرے گا۔“ شہلا بولی۔ ”میرا خیال ہے اب تمہاری تسلی ہوگئی ہے۔ تم کھانا کھاؤ اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے آواز دے لینا۔“ شہلا بولی اور کھڑی ہوگئی۔ اس وقت اس نے شریفانہ قسم کا لباس پہن رکھا تھا۔ کسی قدر ڈھیلے اونی ٹراؤزر کے ساتھ ڈھیلی ہائی نیک اور پوری آستین کی گرم جرسی پہن رکھی تھی۔ میں نے دل میں شکر ادا کیا کہ وہ واہیات ڈریسنگ میں نہیں تھی ورنہ سویرا ضرور بُرا محسوس کرتی۔ مگر وہ اس وقت بھی بُرا محسوس کر رہی تھی کیونکہ اس نے شہلا کے جاتے ہی مجھ سے کہا۔

”آپ نے دیکھا کتنی بے ہودہ عورت ہے کس انداز میں بیٹھی تھی۔“

میں نے غور ہی نہیں کیا تھا کہ شہلا کس انداز میں بیٹھی تھی۔ اس لیے سویرا کی تائید کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ سویرا بدستور غصے میں تھی اور میں نے بہ مشکل سمجھا بجھا کر اسے کھانے پر آمادہ کیا۔ حالات سے قطع نظر کھاتے پیتے رہنا ضروری تھا۔ تا کہ توانائی برقرار رہے۔ سویرا نے کم کھایا لیکن کھا لیا اور میں نے بھی اپنا پیٹ بھر لیا۔ شہلا نے یہ تصدیق تو کر دی تھی کہ حویلی میں کسی کو نقصان نہیں ہوا تھا۔ سویرا جس طرح سوتے میں بے خبر لائی گئی تھی اس سے لگ رہا تھا کہ فتح خان نے بے ہوش کرنے والی کوئی چیز استعمال کی تھی۔ ایک یہی صورت تھی کہ وہ کسی کو بھی نقصان پہنچائے بغیر سویرا کو وہاں سے نکال لانے میں کامیاب ہو ورنہ یہ کام تو خون خرابے کے بعد ہی ممکن تھا۔ کچھ دیر بعد شہلا چائے لے کر آئی اور ٹرے لے جانے لگی تو سویرا نے اسے اشارے سے روکا اور اس کے پاس جا کر آہستہ سے کچھ کہا۔ شاید وہ واش روم جانا چاہتی تھی۔ شہلا نے کہا۔

”دو منٹ رک جاؤ میں آکر تمہیں لے جاتی ہوں جب تک چائے لے لو۔“

شہلا کچھ دیر بعد آکر سویرا کو ساتھ لے گئی۔ واپسی میں وہ دو عدد کمبل بھی لے آئی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ نصف رات ہو چکی ہے۔ فتح خان اب تک واپس نہیں آیا تھا۔ سویرا تھک گئی تھی، وہ لیٹ گئی۔ شروع میں وہ خوف زدہ تھی اور مجھے پاس پا کر اس نے اطمینان محسوس کیا تھا لیکن اب وہ جھجک رہی تھی کہ میرے ساتھ ایک ہی کمرے میں تھی۔ یہ مجبوری تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”سویرا، سونے کی کوشش کرو، اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا، پریشان ہو کر جاگنے اور فکر کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔“

”ان حالات میں نیند کیسے آئے گی؟“

”آجائے گی۔“ میں نے اصرار کیا۔ ”تم سونے کی شعوری کوشش کرو۔“

سویرا لیٹ گئی۔ اس نے کمبل اوڑھ لیا تھا۔ یہ غیر ملکی کمبل بہت ہلکے اور اعلیٰ درجے کے تھے۔ بالکل نئے تھے اور ان سے بھینی بھینی خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ میں بھی کمبل اوڑھ کر تکیہ دیوار سے لگا کر نیم دراز ہوگیا۔ سویرا مجھ سے کچھ دور تھی۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد اس کی سانسوں میں ایک مخصوص ہمواری آگئی جو نیند کی نشانی تھی۔ وہ سو چکی تھی۔ میری آنکھوں کی نیند بدستور غائب تھی کیونکہ میں شدت سے فتح خان کا انتظار کر رہا تھا۔ باہر خاموشی تھی۔ ایک بار میں نے دروازے کے پاس جا کر خاصی دیر تک سن گن لی تھی لیکن خاصی دیر تک کان لگانے کے باوجود کوئی ایسی آواز سننے میں ناکام رہا تھا جس سے اندازہ ہوتا کہ یہ جگہ کہاں ہے؟ کسی آبادی میں ہے یا ویرانے میں۔ آبادی میں گاڑیاں اور ان کا شور لازمی ہوتا ہے۔ جبکہ ویرانوں میں پرندوں اور جانوروں کے بولنے کی آوازیں آتی ہیں لیکن یہاں ایسی کوئی آواز نہیں تھی۔ مکمل سناٹا تھا۔

میں آکر لیٹا، نہ جانے کتنی دیر بعد مجھے باہر ہلکی آوازوں کا احساس ہوا اور میں جلدی سے اٹھ کر دروازے کے پاس آیا۔ کان لگانے پر محسوس ہوا کہ کئی افراد بول رہے تھے لیکن الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ شاید فتح خان واپس آگیا تھا۔ میرا دل چاہا کہ دروازہ پیٹوں لیکن سویرا کی نیند میں خلل کا سوچ کر باز رہا۔ اگر فتح خان آیا تھا تو وہ یقیناً اس بات کی پروا کیے بغیر مجھے بلا لیتا کہ میں سو رہا ہوں یا جاگ رہا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوں۔ میرا اندازہ درست نکلا کیونکہ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور فتح خان کے ساتھی نے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ یہ امیر مقام کا ساتھی تھا۔ اس نے آواز نہیں نکالی تھی اس لیے میں بھی خاموشی سے باہر آگیا۔ وہ اکیلا تھا اور اس نے شاٹ گن تھام رکھی تھی۔ میرے باہر آتے ہی وہ چند قدم پیچھے چلا گیا اور بولا۔ ”دروازہ باہر سے بند کردو۔“

اس جدید ساخت کے لکڑی سے بنے دروازے پر باہر انتہائی قدیم ساخت کی کنڈی تھی۔ میں نے کنڈی چڑھا دی۔ ”اور بولو؟“

”چلو اُدھر۔“ اس نے راہداری کے سرے کی طرف اشارہ کیا۔ اس مختصر سی راہداری میں آمنے سامنے دو کمرے تھے اور تیسرا دروازہ شاید باہر جانے کے لیے تھا اور فتح خان کے آدمی نے اسی طرف اشارہ کیا تھا۔ یہ جگہ اس مکان میں بالکل اندر تھی اسی وجہ سے یہاں کوئی آواز نہیں آرہی تھی لیکن کمروں میں ہوا کی آمد ورفت کا کوئی نظام تھا اس لیے گھٹن کا احساس نہیں تھا۔ راہداری سے بھی لگا کہ یہ کوئی باقاعدہ پلاننگ سے بنایا ہوا مکان تھا۔ فرش ماربل کا تھا اور دیواروں پر میٹ فنش پینٹ تھا۔ دروازے اعلیٰ درجے کے دیودار کی لکڑی سے بنے تھے۔ باہر سے ٹھوس تختوں پر اخروٹ کی لکڑی سے منقش کام کیا ہوا تھا۔

میں راہداری سے باہر آیا تو یہ ایک چھوٹا سا ہال ثابت ہوا۔ اس کے ایک طرف کھڑکی تھی جس پر بھاری پردے تھے اور دوسری طرف ایک دروازہ تھا۔ ہال خالی تھا اور اس کا فرش بھی چمک دار ماربل کا تھا۔ ہال کا دروازہ ایک شاندار قسم کی نشست گاہ میں کھلا جس میں بہترین قسم کا لکڑی کا فرنیچر تھا۔ شاہانہ قسم کے صوفے۔ گلاس ٹاپ میزیں اور چاروں طرف دیواروں اور ریکس پر سجا قیمتی آرائشی سامان تھا۔ فرنیچر اخروٹ کی لکڑی کا تھا۔ دبیز فوم پر اعلیٰ درجے کا مخمل چڑھا ہوا تھا۔ ایک طرف بڑے اسٹائلش قسم کے آتشدان میں لکڑیوں کی آگ بھڑک رہی تھی اور اسی وجہ سے یہاں اطمینان بخش حرارت تھی۔ ایک صوفے پر فتح خان براجمان تھا اور اس کے ہاتھ میں ام الخبائث کا بھرا ہوا گلاس تھا۔ خلافِ توقع چہرے سے وہ فکر مند ہی لگ رہا تھا جبکہ میرا خیال تھا اس نے مجھے ذلیل کرنے کے لیے بلایا ہوگا۔ وہ اکیلا ہی تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے آہستہ سے کہا۔

”شہباز مجھے پتا ہے تم اس وقت میرے کو قتل کرنا چاہتا ہے۔“

”چلو تم نے میرے بارے میں ایک درست اندازہ تو لگایا۔“ میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”بس مجھے موقع ملنے دو اس وقت میں مجبور ہوں۔“

”بکواس بند کرو خانہ خراب۔“ امیر مقام مرحوم کا ساتھی عقب سے غرایا۔ وہ موت سے بال بال بچا تھا ورنہ اس کی نیت بھی مہرو پر خراب تھی اور اگر شہلا تہ خانے کے دروازے پر تالا نہ لگاتی تو وہ بھی مہرو پر دست درازی کرکے اپنی موت پر مہر ثبت کرلیتا۔ مگر اس وقت وہ دوبارہ طرم خان بن رہا تھا۔ ”خان کے سامنے تمیز سے بات کرو۔“

”فتح خان اگر تمہارے اس پلّے نے ہی بھونکنا ہے جو زبردست دیکھتے ہی دُم ہلانے لگتا ہے اور صرف نہتے لوگوں پر بھونک سکتا ہے تو تم سے بات کرنا بیکار ہے۔“

اس سے پہلے وہ مزید غراتا فتح خان نے پشتو میں اس کی عزت افزائی کرتے ہوئے اسے وہاں سے دفع ہوجانے کا حکم دیا اور وہ کان دبا کر رخصت ہوگیا تو فتح خان نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ ”بیٹھو شہباز خان۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”فتح خان تمہیں شاید اندازہ نہیں کہ... تم نے میری غیرت کو کس طرح للکارا ہے۔ اگر حالات کے سرد وگرم نے میرے اعصاب کو پختہ نہ کیا ہوتا تو اس وقت میں تمہیں دیکھتے ہی قتل کرنے کی کوشش کرتا۔ اس لیے تم مجھے اپنا ایسا دشمن سمجھو۔ میں تمہارے ساتھ نہیں بیٹھ سکتا۔ میرا تعلق بھی ایک قبائلی معاشرے سے ہے، ہم اپنے حریف کے ساتھ تو بیٹھ سکتے ہیں لیکن عزت پر ہاتھ ڈالنے والے دشمن کے ساتھ نہیں۔“

فتح خان نے میری بات پر پہلو بدلا اور اس کے چہرے کا رنگ بھی بدلا تھا لیکن اس نے زبان پر قابو رکھا اور پہلے والے نرم لہجے میں کہا۔ ”شہباز مجھے اعتراف ہے میں ..... ٹھیک نہیں کیا ہے لیکن اگر میں کہے گا کہ تمہارا منگیتر کو یہاں لاکر میں نے اچھا کیا ہے تو تم کبھی نہیں مانے گا۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”ظاہر ہے، تمہاری اس گپ پر میں کبھی یقین نہیں کروں گا۔ بھیڑیا کبھی بھیڑ کی حفاظت نہیں کرتا۔“

”پر یہ سچ ہے۔ اگر میں اسے حویلی سے نہ لاتا تو مرشد اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتا۔“

مرشد کے نام نے مجھے چونکا دیا۔ ”مرشد.....اس کا کیا مقصد تھا؟“

”وہ اپنے بھائی کی ضد پر سویرا کو اغوا کرانے کا فکر میں تھا۔ اگر میں سویرا کو وہاں سے نہ لاتا تو وہ اب تک یہ کام کرچکا ہوتا۔“

مجھے لگا کہ فتح خان میرے آتشِ غضب کو ٹھنڈا کرنے کے لیے مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کررہا تھا۔ اس نے گویا صرف مرشد کو ناکام بنانے کے لیے سویرا کو پہلے اغوا کرلیا۔ ”فتح خان تم مجھے احمق سمجھتے ہو میں مر کر بھی اس بات پر یقین نہیں کرسکتا۔ تم نے صرف مجھے مجبور کرنے کے لیے یہ کام کیا ہے اور یقین کرو مجھے جب موقع ملا میں تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کروں گا، ماضی کی مروت کو اب بھول جاؤ۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں جانتا ہے، ٹھیک ہے تم یقین مت کرو لیکن میں نے اس لیے بھی یہ کام کیا ہے کہ تم میرا کام کرو۔ اگر مرشد اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتا تو تم یقیناً اپنے حواس کھو دیتا اور اسے مارنے کی کوشش میں خود مارا جاتا۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ مرشد حویلی کو مکمل طور پر برباد کردینا چاہتا ہے۔“ میں نے بہ ظاہر طنز کیا لیکن میرے اندر ایک فکر سی سر اٹھانے لگی تھی۔

”بالکل اس کا منصوبہ تھا کہ وہ حویلی پر حملہ کرا کے سویرا کو اٹھوا لیتا اور تمہارے ماں باپ کو قتل کرا دیتا اور حویلی کو بم سے اُڑا دیتا اگر وہ ایسا کرتا تو تم کیا کرتا؟“

”وہی جو تم نے کہا ہے میں اپنی جان کی پروا کیے بغیر اسے مارنے کی کوشش کرتا۔ لیکن میرا نہیں خیال کہ مرشد اتنا بے وقوف ہے۔“

”وہ بے وقوف نہیں لیکن مجبور ہے۔ اس کے اپنے خاندان میں اس کا کئی مخالف پیدا ہوگیا ہے اور ان کا کوشش ہے کہ نادر کو گدی پر بٹھا دے۔ مرشد بڑا حصہ خود کھا رہا ہے اور دوسروں کو کم دیتا ہے۔ وہ کسی کے قابو میں نہیں ہے۔ نادر معذور آدمی ہے اگر وہ پیر بن گیا تو وہ ان لوگوں کے قابو میں رہے گا۔ ان لوگوں سے بچانے کے لیے اس نے نادر کو الگ رکھا ہے اور اس کا ہر جائز ناجائز بات مانتا ہے۔“

میں چونکا فتح خان کی بات اس حد تک درست تھی کہ مرشد نے نادر کو مرشد ہاؤس سے ہٹا کر اسلام آباد کی ایک کوٹھی میں رکھا ہوا تھا۔ اگرچہ مجھے اب بھی فتح خان کی بات پر یقین نہیں تھا لیکن نادر اسی غلیظ ذہنیت کا آدمی تھا۔ ریڑھ کی ہڈی میں لگنے والی گولی نے اسے جسمانی طور پر مفلوج کردیا تھا لیکن اس حالت میں بھی وہ اپنے سفلی جذبات کی تسکین کے لیے نت نئے طریقے اختیار کررہا تھا۔ فاضلی کے ساتھ آنے والی کال گرل نے اس کے بارے میں ڈھکے چھپے انداز میں بہت کچھ بتایا تھا۔ وہ بالکل ایسا سوچ سکتا تھا اور اگر فتح خان کی بات درست تھی تو اس بار آزاد ہوتے ہی میں نادر کا حساب برابر کرنا چاہتا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے خیال تھا کہ مرشد خود بھی اپنے بھائی سے چھٹکارے کا خواہاں تھا کیونکہ وہ اس کے لیے دن بہ دن مصیبت اور بدنامی کا باعث بنتا جارہا تھا۔

”تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟“

”مرشد کے آدمیوں میں کئی میرے لیے مخبری کرتا ہے۔ مجھے اس کے بارے میں سب پتا ہوتا ہے۔“ فتح خان نے چالاکی سے کہا۔ ”تبھی تو میں اس کا فیکٹری اور جانوروں کا فارم تباہ کرنے میں کامیاب رہا۔“

”شہلا نے مجھے بتایا ہے کہ حویلی اور میرے گھر والوں کو کوئی نقصان نہیں ہوا ہے لیکن مجھے اس کی بات کا یقین نہیں ہے۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ تم حویلی کی عزت کو اُٹھا لاؤ اور کوئی تمہارا راستہ نہ روکے؟“

”میرے کو معلوم تھا تم یہ ضرور پوچھے گا۔“ اس نے اطمینان سے کہا اور اپنی جیکٹ کی جیب سے ایک چھوٹا سا چمکیلا سلینڈر نکالا۔ ”اس میں بے ہوشی کا گیس بھرا ہے۔ یہ سلینڈر پوری حویلی کے لیے کافی تھا۔ پہلے میرے آدمیوں نے گارڈز کو بے ہوشی والا بلٹ مارا اور پھر ان کو ایک کمرے میں بند کردیا۔ پھر حویلی میں گیس چھوڑ دیا اندر سب بے ہوش ہوگیا۔“

”بکواس اتنی بڑی حویلی میں گیس ہر جگہ نہیں جاسکتی۔“

”جاسکتا ہے۔“ اس نے سکون سے کہا۔ ”میں نے طریقہ ہی ایسا استعمال کیا تھا۔ مین سوئچ سے حویلی میں وائرنگ لے جانے والے کنسیلڈ پائپ کو استعمال کیا اور اس سے گیس سلینڈر لگا کر کھول دیا۔ وائرنگ والے پائپ سے گیس ہر جگہ پہنچ گیا اور ہم آرام سے اندر جا کر سویرا کو لے آیا اور تم فکر مت کرو ہم تمہارے باپ کے سرہانے ایک پرچہ بھی رکھ آیا تھا۔ اس میں اسے بتایا کہ اس کا بہو بالکل محفوظ ہے اور وہ بلاوجہ شور کرکے اپنا عزت خود خراب نہ کرے۔ امید ہے وہ ایسا ہی کرے گا۔“

مجھے بھی یہی خیال تھا کہ فتح خان نے کسی طریقے سے حویلی والوں کو بے ہوش کرکے اپنا کام نکالا تھا۔ لیکن گیس کے استعمال کی بات نے مجھے پریشان کردیا تھا۔ مجھے اس قسم کی گیسوں کے بارے میں زیادہ علم نہیں تھا لیکن اتنا ضرور معلوم تھا کہ اس قسم کی گیسز ایک خاص مقدار سے زیادہ ہو... تو آدمی کی موت کا سبب بھی بن جاتی ہیں اور بوڑھوں بچوں پر یہ زیادہ اثر کرتی ہیں۔ میں نے فتح خان کی طرف دیکھا۔ ”مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ حویلی میں سب ٹھیک ہے؟“

”تم یقین کرسکتا ہے۔“ فتح خان نے کہا اور میرا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

موبائل نکال کر اس پر کوئی نمبر ملایا اور موبائل میری طرف بڑھا دیا۔ ”بیل جا رہا ہے بات کرو۔“

میں نے موبائل لے کر دیکھا۔ فتح خان نے حویلی کا نمبر ملا دیا تھا۔ بیل جا رہی تھی۔ چند لمحے بعد بابا نے ریسیور اُٹھایا۔ ”ہیلو کون بات کر رہا ہے؟“ ان کی آواز میں بے تابی تھی۔

”بابا۔“ میری آواز حلق میں پھنسنے لگی۔ ”میں ہوں.... ناخلف.... جس کی وجہ سے.... حویلی پر آفتیں آ رہی ہیں۔“

”شہباز۔“ بابا نے اضطراب سے کہا۔ ”کہاں ہو تم، میں سارا دن تم سے رابطے کی کوشش کرتا رہا۔ تمہارے ساتھیوں سے پتا چلا ہے کہ تم غائب ہو؟“

”میں فتح خان کی قید میں ہوں۔“

”تمہیں معلوم ہے کہ....“

”جی بابا مجھے معلوم ہے سویرا یہیں ہے، میرے پاس اور وہ بھی قید ہے لیکن محفوظ ہے۔“

بابا نے شاید بہت دیر بعد سکون کا سانس لیا تھا، وہ کچھ دیر کے لیے چپ ہو گئے پھر انہوں نے بھرائی آواز میں کہا۔ ”شہباز بیٹے تم نہیں جانتے آج کا دن میں نے اور تمہاری ماں نے کس طرح مر مر کر گزارا ہے۔“

”مجھے اندازہ ہے بابا لیکن میں مجبور تھا اب بھی مجبور ہوں۔ مگر آپ سویرا کے لیے فکرمند نہ ہوں اور نہ ہی اس بارے میں کسی کو بتائیں۔ آپا اور شمی کو بھی نہیں۔ گارڈز کو علم ہے؟“

”نہیں ان کو نہیں بتایا ہے۔ بس شجاع کو اطلاع دی ہے۔“

”بس تو اسے چھپا کر رکھیں اللہ نے چاہا تو میں سویرا کو لے کر آؤں گا۔“

”شہباز....“ بابا نے کہنا چاہا لیکن اسی لمحے لائن کٹ گئی۔

”ہیلو.... ہیلو۔“ میں نے تیز آواز میں کہا تو فتح خان مسکرانے لگا۔

”شاید بیلنس ختم ہو گیا ہے۔ اب موبائل اِدھر دے دو۔“

میں نے اسے گھورا اس نے یقیناً موبائل میں اتنا ہی بیلنس چھوڑا ہوگا کہ میں چند منٹ سے زیادہ بات نہ کر سکوں۔ مجھے غصہ آنے لگا تھا۔ ”اگر میں نہ دوں تو....؟“

اس نے صوفے کے برابر میں رکھے کشن کے نیچے سے پستول نکال لیا۔ ”شہباز خان، فتح خان سے مذاق مت کیا کرو ہم مذاق سمجھتا ہی نہیں ہے شاباش لاؤ اِدھر دو موبائل۔“

”میں مذاق کر بھی نہیں رہا ہوں۔“ میں نے کہا اور اس سے پہلے کہ فتح خان کچھ کہتا میں موبائل کو آتش دان میں پھینک چکا تھا۔ بھڑکتے شعلوں سے اسے نکالنا ممکن نہیں تھا۔ یہ دھات اور پلاسٹک سے بنا ہوا تھا، آگ نے ایک منٹ سے بھی پہلے اسے تباہ کر دیا ہوگا۔ فتح خان اُچھل پڑا تھا۔

”یہ کیا کیا تم نے؟“

”وہی جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔“ اس کا ردِعمل دیکھ کر مجھے دلی مسرت ہوئی تھی۔ یقیناً موبائل کی تباہی سے اسے تکلیف ہوئی تھی۔ اس میں اس کا کوئی مفاد ہوگا۔ ”میں نے تم سے کہا ہے نا اب تم مجھ سے ذرا بھی رعایت کی امید مت رکھو۔“

فتح خان کا موڈ خراب ہو گیا۔ اس نے غرا کر کہا۔ ”تب تم کو بھی رعایت نہیں ملے گا۔“

”فتح خان مجھے دھمکی مت دو کیونکہ میں نے کبھی تم سے اچھے رویے کی امید نہیں رکھی۔“

”ابھی تم نے فتح خان کو جانا نہیں ہے اگر جان جاتا تو تم کو پتا ہوتا میں تمہارے ساتھ بہت مہربان ہے۔“

”اپنی مہربانی اپنے پاس رکھو۔“ میں نے منہ بنا کر کہا۔

”ضرور۔“ اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”ضرور اپنے پاس رکھے گا.... امید خان۔“ وہ دہاڑا۔ فوراً اس کا وہ آدمی اندر آیا جو مجھے کمرے سے لایا تھا اس کا نام امید خان تھا۔ اس نے مستعدی سے کہا۔

”حکم خان۔“

”اسے لے جاؤ۔“ فتح خان بولا اور پھر مجھ سے کہا۔ ”شہباز خان جلد تم کو پتا چل جائے گا کہ فتح خان کا نامہربانی کیا ہوتا ہے، اب تم شکایت نہیں کرے گا۔“

”میں دشمن سے شکایت کا قائل نہیں ہوں۔ اگر میرا داؤ چل جائے تو تم بھی بُرا مت منانا۔ ویسے اگر کچھ پوچھنا چاہوں تو بتاؤ گے؟“

مجھے لگا کہ فتح خان انکار کر دے گا لیکن پھر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا شاید وہ میرا سوال سننا چاہتا تھا۔ ”بولو؟“

”تم خانہ بدوشوں کی طرف کیوں گئے تھے؟“

”ان سے تصفیے کے لیے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”لیکن وہ وہاں سے غائب ہیں۔“

”اتنی جلدی۔“ میں حیران ہوا۔ ”میرا تو خیال ہے وہ ابھی اسی علاقے میں ہوں گے۔“

”نہیں ہیں میرے ساتھیوں نے چاروں طرف میلوں دیکھا پر ان کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔“

”ان کے ساتھ سامان ہوتا ہے، مویشی اور دوسرے

جانور ہوتے ہیں وہ دیکھتے ہی دیکھتے غائب نہیں ہو سکتے میرا خیال ہے تم مجھے بتانا نہیں چاہتے۔“

”میں سچ کہہ رہا ہے تم ان خانہ بدوشوں کو نہیں جانتا جس کا.... دشمن بن جائے اس کا نسلوں تک پیچھا کرتا ہے۔ ان کا آپس میں رابطہ ہوتا ہے اور ان کے سفر کے علاقے میں کوئی شخص ان کی نظروں سے بچ نہیں سکتا۔ اسی لیے میں ان سے صلح کرنے گیا تھا۔ لاکھ دو لاکھ ان کے سردار کو دیتا تو وہ خود معاملہ سیٹ کر لیتا۔ پر وہ لوگ ملا ہی نہیں۔“

”کیا وہ لوگ جن بھوت ہیں جو اس طرح غائب ہو گئے؟“

”اوہ نہیں شہباز خانا۔“ فتح خان نے بےزاری سے کہا۔ ”یہ لوگ بہت چالاک ہوتا ہے۔ خود کچے علاقوں میں سفر کرتا ہے لیکن ان کے پاس ٹرک ہوتا ہے جو آس پاس کا سڑک پر ہوتا ہے۔ جیسے ہی یہ بھاگنا چاہتا ہے۔ اپنا ٹرک منگواتا ہے۔ سامان اور لوگوں کو اس میں بھرتا ہے۔ کچھ جانور لے کر پیدل بھاگتا ہے۔ جو جانور بھاگ نہیں سکتا اسے بھی ٹرک میں بٹھا لیتا ہے۔ ایک رات میں سو دو سو میل دور چلا جاتا ہے اب آدمی کیسے تلاش کرے اور کہاں تلاش کرے۔ وہ کسی طرف بھی جا سکتا ہے۔“

وہ صحیح کہہ رہا تھا۔ میں نے بھی خانہ بدوشوں کے بارے میں اس قسم کی باتیں سنی تھیں۔ اس گفتگو کے دوران امید خان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا اور وہ بار بار عقب سے شاٹ گن کی نال میری کمر میں چبھو رہا تھا۔ اگرچہ فتح خان کی باتوں میں کوئی ابہام نہیں تھا۔ وہ ان کی دشمنی کے بارے میں بھی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ایک بار یہ خانہ بدوش جس کے دشمن ہو جائیں اس کا قبر تک پیچھا کرتے تھے۔ مگر فتح خان ڈرنے والے لوگوں میں سے نہیں تھا۔ میری چھٹی حس نے خبردار کیا کہ فتح خان مجھ سے کوئی بات چھپا رہا تھا، کوئی ایسی بات جس کا مجھ سے تعلق ہو سکتا تھا۔ اس سے پہلے میں اس سے مزید کوئی سوال کرتا وہ کھڑا ہو گیا۔

”اسے لے جاؤ۔“

امید خان مجھے لے کر کمرے تک آیا۔ نشست گاہ بھی ایک بند کمرا تھا اور اس سے بھی اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ یہ جگہ کہاں ہو سکتی تھی۔ سناٹا بدستور حاوی تھا۔ اگر یہاں فتح خان کے کچھ ساتھی موجود تھے تو وہ کہیں دور تھے یا سو رہے تھے۔ امید خان نے کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں اندر آیا تو سویرا بدستور کمبل میں لپٹی سو رہی تھی۔ اس نے کمبل سر تک لے رکھا تھا۔ میرے اندر آتے ہی امید خان نے دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ کنڈی لگنے کی آواز آئی اور وہ وہاں سے چلا گیا۔ سردی کا احساس کسی قدر بڑھا تھا کیونکہ آتش دان میں آگ کم ہو رہی تھی اور لکڑی جل کر انگاروں میں تبدیل ہو رہی تھی۔ میں کمبل لے کر لیٹ گیا۔ فی الحال میرے پاس سونے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ سویرا سو رہی تھی، اس کی ہلکی سانسوں کی آواز مجھ تک آ رہی تھی۔ میں لیٹا اور کچھ دیر بعد غنودگی میں تھا کہ اچانک مجھے سویرا کی کراہ سنائی دی۔ میں چونک گیا تھا۔ اس کی طرف دیکھا لیکن وہ بدستور کمبل میں ساکت تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اس کی کراہ مجھے سچ مچ سنائی دی تھی یا یہ نیند کا دھوکا تھا۔ چند لمحے تک جب کوئی آواز نہیں آئی تو میں دوبارہ لیٹ گیا اور اسی لمحے سویرا پھر کراہی بلکہ اس نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔ ”نہیں چھوڑ دے میرے کو۔“

اس بار میں اُٹھا نہیں تھا اُچھل پڑا تھا کیونکہ وہ آواز سویرا کی نہیں تھی میں نے جھپٹ کر اس پر سے کمبل اُٹھایا اور دوسری بار زیادہ اُچھلا تھا کیونکہ کمبل تلے خانہ بدوش لڑکی مہرو تھی۔ وہی مہرو جو امیر مقام کی ہوس کا نشانہ بنی تھی اور پھر اس کے شوہر نے انتقاماً امیر مقام کا گلا دبا کر اسے ہلاک کر دیا تھا۔ وہی مہرو اس وقت کمبل تلے اس حال میں تھی اس کا رہا سہا لباس بھی چیتھڑوں میں بدل گیا تھا اور پہلے اگر چند خراشیں تھیں تو اب اس کی شفاف جلد درجنوں خراشوں سے بھری ہوئی تھی۔ چہرے اور جسم پر جا بہ جا نیل اور دانتوں سے بھنبھوڑنے کے نشانات تھے۔ ایک آنکھ کسی قدر سوج گئی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ اس بار وہ ایک نہیں کئی درندوں کی ہوس کا نشانہ بنی تھی۔ سویرا نے مجھے کسی عورت کے بارے میں بتایا تھا، اس نے اس کے چلانے کی آواز سنی تھی۔ وہ عورت یقیناً مہرو تھی لیکن مہرو یہاں تھی تو سویرا کہاں تھی؟

اس سوال نے مجھ میں بجلی بھر دی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے فتح خان نے مجھے دھمکی دی تھی کہ جلد مجھے پتا چل جائے کہ اس کی نامہربانی کیا ہوتی ہے اور مجھے پتا چل گیا تھا۔ میں دروازے کی طرف جھپٹا اور اسے پیٹنے لگا۔ ساتھ ہی میں چلا چلا کر فتح خان کو گالیاں دے رہا تھا۔ ایک منٹ بعد فتح خان کی مسرور آواز سنائی دی۔ ”شہباز خان کیوں اپنی توانائی ضائع کرتا ہے؟“

”فتح خان۔“ میں نے دہاڑ کر کہا۔ ”اگر سویرا کو خراش بھی آئی تو....“

”تو تم توپ لا کر ہم کو اُڑا دے گا۔“ اس کی آواز میں طنز آ گیا۔ ”تم کیوں عقل کا بات نہیں کرتا ہے۔ تم جانتا ہے کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

فتح خان اچھا آدمی نہیں ہے وہ اپنے مفاد کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے لیکن لگتا ہے تم نے فتح خان کو اہمیت نہیں دیا۔ اب تم کو پتا چل گیا ہوگا کہ فتح خان کیا کر سکتا ہے۔''

اس کی بات نے مجھے ٹھنڈا کر دیا تھا اور میں نے محسوس کیا کہ میں فتح خان جیسے شاطر دشمن کے سامنے بہت کمزور کارکردگی پیش کر رہا تھا۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''فتح خان سویرا کہاں ہے؟''

''وہ محفوظ ہے ابھی شہلا کے ساتھ ہے۔'' وہ بولا۔ ''لیکن میرے پاس کچھ دوسرا لوگ بھی ہے جو عورت کا کیا حشر کرتا ہے یہ تم نے دیکھ لیا ہوگا۔''

''فتح خان اس طرح عورتوں پر ظلم کرنے والے میرے نزدیک زنخوں سے بھی بدتر ہوتے ہیں۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''تمہارے آدمیوں کی جرأت تو میں دیکھ چکا ہوں جب خانہ بدوشوں کو دیکھتے ہی انہوں نے کتے کی طرح دُم دبا کر ہتھیار رکھ دیے تھے۔ یہ صرف عورتوں پر اپنی مردانگی دکھا سکتے ہیں۔''

''شہباز خان کام کا بات کرو۔'' اس نے بور ہونے والے انداز میں کہا۔ ''میں تم سے کام کا بات کرنا چاہتا ہے اور تم اِدھر اُدھر کا بات شروع کر دیتا ہے۔''

میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھ سے کیا چاہتا تھا۔ وہ برٹ شا کے ہیروں کے پیچھے پاگل ہو رہا تھا اور ہر قیمت پر انہیں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے وہ میری مدد چاہتا تھا۔ شاید اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ جس کام میں، میں ہاتھ ڈالتا ہوں وہ ہو جاتا ہے۔ حالانکہ وہ خود میری ناکامیوں کا سبب تھا اور کئی کا گواہ بھی۔ تازہ کیس چینی بریف کیس کا تھا جسے میں تمام تر پلاننگ کے باوجود حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ نہ جانے کس بنا پر ایسا سمجھ رہا تھا کہ میں جو کام کرنا چاہوں وہ کسی نہ کسی طرح ہو جاتا ہے۔ میں نے سوچ کر کہا۔

''فتح خان میں تم سے تعاون کرنے کو تیار ہوں، لیکن اس بات کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ وہ ہیرے مل جائیں گے، تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اس کئی مربع میل پر پھیلی وادی میں انہیں تلاش کرنا کس قدر مشکل کام ہے۔''

''شہباز خان تم کو یہ کام کرنا ہی ہوگا۔'' فتح خان کا لہجہ بدل گیا۔ ''اور تم بھول رہا ہے ضمانت میرے پاس ہے۔''

وہ سویرا کو ضمانت قرار دے رہا تھا یعنی اگر میں ہیرے تلاش کرنے میں ناکام رہتا تو اس کی سزا سویرا کو ملتی۔ ''فتح خان تم پاگل ہو گئے ہو، ایک ناممکن کام کے لیے ایک شخص کو زبردستی مجبور کر رہے ہو۔ سویرا کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر ہیرے تلاش کرنا اتنا آسان ہوتا تو یہ اب تک تمہیں مل چکے ہوتے۔ تم خود بھی تو سالوں سے انہیں تلاش کر رہے ہو۔''

''تم فکر مت کرو میں پاگل نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے تم ہیرے تلاش کر سکتا ہے۔ سویرا سے تمہارا تعلق ہے، اگر تم ناکام رہا تو سزا اس کو ملے گا اور پتا ہے میں کیا کرے گا؟''

وہ شاید اس سلوک کی دھمکی دے رہا تھا جو اس کے آدمی مہرو کے ساتھ کر چکے تھے۔ ''فتح خان تم کیا کرو گے؟''

''میں سویرا کو مرشد کے حوالے کر دوں گا۔'' اس نے قطعی لہجے میں کہا۔

میں دہل کر رہ گیا تھا۔ ''تم ایسا نہیں کر سکتے۔''

''میں ایسا ہی کرے گا۔'' وہ بولا۔ ''سویرا اب اِدھر نہیں ہے۔ وہ شہلا کے ساتھ ایک اور جگہ جا چکا ہے۔ اب تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، جلد میں تم کو اُدھر لے جائے گا اور پھر تم کو مہلت دے گا۔ اگر تم نے مہلت میں ہیرا تلاش کر لیا تو میں سویرا کو واپس حویلی پہنچا دے گا ورنہ.....''

اس ورنہ سے آگے جو تھا وہ بہت خوف ناک تھا لیکن یہ حقیقت بھی تھا۔ فتح خان مذاق کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''فرض کرو میں ایسا ہی کرتا ہوں جیسا تم چاہتے ہو لیکن تمام تر کوشش کے باوجود میں ہیرے تلاش کرنے میں ناکام رہتا ہوں تب بھی تم سویرا کو مرشد کے حوالے کر دو گے؟''

''مجھے ہیرے چاہئیں۔'' اس نے کہا۔ ''تم ہیرے لاؤ اور سویرا کو لے جاؤ اس کے سوا کوئی دوسرا بات نہیں ہو سکتا۔''

''فتح خان.....''

''اب تم آرام کرو اور سوچو تمہارے پاس کل تک کا مہلت ہے۔''

''فتح خان میری بات سنو اس عورت کے لیے کپڑے دو۔'' میں نے چلا کر کہا لیکن فتح خان قہقہہ لگاتا ہوا جا چکا تھا۔ اس کے آدمیوں نے اس بے بس عورت سے امیر مقام کا انتقام لیا تھا۔ بلکہ انتقام کیا لیا تھا ایک طرف انہوں نے اپنی ہوس پوری کر لی اور دوسری طرف مجھے دھمکانے کا بندوبست کر دیا کہ میں نے فتح خان کی بات نہ مانی تو سویرا کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔ اگرچہ فتح خان نے اپنے آدمیوں کے حوالے سے دھمکی نہیں دی تھی بلکہ اسے مرشد کے حوالے کرنے کو کہا تھا۔ مگر اس صورت میں سویرا کو کہیں سنگین صورتِ حال کا

سامنا کرنا پڑتا۔ مرشد سے زیادہ نادر خطرناک تھا۔ مجھ سے اور میرے ساتھیوں سے اس دنیا میں شاید ہی کوئی اتنی نفرت کرتا ہوگا جتنی کہ نادر کرتا تھا اور اگر میرا کوئی پیارا اس کے ہاتھ آ جاتا تو وہ اس کے لیے اذیت کا ہر ممکن سامان مہیا کر دیا۔

فتح خان کے جانے کے بعد میں نے مہرو کی طرف دیکھا تو اسے ہوش میں پایا، وہ کمبل میں دبکی ہوئی خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں پہلے بھی اسے دیکھ چکا تھا۔ اس وقت وہ امیر مقام کی درندگی کا شکار ہونے کے باوجود ایک حوصلہ مند اور نڈر عورت نظر آئی تھی۔ لیکن اس بار اس کی شخصیت کچل کر رہ گئی تھی۔ اس کی ساری بہادری اور حوصلہ رخصت ہو گیا تھا اور وہ بے بسی اور بے چارگی کی تصویر نظر آ رہی تھی۔ ہوش میں ہونے کے باوجود اس کے حواس پوری طرح بحال نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے میری اور فتح خان کی گفتگو سننے کے باوجود وہ مجھ سے خوف زدہ تھی اور شاید اس کا خیال تھا کہ اسے ہوش میں دیکھ کر میں بھی اس کے ساتھ وہی سلوک کروں گا۔ جو شاید یہاں آتے ہی اس کے ساتھ روا رکھا گیا تھا۔ اس کا اعتبار ختم ہو گیا تھا اور وہ ہر مرد کو ایسا ہی سمجھ رہی تھی۔

میرا خون کھولنے لگا تھا۔ فتح خان کے بارے میں میرا نرم تاثر اس ایک دن میں تباہ ہو کر رہ گیا تھا۔ اگرچہ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے شہلا کے ساتھ بھی تقریباً یہی سلوک کیا تھا لیکن ایک تو وہ خود آزاد خیال عورت تھی اور دوسرے اس نے خود اپنی عزت کے لٹیروں سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ اس لیے میں نے زیادہ دخل اندازی سے گریز کیا تھا۔ ویسے بھی میں خدائی فوج دار نہیں ہوں جو ہر معاملے میں ٹانگ اڑاؤں مگر اس عورت سے کیے جانے والے بہیمانہ سلوک نے میرے اندر فتح خان اور اس کے ساتھیوں کے لیے ذرا سا بھی نرم گوشہ ختم کر دیا تھا۔ خانہ بدوش کیسے ہی سہی انہوں نے امیر مقام سے بالکل ٹھیک سلوک کیا تھا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ اگر مجھے موقع ملا تو میرا سلوک بھی اس سے مختلف نہیں ہوگا۔

مہرو بہت خوف زدہ تھی۔ اس لیے میں نے اس کے قریب جانے سے گریز کیا۔ میں چاہتا تھا کہ اس کا خوف کم ہو جائے۔ اس لیے میں دروازے کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے نرمی سے کہا۔ ''مہرو تمہیں یاد ہے اس مکان میں جہاں تمہیں قید کیا گیا تھا وہاں میں بھی ان لوگوں کی قید میں تھا۔''

اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ ایک ٹک مجھے دیکھ رہی تھی۔ لیکن میں آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ اس کے بارے میں بتایا جب امیر مقام اسے پکڑ کر لایا تھا۔ پھر جب اس کے قبیلے والے مکان میں گھس آئے اور انہوں نے اسے تلاش کر لیا۔ مہرو کے شوہر نے امیر مقام کا گلا گھونٹ کر اپنا انتقام لے لیا تھا اور وہ مزید انتقام کے چکر میں پڑنے کے بجائے اپنا راستہ لیتا تو اس انجام سے بچ جاتا جو اسے فتح خان کے ہاتھ سے نصیب ہوا تھا۔ شہلا کے چکر میں وہ اپنی جان سے گیا تھا۔ شوہر کا ذکر آنے پر مہرو کے تاثرات ذرا بدلے تھے۔ میں نے کہا۔

''میں بے ہوش ہو گیا تھا لیکن مجھے بعد میں بتایا گیا کہ تمہارے شوہر کو فتح خان نے گولی ماردی تھی۔ تم وہاں تھیں تم نے تو دیکھا ہوگا۔''

اس بات پر مہرو کی آنکھیں بھر آئیں اور پھر وہ رونے لگی۔ شروع میں وہ آہستہ آواز میں رو رہی تھی لیکن پھر اس نے بلند آواز سے دھاڑیں مار کر روتے ہوئے اپنے شوہر اور اپنی عزت کا بین کرنا شروع کر دیا۔ میں نے اس کے رونے دھونے میں مداخلت نہیں کی۔ میں چاہتا تھا کہ اس کے دل کی بھڑاس نکل جائے اور وہ مجھ پر کسی حد تک اعتماد کرنے لگے تب میں اس سے بات کروں۔ وہ ہوش میں یہاں آئی تھی اس لیے اس نے بہت کچھ دیکھا ہوگا۔ اسے علم ہوگا کہ یہ جگہ کیسی ہے اور فتح خان کے کتنے ساتھی یہاں ہیں۔ وہ دیر تک روتی رہی۔ پھر اس کی دھاڑیں سسکیوں میں بدل گئیں اور رفتہ رفتہ وہ بھی رکنے لگیں۔ اس موقع پر میں نے ذرا آگے آ کر پانی کی بوتل اس کی طرف سرکائی اور نرمی سے کہا۔ ''پانی پی لو۔''

''مجھ کو نہیں پینا۔'' اس نے بھرائی آواز میں کہا۔ ''مجھے مر جانے دو۔''

''تمہارے مرنے سے کسی کا نقصان نہیں ہوگا۔ بلکہ تمہارے شوہر کے قاتل اور تمہاری عزت کے لٹیرے خوش ہوں گے کہ تم سے جان چھوٹ گئی۔ وہ خود بھی یہی چاہتے ہیں کہ تم مر جاؤ۔''

''تب مجھے مار کیوں نہیں دیا؟'' وہ پھر رونے لگی۔ ''ایسا کیوں کیا میرے ساتھ؟''

''کیونکہ یہ انسان کے روپ میں درندے ہیں، تمہارے شوہر نے ان کے ایک ساتھی کو مارا تھا اب یہ اس کا انتقام تم سے لے رہے ہیں۔''

''راجو نے ٹھیک کیا۔'' وہ تڑپ کر بولی اور پھر راجو کا نام لے کر بین کرنے لگی۔ اگرچہ وہ اس سے عمر میں خاصا بڑا تھا اور صورت کا بھی خاص نہیں تھا لیکن وہ اس سے یقیناً محبت

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کرتی تھی ورنہ اس کے مرنے کا اس طرح غم نہ کرتی۔ ویسے وہ اپنے لوگوں میں نہیں تھی کہ دکھاوے کے لیے ہی روتی دھوتی۔ یہاں اسے دکھاوے کی مجبوری نہیں تھی۔ میں نے اس بار بھی مداخلت نہیں کی۔ اس کے خاموش ہونے کا انتظار کرتا رہا اور جب اس کی سسکیاں مدھم پڑ گئیں تو میں نے پانی گلاس میں ڈال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس بار اس نے انکار نہیں کیا اور پانی پی لیا۔ پانی پی کر وہ پُرسکون اور کسی قدر پہلے والی حوصلہ مند مہرو نظر آنے لگی۔

''تم اپنے شوہر کے قاتلوں اور اپنی عزت کے لٹیروں سے بدلہ لینا چاہتی ہو؟'' میں نے آہستہ سے کہا تو وہ ایک بار پھر تڑپ گئی تھی اس نے چلّا کر کہا۔

''ہاں میں ان کو اپنے ہاتھوں سے ٹکڑے کرنا چاہتی ہوں۔''

''تب تمہیں حوصلہ کرنا ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''خود پر قابو پاؤ اور موقع کا انتظار کرو، یقین کرو تم کو ایک موقع ضرور ملے گا اور تب تم ان لوگوں سے انتقام لے سکو گی لیکن شرط یہ ہے تم خود پر قابو رکھو اور جیسا میں کہوں ویسا کرتی رہو۔''

''میں کیا کروں؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔ ''میں ان سب کتوں کو اپنے ہاتھ سے مارنا چاہتی ہوں۔''

''پہلے تو اپنی آواز آہستہ کرو اگر ان لوگوں کو پتا چل گیا تو تمہارا انتقام یہیں ختم ہو جائے گا، اس لیے پہلے ان لوگوں کو فریب دو۔ دھوکے میں رکھو۔ یہ بتاؤ تمہیں اسلحہ چلانا آتا ہے؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں راجو نے میرے کو پستول اور بندوق چلانا سکھایا ہے۔''

''دیکھو مہرو! اگر تم انتقام لینا چاہتی ہو تو پہلے ان لوگوں کو دھوکے میں رکھنا ہوگا۔ ایک بار یہ تمہیں کمزور عورت سمجھ کر دھوکے میں آگئے تو تم ان سے انتقام لے سکتی ہو۔ یہ سارے چھٹے ہوئے بدمعاش ہیں اور ان کے پاس اسلحہ بھی ہے... لیکن اندر سے یہ بزدل ہیں۔ تم ان کا سامنا کر چکی ہو اور ان کے بارے میں جانتی ہو۔''

اس کے چہرے پر نفرت اور انتقام کی سرخی پھیل گئی تھی۔ اس نے بلا تکلف قالین پر تھوکا اور بولی۔ ''اس سور ما کو دیکھا تھا جس نے میری عزت لوٹی تھی جب راجو اس کا گلا دبا رہا تھا تو کیسے بھیک مانگ رہا تھا۔''

وہ درست کہہ رہی تھی۔ میں نے اس کی تائید کی۔ ''تم نے ٹھیک کہا ہے، یہ سب ایسے ہی بزدل ہیں۔ ایک کمزور عورت پر ظلم کرنے والے دنیا کے سب سے بزدل ہوتے ہیں اور ایسے لوگوں کو مارنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا بس اس کے لیے ذرا ہوشیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''میں سب کروں گی۔'' اس نے جوش سے کہا۔ ''ان کتوں سے بدلہ لینے کے لیے مجھے ان کے پاس جانا پڑا تو میں جاؤں گی۔''

دراصل میں نے محسوس کر لیا تھا کہ یہ اس عورت کو یہاں صرف مجھے دھمکانے کے لیے لائے تھے اور وہ زیادہ دیر اسے یہاں نہیں رکھیں گے۔ وہ اسے دوبارہ لے جائیں گے اور اس وقت تک اپنی ہوس کا نشانہ بناتے رہیں گے جب تک وہ مر نہیں جاتی۔ وہ اسے زندہ چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ فتح خان کی صلح کے لیے خانہ بدوش قبیلے کے پیچھے جانے والی بات بھی مجھے دھوکا لگ رہی تھی۔ اگر اس نے ان لوگوں سے صلح کرنی ہوتی تو مہرو کو اغوا کرنے کے بعد اس سلوک کا نشانہ نہ بناتے بلکہ اسے خانہ بدوشوں پر دباؤ کے لیے استعمال کرتے۔ فتح خان اگر واپس اس طرف گیا تھا تو اس کی وجہ کچھ اور ہو سکتی تھی۔ وہ ہرگز نہیں جو وہ بیان کر رہا تھا۔ خوش قسمتی سے مجھے مہرو کی صورت میں ایک فرد مل گیا تھا جو میری معلومات میں اضافہ کر سکتا تھا۔

''مہرو میرے کچھ سوالوں کا جواب خوب سوچ سمجھ کر اور یاد کر کے، دینا فوراً مت دینا، اس سے بھی ہمیں ان لوگوں سے انتقام لینے میں مدد ملے گی۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں میں سمجھ گئی۔''

وہ اٹھ بیٹھی تھی اور اس نے اس دوران میں بوتل سے کئی بار پانی پیا تھا۔ وہ شدید پیاسی تھی۔ ایک تو اس کے ساتھ کیا جانے والا سلوک اور پھر اسے پانی بھی نہیں دیا گیا ہو گا۔ ورنہ اس موسم میں اتنی پیاس نہیں لگتی ہے۔ اپنے چیتھڑے لباس سے جھانکتے جسم کو اس نے کمبل میں چھپا لیا تھا۔ اس کا مخصوص اعتماد بحال ہو گیا تھا۔ میں نے پوچھا۔

''تم نے دیکھا یہ جگہ کہاں ہے جہاں اس وقت ہم قید ہیں؟''

اس نے سوچا اور پھر بولی۔ ''یہ مجھے گاڑی میں نیچے لٹا کر لائے تھے اور راستے میں بھی مجھے نوچتے کھسوٹتے رہے تھے۔ میں نہیں دیکھ سکی کہ کدھر لائے ہیں۔ پر جب یہ مجھے اندر لا رہے تھے تو میں نے دیکھا تھا۔ باہر سے یہ بہت بڑا مکان ہے، بہت بڑا کھلا حصہ ہے۔''

مہرو کا مطلب تھا کہ یہ بڑی سی کوٹھی ہے۔ ''کھلے حصے میں پھول پودے اور گھاس لگی ہے، کچا ہے یا جھاڑ جھنکاڑ ہے؟''

''گھاس پھول والے پودے لگے ہیں۔'' اس نے

انکشاف کیا۔ ''باہر بھی ماربل پتھر لگا ہے۔ بہت خوبصورت لگ رہا ہے۔''

''اندر سے کیسا ہے یہ مکان؟''

''محل جیسا۔'' وہ بولی۔ ''پر یہ میرے کو ایک گندے سے کمرے میں لے گئے تھے اور وہاں.....'' وہ بولتے بولتے رک گئی۔ میں سمجھ گیا۔

''ٹھیک ہے اسے چھوڑو، یہ بتاؤ کہ کتنے آدمی ہیں یہاں؟''

''چار تو تیری والی گاڑی میں تھے۔''

''میرے اور ایک لڑکی کے علاوہ؟''

''نہیں تم دونوں کے ساتھ، وہ لڑکی کون ہے؟''

''میری ساتھی ہے، کچھ دیر پہلے وہ اسی کمبل میں سو رہی تھی لیکن یہ مجھے باہر لے گئے اور اسے کہیں اور بھیج دیا ہے۔''

''کہیں اس گندے کمرے میں نہ لے گئے ہوں۔'' اس نے بے ساختہ کہا تو میرے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی تھی۔

''نہیں۔'' میں نے یقین سے کہا۔ ''فتح خان اس کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا ہے۔''

''کیوں نہیں کر سکتا.....؟ یہ بہت گندے لوگ ہیں۔''

''نہیں کر سکتا۔'' اس بار میں بولا تو میری آواز میں غراہٹ تھی۔ ''وہ مجھے جانتا ہے۔''

میری غراہٹ نے مہرو کو سہا دیا تھا۔ اس نے پھر اصرار نہیں کیا۔ یقین کے باوجود مہرو کی بات نے کچھ دیر کے لیے میرے خیالات کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ میں فی الحال سویرا کے بارے نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ اس لیے خیالات کو دوبارہ جمع کرنے میں کچھ وقت لگا تھا۔ میں نے کہا۔ ''دوسری گاڑی میں تمہارے ساتھ کتنے آدمی تھے؟''

''چار۔'' وہ بولی۔ ''وہی کتے مجھے اندر لے گئے تھے۔ ہاں ان کے ساتھ وہ عورت بھی تھی۔'' اس کا اشارہ یقیناً شہلا کی طرف تھا۔

گویا فتح خان سمیت یہاں اس کے پانچ ساتھی تھے، اگر شہلا اور سویرا کو لے جانے کے لیے ایک دو افراد ساتھ تھے تو یہاں موجود افراد کی تعداد چار یا پانچ رہ گئی تھی۔ اگرچہ اس کا امکان کم تھا کہ مہرو جیسی کمزور عورت ان پیشہ ور بدمعاشوں کے خلاف کچھ کر سکے لیکن میں کوشش تو کر سکتا تھا۔ بعض اوقات کمزور نظر آنے والی چیونٹی ہاتھی جیسے دیو قامت جانور کی موت کا سبب بن جاتی ہے۔ ایسے ہی مہرو بھی شاید ان لوگوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا سبب بن جاتی۔ اگر مہرو کامیاب بھی ہو جاتی تو اس سے مجھے شاید کوئی فائدہ نہ ہوتا کیونکہ سویرا بدستور فتح خان کے قبضے میں رہتی لیکن ممکن ہے چند ساتھی کم ہونے سے فتح خان کمزور پڑ جاتا اور مجھے اس کے خلاف موقع مل جاتا۔ میں نے پوچھا۔

''ان کے پاس کس قسم کا اسلحہ ہے، تم نے دیکھا ہوگا؟''

اس نے سوچا اور پھر بغیر نام کے مجھے اسلحے کی جو تفصیل بتائی اس کے مطابق ان لوگوں کے پاس خودکار رائفلیں تھیں۔ یہ شاید جدید ساخت کی کلاشنکوف اے کے چوہتر تھیں جن کا شمار دنیا کی بہترین اسالٹ رائفلوں میں ہوتا ہے۔ چھوٹی ہونے کے باوجود ان کی حد مار اور درستگی اے کے سینتالیس سے کہیں بہتر ہے۔ اس کے علاوہ شاٹ گنز تھیں اور شاید پستول بھی تھے۔ مہرو کے لیے سب سے آسان اور بہترین ہتھیار رائفل ہو سکتی تھی کیونکہ یہ استعمال میں آسان ہوتی ہے اور اس کا ایک ہی برسٹ کئی افراد کو دوسری دنیا کی سیر کرانے کے لیے کافی ثابت ہو سکتا ہے۔ میں نے یادداشت کی مدد سے مہرو کو اس رائفل کا ممکنہ استعمال بتایا۔ اس کے سیفٹی لاک اور اسے کھولنے کے طریقے کے بارے میں سمجھایا۔ وہ غور سے میری بات سن رہی تھی۔ کئی بار سمجھانے پر اس نے سر ہلایا۔

''میں سمجھ گئی۔''

پھر اس نے خود مجھے بتایا کہ یہ رائفل کیسے استعمال کرتے ہیں۔ مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ وہ اتنی آسانی سے میرے منصوبے سے متفق ہو گئی تھی اور اب ان لوگوں سے انتقام لینے کے لیے بے چین تھی۔ وہ مضبوط اعصاب کی باہمت عورت تھی۔ اس نے مختصر سے وقت میں جو دیکھا اور سہا تھا وہ ہر عورت کے بس کی بات نہیں ہوتی..... اس کی جگہ کوئی اور ہوتی تو اب تک پاگل ہو گئی ہوتی یا جان دے چکی ہوتی۔ انتقام لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر وہ خانہ بدوش تھی اور یہ لوگ سخت جان ہونے کے ساتھ زندگی اور موت کے بارے میں منطقی رویّہ رکھتے ہیں۔ خوشی اور غم کا احساس مختصر وقت کے لیے ہی ان پر غلبہ پاتا ہے۔ کسی بھی جذبے کو زیادہ دیر خود پر طاری نہیں رکھتے.... اور جلد معمول پر آجاتے ہیں۔ اس نے کل سے کچھ نہیں کھایا تھا اور ان لوگوں نے اسے نچوڑ لیا تھا۔ اس کے چہرے سے نقاہت جھلکنے لگی تھی۔ صرف پانی پی کر اس نے خود کو سنبھالا ہوا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

''اب تم لیٹ جاؤ اور یوں ظاہر کرو کہ بہت کمزور اور ہوش میں نہیں ہو۔''

وہ سچ مچ آرام کی ضرورت محسوس کر رہی تھی۔ اس لیے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

لیٹ گئی۔ میں کمبل لپیٹ کر دیوار سے پشت لگا کر بیٹھ گیا۔ اب مجھے انتظار تھا فتح خان یا اس کے آدمیوں کا جو مہرو کو یہاں سے لے جاتے۔ جب تک میں اس سے بات کر رہا تھا مجھے کچھ محسوس نہیں ہوا لیکن جب وہ لیٹ گئی تو مجھے ندامت ہونے لگی میں اس مظلوم عورت کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ اگر وہ وہی کرتی جو میں نے اسے سمجھایا تھا تو اس کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ممکن ہے وہ فتح خان کے دو تین ساتھیوں کو مار دیتی لیکن ساتھ ہی وہ خود بھی ماری جاتی۔ لیکن اس کا بچنا ویسے بھی ممکن نہیں تھا۔ فتح خان شاید مجھے عبرت دلانے کے لیے اسے ساتھ لایا تھا اور اس سے یہ کام لے لیا تھا اس لیے اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ فتح خان جیسے لوگ بلاوجہ کا بوجھ نہیں اٹھاتے ہیں وہ اسے ختم کر کے کہیں دفنا دیتا اور اس کے قبیلے والوں کو بھی اس کے انجام کا پتا نہیں چلتا۔ پھر بھی مجھے ایک عورت کو اس طرح استعمال کرتے ہوئے ندامت ہو رہی تھی۔

اس بند کمرے میں وقت کا پتا نہیں چل رہا تھا لیکن میرا اندازہ تھا کہ صبح قریب تھی۔ بیٹھے بیٹھے مجھے اونگھ آ گئی تھی کہ اچانک دروازہ کھلا اور فتح خان کے دو آدمی اندر گھس آئے۔ جبکہ ایک آدمی باہر رہا تھا۔ میں نے ان کو پہلے بھی دیکھا تھا۔ میں چونکا تو ان میں سے ایک غرا کر بولا۔ ”خبردار اپنا جگہ بیٹھے رہو۔“

وہ مسلح تھے لیکن ان کی رائفلیں شانوں سے جھول رہی تھی البتہ باہر موجود آدمی پستول لیے ہوئے تھا اور پوری طرح چوکنا تھا۔ اس نے پستول کا رُخ میری طرف کر دیا۔ آنے والوں نے مہرو پر پڑا کمبل کھینچ کر ایک طرف پھینک دیا اور پھر اسے جان بوجھ کر یوں اُٹھایا کہ سامنے سے اس کی قمیص جو پہلے ہی پھٹی ہوئی تھی کھل گئی۔ ان کی ہوسناک نظریں مہرو کے جسم پر رینگ رہی تھیں۔ دونوں نے اس کا ایک ایک بازو تھام رکھا تھا اور وہ یوں جھول رہی تھی جیسے نیم بے ہوش ہو۔ اس کی حالت دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا۔ اگر وہ سچ مچ اتنی بے حال تھی تو اس سے کسی کارروائی کی توقع فضول تھی اور اگر وہ اداکاری کر رہی تھی تو بہت اچھی اداکارہ تھی۔ میں نے کہا۔

”تم لوگوں نے اس کا یہ حال کر دیا ہے اب تو اس پر رحم کرو۔“

”رحم کرنے تو لے جا رہا ہے۔“ مجھے خبردار کرنے والے نے معنی خیز انداز میں کہا۔ پھر وہ مہرو کو کھینچتے ہوئے لے گئے اور دروازہ بند ہو گیا۔ وہ معمولی سی مزاحمت کر رہی تھی اور اس کے منہ سے فریاد بھری آوازیں نکل رہی تھیں۔ فتح خان کے آدمیوں کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ اسے گنے کی طرح نچوڑنے لے جا رہے تھے۔ جیسے گنا مشین والا گنے کو کئی بار مشین سے گزار کر اس کا سارا رس نکال لیتا ہے اور پھر بچ جانے والا پھوک پھینک دیا جاتا ہے اسی طرح جب مہرو ایک بے جان جسم رہ جاتی تو اسے کہیں گاڑ دیتے۔ جب دروازہ کھلا تھا تو میری نظر سامنے والے کمرے کے دروازے پر گئی تھی اور جب وہ لوگ چلے گئے تو مجھے خیال آیا۔ یہاں سے نکلنے کے بعد ایک چھوٹا ہال تھا اور اس کا ایک ہی دروازہ تھا اور یہ دروازہ نشست گاہ میں کھلتا تھا۔ اگر اس حصے میں آمدورفت کا یہی راستہ تھا تو میں نے سویرا کو لے جاتے اور مہرو کو لاتے نہیں دیکھا تھا اس کے علاوہ یہی سامنے والے کمرا باقی رہ جاتا تھا جہاں سے کسی کو لایا اور لے جایا جا سکتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کمرے میں باہر کا کوئی راستہ بھی تھا۔

آتشدان میں بیشتر لکڑی جل چکی تھی اور اب انگارے دہک رہے تھے، صرف کناروں کی کچھ لکڑی بچی تھی۔ کمرے کا دروازہ اندر کی طرف کھلتا تھا اور اندر صرف ایک کنچر لگا تھا۔ باہر کنڈی تھی جو اسکروز سے فٹ تھی لیکن یہ اسکروز اندر تک نہیں آئے تھے یعنی وہ لکڑی کے پار نہیں ہوئے تھے۔ یہ تقریباً دو انچ موٹا دروازہ تھا۔ جو ٹھوس لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ اندر لگا کنچر درمیان میں تھا جبکہ باہر لگی کنڈی دروازے کے کسی قدر اوپری حصے میں تھی۔ میرے ذہن میں ایک خیال خاصی دیر سے تھا۔ لیکن مجھے اسے عملی جامہ پہنانے کا موقع نہیں ملا تھا اور یہ موقع شاید اب آ گیا تھا۔

میں نے آتشدان میں جلنے سے بچ جانے والی ایک تقریباً دو فٹ لمبی لکڑی اٹھائی اس کا اگلا سرا کالا ہو رہا تھا اور انگاروں پر رکھنے سے اس نے ایک منٹ میں آگ پکڑ لی۔ یہ بالکل خشک لکڑی تھی اور بہت معمولی سا دھواں چھوڑ رہی تھی۔ میں لکڑی لے کر دروازے کے پاس آیا کچھ دیر باہر کی سن گن لیتا رہا لیکن باہر بالکل سناٹا تھا۔ تب میں نے لکڑی کا جلتا سرا دروازے کے اس حصے سے لگا دیا جس کے باہر کنڈی لگی تھی۔ آگ نے ایک منٹ میں اوپری پالش کو جلا ڈالا تھا اور نیچے سے لکڑی نکل آئی۔ لیکن یہ دیودار کی سخت لکڑی تھی جو آسانی سے آگ نہیں پکڑتی ہے۔ اسے آگ لگانے کے لیے ضروری تھا کہ میں بہت دیر تک لکڑی کا جلتا سرا در[illegible] سے لگائے رکھتا۔

جب تک لکڑی آتشدان میں جل رہی تھی تو اس کا اُٹھتا دھواں چمنی کے راستے باہر جا رہا تھا اور کمرے میں اس کا اثر بہت کم تھا لیکن اب لکڑی سے اُٹھتا دھواں کمرے میں بھر رہا تھا اور ہلکا ہونے کے باوجود اس نے چند منٹ میں کمرے کی فضا کو دھندلا دیا تھا۔ اب یہ دھواں سانس لیتے ہوئے سینے میں لگ رہا تھا۔ دس منٹ بعد دروازے کی لکڑی سیاہ ہونا شروع ہو گئی تھی۔ مگر اس وقت تک دھواں اس قدر ہو چکا تھا کہ اس میں سانس لینا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے لکڑی آتش دان میں اس طرح رکھ دی کہ وہ جلنے سے محفوظ رہے اور خود کمبل کا ایک حصہ پانی سے بھگو کر اس میں منہ رکھ کر سانس لینے لگا۔ دھواں آنکھوں میں لگ رہا تھا اور جلن کے ساتھ پانی بہنے لگا تھا۔ بہرحال لکڑی واپس رکھنے سے دھواں کم ہونے لگا اور اگلے چند منٹ میں یہ اتنا کم ہو گیا کہ اب میں بھیگے کمبل پر منہ رکھے بغیر بھی سانس لے سکتا تھا۔ میرا اندازہ درست تھا یہاں وینٹی لیشن کا کوئی نظام تھا جو اندر تازہ ہوا پھینکتا تھا اور باسی ہوا کو باہر لے جاتا۔ اگرچہ دیواروں میں بہ ظاہر کوئی ایسا سوراخ نہیں تھا جہاں سے ہوا کی آمدورفت ممکن ہوتی۔

جب دھواں خاصی حد تک کم ہو گیا تو میں لکڑی لے کر دوبارہ اُٹھا اب یہ فٹ بھر رہ گئی تھی۔ دس منٹ بعد جب میں نے لکڑی بالکل چھوٹی رہ جانے اور کمرا دھوئیں سے ایک بار پھر بھر جانے پر اسے آتش دان میں ڈالا تو دروازے کا کنڈی والا حصہ بالکل کوئلہ ہو چکا تھا۔ دھواں کم ہونے کے بعد میں نے کنچر پکڑ کر دروازے پر زور آزمائی کی۔ شروع میں تو وہ ساکت رہا تھا لیکن میں مستقل مزاجی سے اسے ہلانے کی کوشش کرتا رہا تو کچھ دیر بعد اس میں ذرا جنبش پیدا ہوئی تھی۔ آگ نے لکڑی کو جلا ڈالا تھا اور اس میں گڑی اسکرو کیلوں کی گرفت کمزور ہو گئی تھی۔ اگر میں کوشش کرتا تو اسکروز دروازے سے نکل جاتے اور یہ کھل جاتا۔ ابھی میں کوشش کر رہا تھا کہ مجھے کہیں دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور میں تیزی سے واپس آ کر کمبل میں لپٹ کر لیٹ گیا۔ فوراً ہی دروازہ کھلا۔ میں نے ظاہر کیا جیسے میں گہری نیند سے اُٹھ گیا ہوں۔ آنے والا فتح خان تھا اور اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ کمرے میں دھواں بہت کم رہ گیا تھا لیکن اس نے محسوس کر لیا۔

”دھواں کیوں ہو رہا ہے؟“ اس نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

”ہاں دھواں ہو رہا ہے۔“ میں نے سادگی سے کہا۔ ”مجھے کیا پتا کیوں ہو رہا ہے؟“

اس نے آتشدان کی طرف دیکھا۔ ”اب تو اس میں بھی انگارہ رہ گیا ہے؟“

”ایسا کرو چمنی میں گھس کر دیکھ لو ہو سکتا ہے اس میں کوئی مسئلہ ہو گیا ہو؟“ میں نے جواب دیا۔ ”تمہارے آدمی اس لڑکی کو پھر لے گئے ہیں کیا وہ اس کی جان لے کر چھوڑیں گے۔“

”یہ ان کا معاملہ ہے۔“ وہ بے نیازی سے بولا۔ ”امیر مقام ان کا دوست تھا اور وہ اس لڑکی کی وجہ سے مارا گیا۔“

”لڑکی کی وجہ سے نہیں اپنے کرتوتوں کی وجہ سے۔“ میں نے تصحیح کی۔ ”لگتا ہے تم نے سارے بدکردار اوباش لوگ جمع کر رکھے ہیں۔ ویسے تمہارا اپنا کردار کون سا اچھا ہے، تم نے کیریئر کا آغاز ہی ایک آدمی کی بیوی کو پھنسا کر کیا تھا۔“

”مجھ کو شینا مت یاد دلاؤ۔“ فتح خان غرایا۔ ”میں جب اس کا سوچتا ہے میرا خون کھولنے لگتا ہے۔“

”یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔“ میں نے لاپروائی سے کہا۔ ”یہ بتاؤ کہ میں ہیرے کیا یہیں بیٹھے بیٹھے تلاش کر کے دے دوں؟“

ہیروں کے نام پر اس کا موڈ اچھا ہو گیا اور وہ مسکرایا۔ ”نہیں پر جلد تم کو اُدھر وادی کی طرف لے جائے گا۔“

”وہاں برف ہی برف ہوگی۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔ ”ایسے میں وہاں کچھ تلاش کرنا اور بھی مشکل کام ہوگا۔“

”نہیں وہ جگہ زیادہ بلند نہیں ہے برف ہوگا پر زیادہ نہیں ہوگا۔“ اس نے جواب دیا۔

”کب جانا ہے اس طرف؟“

”جلد، پر وقت نہیں بتا سکتا۔“

”فتح خان مجھ سے ایک ڈیل کر لو سویرا کو واپس حویلی پہنچا دو اور میں وعدہ کرتا ہوں جب تک ہیرے نہیں مل جاتے تمہارے ساتھ رہوں گا اور فرار کی کوشش بھی نہیں کروں گا۔“

”تمہارا بات کا یقین ہے۔“ اس نے خلافِ توقع میری پیش کش کے جواب میں سنجیدگی سے کہا۔ ”پر سویرا کو بچانے کے لیے تم پورا کوشش کرے گا اگر وہ نہیں ہوا تو تم پورا کوشش نہیں کرے گا۔“

”پوری کوشش کروں گا۔“ میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں کرے گا۔ تم یہاں سے کوشش نہیں کرے گا۔“ اس نے سینے پر دل کے مقام پر ہاتھ رکھا۔ ”جب تک اِدھر چوٹ نہیں لگے گا تو کوشش کیسے کرے گا۔“

میں سمجھ رہا تھا وہ کسی صورت سویرا کو نہیں چھوڑے گا۔ یہ تو ترپ کا پتا اس کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”شہباز خان میں اب اس ملک سے نکل جانا چاہتا ہے۔“

”کیوں یہاں کیا ہے بلکہ اب تو یہ ملک تم جیسے مجرموں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی جنت بن گیا ہے، یہاں صرف تم لوگ ہی مطمئن اور سب کرنے کے لیے آزاد ہو۔ ورنہ عوام تو ہر طرح سے ذلیل و خوار اور مجبور ہیں۔'' میں نے طنز کیا۔ ''تم اپنی جنت چھوڑ کر کہاں جانا چاہتے ہو؟''

فتح خان نے اپنی خشخشی داڑھی کھجائی۔ ''تم ٹھیک کہتا ہے پر بات یہ ہے اِدھر کسی کے پاس دولت آجائے تو اوپر والوں کو بو آجاتا ہے اور وہ اپنا حصہ مانگتا ہے، ان کا حصہ دے کر کیا بچے گا۔ تم سمجھ رہا ہے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''بالکل جو جتنا اوپر ہے اتنا بڑا ڈاکو ہے اور ان کے مقابلے میں تم ایک چھوٹے ڈاکو ہو۔ تمہارے لیے عافیت اسی میں ہے کہ ان سے دور رہو۔''

وہ خوش ہو گیا۔ ''یہی تو میں کہہ رہا ہے۔ ہیرے ملتے ہی میں یہاں سے نکل جائے گا۔''

فتح خان کچھ عرصے پہلے تک صاف اردو بولنے لگا تھا لیکن شاید یہ دوبارہ اپنے ہم زبانوں کے ساتھ رہنے کا نتیجہ تھا کہ اس کی اردو میں گلابی رنگ نمایاں ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا باہر جانے والا منصوبہ پہلے بھی میرے سامنے تھا۔ شہلا کی مدد سے وہ یہ ہیرے مڈل ایسٹ کی مارکیٹ میں اچھے داموں بیچ سکتا تھا۔ کیونکہ جب سے ڈالر اور امریکا پر زوال آنا شروع ہوا تھا تب سے لوگوں کا ڈالر پر سے اعتماد اُٹھتا جا رہا تھا اور دولت مند ممالک اور دولت مند اپنے ڈالرز سونے اور دوسری قیمتی اشیا میں منتقل کر رہے تھے یہی وجہ تھی کہ عالمی منڈی میں سونے اور دوسری قیمتی دھاتوں کے ساتھ جواہرات کی قیمت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ آج سے کوئی بارہ سال پہلے بھی ان ہیروں کی مالیت پچیس ملین ڈالرز تھی اور اب یہ قیمت دوگنا ہو گئی ہو گی یعنی فتح خان کو پانچ کروڑ ڈالرز کی خطیر رقم مل سکتی تھی اور یہ اتنی دولت تھی کہ وہ اپنی باقی زندگی بڑے عیش و آرام سے دنیا کے کسی پُرسکون گوشے میں گزار سکتا تھا۔ غالباً وہ ایسا ہی کرنا چاہتا تھا۔ اس کی عمر ابھی پینتالیس اور پچاس کے درمیان تھی۔ اگر عیاشی کا عرصہ بیس سال لگایا جائے تو اس کے لیے یہ دولت کافی سے زیادہ تھی۔ اس کے بعد صرف بڑھاپا رہ جاتا جو معمولی دولت کے سہارے بھی کٹ سکتا تھا۔

''مگر فتح خان اصل کام تو ہیرے تلاش کرنا ہے اور تم یہ کام اتنے سالوں میں تمام تر کوشش کے باوجود نہیں کر سکے ہو۔ برٹ شا تمہاری قید میں ہے اور تم نے یقیناً اس سے ہیروں والی جگہ معلوم کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کر لیا ہو گا۔''

''ہاں پر وہ نہیں بتاتا خنزیر کی اولاد۔'' فتح خان برہم ہو گیا۔ ''پر ایک طریقہ باقی ہے۔''

''اگر تم اس کی بیٹی کے ذریعے اس پر دباؤ ڈالنا چاہتے ہو تو بھول جاؤ یہ انگریز اپنی آل اولاد کی اتنی پرواہ نہیں کرتے۔ ..... خاص طور سے جب وہ جوان اور خود مختار ہو جائے۔''

فتح خان مجھے گھور رہا تھا۔ ''شہباز خان تم اپنا کام آسان کر سکتا ہے، تم اس کی لڑکی کو یہاں بلا لو پھر اس کا باپ بھی بولے گا۔''

''یہ ممکن نہیں ہے۔'' میں نے انکار کر دیا۔ ''اوّل تو وہ یہاں آئے گی نہیں اور دوسرے میں خود عورتوں کے سہارے آگے بڑھنے کا قائل نہیں ہوں۔''

اس نے کسی قدر حیرت سے مجھے دیکھا۔ ''تم اسے بچانا چاہتا ہے اس سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

''کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن اگر اس کی جگہ کوئی بالکل اجنبی لڑکی یا عورت ہوتی تب بھی میرا جواب یہی ہوتا۔''

''تم کو سویرا کا پروا بھی نہیں ہے؟''

''پروا ہے لیکن فتح خان تم اس بات کو نہیں سمجھو گے اسے بچانے کے لیے میں کسی اور کا بُرا نہیں کر سکتا' یہ میری فطرت کے خلاف ہے۔''

''تب میرا بُرا کیوں کر رہے ہو؟''

''تمہیں ہیروں کی ضرورت ہے وہ تم اپنے بَل بوتے پر بھی حاصل کر سکتے ہو حالانکہ وہ تمہارا حق نہیں ہیں۔''

فتح خان نے بُرا سا منہ بنایا۔ ''ہمارا نہیں ہے تو کسی کے باپ کا بھی حق نہیں ہے۔''

''فتح خان تم بلاوجہ مجھے اس معاملے میں شامل کر رہے ہو۔ اگر سویرا کو ذرا سا بھی نقصان ہوا اور میں بچ گیا تو یقین کرو میں ساری دنیا میں تمہارا پیچھا کروں گا اور تم جس عیش و سکون کے چکر میں ہو وہ تمہیں کبھی نہیں ملے گا۔''

فتح خان نے میری بات اَن سنی کی اور بولا۔ ''تم تیار رہو تم کو کسی وقت بھی اِدھر سے لے جائے گا۔''

''بھوکا پیاسا؟'' میں نے سادگی سے پوچھا۔ ''مجھے تو باتھ روم جانے کا موقع بھی نہیں ملا ہے۔''

''ابھی سب ملے گا کھانا پانی بھی اور باتھ روم جانے کا موقع بھی۔'' اس نے کہا اور اُلٹے قدموں دروازے سے نکلتے ہوئے اسے بند کرتا چلا گیا تھا۔ شکر ہے اس نے اندر آنے کے بعد دروازہ بند نہیں کیا تھا ورنہ وہ جلا ہوا حصہ فوراً دیکھ لیتا۔ دوسرے باہر موسم سرد تھا اس لیے کنڈی اگر گرم بھی ہوتی تھی تو جلد ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اسے کھولتے ہوئے اگر فتح خان گرمی محسوس کر لیتا تو چوکنا ہو جاتا لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ کبھی نہیں دیکھتے۔ جلد یا بدیر میری

کوشش کا ان کو علم ہونا لازمی تھا۔ فتح خان کے جاتے ہی چند منٹ بعد امید خان آیا اور اس نے دروازہ کھولتے ہوئے مجھ سے کہا۔

''چلو تم کو لیٹرین لے جانا ہے۔''

میں اس کے ساتھ چھوٹے ہال تک آیا۔ جب اس نے کھڑکی والا پردہ ایک طرف کیا تب مجھے پتا چلا کہ اس طرف ایک چھوٹا سا دروازہ بھی تھا اور یہ باتھ روم کا تھا۔ ٹائلز اور بہترین فکسچرز سے آراستہ۔ یہ باتھ روم چھوٹا مگر مکمل تھا۔ میں نے آرام سے تمام ضروری امور انجام دیے اور پھر اچھی طرح منہ ہاتھ دھوئے۔ یہاں گرم پانی آ رہا تھا۔ دانت صاف کیے اس دوران میں امید خان نے دو تین بار دروازہ بجایا اور ہر بار میں نے اسے انتظار کرنے کو کہا۔ اگر دروازہ اندر سے بند نہ ہوتا تو وہ یقیناً اندر گھس آتا لیکن یہاں سے فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا اس لیے اسے یہ خدشہ تو نہیں تھا کہ میں فرار ہو جاؤں گا۔ میں باہر آیا تو وہ مشتعل تھا۔ اس نے کھا جانے والے انداز میں کہا۔ ''اتنا دیر لگایا؟''

''مجھے قبض ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تمہیں ہوتا ہے تو تم اتنی دیر نہیں لگاتے؟''

''چلو جلدی۔'' وہ بولا میں نے محسوس کیا کہ اسے جلدی تھی۔ پھر میری سمجھ میں آ گیا کہ اسے کس چیز کی جلدی تھی۔ وہ جلد از جلد مجھے بند کر کے مہرو میں اپنا حصہ بٹانا چاہتا تھا۔ وہ بے چاری یقیناً پھر کرب اور ذلت کی ان منزلوں سے گزر رہی تھی جو کسی عورت کا سب سے بڑا امتحان ہو سکتے ہیں۔ مجھے طیش تو آیا تھا اور شاید میں کوشش کرتا تو امید خان پر قابو پا کر اسے جہنم رسید بھی کر سکتا تھا لیکن اس وقت میں ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہتا تھا جو میرے اور سویرا کے لیے مشکلات کا باعث بنے۔ فتح خان اسے یہاں سے بھیج چکا تھا۔ اس لیے میں صبر کر کے واپس کمرے میں آ گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں دروازے پر دوبارہ طبع آزمائی کر کے آزاد ہونے کی کوشش کر سکتا تھا۔ اس لیے شرافت سے واپس کمرے میں بند ہو گیا۔

امید خان نے جیسے ہی راہداری والا دروازہ بند کیا میں نے دروازے پر طبع آزمائی شروع کر دی۔ اس بار میں نے زیادہ طاقت سے زور لگایا۔ اس کا امکان تھا کہ جب کنڈی نکلے گی تو خاصا شور ہو گا لیکن میں اس کے لیے تیار تھا۔ مگر خلاف توقع دروازہ ذرا ہلنے کے بعد پھر ٹس ہو گیا اور اس سے آگے ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔ شاید آگ نے لکڑی کو اس طرف سے جلایا تھا۔ لیکن اس کا اثر باہر تک نہیں گیا تھا جہاں اسکرو کیلیں لگی تھیں۔ وہاں کیلیں مضبوطی سے اپنی جگہ قائم تھیں اس لیے دروازہ بس ذرا سا ہلنے کے بعد دوبارہ مضبوطی سے اپنی جگہ قائم ہو گیا تھا۔ پھر اندر کا کچھ بھی زیادہ بڑا اور مضبوط نہیں تھا کہ میں اس پر اپنی صحیح گرفت رکھ سکتا۔ زیادہ زور لگانے سے کچھ بھی ہلنے لگا تھا۔ اگر میں اسی طرح زور آزمائی کرتا رہتا تو وہ دروازے سے نکل جاتا۔ یوں میری یہ کوشش ناکام رہی تھی۔

بدقسمتی سے آتشدان میں مزید لکڑی باقی نہیں رہی تھی اور کچھ دیر پہلے تک جو لکڑی تھی وہ بھی اب جل کر انگاروں میں تبدیل ہو رہی تھی۔ رات کے انگارے راکھ بن رہے تھے۔ بس چند گھنٹوں کی بات تھی کہ آتشدان ٹھنڈا پڑ جاتا۔ ممکن ہے اس سے پہلے ہی میں یہاں سے رخصت ہو جاتا لیکن اگر مجھے یہاں رہنا بھی پڑتا تو اس کا امکان کم ہی تھا کہ آتشدان میں دوبارہ لکڑی ڈالی جاتی۔ یہ بھی شاید شہلا کی مہربانی تھی ورنہ فتح خان اتنا اچھا نہیں تھا کہ اپنے قیدیوں کو ایسی سہولتیں مہیا کرتا۔ اس نے تو ناشتے کا آسرا بھی دیا تھا لیکن فی الحال اس کے آثار بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ مہرو کی طرف سے ابھی تک کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا تھا۔ یا تو اسے موقع نہیں ملا تھا یا پھر وہ میری توقع کے خلاف ایک کمزور عورت ثابت ہوئی تھی جو درندہ صفت مردوں کے سامنے ہمت ہار گئی تھی۔ میں مایوس تو نہیں لیکن بور ہو رہا تھا۔ آج میرے سارے پلان فیل ہو رہے تھے۔ شاید ان دنوں میرے ستارے کچھ گردش میں تھے۔ بینک لاکر تک رسائی کی کوشش کے بعد سے جو شامت آئی تھی وہ ابھی تک جاری تھی۔ پہلے میں اور بریف کیس شہلا اور فتح خان کے ہاتھ لگے تھے اور اب سویرا بھی ان کے قبضے میں آ گئی تھی۔

میں بور ہو کر اونگھنے لگا تھا اس لیے جب اچانک فائرنگ کا شور گونجا تو میں اُچھل پڑا تھا۔ کسی نے پورا برسٹ چلا دیا تھا۔ فائرنگ کی آواز کے ساتھ لوگوں کے چلانے کا شور بھی سنائی دیا تھا۔ پھر فائرنگ کا شور تو تھم گیا لیکن فتح خان کے آدمیوں کا شور جاری رہا۔ چند لمحے بعد فتح خان کے چلانے کی آواز بھی ان میں شامل ہو گئی۔ پہلے والے تو درد سے چلا رہے تھے لیکن فتح خان کی دہاڑوں اور گالیوں میں غصے کا عنصر نمایاں تھا۔ مہرو کو موقع مل گیا تھا اور اس نے اس سے فائدہ اُٹھا لیا تھا۔ فائرنگ اس کے سوا کون کر سکتا تھا؟ اب نہ جانے فتح خان کے کتنے آدمی مرے تھے یا زندہ تھے اس کا کچھ نہیں پتا تھا۔ اگر مہرو سے ہتھیار چھین لیا گیا تھا تو یقیناً اس کی خیر نہیں تھی اور جلد یا بدیر فتح خان اسے بھی دنیا سے رخصت

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کردیتا۔ میرے کان کسی فائر کی آواز کے منتظر تھے لیکن خاصی دیر گزرنے کے بعد ایسی کوئی آواز نہیں آئی بلکہ فتح خان کے آدمیوں کی چیخ وپکار اور اس کی اپنی دہاڑیں بھی رک گئی تھیں۔ کبھی کبھی ہلکی سی آواز آتی تھی۔ پھر میں نے کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی مدھم آواز سنی۔ اس کے بعد سناٹا چھا گیا تھا۔

اس کمرے میں بند میں صرف اندازے لگا سکتا تھا کہ باہر کیا ہوا ہے۔ مگر ایک بات یقینی تھی کہ جو ہوا تھا وہ فتح خان اور اس کے ساتھیوں کے لیے اچھا نہیں ہوا تھا۔ فائرنگ مہرو نے ہی کی تھی لیکن اس کا نتیجہ ابھی غیر واضح تھا۔ اگر وہ زندہ تھی تو یقیناً اچھے حال میں نہیں ہوگی۔ فتح خان کے گھٹیا آدمیوں نے پہلے ہی اس کا حشر کردیا تھا اور اب بھی امید نہیں تھی کہ وہ سکون سے ہوگی۔ کچھ دیر گزرنے کے بعد میں نے دروازہ بجایا مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ کچھ دیر بعد دوبارہ بجایا تو باہر سے امید خان کی جھنجلائی آواز آئی۔ ”کیا ہے خانہ خراب سکون سے بیٹھو۔“

”سکون سے کیسے بیٹھوں مجھے ابھی تک کھانے کو کچھ نہیں ملا۔“

اس پر امید خان نے کھانے کے بارے میں ایک نہایت نازیبا مشورہ دیا۔ میں نے کہا۔ ”شاید تم یہی کرتے ہو گے، خیر یہ بتاؤ کہ فائرنگ کس نے کی اور کون مرا ہے۔ اگر وہ تم میں سے ہے تو مجھے نہایت خوشی ہوگی؟“

حسب توقع امید خان نے چراغ پا ہوکر اپنی مادری زبان میں ارشاد کیا اور بکتا جھکتا وہاں سے چلا۔ میں نے اس کے لہجے اور رویّے سے اندازہ لگالیا کہ باہر گڑبڑ بہت زیادہ ہوئی تھی۔ امید خان پاگل ہورہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ نقصان بہت زیادہ تھا۔ میری تو خواہش تھی کہ وہ سارے کیفر کردار کو پہنچیں جو مہرو پر ظلم کرنے میں شامل تھے۔ وقت گزرتا رہا۔ دن یقیناً نکل آیا تھا۔ میں رات بھر سو نہیں سکا تھا اور اب بھی سونے کا موقع نہیں تھا مگر اونگھنے میں تو کوئی حرج نہیں تھا۔ کئی گھنٹے گزرنے کے بعد باہر راہداری والا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ کمرے کا دروازہ کھلا تو فتح خان کا سرخ چہرہ نظر آیا تھا۔ مارے طیش کے اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔ اس نے آتے ہی غرا کر کہا۔

”تم نے اچھا نہیں کیا۔“

”خوب جیسے تم تو بہت اچھا کررہے ہو۔“ میں نے طنز کیا۔ ”ویسے میں نے کیا اچھا نہیں کیا؟“

”آج یہاں جو ہوا ہے اس کے ذمّے دار تم ہو۔“

”تمہارا اشارہ یہاں ہونے والی فائرنگ کی طرف ہے تو اس وقت میں اس کمرے میں بند تھا بھلا میں اس کا ذمّے دار کیسے ہوسکتا ہوں؟“

”اس حرامزادی کو تم نے سکھایا تھا۔“ وہ پھر غرّایا۔

”فتح خان گالیاں دینے کے بجائے کام کی بات کرو۔“

فتح خان نے چند گہری سانسیں لیں اور خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ ”اس خانہ بدوش عورت نے میرے چار بہترین ساتھی ہلاک کردیے ہیں۔ پتا نہیں کیسے اس کے ہاتھ رائفل آگئی تھی۔“

مجھے یہ سن کر دلی خوشی ہوئی اور میں نے اس کا اظہار بھی کردیا۔ ”فتح خان مجھے یہ سن کر واقعی خوشی ہے وہ سب اسی قابل تھے۔ مجھے عورتوں سے زیادتی کرنے والے بالکل پسند نہیں ہیں۔“

”یہ سب تم نے اس عورت کو سکھایا تھا۔“

”میں نے؟“ میں نے مصنوعی حیرت سے کہا۔ ”فتح خان وہ اپنے ہوش میں کب تھی کہ میں اسے کچھ سکھاتا۔ تمہارے جانوروں سے بھی بدتر آدمیوں نے اس کے جسم اور روح دونوں کو کچل دیا تھا۔ تم نے اسے میرے سامنے مثال کے طور پر پیش کیا تھا۔ جب تم نے اپنا مقصد حاصل کرلیا تو اس بے چاری کو دوبارہ ان جانوروں کے حوالے کردیا۔ اب اس نے کیا کیا اور کیسے کیا میں اس کا ذمّے دار کیسے ہوسکتا ہوں؟“

فتح خان مجھے سفاک نظروں سے گھور رہا تھا۔ ”شہباز تم نہایت چالاک آدمی ہو۔ میں نے اپنی ساری زندگی میں تمہارے جیسا مکار شخص نہیں دیکھا ہے۔“

میں ہنسا۔ ”حالانکہ تم روز آئینہ دیکھتے ہو۔ اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔ کیا تم ابھی شیر خوار ہو؟“

فتح خان کو پورا یقین تھا کہ یہ میرا ہی کام ہے اس نے پاؤں پٹخ کر کہا۔ ”اس عورت کو تم نے بہکایا ہے۔“

میں نے لاپروائی سے جواب دیا۔ ”میں نے ایسا نہیں کیا لیکن اگر کیا بھی ہے تو تم مجھے کس طرح دوش دے سکتے ہو؟ کیا میں تمہارا دوست ہوں جو تمہارے مفاد کا خیال رکھوں۔ میں تمہارا دشمن ہوں اور مجھے جہاں موقع ملے گا میں تم پر وار ضرور کروں گا۔“

فتح خان چپ ہوگیا۔ مگر اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ”اگر مجھے معلوم ہوگیا کہ یہ کام تمہارا ہے تو تمہارا انجام اس عورت سے بھی بُرا ہوگا۔ وہ میرا نہایت قیمتی ساتھی تھا۔ مجھے ان کا جواب دینا ہے۔“

”تم جواب دے سکتے ہو انہوں نے ایک عورت سے

زیادتی کی اور اس نے انہیں گولی ماردی۔“ میں نے خلوص سے کہا۔ ”اس میں تمہارا قصور تو نہ ہوا اور برائے مہربانی اپنی بلی میرے سر رکھنے سے بھی گریز کرو۔“

”بلی...... کیا؟“

”بلی نہیں بلی۔“ میں نے تصحیح کی اور پھر دریافت کیا۔ ”یعنی مصیبت۔ ویسے اس عورت کا کیا ہوا تم نے اسے تو زندہ نہیں چھوڑا ہوگا؟“

میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے وہ مجھے گھورتا رہا پھر اس نے کہا۔ ”شہباز خان تم نے ابھی فتح خان کو ٹھیک سے نہیں جانا ہے۔“

”ہاں یہ تو ہے روز تمہاری شخصیت کا کوئی نہ کوئی ایسا پہلو سامنے آتا ہے جو مجھے حیران کردیتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”تم بس ایک بات یاد رکھو سویرا میرے پاس ہے اور اس کی زندگی اور عزت سب تم پر ہے تم جیسا کرے گا اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک ہوگا۔“ فتح خان نے کہا اور جیسے دندناتا ہوا آیا تھا اسی طرح اچانک واپس چلا گیا۔ اس بار بھی دروازہ کھلا رہا تھا اس لیے اس کی یا امید خان کی نظر دروازے کے جلے حصے کی طرف نہیں گئی تھی۔ اس نے مہرو کے بارے میں بتانے سے گریز کیا تھا، تو کیا وہ زندہ تھی؟ ورنہ فتح خان کو اس کے بارے میں بتانے میں کیا حرج تھا؟ وہ کھل کر کہہ سکتا تھا کہ اس نے مہرو کو عبرتناک انداز میں موت کے گھاٹ اُتار دیا ہے۔ فتح خان نے کلائی کی گھڑی پہن رکھی تھی اور میں نے غیر محسوس انداز میں اس پر وقت دیکھ لیا تھا۔ ابھی دوپہر کے بارہ بجے تھے۔ مجھے کچھ کھائے ہوئے چودہ گھنٹے سے زیادہ گزر چکے تھے اس لیے اب پیٹ خالی تھا۔ مگر چوہا ریس کی نوبت نہیں آئی تھی۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور امید خان نے ایک ٹرے اندر رکھ دی جس پر خشک نان اور چائے کا مگ تھا ساتھ پانی کی چھوٹی بوتل بھی تھی۔ ٹرے رکھتے ہی اس نے دروازہ بند کردیا۔ بھوک کی حالت میں اس نان خشک نے بھی مزہ دیا تھا۔ کھانا کھا کر میں نے خدا کا شکر ادا کیا جو پتھر میں رہنے والے کیڑے کو بھی رزق دیتا ہے۔ میں تو اشرف المخلوقات میں سے ہوں وہ مجھے کیسے بھول سکتا تھا؟ میرا خیال تھا کہ فتح خان ایک دو دن میں مجھے لے کر شمالی علاقے کی اس وادی کی طرف روانہ ہوجائے گا جہاں کہیں کروڑوں ڈالرز مالیت کے ہیرے زمین میں دبے تھے۔ مگر خلافِ توقع فتح خان جیسے مجھے بھول گیا تھا۔

اس کے بعد وقت گزاری کا ایک طویل اور بور کردینے والا سلسلہ شروع ہوا۔ میں زیادہ وقت سونے میں گزارتا تھا۔ میرا اندازہ درست نکلا تھا ایک بار آتشدان بجھنے کے بعد اس میں دوبارہ لکڑی نہیں ڈالی گئی تھی اور کمرا ہمہ وقت نہایت سرد رہتا تھا۔ شکر ہے وہاں دوسرا کمبل بھی تھا۔ یہ دونوں مل کر مجھے سردی سے بچاتے تھے۔ دن رات کا حساب ملنے والے کھانے سے ہوتا تھا۔ جب خشک نان کے ساتھ چائے آتی تو یہ ناشتا ہوتا تھا اور جب سالن ہوتا تو یہ رات کا کھانا ہوتا تھا۔ مجھے چوبیس گھنٹے میں بس یہی خوراک مہیا کی جاتی تھی۔ پانی کی ایک چھوٹی بوتل دی جاتی تھی جس میں مشکل سے ایک لیٹر پانی ہوتا تھا۔ موسم کی وجہ سے مجھے خاص فرق نہیں پڑا ورنہ ان تین دنوں میں اتنا کم پانی پینے سے مجھے ڈی ہائیڈریشن ہوجاتی۔ چوبیس گھنٹے میں صرف ایک بار واش روم لے جاتے تھے اور وہ بھی سخت نگرانی میں۔ اس وقت فتح خان خود موجود ہوتا تھا۔ لیکن وہ مجھ سے کسی قسم کی گفتگو کرنے سے گریز کرتا تھا۔

تیسرے دن میں نے رات کا کھانا کھایا اور فوراً ہی مجھے نیند آنا شروع ہوگئی۔ مجھے پھر کوئی خواب آور دوا دے دی گئی تھی اور میں مزاحمت کے باوجود جاگ نہ سکا سوگیا۔ وہاں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے میں خود کو زخم لگا کر جاگنے کی کوشش کرتا۔ میری ہتھیلی کا زخم بھی مندمل ہوگیا تھا اور پہلے ٹھکانے پر ہونے والے ہنگامے میں اس کا قصہ بھی دب گیا تھا، اگر شہلا اور فتح خان نے یہ زخم دیکھا بھی تھا تو اسے نظر انداز کردیا تھا۔ چوبیس گھنٹے بعد زخم تقریباً ٹھیک ہوگیا تھا۔ حکیم قادس کی دی ہوئی مخصوص دواؤں کا اثر اب تک تھا کہ میرے زخم وقت سے پہلے ٹھیک ہوجاتے تھے۔ میں کچھ دیر نیند کے خلاف مزاحمت کرتا رہا لیکن دی جانے والی دوا اتنی طاقت ور تھی کہ اس نے بالآخر میرے حواس پر قبضہ کرلیا۔

☆☆☆

میرا خیال تھا کہ میری آنکھ فتح خان کے کسی اور قید خانے میں کھلے گی ظاہر ہے مجھے آسانی سے اور بلا مزاحمت منتقل کرنے کے لیے ہی خواب آور ڈوز دیا گیا تھا۔ لیکن جب میرے حواس بحال ہوئے تو میں دنگ رہ گیا۔ میں ایک گاڑی میں بیٹھا تھا جس کا انجن اسٹارٹ تھا اور میں ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔ شکر ہے گاڑی چل نہیں رہی تھی بلکہ رکی ہوئی تھی۔ یہ غیر ملکی ساختہ چھوٹی ٹوسیٹر فور وہیل ڈرائیو تھی۔ چھوٹی ہونے کے باوجود اس کا انجن بہت طاقت ور ہوتا ہے اور یہ پہاڑی اور ناہموار راستوں پر سفر کے لیے بے مثال ہے۔ اس کا پچھلا حصہ سامان رکھنے کے لیے ہوتا ہے یہاں ترپال نظر آرہی تھی۔ جیپ ایک سڑک کے کنارے کھڑی تھی اور اس پر وقفے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

وقفے سے گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ یہ بہت مصروف سڑک نہیں تھی لیکن ویران بھی نہیں تھی۔ البتہ جہاں جیپ کھڑی تھی اس کے آس پاس کا علاقہ جنگل کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ذرا دور پہاڑیاں دکھائی دے رہی تھیں اور بہ ظاہر ایسا ہی لگ رہا تھا کہ میں راولپنڈی یا اسلام آباد میں کہیں ہوں۔ چاروں طرف صبح کی ہلکی سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ بہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ مجھے ڈرائیونگ کرتے کرتے اونگھ آئی اور اب میں ہوشیار ہو گیا تھا۔ لیکن ایسا نہیں تھا کوئی مجھے اس جیپ میں بٹھا کر اور اس کا انجن اسٹارٹ کر کے چلا گیا تھا۔ ایمرجنسی بریک لگی ہوئی تھی اور گیئر بھی نیوٹرل تھا یعنی انجن چلنے کے باوجود جیپ کے ازخود چلنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

میرے جسم پر نیا لباس تھا۔ گرم اور موٹی اونی پتلون، بکس ریشے کی گرم شرٹ اور اس پر موٹی لیکن وزن میں ہلکی گرم ترین جیکٹ تھی۔ پتلون کے نیچے سوتی پاجامہ بھی تھا۔ پیروں میں بہترین قسم کے غیر ملکی جوتے تھے جو عام طور سے پہاڑوں پر سفر کرنے والے استعمال کرتے ہیں۔ چٹانوں پر چڑھنے کے لیے ان میں اسپائکس بھی لگ سکتی ہیں۔ میرے سر پر گرم اونی ٹوپی اور آنکھوں پر سن گلاسز تھے۔ میں سوچنے لگا کہ میں جاگ گیا ہوں یا فتح خان کے قید خانے میں آزادی کا خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں نے بازو میں چٹکی لی تو تکلیف نے بتایا میں جاگ رہا ہوں۔ یہ خواب نہیں ہے۔ میں آزاد تھا اور کہیں بھی جا سکتا تھا۔ لیکن اس سے پہلے میں جیپ کو نیوٹرل گیئر سے اٹھاتا۔ میری نظر ڈیش بورڈ پر رکھے لفافے پر گئی۔ خاکی رنگ کا یہ لفافہ خاصا موٹا سا تھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر لفافہ اٹھا لیا۔ کھولنے پر اندر سے پہلے تو خستہ اور نئے نوٹوں نے توجہ حاصل کی مگر ایک سفید کاغذ نظر آتے ہی ان سے... دلچسپی ختم ہو گئی۔ میں نے جلدی سے کاغذ نکال کر اس کی تہیں کھولیں۔ اندر ایک عدد تحریر تھی اور میرے لیے تھی۔

''شہباز خان، تم حیران ہو گا تم کو اس طرح کیوں چھوڑ دیا ہے۔ پر یہ تمہارا غلط فہمی ہے۔ تم کو چھوڑا نہیں ہے۔ تم اب بھی میرا قیدی ہے اور میری نگرانی میں ہے۔ یہ جیپ اور اس کا سامان دونوں تمہارا ہے۔ جیپ تمہارے نام ہے۔ لفافے میں پچاس ہزار کا رقم ہے۔ اب تم سیدھا وادی کی طرف جائے گا اور اگر اس کے علاوہ کہیں اور گیا یا کسی سے رابطہ کیا تو تم جانتا ہے میں کیا کرے گا۔ تم کسی جگہ نہیں رکے گا اور کسی بند عمارت میں نہیں جائے گا۔ تم میرے کو دھوکا نہیں دے سکتا ہے، ایک ایک قدم پر میرا نگرانی ہو گا۔ اب سے تمہارے پاس کل دس دن کا مہلت ہے۔ دس دن بعد اسی جگہ میری چیز لے کر آ جاؤ۔ میں دس دن انتظار کرے گا اور تم جانتا ہے اس کے بعد کیا کرے گا۔ میں قسم نہیں کھاتا پر وہی کرے گا جو اس سے کہا تھا۔ دس دن بعد اسی جگہ انتظار کرے گا۔

تم جانتا ہے میں کون ہے؟''

تحریر کا ایک ایک لفظ بتا رہا تھا کہ یہ فتح خان کی ہے لیکن تحریر اس کی نہیں لگ رہی تھی بلکہ یہ بہت خوب صورت نسوانی تحریر تھی اور شاید شہلا کی تھی کیونکہ فتح خان کسی غیر متعلقہ فرد سے یہ تحریر نہیں لکھوا سکتا تھا۔ اس نے مجھے آزاد چھوڑ دیا تھا لیکن اَن دیکھی زنجیروں میں جکڑ کر۔ اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ آزاد کرنے کے باوجود ہر قدم پر میری نگرانی کرے گا اور اگر اسے ذرا بھی شبہ ہوا کہ میں کسی اور چکر میں ہوں تو وہ سویرا کے حوالے سے اپنی دھمکی پر عمل کرے گا اور اسے مرشد علی کے حوالے کر دے گا۔ میرا دل اس تحریر کو پڑھتے ہوئے ایک اندرونی خوف سے جکڑنے لگا تھا۔ میرے پاس دس دن یعنی دو سو چالیس گھنٹے تھے اور مجھے اس دوران میں وادی تک جا کر وہ ہیرے تلاش کر کے واپس آ کر فتح خان کے حوالے کرنا تھے۔ اس وادی کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ میں ساری عمر بھی وہاں ہیرے تلاش کرتا رہوں تب بھی کامیابی کا امکان ایک فیصد بھی نہیں تھا۔ اس کام کے لیے فتح خان نے مجھے صرف دس دن دیے تھے۔ اس دوران ... میں کسی سے رابطہ نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی مدد مانگ سکتا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ فتح خان نے میری نگرانی کا مکمل بندوبست کیا ہو گا۔

وہ مجھے بالکل آزاد چھوڑنے کا خطرہ مول لے ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ جب وہ اپنی نگرانی میں مجھ سے یہ کام کروا سکتا تھا یعنی میرے سر پر مسلط رہ کر تو اسے مجھے یوں کسی حد تک آزادی دینے کی کیا ضرورت تھی؟ اس وقت اس کا جواب میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ ویسے بھی میں تازہ تازہ ہوش میں آیا تھا اور غیر متوقع حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا اس لیے دماغ فوری کام کرنے کے قابل نہیں تھا۔ یا یوں کہیں کہ کام تو کر رہا تھا لیکن اس میں ربط نہیں تھا۔ فتح خان نے مجھے اپنے جال میں جکڑنے کے لیے مجھ پر کسی عمارت یا بند جگہ جانے پر پابندی لگا دی تھی جہاں سے میں فون یا کسی شخص کی مدد سے اپنے لوگوں سے رابطہ کر سکوں۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر انجن بند کر دیا۔ یہ تقریباً نئی جیپ تھی۔ کم سے کم انجن کی آواز اور اندرونی آرائش سے ایسا ہی لگ رہا تھا۔ شاندار اور جاندار قسم کا ڈیش بورڈ تھا جس میں ڈیجیٹل آڈیو پلیئر کے ساتھ اور بھی کئی اقسام کی چیزیں لگی تھیں جیسے ایک ڈیجیٹل کلاک، آلٹی میٹر اور لائٹر وغیرہ۔ اس میں ایک قطب نما بھی تھا جو بتاتا تا کہ جیپ کس طرف جا رہی تھی اس کے علاوہ جی پی ایس بھی تھا جو یہ بتاتا تا کہ جیپ اس وقت کس مقام پر ہے۔ چھوٹی ہونے کے باوجود جیپ کی سیٹیں بڑی اور نہایت آرام دہ تھیں۔ میں کسی قدر نیم دراز پوزیشن میں تھا اور سیٹ بیلٹ بندھی ہوئی تھی۔

سامنے کا جائزہ لے کر میں نے پیچھے کی طرف توجہ دی۔ عقبی حصہ تقریباً چار بائی پانچ فٹ کا تھا۔ یہاں نشستیں لگتی ہیں لیکن فی الوقت یہ جگہ خالی تھی۔ فتح خان نے رقعے میں سامان کا ذکر بھی کیا تھا اور میں نے سامان دیکھنے کے لیے سیٹ بیلٹ کھولی پھر مڑ کر ترپال ہٹانے کی کوشش کی تھی کہ اس کے نیچے کوئی کلبلایا۔ میں بدک گیا ترپال کے نیچے یقیناً کوئی شخص تھا اور جب میں نے ترپال ہٹائی تو ایک بار پھر دنگ رہ گیا تھا۔ نیچے مہرو اس حال میں لیٹی تھی کہ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور منہ پر چوڑا ٹیپ لگا تھا۔ لیکن اس سے قطع نظر وہ کئی دن پہلے والے تباہ حال مہرو سے بالکل الگ دکھائی دے رہی تھی۔ یقیناً بہترین علاج سے اس کے زخم مندمل ہو گئے تھے اور چہرے پر بہت معمولی سی نشانات باقی رہ گئے تھے۔ اس کے جسم پر بھی میری طرح بہترین گرم لباس اور پاؤں میں جوتے تھے۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ شاید چند لمحے پہلے ہوش میں آئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی بڑی آنکھیں مزید پھیل گئیں۔ اس نے ناک سے آواز نکالی لیکن اس سے پہلے میں اسے کھولتا۔ اس کی جیکٹ کی جیب سے جھانکتے کاغذ نے میری توجہ حاصل کر لی۔ میں نے ہاتھ بڑھا اسے نکالنا چاہا تو مہرو نہ جانے کیا سمجھی۔ جیکٹ کی جیب مین اس کے سینے پر تھی۔ وہ بدک کر پیچھے ہوئی لیکن وہاں گنجائش ہی کتنی تھی۔ میں نے آرام سے کاغذ اچک لیا اور دھیمی آواز میں کہا۔

''مہرو آرام سے لیٹو میں ابھی تمہیں کھولتا ہوں۔''

میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا کہ فتح خان نے اپنے چار ہلکہ پانچ بہترین آدمیوں کی قاتل کو کیسے میرے ساتھ چھوڑ دیا اور وہ بھی بالکل ٹھیک ٹھاک حالت میں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی بہترین دیکھ بھال ہوئی ہے۔ حسب توقع یہ رقعہ بھی مہرے لیے ہی تھا۔

''شہباز اگر تم یہ رقعہ پڑھ رہا ہے تو اس کا مطلب ہے تم نے مہرو کو دیکھ لیا ہے۔ تم شاید حیران ہو گا کہ میں نے اسے کیسے چھوڑ دیا ہے۔ جبکہ اس کی وجہ سے میرا پانچ بہترین آدمی اپنی جانوں سے گیا۔ میں نے اسے چھوڑا نہیں ہے۔ یہ اس کا سزا ہے۔ وہ سزا یہ ہے کہ اس کا قبیلہ اب اسے تلاش کر رہا ہے کیونکہ اسے پتا چلا ہے کہ اپنے شوہر راجو کے قتل میں یہ خود شامل تھا اور اب اپنے آشنا شہباز ملک کے ساتھ فرار ہو گیا ہے۔ تم سمجھا شہباز خان، اس خانہ بدوش قبیلے کا ڈھائی سو مسلح آدمی تم دونوں کو راولپنڈی اسلام آباد اور اس کے آس پاس تلاش کر رہا ہے اور جہاں تمہیں دیکھے گا وہیں قتل کر دے گا۔ یہ اس کے سردار کا حکم ہے۔ قتل کرنے والے کو ایک لاکھ روپیا اور قبیلے میں اس کا پسند کا کنواری لڑکی مفت ملے گا۔ اس قبیلے میں لڑکی قیمت کے بدلے ملتا ہے۔ بالکل ہمارا والا رواج ہے۔ جتنا خوب صورت لڑکی اتنا زیادہ قیمت۔ اگر تمہیں یقین نہیں ہے تو ٹھیک گیارہ بجے اس قبیلے کے لوگ اس جگہ پہنچ جائے گا اسے بتا دیا ہے کہ تم اور مہرو یہاں ملے گا۔ اب تمہارا عافیت اسی میں ہے جلد از جلد اس جگہ سے دور شمال کی طرف چلے جاؤ تمہیں معلوم ہے تمہیں کہاں جانا ہے؟

تم مجھے جانتا ہے۔''

بے ساختہ میرے منہ سے ایک گالی نکل گئی۔ فتح خان میری توقع سے زیادہ شاطر ثابت ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے صرف اپنی گرفت میں نہیں جکڑا تھا بلکہ میرے پیچھے نہایت خطرناک لوگ لگا دیے تھے۔ نہ جانے اس نے یہ کام کیسے کیا تھا۔ میں نے ڈیش بورڈ کی ڈیجیٹل کلاک کی طرف دیکھا، اس میں دس بج کر سینتیس منٹ ہو رہے تھے۔ وقت کم تھا مجھے گیارہ بجے کا انتظار کیے بغیر اس جگہ سے دور چلے جانا تھا۔ ممکن ہے میری جگہ کوئی اور ہوتا تو جیپ اسٹارٹ کر کے جہاں سینگ سمائے نکل بھاگتا لیکن میں اتنی عجلت بھی نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ اس لیے میں جیپ سے اترا اور ہائی وے کے آس پاس کا جائزہ لیا۔ جلد مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں مری ایکسپریس وے کے ایک حصے میں کھڑا ہوا تھا۔ یہ اس کا آغاز تھا اور جلد ہی پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ آگے دور پہاڑ دھند ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آ رہے تھے۔ لیکن یہاں موسم خوشگوار تھا اور نکھری دھوپ تھی۔ یہاں سے نکلنے کے دو ہی راستے تھے یا تو میں واپس جاتا یا آگے بڑھ جاتا۔ دائیں طرف نیچے وادی تھی اور بائیں طرف تھوڑے سے میدان کے بعد پہاڑیاں شروع ہو جاتیں۔ میں دونوں طرف نہیں جا سکتا تھا کم سے کم جیپ کے ساتھ تو نہیں جا سکتا تھا۔ میں واپس جیپ میں آیا اور مہرو کا منہ کھولے بغیر اس سے کہا۔

''میری بات غور سے سنو فتح خان نے تمہیں رہا نہیں کیا ہے بلکہ سزا دی ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے اسے رقعہ حرف بہ حرف سنا دیا اور پھر جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں یہاں سے آگے جانا ہو گا جہاں فتح خان کی بات کی سچائی جان

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

سکیں۔ فتح خان چھوٹے قد والا شخص ہے۔ تم پر ظلم کرنے والے سب اس کے ساتھی ہیں جنہیں تم نے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اب میں تمہارا منہ کھول رہا ہوں لیکن مہربانی کر کے چیخنے چلّانے سے گریز کرنا ورنہ میں تمہیں اسی جگہ اُتار کر آگے روانہ ہو جاؤں گا۔“

اس نے سر ہلا کر اشارہ کیا کہ وہ شور نہیں کرے گی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے منہ سے ٹیپ اُتار دیا۔ دس بج کر پچاس منٹ ہو گئے تھے اس لیے جیپ آگے بڑھا دی۔ مہرو نے شور نہیں کیا لیکن منہ کھلتے ہی کیا، کیوں اور کیسے پر مبنی سوالات کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ میں خاموشی سے سنتا رہا اور اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ”مجھے خود بھی نہیں معلوم، میں کھانا کھا کر اسی کمرے میں سویا تو اب سے کچھ دیر پہلے اسی جیپ میں ہوش آیا ہے۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ یہاں ترپال کے نیچے تم بھی ہو۔“

مہرو نے بے یقینی سے کہا۔ ”یہ شخص جھوٹا ہے میرے لوگ کبھی مجھے ایسا نہیں سمجھ سکتے۔“

”ایسا مت کہو میں نے دیکھا ہے تمہارے لوگ بھی کم وحشی نہیں ہیں۔ کیسے دیوانے ہو رہے تھے۔“ میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”اگر فتح خان اپنے آدمیوں سمیت نہ چڑھ دوڑتا تو ہم بھی تمہارے نام نہاد انصاف کی نذر ہو جاتے۔“

”مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔“ اس بار اس نے صاف گوئی سے مجھ پر شک کا اظہار کیا۔ میں نے پوچھا۔

”تمہیں پڑھنا آتا ہے؟“

”تھوڑا سا۔“ وہ بولی۔

”تب یہ پڑھ لو۔“ میں نے اس کی جیکٹ سے نکلنے والا کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا اور وہ اسے لے کر پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ جیپ اب پہاڑوں کی حدود میں داخل ہو گئی تھی دائیں طرف موجود وادی وسیع اور گہری ہوتی جا رہی تھی۔ ایک طرف پہاڑ آ گیا تھا اور دونوں کے درمیان یہ دو رویہ سڑک تھی۔ ایک موڑ مڑتے ہی میں نے جیپ کنارے لگا کر روک دی اور پھر مڑ کر مہرو کے ہاتھ اور پاؤں کھولے۔ ”میرے ساتھ آؤ لیکن بھاگنے کی کوشش اسی وقت کرنا جب مرنے کا ارادہ ہو۔“

وہ نہ جانے اسے دھمکی سمجھی یا کچھ اور، بہرحال خاموشی سے اُتر کر نیچے آ گئی۔ میں اس موڑ کی طرف بڑھا جہاں سے نیچے کی وہ جگہ صاف نظر آتی جہاں کچھ دیر پہلے جیپ کھڑی تھی اور مجھے اس میں ہوش آیا تھا۔ گیارہ بجنے میں دو منٹ رہ گئے تھے اور موڑ تک آتے ہی سبز رنگ کی وہ بڑی سی پک اپ نظر آ گئی جس کے آس پاس کوئی نصف درجن خانہ بدوش موجود تھے۔ ان کا حلیہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ وہ خانہ بدوش تھے۔ ان میں سے ایک کے پاس چھوٹی نال والی رائفل بھی نظر آ رہی تھی۔ مہرو میرے پیچھے آئی تھی اور ان لوگوں کو دیکھتے ہی اس نے ہذیانی لہجے میں کہا۔

”یہ میرے قبیلے کے لوگ ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے فتح خان نے ٹھیک کہا ہے۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”یہ واقعی تمہیں اور مجھے تلاش کر رہے ہیں۔“

”جھوٹ بولتا ہے وہ.....“ مہرو نے روانی سے گالی دی۔ ”ہمیں ڈرانا چاہتا ہے۔“

”ممکن ہے لیکن اس صورت میں تمہیں چھوڑنے کا کیا مطلب ہوا۔ میں نے اسے دیکھا تھا وہ اپنے آدمیوں کے مارے جانے پر پاگل ہو رہا تھا۔“

مہرو نے سر ہلایا۔ ”جب وہ کمرے میں آیا اور اپنے آدمیوں کی لاشیں دیکھیں تو اتنا غصے میں آ گیا کہ مجھے لگا ابھی مجھے گولی مار دے گا لیکن پھر اس نے کچھ نہیں کہا اور صرف مجھے باندھ کر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد آ کر اپنے آدمیوں کی لاشیں بھی لے گیا تھا۔“

”تم خود سوچو اگر وہ غلط کہہ رہا ہے تو تمہیں چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تمہارے قبیلے کے لوگ تمہاری مدد کے لیے نہیں بلکہ قتل کرنے کے لیے تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔“

”مجھے یقین نہیں آ رہا.....“ وہ بولی۔

”ٹھیک ہے تب تم ان تک جا سکتی ہو۔“ میں نے واپس جیپ کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ”ان سے بچ گئیں تو فتح خان نہیں چھوڑے گا اس کے آدمی ہماری نگرانی کر رہے ہیں۔“

وہ چونکی۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”ہوش میں آنے کے بعد اس کا ایک پرچہ مجھے بھی ملا تھا جیسے تمہاری جیکٹ میں تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تمہارے پاس سوچنے کے لیے ایک منٹ ہے اس کے بعد میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے اب یہ ہمارے پیچھے آئیں گے۔“

مہرو اگرچہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی۔ کم سے کم اسکول کی پڑھی ہوئی نہیں تھی اور نہ ہی اسے شہری انسانوں سے زیادہ واسطہ پڑا ہوگا۔ لیکن ایک خانہ بدوش کی حیثیت سے اس نے یقیناً بہت ساری دنیا دیکھی تھی۔ میں نے دیکھا ہے کہ خانہ بدوشوں میں عام دیہاتیوں کے مقابلے میں زیادہ سوجھ بوجھ اور ہوشیاری پائی جاتی ہے خاص طور سے یہ خطرے کو بہت جلد بھانپ لیتے ہیں۔ یہی ہوشیاری مہرو میں بھی تھی اس نے فیصلہ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر فتح خان کی بات درست تھی تو اس کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے لوگ اسے دیکھتے ہی مار دیتے اور اسے صفائی کا موقع بھی نہیں ملتا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔“

اس بار وہ جیپ میں میرے برابر آ بیٹھی۔ میں نے جیپ آگے بڑھاتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ”کیا تمہیں یقین آ گیا ہے کہ یہ ہماری جان لینے آئے ہیں؟“

”تھوڑا تھوڑا۔“ اس نے ہچکچا کر کہا۔ ”جب میرے لوگ کسی کو مارنے کے لیے تلاش کرتے ہیں تو وہ اسی طرح چھ اور پانچ کی تعداد میں ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک کے پاس کوئی ہتھیار ہوتا ہے باقی چاقو اور ڈنڈے رکھتے ہیں۔ یہ لوگ بھی ایسے ہی ہیں۔“

”ممکن ہے یہ ماریں نہ پکڑ کر قبیلے میں لے جائیں؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”پکڑ کر لے جانے کے لیے تین اور چار آدمی ہوتے ہیں۔ اتنے صرف مارنے کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ تاکہ شکار بچ کر نہ نکل سکے۔“

وہ قبیلے کی بھیدی تھی ایک ایک بات جانتی تھی۔ چند منٹ کی چڑھائی کے بعد دھوپ غائب ہو گئی تھی اور بادل آ گئے تھے۔ یہ پیٹرول انجن والی جیپ تھی اور اس کی ٹنکی فل تھی۔ اس کے ساتھ ہی عقبی حصے میں دروازے کے ساتھ دو عدد چار چار گیلن کے کین فل رکھے تھے۔ جیپ میں ایک اسٹپنی عقبی دروازے کے ساتھ بندھی تھی اور ایک چھت پر تھی۔ مجھے ترپال تلے مہرو کے ساتھ خاصا کچھ سامان بھی نظر آیا تھا لیکن ابھی اسے دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ سردی بڑھ رہی تھی۔ مگر اب تک میں نے ہیٹر آن نہیں کیا تھا اتنے گرم لباس میں اب تک اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ مہرو کے سر پر گرم اونی ٹوپی تھی، ایسا لگ رہا تھا فتح خان نے ہمیں سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے مکمل طور پر تیار کر دیا تھا۔ اس کے سنہری مائل سرخ بال ٹوپی تلے چھپ گئے تھے اور وہ اس لباس میں بالکل بھی کوئی خانہ بدوش عورت نہیں لگ رہی تھی۔ اس کے بجائے وہ اسلام آباد کی کسی برگر فیملی کی لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔ خانہ بدوش ہونے کے باوجود وہ خاصی خوب صورت تھی۔ موزوں جسامت اور سرخ و سفید رنگ پر سبزی مائل آنکھیں اچھی لگتی تھیں۔ ناک نقشہ ذرا اکھڑا تھا لیکن یہ بھی اچھا لگ رہا تھا۔ اگر اس وقت اسے اس کے قبیلے کا کوئی فرد دیکھتا تو آسانی سے شناخت نہیں کر سکتا تھا۔

مجھے سوات کا راستہ تو معلوم تھا لیکن اس وادی تک جانے کا راستہ میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔ بات بھی بہت پرانی تھی اور میں نے وہاں سے نکلنے کے لیے کئی دن کا پیدل سفر کیا تھا۔ وہاں جانے کا کوئی باقاعدہ اور پختہ راستہ نہیں تھا کیونکہ آبادی سے دور ہونے کی وجہ سے وہ جگہ ویران تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ میں راجا عمر دراز کے محل والی وادی میں پہنچ جاتا تو وہاں سے اس وادی تک کیسے جاتا جبکہ مجھے قطعی علم نہیں تھا کہ وہ کتنی دور اور کس طرف تھی۔ یہ بات فتح خان کو بھی معلوم ہونا چاہیے تھی لیکن اس نے مجھے بتائے بغیر یوں ہی چھوڑ دیا تھا۔ مہرو اپنی فکر میں تھی کچھ دیر بعد اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”ہم جہاں جا رہے ہیں اس کا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ”یہ بتاؤ تمہیں کہاں جانا ہے؟“

”میں۔“ وہ ہچکچائی۔ ”پتا نہیں.... میرا اپنے قبیلے کے سوا کوئی نہیں ہے اسی میں میرے گھر والے ہیں۔ لیکن اب میں وہاں نہیں جا سکتی ہوں۔“

”وہ تو ظاہر ہے لیکن تم جلدی سے فیصلہ کر لو کہ تمہیں کہاں جانا ہے میں آنے والی پہلی آبادی میں تمہیں اُتار دوں گا۔“

”مجھے کیوں اُتار دو گے؟“ وہ پریشان ہو گئی۔ ”میں ابھی کہیں نہیں جا سکتی۔“

”یہ تمہارا مسئلہ ہے۔“ میں نے رُکھائی سے جواب دیا۔ درحقیقت فتح خان نے اسے میرے ساتھ لگا کر میرا کام مزید مشکل کر دیا تھا۔ اپنے خیال میں اس نے میرے گرد پھندا مزید مضبوط کر دیا تھا اور اب میں لازمی وادی کی طرف جاتا۔ یا شاید یہ اس کا مذاق تھا۔ بہرحال اس نے مجھے مشکل میں ڈال دیا تھا اور میں کوشش کر رہا تھا کہ اپنا رویہ روکھا رکھ کر اس سے جان چھڑاؤں۔ میں کوئی فلمی ہیرو نہیں تھا جو ہیروئن یا پارٹ ٹائم ہیروئن کے ساتھ ہنستا گاتا تمام مشکلات سے نکل جاتا اور نہ جیمز بانڈ تھا جو اس وقت تک حرکت میں نہیں آتا تھا جب تک اس کی بغل میں ایک عدد حسینہ نہ ہو۔ میرے لیے خواتین کا ساتھ ہمیشہ مشکل ثابت ہوا ہے۔ زرین کے تجربے سے مجھے اس کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا حالانکہ وہ بھی مجبوری تھی میں اسے جان بوجھ کر ساتھ لے کر نہیں نکلا تھا۔ اب یہ مہرو ساتھ تھی۔ لیکن میرا ہرگز ارادہ نہیں تھا کہ اسے ساتھ رکھوں۔ ڈرائیونگ کے ساتھ میں عقبی آئینے پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا اس کا پورا امکان تھا کہ خانہ بدوش پارٹی اس طرف آئے۔ یہاں تک کا پتا انہیں فتح خان نے بتایا ہوگا اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ بھی امکان تھا کہ فتح خان نے میرا روٹ بھی بتا دیا ہو اور وہ اب مستقل میرے پیچھے رہیں۔

''خدا کے لیے میں کہاں جاؤں گی؟'' وہ کچھ دیر بعد بولی۔ ''مجھے اپنے ساتھ رکھو۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ ممکن نہیں ہے میں بہت ضروری کام سے شمال کی طرف جا رہا ہوں۔ مجھ کو کسی کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ مجھے ہر صورت میں یہ کام کرنا ہے اور میرے پاس وقت بھی کم ہے میں تمہیں کہاں لیتا پھروں گا۔''

''میں تمہیں تنگ نہیں کروں گی لیکن مجھے یہاں مت اُتارو۔''

''تم بلاوجہ پریشان ہو رہی ہو۔ میں تمہیں کسی آبادی میں اُتاروں گا۔ تم کسی بس یا وین میں بیٹھ کر آرام سے واپس اسلام آباد جا سکتی ہو اور وہاں کسی سے پوچھ کر عورتوں کے پولیس اسٹیشن جا سکتی ہو وہ تمہیں دارالامان بھیج دیں گے۔'' میں نے اسے مسئلے کا حل سمجھایا۔

''دارالامان.... یہ کیا ہوتا ہے؟''

''یہاں بے سہارا عورتوں کو رکھا جاتا ہے۔ تم چاہو تو پولیس کو اپنے شوہر کے قتل کے بارے میں بھی بتا سکتی ہو لیکن غلطی سے بھی فتح خان یا ان چار آدمیوں کا ذکر مت کرنا جو تمہارے ہاتھ سے مارے گئے تھے ورنہ تم خود پھنس جاؤ گی۔''

میں نے یہ بات کئی بار دھرائی تو وہ سمجھ گئی۔ میں پچاس ہزار میں سے اسے دو تین ہزار دے دیتا تو وہ آسانی سے واپس جا سکتی تھی۔ اب وہ رضامند دکھائی دے رہی تھی اور میں خوش تھا کہ میں نے فتح خان کی ایک چال تو ناکام بنا دی جو اس نے مجھے اپنا پابند بنانے کے لیے چلی تھی۔ اس وقت ہم مارگلہ کی پہاڑیوں سے گزر رہے تھے۔ دائیں بائیں چھوٹی چھوٹی وادیوں میں مکانات اور آبادیاں تو نظر آ رہی تھیں لیکن ابھی تک ایسا کوئی بازار نظر نہیں آیا تھا جہاں میں مہرو کو اُتار سکتا۔ ہائی وے کے ساتھ اکا دکا دکانیں بھی تھیں مگر یہاں بھی اسے نہیں اُتار سکتا تھا۔

تقریباً نصف گھنٹے بعد ایک ایسا بازار آیا جہاں درجن بھر دکانیں اور ایک ہوٹل بھی تھا۔ صرف دو دکانیں اور ایک ہوٹل کھلا ہوا تھا۔ اکا دکا لوگ بھی نظر آ رہے تھے لیکن سردی نے ماحول کو ویران کر رکھا تھا۔ میں نے جیپ ہوٹل سے ذرا فاصلے پر روک دی اور پھر لفافے سے تین ہزار نکال کر مہرو کو تھما دیے۔ وہ کچھ پریشان اور خوف زدہ لگ رہی تھی۔ جب میں نے اسے اترنے کو کہا تو وہ منمنا کر بولی۔ ''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''فکر مت کرو تم آرام سے واپس اسلام آباد پہنچ جاؤ گی۔'' میں نے اسے حوصلہ دیا۔ ''اصل خطرہ تو میرے ساتھ ہے اگر میں واپس آیا تو فتح خان کے پاس ہی جاؤں گا اور تم دوبارہ اس کے ہتھے چڑھ جاؤ گی اور یقین کرو اس کے پاس درندہ صفت آدمیوں کی کوئی کمی نہیں ہے وہ پھر تمہیں ان کے حوالے کر دے گا۔''

مہرو نے ذرا تعجب سے مجھے دیکھا۔ ''وہ تمہارا دشمن ہے تو اس کے پاس کیوں جاؤ گے؟''

''کیونکہ اس نے میرے ایک ساتھی کو قید کر رکھا ہے اور اس کی رہائی کے لیے شرط لگا دی ہے۔ مجھے اس کی شرط پوری کر کے واپس جانا ہوگا۔''

اس اطلاع نے میرا کام آسان کر دیا اور مہرو فوراً جیپ سے اُتر گئی۔ میں نے ہاتھ ہلایا اور عقبی حصے میں ترپال کے نیچے موجود سامان کی طرف متوجہ ہوا۔ توقع کے مطابق اس میں وادی تک سفر کے لیے سامان تھا۔ اس میں خوراک اور پہاڑی علاقوں میں سفر کے لیے خاص اشیا کے ہمراہ ایک عدد چھوٹا سا آسانی سے لگ جانے والا جدید قسم کا خیمہ بھی تھا۔ ایک عدد چھوٹا اسپرٹ سے جلنے والا سیفٹی اسٹوو اور اس کے لیے اسپرٹ کی پانچ لیٹر کی سائفن بوتل بھی تھی۔ اسے کھولے بغیر صرف نلکی لگا کر اسٹوو میں اسپرٹ بھری جا سکتی تھی۔ دو عدد طاقت ور ٹارچیں، ایک لٹکانے والا لیمپ اور ان کو روشن رکھنے کے لیے خاصی تعداد میں ڈرائی بیٹریز تھیں۔

فتح خان نے ہر چیز کا خیال رکھا تھا کہ اس سفر کے دوران مجھے کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہو اور میں اپنی پوری توجہ ہیرے تلاش کرنے پر لگا سکوں۔ ایک چھوٹے بیگ میں میرے لیے دو عدد پینٹ شرٹس اور ایک جوڑا جوتوں کا تھا۔ خوراک میں خشک کیا ہوا گوشت اور ٹن بند اشیا زیادہ تھیں۔ اس کے علاوہ خشک دودھ اور کافی کا ڈبا بھی تھا۔ سب کچھ تھا لیکن وادی تک جانے والے راستے کا کوئی نقشہ نہیں تھا۔ شاید فتح خان کو بھی اس کا خیال نہیں آیا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا اور میں نے پلٹ کر ڈیش بورڈ کا خانہ کھولا۔ اس میں جیپ کے کاغذات کے ساتھ ایک چھوٹا سا رول کیا ہوا پلاسٹک کوٹڈ کاغذ بھی تھا۔ میں نے رول کھولا تو اس پر سوات کے نقشے کے ساتھ ہی وادی تک جانے والے راستے کی بال چین سے مکمل وضاحت کی گئی تھی۔ گویا فتح خان نے اس پہلو کا خیال بھی رکھا تھا۔ اب بس مجھے روانہ ہو جانا تھا۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں جیپ اسٹارٹ کرتا میری نظر

ہوٹل سے ذرا آگے موجود ایک پُرانی لیکن بڑی اور مضبوط کار کی طرف گئی۔ کار کے ساتھ تین مقامی نظر آنے والے افراد نے مہرو کو گھیرنے کے انداز میں اپنے درمیان لے رکھا تھا اور وہ ہراساں دکھائی دے رہی تھی۔ اگرچہ ان افراد کے پاس کوئی اسلحہ تو دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن ایک کا ہاتھ اپنے کوٹ کی جیب میں تھا اور ابھار بتا رہا تھا کہ اس نے کوئی چیز پکڑ رکھی ہے۔ اس نے شلوار قمیص پر کوٹ پہن رکھا تھا جیسا کہ مقامی رواج تھا۔ میں نے ایک لمحے کو سوچا کہ اب یہ میرا معاملہ نہیں ہے اور مجھے کسی نئے چکر میں پڑنے کے بجائے اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔ مجھے بہر صورت ہیرے لا کر فتح خان کے حوالے کرنا تھے تاکہ سویرا کی واپسی ممکن ہو سکے۔ میں مہرو کو بچانے کی کوشش میں کسی نئی مصیبت میں پڑ سکتا تھا اور میرا راستہ کھوٹا ہوتا۔

میں سوچتا رہا اور جیپ اسٹارٹ کرنے کے لیے چابی پر ہاتھ بھی رکھ دیا تھا۔ لیکن میرا اندر میرے فیصلے سے متفق نہیں تھا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا پھر چابی سے ہاتھ ہٹا کر نیچے اُتر آیا اور تیز قدموں سے مہرو کی طرف بڑھا۔ وہ لوگ شاید اسے کار میں بیٹھنے پر مجبور کر رہے تھے۔ میں نے ذرا دور سے اسے آواز دی۔ ''ارے تم یہاں ہو میں تمہیں کہاں کہاں تلاش کرتا پھر رہا تھا۔'' میں نے ان آدمیوں کو گھورا۔ ''تم لوگ کون ہو اور میری بیوی کو کیوں گھیر رکھا ہے؟''

''یہ تیری بیوی ہے۔'' کوٹ کی جیب میں ہاتھ رکھے جوان آدمی نے کہا وہ صورت سے اوباش لگ رہا تھا۔ باقی دو اس کی نسبت کم عمر تھے لیکن پورے چھٹے ہوئے لگ رہے تھے۔ وہ مہرو کو ساتھ لے جانے کی فکر میں تھے۔ ''یہ تو کہہ رہی ہے اس کا کوئی نہیں ہے اور اسے اسلام آباد جانا ہے ہم اسے اسلام آباد چھوڑ دیتے۔''

''یہ سمجھی کہ میں اسے چھوڑ گیا ہوں تو یہی کہے گی۔'' میں نے مہرو کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''چلو یہاں سے۔''

''ایک منٹ۔'' ایک کم عمر نے مہرو کا دوسرا ہاتھ تھام لیا۔ ''کیا ثبوت ہے کہ تم اس کے شوہر ہو؟''

میں نے اس کا ہاتھ کلائی سے پکڑ کر دبایا تو اس نے بلبلا کر مہرو کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میری گرفت ہڈیاں کڑکڑا دینے والی تھی۔ اس نے گالی دے کر دوسرے ہاتھ سے مجھے مکا مارنا چاہا لیکن میں نے اس کا ہاتھ گھمایا تو ساتھ میں وہ خود بھی گھوم گیا اور مکا ہوا میں لہراتا دوسرے کم عمر کے منہ پر لگا۔ اس نے گالی دی اور اوباش نظر آنے والے نے جیب سے ہاتھ نکالا۔ پستول کی جھلک دیکھتے ہی میں نے لات چلائی اور پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس بار اس نے بھی گالی دی۔ میں نے جس کی کلائی پکڑی ہوئی تھی اس کی کلائی یوں گھمائی کہ وہ اسے ٹوٹنے سے بچانے کے لیے ازخود توپ سے نکلے گولے کی طرح اوباش صورت سے جا ٹکرایا اور اسے لیتا ہوا زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ دوسرا کم عمر مجھ سے چمٹ گیا تھا۔ اس نے میرا کام آسان کر دیا۔ اس کی گردن دبائی تو اس نے خود کو چھڑانا چاہا لیکن اب کمبل اسے کہاں چھوڑنے والا تھا۔ میں نے دو بار اس کا منہ کار کی باڈی پر مارا۔ باڈی زیادہ مضبوط تھی اس لیے نقصان اس کے منہ کا ہوا اور اسے ناک کی ہڈی ٹوٹنے کے ساتھ کئی دانتوں سے محرومی کا صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا اور میں نے اس کی گردن چھوڑی تو وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اوباش صورت اپنے ساتھیوں کو گالیاں دیتا اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے اس کے منہ پر ٹھوکر ماری اور وہ دوبارہ لیٹ گیا۔ پہلا کم عمر زیادہ ہوشیار تھا اس نے ایک بار گرنے کے بعد دوبارہ اُٹھنے کی کوشش نہیں کی اور ایک منٹ سے بھی پہلے یہ معاملہ نمٹ گیا تھا میں نے مہرو سے کہا۔

''جا کر گاڑی میں بیٹھو۔''

مہرو کے جانے کے بعد میں نے ایک طرف پڑا پستول اُٹھا کر جیب میں رکھ لیا اور مدہوش پڑے اوباش صورت کی تلاشی لے کر اس کے دو عدد فاضل میگزین بھی نکال لیے۔ فتح خان نے ہر چیز کا بندوبست کر دیا تھا سوائے اسلحے کے اور اب میں کسی ہتھیار کے بغیر خود کو ایسا ہی محسوس کرتا تھا جیسے گزرے زمانے میں شرفا خود کو ننگے سر محسوس کرتے ہوں گے۔ ان لوگوں کی مہربانی سے مجھے ہتھیار بھی مل گیا تھا۔ بازار کی ویرانی میں اکا دکا افراد نے یہ منظر دیکھا تھا لیکن ان میں سے کسی نے بھی دخل اندازی سے گریز کیا۔ میں اوباش صورت کے پاس بیٹھا اور دھیمی آواز میں کہا۔

''ابھی میں چلا جاؤں گا اور میرے جاتے ہی تم بھی روانہ ہو جانا کیونکہ اب مجھے دوبارہ دکھائی دیے تو اس کا مطلب ہوگا تم مرنا چاہتے ہو۔ اس واقعے کو بھول جانا بھی تمہاری صحت کے لیے بہتر ہوگا۔ پولیس کا رُخ بھی مت کرنا ورنہ اس سے بھی زیادہ بڑی مشکل میں پھنس جاؤ گے۔''

وہ تینوں مجھے دہشت زدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس لیے مجھے یقین تھا وہ وہی کریں گے جو میں نے کہا ہے۔ جیسے ہی میں جیپ میں آ کر بیٹھا وہ بھی گرتے پڑتے اُٹھ کر کار میں گھس گئے۔ کار اسٹارٹ ہوئی اور لہرا کر پہلے ہوٹل میں گھسنے لگی۔ بروقت بریک لگا کر اسے روکا اور پھر وہ کسی مدہوش شرابی کی طرح لہراتی ہوئی نیچے کی طرف جانے لگی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں فوراً اوپر کی طرف روانہ ہو گیا اور اس بازار سے نکلنے کے بعد مہرو سے پوچھا۔ ”یہ کیا چکر تھا؟“

اس نے گہری سانس لی۔ ”میں نے تو بس اتنا پوچھا تھا کہ اسلام آباد جانے والی گاڑی کب آتی ہے؟“

”اور وہ تمہیں لفٹ دینے کو تیار ہو گئے۔“

”کیا دینے کو؟“ وہ نہ سمجھنے والے انداز میں بولی۔

”لفٹ.... مطلب ساتھ لے جانے کو۔“

”ہاں کتے کہیں کے جہاں کوئی اکیلی عورت دیکھی آجاتے ہیں۔“ وہ غصے میں آگئی۔ ”کاش میرے پاس چاقو ہوتا تو میں ایک دو کا پیٹ پھاڑ دیتی۔“

”تمہیں چاقو چلانا آتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں.... میں کلہاڑی اور درانتی بھی چلالی ہوں۔“ وہ بولی۔ ”ہماری عورتوں کو وہ سارے ہتھیار استعمال کرنے آتے ہیں جو قبیلے کے مردوں کے پاس ہوتے ہیں۔“

قبائلیوں اور خانہ بدوشوں میں یہ ہوتا ہے وہ اپنی عورتوں کو بھی لڑنا سکھاتے ہیں تا کہ بہ وقت ضرورت ان سے بھی مدد لے سکیں۔ مگر افسوس کے یہ سارے گر مہرو کے کام نہیں آئے اور وہ دو بار خود سے زیادہ چالاک اور طاقت ور مردوں کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ تین یا چار دن پہلے میں نے اسے بہت بُرے حال میں دیکھا تھا لیکن اب وہ بالکل بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔ فتح خان نے اس کا علاج کرانے کے ساتھ شاید اسے بہترین خوراک بھی فراہم کی تھی کیونکہ اس کی صحت بھی ٹھیک تھی۔ مہرو نے بتایا کہ اپنے ساتھیوں کی لاشیں لے جانے کے کئی گھنٹے بعد فتح خان آیا اور اس نے مہرو کو انجکشن لگا کر بے ہوش کر دیا تھا اور اس کے بعد وہ زیادہ تر بے ہوش رہی تھی۔ اسے کچھ دیر کے لیے ہوش آتا تو اسے دوبارہ انجکشن لگا دیا جاتا تھا اور اسی بے ہوشی کے دوران میں اس کا علاج کیا جاتا رہا تھا۔ اسے شاید انجکشن کے ذریعے ہی خوراک دی جاتی رہی ہوگی اور ڈرپ کی مدد سے پانی کی کمی پوری کی جاتی ہوگی۔ کہنی کے جوڑ پر انجکشن کا نشان تھا شاید اس سے کینولا منسلک کیا ہوگا اور پھر اسی کی مدد سے اسے قوت بخش انجکشن دیا جاتا رہا ہوگا۔ بار بار نس تلاش کرنے کی زحمت سے بچنے کے لیے ہی کینولا لگایا جاتا ہے۔ یقیناً اسے بھی خوراک اور پانی دیا جاتا رہا تھا کیونکہ اس میں نہ تو کسی قسم کی کمزوری محسوس ہو رہی تھی اور نہ بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے مہرو سے کہا۔

”میں اب تمہیں کسی بڑے قصبے میں چھوڑ دوں گا تا کہ تمہیں ایسی کوئی پریشانی نہ ہو۔“

اس اطلاع نے اسے فکر مند کر دیا تھا کیونکہ پہلا تجربہ ہی خاصا خطرناک ثابت ہوا تھا اگر میں بروقت مداخلت نہ کرتا تو وہ ایک بار پھر کچھ ہوس زدہ مردوں کے ہتھے لگ جاتی۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”فتح خان تم سے کیا کام لے رہا ہے؟“

”اس کا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔“ اس نے پیش کش کرنے والے انداز میں کہا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ”اگر تم یہ سمجھ رہی ہو کہ میں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گا تو تم غلطی پر ہو۔ مجھے جو کرنا ہے اکیلے کرنا ہے۔“

”ایک کام کو ایک آدمی کے مقابلے میں دو آدمی زیادہ بہتر کر سکتے ہیں۔“ اس نے اصرار کیا۔ ”جب تم واپس آنا تو پھر مجھے شہر میں چھوڑ دینا۔“

”مہرو میں جس کام کے لیے جا رہا ہوں وہ بہت مشکل ہے اور اس میں جوکھم بھی ہے۔ تم آرام سے واپس جا سکتی ہو کیونکہ یہ بھی ہو سکتا ہے میری واپسی نہ ہو۔“

اس کا اصرار جاری رہا۔ ”میں کمزور عورت نہیں ہوں تم نے دیکھ لیا ہے، میری جگہ کوئی اور ہوتی تو اب تک مر چکی ہوتی۔ میں ہر مشکل میں تمہارا ساتھ دے سکتی ہوں۔“

”تمہیں کیا ضرورت ہے ہر مشکل میں میرا ساتھ دینے کی؟“ میں نے ذرا خشک لہجے میں پوچھا۔ ”جبکہ تم واپس جا سکتی ہو، ضروری نہیں ہے ہر بار تمہیں ایسے لوگ ملیں۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ وہ ہچکچا کر بولی۔ ”پر مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے میں تمہارے ساتھ رہوں گی تو حفاظت سے رہوں گی۔ پھر میں تمہارے کام آؤں گی۔ بالکل بھی بوجھ نہیں بنوں گی۔“

اس کی بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وادی تک سفر میں مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی مگر اس دوران میں وہ مجھ پر بوجھ بھی نہیں بنتی۔ وہ مضبوط جسم کی جوان خانہ بدوش عورت تھی۔ بلکہ دیکھا جائے تو عمر کے لحاظ سے لڑکی تھی۔ ہاں شادی شدہ تھی۔ اسے اونچے نیچے ناہموار راستوں پر سفر کا تجربہ بھی تھا۔ سامان خاصا تھا اور وادی سے بہت پہلے مجھے جیپ چھوڑ کر پیدل سفر کرنا تھا۔ اگر وہ ساتھ ہوتی تو سامان اٹھانے والے دو ہو جاتے اور سب سے اہم بات جب میں وادی پہنچ جاتا اور اپنی ساری توجہ ہیرے تلاش کرنے پر مرکوز کر دیتا تو مجھے دوسرے کاموں کے لیے وقت

نہیں ملتا جیسے کھانا بنانا، پانی اور لکڑی تلاش کر کے لانا اور سب سے اہم کام سامان کی حفاظت کرنا ہوتا۔ مہرو یہ کام آسانی سے کر سکتی تھی۔ اس کے بارے سوچتے ہوئے مجھے یاد آیا۔

”جب تمہیں امیر مقام پکڑ کر لایا تھا تو تم نے اپنے کسی بچے کا ذکر بھی کیا تھا۔ اب تمہیں اس کی پروا نہیں ہے؟“

اس کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔ ”پروا کیوں نہیں ہے پر میں کیا کروں اب میں واپس تو نہیں جا سکتی۔“

”تب تمہارا بچہ کون سنبھالے گا۔ وہ دودھ پیتا ہے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”میری بہن دیکھے گی، اس کا بھی بچہ ہے جو دودھ پیتا ہے، وہ اسے دودھ پلا دے گی۔“

اس سفر میں پہلی بار مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔ وہ ماں تھی اور ایک ماں کے لیے اپنے بچے سے دور رہنے سے زیادہ دشوار بات اور کوئی نہیں ہوتی...... وہ انا پرست تھی اس لیے اپنا دکھ ظاہر نہیں کر رہی تھی۔ مگر اسے اپنے بچے کی یاد تو ستاتی ہو گی۔ وہ رو رہی تھی لیکن اپنے آنسو چھپانے کے لیے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ میں بھی چپ ہو گیا۔ خاصی دیر بعد اس نے بھرائی آواز میں کہا۔ ”میں اس قابل نہیں ہوں کہ اپنے بچے کے پاس جاؤں اسے دودھ پلاؤں۔“

”یہ تمہارا خیال ہے لیکن میرا خیال ہے جو ہوا اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے، تم تو ظلم کا شکار ہوئی ہو۔ ویسے اگر تم اپنے شوہر کے ساتھ واپس جاتیں تو وہ تمہیں قبول کر لیتا؟“

”راجو کا مجھے یقین ہے وہ مجھے قبول کر لیتا کیونکہ وہ جانتا ہے میں بد کردار نہیں ہوں اور وہ مجھ سے محبت بھی کرتا تھا۔ پر اس کے گھر والے....“

وہ بولتے بولتے رک گئی۔ قبیلے اور گھر میں اس کا مستقبل غیر محفوظ تھا ممکن ہے راجو اسے طلاق دے دیتا۔ ویسے وہ خود کون سا کردار کا اچھا تھا۔ شہلا کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ پھر یہ خانہ بدوش قبیلہ بھی جرائم پیشہ لگ رہا تھا۔ سردار اگر اپنے عزائم میں کامیاب ہو جاتا تو ہمیں مار کر یقیناً وہ گھر کو لوٹ لیتے اور پھر فرار ہو جاتے۔ وہ تو فتح خان نے اچانک آکر ان کے رنگ میں بھنگ ڈال دی۔ بہر حال یہ سب مہرو سے کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں ابھی تذبذب میں تھا کہ اسے لے کر جاؤں یا نہ لے جاؤں۔ اس وقت میں نے ذہن آزاد چھوڑ دیا۔ اگر بعد میں کوئی ایسی صورتِ حال بن جاتی جس میں اسے ساتھ لے جانا مناسب ہوتا تو میں اسے لے جا بھی سکتا تھا۔ ابھی تو بہت طویل سفر کرنا تھا۔ چھوڑنے کو میں اسے سوات شہر میں بھی چھوڑ سکتا تھا۔ مجھے اس کی فکر نہیں تھی۔

شام چار بجے تک سفر کے دوران کئی چھوٹے بڑے قصبے آئے لیکن میں نے کہیں جیپ نہیں روکی سوائے ایک پیٹرول پمپ کے جہاں میں نے ٹنکی دوبارہ فل کرالی۔ اب میرے پاس اتنا پیٹرول تھا کہ میں رکے بغیر آرام سے اپنی منزل تک پہنچ سکتا تھا۔ ایک جگہ قصبے میں رک کر ہوٹل سے چائے منگوائی۔ لیکن میں اور مہرو جیپ میں رہے تھے۔ پانچ ہزار فٹ سے اوپر آتے ہی جا بہ جا برف کے ڈھیر نظر آنے لگے تھے۔ یہ گزشتہ برف باریوں کی برف تھی جو پگھلنے کے لیے موسم بہار کی منتظر تھی۔ موسم ابر آلود تھا۔ کہیں بادل زیادہ تھے اور کہیں کم تھے لیکن کہیں پر بھی برف باری یا بارش کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کیونکہ اس صورت میں سفر مخدوش ہو جاتا۔ کافی یا چائے گرم رکھنے کے لیے ایک عدد چھوٹے سائز کا تھرماس بھی جیپ میں موجود تھا۔ میں نے اسی میں ہوٹل سے چائے بھروالی تھی۔ یہاں جس قسم کے ہوٹل تھے ان میں ڈھنگ کی کافی ملنے کا امکان بہت کم تھا اس لیے میں نے چائے کو ترجیح دی۔ اگرچہ یہ دودھ پتی والی چائے تھی جس میں میٹھا بھی زیادہ ہوتا لیکن بہر حال چائے تھی اور گرم تھی۔

فتح خان نے مجھے خبردار کیا تھا کہ وہ مسلسل مجھ پر نظر رکھے گا اور اگر میں وادی کی طرف جانے والے راستے سے ہٹا تو وہ سویرا کے حوالے سے اپنی دھمکی پر عمل کر گزرے گا۔ سفر کے دوران میں جائزہ لیتا رہا تھا کہ کوئی جیپ کے پیچھے تو نہیں ہے لیکن مجھے کوئی تعاقب میں نظر نہیں آیا تھا۔ اس کے باوجود میں خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کہ فتح خان کی ہدایات سے انحراف کر کے اسے موقع فراہم کروں۔ ہیروں کے لیے وہ پاگل ہو رہا تھا اور پاگل سے آدمی کو ہمیشہ محتاط رہنا چاہیے کیونکہ وہ اپنے یا دوسرے کے نفع نقصان کا خیال نہیں کرتا ہے۔ اس موسم میں کہیں کوئی ڈھنگ کا ہوٹل یا کیفے کھلا ملنا محال تھا اور اگر کھلا بھی ہوتا تو وہاں کھانے کی کوئی ڈھنگ کی چیز ملنا محال تھا۔ اس لیے اس سفر کے دوران ہمیں ان ہی چیزوں پر گزارا کرنا تھا جو جیپ میں موجود تھیں۔ یہ سامان اچھا خاصا تھا اور اگر مہرو بھی ساتھ ہوتی تب بھی یہ دس دن کے لیے کافی ہوتا۔

چار بجے ہی موسم سرمئی ہو گیا تھا اور لگ رہا تھا کہ ایک گھنٹے بعد باقاعدہ تاریکی چھا جائے گی۔ اس کے بعد سفر مشکل ہو جاتا۔ ابھی ہم نے نصف راستہ طے کیا تھا وہ بھی اس وجہ سے کہ موسم خوشگوار تھا۔ ورنہ ہمیں سوات تک پہنچنے میں دو دن لگ سکتے تھے اور اس کے بعد کم سے کم ایک دن کا پیدل سفر تھا۔ میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے سوچا کہ فتح خان کو معلوم نہیں ہے کہ کم سے کم چھ دن تو صرف آنے جانے میں لگ جائیں گے اس کے بعد ہیرے تلاش کرنے کے لیے صرف چار دن بچیں گے۔ اس کے خیال میں چار دن میں ایک آدمی اس میل بھر پھیلی وادی میں ہیروں کا وہ چھوٹا سا بلیک بکس تلاش کر سکتا تھا جو برٹ شا نے کہیں چھپایا تھا۔ اس کا امکان لاکھ میں سے کیا کروڑ میں سے ایک بھی نہیں تھا۔ مجھے ایک بار پھر شک ہونے لگا کہ فتح خان کسی اور چکر میں تھا وہ بھلا مجھ سے یہ ناممکن کام کس طرح کہہ سکتا تھا۔ مگر میں صرف شک کی وجہ سے سفر ترک نہیں کر سکتا تھا۔

کچھ دیر میں تاریکی چھا جاتی اور اس موسم میں رات میں سفر کرنا بہت خطرناک ثابت ہو سکتا تھا اس لیے رات ہونے سے پہلے ہمیں کوئی ایسی جگہ تلاش کرنا تھی جہاں رات گزار سکیں ورنہ اسی جیپ میں رات گزارنا پڑتی۔ اس وقت ہم ایک ویران اور تنگ سی سڑک سے گزر رہے تھے جس کے ایک طرف گہری ڈھلان تھی اور دوسری طرف آسمان کو چھوتا برف اور جنگل پوش پہاڑ۔ میں نے مہرو سے بھی کہا کہ وہ نظر رکھے ممکن ہے کوئی مناسب جگہ نظر آجائے۔ کوئی ایک گھنٹے بعد جب سچ مچ تاریکی چھانے لگی تھی۔ اچانک مہرو نے پہاڑ کے اوپر کی طرف جانے والے ایک کچے راستے کی طرف اشارہ کیا۔ ”ہوسکتا ہے اس پر کوئی جگہ مل جائے۔“

میں نے جیپ روک کر راستے کا معائنہ کیا۔ اس پر مشینی گاڑیاں نہیں چلتی تھیں لیکن انسانوں اور جانوروں کی آمد و رفت باقاعدگی سے ہوتی تھی۔ میں نے کچھ سوچنے کے بعد جیپ اس طرف گھما دی۔ راستہ کچا لیکن ہموار تھا۔ ہم کچھ اوپر گئے ہوں گے کہ ایک چھوٹی سی عمارت دکھائی دی۔ نیچے سڑک سے یہ گھنے درختوں میں چھپی ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آئی تھی۔ پرانے انداز میں پتھروں اور اوپر کھپریل کی چھت سے بنا ایک ہی کمرا تھا۔ شاید کسی زمانے میں یہ ریسٹ ہاؤس یا اس علاقے میں سفر کرنے والے سرکاری افسران کا عارضی پڑاؤ ہو گا۔ لیکن اب یہ متروک ہو چکا تھا اور اس کی کھڑکیاں اور دروازے غائب تھے۔ برآمدے کے اوپر آنے والی چھت غائب ہو چکی تھی لیکن کمرے کے اوپر کی چھت خستہ حال ہونے کے باوجود ابھی تک برقرار تھی۔ میں اور مہرو جیپ سے اتر کر کمرے تک آئے۔ فرش پر گرد اور پرندوں کی بیٹ کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور اس پر جوتا رکھے بغیر اندر جانا ممکن ہی نہیں تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ایسا ہی ایک ڈھیر اندر بھی موجود ہو گا اور اسے صرف ایک رات کے لیے صاف کرنا ہم دونوں کے بس کی بات نہیں تھی کیونکہ اس میں بہت وقت لگ جاتا اور صفائی کے لیے ہمارے پاس کچھ نہیں تھا۔ اگر یہ کمرا صاف ہوتا تو رات گزارنے کے لیے بہت بہترین جگہ ہوتی۔ یہاں ہم موسم کی سختی سے محفوظ رہتے۔

ہماری قوم کی مثال اس مفلس فقیر کی سی ہے جو اپنے پاس موجود چیز کی نہ تو پروا کرتا ہے اور نہ اسے سنبھال کر رکھتا ہے مگر مزید چیزوں کے لیے اس کی ہوس بھی کم نہیں ہوتی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک جن کے پاس وسائل کی کمی نہیں... وہ اپنی ایک ایک چیز کو سنبھال کر استعمال کرتے ہیں اور اس سے پورا نفع حاصل کرتے ہیں اور ہم اپنی ہی بنائی چیزوں کو لاپروائی سے چھوڑ دیتے ہیں۔ بہت مضبوط پتھروں سے بنی یہ عمارت برسوں نہیں صدیوں قائم رہ سکتی ہے۔ اگر اس کی دیکھ بھال کی جاتی تو یہ روزِ اوّل کی طرح ہوتی۔ اگر سرکار کو اس کی ضرورت نہیں تھی تو اسے نجی شعبے کو فروخت کیا جا سکتا تھا۔ کوئی غریب آدمی اسے لے کر چھوٹے موٹے ہوٹل میں بدل دیتا یا اپنی رہائش کے لیے استعمال کرتا۔ ان علاقوں میں درجنوں این جی اوز لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کر رہی ہیں، یہ جگہ ان کو دفتر کے طور پر دی جا سکتی تھی۔ مگر اب یہ بے کار پڑی ہوئی تھی۔ بہت افسوس کے ساتھ ہم واپس جیپ میں آگئے۔ مہرو نے کہا۔ ”ہم اس میں بھی سو سکتے ہیں۔“

یہ بھی مشکل نہیں تھا۔ جیپ کی آرام دہ سیٹ پیچھے ہو جاتی تھی اور آدمی دراز نہ سہی نیم دراز ہو سکتا تھا۔ مگر میں اس کے ساتھ سونے کے خیال سے ہچکچا رہا تھا۔ عجیب بات تھی کچھ عرصے پہلے زرین کے ساتھ بھی بہت سا وقت اکیلے ویرانوں میں گزارا تھا لیکن مجھے اس کے ساتھ کبھی ایسی جھجک محسوس نہیں ہوئی تھی۔ حالانکہ اس کے انداز میں میرے لیے بہت والہانہ پسند آگئی تھی۔ اس کے باوجود اس کے ساتھ مجھے خود پر پورا اعتماد ہوتا تھا کہ میں کسی بھی صورتِ حال میں اسے سنبھال لوں گا اور اس کی وجہ اس کا میری ذات پر اندھا اعتماد اور محبت تھی۔ لیکن یہ خانہ بدوش عورت میرے لیے بالکل اجنبی تھی۔ ابھی چند دن پہلے ہی کئی صدموں سے گزری تھی اور مجھے بالکل نہیں معلوم تھا کہ کس صورتِ حال میں اس کا ردِ عمل کیا ہو گا؟ میں اس سے محتاط تھا۔ یقیناً اس کے ذہن میں بھی کوئی ایسا ویسا خیال نہیں تھا اور اتنی دیر میں وہ یہ تو جان گئی تھی کہ میں عورتوں کی طرف رغبت رکھنے والا یا ان کی مجبوری اور کمزوری سے فائدہ اٹھانے والا شخص نہیں ہوں۔ اس لیے وہ بلا جھجک جیپ میں سونے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔

اس کے سوا کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا اس سردی میں کھلی فضا میں صرف خیمہ لگا کر ہی سویا جا سکتا تھا جبکہ درجہ حرارت یقیناً نقطۂ انجماد سے نیچے تھا۔ پیچھے دو عدد کمبل بھی موجود تھے جو ہلکے لیکن کسی ایسے میٹریل سے بنے تھے جو بہت گرم ہوتا ہے۔ انجن بند ہونے کے بعد جیپ اندر سے بھی یخ ہو گئی تھی اور ان کپڑوں میں بھی سردی لگ رہی تھی۔ ابھی صرف چھ بجے تھے اور سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اس لیے پہلے ہم نے لکڑیاں جمع کر کے الاؤ جلایا اور اس پر ٹن میں بند کھانا گرم کر کے کھایا میرے پیٹ میں یقیناً کئی دن سے کچھ نہیں گیا تھا اس لیے میں نے دودھ گرم کر کے اس میں کارن فلیکس لے لیا۔ پھر کافی تیار کی۔ اسے کافی سے رغبت نہیں تھی لیکن گرم ہونے کی وجہ سے اس نے پی لی۔ الاؤ ریسٹ ہاؤس کی دیوار کی اوٹ میں روشن کیا تھا۔ ایک تو یہاں ہم ہوا سے محفوظ تھے دوسرے میں نہیں چاہتا تھا کہ آس پاس کوئی موجود ہو تو روشنی دیکھ کر بلاوجہ تفتیش کے لیے یہاں چلا آئے۔ میں فی الحال کسی کے سوالات کا سامنا کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ نو بجے تک الاؤ بجھ کر انگاروں میں تبدیل ہو گیا تھا۔ میں نے مہرو سے کہا۔

”اب سونے کی کوشش کرتے ہیں۔“

میں نے انگاروں پر ریت ڈالی اور ہم جیپ میں آگئے۔ کمبل پہلے ہی نکال لیے تھے الاؤ کے پاس کمبل میں لپٹے بیٹھے تھے۔ مجھے تھکن محسوس ہو رہی تھی لیکن نیند نہیں آ رہی تھی۔ مہرو نے تلے آلو اور خشک گوشت کے ٹکڑے بھون کر کھائے تھے اس لیے اسے تو لیٹتے ہی نیند آگئی۔ میں کمبل میں لپٹا جاگتا رہا۔ صبح سے اب تک دوڑ بھاگ لگی ہوئی تھی، پہلی بار مجھے سکون سے سوچنے کا موقع ملا تھا۔ میں نے یہ سوچنے کے بجائے کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا تھا اور فتح خان نے مجھے کیوں چھوڑا تھا؟ اس پلان کو فتح خان کے نقطۂ نظر سے دیکھا۔ یعنی اگر میں فتح خان کی جگہ ہوتا تو ہیروں تک رسائی کے لیے کس طرح کا پلان تیار کرتا۔ ذرا غور و خوض کے بعد مجھے فتح خان کا اس طرح مجھے چھوڑنا اور ہیروں کی تلاش میں اکیلے روانہ کرنا، پھر مجھے صرف دس دن کی مہلت دینا اور جواب میں ایسی دھمکی دینا جس پر عمل کرنے کے بعد میرے اور فتح خان کے درمیان مفاہمت کی ہر راہ بند ہو جاتی اور میں اس کے سر سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہوتا۔ مجھے شاطر فتح خان سے ایسے منصوبے کی امید نہیں تھی۔

لیکن یہ توقع بھی نہیں تھی کہ اس کا اصل پلان یہی ہو گا جو اس نے مجھے خط کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ کسی وجہ سے اس نے مجھے یوں آزاد چھوڑا تھا لیکن ساتھ ہی میری نگرانی کا پورا بندوبست کر دیا تھا۔ مجھے راستے میں بہت ساری جگہوں پر دور تک کوئی اپنے پیچھے نظر نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ فتح خان کسی دوسرے طریقے سے میری نگرانی کر رہا تھا۔ میرے ذہن میں سگنل دینے والی ڈیوائس کا خیال پہلے بھی آیا تھا۔ آج کل ایسی جدید ڈیوائس عام ہیں۔ جو چھوٹی ہونے کے ساتھ کئی میل دور تک سگنل دے سکتی ہیں اور جی پی ایس کی مدد سے اپنا جائے وقوع بھی نشر کرتی ہیں۔ ڈیوڈ شا کے ساتھ کام کر کے فتح خان نے جدید الیکٹرانک ڈیوائسز کے معاملے میں خاصی ترقی کی تھی۔ اگر اس نے جیپ میں ایسی کوئی ڈیوائس لگا دی تھی تو میں کسی صورت اس کا سراغ نہیں لگا سکتا تھا۔ اتنی بڑی جیپ میں اسے کہیں بھی چھپایا جا سکتا تھا اور بہت ساری جگہیں تو ایسی تھیں جنہیں مخصوص اوزاروں سے کھولے بغیر دیکھا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ فتح خان یا اس کے آدمی یقیناً اس وقت کہیں آس پاس چند میل کے فاصلے پر موجود ہو سکتے تھے۔

مجھے خیال آیا کہ اگر میں انہیں تلاش کرنے کی کوشش کروں تو کامیاب ہو سکتا ہوں لیکن پھر میں نے یہ خیال مسترد کر دیا۔ اوّل تو وہ احمق نہیں تھے کہ کسی کھلی جگہ موجود ہوتے اور میں ان کو آسانی سے تلاش کر لیتا۔ یقیناً انہوں نے خود کو چھپانے کی پوری کوشش کی ہو گی دوسرے وہ اس سڑک پر آگے پیچھے کہیں بھی ہو سکتے تھے میں ان کو صرف پیدل جا کر ہی تلاش کر سکتا تھا ورنہ جیپ کے حرکت میں آتے ہی وہ جان جاتے کہ میں اپنی جگہ سے نکل گیا ہوں۔ سوچتے سوچتے نہ جانے کس وقت مجھے نیند آ گئی تھی۔ پھر ٹپ ٹپ کی آواز سے میری آنکھ کھلی۔ کچھ دیر تو سمجھ میں نہیں آیا پھر میں چونکا۔ بارش ہو رہی تھی اور اس کی موٹی بوندیں چھت پر گر کر آواز پیدا کر رہی تھیں میں نے جیپ کی ڈیجیٹل کلاک کی طرف دیکھا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ مہرو یقیناً گہری نیند میں تھی کیونکہ اس کے کمبل سے خراٹوں کی آواز آ رہی تھیں۔ روایتی معنوں میں انہیں سریلے خراٹے تو نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن کرخت مردانہ خراٹوں سے کہیں بہتر تھے۔ بعض دفعہ مجھے بیتو اور سفیر کے ساتھ سونا پڑتا تھا تو ان کے خوفناک خراٹے نیند حرام کر دیتے تھے۔ خود اپنے بارے میں مجھے بتایا گیا تھا میں بھی کم خوفناک خراٹے نہیں لیتا تھا۔ بارش کے ساتھ ہی سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا اور جیپ اندر سے بھی فریج بنی ہوئی تھی۔ لیکن کمبل کی وجہ سے یہ سردی ناقابلِ برداشت نہیں تھی۔ میں سوچنے لگا کہ صبح جیپ کیسے اسٹارٹ ہو گی اس کا انجن تو بالکل جامد پڑا ہو گا لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ شاید اس میں خصوصی اگنیشن سسٹم ہو گا جو بہت سردی میں بھی انجن کو اسٹارٹ کر دیتا ہے یہ خاص طور سے سرد جگہوں پر استعمال ہونے والی

WWW.PAKSOCIETY.COM

گاڑیوں میں لگایا جاتا ہے میں نے دعا کی کہ اس میں یہ سسٹم موجود ہو ورنہ صبح روانگی مشکل ہو جائے گا۔ دوبارہ آنکھ لگی تھی کہ کوئی چیز دھم سے جیپ کے بونٹ پر گری اور میں ہڑبڑا کر اُٹھا۔ باہر تاریکی تھی لیکن بونٹ پر بیٹھا ہیولا دکھائی دے رہا تھا۔ مہرو بھی اُٹھ گئی تھی اس نے بہت آہستہ سے پوچھا۔

"یہ کیا ہے؟"

"دشمن۔" میں نے کہا اور غیر محسوس انداز میں ٹارچ سامنے کرتے ہوئے اچانک روشن کی تو بونٹ پر بیٹھا بڑے سائز کا بندر چھلانگ لگا کر بھاگ نکلا۔ مہرو ہڑبڑائی تھی لیکن اس نے عام خواتین کی طرح چیخ مارنے سے گریز کیا۔ بندر اس کے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھا اس کے اپنے قبیلے میں اتنے ہی بندر ہوں گے جتنے کے آدمی ہوتے ہیں کیونکہ یہ خانہ بدوش بندر پالتے ہیں۔ ان کو کرتب سکھا کر مداریوں کو فروخت کرتے ہیں۔ اچانک دھم سے کوئی دوسرا بندر جیپ کی چھت پر کودا۔ اس کے وزن سے جیپ ہل کر رہ گئی تھی۔ شاید بندروں کو کھانے کی چیزوں کی بو آگئی تھی اور وہ اس چکر میں جیپ کے آس پاس آگئے تھے۔ میں نے شکر ادا کیا کہ یہ اس وقت نہیں آئے جب ہم باہر تھے۔ شاید اس وقت بندروں کا یہ قبیلہ کہیں دور تھا ورنہ ہمارا سکون سے ڈنر کرنا ناممکن ہو جاتا۔ میں نے ٹارچ سے اردگرد روشنی ڈالی تو مجھے درجنوں کی تعداد میں بندر دکھائی دیے تھے۔ اگرچہ ہمیں ان سے کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ جیپ کی ونڈ اسکرین اور کھڑکیوں کے شیشے بڑے مضبوط قسم کے تھے اور یہ انہیں آسانی سے نہیں توڑ سکتے تھے۔ مگر وہ دھما چوکڑی مچا کر اور بار بار جیپ پر کود کر ہمیں پریشان کر سکتے تھے۔ پھر ایسا ہی ہوا انہوں نے ریسٹ ہاؤس کی چھت اور آس پاس کے درختوں سے جیپ پر چھلانگیں لگانا شروع کر دیں۔ ایک بعد ایک وہ اس تواتر سے کود رہے تھے کہ جیپ میں بھونچال آگیا تھا اور شور بے پناہ تھا۔

"کچھ کرو۔" مہرو نے گھبرا کر کہا۔ "یہ اندر نہ گھس آئیں۔ ان کے دانتوں اور ناخنوں میں زہر ہوتا ہے آدمی کو کاٹ لیں یا ناخن ماریں تو وہ بیمار ہو جاتا ہے۔"

وہ بندروں کے بارے میں بہتر جانتی تھی۔ میں نے کہا۔ "فکر مت کرو یہ اندر نہیں آسکتے ہیں یہ شاید ڈرا کر ہمیں جیپ سے باہر نکالنا چاہتے ہیں۔"

"یہاں سے نکلو کہیں یہ گاڑی کو نقصان نہ پہنچا دیں۔"

میں بھی یہی سوچ رہا تھا کیونکہ جیپ جس بری طرح ہل رہی تھی اگر اس کی بیٹری سے ایک آدھ تار لوز ہو جاتا تو جیپ اسٹارٹ ہی نہ ہوتی۔ میں نے کمبل نیچے کیا اور سیدھے ہو کر اگنیشن گھمایا۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ ایک بار ہلکی گھر گھراہٹ کے بعد انجن اسٹارٹ ہو گیا تھا۔ انجن کی آواز اور ہیڈ لائٹس کے روشن ہوتے ہی بندروں نے آسمان سر پر اُٹھا لیا تھا۔ ان کی سمع خراش چیخیں اندر تک کانوں میں چبھ رہی تھیں۔ باہر تو ماحول ہی کچھ اور ہوگا۔ میں نے جیپ ریورس کی اور کہیں بلندی سے ایک سمر سالٹ کا مظاہرہ کرنے والا خاصے بڑے سائز کا بندر دھڑام سے کچی زمین پر گرا۔ ایک تو اس کا نشانہ خطا گیا تھا اور دوسرے زمین یقیناً جیپ کی چھت سے زیادہ سخت تھی۔ وہ تکلیف کے عالم میں اٹھا اور لڑھکتا ہوا ایک درخت کے پیچھے غائب ہو گیا۔ پیچھے موجود بندر بھی افراتفری میں جان بچانے کے لیے بھاگے اور ایک نے دور سے لکڑی کھینچ کر ماری جو ونڈ اسکرین پر لگی لیکن اسے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ بندروں کی دھما چوکڑی سے قطع نظر میں پورے دھیان سے جیپ کو اس تنگ راستے پر لا رہا تھا جو ہمیں نیچے سڑک تک لے جاتا۔ یہاں ریورس کرنے کی گنجائش بہت کم تھی بہ مشکل میں نے یہ کام کیا اور ہم پہاڑی سے اُترنے لگے۔

بندر اب بھی جیپ کے آس پاس شور مچا رہے تھے۔ ویسے میں حیران تھا کہ بندر اس سردی میں اتنی بلندی پر موجود تھے کیونکہ سردیوں میں یہ گروہوں کی صورت میں نیچے مارگلہ کے پہاڑوں کا رُخ کرتے ہیں جہاں سردی اتنی شدید نہیں ہوتی ہے اور ان کو کھانے کو کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔ جیپ میں لگے آلٹی میٹر کے مطابق ہم اس وقت چھ ہزار فٹ سے ذرا اوپر تھے۔ سڑک تک آتے آتے بندروں نے ہمارا پیچھا چھوڑ دیا تھا۔ جیپ روک کر میں نے گھڑی کی طرف دیکھا اور حیران ہوا صبح کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے جبکہ مجھے ایسا لگا تھا کہ بس میں نے ایک جھپکی لی تھی کہ بندروں کی ٹولی آن موجود ہوئی تھی۔ ابھی تاریکی تھی اور سورج نکلنے میں ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ کا وقت تھا۔ بارش رک گئی تھی لیکن سڑک پر پھسلن موجود تھی اس لیے میں نے روشنی ہونے تک یہیں رکنے کا فیصلہ کیا۔ شکر ہے دھند نہیں تھی ورنہ اس طرح سڑک پر رکنا خطرناک بھی ہو سکتا تھا۔ احتیاطاً میں جیپ کو ذرا آگے لے آیا تاکہ بندروں کو تسلی ہو جائے کہ ان کے علاقے میں گھس آنے والے فرار ہو گئے ہیں۔

ہماری نیند پوری ہو گئی تھی۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ رات کو کھایا کارن فلیکس کب کا ہضم ہو گیا تھا۔ اس موسم میں بھوک ویسے بھی زیادہ لگتی ہے۔ مہرو نے ڈٹ کر کھایا تھا لیکن اس نے بھی کچھ دیر بعد بھوک کی بات کی۔ میں نے

کہا۔ "روشنی ہو جائے پھر اسٹو و جلا کر کچھ کرتے ہیں۔" میں جسم سکیڑ کر پچھلی نشست پر آیا اور اندر کی روشنی آن کر کے سامان کا جائزہ لینے لگا۔ فتح خان نے پشت پر لادنے والے دو عدد بیگ بھی رکھے تھے۔ فی الحال یہ خالی تھے لیکن اتنے بڑے تھے کہ ہم جیپ میں موجود کھانے پینے اور ضرورت کا سارا سامان ان میں باندھ کر پیدل سفر کر سکتے تھے۔ میں نے پہلے سامان کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک بیگ میں نے اپنے لیے تیار کیا اس میں ساری بھاری چیزیں تھیں۔ دوسرا بیگ مہرو کے لیے بنایا اس میں ہلکی چیزیں تھیں۔ میرے بیگ کا وزن تقریباً تیس کلوگرام تھا جبکہ مہرو والے کا بیس کلوگرام سے زیادہ نہیں تھا۔ مہرو نے پوچھا۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟"

"سفر کی تیاری۔" میں نے اسے آگاہ کیا۔ "ایک جگہ پہنچ کر میں جیپ چھوڑ دوں گا اس سے آگے پیدل سفر کرنا ہے یہ سارا سامان اسی سفر کے لیے ہے۔"

"تب تم اسے استعمال مت کرو۔" اس نے مشورہ دیا۔ "کھانے کا سامان ہم راستے سے لے سکتے ہیں۔ یہاں دکان نہ ہو تو کسی گھر سے لے سکتے ہیں۔"

وہ درست کہہ رہی تھی۔ یہ سامان صرف سفر کے لیے تھا اور ہمیں کھانا پینا مقامی لوگوں سے مل سکتا تھا۔ میرے پاس رقم تھی اور اس سے ہم کچھ بھی خرید سکتے تھے۔ میں نے اس سے اتفاق کیا اور ساتھ ہی نوٹ کیا کہ اس نے اپنا ذکر بھی کیا تھا جیسے اس سفر میں وہ بھی میرے ساتھ ہوگی۔ میں نے اس کی بات نظر انداز کر دی۔ سامان پیک کرتے ہوئے ساڑھے چھ بج گئے تھے۔ بارش کے بعد آسمان صاف ہو گیا تھا اور صبح کی سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ اس لیے میں نے روانہ ہونے کا فیصلہ کیا اگرچہ نیچے سڑک ابھی تک تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ہم پونے سات بجے روانہ ہوئے اور سات بجے تک روشنی تیز ہو گئی تھی۔ اوپری چوٹیوں پر دھوپ جھلکنے لگی تھی۔ کچھ دیر بعد مہرو نے دور سے اُٹھنے والے دھوئیں کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ دیکھو وہاں کچھ ہے۔"

"ممکن ہے لیکن یہ کوئی چشمہ بھی ہو سکتا ہے جس کے گرم پانی سے بھاپ اُٹھ رہی ہو؟"

"یہ بھاپ نہیں آگ کا دھواں ہے۔" اس نے یقین سے کہا۔ اس کا یقین درست ثابت ہوا جب ہم دس منٹ بعد سڑک کے کنارے بنے ایک کچے ہوٹل تک پہنچے۔ اس کی ٹین کی چھت پر لگے چمنی کے پائپ سے دھواں اُٹھ رہا تھا اور اندر سے چائے اور شاید پراٹھوں کی خوشبو آرہی تھی۔ میں نے

کیا آپ
لبوب مقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟
کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوّی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوّی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مقوّی اعصاب ٹیلیفون کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک
المسلم دار الحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی یونانی دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لبوب مقوّی اعصاب ہم پہنچائیں گے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہارن دیا تو صرف شلوار قمیص میں ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا باہر آیا۔ میں جیپ سے اُتر آیا اور باہر آنے پر مجھے پتا چلا کہ اصل سردی تو باہر تھی۔ جیپ اندر سے خاصی گرم تھی۔ میں لرز گیا تھا لیکن لڑکا سکون سے کھڑا تھا اس نے اسفنج کی چپل پہن رکھی تھی۔ وہ جیپ اور میرے حلیے سے سمجھ گیا تھا کہ میں شہر سے آیا ہوں اس نے اردو میں کہا۔

”جی صاحب؟“

”ناشتا ملے گا؟“

”کیوں نہیں صاحب بالکل ملے گا۔“ اس نے خوش ہو کر کہا۔ اتنی صبح گاہک آجانا خوشی کی بات تھی جبکہ اندر ابھی ناشتے کی تیاری کا آغاز ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔

”کیا ملے گا؟“

”پراٹھا، انڈا، دہی اور چائے۔“ اس نے فرفر مینو بتا دیا۔

”سب لے آؤ۔ لیکن ناشتا جیپ میں کریں گے۔“ میں نے اسے ایک پانچ سو کا نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ ”برتن صاف ستھرے ہوں اور دو الگ الگ ٹرے میں لانا، چائے بعد میں لانا سمجھ گئے؟“

”جی صاحب۔“ وہ مزید خوش ہو گیا کیونکہ میں نے اسے پہلے ہی ناشتے کی قیمت سے زیادہ رقم دے دی تھی۔ وہ اندر دوڑ گیا اس نے مہرو کو دیکھ لیا تھا اس لیے تعجب نہیں کیا کہ میں جیپ میں ہی ناشتا کرنا چاہتا تھا۔ ذرا دیر کے لیے دوبار جیپ کا دروازہ کھلا تھا تو اندر بھی موسم یخ ہو گیا تھا۔ میں نے جلدی سے کچھ دیر کے لیے انجن اسٹارٹ کر کے ہیٹر چلایا تو جان میں جان آئی تھی۔ اتنی دیر میں مہرو نے کمبل تہ کر کے رکھ دیے تھے۔ ہمارے پاس گفتگو کے لیے کوئی موضوع نہیں تھا اس لیے خاموشی سے ناشتے کا انتظار کرتے رہے۔ ناشتا پندرہ منٹ بعد آیا تھا۔ لڑکا دو ڈھکی اسٹیل کی چھوٹی ٹریز میں پراٹھے اور تلے ہوئے دیسی انڈے لایا تھا۔ انڈے اور پراٹھے دونوں دیسی گھی میں تلے گئے تھے۔ دو عدد پراٹھے فی کس خاصے بھاری تھے لیکن جب ہم نے کھانا شروع کیا تو پتا ہی نہیں چلا کہ کب ختم ہو گئے۔ میں تو بھوکا تھا ہی مہرو نے بھی پورا انصاف کیا۔ ناشتے نے پیٹ تو بھر دیا تھا لیکن نیت نہیں بھری تھی۔ بہرحال اتنا بھی کافی تھا۔ لڑکا بالکل درست وقت پر دو عدد بڑے سائز کے فولادی مگوں میں چائے لے آیا۔ چائے میں اگرچہ ہر چیز بہت تھی۔ یعنی بہت دودھ، بہت پتی اور بہت چینی لیکن اس نے اس موسم میں بھرپور مزہ دیا تھا۔ لڑکا ٹرے واپس لے گیا تھا۔ جب وہ مگ لینے آیا تو میں نے اسے تھرماس دیا۔

”اس میں تازہ چائے بنوا کر لے آؤ لیکن اس میں دودھ کم ہو اور چینی بالکل نہ ہو سمجھ گئے۔“

”سمجھ گیا صاحب۔“ اس نے کہا اور پھر دبے لفظوں میں بولا۔ ”صاحب اگر ٹپ دینا ہو تو الگ سے دینا۔“

دوسرے لفظوں میں وہ بتا رہا تھا کہ اگر میں نے رقم چھوڑی تو ہوٹل کا مالک اسے نہیں دے گا۔ میں نے ایک سو کا نوٹ اس کی جیب میں رکھا اور کہا۔ ”مالک سے بولو آکر حساب کر دے۔“

لڑکا خوشی خوشی واپس چلا گیا۔ مہرو کو غالباً میری فیاضی اچھی نہیں لگی تھی کیونکہ وہ منہ بنا کر دیکھ رہی تھی ظاہر ہے وہ جس معاشرے کی پروردہ تھی وہاں کسی کو بلاوجہ کچھ دینے کا رواج نہیں تھا، وہ لوگ تو صرف لینے کے قائل تھے۔ کچھ دیر بعد ہوٹل کا مالک مہرو سے بھی زیادہ بُرا منہ بنا کر باہر آیا۔ اس نے دو سو اور کچھ رقم میرے حوالے کی۔ اگرچہ اس نے ناشتے کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کر لی تھی لیکن اب ٹپ کا امیدوار بھی تھا میں نے اسے بھی مایوس نہیں کیا اور دو سو کے علاوہ جو اوپر تھا وہ اسے دے دیا اگرچہ یہ اس کے لیے کم تھا کیونکہ اس کا منہ تھوڑا سا ہی بہتر ہوا تھا وہ شاید تمام رقم کے چکر میں تھا۔ کچھ دیر بعد لڑکا تھرماس لے کر آیا تو میں نے باقی دو سو بھی اسے تھما دیے۔ لڑکے کی خوشی دیکھنے والی تھی اور مہرو کا منہ مزید بن گیا تھا۔ جیسے ہی میں نے جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی تو اس نے کہا۔

”اتنی رقم دینے کی کیا ضرورت تھی۔ پانچ دس روپے دے دیتے بس۔“

”اوہ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا میں پانچ دس دے دیتا۔“ میں نے افسوس سے کہا۔ ”بلکہ تم پہلے مل جاتیں تو میری بہت ساری رقم بچ جاتی کیونکہ میں عام طور سے اتنی ہی رقم دیتا ہوں۔“

وہ سمجھ گئی کہ میں مذاق اُڑا رہا ہوں اس لیے کھسیا کر چپ ہو گئی۔ ناشتا کرنے کے بعد مجھ میں اتنی توانائی آ گئی تھی کہ میں رات تک کھائے پیے بغیر گزارا کر سکتا تھا۔ اس دوران میں سڑک والا حصہ بھی روشنی میں آ گیا تھا۔ میں اچھے موسم کا فائدہ اُٹھا کر تیز ڈرائیونگ کرنے لگا۔ بعض اوقات جیپ کی رفتار اتنی تیز ہو جاتی تھی کہ وہ اس سڑک پر خطرہ محسوس ہوتی تھی۔ ایسے میں مہرو خوف زدہ ہو جاتی تھی۔ مگر اس نے زبان سے خوف کا اظہار نہیں کیا صرف اس کے تاثرات سے پتا چلتا تھا کہ وہ خوف زدہ ہے۔ کیونکہ اس بار سفر کا آغاز بالکل صبح سویرے کر دیا تھا اس لیے بارہ بجے تک ہم سوات کے قریب پہنچ گئے تھے۔ خوش قسمتی سے اب تک نہ تو کسی لینڈ سلائیڈنگ سے واسطہ پڑا تھا جو اس موسم میں اور اس علاقے میں عام سی بات تھی اور نہ کہیں برف باری یا بارش سے سامنا ہوا تھا۔ کہیں کہیں بادل ضرور تھے لیکن اس دن سفر کا بڑا حصہ روشنی اور چمکتی دھوپ میں طے ہوا تھا۔ بارہ بجے میں نے ایک جگہ جیپ روک لی۔ یہاں چھوٹا آبشار بہہ رہا تھا۔ ہم نے اس کا صاف پانی بوتلوں میں بھرا۔ کچھ ضروریات سے فارغ ہوئے اور چائے پی کر تازہ دم ہو کر آگے روانہ ہو گئے۔

تین بجے ہم سوات شہر میں داخل ہوئے۔ حالات اور سردی نے یہاں کی رونقوں کو مرجھا دیا تھا۔ تقریباً تمام ہی ہوٹل بند تھے۔ صرف ایک ہوٹل کھلا ہوا ملا اور اس میں بھی کچن بند تھا۔ بڑی مشکل سے اس کا منیجر ہمارے کھانے کا انتظام کرنے پر تیار ہوا۔ اسے حیرت ہوئی کہ ہم ہوٹل کے بہترین ڈائننگ ہال کے بجائے کھانا جیپ میں کھانا چاہتے تھے۔ خوش قسمتی سے ایک مرغا دستیاب تھا جس کا وہ ہماری خاطر چرغا بنانے کو تیار ہو گیا۔ لیکن اس میں ایک گھنٹا لگ جاتا۔ بہرحال یہ ہمارا آخری آسرا تھا کیونکہ اس کے بعد ہمیں مزید بلندی اور آبادیوں سے پرے جانا تھا اس لیے ہم انتظار کرنے پر مجبور تھے۔ ساتھ ہی میں نے منیجر سے کہا کہ وہ ہمیں تین بڑے روغنی نان تیار کر دے۔ یہ نان اس موسم میں دو تین ہفتے آرام سے محفوظ رہ سکتے تھے اور پیدل سفر میں بہترین خوراک ثابت ہوتے۔ میں نے مہرو سے کہا۔ ”اگر تم واپس جانا چاہو تو یہاں سے موقع ہے بسیں چل رہی ہیں جو پندرہ گھنٹے میں تمہیں واپس اسلام آباد پہنچا دیں گی۔“

اس نے انکار کر دیا۔ ”نہیں میں تمہارے ساتھ واپس جاؤں گی مجھے ڈر ہے میرے قبیلے والے مجھے تلاش کر لیں گے اور فوراً مار ڈالیں گے۔ تمہارے ساتھ میں محفوظ رہوں گی۔ تم مجھے وہاں بھیج دینا جس کا تم نے کہا تھا، کیا نام تھا؟“

”شاید یہ تمہاری خوش فہمی ہے، لیکن خیر جیسے تمہاری مرضی۔“ میں نے کہا۔ ”اگر ہم واپس آ گئے تو میں تمہیں دارالامان پہنچا دوں گا۔“

چار بجے ہم نے کھانا کھایا اور اس کے فوری بعد روانہ ہو گئے۔ میرے اندازے کے مطابق ابھی دو گھنٹے کا سفر باقی تھا اور میں بہرصورت آج اس جگہ پہنچ جانا چاہتا تھا جہاں سے ہم آگے پیدل سفر کرتے۔ فتح خان نے نقشے میں اس مقام کی وضاحت کی تھی۔ ظاہر ہے یہ ان مقامات سے بالکل ہٹ کر تھا جو راجا عمر دراز کے محل یا اس جگہ سے آتے تھے جہاں سے

ماہ شعبان میں شب برات ہوتی ہے۔ اس رات میں عام طور پر اپنے مرحوم بزرگوں اور رشتہ داروں کی فاتحہ ہوتی ہے۔ ایک زمانہ دراز تک اس رات آتش بازی ہوتی تھی۔ قطب شاہی دور میں اس رات کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ سلطان نے کئی نظمیں اس کے متعلق لکھیں۔ قطب شاہ کو روشنی، پانی اور چمن سے بڑی دلچسپی تھی۔ شب برات میں خوب روشنی کی جاتی اور آتش بازی ہوتی تھی اور فاتحہ دلائی جاتی تھی، شادیوں کا سلسلہ شعبان میں بند ہو جاتا تھا۔ اس رات کی برکت اور تقدیس کے متعلق بیسیوں روایتیں ملتی ہیں جس میں اس امر کا تذکرہ ہے کہ یہ رات حاجتوں کے برآنے اور دعاؤں کے قبول ہونے کی رات ہے اور اس رات بے شمار برکات نازل ہوتی ہیں۔ عام طور پر اس رات کو آتش بازی چھوڑی جاتی ہے اور یہ طریقہ نہ صرف جنوبی ہند بلکہ شمالی ہند میں بھی رائج ہے۔ اگر آتش بازی کی ابتدا کے متعلق غور کریں اور تحقیقات کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ طریقہ کسی دوسرے اسلامی ممالک یعنی حجاز، عرب، شام، مصر، ایران، عراق وغیرہ میں نہیں ہے۔ یہ صرف ہندوستان سے متعلق ہے۔ ہندوستان کی قدیم تاریخوں اور سیاحوں کے سفرناموں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے مغلیہ عہد تک یہاں آتش بازی کا رواج نہیں تھا چنانچہ سفرنامہ ابن بطوطہ یا ابن جبیر کے سفرنامہ میں جہاں دوسری باتوں کا تذکرہ ہے وہاں شب برات میں آتش بازی کا ذکر نہیں ملتا۔ خصوصاً ابن بطوطہ جو محمد تغلق کے زمانے میں کئی سال تک ہندوستان میں مقیم رہا اور ایک خدمت پر بھی مامور تھا، آتش بازی کا کوئی ذکر نہیں کرتا حالانکہ اس نے ہر بات تفصیل سے لکھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اکبری عہد میں جبکہ اکثر باتیں ہندوؤں سے سماجی طریقوں کی یک جہتی کے لیے قبول کی جا رہی تھیں اور دونوں کو ایک ساتھ اتحاد و اتفاق کے طریقے سمجھائے جا رہے تھے تو غالباً دیوالی کی مناسبت سے شب برات میں آتش بازی کا طریقہ رائج کیا گیا۔

اقتباس: دکنی کلچر از محمد نصیر الدین ہاشمی

انتخاب: نبیلہ اظہر، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں بھٹکتے بھٹکاتے ہوئے ایمن شا کے ساتھ وادی سے نکلا تھا یہ وادی تک جانے کا سب سے مختصر راستہ تھا۔ سوات کے بعد جیپ پھر بلندیوں کی طرف جارہی تھی اور چاروں طرف برف ہی برف دکھائی دے رہی تھی۔ بلندی کے ساتھ ساتھ سردی بھی بڑھ رہی تھی۔ سوات سے نکلتے ہوئے میں نے ایک بار پھر ٹنکی فل کرائی تھی اور ساتھ میں ایک کین جسے راستے میں ٹنکی میں ڈالا تھا وہ بھی بھروالیا تھا۔

''ہم کہاں جارہے ہیں؟''

''شمال کی طرف۔'' میں نے جواب دیا۔

''وہ تو میں بھی جانتی ہوں لیکن شمال میں کہاں جارہے ہیں؟'' وہ کسی قدر جھنجلا گئی۔

''کیا تم نے یہ علاقہ پہلے کبھی دیکھا ہے؟'' میں برف سے اَٹی سڑک پر احتیاط سے ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔ میں کنارے سے دور رہنے کی کوشش کررہا تھا کیونکہ برف کی وجہ سے سڑک پر اتنی پھسلن تھی کہ بریک لگانے پر بھی جیپ کئی فٹ تک پھسلتی تھی۔

''نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''تب تمہارا جاننا بیکار ہے کہ میں تمہیں کہاں لے جا رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے تمہیں پہلے ہی خبردار کردیا تھا کہ یہ جوکھم کا سفر ہے لیکن تم خود اصرار کرکے آئی ہو اس لیے مہربانی کرکے کوئی شکایت مت کرنا۔''

''میں شکایت نہیں کررہی میں تو پوچھ رہی ہوں ہم کہاں جارہے ہیں؟'' اس نے اس بار بدلے ہوئے انداز میں کہا۔

''زیادہ دور نہیں جانا ہے کل صبح ہم پیدل سفر شروع کریں گے اور رات سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔'' میں نے کسی قدر بے زاری سے کہا۔ ''اب سوال مت کرو تم ساتھ ہو خود دیکھ لوگی۔''

وہ چپ ہوگئی۔ شہر سے نکل کر ویرانوں میں سفر کرتے ہوئے میں مسلسل عقب پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ لیکن ابھی تک مجھے تعاقب کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ مگر یہ بات یقینی تھی کہ فتح خان یا اس کے ساتھی ہمارے پیچھے ہیں۔ اس وقت ہم ایک درّے نما جگہ سے گزر رہے تھے سڑک کے دونوں طرف اونچی برف پوش چوٹیاں تھیں۔ درّے کی بلندی پر پہنچ کر جیسے ہی ہم دوسری طرف اُترے میں نے جیپ روک دی۔ مہرو نے میری طرف دیکھا۔ ''جیپ کیوں روکی ہے؟''

''کچھ نہیں تم اندر رکو۔'' میں نے اس سے کہا اور اپنی جیکٹ کے کالر کھڑے کرتے ہوئے جیپ سے اُتر آیا۔ جیپ کے اندر ہیٹر آن تھا اس لیے اندر درجہ حرارت خوشگوار تھا۔ جبکہ باہر اس غضب کی سردی تھی۔ سامان میں چرمی دستانے بھی تھے۔ وہ اس وقت کام آئے۔ ورنہ ہاتھ ٹھٹھر جاتے۔ جیکٹ بہت اعلیٰ درجے کی تھی۔ اس کے کالر میں ہلکا پلاسٹک استعمال ہوا تھا اس لیے کالر بہ آسانی کھڑے ہوجاتے تھے اور جب تک انہیں نیچے نہیں کیا جاتا یہ ازخود نیچے نہیں آتے تھے۔ اس کی وجہ سے گردن اور کان سردی سے بچے ہوئے تھے۔ درّہ کم سے کم ایک کلومیٹر طویل تھا اور سڑک دور تک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ اگر فتح خان کے آدمی میرے تعاقب میں تھے تو وہ کتنا پیچھے تھے؟ اگرچہ اس کا امکان تھا کہ جیپ رکتے ہی ان کو پتا چل گیا ہوگا اور وہ خود بھی رک گئے ہوں گے۔ میں سوچ رہا تھا کہ پیدل واپس جاکر ان کا سراغ لگاؤں۔ ابھی میں فیصلہ نہیں کرپایا تھا کہ مہرو بھی اُتر کر میرے پاس آگئی۔ باہر کی سردی نے اسے کانپنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے لرزتی آواز میں کہا۔ ''تم اتنی سردی میں باہر کیوں کھڑے ہو؟''

''تم اندر بیٹھو۔'' میں نے اس کا سوال نظرانداز کرکے کہا۔ لیکن وہ بدستور وہیں کھڑی رہی۔ مجھے کھڑے دس منٹ ہوگئے تھے لیکن سڑک کے دوسرے سرے پر ابھی تک کوئی گاڑی نمودار نہیں ہوئی تھی۔ فتح خان یا اس کے آدمی جان گئے تھے کہ میں رک گیا ہوں اور کیا وہ بھی رک کر انتظار کررہے تھے کہ میں آگے بڑھوں تو وہ بھی میرا تعاقب شروع کریں۔ میں سچ مچ ان کا قیدی بن کر رہ گیا تھا۔ مہرو میرے پیچھے کھڑی تھی۔ اچانک اس نے کہا۔

''یہ تمہارے کوٹ پر کیا لگا ہے؟'' اس کا اشارہ جیکٹ کے کھڑے کالر کی طرف تھا۔

''کیا لگا ہے؟'' میں نے پیچھے ہاتھ مارا تو میرا ہاتھ کالر کے کپڑے سے چپکی ایک چکنی چیز پر گیا۔ یہ شاید ایک انچ لمبی تھی۔ میں نے اسے اُتارنا چاہا تو وہ بہت مضبوطی سے چپکی ہوئی تھی۔ اسے اُکھاڑنے کی کوشش میں کپڑا بھی اُتر جاتا۔ جیکٹ اُتارے بغیر میں اسے نہیں دیکھ سکتا تھا اور اس سردی میں جیکٹ اُتارنے کے خیال سے روح فنا ہورہی تھی۔ مگر اس چیز کو دیکھنا تو تھا میں نے دل کڑا کرکے جیکٹ کی زپ کھولی اور اسے اُتار دیا۔ کالر پر چپکی چیز سامنے آگئی۔ یہ ایک چھوٹا سی چپ نما چیز تھی۔ اسی لمحے درّے کے آغاز سے ایک بڑی گاڑی نمودار ہوئی اور تیزی سے ہماری طرف آنے لگی تھی۔

جاری ہے

بیت بازی

قارئین

(محمد سعید قاسمی، ڈلوال کا جواب)

خالد فاروق..........منڈی بہاؤالدین

یاد ایسا زخم ہے جو کہ کبھی بھرتا نہیں
کون کہتا ہے کہ بھر جائے تو مرجاتی ہے یاد

تابش فہمی..........تلہ گنگ

یہ شہر سجدہ گزاراں، دیار کم نظراں
یتیم خانۂ ادراک کے سوا کیا ہے

(محمد یاسین طفیل، دوکھری کا جواب)

محمد افتخار..........ساہیوال

بسیرا کانچ نگر میں کیا ہے یوں میں نے
کہ پتھروں سے مجھے اب کوئی گلہ ہی نہیں

(فریحہ ادریس، لاہور کا جواب)

فصاحت اللہ..........اوسلو، ناروے

ہوا کا سامنا کرنا پڑے گا
دیے کو حوصلہ کرنا پڑے گا

اعجاز علی..........گوجرہ

ہم جیسے لوگ تو تجویز بھی نہیں سنتے
تمہارے حکم کی تعمیل ہو تو کیسے ہو

(فرح اشرف، اوچ شریف کا جواب)

نورین مصطفیٰ..........اوچ شریف

یاد کا دیپ جلا ہے تو یہ لگتا ہے خلیل
میرے پہلو میں کئی شمس و قمر بیٹھے ہیں

(فصیحہ ارشاد، سرگودھا کا جواب)

بشریٰ بانو ناگوری..........کراچی

رات ہرچند کہ سازش کی طرح گزری ہے
صبح ہونے کا مگر دل میں یقیں رکھنا ہے

زرینہ جونیجو..........لاڑکانہ

روز بناتا ہوں پُل دریا پار نہیں کرتا
میں رستے اپنی خاطر ہموار نہیں کرتا

(اختر حسین، ملتان کا جواب)

تنویر رفیق..........لانڈھی کراچی

یہ الگ بات کہ تقدیر لپٹ کر روئی
ہم نے تو تمہیں دیکھ کے پھیلائے تھے بازو

(دردانہ کوثر، جہلم کا جواب)

عبدالقیوم اسد..........رحیم یار خان

یہ تیرا شہر بھی ہے شہر زلیخا جاناں
وہ پیغمبر ہے جو دامن بچالے جائے

(عرفان بشیر، ساہیوال کا جواب)

فرحت حسن..........چنیوٹ

اِک اذیت سے پرندوں کو بچایا جائے
اب کوئی پیڑ نہ جنگل میں گرایا جائے

نوازش حسن خان..........گجرات

اذانوں کی رسمیں ادا ہورہی ہے
مگر ان میں جوش بلالی نہیں ہے

تبسم فاطمہ..........جہلم

اب تو اس دنیا سے جی جان سے لڑسکتی ہوں
اب میرے ساتھ مرا حلقۂ احباب بھی ہے

(فائزہ حیات، لاہور کا جواب)

ملک ثاقب شاز تولی..........ایبٹ آباد

محسن مجھے اس شخص سے عقیدت ہے ورنہ
پتھر کے صنم پیار کے قابل نہیں ہوتے

اطہر حسن..........حسن ابدال

مرا نقصان بھی ممکن ہے لیکن
مجھے اب فیصلہ کرنا پڑے گا

اطہر حسن..........لاہور

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں میں نے

ناہید فراز..........راولپنڈی

محبت زرد موسم سے لپٹ کر جب بھی روتی ہے
تو بالوں میں گلابوں کو سجاکر دیکھ لیتے ہیں

(راجا ثاقب نواز ثاقب، ساہیوال کا جواب)

انس احمد..........لاہور

یارب ہماری ماں کو سلامت رکھنا
ورنہ درازی عمر کی دعا کون کرے گا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

سلطان فریدالدین.......قطر، یواے ای
یوں ٹوٹ کے بکھرے ہیں میرے خواب فضا میں
بکھری ہوئی اس ذات کا ذرہ نہیں ملتا
نوازش علی زیدی.......چکوال
یہ اور بات کہ تقدیر سو گئی قابل
وگرنہ دیدۂ بیدار ہم بھی رکھتے ہیں
فرید غنی.......جہلم
یوں ہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آتا ہے
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انساں جاناں
(ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی، برہ زئی کا جواب)

فراز احمد.......باہوکھوسہ
یہ سخن جو ہم نے رقم کیے یہ ہیں سب ورق تیری یاد کے
کوئی لمحہ صبح وصال کا کوئی شامِ ہجر کی مدتیں
محمد فیصل اقتیار.......کوئٹہ
یہ سوچ کے پلکوں میں چھپالیتا ہوں آنسو
گر کر یہ میری آنکھوں سے بے گھر نہ ہو جائیں
نصرت جاوید.......لاہور

لازمی نہیں ہم کو یاد کرو فراز
مگر بھول جاؤ اس کی بھی اجازت نہیں تمہیں
(اختر جوکھیو، ٹنڈوآدم کا جواب)
مرزا فرحال بیگ.......حیدرآباد
دل تو کیا چیز ہے ہم روح میں اُتر جاتے
تم نے چاہا ہی نہیں چاہنے والوں کی طرح

(شکیل گوندل، لاہور کا جواب)
سعید احمد چاند.......کراچی
یہی بہت ہے کہ دل اس کو ڈھونڈ لایا ہے
کسی کے ساتھ سہی وہ نظر تو آیا ہے
(نصرت شاہین، سرگودھا کا جواب)
خضر عباس بخاری.......شجاع آباد
اب ملاقات میں وہ گرمی جذبات کہاں
اب تو رکھنے وہ محبت کا بھرم آتے ہیں
(نوشین ملک، ناروے کا جواب)
طہٰ یاسین.......حیدرآباد
وہ ایک خواب جسے سب نے مل کے دیکھا تھا
اب اپنے اپنے قبیلوں میں بٹ کے دیکھتے ہیں

(محمد یاسین طفیل، دواکھری کا جواب)
راجا ثاقب نواز ثاقب.......ساہیوال
بہت سلیقے سے اپنی نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا
نوشین ناز.......حاصل پور
بس اجازت ہے سانس لینے کی
زیست کرنے کی کب اجازت ہے
(حکیم سید محمد رضا شاہ، نورنگہ میانوالی کا جواب)
فرحت اللہ لغاری.......ڈی جی خان
یقین رکھتی نہیں ہوں میں کسی کے تعلق پر
جو دھاگا ٹوٹنے والا ہو اس کو توڑ دیتی ہوں
سہیل اشرف.......بہاولپور

یادوں کی میز پر کوئی تصویر چھوڑ دو
کب سے ہمارے ذہن کا کمرا اداس ہے
ارباب شاہ.......جہلم
یہ معجزہ بھی محبت کبھی دکھائے مجھے
کہ سنگ تجھ پہ گرے اور زخم آئے مجھے

(عقیل الرحمٰن، کھاٹاں کا جواب)
انیتا صنم.......کراچی
نہ جانے کون سا آنسو کسی سے کیا کہہ دے
ہم اس خیال سے نظریں جھکائے بیٹھے ہیں
عقیلہ فہیم.......کراچی
نہیں موت آتی مگر زندگی کا
جو زہر اب غم ہے پیے جارہی ہوں

(فہیم الدین، کراچی کا جواب)
عقیل الرحمٰن
کھاٹاں
محسوس ہورہا ہے یہ پھولوں کو دیکھ کر
گھبرا کے سو گئے ہیں شراروں کے قافلے
☆☆☆

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہورہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظرانداز کررہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کردیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدِنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

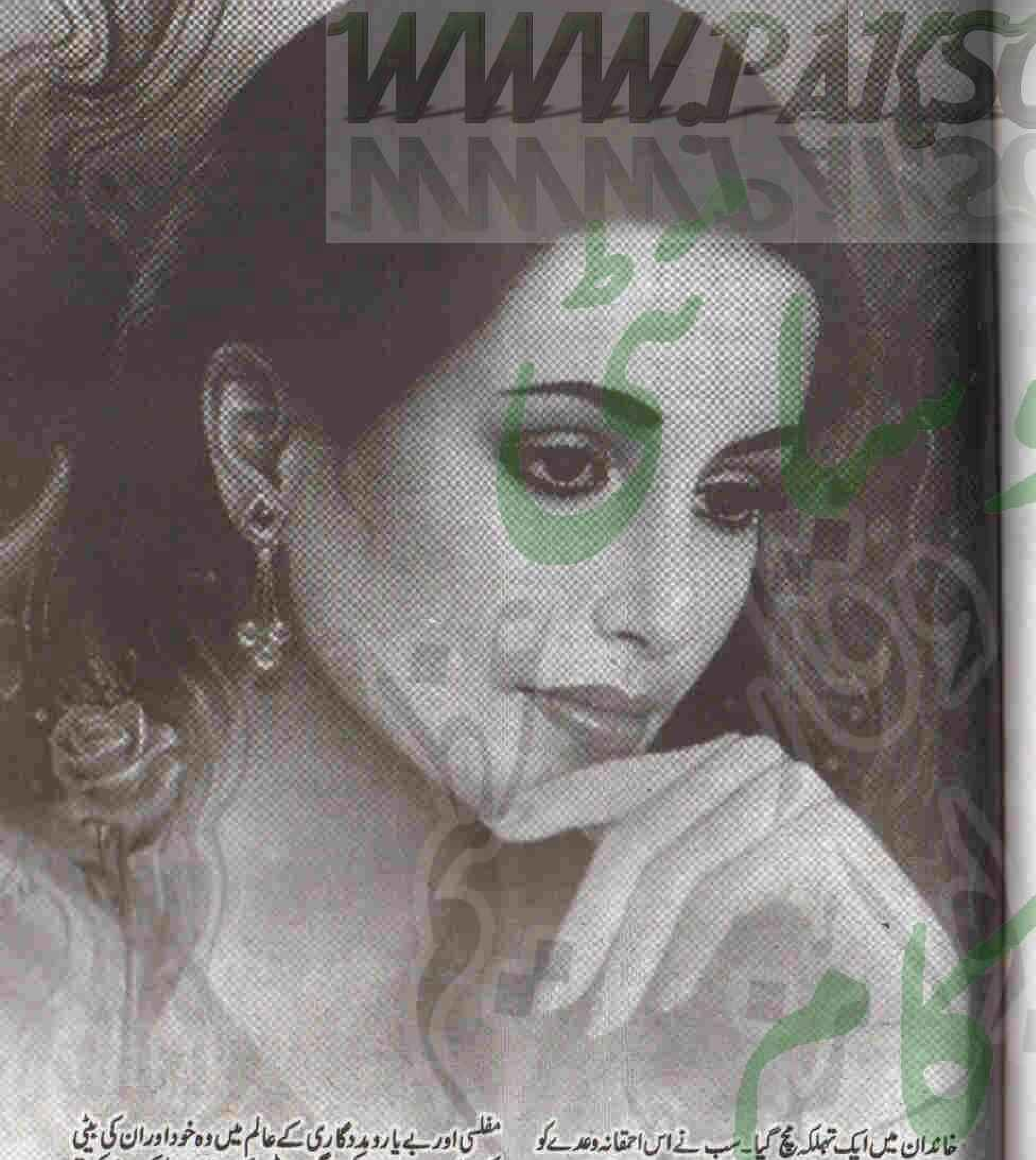

رقص زندگی

محترمہ عذرا رسول صاحبہ!
السلام علیکم!

میں شروع دن سے سرگزشت کی شیدائی ہوں۔ سچی بیانیاں پڑھتے ہوئے اکثر میں سوچا کرتی ہوں کہ میری آپ بیتی بھی تو کم دلچسپ نہیں۔ اسے اگر صحیح طور پر لکھا جائے تو قارئین کو بھی پسند آئے گی۔ اسی خیال سے میں نے اپنے مصائب کی مکمل روداد لفظ بہ لفظ لکھ دی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اسے دوبارہ کسی اچھے رائٹر سے لکھوالیں، صرف اتنی التجا ہے کہ میرا اور میرے شہر کا نام بدل دیں۔

فقط عارفہ
(واہ کینٹ)

میرا نام عارفہ ہے۔ میں نے ایک متوسط طبقے کے خاندان میں آنکھیں کھولیں۔ میرے والد کا نام کیپٹن اشفاق احمد تھا اور والدہ کا نام حمیدہ بیگم۔ سننے میں آیا کہ میرے امی ابو کی شادی بھی عجیب و غریب حالات کے تحت ہوئی تھی۔ میرے ابو 44ء میں برما کے محاذ پر شریک جنگ تھے۔ ان دنوں وہ سپاہی تھے۔ ان کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر سپاہی عظیم اللہ تھے۔ وہ لڑائی میں بُری طرح زخمی ہوگئے، بچنے کی کوئی امید نہیں تھی مگر ایک نڈر سپاہی ہونے کے باوجود وہ موت کے خیال سے بڑے مضطرب اور پریشان تھے۔ میرے ابو نے اس پریشانی کی وجہ پوچھی تب انہوں نے بہت اصرار کے بعد بتایا کہ وطن میں ان کی ایک بیٹی کنواری بیٹھی ہے اور خاندان میں کوئی ایسا فرد نہیں جو ان کی موت کے بعد اس کے فرض سے سبکدوش ہونے کو اپنی ذمے داری سمجھے۔ میں اس خیال سے پریشان ہوں۔ دل پر ایک ناقابلِ برداشت بوجھ سا رکھا ہے کہ میرے بعد میری بیٹی کا کیا ہوگا؟

تب خدا جانے ابو کو کیا خیال آیا کہ انہوں نے بلا تامل جواب دیا کہ اگر آپ مجھے اس قابل سمجھیں اور اگر زندگی نے مجھے اتنی مہلت دی تو میں آپ کی بیٹی سے شادی کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔ عظیم اللہ یہ سن کر خوشی سے رونے لگے، انہوں نے میرے ابو کو گلے سے لگا لیا۔ اس وقت ایک خط اپنی بیوی کے نام لکھوایا کہ میں عظیم اللہ وصیت کرتا ہوں کہ میری بیٹی حمیدہ بیگم کی شادی اشفاق احمد سے (خدا اسے صحیح سلامت وطن واپس پہنچائے) کردی جائے۔ اس وصیت پر دستخط کرکے دو گھنٹے کے اندر عظیم انتقال کر گئے مگر مرتے وقت وہ بالکل پُرسکون اور مطمئن تھے۔

جنگ ختم ہوئی۔ ابو اپنے وطن واپس لوٹے۔ ان کے والدین اور خاندان والوں نے بڑی خوشیاں منائیں۔ ان کی والدہ بیٹے کے لیے اچھی سے اچھی لڑکی تلاش کرنے لگیں مگر جب ابو کو ان کے ارادے کا علم ہوا تو انہوں نے تمام واقعہ بیان کیا اور کہا کہ اب وہ اپنے وعدے کے پابند ہیں، عظیم اللہ کے گھر کا پتا ان کے پاس ہے (وہ دوسرے شہر میں رہتے تھے) اور وہاں جائیں گے، ان کی بیگم سے بات کریں گے پھر اگر ان کی بیگم نے شوہر کی وصیت کا احترام کیا تو وہ حمیدہ سے شادی کرلیں گے اور اگر انہوں نے اس وصیت سے انکار کیا تب وہ واپس آجائیں گے اور پھر جہاں ان کی والدہ کہیں گی، بے چوں و چرا وہاں شادی کے لیے آمادہ ہوجائیں گے۔ اس بات پر پورے خاندان میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ سب نے اس احمقانہ وعدے کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا اور ابو کو ہر طرح مجبور کیا گیا کہ وہ یہ بچکانا ضد چھوڑ دیں۔ خدا جانے عظیم اللہ کی لڑکی اندھی ہو، لولی لنگڑی ہو، بدصورت ہو، کالی ہو، ان پڑھ ہو تو کیا وہ پھر بھی اس سے شادی کرلیں گے؟ ابو نے کہا، اب تو وہ جیسی بھی ہو میں شادی کا وعدہ کرچکا ہوں۔

اور سارے خاندان کی مخالفت کے باوجود چند روز بعد ہی ابو میرے نانا کے شہر گئے، وہاں ان کا گھر تلاش کیا۔ نانا کے مرنے کی خبر بہت پہلے وہاں پہنچ چکی تھی اور میری نانی جن کا خدا کے سوا کوئی سہارا نہیں تھا۔ حیران و پریشان تھیں کہ اس مفلسی اور بے یار و مددگاری کے عالم میں وہ خود اور ان کی بیٹی کس طرح زندہ رہ سکیں گی۔ بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے کی تو کوئی امید بھی انہیں نہ تھی، اس وقت تو زندگی کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ میرے ابو نے دروازے پر دستک دی تو نانی سمجھیں کہ کوئی فقیر آیا ہے۔ انہوں نے گھر کے برتنوں میں سے واحد دیگچی اٹھائی اور دروازے پر آکر بولیں کہ بابا، گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہے، یہ پتیلی لے جاؤ، اسے بیچ کر اپنی ضرورت پوری کرلو اور اگر ہوسکے تو دو روٹیاں ہمیں بھی دے جانا۔ یہ سن کر ابو کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انہوں نے جواب دیا کہ اماں، میں فقیر تو ہوں مگر ویسا نہیں جیسا آپ نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

سمجھا ہے۔ میں آپ کے مرحوم شوہر کا خط لایا ہوں، آپ اسے پڑھیں اور پھر فیصلہ کریں کہ آیا اپنے گھر کی کوئی چیز مجھے خیرات دینا چاہتی ہیں یا نہیں؟

نانی نے خط پڑھا اور بے اختیار خوشی کے آنسو بہاتے ہوئے سجدے میں گر پڑیں۔ سر اٹھایا تو خیال آیا کہ اس فرشتے کو تو ابھی تک دروازے پر ہی کھڑا رکھا ہے۔ وہ ابو کا ہاتھ پکڑ کر گھر میں لے گئیں۔ گلے سے لگایا، بے شمار دعائیں دیں کہ خدا تیرا بھلا کرے، مجھے یقین نہیں آتا کہ دنیا میں اب بھی تجھ جیسے انسان موجود ہیں جن پر فرشتوں کو رشک آجائے۔ غرض ایک ہفتہ کے بعد میری امی اور ابو کی شادی ہوگئی۔ ابو جانتے تھے کہ اب اپنے شہر جانا بیکار ہے۔ پھر نانی کے اکیلے پن کا بھی خیال تھا، وہ وہیں آباد ہوگئے اور جب پاکستان بنا تو وہیں سے پاکستان کی افواج میں شامل ہوکر پنڈی آگئے۔ یہاں انہیں کیپٹن بنا دیا گیا۔

مگر اس معجزے کے باوجود میری اور امی کی قسمت میں سکھ کے زیادہ دن نہیں لکھے تھے۔ پنڈی آنے کے دوسرے سال نانی انتقال کر گئیں۔ اسی سال میری پیدائش بھی ہوئی اور ابھی میں تین سال کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ کشمیر کے محاذ پر ایک سرحدی فوجی جھڑپ میں ابو شہید ہوگئے۔ مگر اس مختصر مدت میں انہوں نے امی کو آرام پہنچانے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی تھی۔ یہاں تک کہ اپنے تمام جمع شدہ سرمائے سے ایک چھوٹا سا مکان خرید کر ان کے نام کر دیا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ حمیدہ، میرے خاندان والوں نے تمہارے بارے میں بڑی خوفناک پیش گوئیاں کی تھیں کہ تم خدانخواستہ اندھی، لولی لنگڑی، کانی نہیں تو کم سے کم کالی اور بدصورت ضرور ہوگی مگر اب کاش میں تمہیں ساتھ لے جا کر دکھا سکتا کہ خدا نے جنت کی حور میری قسمت میں لکھ دی ہے۔ امی بھی ابو کو بے انتہا چاہتی تھیں اور کیوں نہ چاہتیں، میرے ابو جہاں صورت شکل میں مردانہ وجاہت کا بے مثل نمونہ تھے وہیں وہ سیرت واخلاق میں بھی کسی فرشتے سے کم نہ تھے۔ شاید اس لیے خدا نے انہیں اتنی جلدی واپس بلا لیا کہ فرشتوں کی جگہ زمین نہیں آسمان پر ہوتی ہے۔

کیپٹن ہونے کے بعد میرے ابو کی تنخواہ بڑی معقول ہوگئی تھی۔ شہید ہونے کے بعد ان کے جو واجبات اور پنشن میری امی کو ملی وہ کم ضرور تھی مگر ہم دو جانوں کے گزارے کے لیے کافی تھی، خاص طور سے اس صورت میں کہ مکان ہمارا اپنا تھا.... پھر جب میں کچھ بڑی ہوئی اور میری تعلیم کے ساتھ ہی مہنگائی نے ضروریات زندگی کو زیادہ گراں کر دیا تو امی نے گھر پہ بچوں کو پڑھانا اور محلے کے لوگوں کے کپڑوں کی سلائی شروع کر دی۔ میں اس زمانے کی تمام تر تفصیلات میں نہیں جاؤں گی، بس اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ زمانے کے سرد وگرم کا مقابلہ کرتے ہوئے میں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا۔ بیس سال کی عمر میں، میں بی اے بھی پاس کر چکی تھی۔

اب قدرتی طور پر امی کو، جو محنت شاقہ کرتے کرتے خود بہت بیمار رہنے لگی تھیں، میری شادی کی فکر ستانے لگی۔ کچھ رشتے آئے بھی لیکن ظاہر تھا کہ ہمارے پاس دینے لینے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ ایک دو لالچی لوگ مکان کے لالچ میں اس پر بھی شادی کے لیے آمادہ تھے مگر امی نے صاف کہہ دیا کہ یہ مکان میرے مرحوم شوہر کی نشانی ہے، میں اسے کسی صورت میں کسی لڑکے کے نام نہیں لکھوں گی خواہ وہ آسمان سے اُتر کر ہی کیوں نہ آیا ہو۔ اس کے علاوہ جب آپ کو میری بیٹی کی صورت، سیرت اور اس کے گن پسند ہیں تو مکان لکھوانے پر اتنا اصرار کیوں؟ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کو میری بیٹی کی نہیں، اس مکان کی ضرورت ہے اور جس گھر میں میری بیٹی کی عزت نہ ہو، میں ایسے گھر رخصت کرنے کے بجائے زندگی بھر کنوارا بٹھائے رکھنا پسند کروں گی۔

چنانچہ میں کنواری بیٹھی رہی۔ بیس سے بائیس بائیس سے پچیس سال ہوگئے۔ ان ہی دنوں امی کی طبیعت اچانک بہت خراب ہوگئی۔ ان کی پھولتی اکھڑتی سانسیں دیکھ کر میں ...... بہت گھبرا گئی۔ محلے میں ایک نئے ڈاکٹر صاحب نے اپنا مطب کھولا تھا اور سننے میں آیا تھا کہ بہت ہمدردی اور توجہ سے علاج کرتے ہیں اور فیس بھی بہت کم لیتے ہیں۔ رات کے گیارہ بجے تھے۔ مطب کا وقت ختم ہو چکا تھا اور رات کے وقت کسی ڈاکٹر کو گھر پر بلا کر مریض کو دکھانا، ظاہر ہے دُگنی فیس کا متقاضی ہوتا ہے مگر مجھے اس وقت فیس سے زیادہ امی کی زندگی کی فکر تھی۔ میں نے چادر اوڑھی اور رات کے اندھیرے میں ڈاکٹر شفیق الرحمان کے مطب کی جانب چل پڑی۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس وقت بھی ان کا مطب کھلا تھا۔ معلوم ہوا کہ مریضوں کا رش عام دنوں سے زیادہ تھا اور ڈاکٹر صاحب نے مناسب نہیں سمجھا کہ وقت ختم ہونے کا عذر کر کے آئے ہوئے مریضوں کو مایوس واپس کر دیں۔ میں جب پہنچی تو وہ آخری مریض کو دیکھ کر فارغ ہوئے تھے۔ میری پریشانی انہوں نے میرے چہرے سے پڑھ لی۔

''گھبرانے سے کچھ نہیں ہوگا بی بی!'' وہ بولے ''اطمینان سے بتائیں کہ آپ کی والدہ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میری امی کی طبیعت خراب ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

ڈاکٹر صاحب آہستہ سے مسکرائے ''ہم اس بحث میں پڑے تو آپ کی امی کے علاج میں اتنی ہی تاخیر ہوگی، ویسے آپ اسے میرا قیافہ اور اندازہ بھی کہہ سکتی ہیں۔''

میں نے مختصر طور پر ڈاکٹر صاحب کو امی کی حالت اور بیماری کی علامات کے بارے میں بتایا، انہوں نے جلدی جلدی کچھ دوائیں اور انجکشن اپنے بیگ میں رکھے اور میرے ساتھ چل پڑے۔ جی ہاں، پیدل۔ ویسے میرا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم پانچ منٹ میں پہنچ گئے۔ امی بے ہوش ہوگئی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً ان کا ضروری معائنہ کیا۔ ایک انجکشن لگایا۔ ذرا ہوش آنے پر دوا پلائی اور رات کے دو بجے تک...... جب تک امی کی طبیعت کافی سنبھل نہیں گئی، وہ وہیں پلنگ کے پاس امی کے سرہانے بیٹھے رہے۔ میں نے اپنی چھوٹی سی زندگی میں ایسا کوئی ڈاکٹر ابھی تک نہیں دیکھا تھا، اتنا ہمدرد، اتنا مخلص، دوسروں کے دکھ کو اس حد تک اپنا دکھ سمجھنے والا۔ اور جب آخرکار وہ دو بجے کے بعد رخصت ہونے لگے تو میں نے ڈرتے ڈرتے فیس کے بارے میں پوچھا۔

''میری فیس کی آپ فکر نہ کریں۔'' وہ بولے ''وہ انشاء اللہ مجھے اس وقت مل جائے گی جب آپ کی امی بالکل صحت مند ہوکر مجھے ڈھیر ساری دعائیں دیں گی۔ اور ہاں، اب آپ بھی آرام کریں۔ میں نے ایک دوسرا انجکشن بھی دے دیا ہے۔ آپ کی امی خدا نے چاہا تو صبح تک سکون سے سوتی رہیں گی۔ پھر جو دوائیں میں نے پڑیوں میں باندھ کر رکھ دی ہیں، وہ انہیں پابندی سے ہر چھ گھنٹے کے بعد دیتی رہیں، انشاء اللہ دو تین دن میں بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔''

☆☆☆

مجھے کچھ معلوم نہیں تھا (اور نہ ہی کوئی اندازہ ہوا کہ کب کوئی بات کیسے ہوگئی؟) کہ تقدیر ایک بار پھر گزری ہوئی تاریخ کو دُہرا رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس رات کے بعد بڑی پابندی سے ازخود صبح شام آکر امی کو دیکھنے لگے۔ وہ تمام دوائیں بھی اپنے ساتھ ہی لاتے تھے اور تمام انجکشن بھی اپنے پاس سے ہی لگا رہے تھے۔ امی کی طبیعت کبھی اتنی سنبھل جاتی کہ جیسے وہ... بیمار ہی نہیں ہیں مگر پھر سانس کا ایک دورہ پڑتا اور تمام افاقہ اس دورے کی نذر ہو جاتا تھا۔ ان دنوں امی طبیعت کی خرابی کی حالت میں بڑی مایوسی اور افسردگی کی باتیں کرنے لگتی تھیں۔ ایسی ہی ایک شام کو امی بے تحاشا رونے لگیں۔ اور روتے روتے اچانک بولیں۔

''ڈاکٹر صاحب! مجھے یقین ہے کہ میں اس بیماری سے بچ نہیں سکوں گی مگر میں موت کی منت کر رہی ہوں کہ وہ مجھے اتنی مہلت دے دے، خدا سے دعائیں مانگ رہی ہوں کہ وہ کوئی ایسا وسیلہ پیدا کر دے کہ میں اپنی عارفہ کی جانب سے بے فکر ہو جاؤں۔ میرے بعد خدا کے علاوہ اس دنیا میں اس کا کوئی سہارا نہیں ہے۔ کاش کوئی ایسا معجزہ ہو جائے، کوئی فرشتہ میرے دروازے پر دستک دے اور کہے کہ حمیدہ، تم فکر مت کرو، تمہارے بعد میں تمہاری بیٹی کی نگرانی اور سرپرستی اپنے ذمے لیتا ہوں۔ اگر ایسا ہو جائے تو میرے دل سے ایک بھاری بوجھ ہٹ جائے اور میں خوشی خوشی اپنی جان دے دوں۔''

''امی، آپ ایسی باتیں نہ کریں، مجھے آپ کی صحت یابی کا یقین ہے۔''

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا ''لیکن آپ کو ایسی ہی اپنی بیٹی کی فکر ہے تو سمجھ لیں کہ کوئی آپ کے دروازے پر دستک دے رہا ہے، اگرچہ وہ فرشتہ نہیں ہے۔''

''کون...... کون میرے دروازے پر دستک دے رہا ہے؟'' امی نے بیتابی سے پوچھا۔

''وہ میں ہوں امی!'' ڈاکٹر شفیق نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا ''اگر آپ مجھے اس قابل سمجھتی ہیں تو میں آپ کی بیٹی کو اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کے لیے آمادہ ہوں۔''

امی جوش مسرت میں اُٹھ کر بیٹھ گئیں ''تم...... تم سچ کہہ رہے ہو بیٹے!'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔

''ہاں امی، اتنا سچ کہ میں نے اس سے بڑا سچ کبھی اپنی زندگی میں نہیں کہا۔''

امی نے بے اختیار ڈاکٹر شفیق کو اپنے گلے سے لگا لیا۔

''خوش رہو بیٹے! تم نے اس وقت ایک مرتی ہوئی ماں کے مردہ بدن میں روح پھونک دی۔ مگر بیٹے، تمہارے والدین، عزیز واقارب......؟''

''سب ہیں، میں نے یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ اول تو وہ میری خوشی کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنیں گے لیکن بالفرض انہوں نے مخالفت بھی کی تب بھی میں ہر حال میں اپنا وعدہ پورا کروں گا خواہ اس کے لیے مجھے ساری دنیا ہی کیوں نہ چھوڑنا پڑے۔''

امی بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ میں اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ڈاکٹر شفیق حیران رہ گئے۔

”اب آپ کیوں رو رہی ہیں؟“ آخر ڈاکٹر شفیق نے پوچھا۔

”کچھ نہیں بیٹے!“ امی نے دوپٹے سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے جواب دیا ”تم نہیں جانتے مگر مجھے اس وقت ایک تم جیسا فرشتہ یاد آگیا جس نے کبھی میری ماں کے دروازے پر دستک دے کر بالکل یہی بات کہی تھی۔“

☆☆☆

وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ جب ڈاکٹر شفیق کے والدین کو ان کے ارادے کا علم ہوا تو جیسے مخالفت کا ایک طوفان کھڑا ہوگیا مگر شفیق اس معاملے میں شاید میرے ابو سے خوش قسمت تھے۔ انہوں نے وہ ہی کچھ کر دکھایا جس کا وعدہ کیا تھا اور ان کے گھر والوں کو بالآخر اپنی ہار تسلیم کرنا پڑی۔ ایک ماہ کے اندر میری اور شفیق کی شادی ہوگئی۔ میں اپنی امی کے گھر سے رخصت ہوکر شفیق کے گھر آگئی مگر ان کے والدین اور بہن بھائیوں نے کبھی دل سے اس رشتے کو قبول نہیں کیا۔ عجیب بات یہ بھی کہ میری شادی کے ہونے کے امکان کے ساتھ ہی امی کی طبیعت بھی سنبھلتی گئی اور شادی والے دن تو کوئی انہیں دیکھ کر یہ کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ کبھی اتنی بیمار پڑی تھیں کہ ان کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ اس فطری اتفاق کو بھی میرے سسرال والوں نے امی کی ایک عیاری اور چالاکی قرار دیا کہ انہوں نے ان کے بھولے بھالے بیٹے کو اپنی بیماری کا ڈراما کر کے اپنی فقیر بیٹی اس ہونہار بیٹے کے گلے میں باندھ دی جس کے لیے بڑے سے بڑے گھر کے لوگ اپنی لڑکی اور لاکھوں کا جہیز دینے کے لیے تیار تھے۔

میرے ساتھ تمام گھر والوں کا جو سلوک تھا، میں اسے بیان بھی کرنا چاہوں تو اس کی تمام تر تلخی کے ساتھ تحریر نہیں کر سکتی۔ وہ بات بات پر میری تحقیر کرتے تھے۔ ذرا ذرا سے معاملے کو اتنا بڑھا چڑھا کر بیان کرتے کہ میری آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ ایسی چٹکیاں لیتے جن کی اذیت صرف میں ہی محسوس کر سکتی تھی۔ سارے گھر کا کام مجھ پر ڈال رکھا تھا، اس کے باوجود ہر کوئی بُرا بھلا کہتا رہتا تھا۔ میرے ہر ایک کام میں کیڑے نکالے جاتے تھے اور یہ روش بڑھتے بڑھتے اس حد تک آپہنچی تھی کہ ساس، سسر، چھوٹے دیور اور نندیں بُرا بھلا کہنے کے علاوہ مجھے گالیاں کوسنے بھی دینے لگے تھے۔ کسی آئے گئے کا خیال کیے بغیر مجھ پر مار بھی پڑنے لگی۔ اور یہ سب کام اس طرح ہوتا کہ شفیق کو خبر نہ ہو۔ ان کے سامنے سب کا رویہ ایک دم بدل جاتا تھا۔ شفیق ہر وقت مجھے گھر کے کاموں میں مصروف دیکھ کر شکایت کرتے کہ آپ لوگ یہ کیا زیادتی کر رہے ہیں، پورے گھر کا بوجھ اکیلی عارفہ پر ڈال رکھا ہے تو ساس بڑے ناز و انداز سے جواب دیتیں کہ بیٹے، میں کیا کروں، میں تو کہتی ہوں مگر عارفہ تو کسی کو کام میں ہاتھ ہی نہیں لگانے دیتی، آخر اسی ماں کی بیٹی ہے نا جس کی پوری زندگی محلے والوں کی خدمت کرتے گزری تو بے چاری عادت سے مجبور ہے۔ اسے خالی بیٹھنا تو آتا ہی نہیں۔

مگر اس کے باوجود شفیق سب کچھ جانتے اور سمجھتے تھے۔ میں نے کبھی ان سے گھر والوں کے کسی رویّے کی شکایت نہیں کی مگر خود انہیں اپنے گھر والوں کے طرزِ عمل کا اندازہ تھا، وہ اکثر مجھے گلے سے لگا کر کہتے۔

”بس، میری روح، میری چاند! کچھ مدت اور گزار لو۔ میں .... مکان خریدنے کے لیے رقم جمع کر رہا ہوں۔ کافی جمع کر چکا ہوں باقی بھی سال بھر کے اندر انشاء اللہ جمع ہو جائے گی پھر ہم اپنے الگ گھر میں رہیں گے اور تمہارا ان ظالموں سے پیچھا چھوٹ جائے گا۔“

شفیق کی یہی باتیں تھیں جنہیں سن کر میرے قلب و ذہن پر ایک سرور سا طاری ہو جاتا تھا اور میں ایک نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ ان کے مظالم کا نشانہ بننے کے لیے تیار ہو جاتی تھی۔ سال بھر بعد خدا نے مجھے ایک پیاری، چاند سی بیٹی کی ماں بنا دیا مگر بیٹی کا پیدا ہونا گویا میرے لیے تازہ ستم کے ایک نئے باب کا کھل جانا تھا۔ اب مجھے منحوس کا خطاب بھی دے دیا گیا۔ کہا گیا کہ ان کے خاندان میں نسلوں سے یہ روایت چلی آرہی ہے کہ پہلا بچہ لڑکا ہوتا ہے اور اگر کبھی بدقسمتی سے لڑکی ہوتی ہے تو خاندان پر ضرور کوئی مصیبت آجاتی ہے مگر اب میں زیادہ حوصلے کے ساتھ حالات کا مقابلہ کر رہی تھی۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ میں اب ایسی باتوں کی عادی ہو چکی تھی۔ کچھ اس وجہ سے کہ گالیاں اور جھڑکیاں کھا کر جب میں تنہائی میں آکر آنسو بہانے لگتی تو میری بیٹی مہ پارہ کی معصومانہ حرکتیں، فرشتوں جیسی مسکراہٹ میرے سارے آنسو خشک کر دیتی تھی۔ پھر کچھ یہ وجہ بھی تھی کہ مکان خریدنے کے لیے جو ہدف شفیق نے مقرر کیا تھا وہ اب پورا ہونے ہی والا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ ہماری بیٹی کی پہلی سالگرہ ہم اپنے گھر میں ہی منائیں گے۔

مگر تقدیر ہمارے ہوائی قلعوں پر مسکرا رہی تھی۔ مہ پارہ کی سالگرہ میں ابھی ایک ماہ باقی تھا۔ شفیق ایک خوبصورت

مکان خریدنے کا سودا تقریباً مکمل کر چکے تھے۔ صرف مکان کی رجسٹری میرے نام ہوکر رقم کی ادائیگی باقی تھی کہ برسات کی ایک رات تقریباً ایک بجے کوئی مریض اپنی لبِ مرگ بیوی کو دکھانے کے لیے ڈاکٹر صاحب کو لینے آیا۔ تب تک شفیق ایک سیکنڈ ہینڈ کار خرید چکے تھے۔ وہ حسبِ عادت اسی وقت مریضہ کو دیکھنے روانہ ہوگئے اور بس انہیں موٹر کار میں بیٹھ کر جاتے دیکھنا وہ آخری نظارہ تھا جب میں نے انہیں زندہ دیکھا۔ بارش ہو رہی تھی۔ سڑکوں پر پانی دریا کی طرح بہہ رہا تھا، جگہ جگہ کیچڑ اور پھسلن تھی۔ شفیق مریضہ تک پہنچے۔ اسے دیکھنے اور اس کی زندگی بچانے میں تو کامیاب ہوگئے مگر واپس آتے ہوئے خود اپنی جان کی حفاظت نہ کر سکے۔ ایک موڑ پر اچانک برآمد ہونے والے ٹرک سے ان کی کار ٹکرا گئی۔ ٹکر اتنی زبردست تھی کہ کار کئی قلابازیاں کھاتی ہوئی دور جا گری اور اس میں آگ لگ گئی۔ جب تک لوگ مدد کو پہنچتے یا بارش کا پانی آگ بجھانے میں کامیاب ہوتا، میری زندگی اسی جلی ہوئی کار میں راکھ ہوگئی۔

اور ٹھیک اسی طرح جس طرح میرے ابو میری امی کو چھوڑ کر چلے گئے تھے، کم و بیش اتنی ہی مدت میرے ساتھ گزار کر شفیق بھی رخصت ہوگئے۔

☆☆☆

سسرال میں اپنی نحوست کے سلسلے میں، میں ایک اہم بات کا ذکر کرنا بھول گئی۔ جب مہ پارہ پیدا ہوئی تو لیڈی ڈاکٹر کو معلوم ہوا کہ رحم میں ایک چھوٹی سی رسولی بھی موجود ہے، اس نے اسی وقت شفیق سے مشورہ کیا اور ظاہر ہے کہ شفیق ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے وہی مشورہ دے سکتے تھے جس پر خود لیڈی ڈاکٹر پہنچ چکی تھی۔ آپریشن کر کے رسولی تو نکال دی گئی مگر اس کے ساتھ یہ منحوس خبر بھی سننے میں آئی کہ اب میں کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ گویا وہ جو لڑکی ہونے کی وجہ سے ایک تسلی سی تھی کہ اس مرتبہ لڑکی ہوئی تو کیا، اگلی مرتبہ خدا لڑکا بھی دے سکتا ہے تو اس تسلی کو بھی تقدیر نے چھین لیا۔ یہ گویا میری نحوست کی مزید علامت تھی کہ میں نے نہ صرف لڑکی کو جنم دیا بلکہ آئندہ کسی بیٹے کے پیدا ہونے کی راہ بھی مسدود کر دی۔ ہرچند اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا مگر کبھی کبھی خود میں بھی سوچنے لگی تھی کہ میں سچ مچ منحوس ہوں، پیدا ہوئی تو باپ کے سائے سے محروم ہوگئی۔ جوان ہوئی تو بیٹے کا منہ دیکھنے کی توقع ختم کر دی اور پھر انتہا یہ کہ اپنے سرتاج، اپنے سہاگ کو بھی اپنی نحوست سے ہلاک کر دیا۔

شفیق کے انتقال کے بعد مجھے زیادہ دن سسرال میں برداشت نہیں کیا گیا۔ چالیسویں کی فاتحہ بھی نہیں ہوئی تھی کہ مجھے مار پیٹ کر اور دھکے دے کر گھر سے نکال دیا گیا۔ انتہا یہ کہ میری بیٹی بھی مجھ سے چھین لی گئی۔ میں مظلوم کس کا دروازہ کھٹکھٹاتی۔ کس سے انصاف طلب کرتی۔ تھک ہار کر اس اُجڑے مکان میں اور اسی بیمار ماں کی آغوش میں پناہ لینے آگئی جسے جوان داماد کی موت نے بس چند دن کا مہمان رہنے دیا تھا۔ تب مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ شفیق کس درجہ مخلص، بے لوث اور وفادار انسان تھے۔ انہوں نے شادی کے فوراً بعد ہی امی کی دیکھ بھال اور گھر کے کام کاج کے لیے ایک ہمہ وقتی ملازمہ رکھ دی تھی جو ہر طرح ان کی خدمت کرتی تھی۔ اس دوران سسرال سے مجھے بہ مشکل دو چار بار امی کو دیکھ آنے کی اجازت ملی تھی۔ میں نے خادمہ کو گھر میں کام کرتے بھی دیکھا تھا مگر میرے پوچھنے پر اس نے صرف اتنا بتایا تھا کہ پڑوس کی ایک ہمدرد عورت ہے جو کبھی کبھار ان کا کام کرنے آجاتی ہے۔ غالباً شفیق نے امی کو بھی منع کر دیا تھا کہ مجھے اس بارے میں زیادہ نہ بتایا جائے کہ مبادا کہیں سسرال میں یہ بات میری زبان سے نکل جائے اور ان لوگوں کو بھی معلوم ہو جائے کہ یہ بڑھیا شادی کے بعد بھی اپنی خدمت کے بہانے ان کے بیٹے کو لوٹ رہی ہے۔

ابھی مجھے گھر آئے چند روز ہی گزرے تھے۔ ملازمہ ظاہر ہے کہ شفیق کے انتقال کے بعد سے جب تک اس کا مہینا پورا نہیں ہوا آتی رہی۔ اس کے بعد بھی وہ غریب محبت اور خلوص کے مارے کام چھوڑنا نہیں چاہتی تھی مگر اب اس کی تنخواہ دینے والا کون تھا، اس کی کوئی ایسی خاص ضرورت نہیں رہ گئی ہے پھر وہ اپنا نقصان کیوں کرتی آخر اسے ملازمت کر کے ہی اپنے بچوں کا پیٹ بھرنا ہے تو کسی اور جگہ ملازمت کر لے۔ مجھے آئے چند روز ہی گزرے تھے کہ اپنے بچپن کی ایک سہیلی نوراں کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس پر سسرال میں بے انتہا ظلم ڈھائے جا رہے ہیں۔ اس کے ماں باپ مر چکے تھے، بھائیوں نے چند ہزار روپے لے کر اس کی شادی ایک شرابی جواری سے کر دی تھی جو شادی کے سال بھر بعد ہی اس کی گود میں ایک بیٹا چھوڑ کر خدا جانے کہاں غائب ہوگیا۔ اس بے چاری نے چار پانچ سال سسرال والوں کی خدمت کر کر کے گزار دیے مگر حال یہ تھا کہ گھر کا سارا کام لینے کے باوجود نہ اسے پیٹ بھر کھانا دیا جاتا تھا اور نہ بیمار پڑ جانے پر اس کا علاج کیا جاتا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں نے یہ حالات سنے تو دوسرے دن ہی اس کی سسرال پہنچ گئی، اسے دیکھا تو میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ نوراں جو چھ سات سال پہلے حسن و جوانی کا جگمگاتا چاند تھی، اب صرف ہڈیوں کا ڈھانچا بن کر رہ گئی تھی۔ اس کے سسرال والوں کو یہ خدشا تھا کہ کہیں یہ کم بخت مر مرا گئی تو لوگ اس کی موت کا ذمّے دار بھی انہیں ٹھہرائیں گے، اس کا کفن دفن بھی انہیں کرنا ہوگا اور اس کے بعد اس کے پانچ سالہ بچے منصور کی پرورش کا بار بھی ان ہی پر آپڑے گا۔ میں نے جو اسے اپنے ساتھ لے جانے کی بات زبان سے نکالی تو جیسے ان سب کے دل کی مراد بر آئی۔ بولے "ہاں ہاں شوق سے لے جاؤ، آخر تمہاری سہیلی ہے، تمہیں اس کا خیال نہیں ہوگا تو اور کسے ہوگا؟ یہاں تو ہم اس نیک بخت کو سمجھاتے سمجھاتے عاجز آگئے کہ گھر میں اتنے آدمی ہیں، کوئی نہ کوئی گھر کا کام کرلے گا مگر یہ تو جیسے کام کی رسیا ہے، ایک منٹ خالی نہیں بیٹھ سکتی، سارا سارا دن کام میں جتی رہتی ہے۔ بیمار پڑی تو ہم نے ہر چند خوشامد کی، خود ڈاکٹر سے دوا لا کر دی مگر اسے تو دوا کے نام سے چڑ ہے۔ اب تم اسے ساتھ لے جاؤ گی، کچھ سمجھاؤ گی تو شاید اس کی سمجھ میں آجائے۔

میں نوراں کو ساتھ لے تو آئی مگر وہ غریب تپ دق کے آخری درجے تک پہنچ چکی تھی۔ میں نے مقدور بھر اس کا علاج کرایا، اس کی خدمت بھی کی مگر اس کی طبیعت سنبھلنے کے بجائے اور بگڑتی چلی گئی۔ ادھر امی کی بُری حالت تھی۔ ان کی دیکھ بھال بھی کرنا پڑتی تھی اور اپنی استطاعت کی حد تک دوا علاج بھی مگر اب مجھے کوئی شفیق جیسا ڈاکٹر کہاں ملتا جو خود آدھی آدھی رات تک مریض کے سرہانے بیٹھ کر خدمت کرتا ہو۔ وہ مہینا بھر کے اندر سدھار گئیں اور ایک طرح سے اچھا ہی ہوا، وہ ابو اور شفیق کو یاد کر کرکے اس قدر روتی اور آنسو بہاتی تھیں کہ دم اُکھڑ جاتا تھا۔ مجھ سے ان کی یہ حالت نہیں دیکھی جاتی تھی۔ خدا نے آخر ان کی مشکل آسان کردی۔ ایک رات ایسی سوئیں کہ بس سوتی ہی رہ گئیں۔ ان کی موت کا نوراں پر بھی بہت اثر ہوا۔ ایک دن اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

"خدا جانے عارفہ، میں نے اس دنیا میں ایسی کون سی نیکی کی تھی کہ جس کے بدلے میرے آخری دنوں میں تم مجھے مل گئیں۔" وہ بولی "اور میں نے بھی کچھ دن آرام کے گزار لیے مگر مجھے احساس ہے کہ میرا آخری وقت آپہنچا ہے۔ دنیا سے جاتے ہوئے مجھے کوئی غم، کوئی فکر نہیں ہے سوائے اپنے بیٹے منصور کے تم اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر مجھ سے وعدہ کرو کہ میرے بعد اسے اپنے بیٹے کی طرح رکھو گی۔ اسے لکھاؤ گی، پڑھاؤ گی، زندگی میں کسی اچھے مقام تک پہنچنے میں اس کی مدد کرو گی۔ تم یہ وعدہ کرو تو میں آسانی سے اور اطمینان سے یہ دنیا چھوڑ دوں گی۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو نوراں، کیا تمہیں یہ سب کچھ کہنے کی ضرورت تھی۔ اوّل تو کوئی انسان اپنے مرنے جینے کی بات یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن خدانخواستہ تم نہ رہیں تو تمہارے بعد میری جتنی بھی زندگی ہے، اپنے بیٹے منصور کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں ہی صرف ہوگی۔ تم جانتی ہو کہ میری سسرال والوں نے مجھ سے میری بیٹی چھین لی ہے، میں سمجھوں گی کہ خدا نے مجھے اس کے بجائے ایک بیٹا دے دیا۔"

نوراں دیر تک میرا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگائے روتی رہی۔ اس کا وقت بھی قریب آچکا تھا۔ ابھی امی کے انتقال کو دوسرا مہینا شروع نہیں ہوا تھا کہ ایک صبح کے طلوع ہوتے ہوئے سورج کی زرد کرنوں میں نوراں بھی میرا ساتھ چھوڑ گئی۔

☆☆☆

اب میں اس بھری دنیا میں اکیلی اور بے سہارا رہ گئی تھی مگر میں نے ہمت نہیں ہاری۔ ابو کی پینشن بھی امی کے انتقال کے بعد بند ہوگئی تو میں نے گزراوقات کے لیے گھر میں بچوں کو ٹیوشن پڑھانے لگی..... اور خدا نے اس میں اتنی برکت دی کہ میرا اور منصور کا گزارا بہ آسانی ہونے لگا۔ میں سوچ رہی تھی کہ زندگی یونہی گزر جائے گی مگر قسمت کو ابھی کچھ اور کھیل دکھانا منظور تھا۔ منصور کے بارے میں میرے بڑے بلند ارادے تھے، وہ بچہ بھی بڑا ذہین اور ہونہار تھا، ایک بار کا پڑھایا ہوا سبق اس طرح یاد کرلیتا تھا کہ دوبارہ بتانے کی ضرورت نہیں رہتی تھی اور اس کی اسی صلاحیت کو دیکھ کر مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ خدا نے حالات سازگار رکھے، مجھے اتنی زندگی اور قوت دی تو میں ایک دن اسے شفیق کی طرح بہت بڑا ڈاکٹر بناؤں گی۔ میں اس کی پڑھائی اور ذہنی اخلاقی تربیت پر پوری توجہ دے رہی تھی اور مجھے اپنی محنت کے بار آور ہونے کا یقین تھا۔

بازار سے گوشت، ترکاری اور دوسری ضروریاتِ زندگی خریدنے مجھے خود جانا پڑتا تھا۔ اور مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ محلّے کا ایک دولت مند آدمی رئیس خان کب سے مجھے اس طرح آتے جاتے دیکھ رہا ہے۔ پھر اس نے دوسرا قدم اُٹھایا اور ترکاری یا گوشت والے کی دکان پر مجھ سے دانستہ مڈبھیڑ کرنے لگا مگر میں نے اسے کوئی لفٹ نہیں دی۔ ان تمام باتوں کے لیے اب میرے دل میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ میں تو ایک مشن کے تحت اپنی زندگی گزار رہی تھی۔ جب اس طرح وہ میری توجہ حاصل کرنے میں ناکام رہا تو اس نے مختلف عورتوں کو پیغام دے کر میرے گھر بھیجنا شروع کردیا۔ وہ سب ایک رٹا رٹایا سبق دُہرائی تھیں کہ تم ابھی جوان ہو، بے انتہا خوبصورت ہو اور اس دنیا میں بالکل اکیلی ہو۔ ایک تنہا عورت کے لیے اس معاشرے کے نیک و بد سے بچ کر زندگی گزارنا تقریباً ناممکن ہے۔ تم دوسری شادی کرلو یا یہ منظور نہیں تو کبھی کبھار رئیس خان کو خوش کردیا کرو، وہ ایسے بامروت اور پابند وضع آدمی ہیں کہ پھر زندگی بھر تمہاری سرپرستی کرتے رہیں گے اور ایک بار تم ان کے زیرِ سایہ آگئیں تو پھر کسی کی مجال نہیں کہ تمہاری طرف نگاہ اُٹھا کر بھی دیکھے۔

میں بھی جانتی تھی کہ میں اکیلی عورت، بدمعاش قسم کے مردوں سے، اگر ان میں سے کسی نے واقعی مجھے تنگ کرنے کا ارادہ کرلیا تو ہرگز بچ نہیں سکتی۔ مگر اب تک زندگی نے مجھے کافی تجربہ کار بنا دیا تھا۔ مجھ میں کچھ خود اعتمادی بھی آگئی تھی۔ سوچتی تھی کہ اب ایسا بھی کیا اندھیر کہ۔ کوئی میری مرضی کے خلاف مجھ پر قابو پالے گا مگر بدقسمتی سے ایسا ہی ہوا۔

رئیس خان جب عورتوں کو بھیج بھیج کر تھک گیا تو اس نے ایک دن مجھے اپنے بدمعاش ساتھیوں کے ذریعے اغوا کرالیا۔ وہ لوگ اغوا کرکے مجھے اس کے ایک بنگلے پر لے گئے جہاں رئیس خان پہلے سے میرا انتظار کررہا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو جانے کا اشارہ کیا اور مجھے ایک کمرے میں بند کرکے میری عزت پر حملہ آور ہوا۔ میں نے مقدور بھر..... مدافعت کی مگر جب دیکھ لیا کہ اس کے مقابلے میں ہارتی ہار نظر آرہی ہے تو میں کمرے کی کھڑکی کھول کر اس کے پاس کھڑی ہوگئی۔

"رئیس خان! تم نے اب تک نہ جانے کتنی بدنصیب لڑکیوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا ہوگا۔" میں چیخ کر بولی "خدا کے غضب سے ڈرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا قہر تمہیں ایسی حالت میں پکڑ لے کہ تم اپنے گناہوں پر توبہ بھی نہ کرسکو۔ مجھے احساس ہے کہ میں تم سے مقابلے میں نہیں جیت سکتی مگر خدا کی قسم، اگر تم نے حرام کاری کے خیال سے میری طرف ایک قدم بھی بڑھایا تو میں اس کھڑکی سے کود کر اپنی جان دے دوں گی۔"

رئیس خان دم بہ خود کھڑا رہ گیا۔ شاید اس کی زندگی میں کوئی مجھ جیسی لڑکی پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔

"میں تجھے جی جان سے چاہتا ہوں عارفہ!" وہ بولا "میں نے ہر طرح تجھے اپنا بنانے کی کوشش کی مگر تیرے انکار نے آخر مجھے اس آخری چارہ کار کو اختیار کرنے پر مجبور کردیا۔ آج تک کوئی لڑکی جسے میں نے پانا چاہا ہو مجھ سے بچ کر نہیں جاسکی۔ میں تیری اس موت کی دھمکی سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ مگر دیکھ، ان باتوں سے کیا فائدہ، اب بھی میرا کہنا مان لے، میں ساری زندگی کے لیے تجھے رانی بنا کر رکھوں گا۔"

"جس طرح نجانے کتنی ہی لڑکیوں کو رانی بنا کر رکھ چکے ہو؟"

"ان میں اور تجھ میں زمین آسمان کا فرق ہے عارفہ، خدا کی قسم! میں نے آج تک کوئی اتنی خوبصورت اور نڈر لڑکی نہیں دیکھی جو ایک پانچ سالہ بچے کے ساتھ ایسی بے جگری اور حوصلے کے ساتھ دوسروں کی مدد کی محتاج ہوئے بغیر زندگی گزار رہی ہو۔"

"تم مجھے بہت چاہتے ہو؟" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں، بہت ...... اپنی تمام دولت اور شان و شوکت سے بھی زیادہ۔" رئیس خان نے جواب دیا۔

"تب پھر تم اس گناہ سے میرا دامن اور اپنا منہ کالا کیوں کررہے ہو؟" میں نے حوصلہ کرکے جواب دیا "مجھ سے شادی کیوں نہیں کرلیتے؟"

"تم...... تم مجھ سے شادی کرو گی؟" رئیس خان خوش ہوکر بولا۔

"ہاں۔"

"مگر میں نے تو پہلے شادی کی پیشکش بھی کی تھی۔"

"تب مجھے ایسی صورتِ حال کا سامنا کرنا نہیں پڑا تھا۔"

"پھر میں تم سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"مگر اس سے پہلے میری ایک دو باتیں سن لو۔ پہلی یہ کہ اب میں کبھی ماں نہیں بن سکوں گی۔"

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ مجھے اولاد کی تمنّا بھی نہیں، وہ پہلے ہی خدا نے مجھے ضرورت سے زیادہ دے رکھی ہے۔"

"دوسری بات یہ کہ میں اپنے مکان کے علاوہ کہیں اور نہیں رہوں گی اور وہ میرا بیٹا منصور، میرے ساتھ رہے گا۔"

"وہ تمہارا بیٹا کب ہے، تمہاری سہیلی کا لڑکا ہے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

"درست ہے۔ مگر اب میں اس کی ماں ہوں۔"

"ٹھیک ہے، وہ تمہارے ساتھ رہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"تیسری اور آخری بات یہ کہ شادی محلے والوں کی موجودگی میں شریعت اور قانون خداوندی کے مطابق ہوگی، میں کوئی کام چوری چھپے کرنا نہیں چاہتی۔"

"مجھے یہ بھی منظور ہے۔"

"بس تو پھر آج سے پندرہ دن کے بعد برات لے کر میرے گھر آجانا۔ قاضی کو بھی لیتے آنا، میں تمہیں تیار ملوں گی۔"

☆☆☆

اور یوں پندرہ دن کے بعد رئیس خان سے میری دوسری شادی ہوگئی۔ اس کی یہ کون سی شادی تھی، مجھے نہیں معلوم اور نہ مجھے اس سے غرض تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ رئیس خان صرف نام کا ہی رئیس نہیں، ایک بڑے اور شریف امیر گھرانے کا بگڑا ہوا نوجوان ہے اور مجھے اس دنیا میں سکون سے رہنے اور منصور کو ڈاکٹر بنانے کے اپنے مشن کو پورا کرنے کے لیے ایک ایسے ہی آدمی کا معاشرتی تحفظ درکار تھا۔ شروع میں وہ پورا ہفتہ میرے گھر رہا۔ اس کے بعد جیسے جیسے دن گزرتے گئے، اس کی آمدورفت کم ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ شادی کے سال بھر بعد تو مہینوں اس کی صورت نظر نہیں آتی تھی مگر مجھے اس کی پروا نہ تھی۔ اس سے جو تعلق حالات کی مجبوری سے ہوگیا تھا، وہی میرے لیے حد درجہ ناگوار تھا اور میں بس اسے ایک تلخ فرض کی طرح ہی ادا کرتی تھی۔ شاید یہ بھی ایک وجہ ہو کہ اس کی توجہ جلد ہی دوسری طرف مبذول ہوگئی اور وہ ایک شکار کو کامیاب طریقے سے زیر کرنے کے بعد دوسری کسی جولان گاہ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ مگر ایک بات ضرور تھی، اس نے ابتدا سے جو میرا خرچ ایک ہزار روپے ماہانہ مقرر کردیا تھا، وہ پوری پابندی سے مجھے ملتا رہتا تھا، خواہ وہ آئے یا نہ آئے۔ اور یوں میں بڑی کامیابی سے اپنے مشن کو پورا کرنے میں مصروف ہوگئی۔

وقت گزرتا گیا۔ ایک ایک کرکے بیس سال بیت گئے۔ منصور بڑا ہی لائق اور ہونہار طالب علم ثابت ہوا، اس نے پہلی جماعت سے جو اپنا اول آنے کا ریکارڈ قائم کیا تھا، اسے ایم بی بی ایس کے فائنل امتحان تک برقرار رکھا۔ ورنہ ظاہر تھا کہ سخت مقابلہ اور سفارش کے اس زمانے میں جبکہ سیکنڈ ایئر سائنس کے بعد کسی میڈیکل کالج میں داخلہ ملنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ اسے صرف میرٹ کی بنیاد پر داخلہ مل گیا اور پھر پانچ سال بعد اس نے اسی شاندار کامیابی سے اپنا فائنل امتحان بھی پاس کرلیا۔

☆☆☆

اس طویل دور میں جہاں اور بہت کچھ ہوا تھا وہیں میری سسرال والوں کی تمام اکڑفوں بھی رخصت ہوچکی تھی۔ سسر انتقال کرگئے اور ان کے انتقال کے ساتھ ہی بندھا ہوا گھر جھاڑو کے تنکوں کی طرح بکھر گیا۔ دیوروں اور نندوں کی شادیاں ہوگئیں اور وہ سب کے سب یا تو اپنے اپنے حالات سے اتنے مجبور تھے یا پھر اتنے خود غرض کہ کسی نے پلٹ کر اپنی بوڑھی ماں اور نوجوان یتیم بھتیجی مہ پارہ کی خبر نہیں لی۔ میں گاہے گاہے وہاں کے حالات معلوم کرتی رہتی تھی۔ خاص طور سے اس لیے کہ اس گھر میں اب بھی میرے مرحوم شوہر کی ایک قیمتی اور واحد یادگار میری بیٹی مہ پارہ کی صورت میں موجود تھی۔ بیٹوں اور بیٹیوں نے ساتھ چھوڑ دیا تو بوڑھی ساس اور نوجوان پوتی کے لیے گزراوقات کا واحد ذریعہ ان دکانوں کے کرائے کی آمدنی رہ گیا جو میرے سسر نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں ازراہِ دوراندیشی مکان کے گراؤنڈ فلور کے کئی کمروں کو توڑ کر بنوادی تھیں۔ مگر پھر یہ آمدنی بھی کم پڑنے لگی۔ کوئی سرپرست نہیں تھا۔ کوئی دیکھ بھال کرنے والا مرد نہیں تھا۔ دکان دار بھی پریشان کرتے تھے، کبھی کرایہ دیتے تھے، کبھی مختلف بہانوں سے دبا لیتے تھے۔

پھر سننے میں آیا کہ رئیس خان اپنی عیارانہ ہمدردی کا جال لے کر پہنچ گیا، خود میرے سسر کا واقف کار یا دوست ظاہر کرکے اس نے روپے پیسے سے دل کھول کر میری ساس کی مدد کی.....

مہ پارہ نے کسی نہ کسی طرح بی اے تک تعلیم حاصل کرلی تھی اور اب قدرتی طور پر میری ساس کو اس کی شادی کی فکر تھی۔ موقع دیکھ کر رئیس خان نے اپنے دام ہم رنگ زمیں بچھادیا، بوڑھی ساس کو لالچ دیا کہ وہ ان کا تمام قرض اور مکان کا رہن نامہ سب کچھ معاف اور واپس کردے گا بشرطیکہ وہ مہ پارہ کی شادی اس کے ساتھ کردیں۔ ساس بے چاری اس کے احسانوں کے بوجھ سے دبی ہوئی تھیں، یہ دیکھنے کے باوجود کہ رئیس خان کی عمر پچاس سال سے بھی کچھ زیادہ ہی ہے اور وہ عمر میں مہ پارہ کا باپ معلوم ہوتا ہے، وہ اس رشتے سے صاف صاف انکار نہیں کرسکیں، پہلے ٹالتی رہیں کہ وہ اپنے بیٹوں سے مشورہ کرکے جواب دیں گی مگر رئیس خان دیکھ چکا تھا کہ مچھلی نے کانٹا نگل لیا ہے، اب صرف ایک جھٹکے کی کسر ہے کہ وہ اس کے قبضے میں

ہوگی اور اس نے ایک روز بڑے سخت الفاظ میں دھمکی دی کہ اگر میری ساس نے ایک ہفتے کے اندر ہاں میں جواب نہیں دیا تو وہ دوسرے ہفتے ان کے مکان پر قبضہ کرکے انہیں سڑک پر پھنکوادے گا۔ طاقت اس کے ہاتھ میں تھی۔ ذرائع اس کے ہاتھ میں تھے۔ بوڑھی ساس کو معلوم تھا کہ اسے عدالت سے ڈگری بھی مل چکی ہے اور اب وہ جب چاہے انہیں دردر کی خاک چھنوا سکتا ہے۔

مجھے یہ حالات اس ملازمہ کی زبانی معلوم ہوتے رہتے تھے جسے کبھی شفیق نے میری امی کی دیکھ بھال کے لیے رکھا تھا اور جو مجبوراً ملازمت چھوڑنے کے باوجود اپنا تعلق نہ توڑ سکی تھی۔ ہفتہ عشرے میں ایک چکر لگاتی رہتی تھی۔ کچھ دن اس نے میرے سسر کے گھر میں بھی کام کیا تھا اسی بہانے وہ وہاں بھی آمدورفت رکھتی تھی پھر چونکہ میں نے خاص طور پر اس سے کہا تھا (اور اسے معلوم بھی تھا کہ مہ پارہ میری بیٹی ہے) کہ وہ مجھے مہ پارہ کی خیریت سے آگاہ کرتی رہا کرے، وہ اس لیے بھی میری سسرال میں وقفے وقفے سے جھانک آتی تھی۔ مجھے یہ معلوم ہوا کہ رئیس خان مہ پارہ سے شادی کرنے کی فکر میں ہے تو اس خبیث انسان پر بے حد غصہ آیا۔ پھر سوچا کہ شاید اسے معلوم نہ ہو کہ مہ پارہ میری بیٹی ہے اور اس رشتے سے وہ اس کے لیے حرام ہے لیکن ان دنوں اس نے میرے گھر آنا جانا بالکل بند کردیا تھا بلکہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، وہ تقریباً دو برس سے مجھ سے ملنے نہیں آیا تھا اس لیے میں اس فکر میں تھی کہ اسے یہ بات بتادوں تو کیسے بتاؤں؟

پھر سننے میں آیا کہ وہ آج کل میری سسرال کے چکر روزانہ لگا رہا ہے تو ایک رات میں چادر اوڑھ کر اپنی سسرال کے دروازے پر کھڑی ہوگئی جیسے ہی رئیس خان باہر نکلا، میں آڑ سے نکل کر اس کے سامنے آگئی۔ وہ مجھے دیکھ کر اور یوں اچانک اپنے سامنے پاکر کچھ حیران اور کچھ پریشان سا ہوگیا۔

"تم..... تم یہاں کیا کررہی ہو؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"میں ایک ضروری بات کہنا چاہتی ہوں۔ مگر شاید تمہیں یہاں سڑک پر کھڑے ہوکر بات کرنا پسند نہ ہو۔" میں نے جواب دیا "اس لیے میرے ساتھ گھر چلو۔"

"آخر ایسی کیا بات ہے، کیا تمہارا خرچ تمہیں پابندی سے نہیں مل رہا؟"

"شکریہ، خرچ پابندی سے مل رہا ہے۔"

"پھر کیا اب وہ کم معلوم ہورہا ہے، ٹھیک ہے میں اگلے ماہ سے دو ہزار کردوں گا۔"

"مجھے تمہارے خرچ کی اتنی پروا نہیں ہے، میں کچھ دوسری بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"اچھا چلو۔" رئیس خان نے مجبوراً آمادگی کا اظہار کیا "مگر تمہیں پتا کیسے چلا کہ میں یہاں ملوں گا؟"

"مجھے ایک مدت سے اس جال کی اطلاع ہے جس میں تم ایک مجبور لڑکی کو پھانسنے کی فکر کررہے ہو۔"

"ہاہاہا۔" رئیس خان اپنے مخصوص انداز میں ہنسنے لگا "بہت خوب، تو یہ رقابت کا جذبہ ہے جو تمہیں یہاں تک لے آیا ہے؟"

"بکواس بند کرو۔" میں نے غصے سے کہا "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ مجھے تمہاری اور تمہاری عیاشانہ زندگی کی کبھی پروا نہیں رہی ہے۔ میں نے تم سے شادی کے وقت نہیں پوچھا کہ تمہاری کتنی بیویاں اور کتنی داشتائیں ہیں اور نہ کبھی مجھے یہ جاننے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ تم اور کہاں کہاں جاتے ہو؟ میری اور تمہاری شادی کم سے کم میری جانب سے حالات کی ایک مجبوری کے تحت ہوئی تھی۔ البتہ مجھے یہ اعتراف ہے کہ تم نے خاطر خواہ تعلق رکھا ہو یا نہ رکھا ہو، مگر اپنا وعدہ آج تک نبھایا ہے اور میں نے بھی اپنی حد تک کبھی تمہاری خاطر داری میں کوئی کسر نہیں چھوڑی..... مگر اب معاملہ ہی کچھ اور آپڑا ہے۔"

"کیسا معاملہ؟"

"گھر چلو تو اطمینان سے بتاؤں گی۔" میں نے جواب دیا۔

مجھے معلوم تھا کہ منصور اس وقت گھر پر نہیں ہوگا، وہ اپنے ایک دوست کی برتھ ڈے پارٹی میں گیا ہوا تھا اور رات کے گیارہ بجے سے پہلے واپس آنے والا نہیں تھا۔ ویسے یہ بڑی عجیب سی بات تھی کہ منصور نے سب باتوں سے واقف ہونے کے باوجود کبھی رئیس خان کے بارے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی اور نہ ہی کبھی اسے کسی رشتے یا تعلق کے نام سے پکارا تھا، وہ ہمیشہ اسے رئیس خان ہی کہتا تھا، کبھی بہت ہی زیادہ اپنے جذبات سے مغلوب ہوجاتا تھا تو وہ صرف ایک ہی سوال کرتا تھا کہ امی آخر آپ نے اس آدمی سے شادی کیوں کی تھی؟ میں نے اس سے کبھی کوئی بات راز میں نہیں رکھی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ میرا حقیقی بیٹا نہیں۔ اسے معلوم تھا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہ اس کی ماں میری بہت ہی پیاری سہیلی نوراں تھی۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ اس کے ماموں نے چند ہزار روپے کے عوض اس کی ماں کی ایک جواری شرابی آدمی سے شادی کردی تھی اور وہی جواری شرابی آدمی اس کا باپ تھا۔ مگر اسے ان میں سے کسی بات پر نہ کوئی شرمندگی تھی نہ کسی قسم کے احساس کمتری میں مبتلا تھا اور یہی ایک بات اس کے مضبوط سیرت و کردار کی غمازی کرتی تھی۔ ویسے یہ ایک حیرت انگیز بات تھی کہ وہ اپنی بہت سی عادتوں، اپنی پسند و ناپسند، اپنے مزاج و اطوار میں شفیق سے بہت ملتا جلتا تھا بلکہ کبھی کبھی تو مجھے اس کے خدوخال میں بھی شفیق ہی کی جھلک معلوم ہوتی تھی۔ خدا جانے یہ کوئی اتفاق تھا یا کوئی پُراسرار تعلق۔ میری سرپرستی میں گزارے ہوئے ان بیس سالوں کا عکس جو میں نے اسے شفیق بنانے میں صرف کیا تھا۔

رئیس خان پہلی مرتبہ میرے ساتھ اکیلے گھر میں گھبرا رہا تھا۔

''جلدی کہو، کیا کہنا چاہتی ہو؟'' اس نے کہا ''مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔''

''میں نے سنا ہے کہ تم جمیل الرحمان صاحب کی پوتی سے شادی کررہے ہو؟'' میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ جمیل الرحمان میرے مرحوم سسر کا نام تھا۔

''تم نے کس سے سنا، میں نے تو اس کو راز رکھنے کی بہت کوشش کی تھی؟''

''ایسی باتیں زیادہ دیر تک چھپی نہیں رہتیں۔''

''جب تم خود کہہ چکی ہو کہ تمہیں کبھی اس بات سے کوئی سروکار نہیں رہا کہ میں نے کتنی شادیاں کیں اور کس سے شادی کرتا ہوں کس سے نہیں تو پھر اب یہ تجسس کیوں؟''

''اس کی بھی ایک وجہ ہے، پہلے میرے سوال کا جواب دو۔''

''اگر میں کہوں کہ ہاں، تم نے ٹھیک سنا ہے، تب......؟''

''تب میں زور دے کر کہوں گی کہ اپنا یہ ارادہ ترک کردو۔''

''مگر کیوں؟''

''تم اپنی اور اس بچی کی عمر نہیں دیکھتے، تم دونوں میں کم سے کم پینتیس سال کا فرق ہے۔''

''تو پھر کیا ہوا؟ میں اب بھی جوان ہوں، شادی کے قابل ہوں اور مرد کو تو ویسے بھی کہا جاتا ہے کہ ساٹھ سال کی عمر میں جوان ہوتا ہے۔''

''میں تمہارے شادی کے قابل ہونے نہ ہونے کی بات نہیں کررہی ہوں۔''

''تو پھر کیا اعتراض ہے؟''

''تم عمر میں اس کے باپ کے برابر ہو۔''

''صرف عمر میں ہی باپ کے برابر ہوں، باپ تو نہیں ہوں۔''

''اب تم حقیقت ہی سننا چاہتے ہو تو سنو، تم سچ مچ اس کے باپ ہو، سوتیلے باپ!''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' رئیس خان کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''اس طرح کہ میں مہ پارہ کی ماں اور جمیل الرحمان صاحب کے بیٹے شفیق الرحمان کی بیوہ ہوں۔ مہ پارہ میری اور ان کی محبت کی نشانی ہے۔''

رئیس خان دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔

''تم جھوٹ بول رہی ہو۔'' آخر وہ بولا۔

''تم اس بات کی کسی سے بھی تصدیق کرسکتے ہو۔''

''اچھا تو پھر یہ سچ بھی ہے تو کیا ہوا؟ وہ تمہاری بیٹی ہے، میری تو نہیں۔''

''تم کیسے مسلمان ہو۔'' میں حیرت زدہ رہ گئی ''اتنی معمولی سی بات نہیں جانتے کہ کسی عورت سے شادی کرنے کے بعد اس کی اولاد مرد پر حرام ہوجاتی ہے خواہ وہ کسی دوسرے مرد سے ہی کیوں نہ ہو۔''

''اول تو مجھے یقین نہیں کہ تم سچ کہہ رہی ہو۔'' رئیس خان کھڑا ہوگیا ''اور اگر یہ سچ بھی ہے تو میں اس فلسفے کو نہیں مانتا، وہ لڑکی تمہاری بیٹی ہوسکتی ہے، میری نہیں اور میری بیٹی نہیں ہے تو میں اس سے ضرور شادی کرسکتا ہوں اور کرکے رہوں گا۔ ہاں تم بھی ایک بات اچھی طرح سن لو، اگر تم نے اس بارے میں کوئی شرارت کی یا یہ جھوٹی داستان مہ پارہ کی دادی تک پہنچانے کی کوشش کی تو میں تمہیں جان سے ماردوں گا۔ تم جانتی ہو کہ میں شریف بھی ہوں اور بدمعاش بھی۔ میرے پاس ایسے کتنے ہی لوگ ہیں جو ایک اشارے پر کسی کا بھی خون کرسکتے ہیں۔ اس بات کو دھمکی مت سمجھنا، تم نے کوئی ایسی ویسی بات کی تو میں وہی کرگزروں گا جو کہہ رہا ہوں اور اس وقت ممکن ہے تمہارا لاڈلا منصور بھی میرے انتقام کی زد میں آجائے۔ میں اچھوں کے ساتھ اچھا اور بُروں کے ساتھ بہت ہی بُرا ہوں۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔''

اور اتنا کہہ کر رئیس خان مجھے غوروفکر، خوف و ہراس میں غلطاں چھوڑ گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ واقعی ایسا ہی آدمی تھا کہ کچھ بھی کرسکتا تھا۔ مجھے اس کا ذاتی تجربہ تھا۔ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ اپنی عیاشی کے دھندے میں وہ کتنی ہی لڑکیوں کا خون بھی کرچکا ہے اور کئی لڑکیاں رسوائی سے بچنے کے لیے خود اپنی جان لے چکی ہیں، مگر اسے ان کی موت کی ذرہ برابر بھی فکر نہ تھی اور نہ ہی ان جرائم کا کوئی خوف تھا جو اس نے اپنے جرائم پیشہ ساتھیوں کی مدد سے کیے تھے، وہ اب بھی ایک رئیس زادہ تھا، دولت مند تھا، بارسوخ تھا اور جانتا تھا کہ قانون اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے دس بار سوچے گا کہ وہ جب چاہے قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک کر صاف بچ کر نکل جائے گا جس طرح اب تک بچ کر نکلتا رہا ہے۔

مگر میں بھی تہیہ کرچکی تھی کہ اسے مہ پارہ کی زندگی تباہ کرنے نہیں دوں گی۔ یہ نہ صرف حرام ہے بلکہ میری معصوم بچی کی جیتے جی موت کے مترادف ہے۔ اور پھر سوچتے سوچتے مجھے اچانک یاد آیا کہ رئیس خان اپنی حفاظت کے لیے ایک ریوالور ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ جب وہ میرے پاس آتا تھا تب بھی مسلح ہوتا تھا۔ ایک بار وہ اپنا ریوالور میرے گھر بھول گیا اور پھر اس کے بعد مدت تک نہیں آیا۔ آیا تو اسے وہ ریوالور یاد نہیں رہا تھا۔ جس شخص کے پاس اسلحے کے انبار لگے ہوں اس میں اسے ایک ریوالور گم ہونے کی کیا فکر ہوسکتی تھی۔ اور یہ ریوالور یاد آنے کے ساتھ ہی میرے ذہن میں ایک پلان اُبھرنے لگا۔

☆☆☆

میں دوسرے دن اپنی ساس سے ملنے گئی اور مجھے قطعی حیرت نہیں ہوئی جب وہ مجھے نہیں پہچان سکیں۔ اس لیے نہیں کہ میں کچھ بہت زیادہ بدل گئی تھی بلکہ اس لیے کہ ان کی نگاہ کمزور تھی، چشمہ لگانے کے باوجود انہیں چہرے ٹھیک سے نظر نہیں آتا تھا...... مگر مجھے ایک عجیب حیرت آمیز خوشی ہوئی جب مہ پارہ نے مجھے دروازے پر ہی پہچان لیا۔

''امی!'' بے اختیار اس کی زبان سے نکلا۔

''تم...... تم مجھے کیسے جانتی ہو؟'' میں نے کانپتے ہونٹوں سے پوچھا۔

''گھر میں آپ کی اور ابو کی کئی تصویریں ہیں جو میں نے چھپا کر اپنے پاس رکھی ہیں۔'' مہ پارہ نے جواب دیا ''اس کے علاوہ وہ جو مائی خیراں آتی ہے وہ مجھے اکثر آپ کی باتیں سناتی رہتی ہے۔ مجھے انہی کے ذریعے یہ معلوم تھا کہ آپ یہاں سے قریب ہی ایک دوسرے محلے میں رہتی ہیں اور میں نے اس کی بے انتہا خوشامد بھی کی کہ وہ مجھے آپ کا پتا بتادے، آپ اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ میرا دل کس طرح آپ سے ملنے آپ کی گود میں منہ چھپانے کے لیے تڑپ رہا تھا مگر مائی خیراں نے کبھی مجھے پتا نہیں بتایا، ہمیشہ یہی تسلی دی کہ مناسب وقت آنے پر آپ خود مجھ سے ملنے آئیں گی۔''

یہ باتیں سن کر کون سی ماں ہوگی جس کا دل نہ تڑپ اُٹھے گا۔ میں نے اپنی بانہیں کھول دیں اور مہ پارہ میرے سینے سے لگ کر آنسو بہانے لگی۔ پھر کچھ دیر کے بعد میں نے خود کو سنبھالا۔ میں جان گئی تھی کہ وہ مائی خیراں کسے کہہ رہی ہے۔ مائی خیراں وہی ملازمہ تھی جسے شفیق نے اس کی خدمت کے لیے رکھا تھا۔

''اچھا بیٹی، اب خود کو سنبھالو۔'' میں نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا ''میں یہاں ایک ضروری کام سے آئی ہوں۔ تمہاری دادی مجھے خود سے پہچان لیں تو اور بات ہے مگر انہیں معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں کون ہوں؟''

''آپ سے بہت سی باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے امی، کیا آپ پھر یہاں نہیں آئیں گی؟''

''میں تو اس کوشش میں ہوں بیٹی کہ تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنے گھر لے جاؤں۔'' میں نے جواب دیا ''اس لیے خدا سے دعا کرو کہ وہ مجھے میرے مقصد میں کامیاب کردے اور اب تم مجھے اپنی دادی کے پاس لے چلو۔''

''آپ دادی کی بالکل فکر نہ کریں۔ وہ آپ کو نہیں پہچان سکیں گی۔'' مہ پارہ نے کہا ''اول تو انہیں ٹھیک سے دکھائی نہیں دیتا، دوسرے ان کی یادداشت بھی بہت کمزور ہوگئی ہے۔''

مہ پارہ مجھے اس کمرے میں لے گئی جہاں میری ساس بیٹھی تھیں۔ میں نے انہیں سلام کیا، انہوں نے جواب دیا۔

''میں نے تمہیں پہچانا نہیں بیٹی!'' وہ بولیں۔

''میں آپ کے قریب ہی دوسرے محلے میں رہتی ہوں۔'' میں نے جواب دیا ''ایک شریف آدمی کی بیوی ہوں۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے جسے میں نے بڑی محنت کرکے ڈاکٹر بنایا ہے، اب وہ ہاؤس جاب کررہا ہے۔ میں اسی سلسلے میں آپ کی خدمت میں آئی ہوں۔''

''ہاں ہاں، ضرور بتاؤ میں کیا کرسکتی ہوں؟''

''میں اپنے بیٹے منصور کے لیے آپ کی پوتی مہ پارہ کا رشتہ مانگنے آئی ہوں۔''

میری ساس نے ایک گہری سانس لی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

''ہم بہت غریب لوگ ہیں بیٹی!'' وہ بولیں ''اس کے علاوہ ایک امیر آدمی کے قرض دار بھی ہیں۔ وہ چاہے تو ہمیں آج ہمارے گھر سے نکال کر سڑک پر پھینک سکتا ہے۔ مجھے اس رشتے سے بہت خوشی ہوتی مگر اب میں مجبور ہوں۔''

''ایسی کیا مجبوری ہے اماں؟''

''ہے بیٹی، بڑی مجبوری ہے۔ اس امیر آدمی کا نام ہے رئیس خان، وہ میری پوتی سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اس شادی کے بدلے تمام قرض معاف کرنے اور یہ مکان بھی ہمیں واپس کرنے کے لیے تیار ہے۔''

''میں نے رئیس خان کا نام سنا ہے۔'' میں نے کہا ''وہ تو عمر میں مہ پارہ کے باپ سے بھی بڑا ہے۔''

''میں جانتی ہوں بیٹی، میں جانتی ہوں مگر ہماری مجبوری ہماری شرافت ہے۔ اب اس بڑھاپے میں، میں اپنی جوان پوتی کو لے کر سڑکوں پر بھیک تو نہیں مانگ سکتی۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ اگر یہ شادی ہوگئی تو مجھے اس سے کوئی خوشی ہوگی......؟ مگر ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے اور میں جانتی ہوں کہ یہ شادی میرے لیے اور میری پوتی کے لیے موت ہی کے برابر ہے مگر میں کیا کروں، میں بہت مجبور ہوں۔''

''کوئی آپ کو آپ کے گھر سے نہیں نکال سکتا۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا ''اور میں یہ بھی وعدہ کرتی ہوں کہ رئیس خان پھر کبھی آپ کو پریشان کرنے نہیں آئے گا اس کا علاج میں کرلوں گی۔ آپ تو بس میرے بیٹے کا رشتہ منظور کرلیں۔''

''اگر تم رئیس خان سے میری جان چھڑا سکتی ہو تو میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہوسکتی ہے۔'' میری ساس نے کہا ''تمہیں شاید معلوم ہو کہ میرا بیٹا مہ پارہ کا باپ بھی ایک ڈاکٹر تھا مگر اس نے ایک ایسی منحوس لڑکی سے شادی کرلی جس سے شادی ہوتے ہی میرا ابھرا پرا گھر برباد ہوگیا۔''

لگتا تھا کہ میری ساس ابھی تک مجھے معاف نہیں کرسکی ہیں۔

''سب تقدیر کے کھیل ہوتے ہیں اماں!'' میں بولی ''نہ کوئی منحوس ہوتا ہے، نہ خوش قسمت۔ جو تقدیر میں لکھا ہوتا ہے وہ پورا ہوکر رہتا ہے اور آدمی اپنی قسمت خود نہیں لکھتا۔ ایسا ہوتا تو پھر دنیا میں کوئی غریب اور بدقسمت نہ ہوتا۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مگر میں یہ رشتہ منظور کرلوں تو مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''کچھ نہیں۔ سب کچھ میں کرلوں گی۔ آپ کو بس اتنا کرنا ہے کہ اب رئیس خان آئے تو اس سے کہیں کہ آپ اپنی پوتی کی شادی اس سے کرنے کے لیے تیار ہیں مگر یہ شادی ایک ماہ بعد ہوگی اور اسے وعدہ کرنا ہوگا کہ شادی سے پہلے وہ نہ صرف تمام قرض معاف کردے گا بلکہ یہ مکان بھی مہ پارہ کے نام لکھ دے گا۔ اس سے یہ بھی کہیں کہ اس کا بار بار یہاں آنا مناسب نہیں اس لیے اب صرف جب آئے جب تمام کاغذات مکمل ہوجائیں یا پھر شادی کے دن برات لے کر آئے۔ اس دوران.... وہ آپ کو اپنے انتظامات کرنے کے لیے تنہا چھوڑ دے اور ہاں، شادی کے انتظامات کرنے کے لیے کچھ رقم بھی دے دے۔''

''رقم، میں اس سے روپیا مانگوں؟''

''صرف اسے مطمئن کرنے کے لیے ورنہ آپ اس روپے کو چاہے کسی اندھے کنویں میں پھینک دیں یا خیرات کردیں، کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' میں نے کہا ''آپ اب یہ بتائیں کہ شادی کے لیے جلد سے جلد کون سی تاریخ دے سکتی ہیں؟''

''اگر ایسی ہی بات ہے تو پھر تم آج سے دس دن بعد بھی برات لاسکتی ہو۔''

میں برات لے کر نہیں آؤں گی۔ شادی بہت سادگی .... اور خاموشی سے ہوگی تاکہ رئیس خان کو اگر پتا چلے بھی تو شادی کے بعد پتا چلے تب وہ کچھ نہیں کرسکے گا اور اگر کچھ کرنے کی کوشش کرے گا بھی تو میں اس سے نمٹ لوں گی۔''

میری باتوں سے میری ساس کے بوڑھے جسم میں بھی حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک عزم، ایک حوصلہ پیدا ہوگیا۔

''بیٹی، تو میرے اور مہ پارہ کے حق میں رحمت کا فرشتہ بن کر آئی ہے۔ اب چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے، میں رئیس خان کو اس کے ارادے میں کامیاب نہ ہونے دوں گی۔'' انہوں نے بڑے حوصلے سے کہا۔

☆☆☆

میں گھر پہنچی تو منصور میرا انتظار کررہا تھا۔ یہ موقع آگیا تھا کہ میں اسے بھی اپنے راز میں شامل کرلوں اور میں نے مختصر الفاظ میں اپنی داستانِ حیات پہلی مرتبہ اسے سنائی۔ اسے بتایا کہ کس طرح مہ پارہ کی پیدائش کے بعد اس کے والد کی ایک حادثے میں موت واقع ہوگئی اور کس طرح میں، جو پہلے ہی سسرال میں منحوس سمجھی جاتی تھی، ٹھوکریں مار کر گھر سے نکال دی گئی۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ اب رئیس خان

اپنی دولت کے بل پر مہ پارہ سے، اپنی سوتیلی بیٹی سے شادی کرنے پر تلا ہوا ہے اور اس کا توڑ میں کسی بھی طرح کرنا چاہتی ہوں۔

''امی، میں آج جو کچھ ہوں، آپ کی بدولت ہوں، آپ کی خوشی کے لیے، آپ کے حکم پر چلتے ہوئے میں اپنی جان بھی دے سکتا ہوں اور مہ پارہ جیسی لڑکی کے ساتھ شادی کرنا تو میرے لیے انتہائی خوش نصیبی کی بات ہوگی مگر آپ نے رئیس خان سے نمٹنے کے لیے کیا سوچا ہے؟''

''اس کے لیے بھی میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے۔'' میں نے ٹالتے ہوئے جواب دیا ''مگر سرِدست پہلا قدم تو تمہاری اور مہ پارہ کی شادی ہے۔ تم نے میری بات مان کر میری لاج رکھ لی۔ خدا تمہیں اور مہ پارہ کو ہمیشہ خوش، شاد و آباد رکھے۔''

رئیس خان کو جب میری ساس نے ہری جھنڈی دکھائی تو وہ خوشی سے ناچ اٹھا اور کہنے لگا کہ میں ابھی ایک ہفتے کے اندر تمام قرضے کی معافی اور مکان کی منتقلی کے کاغذات تیار کرائے دیتا ہوں۔ میری ساس نے کہا کہ نہیں، اتنی جلدی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی مجھے شادی کی تیاری بھی کرنا ہے، اب تم آؤ تو آج سے ٹھیک ایک ماہ کے بعد برات لے کر ہی آنا اور رئیس خان میری ساس کے ہاتھ میں بغیر مانگے پچیس ہزار کیش رکھ کر چلا گیا۔

اس کے ٹھیک آٹھ دن بعد ایک شام بڑی خاموشی اور سادگی سے منصور اور مہ پارہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئے۔ میں مہ پارہ کو اپنی بیٹی کو، رخصت کراکے اپنے گھر لے آئی۔ تب تک میری ساس کو کوئی شبہ نہیں ہوا تھا کہ میں ان کی وہی منحوس بہو ہوں جسے انہوں نے گھر سے نکال دیا تھا۔ پتا نہیں کیسے شادی کے چار پانچ دن بعد ہی رئیس خان کو اس شادی کا معلوم ہوگیا۔ وہ غصے میں پیچ وتاب کھاتے ہوئے میری ساس کے پاس پہنچا۔ میں نے مائی خیراں کی ڈیوٹی لگادی تھی کہ وہ تمام کام چھوڑ کر ہر وقت میری ساس کے ساتھ رہے اور جیسے ہی رئیس خان آئے، مجھے اطلاع کردے۔ چنانچہ اس نے فوراً مجھے آکر بتایا کہ رئیس خان غصے میں آگ بگولا آیا ہے۔ میں نے کمرے کی الماری سے اس کا ریوالور نکالا، اسے چیک کیا، اس میں پوری گولیاں بھری ہوئی تھیں اور پھر ریوالور کو اپنے دوپٹے کی آڑ میں چھپا کر اپنی ساس کے گھر کی طرف چل دی۔

میری ساس رئیس خان کے غصے کے سامنے بُری طرح کانپ رہی تھیں۔

''مجھے کچھ معلوم نہیں، رئیس خان!'' وہ کہہ رہی تھیں ''اس عورت نے مجھ سے کہا کہ وہ تمہیں بھی اس شادی پر راضی کرلے گی اور تم قرض بھی معاف کردو گے، اس نے کچھ ایسی چکنی چپڑی باتیں کیں کہ میں اس کی باتوں میں آگئی۔ اب تم کہتے ہو تو میں کل ہی مہ پارہ کو لے آؤں گی پھر عدالت سے خلع کی ڈگری لے کر اس کی شادی تم سے کردوں گی۔''

''بڑھیا، تجھے کچھ معلوم بھی ہے کہ وہ عورت کون ہے؟'' رئیس خان نے کہا۔

''کون ہے؟'' میری ساس نے حیرت سے پوچھا۔

''تیری بہو، تیرے مرحوم بیٹے شفیق کی بیوہ۔ مہ پارہ اسی کی بیٹی ہے۔ تو نے اسے دھکے دے کر اپنے گھر سے نکال دیا تھا نا تو اس نے اپنے ایک لے پالک بیٹے سے شادی کراکے تجھ سے اپنا بدلہ لیا ہے۔''

''کیا عارفہ......؟'' میری ساس کی حیرت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

''ہاں عارفہ!'' رئیس خان چیخا ''وہی کمینی عورت جس سے میں نے...... شادی کی اور اسے ساری زندگی عیش و آرام سے رکھا اور آج اس نے میرے احسانوں کا یہ بدلہ دیا۔''

''تم نے عارفہ سے شادی کرلی تھی؟''

''ہاں، وہ اب بھی میری منکوحہ ہے۔''

''تب تو مہ پارہ تمہاری سوتیلی بیٹی ہوئی۔ تم اپنی سوتیلی بیٹی سے شادی کرکے اپنا اور اس کا منہ کالا کرنا چاہتے تھے؟''

''یہ سب بکواس ہے۔ میں اسے نہیں مانتا۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ مہ پارہ میری بیٹی نہیں اور جب میری بیٹی نہیں تو کسی کی بھی ہو، میں اس سے شادی کرسکتا ہوں۔''

''تم نے ٹھیک کہا رئیس خان!'' میری ساس نے ایک گہری سانس لی ''عارفہ نے مجھ سے انتقام لیا ہے۔ مگر کیسا شریفانہ انتقام۔ اس نے نہ صرف میری پوتی کو ایک عظیم گناہ سے بچالیا بلکہ ایک قابل اور لائق لڑکے سے اس کی شادی بھی کرادی۔ آج میں سوچتی ہوں تو مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی ہے کہ میں نے ایسی نیک سیرت لڑکی پر کون سا ظلم روا نہیں رکھا۔ شاید خدا بھی مجھے معاف نہ کرے اور تم بھی سن لو رئیس خان، کہ خواہ تم میرا مکان قرقی کرالو، مجھے سڑک پر نکال کر پھینک دو مگر اب میرے جیتے جی تم مہ پارہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں تم پر تھوکتی ہوں۔ اس کمینے باپ پر تھوکتی ہوں

جو اپنی سوتیلی بیٹی سے حرام کاری کرنا چاہتا تھا۔ جاؤ، دفع ہو جاؤ اور جو تم سے ہو سکے، کرلو۔"

"دفع تو میں تجھے کرکے جاؤں گا بڑھیا!" رئیس خان غصے میں بے قابو ہو کر آگے بڑھا اور میری ساس کا گلا دبوچ لیا۔

اب میرے لیے خاموش تماشائی بنے رہنا ناممکن تھا۔

"بس رئیس خان! بس، بہت ہو چکا۔" میں نے ریوالور تانتے ہوئے کہا "اماں کو چھوڑ دو ورنہ میں.... گولی چلا دوں گی۔"

رئیس خان کو اس وقت اس جگہ میری آواز سننے کی توقع بھی نہیں تھی۔ وہ حیرت سے اُچھل کر میری طرف گھوما اور میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر اس کے ہاتھ خود بہ خود میری ساس کے گلے سے ہٹ گئے۔

"یہ کیا نادانی ہے عارفہ!" وہ بولا "تم کیا سمجھ رہی تھیں کہ میں اس کمزور و مجبور عورت کو سچ مچ مارنے لگا تھا۔ وہ تو بس ذرا مجھے غصہ آ گیا تھا، اسے مارنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔"

"مگر میں تمہیں ختم کرنے کا مصمم ارادہ کرکے آئی ہوں۔" میں نے جواب دیا "اب اس دنیا کو تم جیسے شیطان کے وجود سے نجات مل جانا چاہیے۔"

"یہ کیا مذاق کر رہی ہو؟"

"یہ مذاق نہیں حقیقت ہے۔"

"تم مجھ پر گولی نہیں چلا سکتیں۔"

"ذرا کوئی غلط حرکت کرکے دیکھ لو کہ میں کیا کر سکتی ہوں؟"

"تم یہی چاہتی ہو نا کہ میں تمہاری ساس کے تمام قرض معاف کر دوں، اس کا مکان بھی اسے واپس کر دوں اور آیندہ کبھی تم لوگوں کے معاملات میں دخل نہ دوں تو میں تو پہلے ہی ان سب باتوں کے لیے تیار ہو کر آیا تھا۔ مجھے واقعی احساس ہو چکا ہے کہ میں اپنی سوتیلی بیٹی سے شادی...... کرکے ایک بڑے گناہ کا مرتکب ہو رہا ہوں۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے، تم بھی مجھے معاف کر دو۔"

"یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ مرنے سے پہلے تم نے توبہ کرلی، اب یہ اس پروردگار پر ہے کہ وہ تمہیں معاف کرتا ہے یا نہیں مگر میں تمہیں معاف کرنے نہیں، تمہیں تمہارے انجام تک پہنچانے آئی ہوں۔"

اتنا کہہ کر اس سے پہلے کہ رئیس خان اپنے بچاؤ میں کچھ اور کہے یا کچھ کرے میں نے ٹریگر دبا دیا اور پھر لگاتار دباتی چلی گئی۔

☆☆☆

رئیس خان کو ختم کرکے میں اپنے گھر گئی۔ وہاں منصور اور مہ پارہ کو سب کچھ بتایا۔ غسل کیا، لباس تبدیل کیا اور ریوالور ساتھ لے کر قریبی پولیس اسٹیشن پہنچ گئی۔ منصور بھی میرے ساتھ تھا۔

"مجھے گرفتار کرلیجیے انسپکٹر صاحب، آج میں ایک بڑے شیطان کو قتل کرکے آ رہی ہوں، یہ دوسری بات ہے کہ وہ شیطان میرا دوسرا شوہر تھا۔"

منصور نے ساری حقیقت بیان کی۔ وہ پولیس انسپکٹر کوئی شریف انسان تھا، اس نے پوری ہمدردی سے تمام واقعات سنے اور کہا کہ واقعی اس جیسے شیطان کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا۔ آپ اطمینان رکھیں، میں اپنی طرف سے آپ کی والدہ کو کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گا۔ انہیں گرفتار کرکے عدالت میں پیش کرنا میرا فرض ہے جس کے لیے میں مجبور ہوں مگر آپ جب چاہیں ان سے ملاقات کے لیے آ سکتے ہیں۔"

مقدمہ بالکل سیدھا سادا تھا۔ میں اقبالی مجرم تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ کیا حالات تھے جن کے تحت مجھے رئیس خان کا خون کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ عدالت میں میرے وکیل صفائی نے بڑی قابلیت اور مہارت سے میرا مقدمہ پیش کیا۔ عدالت نے بھی رحم سے کام لیا اور مجھے صرف پانچ سال کی سزا سنائی۔ میں تو آزمائش کے بیس کڑے سال گزار چکی تھی۔ یہ پانچ سال کیا حیثیت رکھتے تھے۔ آخر ایک دن یہ بھی ختم ہو گئے اور شاید میرا آخری امتحان بھی۔ میں آزاد ہوئی تو باہر جیل کے دروازے پر منصور اور مہ پارہ ایک پھول سے بچے کو گود میں اُٹھائے میرے استقبال کے لیے موجود تھے۔ انہوں نے میرے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے۔ میں نے انہیں زندہ سلامت دیکھ کر اطمینان کی گہری سانس لیتے ہوئے انہیں گلے سے لگالیا۔ اب آپ سے کیا کہوں، جیل کی سلاخوں کے پیچھے میری سزا کا ایک ایک دن ایک ایک رات اس خوفناک یاد کے تحت گزرا تھا کہ جو کہانی قسمت نے میری ماں کے ساتھ دُہرائی، میرے ساتھ اس کا اعادہ کیا، کہیں وہ تیسری مرتبہ میری بیٹی مہ پارہ پر بھی اسی طرح کی قیامت نہ توڑے کہ شادی کے سال دو سال کے اندر منصور اس سے جدا ہو جائے۔ مگر نہیں، تقدیر کو مجھ پر رحم آ گیا تھا۔ میرے چمن کے تمام پھول میری نظروں کے سامنے لہلہا رہے تھے اور خدا کے فضل و کرم سے وہ آج تک اسی طرح مہک رہے ہیں۔

○○○

کاری

سائیں معراج رسول
السلام علیکم!

ہمارے معاشرے میں آدمی ہم عورتوں کو کس طرح پاؤں کی جوتی بنا کر رکھتے ہیں، اس کی ایک جھلک ہے میری زندگی کی کتھا۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میری سچ بیانی آپ کے سرگزشت کے معیار کی ہے تو اسے ضرور شائع کریں۔ بہت سے لوگوں کو عبرت ہوگی۔

افشاں
(لاڑکانہ)

میں اپنی جان بچانے کے لیے کھیتوں کے درمیان دوڑ رہی تھی۔ پودے مجھے پناہ دے رہے تھے۔ اور دور سے آنے والی ریل کی آواز سمت کا اشارہ کر رہی تھی اور میرے تعاقب میں کچھ لوگ تھے، خونخوار قسم کے جو مجھے مارنا چاہتے تھے۔ ان کے پاس تیز چمکدار کلہاڑیاں تھیں۔ ان لوگوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں ایک میرا سگا بھائی تھا۔ اس کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی اور میرے خون کا سب سے زیادہ پیاسا وہی ہو رہا تھا۔ اسی نے مجھے کاری قرار دیا تھا۔

دوپہر کی گرمی اپنے عروج پر تھی۔ میں نے زندگی میں کبھی ایسی جدوجہد نہیں کی تھی جو اس وقت کر رہی تھی۔ میرا پورا جسم پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ ان مہربان پودوں کے درمیان کہیں لیٹ جاؤں۔

لیکن ایک وحشت ناک موت میرے تعاقب میں تھی اور میں اس طرح بلاوجہ مرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

مجھے ظفر کا بھی خیال آ رہا تھا۔ نہ جانے ان وحشیوں نے اس کا کیا حال کیا ہوگا؟ میں تو پچھلی دیوار پھلانگ کر فرار ہوگئی تھی لیکن یہ نہیں معلوم کہ وہ خود کو بچا سکا تھا یا نہیں۔

وہ لوگ مجھے چاروں طرف سے گھیرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ سات آٹھ افراد تھے، کلہاڑی بردار، میرے خون کے پیاسے جو میرے بھائی کے کہنے پر اپنا دینی اور سماجی فریضہ ادا کرنے کے لیے میری طرف بڑھ رہے تھے۔

میں نے دم لے کر پھر دوڑنا شروع کر دیا۔

میں نہیں جانتی تھی کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ کس طرف جانا تھا۔ بس ایک جان بچانے کی فطری جبلت تھی جو مجھے دوڑائے جا رہی تھی۔ کچھ نہیں معلوم تھا کہ میں بچ نکلوں گی یا ان کے ہتھے چڑھ جاؤں گی۔

بہرحال جان کی حفاظت تو فرض تھا اس لیے میں دوڑتی جا رہی تھی۔ چونکہ میری رفتار ان سے زیادہ تھی اسی لیے میں نے ان لوگوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا۔

اب میں ایک ایسے راستے پر چل رہی تھی جو کچا نہیں بلکہ پختہ تھا۔ یہ ہمارے علاقے کی سڑک تھی جو سیدھی لاری اڈے اور اس کے بعد چھوٹے سے اسٹیشن تک جاتی تھی۔

میں اس وقت پوری طرح ہوشیار تھی۔ میری ساری حسیں کام کر رہی تھیں۔ میں جانتی تھی کہ وہ لوگ میری تلاش میں لاری اڈے یا اسٹیشن تک پھیل گئے ہوں گے کیونکہ میں صرف انہی ذرائع سے یہاں سے باہر جا سکتی تھی۔

میں نے لاری اڈے یا اسٹیشن کا رخ بھی نہیں کیا بلکہ کتراتے ہوئے ریلوے لائن کی دوسری طرف کے کھیتوں میں گھس گئی۔ میرے قد کے برابر پودوں نے مجھے ایک بار پھر پناہ دی تھی۔

وہ مکئی کے پودے تھے جس کی فصل اس وقت اپنے شباب پر تھی لیکن فصل کٹنے کا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔ انہی پودوں کے درمیان مجھے ایک بڑا سا گڑھا نظر آ گیا۔

میں نے اسی گڑھے میں چھلانگ لگا دی تھی۔ وقتی طور پر مجھے پناہ دینے کے لیے وہ ایک مناسب مقام تھا۔ اس وقت دن ڈھلنے کے قریب تھا اور مجھے احساس ہوتا رہا تھا کہ میں کتنی دیر سے اپنی جان بچانے کے لیے دوڑ رہی ہوں۔

کچھ اطمینان سا ہوا تو میں نے اپنے حالات کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔

میرا نام افشاں ہے۔

دو بہنیں اور دو بھائی، ماں باپ۔ تھوڑی بہت زمینیں۔ میں نے انٹر تک تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ میرا قصبہ اچھا خاصا بڑا ہے۔ دو اسکول اور ایک انٹرمیڈیٹ کالج۔ اس کے باوجود یہاں کے لوگوں کے خیالات دقیانوسی ہیں۔ وہی اکڑ اور وحشیانہ پن جن کی خبریں آپ اخبارات میں پڑھا کرتے ہیں۔

میرے قصور کئی تھے۔ پہلا تو یہی تھا کہ میں ایک خوبصورت اور جوان لڑکی تھی۔ اور دوسرا قصور یہ تھا کہ میں نے انٹر تک تعلیم حاصل کر لی تھی اور سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ میں نے ظفر نام کے ایک نوجوان سے محبت کر لی تھی۔

اور شاید یہی وہ قصور تھا جس کی وجہ سے مجھے موت کے قابل سمجھا گیا تھا اور کلہاڑی بردار مجھے مارنے کے لیے آئے تھے۔ ظفر بھی اسی قصبے کا پڑھا لکھا نوجوان تھا۔

اس کے والدین بہت پہلے شہر جا کر آباد ہو گئے تھے۔ قصبے سے ان کا تعلق بہت کم رہ گیا تھا۔ وہ کبھی کبھی چھٹیاں گزارنے کے ارادے سے دس بارہ دنوں کے لیے آیا کرتے۔ ان کا ایک خاصا بڑا مکان اسی قصبے میں تھا جو عام طور پر خالی رہتا تھا۔ اس میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔

اس بار ظفر اکیلا ہی قصبے میں آیا تھا۔ اس کا اپنا مکان تھا۔ جیب میں پیسے تھے اسی لیے کسی بات کی پریشانی نہیں تھی۔ وہ بھی صرف دس بارہ دنوں کے لیے آیا تھا لیکن کسی کو کیا معلوم تھا کہ اس بار قصبے کی زمین اس کے پیروں میں زنجیریں ڈال کر اسے جانے سے روک دے گی۔

اس بار قصبے میں اس کی ملاقات مجھ سے ہو گئی تھی اور وہ پتھر کا ہو کر رہ گیا تھا۔

میں اسے جانتی تھی۔ کئی بار دور سے اسے دیکھ چکی تھی۔ جانتی تھی کہ اس کا نام ظفر ہے۔ میں اس وقت اپنی سہیلی کے یہاں سے اپنے گھر کی طرف جا رہی تھی۔

وہ بھی شاید یونہی گاؤں میں سیر کرتا پھر رہا تھا کہ ہم دونوں ایک گلی میں ایک دوسرے کے سامنے آ گئے تھے۔ اس وقت میں نے ہلکا سا میک اپ بھی کر رکھا تھا اور میرا لباس بھی کچھ جدید طرز کا تھا۔ شاید اسی لیے وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

”اے مسٹر! یہ شہر نہیں ہے۔“ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”یہاں کسی لڑکی کو اس طرح نہیں دیکھتے۔“

”تو پھر کس طرح دیکھتے ہیں؟“ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ضرورت کیا ہے دیکھنے کی۔“ میں نے کہا۔ ”بہتر یہی ہے کہ کہیں اور جا کر ایسی حرکتیں کرو۔“

”کاش کہیں اور جانے کی ہمت اور طاقت رہ جاتی۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔

میں نے پھر کچھ نہیں کہا اور آگے بڑھ گئی۔

لیکن شاید میں اس کے آس پاس ہی کہیں رہ گئی تھی۔ مجھ میں ایسا پہلی بار ہو رہا تھا۔ میں اس کے بارے میں تو جانتی تھی کہ وہ کون ہے۔ کہاں رہتا ہے۔ کیا نام ہے۔ لیکن وہ مجھے نہیں جانتا ہوگا۔

اچانک یادوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

لوگوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مکئی کے کھیت میں کچھ لوگ تھے۔ شاید وہ میری ہی تلاش میں وہاں تک پہنچ چکے تھے۔ میں نے اپنی سانسیں تک روک لیں۔

وہ شاید اسی کھیت میں مجھے تلاش کر رہے تھے۔ اس وقت اندھیرا ہو چکا تھا اور یہ بھی شکر تھا کہ اس طرف کوئی آوارہ کتا نہیں آ نکلا تھا۔ ورنہ وہ بھونک بھونک کر سب کو میری خبر دے دیتا۔

لوگ مجھے آس پاس تلاش کر رہے تھے۔ خدا کو مجھے بچانا تھا اسی لیے ان میں سے کوئی بھی اس گڑھے کی طرف نہیں آیا جہاں میں چھپی ہوئی تھی۔

ایک ایک لمحہ ایک صدی کے برابر محسوس ہو رہا تھا۔

پھر وہ آوازیں دور ہوتی چلی گئیں اور آہستہ آہستہ معدوم ہو گئیں لیکن میں اس گڑھے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ اس طرح نہ جانے کتنے گھنٹے گزر گئے۔

پھر میں خدا کا نام لے کر گڑھے سے باہر آ گئی۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ اندھیرا اور سناٹا۔ بس کبھی کبھی ہوائیں تیز ہو جاتیں تو پودے شور مچانے لگتے تھے۔ اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔

نہ جانے خدا نے مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے پیدا کر دی تھی۔ میں تو اپنے سائے سے بھی ڈرنے والی تھی۔ خاص طور پر اندھیرا تو میری روح فنا کر دیتا تھا۔

میرے ماں باپ نے بہت پیار اور لاڈ سے میری پرورش کی تھی اور اس وقت لاڈ اور پیار کی پلی ہوئی لڑکی ویران کھیت کے اندھیرے میں اکیلی کھڑی ہوئی تھی۔

شاید موت کا خوف ایسا ہوتا ہے کہ وہ ہر خوف سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اس وقت مجھے صرف ایک ہی خوف تھا کہ وہ لوگ کہیں مجھے پکڑ نہ لیں اور میرا جسم کلہاڑیوں سے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائے۔

مجھے یاد آیا کہ میں نے صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں تھا۔

وہاں کھانے کے لیے کیا مل سکتا تھا۔ میں نے اس اندھیرے میں قریبی ایک پودے سے بھٹا توڑ لیا۔ تازہ تازہ دانے والا بھٹا۔ جس کے ہر دانے میں دودھ بھرا ہوا تھا۔ میں نے کبھی کچا بھٹا نہیں کھایا ہوگا لیکن اس وقت وہ میرے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔

بھٹا اگر رسیلا نہیں ہوتا تو شاید مجھے شدید پیاس بھی لگنے لگتی لیکن پیاس ختم ہو گئی تھی اور اب صرف ایک خیال تھا کہ مجھے یہاں سے نکلنا ہے، کہاں؟ یہ میں نہیں جانتی تھی۔

میں نے آہستہ آہستہ ریلوے لائن کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ گھور اندھیرے کے باوجود مجھے ریل کی پٹریوں پر کوئی مہیب سی چیز کھڑی ہوئی دکھائی دے گئی۔

یہ ریلوے کے ڈبے ہو سکتے تھے لیکن مسافروں والے نہیں۔ اگر مسافروں والے ہوتے تو ان میں روشنی بھی ہوتی۔ وہ بالکل تاریک تھے۔

میرا اندازہ قریب جا کر درست نکلا۔ وہ مال گاڑی کے ڈبے تھے۔ مال گاڑی نہ جانے کیوں یہاں کھڑی ہوئی

شمارہ فروری 2012ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش..... آپ کا انتخاب

☆ اول: معراجِ محبت..... ریحانہ (دبئی یو اے ای)

☆ دوم: تعبیر..... افسر حیات..... (لاہور)

☆ سوم: دعا جی بابا..... کمال الدین (کراچی)

پہلے دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بیتی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھی۔ شاید آگے کا سگنل نہیں ملا ہوگا یا کوئی اور بات ہوگی۔

میں ڈبوں کے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ سارے بند ڈبے تھے۔ پھر دو ڈبے ایسے دکھائی دے گئے جن کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ میں خدا کا نام لے کر ایک ڈبے میں داخل ہوگئی۔

ڈبے میں عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔

میرے پیروں کے نیچے سوکھی گھاس تھی۔ شاید وہ جانوروں کا ڈبا تھا لیکن اس وقت خالی تھا۔ میں ہاتھوں کی مدد سے ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھی اور ڈبے کی ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

اس وقت ذہن کی ایسی کیفیت ہو رہی تھی کہ سوچنے سمجھنے کی طاقت بھی نہیں رہی تھی۔ ذہن بالکل شل ہو رہا تھا اور اسی عالم میں مجھے نیند آگئی تھی۔

نہ جانے کب ٹرین روانہ ہوئی؟ کہاں کہاں رکی؟ مجھے کچھ ہوش نہیں تھا۔

لیکن جب آنکھ کھلی تو اچھا خاصا دن نکل آیا تھا۔

اور مال گاڑی کسی بستی کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ یہ اتفاق تھا کہ کسی نے اس ڈبے میں جھانک کر نہیں دیکھا تھا اور اسے چیک کرنے کی کوشش نہیں کی تھی ورنہ نہ جانے کیا ہوتا؟

کہتے ہیں کہ خدا جس کو زندگی دینا چاہتا ہو، اس کو آگ کے دریا سے بھی نکال کر لے جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا اور میں کراچی پہنچ گئی۔

یہ شہر میرے لیے اس لحاظ سے اجنبی تھا کہ میں یہاں صرف ایک بار اپنے ماں باپ کے ساتھ آئی تھی، صرف ایک بار۔ لہٰذا یہاں کے راستے وغیرہ میرے لیے بالکل اجنبی تھے۔

البتہ میرے گاؤں کی ایک لڑکی جو میرے ساتھ اسکول میں بھی تھی۔ شادی کر کے یہیں آگئی تھی۔ اس کا پتا مجھے یاد تھا۔ کیونکہ اکثر اس سے میری خط و کتابت ہوتی رہتی تھی۔

گلبرگ کا علاقہ تھا اس کا۔

اب مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ گلبرگ وہاں سے کتنی دور ہے۔ قسمت ابھی تک تو میرا ساتھ دے رہی تھی۔ میں اسٹیشن سے باہر آنے میں بھی کامیاب ہوگئی تھی۔

نہ جانے کتنی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ ہر شخص پھاڑ کھانے والی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس وقت میں اگر ذرا سا نروس ہو جاتی یا اپنے آپ کو اجنبی ظاہر کرتی تو ہو سکتا تھا کہ کوئی مجھے گھیر لیتا۔

اس وقت میں نے بڑے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ ایک رکشا روکا اور اس سے گلبرگ کا کہہ کر رکشے میں بیٹھ گئی۔ میں نے بہت بڑا رسک لیا تھا۔

اگر گلشن گھر پر نہ ہوتی یا اس نے مکان بدل لیا ہوتا یا پھر اس کا ایڈریس غلط نکلتا تو پھر کیا ہوتا؟ بہرحال جو قسمت میں لکھا تھا۔ وہ تو سامنے آنا ہی تھا۔

لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ گلشن گھر میں تھی اور مجھے دیکھ کر وہ سکتے میں رہ گئی تھی۔ ''افشاں تم...... تم کس طرح آگئیں اور وہ بھی اکیلے؟''

''یہ ایک لمبی کہانی ہے گلشن۔'' میں نے کہا۔ ''فی الحال تم رکشے والے کو کرایہ دے کر فارغ کرو۔''

اس نے رکشے والے کو کرایہ دے کر فارغ کیا اور میرا ہاتھ تھام کر مجھے اپنے کمرے میں لے آئی۔ اس کا شوہر اس وقت دفتر گیا ہوا تھا۔ صرف ایک بیٹا تھا تین سال کا۔

''بتاؤ افشاں۔ کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ؟''

میں نے اسے ساری کہانی سنا دی۔ کچھ بھی نہیں چھپایا تھا۔ ''گلشن۔ میرا قصور صرف اتنا ہے کہ میں نے ظفر کو پسند کر لیا تھا۔ میں نے اسی لیے اس کو گھر بلایا تھا کہ وہ میرے ماں باپ اور بھائی سے مل لے لیکن میری بدقسمتی کہ جس وقت وہ گھر آیا۔ اس وقت گھر میں سوائے میرے اور کوئی نہیں تھا۔ مجھ سے صرف یہ جرم ہوا کہ میں نے اسے بیٹھک میں بلا لیا تھا۔ اسی وقت میرا بھائی آگیا اور اس نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا، کاری کا الزام لگا دیا۔ اس کی آواز سن کر آس پاس کے بھی اور کچھ لوگ آگئے۔ بھائی نے میری ایک نہیں سنی۔ مجھے مارنے کے لیے کلہاڑی نکال لی۔ دوسرے بھی کلہاڑیاں لے کر آگئے تھے۔ پتا نہیں بے چارے ظفر کا کیا ہوا لیکن مجھے فرار کا موقع مل گیا تھا اور در در کی ٹھوکریں کھاتے اور خود کو بچاتے ہوئے تمہارے پاس پہنچ گئی ہوں۔''

''خدا غارت کرے ایسے مردوں کو۔'' گلشن نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ ''اب تم فکر مت کرو۔ تم یہاں آگئی ہو۔ یہ شہر ہے۔ وہ لوگ اب تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ تم اسے اپنا گھر سمجھو۔ اب تم یہیں رہو گی میرے پاس۔''

''اور تمہارے شوہر۔ کیا ان کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟''

''ان سے مل کر تمہارا دل خوش ہو جائے گا۔ تم نے ایسے لوگ بہت کم دیکھے ہوں گے۔''

اس کے بعد یہ ہوا کہ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں روتی چلی گئی۔ اب تک تو رونے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اب تھوڑا سکون ملا تو آنسو امڈنے لگے۔

کیسے کیسے رشتے میں نے کھو دیے تھے۔ ماں باپ اور ایک ظالم بھائی۔ ماں مجھے بہت یاد آرہی تھی۔

گلشن نے میرے لیے ایک کمرا ٹھیک کر دیا تھا۔ میں اس کمرے میں جا کر بستر پر گر گئی۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ میں رات کے دس بجے بیدار ہوئی تھی۔

وہ بھی اس طرح کہ گلشن نے مجھے جھنجوڑ کر اٹھایا تھا۔ ''بس اب اٹھ جاؤ۔ دو دنوں سے بھوکی ہو۔ اشرف بھی کھانے کی میز پر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

''کیا تم نے اپنے شوہر کو سب کچھ بتا دیا۔''

''ظاہر ہے۔ ان سے یہ بات چھپا تو نہیں سکتی نا۔'' گلشن نے کہا۔ ''بس اب تم نہا دھو کر فریش ہو جاؤ۔ میں نے تمہارے لیے کپڑے نکال دیے ہیں۔''

میں جب کھانے کی میز پر پہنچی تو گلشن، اس کا شوہر اور اس کا بچہ تینوں وہاں موجود تھے۔ اشرف نے مسکرا کر میرا استقبال کیا تھا۔

پہلی ہی نظر میں وہ آدمی اچھا لگا تھا۔ شرافت اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی۔ اس کا لہجہ بھی بہت نرم تھا۔ اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ کچھ نہیں پوچھا۔ بس ادھر ادھر کی دلچسپ باتیں کرتا رہا۔

پھر جب کھانے کے بعد چائے آئی تو اس وقت اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''سنیں۔ اب آپ یہاں آگئی ہیں۔ یہ ایک محفوظ جگہ ہے۔ اس گھر کو اب اپنا ہی گھر سمجھیں۔''

''بہت شکریہ آپ کا۔''

''شکریہ تو مجھے اپنی بیوی کا ادا کرنا چاہیے۔ اس کی وجہ سے ایک اچھی صورت دیکھنے کو ملی ہے۔ ورنہ اس کی صورت دیکھ دیکھ کر تو بور ہو گیا تھا۔'' وہ خوش دلی سے بولا۔

''واہ۔ اسی لیے رات دن میری تعریفیں کرتے رہتے ہیں۔''

''پالیسی بھی تو کوئی چیز ہے۔''

میں بھی ہنس رہی تھی۔ کتنا اچھا اور خوش گوار ماحول تھا۔ ایک میرے گھر کے مرد تھے، تنگ نظر، خونی آنکھوں والے۔ جو ذرا ذرا سی بات پر کلہاڑیاں نکال لیتے تھے۔

میں وہاں بہت مزے میں رہ رہی تھی۔ مجھے کسی قسم کی تکلیف نہیں تھی۔ میں نے ایک دن خود اشرف سے کہا۔ ''اشرف صاحب۔ آپ میرا ایک کام کر دیں گے۔''

''کیوں نہیں۔ بتاؤ کیا کام ہے؟''

''آپ مجھے کہیں جاب دلوا دیں۔''

''کیوں؟ جاب کی کیا سوجھ گئی۔''

''بس یونہی۔ میں اپنے طور پر بھی کچھ کرنا چاہتی ہوں۔''

گلشن نے بھی میری تائید کی۔ اس نے اشرف سے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ اس کو کہیں جاب دلوا دیں۔ اس کا دل لگا رہے گا۔''

اشرف کی کوششوں سے مجھے ایک فرم میں ایک مناسب جاب مل گئی تھی۔

زندگی ایک ڈگر پر آتی جا رہی تھی۔ گاؤں کے حالات بھی پتا چل گئے تھے۔ میرے بھائی اور باپ نے ظفر کو بری طرح زخمی کر دیا تھا لیکن وہ اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اس کے بعد اس کا کوئی پتا نہیں تھا۔

اور دوسری خبر یہ تھی کہ میرے گھر والے مجھے تلاش کرتے پھر رہے تھے کیونکہ ان کے انتقام کی آگ ابھی تک بھڑک رہی تھی۔ وہ مجھے مار کر سکون حاصل کر لیتے لیکن میں ان کی دسترس سے دور جا چکی تھی۔ اسی لیے وہ بری طرح تلملائے ہوئے تھے۔

گلشن کے گھر میں سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا کہ ایک شام حالات بالکل بدل گئے۔

جب میں دفتر سے گھر واپس آئی تو میرا باپ اور میرا بھائی دونوں گلشن کے گھر سے باہر نکل رہے تھے۔ میں انہیں دیکھ کر جلدی سے ایک طرف ہوگئی۔

ان کی ٹیکسی کھڑی ہوئی تھی۔ وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر روانہ ہوگئے۔ اس وقت میرے بدن میں جیسے جان ہی نہیں رہی تھی۔ میں لڑکھڑاتے قدموں گھر میں داخل ہوئی۔ گلشن اور اشرف دونوں ہی موجود تھے۔

مجھے دیکھتے ہی گلشن نے مجھے سینے سے لگا لیا تھا۔ ''خدا کا شکر ہے کہ تم ان کے سامنے نہیں آگئیں۔''

''گلشن۔ میں نے انہیں دیکھ لیا تھا۔'' میں نے بتایا۔ ''انہیں دیکھ کر میں ایک طرف چھپ گئی تھی۔''

''بہت غصے میں تھے دونوں۔'' اشرف نے کہا۔ ''تمہیں سارے شہر میں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ یہ گھر

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

انہیں معلوم تھا اسی لئے وہ یہاں بھی چلے آئے۔''

''اب تم دو چار دنوں تک گھر سے مت نکلنا۔'' گلشن جلدی سے بولی۔ ''ہم نے ان سے کہہ تو دیا ہے کہ تم یہاں نہیں آئی ہو۔ لیکن مجھے یقین نہیں کہ انہوں نے میری بات پر بھروسا کرلیا ہوگا۔''

''مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے تم لوگوں کو پریشانی ہورہی ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔ زندگی میں یہ سب تو ہوتا رہتا ہے۔''

وہ دونوں تو اس کے باوجود مجھ سے خلوص برت رہے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں وہاں سے کہیں اور جاؤں۔ لیکن میرا باپ اور بھائی وہاں تک پہنچ چکے تھے اسی لیے میرے ساتھ ساتھ ان دونوں کے لیے بھی خطرہ تھا۔

انہی حالات کے باعث میں نے مناسب سمجھا کہ ان سے الگ ہوجاؤں۔

میری انکم اتنی تھی کہ میں کرائے کا ایک فلیٹ لے سکتی تھی۔ اشرف نے اس سلسلے میں بھی بہت مدد کی اور میں اپنے فلیٹ میں منتقل ہوگئی۔

زندگی ایک بار پھر معمول پر آگئی تھی۔

اس دوران میں ظفر کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم ہوسکا کہ وہ کہاں ہے؟ ہوسکتا ہے کہ اس نے بھی اپنے طور پر مجھے تلاش کرنے کی کوشش کی ہو۔ پھر خاموش ہوکر بیٹھ گیا ہو۔

گاؤں کی خبریں مجھے گلشن ہی سے ملا کرتی تھیں۔ اسی نے یہ خبر سنائی کہ میری ماں کا انتقال ہوگیا ہے۔ میں بہت دیر تک روتی رہی تھی۔ ہوسکتا تھا کہ وہ بے چاری میرے لئے تڑپتی ہو لیکن باپ اور بھائی کے سامنے ایک نہ چلتی ہو۔

ایک دن گلشن میرے پاس ایک عجیب خبر لے کر آئی تھی۔ ''افشاں۔ میں نہیں جانتی کہ اس خبر کو سن کر تمہارا کیا ری ایکشن ہوگا لیکن مکافاتِ عمل شاید اسی کو کہتے ہیں۔''

''کیا بات ہوگئی بتاؤ تو سہی۔''

''گاؤں میں ایک بڑا حادثہ ہوا ہے جس میں تمہارے باپ کی موت واقع ہوگئی اور تمہارے بھائی کی دونوں ٹانگیں کاٹ دی گئی ہیں اور وہ اس وقت کراچی کے سول اسپتال میں ہے۔''

''کیا......؟''

''ہاں۔ قدرت نے تمہاری بے کسی کا بدلہ لے لیا ہے۔''

پتا نہیں میرے لیے یہ خبر افسوس کی تھی، حیرت کی یا خوشی کی؟ میں سوچتی رہی، سوچتی رہی۔ کیا کروں میں؟ عورت کا دل بھی خدا نے عجیب بنایا ہے۔ وہ مجسم پیار ہوتی ہے۔ پیار کے علاوہ اور کچھ جانتی ہی نہیں ہے۔ بھائی نے میری جان لینے کی کوشش کی تھی لیکن اب میں اسے دیکھنے کے لیے بے چین ہورہی تھی۔

بلآخر جب دل نہیں مانا تو میں سول اسپتال پہنچ ہی گئی۔ بھائی کے زخم گرچہ بھر گئے تھے لیکن وہ معذور ہو چکا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں کاٹ دی گئی تھیں۔

لیکن میرے لیے اس کے غصے اور بدمعاشی کا وہی عالم تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے نفرت سے اپنا چہرہ دوسری طرف کرلیا۔ میں اس کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی۔

''کیوں آئی ہے یہاں؟'' اس نے غراتے ہوئے پوچھا۔

''تمہیں دیکھنے کے لیے آئی ہوں بھائی!''

''جا دفع ہوجا۔ تو ایک بدکار عورت ہے۔'' اس نے طیش میں آکر کہا۔

''نہیں بھائی۔ میں بدکار نہیں ہوں۔'' میں نے کہا۔

''بکواس مت کرو۔ دنیا کی ہر عورت بدکار ہوتی ہے۔''

اور یہ لحہ...... میرے لیے یہ ایک ٹرننگ پوائنٹ تھا۔ اس نے صرف میری نہیں بلکہ دنیا کی ہر عورت کی توہین کی تھی۔ اسی لیے میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بھائی۔ اب تم نے پہچان ہی لیا ہے تو تم سے کیا چھپانا۔ ہاں، میں اب ایک بدکردار لڑکی ہوں۔ جانتے ہو۔ اس شہر میں میرے پاس میرا اپنا مکان ہے۔ اپنی گاڑی ہے۔ میں نے صرف دو سال میں یہ سب کچھ بنایا ہے۔ اب تم سمجھ ہی گئے ہوگے کہ یہ سب کیسے بنا ہوگا۔ میں ہر رات کسی کے ساتھ گزارتی ہوں۔''

''نکل جا۔ یہاں سے ذلیل۔''

''جارہی ہوں اور یہ بتا کر جارہی ہوں کہ میں ہر رات کاری ہوتی ہوں، ہر رات۔ اب اگر تم میرا کچھ بگاڑ سکتے ہو تو بگاڑ لو۔ آجانا کسی دن اپنی کلہاڑی لے کر۔ میں انتظار کروں گی۔''

پھر میں اس وارڈ سے اور اپنی پرانی زندگی سے باہر آگئی، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

غریب

جناب ایڈیٹر صاحب

السلام علیکم!

انسان خسارے میں ہے، یہ قول قرآنِ مقدس ہے اس لیے انسان جو کچھ کرتا ہے، اس کے آگے آتا ہے۔ جرم تو ہر حال میں ہے۔ خواہ کتنا ہی عرصہ کیوں نہ گزرجائے۔ قانون تک اسے بھلادے مگر اوپر والی عدالت کسی نہ کسی انداز سے اسے سزا سنادیتی ہے۔ مجھے تو ایک ساتھ دونوں عدالتوں کی سزا ملی ہے۔ میں تہی دست ہوکر جیل میں ایامِ اسیری گزار رہا ہوں۔

کامران

(کراچی)

میں نے اپنے قد سے بڑی بات کہہ دی تھی لیکن بات کہہ دی تھی۔

''میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم دونوں ایک ہوجائیں؟'' یہ بات میں نے اس لڑکی سے کہی تھی جس کے باپ کا میں ڈرائیور تھا۔ اس لڑکی کو کالج لے کر جانا اور کالج سے لے کر آنا بھی میری ڈیوٹی میں شامل تھا۔

اس گستاخی کا جو جواب ملنا تھا، وہ یہی ہوسکتا تھا۔

''تمہیں معلوم ہے تم کیا کہہ رہے ہو اور اس کا نتیجہ کیا ہوسکتا ہے؟''

''نتیجہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن یہ مجھے معلوم ہے کہ میں نے مناسب بات کہہ دی ہے لیکن جو سچ ہے، میں وہی کہہ سکتا تھا۔''

''مت بھولو کہ تم میرے نوکر ہو۔ میرے ڈیڈی تمہیں دو ہزار روپے تنخواہ دیتے ہیں۔'' (یاد رہے کہ پندرہ بیس سال پہلے یہ تنخواہ بہت ہوتی تھی)

''میرا قصور کیا صرف یہی ہے کہ میں غریب ہوں؟''

''غریب!'' اس نے حقارت سے کہا تھا ''تمہاری تنخواہ میرا ہفتے بھر کا خرچ بھی نہیں اٹھا سکتی۔ اور سنو! مجھے اتنی ڈرائیو تو آتی ہے کہ گاڑی لے کر گھر پہنچ جاؤں۔ اترو اور بس میں بیٹھ کر اپنے گھر چلے جاؤ جو تمہاری اوقات ہے۔ میں ڈیڈی سے کہہ دوں گی کہ میں نے تمہیں نوکری سے نکال دیا ہے۔''

''اگر میں غریب نہ ہوتا تو پھر بھی تمہارا یہی جواب ہوتا...؟''

WWW.PAKSOCIETY.COM

"جب کی بات اور ہوتی۔ تمہارے پاس دولت ہوتی تو تم میری ڈرائیوری نہ کررہے ہوتے۔"

"اگر میرے پاس دولت آجائے؟"

"جاؤ، درختوں پر نوٹ لگے ہوئے ہیں۔ شاخیں ہلاؤ اور دولت مند بن جاؤ۔ فی الحال تو یہ کرو، گاڑی سائیڈ میں لگاؤ اور چلتے بنو۔"

میں نے گاڑی ایک سائیڈ پر لگادی اور گاڑی سے اُتر گیا۔ مجھے اُتار کروہ خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"شازیہ، اب ایک بات تم بھی غور سے سن لو! میں اس وقت تک تمہیں منہ نہیں دکھاؤں گا جب تک اپنی غربت دور نہیں کرلیتا۔ اس سے بڑی گاڑی میں بیٹھ کر آؤں گا، میرا انتظار کرنا۔"

میں کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن اس نے گاڑی آگے بڑھادی تھی۔

☆☆☆

میں نے میٹرک پاس کرلیا تھا۔ آگے پڑھنے کی استطاعت تھی نہ شوق تھا۔ کوئی بڑا بھی سر پر نہیں تھا جس کا خوف مجھے پڑھنے پر مجبور کردیتا۔ ایک اماں تھیں، ان کے نزدیک یہی بہت تھا کہ میں نے میٹرک پاس کرلیا ہے۔ محلے کے دو ایک بزرگوں نے کہا بھی کہ دن میں کہیں نوکری کرلو اور کسی نائٹ کالج میں داخلہ لے کر تعلیم آگے بڑھاؤ۔ ان بزرگوں سے میں نے یہی کہا کہ نوکری مل جائے پھر یہی کروں گا۔ کاش! میں اس وقت ان کی بات مان لیتا۔

سب لوگ میرے ہمدرد تھے۔ میرے بھلے کے لیے نوکری تلاش کرنے لگے۔ ان دنوں آج کل کی طرح حال نہیں تھا۔ میٹرک کی بھی کچھ نہ کچھ اہمیت تھی لیکن میری قسمت کا چکر تھا کہ بات بن ہی نہیں رہی تھی۔ پھر انہوں نے مشورہ دیا کہ میں ٹائپنگ سیکھ لوں تو نوکری جلدی مل جائے گی۔ ٹائپنگ نئی چیز تھی۔ مجھے دلچسپی ہوئی اور میں ٹائپنگ سیکھنے بیٹھ گیا۔ سیکھ چکا تو پھر نوکری کی تلاش ہوئی۔ ایک سال اسی تگ ودو میں گزر گیا اور پھر بالآخر مجھے نوکری مل گئی۔

نوکری ملتے ہی میں یہ وعدہ بھول گیا کہ مجھے نائٹ کالج میں داخلہ لینا ہے۔ نوکری کے بعد تو میں کچھ زیادہ ہی خود مختار ہوگیا تھا۔ اب تو اماں بھی مجھے کچھ کہتے ہوئے ڈرتی تھیں۔ میری حوصلہ افزائی ہوئی تو میں اس آزادی کا فائدہ اٹھانے لگا۔ فلموں کا ایسا شوق ہوا کہ روزانہ نو سے بارہ کا شو دیکھ کر ہی گھر میں گھستا تھا۔ ہفتے کی رات تو پوری کی پوری دوستوں ہی میں بسر ہوجاتی تھی۔

جہاں میں کام کرنے لگا تھا، وہاں کے سیٹھ کا لڑکا تھا۔ اس کا نام سلیمان تھا۔ میرا ہی ہم عمر تھا۔ کبھی کبھی آتا تھا تو میرے پاس آکر بیٹھ جاتا تھا۔ ہم دونوں میں جلد ہی دوستی ہوگئی۔ اسے بھی میری طرح فلموں کا چسکا تھا۔ اس نے ایک دن آفر کی کہ میں اس کے ساتھ فلم دیکھنے چلوں۔ مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ اس کی شاندار گاڑی میں بیٹھ کر میں فلم دیکھنے چلا گیا۔ ٹکٹ کے پیسے بھی اسی نے بھرے تھے۔

پھر ہر دوسرے تیسرے دن کا یہی معمول بن گیا۔

سلیمان سے دوستی کے بعد میرے سارے دوست چھوٹ گئے۔ اب تو وہ آفس ٹائم میں بھی آجاتا تھا اور مجھے اُٹھا کر لے جاتا تھا۔ ہم یونہی بے مقصد گاڑی دوڑاتے پھرتے تھے۔ اس کی سنگت میں، میں نے بھی گاڑی چلانی سیکھ لی تھی۔ ایک دو مرتبہ میں اس سے گاڑی مانگ کر لے آیا۔ اماں کو بٹھا کر سیر کرائی تو وہ بھی خوش ہوگئیں۔

دفتر کے لوگوں کو معلوم تھا کہ سلیمان سے میری کیسی دوستی ہے لہٰذا سب مجھ سے ڈرنے لگے تھے۔ میری بادشاہت تھی۔ اب میرے دفتر آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ جس وقت جی چاہتا چھٹی کرلیتا۔ کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔

فلموں کے شوق کے ساتھ ساتھ اب ایک اور شوق نے بھی ہم دونوں کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ یہ شوق تھا لڑکیوں کے پیچھے گھومنے کا۔ وہ گاڑی لے آتا اور ہم دونوں کسی گرلز کالج کے سامنے جاکر کھڑے ہوجاتے۔ بس اسی شوق نے ہماری دوستی میں دراڑ ڈال دی۔

میں تو لڑکیوں کو صرف دیکھ کر ہی بہل جاتا تھا لیکن سلیمان کے حصے میں واقعی ایک لڑکی آگئی۔ اب سلیمان کو میرا وجود کھٹکنے لگا تھا۔ وہ اس لڑکی کے ساتھ اکیلے گھومنا چاہتا تھا اس لیے مجھے نظر انداز کرنے لگا۔ میں بھی اس کی مجبوری سمجھ رہا تھا اس لیے میں نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔

سلیمان دوستی کا حق اتنا ضرور ادا کررہا تھا کہ کبھی کبھی مجھے لے کر آخری شو دیکھنے چلا جاتا تھا لیکن اب اس میں پہلے جیسی گرم جوشی نہیں تھی۔ میرے ساتھ بھی ہوتا تو اس لڑکی کی باتیں کرتا رہتا تھا۔ مجھے کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔ میں نے ایک آدھ مرتبہ اس کے ساتھ فلم ہاؤس جانے سے انکار کردیا تو وہ بھی کھنچ گیا۔

اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا کہ اس لڑکی کا اس سے دل بھر گیا۔ غضب یہ بھی ہوگیا کہ وہ ایک روز مجھے بازار میں مل گئی۔ جانتی تو تھی، مجھے دیکھ کر رک گئی۔ ہم کھڑے کھڑے باتیں کرنے لگے۔ سلیمان اسی طرف سے گزر رہا تھا۔ اس نے نہیں دیکھ لیا، یہ اس نے مجھے بعد میں بتایا تھا۔

دوسرے دن میں دفتر گیا تو وہ مجھے اُٹھا کرلے گیا۔ میری وضاحت کے باوجود وہ یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ وہ اتفاقیہ مجھ سے مل گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں اس سے ملتا رہتا ہوں اور میں نے ہی اسے سلیمان کے خلاف بھڑکایا ہے۔ تلخ کلامی اتنی بڑھی کہ اس نے مجھے مارنا شروع کردیا۔ وہ میرے مالک کا بیٹا تھا۔ میرا ہاتھ اس پر کیسے اُٹھ سکتا تھا۔ خاموشی سے پٹتا رہا۔ بڑی مشکل سے لوگوں نے میری جان اس سے چھڑائی۔ وہ گاڑی لے کر چلتا بنا اور مجھے رکشا کرکے گھر آنا پڑا۔ میری حالت اس وقت ایسی نہیں تھی کہ دوبارہ دفتر جاتا۔

مجھے اپنی چوٹوں کی تکلیف نہیں تھی، افسوس اس کا تھا کہ سلیمان نے مجھ پر شک کیا۔ پھر بھی دل کو تسلی دے رہا تھا کہ سلیمان کا غصہ اُترے گا تو اسے خود افسوس ہوگا کہ اس نے کیا حرکت کی ہے۔ میں خود آگے بڑھ کر اسے منالوں گا۔

دوسرے دن میں نے جان بوجھ کر چھٹی کی کہ سلیمان کا غصہ اُتر جائے۔ اگلے دن میں دفتر گیا اور اس امید پر گیا کہ اب سلیمان سے صلح صفائی ہوجائے گی لیکن ہوا یہ کہ چوکیدار نے مجھے اندر ہی نہیں گھسنے دیا۔ اس کا کہنا تھا سلیمان صاحب نے منع کردیا ہے۔

"میں اس کا نوکر نہیں ہوں، مجھے منیجر صاحب سے ملنے دو۔"

وہ اس پر بھی تیار نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے وہ اس پر تیار ہوا کہ منیجر صاحب کو میرے آنے کی اطلاع کردے۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس میں لکھا تھا، مجھے نوکری سے نکال دیا گیا ہے۔

میں کیا کرسکتا تھا۔ پندرہ دن کی تنخواہ بھی میری باقی تھی۔ وہ بھی ماری گئی اور میں ایک مرتبہ پھر بے کار ہوگیا۔

میں نے اماں کو کچھ نہیں بتایا۔ انہیں دکھانے کے لیے صبح گھر سے نکل جاتا تھا۔ یہ بہانہ کب تک چلتا مجھے اماں کو بتانا پڑا لیکن صرف یہ بتایا کہ میری نوکری چھوٹ گئی ہے۔ یہ تسلی بھی دے دی کہ بہت جلد دوسری نوکری مل جائے گی۔

میرے پڑوس میں ایک لڑکا آفاق رہتا تھا۔ لڑکا کیا مجھ سے پانچ چھ سال بڑا تھا۔ میں اگر چوبیس کا تھا تو وہ تیس کا تو ہوگا۔ کسی جگہ ڈرائیور تھا۔ اپنے سیٹھ کی گاڑی لے کر ٹھاٹ سے گھوما کرتا تھا۔ میں نے اس سے بھی کہہ رکھا تھا کہ اپنے سیٹھ سے کہہ کر میرے لیے کسی نوکری کا بندوبست کرے۔

ایک دن وہ مجھ سے کہنے لگا "یار، ایک جگہ نوکری نکلی تو

شہر بابک سے ہم ایک چھوٹے سے دیوار بند گاؤں رباط میں آئے جو صوبہ کرمان کی مغربی حد پر واقع ہے۔ فاصلہ اٹھائیس میل ہے اور ایک بڑی سڑک ایک کشادہ میدان سے یہاں تک آتی ہے جس میں بہت سے دیہات ہیں اور تمباکو اور گلاب کی بہت کاشت ہوتی ہے۔ اس وقت گلاب جوبن پر تھے اور ہمارا راستہ معطر و معنبر تھا۔ کاشت کار شگفتگی سے پہلے ہی بعض کو عرق کے لیے توڑ لیتے ہیں اور اس سے بھی پہلے غنچوں کو مربہ جات کے لیے چن لیتے ہیں۔ یہاں کا تمباکو دنیا میں نرم ترین اور بہترین سمجھا جاتا ہے۔ اسے عموماً غلطی سے شیرازی تمباکو کہتے ہیں حالانکہ شیراز میں پیدا ہونے والا تمباکو نہ اتنا نفیس ہوتا ہے نہ ایسا خوش ذائقہ۔ میرے ساتھیوں کو صوبہ کرمان چھوڑنے کا افسوس تھا کیونکہ ہمارے پاس شہزادے کا پروانہ تھا جس کے تحت وہ اپنے اور اپنے جانوروں کے لیے سرسات کا تقاضا کرسکتے تھے۔ سرسات ایک قسم کا الاؤنس ہے جسے مسافر وغیرہ سرکاری حکم کے تحت اہلِ دیہہ و شہر پر عائد کرسکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ رقم مالیے سے منہا کردی جاتی ہے۔

لیفٹیننٹ ہنری پوٹنگر کے 1816ء میں لکھے گئے "سفر نامہ بلوچستان اور سندھ" سے اقتباس

تلاش: اظہر جمیل صدیقی، کراچی

ہے لیکن تو ٹھہرا میٹرک پاس اور نوکری ہے ڈرائیوری کی۔ ہوتے تو ہیں اس نوکری کے ٹھاٹ۔ صاحب کو لے گئے، صاحب کے گھر والوں کو چھوڑ آئے۔ خالی وقت میں گاڑی گھر بھی لے آئے جیسے میں لے آتا ہوں لیکن سوال پھر وہی آتا ہے کہ تو پڑھا لکھا بندہ ہے۔ یہ نوکری تیرے لائق نہیں ہے۔"

"یار، بے کار پھرنے سے تو اچھا ہے۔ وہ تو خوش ہوجائیں گے کہ پڑھا لکھا ڈرائیور مل گیا۔ تو بات کرلے میرے لیے۔"

"ایک بات اور بھی تو ہے۔ تجھے ڈرائیونگ آتی کہاں ہے۔"

"کس نے کہہ دیا۔ کسی دن لے آ گاڑی، دکھاتا ہوں تجھے چلاکر۔"

"لائسنس ہے تیرے پاس؟"

"وہ تو نہیں ہے۔"

"نوکری ایسے ہی مل جائے گی؟ سب سے پہلے تو وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

لائسنس دیکھیں گے تیرا۔"

قصہ مختصر یہ کہ آفاق مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ میں نے ٹیسٹ دیا اور مجھے لائسنس مل گیا اور یوں مجھے شازیہ کے گھر ڈرائیور کی نوکری مل گئی۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تکلف نہیں کہ میں نے شازیہ کو پہلے دن ہی پسند کرلیا تھا۔ میں لڑکیوں کے معاملے میں ندیدہ نہیں ہوں۔ شازیہ سے مجھے واقعی پہلی نظر میں محبت ہوگئی تھی۔ میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ اس گھر میں زندگی بھر نوکری کرتا رہوں گا تاکہ شازیہ مجھے دیکھنے کو ملتی رہے۔

شازیہ کے والد کوئی زیادہ رئیس آدمی نہیں تھے۔ ایک چھوٹی سی گارمنٹ فیکٹری کے مالک تھے لیکن میرے لیے تو وہ سیٹھ ہی تھے۔ ان کی کوٹھی نہایت شاندار تھی۔ دو دو گاڑیاں تھیں۔

مجھے نوکری دیتے وقت ان کا صرف ایک ہی اعتراض تھا کہ میری عمر زیادہ نہیں۔ نوجوان ڈرائیور رکھتے ہوئے لوگ ہچکچاتے تو ہیں جبکہ انہیں معلوم تھا کہ شازیہ کو کالج میں ہی چھوڑ کر آیا کروں گا۔ آفاق نے میری نیک چلنی کی ضمانت لی۔ میں نے بھی قسمیں کھا کر اپنی شرافت کا یقین دلایا۔ میں اماں کو بھی ان کے پاس لے کر گیا۔ انہوں نے شازیہ کی والدہ کو شیشے میں اتارا اور یوں مجھے نوکری مل گئی۔

میں نے شازیہ کی محبت میں ایسی دلجمعی سے کام کیا کہ سیٹھ صاحب کا دل جیت لیا۔ شازیہ بھی مجھ سے بہت خوش تھی۔ ایسے ڈرائیور سے کون خوش نہیں ہوگا جس نے چھ مہینے میں ایک بھی چھٹی نہ کی ہو۔ ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد بھی گھنٹوں ان کے گھر پر گزار دیتا کہ شاید شازیہ کو کہیں جانا ہو۔ قربت کے کچھ لمحات اور میسر آجائیں۔

میں بتا چکا ہوں کہ مجھ سے ضبط نہ ہوسکا اور میں دل کی بات زبان پر لے آیا۔ اس کی پاداش میں مجھے نوکری سے ہاتھ دھونے پڑ گئے اور میں یہ کہہ کر اس سے جدا ہوگیا کہ جب تک میں اپنی غربت دور نہیں کرلوں گا، اس کے سامنے نہیں آؤں گا۔

☆☆☆

جگہ جگہ ٹھوکریں کھانے کے بعد مجھے اندازہ ہوگیا کہ غربت دور کرنا تو درکنار غربت سنبھالنے کی بھی مجھ میں سکت نہیں۔ امید ہزاروں کی بھی نہیں تھی اور جمع کرنے تھے لاکھوں۔ اب مجھے پچھتاوا ہو رہا تھا کہ شازیہ کو حاصل کرنے کی جلدی میں اسے دیکھتے رہنے سے بھی گیا۔ مجھے چاہیے تھا کہ پہلے اس کے دل میں جگہ بناتا۔ جو بات میں نے کہی، اسے نہ کہتا۔ میں یہ بھی کوشش کرتا تھا کہ اسے بھول جاؤں لیکن شاید یہ میرے اختیار میں نہیں تھا۔ اسے جتنا بھلاتا تھا، اتنی ہی یاد آتی تھی۔

جب انسان جائز طریقے سے نہیں کما سکتا تو ناجائز کا خیال آتا ہے۔ یہی میرے ساتھ ہوا۔ میں نے ایک کھلونا پستول خرید لیا۔ اب سنسان راستے میری نوکری تھے۔ میں نے اماں سے کہہ دیا تھا کہ مجھے اب جو نوکری ملی ہے وہاں رات کو جانا پڑے گا۔ اماں مجھے نصیحت کرنے لگی تھیں کہ بیٹا، محنت ہی میں عظمت ہے۔ دن میں ہو یا رات میں۔

مجھے پہلے ہی رات بڑی محنت کرنی پڑی تھی۔ سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے ایک سنسان جگہ کسی شکار کے آنے کا انتظار کرنا پڑا تھا۔ پھر ایک آدمی آتا دکھائی دیا تھا۔ میں اچانک اس کے سامنے آگیا تھا۔ وہ اتنا ڈرپوک ثابت ہوا تھا کہ میری ایک ہی دھمکی میں اس نے اپنا پرس اور گھڑی میرے حوالے کردی تھی۔

اس کے پرس سے دو ہزار نکلے تھے۔ ایک مہینے کی تنخواہ چند گھنٹوں میں مل گئی تھی۔ مجھے اور کیا چاہیے تھا۔ میں ان وارداتوں میں مشغول ہوگیا۔ اس کام میں خطرہ تھا لیکن کمائی بھی تھی۔ میں اس کام میں لگا رہا لیکن چھ مہینے بعد ہی اندازہ ہوگیا کہ قطرہ قطرہ کرکے برسوں میں بھی خزانہ جمع نہیں کرسکتا۔ گھر کا خرچ بھی ان پیسوں ہی سے چل رہا تھا۔ چھ مہینے بعد چند ہزار کے سوا میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ یہ وارداتیں ایک ہی علاقے میں کھڑے ہو کر کرتا رہا تھا لہٰذا پولیس حرکت میں آئی اور بڑی آسانی سے مجھے دبوچ لیا گیا۔ مجھے چھ مہینے کی سزا ہوگئی۔

اماں مجھ سے جیل میں ملنے آئیں تو ان کا رونا مجھ سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے انہیں یقین تو دلا دیا تھا کہ مجھے غلط پکڑا گیا ہے لیکن میں خود تو جانتا تھا کہ میں مجرم ہوں۔ میں نے اماں کی حالت دیکھ کر اپنے دل میں عہد کیا تھا کہ آئندہ یہ کام نہیں کروں گا۔

کہتے ہیں جیل مجرموں کی نرسری ہے۔ قیدی اپنے اپنے تجربے ایک دوسرے کے حوالے کرتے ہیں۔ دوستیاں ہوتی ہیں، جب یہ دوست جیل سے نکلتے ہیں تو جرم کی کئی داستانیں پھر جنم لیتی ہیں۔ جیل پہنچتے ہی میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوگئی۔ اس کا نام کچھ بھی ہو، جیل میں سب لوگ اسے طوفان کہتے تھے۔

طوفان نے مجھ سے پوچھا تھا "ابے کس جرم میں اندر آیا ہے؟"

مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آتی تھی کہ میں لوگوں کو لوٹتا رہا

ہوں۔ میں نے سر جھکا کر شرمندگی کے انداز میں کہا تھا "ایک لڑکے سے جھگڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کے چاقو مار دیا، بچ گیا سالا۔"

"ابے تو، تو بڑے کام کا ہے۔ نرکا بچہ ہے، خوب ہاتھ پاؤں نکالے گا۔" اس نے میرے شانے تھپتھپائے اور پھر وہ مجھ پر مہربان رہنے لگا۔

میری ہمت نہیں ہوئی تھی کہ میں اس سے یہ پوچھتا کہ تم کس جرم میں اندر آئے ہو۔ دوسرے قیدیوں سے معلوم ہوا کہ نہایت خطرناک آدمی ہے۔ کئی قتل کرچکا ہے لیکن اس کے پیچھے کچھ ایسے لوگ ہیں کہ ہمیشہ صاف بچ جاتا ہے۔ اس مرتبہ بینک ڈکیتی میں پکڑا گیا ہے لیکن ابھی مقدمہ چل رہا ہے۔ دیکھ لینا صاف بچ کر نکل جائے گا۔ اور بھی کچھ قانونی باتیں ان قیدیوں نے کی تھیں جنہیں سمجھنے کی مجھے ضرورت نہیں تھی۔

میں اس سے ڈرنے لگا تھا اس لیے ہر وقت اس کی خوشامد میں لگا رہتا تھا۔ اس کو بھی مجھ پر رحم سا آنے لگا تھا۔ مجھے ملامت کرتا رہتا تھا کہ میرا اتنا بڑا دل ہے کہ کسی کے چاقو مار سکتا ہوں اور پھر بھی جیل کے جیب کترے قیدیوں سے ڈرتا رہتا ہوں۔ اسے میری ماں پر بھی رحم آتا تھا۔

وہ کہا کرتا تھا "ابے جیل آنا تھا تو اپنی ماں کو اتنا کما کر دے آتا کہ وہ آرام سے بیٹھ کر کھاتی۔"

میں کہا کرتا تھا "طوفان بھائی، غریب لوگ صبح کماتے ہیں، شام تک خرچ کردیتے ہیں۔ کہاں سے دے آتا نہ جانے میری ماں کہاں سے کھا رہی ہوگی۔" اور میں رونے لگتا تھا۔

وہ جھنجلا کر کہتا تھا "ابے تم لوگ غریب اس لیے ہو کہ رونے بیٹھ جاتے ہیں۔"

طوفان کے بڑے لمبے ہاتھ تھے۔ میرے آنے کے دو مہینے بعد ہی اس کا مقدمہ خارج ہوگیا تھا اور اسے جیل سے رہائی مل رہی تھی۔

اس نے مجھے گلے سے لگاتے ہوئے کہا تھا "اگر کبھی غربت سے تنگ آجاؤ تو میرے پاس چلے آنا۔ ایسی ترکیب بتاؤں گا کہ دولت میں کھیلو گے۔ اس پرچے پر میرا ایڈریس لکھا ہوا ہے، بلا کھٹکے آجانا۔"

اس کے چلے جانے سے میں بہت اداس ہوگیا تھا۔ طوفان کی وجہ سے دوسرے قیدی میری عزت کرنے لگے تھے اس لیے شب و روز آسانی سے کٹ گئے۔ پھر وہ دن بھی آگیا کہ میں جیل سے باہر نکلا۔ گھر پہنچا تو اماں سے گلے لگ کر خوب رویا۔ اماں کو یقین تھا کہ میں بے قصور ہوں۔ وہ ان

مولانا چراغ حسن حسرت

اعلیٰ پائے کے انشاپرداز، صحافی، مزاح نگار اور شاعر تھے۔ انہیں اردو اور فارسی زبان و ادب پر عبور تھا۔ وہ کشمیر میں بارہ مولا کے قریب ایک گاؤں بمیار میں شیخ بدرالدین کے ہاں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اردو اور فارسی میں اپنے والد سے حاصل کی۔ بی اے تک کالج میں زیر تعلیم رہے مگر سند حاصل نہ کرسکے۔ 1925ء میں کلکتہ کے "عصر جادید" میں نائب مدیر کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا اور ایک ہی ماہ میں اس کے مدیر بن گئے۔ لاہور آئے تو مولانا ظفر علی خان کے ساتھ "زمیندار" میں کام کرنے لگے۔ آزادی کے بعد روزنامہ "امروز" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اس میں وہ "سندباد جہازی" کے نام سے طنز و مزاح کا کالم لکھتے تھے۔ ان کی تحریر میں چھوٹے چھوٹے چٹکلوں کی بھرمار ہوتی۔ وہ بات سے بات نکالنے کا فن بخوبی جانتے تھے۔ ان کی معلومات کا دائرہ وسیع تھا۔ مصوری کے رموز بھی جانتے تھے۔ مذاہب عالم اور خصوصاً اسلام پر ان کی نظر وسیع تھی۔ تاریخ کا گہرا مطالعہ رکھتے تھے۔ جس موضوع پر بھی بات چھڑتی، وہ اس پر بے تکان بولتے چلے جاتے۔ صحافت کے ہر شعبے کا تجربہ رکھتے تھے۔ انہوں نے اخبارات میں مترجم سے مدیر تک کے فرائض انجام دیے۔ 26 جون 1955ء کو حسرت قیلولہ کررہے تھے کہ اسی دوران اس دنیا سے چل بسے۔

مرسلہ: فتح عالم خورشید، کراچی

کلہوڑے ایک مذہبی فرقہ تھے اور عباسی الاصل ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ 1530ء کے بعد انہوں نے سندھ میں مذہب کے نام پر محصول لگانے شروع کردیے۔ حتیٰ کہ لوگ استحصال سے تنگ آکر سینہ سپر ہوگئے اور تقدس کے باوجود ان کے سردار کو مار دیا اور اس کے پیروؤں کو قلات بھگا دیا۔ بعد میں وہ شہنشاہ ہند کی اجازت سے واپس آگئے اور اس دفعہ بتدریج زور پکڑتے پکڑتے ٹھٹھہ پر قابض ہوگئے۔

لیفٹیننٹ ہنری پوٹنگر کے 1816ء میں لکھے گئے "سفرنامہ بلوچستان اور سندھ" سے اقتباس

تلاش: اظہر جمیل صدیقی، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

لوگوں کو بددعائیں دے رہی تھیں جنہوں نے مجھے پھنسوایا تھا۔ آنسو خشک ہوئے تو یہ سوچنے بیٹھ گیا کہ اب گھر کا چولہا کیسے جلے گا۔ میں نے لوگوں کو لوٹ لوٹ کر جو پیسے اماں کے پاس جمع کرائے تھے، وہ کب کے خرچ ہو چکے تھے۔ مجھے بھی جیل میں رہ کر نصیحت ہو گئی تھی، تہیہ کر لیا تھا کہ اب خطرے والا کوئی کام نہیں کروں گا۔ اور شازیہ......؟ جب یہ خیال آتا تھا تو ہمت ٹوٹ جاتی تھی۔ نوکری کر کے تو اتنی دولت جمع نہیں کر سکتا تھا کہ شازیہ کو حاصل کر لوں۔

اسے دیکھے بہت دن ہو گئے تھے۔ میں اس کے کالج کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی گاڑی کالج کے گیٹ سے نکل رہی تھی۔ اس نے کوئی نیا ڈرائیور رکھ لیا تھا۔ وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی قسم نہیں توڑی۔ اس کے سامنے نہیں آیا۔ بس دور ہی سے ایک جھلک دیکھ لی۔ یہ دیکھنا ہی غضب ہو گیا۔ میری ساری ایمانداری پانی میں بہہ گئی۔ کچھ بھی ہو جائے میں دولت جمع کروں گا اور شازیہ کو حاصل کر کے رہوں گا۔ مجھے اتنا ہوش بھی نہیں رہا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ ہوش آیا تو میں طوفان کے دیے ہوئے ایڈریس پر کھڑا تھا۔ یہ ایک شاندار بنگلا تھا۔ دروازے پر چوکیدار بھی کھڑا تھا۔ کئی گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ طوفان یہاں رہتا ہوگا، یہ ماننے والی بات ہی نہیں تھی۔ پھر بھی میں نے چوکیدار سے پوچھ ہی لیا۔

"طوفان صاحب یہیں رہتے ہیں؟"

"آپ کون ہیں؟"

"میں جو بھی ہوں۔ میں جو پوچھ رہا ہوں، وہ بتاؤ۔ ایڈریس تو انہوں نے یہی دیا تھا۔"

"کس نے ایڈریس دیا تھا؟"

"طوفان صاحب نے۔"

"آپ اپنا نام بتاؤ۔ ان سے پوچھ کر بتانا پڑے گا کہ آپ کو اندر بھیجنا بھی ہے یا نہیں؟"

"میرا نام کامران ہے۔ ان سے کہنا جیل والا کامران۔"

چوکیدار اندر چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کا لہجہ ہی بدل چکا تھا۔ وہ مجھے لے کر اندر چلا گیا اور ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ طوفان اس کمرے میں ہے۔

یہ بنگلا دراصل ایک عالی شان جوا خانہ تھا۔ یہ طوفان کی ملکیت نہیں تھا بلکہ وہ اس کی نگہداشت کے لیے یہاں ملازم تھا۔ طوفان سے ملاقات کے بعد جب مجھے ان لوگوں کے نام معلوم ہوئے جن کے اس جوئے خانے کے پیچھے ہاتھ تھے تو میں حیرت زدہ رہ گیا۔ کیسے کیسے باعزت لوگوں کے نام اس فہرست میں شامل تھے۔ مجھے اپنی غربت پر ترس آنے لگا تھا۔ ہم غریب لوگ عزت کے لیے فاقے کاٹتے ہیں اور یہ لوگ سب کچھ کر کے بھی باعزت ہیں۔

مجھے توقع نہیں تھی لیکن طوفان مجھ سے بڑے تپاک سے ملا۔ وہ جانتا تھا کہ میں یہاں جوا کھیلنے تو آ نہیں سکتا۔ کوئی کام ہی ہوگا جو مجھے کھینچ لایا ہوگا۔ اس نے بغیر وقت ضائع کیے مجھ سے پوچھ لیا۔

"تو بتا کیسے آنا ہوا؟"

"طوفان بھائی، میں دولت کمانا چاہتا ہوں۔"

"ارے واہ، میرے مٹی کے شیر۔ یہ کی نا تو نے مردوں والی بات۔ بول کتنی دولت چاہیے تجھے؟"

"دولت جتنی بھی ہو وہ کم ہوتی ہے۔"

"میرے ساتھ مل کر کام کرے گا؟"

"تم جو کہو گے کرنے کو تیار ہوں، مجھے دولت چاہیے اور جلدی چاہیے۔"

"تو پھر آ جا کل سے۔"

"اس جوئے خانے میں نوکری دلواؤ گے؟"

"ابے یہاں سے کیا ملتا ہے، یہ تو میرا سائڈ بزنس ہے۔ میں تجھے اصل بزنس میں لگاؤں گا۔ جی داری دکھائی تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔"

مجھے یوں لگا جیسے شازیہ میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی ہے۔ پھر اس نے میرے ہاتھوں میں ہاتھ دے دیا ہے۔ مجھ سے کہہ رہی ہے، تم نے جو کہا تھا، وہ کر دکھایا۔

طوفان نے مجھے چھوٹی چھوٹی وارداتوں پر لگا دیا تا کہ میرا ڈر نکل جائے۔ ایسی وارداتیں میں پہلے بھی کرتا رہا تھا اس لیے میری کارکردگی طوفان کے لیے باعث حیرت تھی۔

گھروں میں چوریاں کرنے اور اکیلے دوکیلے راہ گیروں کو لوٹتے ہوئے مجھے چھ مہینے ہو گئے تھے۔ اس عرصے میں، میں نے اچھا خاصا مال کما لیا تھا لیکن یہ اب بھی میرے اندازے سے کم تھا۔ میں تو کروڑ دو کروڑ کا مالک ہونے کے بعد ہی شازیہ کے پاس جانے کا سوچ سکتا تھا۔ وہ بھی یہ ثابت کرنے کے بعد کہ یہ دولت میں نے جائز طریقے سے حاصل کی ہے۔ اس کے لیے میں نے اچھی طرح منصوبہ سازی کر لی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ ایک بڑی رقم ملنے کے بعد میں اپنا کاروبار شروع کر دوں گا۔ یہ کام چھوڑ دوں گا اور ایک بزنس مین کی حیثیت سے شازیہ کے سامنے جاؤں گا۔

میں بار بار طوفان کی توجہ اس طرف دلا رہا تھا کہ وہ کوئی لمبا ہاتھ مارے۔ ان چھوٹی چھوٹی وارداتوں سے کیا بنے گا۔ طوفان نہ جانے کس دن کے انتظار میں تھا۔ میری باتیں سن کر مسکراتا رہتا تھا۔ آخر ایک دن اس نے جیسے تیاری مکمل کر لی۔

"جانِ جگر تیار ہو جا۔ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تو پیچھے ہٹنے والا نہیں۔"

"طوفان بھائی، میں تو کبھی پیچھے نہیں ہٹا۔"

"ابے ان کاموں میں بڑا چوکس رہنا پڑتا ہے۔ ایک کچا ساتھی سب کو مروا دیتا ہے۔ اسی لیے میں نے تجھے ٹریننگ پر لگایا ہوا تھا۔ اصل کام تو اب کرنے والے ہیں۔ مجھے تجھ جیسے ساتھی کی ضرورت تھی، تو مل گیا۔"

طوفان نے بینک ڈکیتی کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس نے تمام معلومات حاصل کر لی تھیں۔ دو کروڑ کی رقم ہاتھ آنے والی تھی۔ اس کے ساتھ مزید تین ساتھی اور بھی تھے۔

"طوفان بھائی! یہ رقم تمام لوگوں میں تقسیم ہو گی تو کیا ہاتھ آئے گا۔ یہ واردات صرف آپ اور میں مل کر کریں تو فائدہ بھی ہے۔"

"ابھی اس لائن میں تو نیا آیا ہے۔ میرے دماغ تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ جو چار مددگار ہیں، منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔ دولت تو میرے اور تیرے ہی حصے میں آئے گی۔ بس تو مجھ پر چھوڑ دے۔"

"طوفان بھائی، اگر انہیں حصہ نہیں ملا تو یہ ہماری مخبری کر سکتے ہیں۔"

"میں نے کہا نا، اپنی زبان بند رکھ ورنہ چلتا پھرتا نظر آ۔ مچھلی کو تیرنا سکھا رہا ہے۔"

اس نے پہلی مرتبہ اس لہجے میں مجھ سے بات کی تھی۔ مجھے چپ ہونا پڑا بلکہ میں خوف زدہ ہو گیا کہ اس کا راز مجھ پر کھل گیا ہے، کہیں وہ مجھے مروا ہی نہ دے۔

وہ ایک غیر ملکی بینک تھا۔ میں اور طوفان ایک دن پہلے بینک کو اندر سے دیکھنے کے لیے بینک میں گئے۔ منیجر سے ملے اور اکاؤنٹ کھلوانے کے بارے میں معلومات کیں لیکن مقصد یہ تھا کہ بینک کا جائزہ لے لیں۔ گارڈ کہاں بیٹھتا ہے، کیش کہاں ہے، وغیرہ وغیرہ۔

طوفان کی یادداشت کا میں قائل ہو گیا۔ گھر پہنچتے ہی اس نے ایک نقشہ تیار کیا۔ جو کچھ ہم بینک میں دیکھ کر آئے تھے، یہ نقشہ اس کی نقل تھا۔ طوفان نے اپنے تین ساتھیوں کو بھی بلا لیا تھا۔ اس نقشے کی مدد سے انہوں نے پوری پلاننگ کر لی۔ داخل ہونے کے بعد کس کو کس طرف جانا ہے، کس کو کیا کرنا ہے، کون سے کاؤنٹر پر کس کی ڈیوٹی ہو گی، وغیرہ وغیرہ۔

بینک کے سامنے پہنچ کر ہم نے اچھی طرح اطمینان کر لیا۔ میں، طوفان اور اس کے دو ساتھی بینک کے اندر گئے۔ اس کا ایک ساتھی گاڑی اسٹارٹ کر کے گاڑی میں بیٹھا رہا۔

اندر پہنچتے ہی طوفان کے دونوں ساتھیوں نے گارڈز کو قابو کیا۔ میں نے بینک میں موجود لوگوں کو زمین پر لیٹ جانے کو کہا۔ یہ لوگ پیسے نکلوانے یا جمع کرانے بینک میں آئے ہوئے تھے۔ طوفان نے کیشیئر کو حکم دیا "نوٹ اس تھیلے میں ڈالو۔"

کیشیئر نے نوٹ تھیلے میں بھر دیے۔ جو لوگ زمین پر لیٹ گئے تھے، ان سے بھی نقدی نکلوا لی۔

اس کام میں بہ مشکل دس منٹ لگے ہوں گے۔ تمام کام بخیر و خوبی ہو گیا تھا کہ بینک کے عملے میں سے ایک نے نادانی کر دی۔ اس نے بینک سے بھاگنے کی کوشش کی۔ طوفان کی چلائی ہوئی گولی نے اسے ڈھیر کر دیا۔ میں اور طوفان کے دو ساتھی یہ سمجھے کہ ہمیں یہی کرنا ہے اور گولیاں برساتے ہوئے نکلنا ہے۔ ہم نے بھی اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی اور فائرنگ کرتے ہوئے باہر نکل آئے۔ گاڑی اسٹارٹ تھی، بیٹھے اور روانہ ہو گئے۔

میں سخت گھبرایا ہوا تھا۔ ذرا ہوش آیا تو مجھے خیال آیا کہ ہمارے دو ساتھی جو ساتھ آئے تھے، گاڑی میں نہیں بیٹھ سکے ہیں۔ وہ شاید وہیں رہ گئے۔

"طوفان بھائی۔ ممدو اور شریف وہیں رہ گئے ہیں، گاڑی میں نہیں بیٹھ سکے۔"

"خاموشی سے پیچھے دیکھتے رہو۔ کوئی ہمارا پیچھا نہ کر رہا ہو۔"

"طوفان بھائی، اگر وہ پکڑے گئے تو ہم بھی پھنس جائیں گے۔"

"میں نے تم سے کہا ہے، چپ کر کے بیٹھے رہو ورنہ مجھے چپ کرانا بھی آتا ہے۔"

اس کی غراہٹ ایسی تھی کہ میں چپ ہو گیا لیکن سوچتا ضرور رہا کہ عجیب آدمی ہے، اسے کچھ پروا ہی نہیں۔

طوفان کا ساتھی کوئی ماہر ڈرائیور تھا۔ بھگاتا ہوا ٹھکانے تک پہنچ گیا۔

"گاڑی کی نمبر پلیٹ بدلو اور اسے فوراً...... صاحب کے گھر پہنچا دو۔ جلدی کرو، گاڑی یہاں کھڑی نہیں رہنی چاہیے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ مجھے اسی بنگلے کے ایک تہ خانے میں لے گیا۔ یہاں پہنچ کر مجھے پھر اپنے دو ساتھیوں کا خیال آیا لیکن پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اتنی دیر میں تہ خانے میں رکھا فون بج اُٹھا۔ طوفان نے فون اُٹھایا اور کچھ دیر بعد ''اچھا'' کہہ کر فون رکھ دیا۔

''یار، گڑ بڑ ہوگئی۔''

''کیا ہوا طوفان بھائی؟''

''ہماری فائرنگ سے پانچ آدمی مارے گئے ہیں۔ ان میں ممدو اور شریف بھی ہیں۔ سچ ہے، گولی کسی کو نہیں دیکھتی۔ سالے سامنے آگئے اور مارے گئے۔ پولیس حرکت میں آگئی ہے۔ ان ہلاکتوں کے بعد معاملہ سنگین ہوگیا ہے، ہمیں جلدی نکلنا ہوگا۔''

''کہاں جائیں گے؟''

''بعد میں سوچیں گے۔ پہلے رقم تو گن لیں۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔

''طوفان بھائی کوئی خطرہ تو نہیں؟''

''دو دن تک کوئی خطرہ نہیں۔ تم فکر مت کرو، پولیس یہاں نہیں پہنچے گی۔ یہ بتاؤ تمہارا پاسپورٹ بنا ہوا ہے؟''

''پاسپورٹ ہے مگر گھر پر ہے۔''

''جا کر لے آؤ۔''

''طوفان بھائی!''

''ابے بکری، ڈرتا کیوں ہے؟ بات ہوگئی ہے۔ دو دن تک پولیس اِدھر اُدھر چھاپے مار کر وقت ضائع کرتی رہے گی۔ پھر وہ آدمی پکڑا جائے گا جو ہماری گاڑی چلا کر لایا تھا۔ اس کی مدد سے پولیس یہاں آئے گی مگر ہم جا چکے ہوں گے۔ اخباروں میں خبر لگ جائے گی کہ بینک ڈکیتی کے ملزمان بیرونِ ملک فرار۔''

''اور ہمارا ساتھی؟''

''اسے سزا ہو جائے گی۔ ہم اس کا حصہ دینے سے بچ جائیں گے۔''

مجھے اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ ممدو اور شریف کو بھی جان بوجھ کر طوفان نے راستے سے ہٹایا ہے تاکہ انہیں حصہ نہ دینا پڑے۔

میں خاموشی سے نکلا اور اپنے گھر آگیا۔ اماں کو میں نے کچھ نہیں بتایا۔ پاسپورٹ اُٹھایا اور طوفان کے پاس چلا آیا۔ اتنی دیر میں وہ رقم گن چکا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق سوا دو کروڑ روپے کی رقم ہاتھ آئی تھی۔ طوفان نے یہ بھی انکشاف کیا کہ ڈھائی کروڑ کی رقم آسٹریلیا کے ایک بینک میں محفوظ ہے جو ایسی ہی کسی بینک ڈکیتی میں اس کے ہاتھ لگی تھی۔

دوسرا دن ہوا تو میں نے ایک عجیب منظر اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا۔ میں نے چیزیں بکتی ہوئی دیکھی تھیں لیکن نوٹوں کے بدلے نوٹ بکتے ہیں، یہ بالکل نئی بات تھی۔ یہ بھی نئی بات تھی اور یہ بھی حیران کن بات تھی کہ ان نوٹوں کا خریدار میرے ملک کی نہایت، نامور ہستی تھی۔ وہ شخص خود چل کر آیا تھا۔

''یہ دو کروڑ پچیس لاکھ کی رقم ہے۔'' طوفان نے تھیلا اس کے سامنے رکھ دیا۔

''میں اس کے ڈیڑھ کروڑ دے سکتا ہوں۔''

''یہ تو بہت کم ہیں۔''

''دس لاکھ اور لے لینا۔''

سودا ہوگیا۔

''میرے جانے کا انتظام کیا ہوا؟''

''آج شام تک ویزا اور ٹکٹوں کا انتظام ہو جائے گا۔'' اس شخص نے کہا۔ پھر کچھ دیر کے بعد کہا ''تم کام کے آدمی ہو۔ باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آتی لیکن سیاسی معاملات خراب ہیں۔ اپوزیشن پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ اس لیے کچھ دنوں کے لیے تمہارا باہر جانا ہی ٹھیک ہے۔''

''یہ کیسا سودا ہے طوفان بھائی! کیا یہ نوٹ جعلی تھے جو سستے بیچ دیے۔''

''یہ رقم ہم باہر نہیں لے جا سکتے تھے۔ ان صاحب کے ہاتھوں فروخت کردی۔ جتنے میں بیچی ہے اتنی رقم ہمیں آسٹریلیا پہنچ کر ان کے بینک سے مل جائے گی۔ ہے نا عقل مندی کا سودا۔ ہم کل اس ملک سے روانہ ہو جائیں گے۔''

''طوفان بھائی! تم چلے جاؤ۔ میں بیرونِ ملک جانا نہیں چاہتا۔'' مجھے شازیہ کا خیال آگیا تھا۔ ایسی دولت کا کیا فائدہ تھا جو مجھے شازیہ سے اتنی دور لے جا رہی تھی۔

''جانِ جگر، تو میرے جرم کی واحد گواہی ہے۔ میں تجھے چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں۔''

''آپ نے مجھے پہلے تو یہ نہیں بتایا تھا کہ بیرونِ ملک جانا پڑے گا۔''

''مجھے خود نہیں معلوم تھا تو تجھے کیا بتاتا۔ وہ تو حالات ایسے ہوگئے جو لوگ میرے پیچھے ہیں وہی مشورہ دے رہے ہیں پھر میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''میرا یہاں کوئی ہے جسے چھوڑ کر میں نہیں جا سکتا۔''

''جرم کی دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا اور پھر ہم ہمیشہ کے لیے نہیں جا رہے ہیں۔ کچھ دنوں میں معاملہ ٹھنڈا پڑتے ہی واپس آجائیں گے۔''

''اماں کو کس پر چھوڑ کر جاؤں؟''

''ان کو پیسے بھیجتے رہنا۔ دو چار مہینے میں واپس آہی جاؤ گے۔ الیکشن ہونے والے ہیں، میرے پشت پناہ اقتدار میں آجائیں گے، پھر ہمیں کوئی پروا نہیں ہوگی۔''

میری ان باتوں سے وہ چوکنا ہوگیا تھا۔ اس نے مجھے اماں سے ملنے بھی نہیں دیا۔ اسے یہ خطرہ ہوگیا تھا کہ میں غائب ہو جاؤں گا حالانکہ اپنا حصہ لیے بغیر میں کہاں جا سکتا تھا؟

اس کے ہاتھ اتنے لمبے تھے کہ اسی دن شام کو ویزا لگ کر آگیا اور ٹکٹ بھی ہاتھ میں آگئے۔ موقع ہی نہ مل سکا کہ میں اماں سے ملتا۔ میں بھی اتنا ڈر گیا تھا کہ باہر نہ نکلنے ہی میں عافیت جانی۔

دوسرے دن وہ وقت بھی آگیا جب میں جہاز کی کھڑکی سے آخری مرتبہ اپنے وطن کو دیکھ رہا تھا۔

''آسٹریلیا میں میرا ایک دوست ہے۔ اس کے پاس جا کر ٹھہریں گے۔ اب اتنی دولت بھی ہمارے پاس ہے کہ ہم کوئی بزنس کرلیں گے۔'' یہ وہ کلمات تھے جو اس نے جہاز اُڑنے کے بعد کہے تھے۔

آسٹریلیا پہنچنے کے بعد اس نے مجھے بتایا کہ ہماری شناخت ہوگئی ہے۔ پاکستان میں ہماری تلاش کی جا رہی ہے۔ ابھی جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔ کچھ کیے بغیر یہاں رہا بھی نہیں جا سکتا۔

''طوفان بھائی، یہ تو آپ نے بُری خبر سنائی۔''

''ہمیں لوگ ہمیشہ یاد نہیں رکھیں گے۔ جلد ہی بھول بھال جائیں گے۔ پھر ہم جو بزنس یہاں کریں گے، وہ پاکستان کی طرف شفٹ کردیں گے۔''

میں مطمئن ہوگیا۔ اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ خطرہ مول لے بھی لیتا تو واپس کیسے آتا؟ میرا پاسپورٹ طوفان کے پاس تھا۔ پھر وہ اتنا خطرناک آدمی تھا کہ مجھے یہاں بھی مروا سکتا تھا۔

وہ اپنے ذرائع کام میں لایا اور مستقل قیام کا بندوبست کرلیا۔ میرے حصے کی رقم بھی اس نے بزنس میں لگا دی۔ اب میرے پاؤں میں مزید زنجیریں پڑ گئیں۔

شازیہ کے لیے میں نے اتنے پاپڑ بیلے تھے اور اب وہی اتنی دور ہوگئی تھی کہ دیکھنے کو بھی ترس گیا تھا۔ اس کی یاد آنسو بن کر آنکھوں میں آتی رہتی تھی لیکن وہ صرف میری پسند تھی۔ میں نے اس کے ساتھ وقت نہیں گزارا تھا کہ اسے بھلانا مشکل ہو جاتا۔ رفتہ رفتہ اس کی صورت آنکھوں سے اوجھل ہوتی چلی گئی۔ بہت سی یادوں کی طرح شازیہ کی یادوں کو بھی میں نے غمِ زمانہ کے حوالے کر دیا۔

میں شازیہ سے اتنی وفاداری تو نبھا سکتا تھا کہ وہ نہیں تو کوئی بھی نہیں لیکن میں اپنے وعدے پر قائم نہ رہ سکا۔ ایک کاروباری ضرورت کے تحت مجھے وہاں کی ایک مقامی عورت سے شادی کرنی پڑ گئی۔ اس بیوی سے ایک بیٹی بھی ہوگئی۔ میں اتنا ہی کر سکتا تھا کہ اس کا نام میں نے شازیہ رکھ دیا۔ میری محبت کو کسی حوالے سے تو زندہ رہنا تھا۔

طوفان بھائی کا انتقال ہوگیا۔ ان کے بعد اب میں تمام بزنس کا اکیلا مالک تھا۔

میں اس روز آئینے کے سامنے کھڑا اپنا جائزہ لے رہا تھا۔ میرا چھریرا بدن فربہی کی طرف مائل تھا۔ چہرے پر فرنچ کٹ داڑھی تھی۔ سر کے آدھے بال وقت سے پہلے سفید ہوگئے تھے۔ اتنا بدل گیا تھا کہ جس نے مجھے پہلے کبھی دیکھا تھا اب مجھے شناخت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں خود سے سوال کرنے لگا، اگر میں پاکستان چلا جاؤں تو مجھے کون شناخت کر سکے گا؟ یہ خیال آتے ہی بہت سے چہرے سامنے آگئے تھے۔ ماں کی یاد آئی تھی جن سے میں نے احتیاطاً کوئی رابطہ نہیں رکھا تھا۔ میں اپنی بے بسی اور بے کسی پر رو پڑا تھا۔ شازیہ سے اب میرا کوئی تعلق نہیں رہا تھا لیکن اسے دیکھنے کا اشتیاق دل میں جاگ اُٹھا تھا۔ اب میں اس کے سامنے بھی جا سکتا تھا کیونکہ میری قسم پوری ہوگئی تھی۔ میرے پاس اب اتنی دولت تھی جس کا شازیہ خواب بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔

یہ سب خیال اس لیے سر اُٹھا رہے تھے کہ طوفان درمیان سے ہٹ گیا تھا۔ اس کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ اب مجھے نہیں روک سکتا تھا۔

میں نے اپنی آسٹریلین بیوی سے ذکر کیا۔ وہ بھی خوش ہوگئی کہ وہ اپنے شوہر کا وطن دیکھے گی، میرے رشتہ داروں سے ملے گی، اچھی خاصی تفریح ہو جائے گی۔

ان دس برسوں میں دنیا کتنی بدل چکی ہوگی۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میں بیوی اور بچی کے ساتھ پاکستان آگیا۔

''ڈیڈی، کیا میں دادی سے ملوں گی؟'' جہاز نے رن وے کو چھو لیا تو میری بیٹی نے مجھ سے پوچھا۔

''شاید!'' میری آواز گلے میں رہ گئی تھی کیونکہ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں؟

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ائرپورٹ کے باہر میری جوانی کا شہر میرا منتظر تھا۔ میں نے ٹیکسی پکڑی اور ایک ہوٹل پہنچ گیا۔ اب میں شازیہ کا غریب ڈرائیور نہیں تھا بلکہ ایک مالدار تاجر تھا۔

اس رات میں بیوی کو دکھانے کے لیے سو گیا تھا ورنہ حقیقت میں جاگتا رہا تھا۔ صبح ہوتے ہی میں نے کار منگوائی اور جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ بیوی اور بچی کو ابھی میں نے ساتھ لے جانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ میں نے احتیاطاً سن گلاسز لگا لیے تھے کہ کوئی پہچان نہ سکے۔

محلے میں پہنچ کر مجھے خوشی ہوئی۔ بہت سے لوگ ایسے ملے جنہیں میں پہچان رہا تھا لیکن ان میں سے کسی نے بھی مجھے نہیں پہچانا۔ میں سب سے پہلے اپنے گھر پہنچا لیکن وہاں تالا پڑا ہوا تھا۔ آفاق برابر ہی میں تو رہتا تھا۔ یہ وہی آفاق تھا جس نے مجھے شازیہ کے گھر ملازمت دلوائی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ آفاق دوپہر کے بعد اپنی ڈیوٹی پر جاتا ہے۔ وہ یقیناً گھر پر ہوگا۔ میں نے آفاق کے دروازے پر دستک دے دی۔ مجھے ہنسی آرہی تھی۔ جب وہ اجنبیوں کی طرح مجھے دیکھ رہا تھا۔

''کہیے، کس سے ملنا ہے؟''

''آفاق سے؟''

''میں ہی آفاق ہوں۔'' اس نے شک بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ابے تو نے بھی مجھے نہیں پہچانا؟''

میرے یہ کہتے ہی اس نے مجھے پہچان لیا اور آگے بڑھ کر گلے سے لگ گیا'' کہاں غائب ہوگیا تھا تو؟''

''بس یار، تقدیر کا چکر تھا۔ دولت کمانے کے لیے بڑی دور چلا گیا تھا۔ اب آگیا ہوں۔''

''اب کیا لینے آیا ہے، تو نے اپنی ماں کو اپنے ہاتھوں مار دیا۔''

''اماں...... میرا مطلب ہے اماں......؟''

''ہاں، وہ اس دنیا میں نہیں رہیں۔ کچھ دن تیرا انتظار کرتی رہیں۔ پھر وہ وہاں گئیں جہاں تو ڈرائیور تھا۔ وہاں سے بھی کچھ معلوم نہیں ہوا۔ کچھ دن میں ان کے کھانے پینے کا خیال رکھتا رہا۔ پھر اللہ بھلا کرے شازیہ بی بی کا۔ ایک دن وہ آئیں اور اماں کو ساتھ لے کر چلی گئیں۔ پچھلے سال معلوم ہوا اماں اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ کوئی ایسے بھی جاتا ہے کہ ماں کو ایک خط تک نہ لکھے۔''

میں سر جھکائے کھڑا تھا۔ ناخلف اولاد اور کس طرح کھڑی ہوتی ہے۔

''آفاق، اب مجھے اجازت دو۔ میں شازیہ کے گھر جاؤں گا۔ وہ میری محسنہ ہے، مجھے اس کا شکریہ بھی ادا کرنا ہے۔''

''دور کیوں جاتے ہو؟ اس کا آفس قریب ہی ہے، وہاں چلے جاؤ۔ اب تو وہ ایڈووکیٹ ہوگئی ہے۔ اپنا آفس ہے۔ بڑے پائے کی وکیل ہے۔ ایسے ویسے مقدموں پر تو ہاتھ بھی نہیں ڈالتی۔''

آفاق نے اس کے آفس کا پتا مجھے سمجھا دیا۔ میں نے بھی سوچا، سیٹھ صاحب سے پھر بھی مل لوں گا، یہاں تک آگیا ہوں تو شازیہ سے تو مل لوں۔ اب تو اس نے شادی بھی کرلی ہوگی۔ دیکھوں تو سہی اب کیسی ہوگئی ہے؟ مجھے پہچانتی بھی ہے یا نہیں؟ اگر نہیں پہچانی تو ایک قہقہے کے درمیان اسے بتاؤں گا کہ میں کامران ہوں۔ غریب ڈرائیور نہیں، مال دار تاجر جس کا بزنس بیرونِ ملک ہے۔ میں بڑے فخر سے کہہ سکوں گا کہ میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اب تم مجھ سے شادی کرسکتی ہو۔ اگر اس کی شادی ہوگئی ہو؟ شادی تو میری بھی ہوچکی ہے۔ کیا میں اسے پھر بھی یہ یقین دلا سکوں گا کہ میں اسے حاصل کرنے کے لیے دولت کمانے نکلا تھا؟ کیا وہ مجھے بے وفا نہیں کہے گی؟ نہیں، میں نے ارادہ بدل دیا۔ اس پر میری اصلیت ظاہر نہ ہو، یہی اچھا ہے۔ بس میں اسے دیکھوں گا اور چلا آؤں گا۔ دل ہی دل میں اس کا شکریہ ادا کردوں گا کہ اس نے میری ماں کا خیال رکھا۔

مجھے یہ فیصلہ کرتے ہوئے دکھ تو بہت ہوا تھا لیکن مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔ اب میں اکیلا نہیں، غیر ملکی بیوی اور میری بیٹی میرے ساتھ تھی۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے آفس میں قدم رکھا۔ ٹانگیں میرے ہاتھوں سے نکلی جارہی تھیں۔ میرا تماشا دیکھنے کے لیے پسینے کی بوندیں میری پیشانی پر رکی ہوئی تھیں۔ میں نے پسینا پونچھا اور ہمت کرکے اس کی سیکریٹری کے پاس پہنچ گیا۔

''شازیہ ابرار سے ملاقات ہوسکتی ہے؟''

''آپ کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں؟''

''میں ایک کیس لے کر ان کے پاس آیا ہوں۔ انہیں اپنا وکیل کرنا چاہتا ہوں۔''

''آپ کا نام سر؟''

''خورشید عالم۔''

یہ فرضی نام میں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا۔ سیکریٹری نے انٹرکام پر اسے اطلاع دی۔ کچھ دیر کے انتظار کے بعد اس

نے مجھے بلوالیا۔

میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ ذرا بھی نہیں بدلی تھی یا پھر میں ماضی کی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے مجھے شک ہوا جیسے اس نے مجھے پہچان لیا ہے لیکن جب اس نے کہا ''سر! تشریف رکھیں۔'' تو مجھے خوشی ہوئی کہ اس نے مجھے پہچانا نہیں تھا۔ میں اس وقت بھی سیاہ چشمہ لگائے ہوئے تھا۔ نام تو پہلے ہی بدل چکا تھا۔ وہ مجھے پہچان ہی نہیں سکتی تھی۔

''فرمائیے، کیا کیس ہے آپ کا؟''

میں نے اسے ایک فرضی کیس دل سے گھڑ کر سنا دیا۔ دل میں یہی تھا کہ کیس مجھے لڑنا کب ہے۔ مجھے تو کچھ دیر اس کے پاس بیٹھنے کے لیے بہانہ درکار تھا۔ وہ ایک ماہر وکیل کی طرح ایک ایک نکتے کو غور سے سن رہی تھی۔ ساتھ ساتھ میرے بارے میں معلومات جمع کرنے کی کوشش کرتی جارہی تھی۔ میں اسے پہلے ہی بتا چکا تھا کہ میں بہت کم عمری میں ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ اب آیا ہوں۔

''آپ نے شادی کی ہے؟''

''اتفاق سے نہیں۔''

''شادیاں اتفاق سے ہوجاتی ہیں۔ نہ ہونے کے لیے تو اتفاق ضروری نہیں ہوتا۔''

''میں آپ کو کھل کر بتا دوں۔'' میں نے کہا ''محبت کی ناکامی نے مجھے شادی نہیں کرنے دی۔''

''اور اس نے جس سے آپ نے محبت کی تھی؟''

''اس کا مجھے معلوم نہیں۔ آج ہی تو اس سے ملا ہوں۔'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

''اس وقت تو آپ مجھ سے ملاقات کررہے ہیں۔''

''وہ بھی آپ ہی کی طرح تھی۔ میرا مطلب ہے آپ کی طرح ذہین اور خوبصورت۔''

''خیر چھوڑیے، میں بھی کیا باتیں لے کر بیٹھ گئی۔ بائی دی وے، آپ ٹھہرے ہوئے کہاں ہیں؟''

میں نے ہوٹل کا نام اور کمرے کا نمبر اسے بتا دیا۔ یہ میری غلطی تھی جو بس ہوگئی۔

اس نے مجھ سے کہا کہ اس کی سیکریٹری سے فیس معلوم کرلوں۔ اگر مناسب ہو تو ادا کردوں۔ وکالت نامہ تیار ہوجائے تو مجھے بلوالیا جائے گا۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اسے اپنی آنکھوں میں سمیٹ کر باہر نکل آیا...... ہوٹل میں پہنچا تو میری بیٹی میرا انتظار کررہی تھی۔ میں اس وقت اتنا ٹوٹا ہوا تھا کہ کوئی اور موقع ہوتا تو آنکھیں بند کرکے یادوں میں گم ہوجاتا لیکن میں اپنی بیٹی سے وعدہ کرکے گیا تھا کہ واپس آکر اسے گھمانے لے جاؤں گا۔ میں نے بیوی اور بیٹی کو ساتھ لیا اور گھومنے نکل گیا۔ رات گئے واپس آیا تو دن بھر کے واقعات کو دُہرانے لگا۔ نیند کہیں دور جاکر کھڑی ہوگئی تھی۔ میری بیوی اور معصوم شازیہ بے خبر سو رہی تھیں۔ صبح ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے سوچا، ہوٹل کی انتظامیہ کے لوگ ہوں گے۔ شاید کوئی ایمرجنسی ہوگئی ہو۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ یہ دیکھ کر میرے ہوش اُڑ گئے کہ باہر پولیس کھڑی ہے۔

''آپ کی گرفتاری کے وارنٹ ہیں۔''

''میرا جرم کیا ہے؟''

''یہ عدالت بتائے گی۔''

ایک پولیس والا آگے بڑھا اور میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ میری بیوی انہیں دھمکیاں دیتی رہی اور وہ مجھے اپنے لے کر چلے گئے۔

دوسرے دن مجھے عدالت میں پیش کردیا گیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ راز کھل گیا لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ راز کھولنے والا کون ہے؟ یہ مجھے اس وقت معلوم ہوا جب شازیہ، میری محبوبہ نے میرے خلاف بطور گواہ بولنا شروع کیا۔ یہ عجیب کیس تھا۔ وکیل بھی وہ تھی، گواہ بھی وہ۔ میری بیوی نے وکیل کرلیا تھا لیکن گواہی اتنی مضبوط تھی کہ پہلی ہی پیشی میں مجھے اقبالِ جرم کرنا پڑا۔

''یہ شخص کبھی میرا ڈرائیور تھا پھر یہ میری محبت میں گرفتار ہوگیا۔ مجھے حاصل کرنے کے لیے اس نے دولت مند بننے کا خواب دیکھا اور طوفان نامی شخص کے ساتھ مل کر بینک ڈکیتی کی اور بیرونِ ملک فرار ہوگیا۔ مجھے معلوم بھی نہ ہوتا کہ اس ڈکیتی کے پیچھے کامران بھی ہے لیکن اس کی فائرنگ سے جو لوگ قتل ہوئے، ان میں میرے والد بھی تھے۔ انہوں نے اسے پہچان لیا تھا۔ انہوں نے مرنے سے قبل یہ بات مجھے بتادی تھی اور میں نے اس کے نام ایف آئی آر درج کرادی تھی۔ جرم کبھی نہیں چھپتا لہٰذا دس سال بعد یہ مجھ سے ملنے آیا اور میں نے اسے پہچان لیا۔''

مجھ پر سوا دو کروڑ کا جرمانہ ہوا یعنی وہ رقم مجھے واپس کرنی تھی جو بینک سے لوٹی تھی اور دس سال قید سنائی گئی۔

میری بیوی، میری بیٹی کو لے کر آسٹریلیا واپس چلی گئی۔ میں پہلے سے بھی زیادہ غریب ہوگیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

مارِ آستین

جناب معراج رسول صاحب
السلام علیکم!
یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ اس دنیا میں جتنے بھی فساد ہوتے ہیں ان کے پیچھے زر، زن اور زمین ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ میں نے بھی ایک بہت غلط کام کیا ہے۔ بہت بڑا گناہ کیا ہے جو آج بھی میرے اعصاب پر سوار ہے۔

نعیم الحسن
(دبئی ،یو اے ای)

میں اور جاوید ہم عمر تھے۔ ہم میں دوستی بھی بہت تھی۔ ہم ایک ساتھ کھیلتے ، ایک ساتھ گھومتے اور ایک جیسے ہی کپڑے پہنتے۔

جاوید میرا عم زاد تھا۔ اس سے چھوٹی فرحانہ تھی۔ میں اپنے والدین کا اکلوتا تھا اس لیے میرے ناز نخرے کچھ زیادہ ہی اُٹھائے جاتے تھے۔ میرے مقابلے میں جاوید خاصا خوش شکل، وجیہ اور گورا چٹا تھا۔ وہ پڑھائی میں بھی خاصا ذہین تھا۔ ہم دونوں ایک ہی اسکول میں اور ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے لیکن پہلی پوزیشن ہمیشہ جاوید کی ہوتی تھی۔ میں بس یونہی واجبی نمبروں سے پاس ہو جاتا تھا۔

ابو ہمیشہ مجھے جاوید کی مثال دے کر کہتے تھے ”نعیم! جاوید سے سبق سیکھ، کیا تو ذہانت میں اس سے کم ہے یا ہماری طرف سے کوئی کمی ہوئی ہے جو تو ہمیشہ اس سے پیچھے رہ جاتا ہے۔ کبھی تو، تو بھی کلاس میں کوئی پوزیشن لے کر دکھا اسے۔“

اسکول میں سارے ٹیچر بھی مجھے یہی طعنہ دیتے تھے۔ ”نعیم! ہمیں یقین نہیں آتا کہ تم جاوید کے کزن ہو۔ ہمیں پتا ہے، وہ کہیں ٹیوشن بھی نہیں پڑھتا، اس کے باوجود ہر کلاس میں فرسٹ پوزیشن لیتا ہے۔“

لوگوں کی اسی قسم کی باتیں سن سن کر مجھے جاوید سے ایک حسد سا پیدا ہو گیا۔ وہ ہر میدان میں مجھ سے آگے تھا، بس ایک ہی جگہ مار کھاتا تھا، وہ کرکٹ مجھ سے اچھی نہیں کھیلتا تھا۔

اسے کرکٹ کھیلنے کا شوق تو بہت تھا لیکن ہر کام شوق سے تو نہیں آتا۔ جیسے مجھے گانے کا بہت شوق ہے لیکن جب میں گانے کی کوشش کرتا ہوں تو حلق سے ایسی بے سری آواز برآمد ہوتی ہے کہ اگر میں کسی بادشاہ کے دور میں ہوتا تو میری گردن ماری جا چکی ہوتی۔ میرے برعکس جاوید بہت اچھا گاتا تھا۔

وہ اگر باقاعدہ موسیقی کی تعلیم حاصل کرتا تو آج کے بے سُرے گلوکاروں کو میلوں پیچھے چھوڑ دیتا۔

جاوید اسکول میں پڑھائی میں تو آگے تھا ہی، وہ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی پیش پیش رہتا تھا۔ تقریری مقابلہ ہو تو جاوید اوّل، بیت بازی میں وہ سب سے آگے، گلوکاری کے بارے میں تو میں بتا ہی چکا ہوں۔ اسٹیج ڈراما ہو تو جاوید ہیرو!

وہ آہستہ آہستہ میرے اعصاب پر سوار ہو گیا۔ میں دل ہی دل میں اس سے نفرت کرنے لگا۔ اس کے برعکس وہ مجھے ٹوٹ کا چاہتا تھا۔ امتحان کے دنوں میں میرے ساتھ رات رات بھر جاگ کر خود بھی پڑھتا تھا اور مجھے بھی پڑھاتا تھا۔ اس نے مجھے تقریر سکھانے کی کوشش بھی کی لیکن کچھ باتیں خداداد ہوتی ہیں جیسے شاعری اور موسیقی! اگر کسی میں شعر کہنے کی صلاحیت نہیں ہے تو دنیا کا بڑے سے بڑا شاعر بھی اسے شاعری کرنا نہیں سکھا سکتا۔

میٹرک میں بھی جاوید کا گریڈ اے ون اور پورے بورڈ میں دوسری پوزیشن تھی۔ میں نے جاوید کی دن رات کی محنت کے باعث اے گریڈ حاصل کر لیا تھا۔

ہم نے ایک ہی کالج میں ایڈمیشن لیا۔ میں تو اس کالج میں داخلہ لینا نہیں چاہ رہا تھا لیکن جاوید اڑ گیا کہ جب ہم پہلی

جماعت سے ایک ساتھ پڑھتے آئے ہیں تو دوسرے کالج میں کیوں پڑھیں؟

لوگ اب مجھے جاوید کے حوالے سے جانتے تھے۔ کوئی پوچھتا تھا کون نعیم! جواب ملتا تھا، یار! وہ جو جاوید کے ساتھ رہتا ہے۔

کالج پہنچ کر جاوید کے تعلقات بہت ہی نمایاں اور ممتاز شخصیات سے بھی ہو گئے تھے۔ ان میں چوٹی کے گلوکار بھی تھے، بڑے بڑے صحافی بھی اور معروف شاعر و ادیب بھی۔ وجہ اس کی غیر نصابی سرگرمیاں تھیں۔

جاوید اکثر جب ان سے ملنے جاتا تو مجھے بھی ساتھ لے جاتا۔ وہ لوگ مجھ سے بھی بہت تپاک سے ملتے لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان میں سے کسی نے مجھے بعد میں جاوید کے بغیر پہچانا بھی ہو۔

ایک مرتبہ ہمارے کالج میں بیت بازی کا مقابلہ تھا۔ جاوید اپنی ٹیم کا لیڈر تھا۔ اس مقابلے کے جج تھے معروف شاعر منیر نیازی، محسن بھوپالی اور ظہیر کاشمیری۔

مقابلہ حسبِ معمول جاوید کی ٹیم نے جیتا۔ اس کے علاوہ جاوید کو بہترین اشعار پڑھنے کا خصوصی انعام بھی ملا۔ وہ تینوں معروف شاعر حضرات بھی جاوید سے مل کر بہت متاثر ہوئے۔

بعد میں بھی جاوید کی منیر نیازی مرحوم سے کئی ملاقاتیں ہوئیں، میں بھی ہر ملاقات میں اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ وہ مجھ سے بہت بے تکلف ہو کر بات کرتے تھے۔

ایک موقعے پر منیر نیازی ایک مشاعرے کے سلسلے میں کراچی آئے ہوئے تھے۔ میرا ایک دوست ان کا بہت بڑا فین تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ یار، میں منیر نیازی صاحب سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے سنا ہے تمہارے ان سے تعلقات ہیں؟“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں۔“ میں نے کہا ”میں آج ہی تمہاری ملاقات ان سے کرا دوں گا۔“

میں اپنے اس دوست کے ساتھ اس ہوٹل میں پہنچ گیا جہاں منیر نیازی صاحب مقیم تھے۔

استقبالیہ پر میں نے اپنا نام بتاتے ہوئے کہا کہ مجھے منیر نیازی صاحب سے ملنا ہے۔

استقبالیہ کلرک نے فون پر ان سے بات کی، پھر وہ مجھ سے بولی ”سر! نیازی صاحب تو آپ کو نہیں جانتے۔“

”آپ پلیز، میری ان سے بات تو کرائیں۔“ میں نے کہا۔ کلرک نے ریسیور مجھے دے دیا۔ میں نے منیر نیازی صاحب کو سلام کیا اور انہیں بتایا کہ آپ سے کالج کی ایک تقریب میں ملاقات ہوئی تھی۔ میں جاوید صدیقی کا دوست ہوں۔

”اچھا اچھا، جاوید صدیقی!“ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا ”ٹھیک ہے، آ جائیے۔“

میں اپنے دوست کو ان کے پاس لے تو گیا لیکن مجھے شدت سے یہ احساس ہوا کہ میں تو کچھ بھی نہیں ہوں، صرف جاوید کا طفیلیہ ہوں۔ اس واقعے کے بعد جاوید سے میری

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

نفرت مزید شدید ہوگئی۔

میں آپ کو یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ ہمارا کالج کو ایجوکیشن تھا۔ لڑکوں سے زیادہ لڑکیاں تھیں۔ جاوید لڑکیوں میں بھی مقبول تھا۔ ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت لڑکی اس سے دوستی کی خواہش مند تھی۔ اس کی مردانہ وجاہت کے علاوہ اس میں دوسری خصوصیات کو بھی دخل تھا مگر وہ لڑکیوں کے معاملے میں بالکل کورا تھا۔

ان ہی دنوں کالج میں ایک لڑکی شاہانہ نے داخلہ لیا۔ وہ انتہائی خوبصورت تھی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ داخلے کے سلسلے میں اس نے میری مدد مانگ لی۔ میں نے بھاگ دوڑ کرکے اس کا داخلہ کرادیا پھر وہ اکثر مجھ سے ملنے لگی۔ وہ انتہائی صاف گو اور بے تکلف لڑکی تھی۔ کچھ ہی دنوں میں وہ مجھ سے بہت زیادہ بے تکلف ہوگئی۔ ہم اکثر کیفے ٹیریا میں بیٹھنے لگے۔

ان ہی دنوں کالج میں سالانہ فنکشن کا انعقاد ہوا۔ ظاہر ہے ایسے موقع پر جاوید پورے کالج پر چھا جاتا تھا۔

شاہانہ بھی اس سے متاثر ہوگئی اور مجھ سے بولی "نعیم! جاوید صاحب تمہارے کزن ہیں؟"

"ہاں، وہ میرا کزن ہے۔" میں نے جواب دیا۔ میں ان دنوں جاوید سے دور دور رہتا تھا اور اپنی الگ شناخت بنانے کی کوشش کررہا تھا۔

"تم جاوید صاحب سے میری ملاقات کراسکتے ہو؟"

"یہ کون سا مشکل ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا اور اپنے قریب سے گزرتے ہوئے ایک لڑکے سے کہا "یار، ذرا جاوید کو اِدھر بھیج دینا۔"

تھوڑی دیر بعد جاوید وہاں آگیا۔ اس نے شاہانہ کی طرف دیکھا بھی نہیں اور مجھ سے بولا۔ "ہاں نعیم! تونے مجھے بلایا ہے؟"

"تجھے جلدی تو نہیں ہے؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "تو، تو ہمیشہ جلدی میں ہوتا ہے۔"

"یار! تیرے لیے تو میں اپنے سب کام چھوڑ سکتا ہوں۔" وہ میرے نزدیک لان میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

"یہ مس شاہانہ افتخار ہیں۔" میں نے جاوید سے شاہانہ کا تعارف کرایا "انہوں نے حال ہی میں کالج میں ایڈمیشن لیا ہے اور تجھ سے ملنا چاہ رہی ہیں۔"

جاوید نے پہلی دفعہ شاہانہ کو دیکھا پھر ہنس کر بولا "ہیلو مس شاہانہ! کیسی ہیں آپ؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس آج نعیم کی وجہ سے آپ سے ملاقات ہوگئی ورنہ آپ کب کسی سے ملتے ہیں۔"

"میں کوئی وی آئی پی تو نہیں ہوں میڈم!" جاوید مسکرایا "ویسے آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔"

"آپ نے تو شاید یہ جملہ رسمی طور پر کہا ہے لیکن مجھے حقیقت میں آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔" شاہانہ نے جاوید کو والہانہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

میرا دل جل کر کباب ہوگیا۔

جاوید نے مجھ سے کہا "اگر اب کہیے تو میں جاؤں، مجھے ابھی......"

"جا یار!" میں نے اس کی بات کاٹ دی "میں نے تجھے ان سے ملنے کو بلایا تھا۔"

"اوکے مس شاہانہ!" جاوید نے اُٹھتے ہوئے کہا "آپ سے پھر ملاقات رہے گی۔"

"شیور!" شاہانہ نے کھنکتی ہوئی آواز میں کہا اور جاوید کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

میں دل ہی دل میں پیچ وتاب کھارہا تھا کہ میں نے اسے جاوید سے ملوایا ہی کیوں؟

"تم بہت خوش قسمت ہو نعیم!" شاہانہ نے کہا "جاوید جیسا ڈشنگ اور ہینڈسم لڑکا تمہارا کزن ہے۔"

اس کے اس جملے سے میرے دل پر آرے چل گئے۔ میں نے سنبھل کر کہا "یار! ہم کسی سے کم ہیں کیا؟"

میری بات پر شاہانہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

پھر تو اکثر شاہانہ، جاوید سے ملنے لگی۔ اس میں زیادہ دخل شاہانہ کی کوششوں ہی کا تھا۔ مجھے اس بات سے تکلیف تو ہوتی تھی لیکن میں مطمئن تھا کہ دوسری لڑکیوں کی طرح ایک دن شاہانہ بھی جاوید سے دور ہوجائے گی۔

ہمارے انٹر کے امتحانات سر پر تھے۔ جاوید حسب معمول رات دن نہ صرف خود پڑھائی کررہا تھا بلکہ مجھے بھی پڑھا رہا تھا۔

دو مہینے تک تو اس نے مجھے کسی طرف توجہ دینے کا موقع ہی نہیں دیا۔

شاہانہ اکثر مجھے کالج میں ملتی تھی تو یہی گلہ کرتی تھی کہ جاوید کی طرح تم بھی بہت مغرور ہوگئے ہو۔ مجھ سے ملاقات تک نہیں کرتے۔"

"اصل میں ہمارے امتحانات سر پر ہیں اس لیے میں آج کل بہت زیادہ مصروف ہوں۔ امتحانات کے بعد ساری کسر پوری کردوں گا۔"

میں اور جاوید دونوں ہی پری انجینئرنگ میں

تھے۔ امتحانات کا رزلٹ آیا تو جاوید حسب معمول بہت اعلیٰ نمبروں سے امتحان میں کامیاب ہوا۔ پاس میں بھی ہوگیا تھا لیکن میرے نمبر بہت کم تھے اور انجینئرنگ کالج میں ایڈمیشن ممکن نہیں تھا۔

جاوید کو تو انجینئرنگ کالج والوں نے خود آفر کی تھی کہ آپ اگر ہمارے کالج میں ایڈمیشن لیں گے تو یہ ہمارے کالج کی خوش بختی ہوگی۔

میں اس صدمے سے نڈھال ہوگیا۔ میں نے پڑھائی ترک کرنے کا فیصلہ کرلیا اور ابو سے کہا کہ آئندہ میں کاروبار میں آپ کا ہاتھ بٹاؤں گا۔

جاوید نے یہ سنا تو وہ دوڑا دوڑا میرے پاس آیا اور بولا "یار نعیم! تو اتنی سی ناکامی سے ہمت ہار بیٹھا۔ تجھے انجینئرنگ کا شوق ہے تو یا تو تُو، انٹرمیڈیٹ کا امتحان دوبارہ دے دے یا پھر پولی ٹیکنک کالج میں ایڈمیشن لے لے۔ تُو وہاں سے بھی بی ٹیک کرسکتا ہے۔ بی ٹیک اور بی ای میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔"

جاوید نے کچھ اس انداز سے سمجھایا کہ بات میری سمجھ میں آگئی۔

یوں زندگی میں پہلی دفعہ میں اور جاوید مختلف کالجوں میں داخل ہوئے۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ یہاں کم از کم میں اپنی شناخت خود بناؤں گا۔ کوئی مجھے جاوید کے حوالے سے نہیں جانے گا۔

ہم پڑھائی میں مصروف ہوگئے۔ میں بھی اب سنجیدگی سے پڑھائی کررہا تھا اور ثابت کرنا چاہتا تھا کہ میں جاوید سے کسی طور کم نہیں۔ اس دوران .... اکثر میں اپنے پُرانے کالج چلا جاتا تھا۔ وہاں شاہانہ اور دوسرے دوستوں سے ملاقات ہوجاتی تھی۔ شاہانہ بے تکلفی سے ملتی تھی۔

مجھے اب یہ انتظار تھا کہ میں تعلیم سے فارغ ہوتے ہی ملازمت کروں گا اور شاہانہ کے گھر رشتہ بھیج دوں گا۔

جاوید نے انجینئرنگ کا امتحان بھی اعلیٰ نمبروں سے پاس کیا۔ اسے فوراً ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ اس کمپنی کا ایک بہت بڑا پروجیکٹ سعودی عرب میں بھی چل رہا تھا۔ جاوید کو سعودی عرب بھیج دیا گیا۔ وہ یہاں بھی مجھ سے بازی لے گیا۔

میں نے بھی انجینئرنگ میں ڈپلوما کرلیا تھا اور خود کو بہت فخر سے ایسوسی ایٹ انجینئر کہتا تھا۔ میرے نمبر بھی خلافِ معمول بہت اچھے آئے تھے۔ میں نے سوچا کہ جب تک کہیں ملازمت نہیں مل رہی ہے، میں بی ٹیک ہی کرلوں۔

میں نے بی ٹیک میں ایڈمیشن لیا ہی تھا کہ جاوید نے کوشش کرکے مجھے بھی اپنی کمپنی میں سپروائزر کی پوسٹ دلوادی۔

زندگی میں پہلی بار میں نے اس کا احسان لینے سے انکار کردیا۔

میرا انکار سن کر وہ دوڑا دوڑا پاکستان آگیا اور مجھ سے ملاقات کرنے کے بعد بولا "یار نعیم! میں نے اتنی کوششوں سے تیرے لیے اس ملازمت کا بندوبست کیا ہے۔ یہ کمپنی بھی دنیا کی بڑی کمپنیوں میں سے ایک ہے۔ اس وقت بھی تیری تنخواہ بیس ہزار روپے پاکستانی کے قریب ہوگی (ان دنوں بیس ہزار کی بہت قدروقیمت تھی۔ پاکستان میں بہت اچھے

شہنشاہ اکبر نے احمد نگر کو فتح کرنے کے لیے اپنے فرزند شہزادہ مراد کو روانہ کیا۔ یہ حالت دیکھ کر بیجاپور سے چاند بی بی احمد نگر آئی اور کمسن بادشاہ کی جانب سے حکومت کرنے لگی۔ چاند بی بی نے بڑی بہادری اور شجاعت سے مغلوں کی فوج کا مقابلہ کیا۔ بالآخر صلح ہوگئی اور نظام شاہی قلمرو کے بعض قلعے مغلیہ حکومت کو مل گئے۔ اکثر امرا چاند بی بی کے مخالف ہوگئے اور آپس میں لڑنے لگے۔ اس حالت کو دیکھ کر اکبر نے اپنے دوسرے فرزند شہزادہ دانیال کو احمد نگر فتح کرنے کے لیے روانہ کیا۔ دانیال کے ساتھ مغلیہ فوج نے احمد نگر کا محاصرہ کرلیا۔ اس وقت بھی چاند بی بی نے احمد نگر کو مغلوں کو دے کر صلح کرلینے کی رائے دی مگر ایک حبشی سردار چیتہ خان نے جو اس وقت احمد نگر میں برسراقتدار تھا، عوام کو چاند بی بی کا مخالف بنادیا۔ یہاں تک کہ جاہل عوام شاہی محل میں گھس گئے اور چاند بی بی کو شہید کردیا۔ جب اکبر کے شہزادے دانیال نے قلعۂ احمد نگر فتح کرلیا تو کچھ عرصے تک ملک عنبر نے نظام شاہی سلطنت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی اور کھڑکی (اورنگ آباد) کو پائے تخت بنایا۔ ملک عنبر کی زندگی میں نظام شاہی حکومت کھڑکی میں قائم رہی۔ بالآخر شاہ جہاں کے سپہ سالار مہابت خاں نے دولت آباد اور کھڑکی فتح کرکے ملک عنبر کے فرزند فتح خان اور نظام شاہی بادشاہ حسین نظام شاہ کو قید کرلیا اس طرح 1043 ہجری مطابق 1644ء میں حکومت نظام شاہی کا خاتمہ ہوگیا۔

اقتباس: دکنی کلچر از محمد نصیر الدین ہاشمی

انتخاب: نبیلہ اظہر، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور خوش حال افراد بھی پانچ چھ ہزار روپے سے زیادہ نہیں کماتے تھے) کمپنی سے دوسری مراعات اس کے علاوہ ہوں گی۔ کھانے پینے اور قیام کی ذمے داری بھی کمپنی ہی کی ہوگی۔ تو اتنی اچھی ملازمت کو ٹھکرا رہا ہے۔''

اس نے پھر مجھے قائل کرلیا اور میں نے سعودی عرب کے لیے رختِ سفر باندھ لیا۔ جاوید تو تیسرے ہی روز چلا گیا تھا۔ وہ صرف میری خاطر پاکستان آیا تھا۔

میں جانے سے پہلے شاہانہ سے ملاقات کرنے کالج پہنچا تو وہ اسی بے تکلفی اور اپنایت سے ملی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں سعودی عرب جارہا ہوں۔

''کب؟'' اس نے پوچھا۔

''کل میری فلائٹ ہے۔'' میں نے کہا ''میں نے سوچا تم سے الوداعی ملاقات ہی کرلوں۔''

''آپ کی بہت نوازش!'' وہ مسکرا کر بولی ''کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔ آپ کے دوست اور کزن تو جب سے اس کالج سے گئے ہیں، وہ مشکل سے چار پانچ مرتبہ کالج آئے ہوں گے۔ جاتے وقت تو انہوں نے کسی سے بھی ملاقات نہیں کی۔''

''وہ ایسا ہی اکھڑ آدمی ہے۔ جب تک کوئی اس کی نظروں کے سامنے رہتا ہے، وہ اس سے ملتا رہتا ہے۔ تم نے آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل کا محاورہ سنا ہے؟ وہ محاورہ جاوید پر صادق آتا ہے۔''

''چلو جی، خیر نال جاؤتے خیر نال آؤ۔'' شاہانہ ہنس کر بولی۔

''شاہانہ!'' میں نے سنجیدہ ہو کر کہا ''تم مجھے پوسٹل ایڈریس تو دے دو۔''

شاہانہ نے حسرت سے میری طرف دیکھا۔

''کیا میری بات سمجھ میں نہیں آئی؟'' میں نے ہنس کر کہا ''میں تم سے خط و کتابت کا پتا مانگ رہا ہوں۔''

''کیوں؟'' شاہانہ نے پوچھا۔

''بھئی، تمہیں وہاں سے خط لکھوں گا، یوں۔'' میں نے جھنجلا کر کہا ''آدمی خط کتابت کا پتا کیوں مانگتا ہے؟''

''لیکن نعیم! ہمارا گھرانا ابھی اتنا آزاد خیال نہیں ہوا ہے کہ وہ مجھے لڑکوں سے خط و کتابت کی اجازت دے دے۔''

اس دور میں موبائل فون کا تو تصور بھی نہیں تھا ورنہ میں اس سے پتا بھی نہ مانگتا۔ اس دور میں تو اَن پڑھ لوگ کیسٹ ریکارڈر کے ذریعے اپنی بات کیسٹ میں ریکارڈ کرکے پاکستان بھیجا کرتے تھے۔

عجب اتفاق تھا کہ میں نے کبھی شاہانہ سے ٹیلی فون نمبر بھی نہیں لیا تھا۔ کبھی اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

میں نے شاہانہ سے کہا ''اچھا اپنے پتے کو چھوڑو، اپنا ٹیلی فون نمبر ہی دے دو۔''

''ہاں، ٹیلی فون نمبر تمہیں دے سکتی ہوں۔'' شاہانہ مسکرا کر بولی اور مجھے اپنا ٹیلی فون نمبر لکھوا دیا۔

میں اس سے رخصت ہو کر گھر آیا تو سارا وقت یہی سوچتا رہا کہ اب میں کمپنی میں منتقل ہوتے ہی شاہانہ کا رشتہ مانگ لوں گا۔

میں امی، ابو اور تایا ابو (جاوید کے والد) کی دعاؤں میں سعودی عرب کے لیے روانہ ہوگیا۔

ائرپورٹ پر جاوید میرا منتظر تھا۔ میں اس کی چمکتی ہوئی بہترین گاڑی دیکھ کر مرعوب ہوگیا اور اس سے کہا ''یار جاوید! تو نے گاڑی تو بہت شاندار خرید لی۔''

''خریدی کہاں ہے یار!'' جاوید ہنس کر بولا ''یہ تو مجھے کمپنی کی طرف سے ملی ہے۔ تین مہینے بعد جب تو کنفرم ہوجائے گا تو تجھے بھی کمپنی کی طرف سے گاڑی مل جائے گی۔''

وہاں میرے قیام کا بندوبست کمپنی نے کہیں اور کیا تھا لیکن جاوید نے کہہ سن کر مجھے بھی اپنے ساتھ ہی رکھ لیا۔ اصل میں وہ انجینئر تھا اور میں سپروائزر۔ اس کا شمار کمپنی کے افسروں میں ہوتا تھا۔ اس کا قیام بھی اچھی جگہ پر تھا۔ یہ تو اس کے تعلقات اور مقبولیت تھی کہ مجھے بھی اس کے ساتھ رہنے کا موقع مل گیا تھا۔

وہاں ہمیں ہر طرح کا آرام تھا۔ کھانا ہم لوگ بھی ساتھ ہی کھاتے تھے۔ کپڑے دھلوانے کے لیے کمپنی کی لانڈری تھی، کمرے کی صفائی اور جھاڑ پونچھ کے لیے جاوید کو کمپنی کی طرف سے ایک ملازم بھی ملا ہوا تھا۔ وہ بنگلہ دیش کا رہنے والا تھا۔ جاوید اس سے برائے نام کام لیتا تھا۔ وہ زیادہ وقت سو کر یا گھوم کر گزارتا تھا۔ فارغ اوقات میں وہ اپنی بیوی کو یاد کرکے زار و قطار روتا اور بنگالی کے اشعار پڑھتا تھا۔

وہ کافی عرصہ کراچی میں رہا تھا اس لیے اسے اردو بھی آتی تھی۔ فارغ اوقات میں ہم بھی اس کی باتوں سے تفریح لیتے تھے۔ وہ بہت باتونی آدمی تھا۔

کہتا تھا ''بس ایک دفعہ قرضہ اُتر جائے، میں اسی دن بنگلہ دیش چلا جاؤں گا۔''

''کیسا قرضہ نورل؟'' میں نے پوچھا۔

''صاحب! شادی کے لیے میں نے گاؤں کے ساہوکار سے سود پر قرضہ لیا تھا۔''

''تمہیں سود پر قرضہ لینے کی کیا ضرورت تھی؟'' میں نے ہنس کر پوچھا ''کچھ دن صبر کرلیتے، کیا تمہاری بیوی کہیں بھاگی جارہی تھی؟''

''کچھ ایسی ہی بات ہے صاحب!'' نورل نے کہا ''میں اپنی بیوی سے بہت پیار کرتا ہوں۔ وہ مجھے شروع سے پسند تھی۔ اچانک اس کا ایک رشتہ آگیا۔ اس کے گھر والے اس کی شادی وہاں کرنا چاہتے تھے لیکن میں نے کوشش کرکے ان لوگوں کو منالیا کہ وہ عینی کی شادی میرے ساتھ کردیں۔''

''عینی!'' میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''ہاں صاحب! میری بیوی کا نام عینی ہے۔'' اس نے ہنس کر کہا ''اس کے ماں باپ نے یہ شرط رکھی کہ اگر تم ایک مہینے کے اندر اندر شادی کرسکتے ہو تو کرو ورنہ ہم عینی کی شادی دوسری جگہ کردیں گے۔''

''پھر، تم نے ساہوکار سے سود پر قرضہ لے لیا؟'' میں نے پوچھا۔

''کیا کرتا صاحب! عینی کے بغیر تو میں زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔''

''تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ عینی کو یہیں بلا لو۔'' میں نے کہا۔

''کہاں صاحب!'' وہ افسردگی سے بولا ''یہ تو آپ جیسے افسر لوگ کرسکتے ہیں۔ ہمیں اپنی فیملی کو بلانے کی اجازت کب ہے؟ اجازت اگر مل بھی جائے تو کمپنی ہمیں رہنے کی جگہ نہیں دے گی، کھانا بھی خود کھانا پڑے گا۔ اب میری کمائی اتنی تو نہیں ہے کہ میں عینی کو یہاں بلالوں۔''

وہ کبھی کبھی موڈ میں ہوتا تو بنگالی کا کوئی گیت گانے لگتا۔ اس کی آواز بہت اچھی تھی اور بنگال کی موسیقی میں تو یوں بھی بہت نغمگی ہوتی ہے۔ گیت کے بول سمجھ میں نہ آنے کے باوجود میں اور جاوید بہت محظوظ ہوتے تھے۔ ایک گانا تو مجھے اب تک یاد ہے جسے وہ دل سے گاتا تھا۔ ''ایک ٹی پاکھیر دوٹی پا کھا۔'' یعنی ایک پرندے کے دو پیر ہیں جن سے وہ ترقی کے آسمان کو چھوئے گا۔ بقول نورل یہ قومی نغمہ 1971ء سے قبل بہت مقبول تھا۔ ایک پرندہ یعنی پاکستان دو پر یعنی مشرقی و مغربی پاکستان۔ اس نغمے کی موسیقی تو اچھی تھی ہی مگر جب سے میں نے اس کے معنی سے آگاہی حاصل کی تھی، بار بار سنانے کو کہتا کہ ہمارے نادان سیاست دانوں نے کتنی بڑی

شہر کرمان 29.56 درجے شمالی عرض بلد اور 56.6 درجے مشرقی طول بلد میں ایک وسیع و عریض میدان کے مغرب میں پہاڑوں کے عین قریب واقع ہے جن میں سے دو، جن کے اوپر قدیم مسمار قلعے ہیں، نے تو اسے آغوش میں لے رکھا ہے۔ یہ کسی وقت ایران کا خوشحال ترین شہر تھا اور وسعت میں دارالحکومت اصفہان سے ہی دوسرے نمبر پر تھا۔ یہ خراسان، بلخ، بخارا، ماوراء النہر اور ایرانی سلطنت کے دیگر شمالی حصوں سے براہِ راست بندر عباس سے مربوط و منسلک ہونے کی وجہ سے عظیم ترین تجارتی مرکز تھا اور دولت، عیش و عشرت اور شان و شوکت کا گڑھ تھا۔ اس مشہور شہر کے اصل بانی کے متعلق کوئی مثبت شہادت موجود نہیں تاہم عرب حملے کے وقت آخری ایرانی بادشاہ یہاں پناہ گزین ہوا اور اسے اپنا دارالسلطنت بنالیا حتیٰ کہ پوری سلطنت فتح ہوگئی اور زرتشت کے پیرو منتشر ہوگئے۔ اسے ساحل پر واقع شہر ہرمز کا ہم عصر قرار دے سکتے ہیں جسے ساسانی خاندان کے کسی ابتدائی شہنشاہ نے بنوایا اور نوے ہجری کے تاریخی مسودے کے اعتبار سے اسی کے نام سے موسوم ہوا۔ اس کی وجہ تسمیہ کے سلسلے میں کئی روایات ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ یہ لفظ ''خرمن'' سے نکلا ہے بمعنی اناج گھر اور یہ بوجہ بہتات ہوا جو اسے نصیب رہی۔ اس کے ماخذ اور نام کی دوسری روایت یہ ہے کہ ایک شہزادی موجودہ شہر کے محل وقوع کے قریب ایک سیب کھا رہی تھی کہ اس کے وسط سے ایک کرم یعنی کیڑا نکلا اور اس نے اسی وقت قسم کھائی کہ وہ عین اسی جگہ ایک شہر بسائے گی جو سیب کے کیڑے کی طرح اپنے گرد و پیش سے بہرہ مند و خورسند ہوگا۔ یہ توجیہات افسانوی ہیں اور کوئی وقعت نہیں رکھتیں لیکن یہ اس کے محل وقوع کے حسن انتخاب کی تائید ضرور کرتی ہیں جس کی بنا پر اس نے اتنے خوفناک نشیب و فراز دیکھے کیونکہ مشرق کا کوئی اور شہر اس کی طرح گردشِ ایام کا تختۂ مشق یا مہلک ترین اندرونی اور بیرونی جنگوں کا شکار نہیں رہا۔

لیفٹیننٹ ہنری پوٹنگر کے 1816ء میں لکھے گئے ''سفر نامہ بلوچستان اور سندھ'' سے اقتباس

تلاش: اظہر جمیل صدیقی، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

غلطی کی جس کی وجہ سے مشرقی پاکستان بنگلہ دیش میں بدل گیا۔

مجھے آئے ہوئے دوسرا مہینا تھا۔ اب تک مجھے شاہانہ کو فون کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

اس دن میری نائٹ ڈیوٹی لگی۔ میں نے آٹھ، ساڑھے آٹھ بجے کے قریب شاہانہ کا نمبر ملایا۔

دوسری طرف سے کوئی مردانہ آواز سنائی دی ”ہیلو!“

”السلام علیکم!“ میں نے کہا۔

”وعلیکم السلام۔ کون صاحب بول رہے ہیں؟“

”میں سعودی عرب سے بول رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”کون......؟ جاوید......!“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ اس کا مطلب تھا کہ شاہانہ کے گھر والے جاوید کو بھی جانتے تھے۔

”جی نہیں، میں نعیم بول رہا ہوں۔ شاہانہ کا کلاس فیلو۔“ میں نے جھوٹ بولا۔ شاہانہ مجھ سے جونیئر تھی۔

”نعیم صاحب! شاہانہ تو اس وقت گھر میں ہے نہیں۔ کوئی پیغام ہو تو آپ مجھے دے دیں۔“

”بس آپ انہیں بتا دیجئے گا کہ سعودی عرب سے نعیم کا فون آیا تھا۔ آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟“

”میں شاہانہ کا بھائی ہوں خالد!“ اس نے جواب دیا ”میں آپ کا پیغام شاہانہ کو پہنچا دوں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں ساری رات یہی سوچتا رہا کہ شاہانہ کا بھائی جاوید کو کیسے جانتا ہے؟ پھر میں نے خود ہی سوچا کہ شاہانہ نے ہی جاوید کا تذکرہ کیا ہوگا۔ اس کا بھائی بھی کسی کالج میں پڑھتا ہوگا اور جاوید سے واقف ہوگا۔

اس کے بعد بھی کئی مرتبہ میں نے فون کیا، کبھی اس کے بھائی نے فون اٹھایا، کبھی اس کے والد نے اور کبھی والدہ نے۔ مجھے ہر بار یہی جواب ملتا کہ شاہانہ اس وقت موجود نہیں ہے۔

میں نے سوچا کہ اب میں رات کو ایسے وقت فون کروں گا جب ان لوگوں کے پاس یہ کہنے کا بہانہ نہیں ہوگا کہ شاہانہ گھر میں موجود نہیں ہے۔ گو یہ انتہائی بداخلاقی تھی لیکن میں شاہانہ سے بات کرنے کو پاگل ہو رہا تھا۔

میں اس انتظار میں تھا کہ کب میری نائٹ ڈیوٹی ہو اور کب میں شاہانہ کے گھر فون کروں۔

ایک ہفتے بعد مجھے اس کا موقع مل ہی گیا۔ میں انتظار کرتا رہا کہ وقت زیادہ سے زیادہ گزر جائے تاکہ شاہانہ سے بات ہو سکے۔

میں نے رات تقریباً ساڑھے بارہ بجے شاہانہ کے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔ اس وقت پاکستان میں رات کے ڈھائی بجے ہوں گے۔

ان دنوں ٹیلی فون میں سی ایل آئی کا سسٹم نہیں تھا۔ چار پانچ گھنٹیاں بجنے کے بعد مجھے شاہانہ کے والد کی نیم غنودہ آواز سنائی دی ”ہیلو!“

”السلام علیکم!“ میں نے بہت ادب سے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام۔“ اس کے والد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ”کون؟“

”انکل، میں سعودی عرب سے نعیم بول رہا ہوں۔ پلیز ذرا شاہانہ سے بات کرا دیں۔“

”تم ہوش میں تو ہو؟“ وہ دہاڑ کر بولے ”یہ کوئی وقت ہے فون کرنے کا؟ اور تم ہوتے کون ہو شاہانہ سے بات کرنے والے؟ میں تم جیسے لفنگوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ آیندہ یہاں فون کیا تو میں بہت بُری طرح پیش آؤں گا۔“

”آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں انکل!“ میں نے کہا ”میں ایسا لڑکا نہیں ہوں۔ مجھے شاہانہ نے خود ہی یہ نمبر دیا تھا ورنہ......“

”اب تُو میری بیٹی پر بہتان طرازی بھی کرے گا۔“ اس کے والد تم سے تو پر آ گئے ”وہ تجھ جیسے لفنگے کو نمبر کیوں دینے لگی۔ تُو نے پہلے بھی دسیوں دفعہ فون کیا لیکن میں نے ہمیشہ طرح دی اور یہی کہا کہ شاہانہ موجود نہیں ہے۔ کوئی شریف اور سمجھ دار لڑکا ہوتا تو اس وقت سمجھ جاتا کہ میں شاہانہ سے اس کی بات نہیں کرانا چاہتا۔ اب اگر تُو نے فون کیا تو میں سیدھا تیرے باپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ شاہانہ اگر واقعی تجھے جانتی ہے تو تیرے گھر کا پتا بھی جانتی ہوگی۔“

”اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی قبلہ! آپ ایک دفعہ شاہانہ کو بتائیں تو......“

مجھے احساس ہوا کہ دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہو چکا ہے اور میں ڈیڈ لائن پر باتیں کر رہا ہوں۔

میری تو عجیب کیفیت ہو گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ لوگ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ کیا وہ لوگ مجھے آوارہ اور لفنگا لڑکا سمجھ رہے ہیں جو لڑکیوں سے بات کرنے کے لیے جھوٹ بولتے ہیں کہ میں امریکا سے بول رہا ہوں، میں کینیڈا سے بول رہا ہوں، وغیرہ وغیرہ۔

میری بے چینی کو جاوید نے بھی بھانپ لیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا ”کیا بات ہے نعیم! تمہیں یہاں کوئی پریشانی ہے؟“

”یار، مجھے گھر بہت یاد آ رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ایک مہینے بعد تمہاری ملازمت مستقل ہو جائے گی۔ پھر میں تمہیں ایک ہفتے کی چھٹی دلا دوں گا۔ تم پاکستان کا ایک چکر لگا لینا۔ اس وقت تو تمہارا جانا مناسب نہیں ہوگا۔ پہلی بات تو یہ کہ کمپنی سے تمہیں چھٹی نہیں ملے گی، اگر جاؤ گے تو پھر ملازمت بھی جاتی رہے گی۔ ہر کمپنی کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔“

”یار، یہ اصول اور قاعدے میں بھی جانتا ہوں۔“ میں نے جھنجلا کر کہا۔

”اس کے باوجود تم ایسی بچکانا بات کر رہے ہو۔“ جاوید نے نرم لہجے میں کہا ”ذرا صبر سے کام لو، میں جب یہاں آیا تھا تو میرا بھی دل نہیں لگتا تھا۔ میں تو اس وقت بالکل اکیلا تھا۔ تمہارے ساتھ کم سے کم میں تو ہوں۔ چلو، آج میں تمہیں امیتابھ کی نئی فلم دکھاتا ہوں۔ اس کا کیسٹ آج ہی آیا ہے۔“ جاوید مجھے بچوں کی طرح بہلا رہا تھا۔

یوں بھی وی سی آر ہماری واحد تفریح تھی۔ ہم وی سی آر پر فلمیں دیکھتے یا پھر بازار کا ایک چکر لگا کر واپس آ جاتے۔ کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدلنے کو باہر کھانا بھی کھا لیتے۔ وہاں دو چار پاکستانیوں اور بھارتیوں نے بھی ریسٹورنٹ بنا لیے تھے اور وہاں دیسی کھانے مل جاتے تھے۔

اس دوران نورل کو چھٹی مل گئی اور وہ گھر والوں اور بیوی کے لیے بہت سے تحفے تحائف لے کر خوشی خوشی بنگلہ دیش چلا گیا۔

ایک مہینے بعد وہ واپس آیا تو بہت افسردہ اور کھویا کھویا سا تھا۔

”کیا بات ہے نورل؟“ میں نے پوچھا ”کیا عینی سے لڑائی ہو گئی ہے؟“

”صاحب جی!“ اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ”یہ سالا پیسا انسان سے زیادہ اہم کیوں ہے؟“

”پیسا انسان سے زیادہ اہم کیسے ہو سکتا ہے؟“ میں نے کہا۔

”ہو سکتا ہے صاحب!“ اس نے متفکروں والے انداز میں کہا ”عینی کے گھر والے بہت لالچی لوگ ہیں۔ اب انہوں نے یہ شرط رکھی ہے کہ اگر تم پچاس ہزار روپے دو گے تو عینی کی رخصتی کریں گے۔“

”تو کیا عینی ابھی تک رخصت ہو کر تمہارے گھر نہیں آئی؟“

”کیسے آتی صاحب جی!“ نورل نے کہا ”میں تو اپنا دل بہلانے کو آپ سے جھوٹ بولتا رہا کہ عینی سے میری شادی ہو گئی ہے۔“

”تو کیا تمہاری شادی نہیں ہوئی ہے؟“ جاوید نے حیرت سے پوچھا ”اور وہ جو تم نے سود پر قرضہ لیا تھا؟“

”وہ تو میں نے سعودی عرب آنے کی لیے ایجنٹ کو دیا تھا۔“ نورل نے کہا ”اس وقت عینی کے گھر والوں نے یہ شرط رکھی تھی کہ بیس ہزار لے کر عینی کی شادی کریں گے۔ میں نے ان سے ایک سال کی مہلت مانگی تھی۔ میں ایک سال میں بیس ہزار تو جمع کر ہی لیتا۔ اب میں گھر گیا تو معلوم ہوا کہ اس کے گھر والے پچاس ہزار مانگ رہے ہیں۔“

”ایسے لالچی لوگوں میں تو رشتہ کرنا ہی حماقت ہے نورل!“ جاوید نے کہا ”کل وہ کہہ دیں گے کہ انہیں ایک لاکھ چاہیے، پھر تم کیا کرو گے، کیا زندگی بھر اسی آس میں پیسے جمع کرتے رہو گے کہ عینی ایک دن تمہیں مل جائے گی۔“

نورل حسبِ عادت آنسو بہانے لگا اور روتے ہوئے بولا ”صاحب! ابھی اگر کہیں سے مجھے صرف تیس ہزار مل جائیں تو میں عینی کے گھر والوں کے منہ پر وہ رقم مار کے عینی کو بیاہ لاؤں۔ اس مرتبہ وہ اپنی بات سے نہیں مکر سکتے۔ میں نے گاؤں کے کئی لوگوں کو بیچ میں ڈالا ہے لیکن ان کی شرط وہی ایک سال کی ہے۔ ایک سال میں پچاس ہزار میں کیسے کماؤں گا صاحب!“

”ابھی تک تم نے کتنے پیسے جمع کیے ہیں؟“

”میرے پاس اس مہینے کی تنخواہ ملا کر اکیس ہزار ہو جائیں گے۔“ نورل نے کہا۔

”تم ایسا کرو، تیس ہزار مجھ سے لے لو اور جا کر عینی کو بیاہ لاؤ۔“ جاوید نے کہا۔

نورل نے بے یقینی سے جاوید کو دیکھا، پھر بولا ”صاحب! مجھ سے ایسا مذاق مت کرو۔“

”یہ مذاق نہیں ہے نورل!“ جاوید نے کہا ”تم کہو تو میں ابھی تمہیں تیس ہزار کا چیک دے دوں۔“

”صاحب! اس پر سود کتنا ہوگا؟“ نورل نے سادگی سے پوچھا۔

”میں کوئی سود خور ہوں کہ سود لوں گا۔“ جاوید ہنس کر

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بولا ”یہ تو میری طرف سے تمہاری شادی کا تحفہ ہوگا۔“

نورل پر گویا شادی مرگ کی کیفیت طاری ہوگئی۔ وہ مارے خوشی کے رونے لگا، پھر بولا ”صاحب جی! اگر یہ مذاق ہوا تو میں مرجاؤں گا، میں یہ صدمہ برداشت نہیں کرسکوں گا۔“

جاوید نے اپنی الماری کھولی، اس میں سے چیک بک نکالی اور تیس ہزار روپے کا چیک لکھ کر نورل کے حوالے کردیا۔ ”تم یہ رقم کل ہی اپنے بینک میں جمع کرادو۔ اب تمہیں یقین آیا کہ یہ مذاق نہیں ہے۔“

چیک ہاتھ میں لے کر نورل پاگلوں کی طرح اُچھلنے کودنے لگا۔ وہ کبھی روتا تھا، کبھی ہنستا تھا، کبھی جاوید کو دعائیں دیتا تھا۔

”نورل!“ میں نے کہا ”تمہاری شادی پر کچھ خرچہ بھی آئے گا نا۔“ میں نے پوچھا ”اس کے لیے دس ہزار میں بھی تمہیں دوں گا۔“

”میں پاگل ہوجاؤں گا صاحب!“ نورل نے کہا۔

”تم پاگل ہونے سے پہلے عینی سے شادی ضرور کرلینا۔“ میں نے کہا اور اسے دس ہزار کا چیک لکھ دیا۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ اسے دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ جیسے وہ عینی کی محبت میں پاگل ہے، اس طرح میں بھی شاہانہ کے لیے دیوانہ ہورہا ہوں۔

نورل چونکہ ابھی چھٹی سے واپس آیا تھا اس لیے اسے فوری طور پر چھٹی نہیں مل سکتی تھی۔

جاوید نے اسے سمجھایا کہ تم ایک مہینا صبر کرلو، پھر میں کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر تمہیں چھٹی دلوادوں گا۔

نورل ان دنوں بہت خوش تھا اور ہر وقت گنگناتا رہتا تھا۔ زیادہ موڈ میں ہوتا تو اپنے گاؤں، اپنے لوگوں اور خاص طور پر عینی کی باتیں شروع کردیتا کہ عینی کے بال اتنے لمبے ہیں، اس کی آنکھیں بہت خوبصورت ہیں اور وہ چلتی ہے تو گویا دلوں پر قیامت ڈھادیتی ہے۔

عینی حسین بھی رہی ہو لیکن نورل کے لیے تو وہ ملکہ حسن تھی۔

میں نے اس دن کے بعد سے شاہانہ کے گھر فون نہیں کیا تھا بلکہ اب میں خود پاکستان جا کر اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ ابھی مزید پندرہ دن باقی تھے، پھر میں مستقل ہوجاتا۔ اس کے بعد بھی چھٹی ملنے میں ہفتہ دس دن تو لگ ہی جاتے۔

اس رات ہی نورل ہمارے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا کہ اچانک ہمارے دروازے پر دستک ہوئی۔

”کون ہے بھئی، آجاؤ۔“ جاوید نے کہا۔

”نورل یہاں ہے صاحب!“ ہمارے دفتر کے چوکیدار کی آواز آئی۔

”ہاں، یہیں ہے۔“

”بنگلہ دیش سے اس کے دوست سلامت کا فون آیا تھا۔ وہ ابھی پھر فون کرے گا۔“

”خیریت تو ہے؟“ جاوید نے چونک کر پوچھا۔

نورل جیسے غریب آدمی کا فون تفریحاً تو آ نہیں سکتا تھا۔ ان دنوں ایک شہر سے دوسرے شہر فون کرنے میں اچھے خاصے پیسے لگتے تھے، کہاں اس کا دوست بنگلہ دیش سے ٹیلی فون کررہا تھا۔

نورل اُٹھتے ہوئے بولا ”دعا کرنا صاحب! میرے گھر میں سب خیریت ہو۔“

”ارے انشاء اللہ سب ٹھیک ہوگا۔ تم پریشان مت ہو۔“

نورل ڈرا سہما وہاں سے رخصت ہوگیا۔ اس کے جانے کے بعد جاوید نے کہا ”یار نعیم! دعا کر کہ نورل کے گھر میں سب خیریت ہو۔ وہ بتارہا تھا کہ اس کی ماں کی طبیعت خراب ہے۔“

آدھے گھنٹے بعد نورل آیا تو اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے جسم کا پورا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں تھا۔

”خیریت تو ہے نورل!“ میں نے پوچھا۔

وہ خاموشی سے مجھے یوں دیکھتا رہا جیسے میری بات اس نے سنی ہی نہ ہو۔

”کیا بات ہے نورل! کس کا فون تھا؟“ جاوید نے قدرے بلند آواز میں پوچھا۔ اس کی خاموشی سے ہم بھی پریشان ہوگئے تھے۔

”سب کچھ ختم ہوگیا صاحب...... سب کچھ ختم ہوگیا۔“ اس نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

”کیا ختم ہوگیا؟“ میں نے پوچھا ”دیکھو نورل! صاف صاف بتاؤ، کیا بات ہے؟“

”اب بتانے کے لیے باقی ہی کیا رہ گیا ہے صاحب جی!“ وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔

ہم نے اسے رونے دیا تا کہ اس کے دل کی بھڑاس نکل جائے۔ جب رو رو کر وہ کچھ بولنے کے قابل ہوا تو بولا ”صاحب جی! آپ میری بات کا یقین نہیں کرتے تھے نا...... کہ پیسا انسان سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ عینی نے ثابت کردیا کہ پیسا زیادہ اہم ہوتا ہے۔ وہ...... وہ......“

”کیا ہوا اسے؟“ جاوید نے پوچھا۔

”اس کے گھر والوں نے اشرف سے ایک لاکھ روپیا لے کر اس کی شادی کردی۔“ وہ پھر بلک بلک کر رونے لگا۔

”ایسی لالچی عورت سے شادی کر کے تم ہمیشہ پریشان رہتے نورل!“ جاوید نے کہا ”شکر کرو کہ تمہاری جان چھوٹ گئی۔“

”ایسا مت بولو صاحب!“ نورل نے کہا ”میں اب یہاں رہ کر کیا کروں گا؟“

”نورل! دنیا بہت بڑی ہے۔ تمہاری جیب میں پیسا ہوگا تو تمہیں عینی سے بھی زیادہ اچھی اور خوبصورت لڑکی مل جائے گی۔“

”مگر عینی تو نہیں ملے گی صاحب!“ وہ پھر رونے لگا۔

ہم نے بہت مشکل سے اسے تسلی دلاسے دے کر خاموش کرایا۔

دوسرے دن معلوم ہوا کہ نورل نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور وہ واپس بنگلہ دیش جارہا ہے۔

جاوید نے اس سے کہا ”نورل! تم نے بہت غلط فیصلہ کیا ہے۔ تم کہو تو میں اب بھی تمہارا استعفیٰ واپس لے سکتا ہوں۔ تمہارے ماں باپ، بہن بھائی ہیں، کیا انہیں پیسوں کی ضرورت نہیں ہے؟“

”میں تو یہاں صرف عینی کی خاطر آیا تھا صاحب!“ نورل نے کہا ”ماں باپ اور بہن بھائیوں کو تو وہاں رہ کر بھی دو وقت کی روٹی کھلا سکتا ہوں۔“

میرے اور جاوید کے لاکھ سمجھانے پر بھی وہ استعفیٰ واپس لینے پر راضی نہ ہوا۔

رخصت ہوتے وقت اس نے جاوید کا اور میرا چیک اپنے بٹوے سے نکالے اور ہمیں لوٹاتے ہوئے بولا ”یہ آپ کی امانت صاحب! اب مجھے اس کی بھی ضرورت نہیں۔“

”پاگل مت بنو نورل!“ جاوید نے کہا ”میں نے یہ رقم تمہاری شادی کے لیے دی تھی۔ تم آخر شادی تو کرو گے نا؟“

ہمارے بہت سمجھانے بجھانے پر اس نے دونوں چیک رکھ لیے اور روتا ہوا روانہ ہوگیا۔

نورل کے جانے کے بعد عجیب سا سناٹا اور ویرانی چھا گئی۔ اس کے دم سے ہمارے اس کمرے میں بہت رونق تھی۔

کمپنی کی طرف سے جاوید کو دوسرا ملازم ملا لیکن اس نے انکار کردیا کہ مجھے ملازم کی ضرورت نہیں ہے۔

نورل کے جانے کے ایک ہفتے بعد میری ملازمت بھی مستقل ہوگئی۔

دوسرے دن جاوید نے مجھے بتایا کہ ”یار نعیم! اب ہم دونوں پاکستان ساتھ چلیں گے۔“

”کیا تو بھی چھٹی لے رہا ہے؟“ میں نے خوش گوار حیرت سے پوچھا۔

”ہاں یار!“ جاوید مسکرا کر بولا ”مجبوری ہے۔“

”کیسی مجبوری؟“ میں چونک کر بولا۔

”پریشان مت ہو یار!“ جاوید ہنس کر بولا ”مجبوری یہ ہے کہ میری شادی ہورہی ہے۔“

”ارے واہ!“ میں نے اس کی پیٹھ پر ایک دھپ ماری ”تو تو چھپا رستم نکلا یار! تو نے شادی بھی طے کرلی اور مجھے ہوا تک نہیں لگنے دی۔“

”میں نے تو صرف فرحانہ کو اس لڑکی کے بارے میں بتایا تھا، امی اور ابو نے جا کر بات طے کرلی اور فرحانہ نے مجھے اس خیال سے نہیں بتایا کہ وہ مجھے سرپرائز دے گی۔“

”یار! تو، تو اب گیا کام سے۔“ میں نے ہنس کر کہا ”اب تو میری کیا اہمیت رہ جائے گی۔ تو ہوگا اور تیری بیوی ہوگی۔ میں آج ہی سے اپنے لیے علیحدہ رہنے کا بندوبست شروع کردیتا ہوں۔“

”تیرا کیا دماغ چل گیا ہے۔“ جاوید نے کہا ”یار! میں شادی کر کے فوراً تو بیوی کو یہاں لانے سے رہا۔ اور لاؤں گا بھی تو اس کے لیے مکان کا بندوبست کروں گا۔ اس مکان میں اتنی گنجائش تو ہوگی کہ ایک کمرا تجھے بھی دے سکوں۔“

”یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں۔“ میں نے کہا ”یہ تو بتا، کیا لڑکی سوتیلی ہے؟“

”کیوں؟“ جاوید نے چونک کر پوچھا کیونکہ میں نے یہ بات بہت سنجیدگی سے کہی تھی۔

”وہ اس لیے کہ لڑکی کے ماں باپ کو تجھ میں آخر ایسا کیا نظر آیا کہ وہ اپنی بیٹی کو اندھے کنویں میں دھکیلنے پر آمادہ ہوگئے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

جاوید بھی میرے ساتھ ہنسنے لگا اور بولا ”میری تو نہیں، ہاں تیری بیوی ضرور سوتیلی ہوگی۔“

”اچھا، یہ تو بتا۔ وہ ہے کون جس کے نصیب تیرے ساتھ پھوٹ رہے ہیں؟“

”یار، تو بھی اسے اچھی طرح جانتا ہے۔“ جاوید نے ہنس کر کہا ”ہمارے کالج ہی میں پڑھتی تھی۔“

”روحی!“ میں نے پوچھا۔ وہی ایک ایسی لڑکی تھی جو کالج میں سب سے زیادہ جاوید کے ساتھ دیکھی جاتی تھی۔ وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھی بھی بلا کی حسین۔

"نہیں یار، اس پرکٹی سے میں کیوں شادی کرنے لگا۔"

"پھر یقیناً ثمینہ ہوگی۔" میں نے ہنس کر کہا۔ ثمینہ بھی تقریری مقابلوں میں حصہ لیتی تھی اور جاوید کے بہت قریب تھی۔

"نو!" جاوید نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

"اچھا تو پھر خود ہی بتا دے، فضول میں میرا دماغ کیوں خراب کررہا ہے؟"

"تو اندازہ لگا تو جانوں؟" جاوید نے گویا مجھے چیلنج کیا۔ میں نے پھر دماغ پر زور دیا "شہلا! ہاں...... وہ شہلا ہی ہوسکتی ہے۔ وہ بھی تو تیری دیوانی تھی۔"

"یار، یہ سب خوبصورت تتلیاں محض دیکھنے کی ہوتی ہیں۔" جاوید سنجیدگی سے بولا "اچھی بیوی تو وہی ثابت ہوتی ہے جو خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ خوب سیرت اور ذہین بھی ہو۔"

"اچھا یار، میں نے ہار مان لی۔" میں نے کہا "کالج میں تو اتنی لڑکیاں تھیں کہ ان کا نام لیتے لیتے صبح ہوجائے گی۔ ان میں سے بہت سی لڑکیاں خوبصورت بھی تھیں اور خوب سیرت بھی۔"

"چل تو بھی کیا یاد کرے گا۔" جاوید نے کہا "اب تو نے ہار مان ہی لی ہے تو میں تجھے نام بتا دیتا ہوں۔ اس کا نام ہے شاہانہ!"

میرے نزدیک اگر بم کا دھماکا بھی ہوتا تو مجھے اتنا دھچکا نہیں پہنچتا جو شاہانہ کا نام سن کر پہنچا تھا۔

"کون شاہانہ؟" میں نے مزید تصدیق کے لیے پوچھا۔

"ارے یار! تو بھول گیا، تو نے ہی تو اس سے میرا تعارف کرایا تھا۔ وہ براؤن بالوں اور براؤن آنکھوں والی گوری لڑکی!"

اب مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ صرف جاوید کے ہونٹ ہلتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ہنس ہنس کر نہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔

پھر وہ بلند آواز میں بولا "میری بات سن بھی رہا ہے یا تو کہیں اور پہنچا ہوا ہے؟"

"آں...... ہاں...... میں سب کچھ سن رہا ہوں۔" میں نے چونک کر کہا اور بہت مشکل سے اپنے آنسوؤں کو ضبط کیا۔

اس وقت چپراسی نے آکر بتایا کہ جاوید صاحب کو بڑے صاحب بلا رہے ہیں۔ چیف انجینئر بڑا صاحب تھا۔

جاوید مسکراتا ہوا چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میرے آنسو بہنے لگے۔ جاوید نے ایک مرتبہ پھر مجھے مات دے دی تھی۔ اس کے لیے میرے دل میں جو نفرت تھی اس میں کئی سو گنا اضافہ ہوگیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ جاوید کا گلا گھونٹ دوں، اسے ذبح کردوں یا گولیوں سے چھلنی کردوں لیکن دل چاہنے سے تو کچھ نہیں ہوتا۔ اب میں شاہانہ کے بارے میں جاوید کو بتا کر خود کو مزید ذلیل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی واپسی تک میں خاصی حد تک سنبھل چکا تھا۔

جاوید نے واپس آکر بتایا کہ چیف انجینئر صاحب ہم دونوں کو ایک ساتھ چھٹی نہیں دے سکتے۔ تم دونوں میں سے کسی ایک کا یہاں رہنا ضروری ہے۔"

"یار! ایسا کرتا ہوں، میں اپنی شادی ایک ماہ کے لیے ملتوی کردیتا ہوں۔" جاوید نے کہا "پہلے تو گھر کا ایک چکر لگا لے۔"

"پاگل پن کی باتیں مت کر۔" میں نے کہا "میں کوئی ننھا بچہ تو نہیں ہوں کہ گھر جانے کے لیے بلک رہا ہوں۔ جب میں نیا نیا آیا تھا تو بات اور تھی۔ اب تو یہاں کی عادت سی ہوگئی ہے۔"

"ویسے یار! تیرے بغیر شادی میں کیا خاک لطف آئے گا؟"

"چل، میں تیرا ولیمہ یہاں بھی کردوں گا۔ تو فکر کیوں کرتا ہے؟"

میں جس مقصد کے لیے پاکستان جانا چاہتا تھا، وہ مقصد ہی اب نہیں رہا تھا۔ مجھے شاہانہ سے بھی کوئی شکایت نہیں تھی۔ میں نے کب اسے اپنے دل کا حال بتایا تھا یا اس نے کب مجھ سے کسی بھی قسم کے عہد و پیمان کیے تھے۔ یہ میری سستی تھی یا بدبختی کہ میں نے اپنے گھر والوں کو وہاں رشتے کے لیے نہیں بھیجا ورنہ آج جاوید کی جگہ میں ہوتا۔ کچھ بھی تھا لیکن جاوید پھر ایک دفعہ میرے راستے کی دیوار بن گیا تھا۔ اگر جاوید نہ ہوتا تو ظاہر ہے کہ شاہانہ کی شادی مجھ سے ہوتی۔

جاوید جانے کی تیاری کرنے لگا۔ وہ روز ہی شاپنگ کرنے جاتا تھا اور مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ اس نے تایا ابو، تائی امی اور فرحانہ کے لیے نہ جانے کیا کچھ خرید لیا، پھر اس نے شاہانہ کے لیے کپڑے، کاسمیٹکس اور جیولری کا بہترین سامان خریدا، بقیہ شاپنگ اس نے کراچی میں کرنے کا ارادہ کیا اور ہم سے رخصت ہوکر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد تنہائی مجھے بُری طرح کھلنے لگی۔

میں راتوں میں دیر تک باہر گھومتا رہتا اور تھک کر اپنے کمرے میں پڑ کر سو جاتا۔

میری اور جاوید کی الماری تو الگ الگ تھیں لیکن جاوید اپنی الماری بھی کھلی چھوڑ گیا تھا۔

میں نے یوں ہی ایک دن اس کی الماری کھول لی۔ اس میں جاوید کے کپڑے اور اوپر والے خانے میں کچھ کاغذات اور خطوط تھے۔

خطوط جاوید کو کوئی لکھتا نہیں تھا، وہ خط لکھنے کا یوں بھی چور تھا۔ وہ تایا ابو سے فون پر بات کرلیتا تھا۔

میں نے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہوکر خطوط کا وہ بنڈل نکال لیا۔

لفافے میں سے خط نکالا تو وہ اب تک خوشبو میں مہک رہا تھا۔ اسے پڑھ کر میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا، لکھا تھا۔

"جان سے پیارے جاوید! ہمیشہ خوش رہو۔ جب سے تم گئے ہو، میرا دن کا چین اور راتوں کی نیندیں حرام ہوگئی ہیں۔ میں تو ایک ایک پَل کانٹوں پر گزار رہی ہوں کہ کب تم واپس آؤ گے اور کب میں تمہاری صورت دیکھوں گی۔ بس اب جلدی سے آجاؤ ورنہ...... تمہاری اور صرف تمہاری...... شانو!"

"شانو کون؟" میں نے سوچا اور دوسرا خط نکال لیا۔ اس میں لکھا تھا۔

"جانو! کل تمہارا فون آیا تو میں نیم غنودگی میں تھی لیکن میں نے فوراً ہی ریسیور اُٹھا لیا ورنہ ابو یا خالد بھائی فون اُٹھا لیتے تو مجھے پھر ایک دن سولی پر لٹک کر انتظار کرنا پڑتا۔ ہاں، فون اگر کوئی اور اُٹھالے تو کوئی بھی فرضی نام لے لینا اور رانگ نمبر کہہ کر لائن کاٹ دینا، کبھی یہ مت کہنا کہ شاہانہ سے میری بات کرادیں......"

مجھ سے آگے نہیں پڑھا گیا۔ یہ شانو، شاہانہ ہی تھی۔ گویا ان کے درمیان عشق و محبت کا کھیل کافی عرصے سے جاری تھا اور جاوید یوں معصوم بن رہا تھا جیسے اسے کچھ پتا ہی نہ ہو۔ اس نے یہ بات مجھ سے کیوں چھپائی؟ یہ سوچ کر میرے دل میں پھر جاوید کے خلاف نفرت کی ایک شدید لہر اُٹھی۔

میں یہ سوچ سوچ کر انگاروں پر لوٹ رہا تھا کہ جاوید تو وہاں رنگ رلیاں منا رہا ہوگا اور میں اپنی ہی آگ میں جل رہا ہوں۔

ان دنوں مجھ سے کام بھی صحیح طریقے سے نہیں ہو رہا تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ میرے دل کو سکون مل گیا۔ میں تو ہمیشہ جاوید کی جیت کو اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کرلیتا تھا۔ حالانکہ وہ میری قسمت کا لکھا نہیں بلکہ میرے اعمال کا نتیجہ ہوتا تھا۔ جاوید اگر پڑھائی میں مجھ سے آگے تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ محنت کرتا تھا، وہ اگر غیر نصابی سرگرمیوں میں پیش پیش رہتا تھا تو یہ اس کا اعتماد تھا۔ اس بے چارے نے تو مجھے بھی مقرر اور گلوکار بنانے کی اپنی سی کوشش کرلی تھی۔ ان سب کے باوجود وہ اس وقت مجھے اپنی خوشیوں کا سب سے بڑا قاتل نظر آرہا تھا۔

ایک مہینا پلک جھپکتے گزر گیا۔ جاوید پاکستان سے لوٹا تو خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ وہ پاکستان سے میرے لیے وہ چیزیں لایا تھا جو سعودی عرب میں دستیاب نہیں ہوتیں لیکن مجھے ذرا بھی خوشی محسوس نہ ہوئی کیونکہ اس نے مجھے زندگی کی اس خوشی سے محروم کردیا تھا جو مجھے سعودی عرب کیا، دنیا میں کہیں بھی، کسی بھی قیمت پر نہیں مل سکتی تھی۔

وہ مجھے ہنس ہنس کر اپنی شادی کے واقعات سنا رہا تھا اور میں اوپری دل سے سن رہا تھا۔

اس نے مجھ پر زور دیا کہ میں بھی اب پاکستان کا چکر لگا لوں۔ میں اسے ایک مہینے تک ٹالتا رہا، پھر یہ سوچ کر راضی ہوگیا کہ اسے کسی قسم کا شبہ نہ ہوجائے۔

میں نے بھی سب لوگوں کے لیے بہت سے تحائف لیے، بالخصوص شاہانہ کے لیے بہت خوبصورت ساڑیاں اور سونے کا ایک سیٹ خریدا اور دل پر پتھر رکھ کر پاکستان روانہ ہوگیا۔

امی ابو سے مل کر میں وقتی طور پر اپنا غم بھول گیا۔ جاوید کا گھر ہمارے گھر سے ملا ہوا تھا۔ درمیان میں دیوار تھی جس میں تایا ابو نے دروازہ نکلوا دیا تھا۔

میری آمد کی اطلاع پاکر فرحانہ بھی بھاگی ہوئی آگئی اور بولی "اوہو، میرے تو مزے آگئے بھئی! ابھی جاوید بھائی

سندھ کا حکمراں سمرا خاندان دودا (جولا ولد تھا) کی موت 694ھ پر تین سو پینتیس سال کے اقتدار کے بعد ختم ہوگیا۔ دودا کے بعد سندھ ایک دفعہ پھر قریباً ایک صدی کے لیے طوائف الملوکی کی نذر ہوگیا۔ دو بھائی خیرامل اور ارک مل کچھ عرصہ قابض رہے لیکن موخرالذکر کے ظلم و ستم کے خلاف سمہ قبیلے کا سردار وزیروں کے ساتھ محل میں داخل ہوا اور اسے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ لوگوں نے اسے نجات دہندہ سمجھ کر بادشاہ بنالیا اور وہ جام (سردار) کے لقب سے تخت نشین ہوا کیونکہ وہ اپنے خاندان کو مشہور شاہ ایران جمشید کی اولاد سمجھتا تھا۔

لیفٹیننٹ ہنری پوٹنگر کے 1816ء میں لکھے گئے "سفرنامہ بلوچستان اور سندھ" سے اقتباس
تلاش: اظہر جمیل صدیقی، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

میرے لیے ڈھیروں تحفے لائے تھے اور اب نعیم بھائی سوٹ کیس بھر لائے۔"

"تجھے یہ خوش فہمی کیوں ہو گئی چڑیل کہ میں تیرے لیے بھی کچھ لایا ہوں؟" میں نے اسے چھیڑنے کو کہا۔

"اس لیے کہ بھوت انسانوں کے لیے تو تحفے لا نہیں سکتے۔" فرحانہ نے برجستہ جواب دیا۔ اس کے جواب پر ابو اور تایا ابو تک ہنسنے لگے۔

میں نے سب کے تحفے دینے کے بعد فرحانہ سے کہا "فرحانہ! یہ میں بھابی کے لیے بھی کچھ لایا ہوں، یہ تم انہیں دے دو۔"

"واہ، میں کیوں دوں؟" فرحانہ نے آنکھیں نچائیں "آپ خود دیں اور آپ کو تو بعد میں انہیں منہ دکھائی بھی دینا ہے۔"

امی نے بھی کہا کہ تمہیں اپنے ہاتھوں سے شاہانہ کو تحفہ دینا چاہیے۔

میں شام تک نہا دھو کر فریش ہو کر جاوید کے گھر پہنچ گیا۔

مجھے دیکھ کر فرحانہ نے جھٹ شاہانہ کے چہرے پر گھونگٹ ڈال دیا اور بولی "نعیم بھائی، ایسے نہیں، آپ پہلے بھابی کو منہ دکھائی میں کچھ دیں، پھر آپ کو چہرہ دکھاؤں گی۔"

میں نے زیورات کے سیٹ کا ڈبا شاہانہ کے ہاتھ پر رکھ دیا اور کہا "یہ میری طرف سے آپ کے لیے حقیر سا نذرانہ ہے۔"

شاہانہ نے گھونگٹ اُلٹ کر مجھے سلام کیا اور بولی "اگر یہ حقیر سا نذرانہ ہے تو بیش قیمت نذرانہ کیسا ہوتا ہے؟"

"بہت سے لوگوں کے لیے دنیا کی قیمتی ترین چیز بھی حقیر لگتی ہے شاہانہ...... بھابی!" میں نے کہا۔

"اچھا بھئی، آپ لوگ باتیں کریں، میں ذرا نعیم بھائی کے لیے چائے بنالوں۔"

فرحانہ کے جانے کے بعد میں نے آہستہ سے پوچھا "شاہانہ! میں نے تمہیں وہاں سے کتنی دفعہ ٹیلی فون کیا، تم نے ایک دفعہ بھی مجھ سے بات نہیں کی۔"

"میں نے تمہیں بتایا تو تھا نعیم کہ ہمارا گھرانا آزاد خیال نہیں ہے۔ تم چھوٹتے ہی کہتے تھے کہ شاہانہ سے بات کرا دیں۔ اب بھلا کون سا ایسا باپ اور بھائی ہوگا جو آدھی رات کو کسی غیر لڑکے کا فون اپنی بیٹی کو پکڑا دے گا۔"

"تم جاوید سے فون پر بات نہیں کرتی تھیں؟" میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

شاہانہ نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر بولی "اس کا مطلب کہ جاوید نے تم سے کچھ نہیں چھپایا؟"

"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ جاوید کی نظروں میں میری کیا حیثیت ہے۔ پھر ایسا بے تکا سوال کیوں کر رہی ہو؟"

"اس کے باوجود تم مجھے فون کرتے رہے؟"

"میرا خیال تھا کہ تم نے جاوید کے حوالے سے اپنے گھر والوں کو میرے بارے میں بتا دیا ہوگا۔"

"گھر والوں کو کیا بتاتی؟" شاہانہ نے کہا "بہرحال مجھے افسوس ہے کہ آپ کو زحمت اُٹھانا پڑی۔"

اسی وقت فرحانہ چائے لے کر آگئی اور بولی "ارے بھابی! افسوس کیسا! یہ زحمت تو نعیم بھائی ہر بار اُٹھائیں گے۔ آپ کو پتا ہے، بچپن میں جب میں کسی چیز کے لیے ضد کرتی تھی تو جاوید بھائی تو مجھے ڈانٹ دیتے تھے لیکن نعیم بھائی نے کبھی میری فرمائش نہیں ٹالی۔"

"تیری فرمائش ٹال کر مجھے کیا اپنا سکون حرام کرنا تھا۔ ایسی بلا کی طرح روتی تھی کہ محلے والے سمجھتے تھے کہ فرحانہ کی بہت زبردست پٹائی ہو رہی ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

فرحانہ نے جواب میں زبان نکال کر میرا منہ چڑا دیا۔

مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا، نہ اپنا گھر، نہ فرحانہ کی باتیں، نہ تایا ابو کی محبت! میں کچھ دیر وہاں بیٹھ کر چلا آیا۔ اس دوران میں بھی شاہانہ، جاوید ہی کے بارے میں پوچھتی رہی کہ وہ کیسے ہیں، کھانا تو وقت پر کھاتے ہیں، انہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟ میں نے اسے یقین دلایا کہ جاوید گھر سے زیادہ آرام میں ہے۔ وہاں اسے سوائے کام کے اور کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا۔ اب جس کام سے وہ وہاں گیا ہے، وہ کام تو اسے کرنا ہی ہوگا۔

میری بات پر شاہانہ ہنسنے لگی۔

میں شام کو باہر نکل گیا اور محلے کے چند دوستوں کے ساتھ ایک ہوٹل میں جا بیٹھا۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ بے روزگار تھے یا اگر ملازمت کر بھی رہے تھے تو وہ اپنی ملازمت سے مطمئن نہیں تھے۔ ہر شخص نے مختلف انداز میں مجھ سے ایک ہی بات کی کہ کسی طرح میرے لیے بھی وہاں کوئی گنجائش نکالو۔

سعودی عرب میں رہ کر مجھے پیدل چلنے کی عادت نہیں رہی تھی۔ میں نے رینٹ اے کار سے ایک گاڑی لی اور اپنے کالج اور پولی کلینک کے تمام دوستوں سے ملاقات کی۔

میں صبح گاڑی لے کر نکل جاتا تو پھر رات ہی کو گھر میں گھستا تھا۔

ایک دن میں گھر میں داخل ہوا تو ابو مجھ پر برس پڑے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

”نعیم! تم ہم سے ملنے پاکستان آئے ہو یا آوارہ گردی کرنے؟“ ابو کی آواز بہت گرج دار تھی اور غصے میں تو وہ بہت زور سے بولتے تھے۔

ان کی آواز سن کر تایا ابو اور فرحانہ دوڑی ہوئی آ گئی

”کیا ہوا چچا جان!“

”کچھ نہیں بیٹی!“ ابو نے اپنا لہجہ نرم کرتے ہوئے کہا ”یہ جب سے آیا ہے، ماں باپ کے پاس دو گھڑی بھی نہیں بیٹھتا۔ صبح گاڑی لے کر نکل جاتا ہے تو رات کی خبر لاتا ہے۔ نہ جانے کہاں واہی تباہی گھومتا پھرتا ہے، کیا کھاتا ہے، کیا پیتا ہے؟ اگر یہ اس لیے پاکستان آیا ہے تو گھر آنے کے بجائے کسی ہوٹل میں ٹھہرتا۔“ ابو کی آواز ایک مرتبہ پھر بلند ہوگئی۔

”ابو...... وہ...... دراصل...... میرے دوست......“

”تمہارے دوست ہی تمہارے سب کچھ ہیں۔“ ابو پھر گرجے۔

”اچھا ابو! اب معاف کردیں، کل سے میں بالکل باہر نہیں جاؤں گا۔“

”چچا جان!“ فرحانہ نے کہا ”نعیم بھائی میٹرک کے اسٹوڈنٹ نہیں ہیں جو آپ انہیں ابھی تک اس انداز میں ڈانٹتے ہیں۔ بے چارے سہم کر رہ گئے۔“

فرحانہ کی بات پر ابو کو ہنسی آ گئی۔ ایک وہی تھی جو غصے میں ابو کو منا لیا کرتی تھی۔ وہ بچپن سے یہی کرتی آئی تھی۔ مجھے اس لمحے اس پر بہت پیار آیا۔

دوسرے دن میں نے گاڑی واپس کردی اور زیادہ وقت گھر میں گزارنے لگا۔

ابو دوپہر کے کھانے کے وقت گھر آتے تھے تو ان سے دنیا جہان کی باتیں کرتا تھا۔ انہیں سعودی عرب کے بارے میں بتاتا تھا کہ وہاں لوگ کیسے رہتے ہیں؟

”بیٹا! ہماری تو بس ایک ہی تمنا ہے۔“ امی نے کہا ”تو ہمیں حج کرادے۔“

”تم حج کی فکر مت کرو۔“ ابو نے کہا ”اس کے لیے میں نے پہلے ہی بندوبست کرلیا ہے۔ اپنے پیسے سے حج کرنے کا مزہ ہی اور ہے۔“

”ابو! کیا آپ میرے پیسے کو اپنا پیسا نہیں سمجھتے؟“ میں نے سنجیدگی سے کہا ”آپ ہی تو کہا کرتے تھے کہ نعیم میرا بینک ہے۔ میں آج اس میں پیسا جمع کر رہا ہوں تو کل پائی پائی وصول بھی کرلوں گا۔“

ابو میری بات سن کر مسکرانے لگے۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ آیندہ سال انشاءاللہ آپ لوگوں کو، تایا ابو اور امی کو بھی حج کراؤں گا۔

”اور نعیم بھائی مجھے......؟“ فرحانہ نے کہا۔

”تجھے حج کرائے گا تیرا شوہر!“ میں نے کہا ”تو کیا ہمیشہ ہمارے سینوں پر مونگ دلتی رہے گی۔ ہم تجھے اسی سال چلتا کردیں گے۔“

”چچا جان!“ فرحانہ نے منہ بسور کے کہا ”نعیم بھائی کی باتیں سن رہے ہیں آپ؟“

”بیٹی! ایک طرح سے وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے، ہاں اس کے کہنے کا انداز غلط ہے۔“

”چچا جان! آپ بھی......“ فرحانہ منہ بسورتی ہوئی چلی گئی۔

☆☆☆

جیسے تیسے وہ ایک مہینا گزرا اور میں واپس سعودی عرب آ گیا۔

جاوید مجھ سے بار بار شاہانہ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ بالکل خیریت سے ہے، بس تمہارے لیے اداس رہتی ہے۔

”یار، میں کوشش تو کر رہا ہوں کہ اسے یہیں بلا لوں لیکن اس میں وقت لگے گا۔“

میری زندگی اپنی ڈگر پر چل نکلی لیکن نعیم سے نفرت میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ خاص طور پر اس وقت جب وہ فون پر شاہانہ سے بات کرتا تھا یا راتوں کو جاگ جاگ کر اسے لمبے لمبے خط لکھتا تھا۔

اس دن میں حسب معمول ڈیوٹی پر تھا۔ میں نے آپ کو شاید بتایا نہیں کہ میں نے الیکٹریکل انجینئرنگ میں ڈپلوما کیا تھا اور نعیم مکینکل انجینئر تھا۔

اچانک ایک پلانٹ چلتے چلتے رک گیا۔ میں نے خرابی تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ پلانٹ میں بجلی کی سپلائی منقطع ہوگئی ہے۔

اس کے لیے الگ سے ایک بہت بڑا کمرا بنا ہوا تھا جہاں سے الیکٹرک سپلائی کی جاتی تھی۔ میں نے مین سوئچ آف کیا اور پاور روم کے باہر لگا ہوا سرخ بلب جلا کر اندر چلا گیا۔ سرخ بلب جلنے کا مطلب یہ تھا کہ اندر کوئی کام کر رہا ہے اس لیے الیکٹرک کا مین سوئچ نہ کھولا جائے۔ اس دروازے کے ساتھ ہی مین سوئچ کا ہینڈل تھا۔ ایسے میں اگر

کوئی مین سوئچ کھول دیتا تو پاور روم میں کام کرنے والا شدید کرنٹ لگنے سے ہلاک ہو جاتا۔

خرابی اس پلانٹ کے فیوز ہی میں تھی۔ میں نے پانچ منٹ سے بھی کم عرصے میں اپنا کام مکمل کیا اور باہر آ کر مین سوئچ آن کردیا۔ سرخ بلب بند کیا اور واپس پلانٹ پر آ گیا۔ پلانٹ نے کام شروع کردیا تھا۔

میرے چیف انجینئر نے اسے بھی میری مہارت سمجھا اور مجھے بہت شاباش دی۔ اس کا انداز ایسا شاہانہ تھا کہ اس نے وہیں کھڑے کھڑے میری تنخواہ میں پانچ سو ریال کا اضافہ کردیا۔

جاوید کو معلوم ہوا تو وہ بھی بہت خوش ہوا اور بولا ”یار نعیم! بس اسی طرح محنت اور لگن سے کام کرتا رہ، ایک سال میں کمپنی تجھے پراجیکٹ انجینئر کے عہدے پر ترقی دے دے گی۔“

اس دن صبح ہی سے میرا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ عجیب سی وحشت محسوس ہو رہی تھی۔ میں اس دن چھٹی کرنا چاہ رہا تھا لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی کام پر آ گیا۔ کاش میں اس دن چھٹی ہی کرلیتا۔

میں نے آ کر تمام پلانٹس کا جائزہ لیا۔ ورکرز کی پروگریس دیکھی اور مطمئن ہو کر اپنے اس چھوٹے سے کیبن میں آ کر بیٹھ گیا جو میرے لیے مخصوص تھا۔

میں نے اچانک جاوید کو پاور روم کی طرف جاتے دیکھا۔

”یہ وہاں اس وقت کیوں جا رہا ہے؟“ میں نے سوچا اور اس کے پیچھے لپکا۔

وہ اس وقت تک مین سوئچ آف کر کے پاور روم میں جا چکا تھا۔ باہر سرخ بلب جل رہا تھا۔

اچانک میرے اندر کی نفرت بیدار ہوگئی اور میرا پورا جسم نفرت کی آگ میں جلنے لگا۔ اس وقت ارد گرد کوئی بھی نہ تھا۔ میں نے نفرت سے مغلوب ہو کر سرخ بٹن آف کیا اور مین سوئچ آن کردیا اور تیزی سے اپنے کیبن میں آ کر بیٹھ گیا۔

اچانک پوری فیکٹری میں خطرے کے سائرن بجنے لگے۔ سائرن کی منحوس آواز سے میرا دل اتنی زور زور سے دھڑکنے لگا کہ گویا سینہ توڑ کر باہر آ جائے گا۔

میں نے نفرت سے مغلوب ہو کر یہ قدم اٹھا تو لیا تھا اور پچھتا رہا تھا اور دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ جاوید کو زیادہ گزند نہ پہنچی ہو۔

تھوڑی دیر بعد مجھے چیف انجینئر نے بلایا اور گلوگیر لہجے میں بولا ”مسٹر نعیم! تمہارا کزن ایک ایکسی ڈنٹ میں ایکسپائر ہوگیا۔“

”ایکسی ڈنٹ؟“ میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

”ہاں، یہ ایک حادثہ ہی تھا۔“ چیف انجینئر نے نرم لہجے میں کہا۔ ”جاوید پاور روم میں کام کر رہا تھا لیکن وہ ریڈ بلب آن کرنا بھول گیا تھا۔ پھر شاید کمپنی ہی کے کسی آدمی نے مین سوئچ آن کردیا۔ جاوید اس وقت پاور روم میں بے فکر ہو کر کام کر رہا تھا۔ اسے اتنا زبردست کرنٹ لگا ہے کہ اس کی موت فوری طور پر واقع ہوگئی۔ میں نے اس کیس کو مقامی پولیس کے حوالے کردیا ہے لیکن پولیس اگر معلوم کر بھی لے گی تو کیا ہوگا؟ غلطی تو جاوید کی تھی، اسے ریڈ بلب آن کر کے اندر جانا چاہیے تھا لیکن جب انسان کی موت آتی ہے تو معمولی سی غلطی بھی اس کا بہانہ بن جاتی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ کمپنی نے ایک انتہائی قابل انجینئر اور میں نے ایک بہترین دوست کھو دیا۔“

چیف انجینئر اس کے علاوہ بھی کچھ کہہ رہا تھا لیکن مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ میرے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ پھر اچانک مجھے ایسا لگا جیسے چھت میری طرف گر رہی ہو۔ میں اچانک زمین پر گر پڑا اور مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

مجھے ہوش آیا تو میں کمپنی کے اسپتال میں تھا۔ کمپنی والوں نے جاوید کا تابوت تیار کردیا تھا۔

چیف انجینئر نے مجھ سے کہا ”مسٹر نعیم! میں نے تمہاری پاکستان روانگی کا بندوبست کردیا ہے۔ مسٹر جاوید کی ڈیڈ باڈی لے کر تم پاکستان جاؤ گے۔ میں نے جاوید کے فادر کو بھی فون پر انفارم کردیا ہے۔ تم جاوید کی ضروری چیزیں پیک کرلو۔ آج رات کی فلائٹ سے تمہاری روانگی ہے۔ میں نے تمہاری دس دن کی چھٹی بھی منظور کرلی ہے، ہری اپ!“ وہ یہ کہہ کر چلا گیا۔ یہ کہتے ہوئے اس گورے کی آنکھیں بھی نم تھیں۔ اس کا جاوید سے کیا رشتہ تھا؟ صرف دوستی کا پھر بھی وہ ملول تھا۔ اور میں؟؟

جاوید نے ہمیشہ مجھے بھائیوں سے بڑھ کر چاہا، ہر ہر موقعے پر میری مدد کی اور میں نے اس کا یہ صلہ دیا۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں بھی اپنی جان دے دوں لیکن میں بزدل ہوں۔ جان دینا بھی تو بہت بہادری کا کام ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں جاوید کی چیزیں پیک کر کے فارغ ہوا ہی تھا کہ پوسٹ مین جاوید کے نام ایک خط دے گیا۔ میں نے اُلٹ پلٹ کر اس رجسٹری لفافے کو دیکھا۔ اس پر ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں جاوید کا نام اور کمپنی کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس پر بنگلہ دیش کی مہر تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ خط نورل نے جاوید کو بھیجا ہے۔

میں نے لفافہ چاک کیا تو اس میں سے دو چیک اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں لکھا ہوا ایک خط برآمد ہوا۔ خط کا مفہوم یہ تھا کہ نورل نے خودکشی کرلی ہے۔ اس نے مرنے سے پہلے میرے نام ایک خط لکھا تھا کہ میرے بٹوے میں دو چیک پڑے ہیں، تم انہیں سعودی عرب میں اس ایڈریس پر بھیج دینا۔''

میرے ہاتھ میں تیس ہزار اور دس ہزار کے دو چیک تھے جو میں نے اور جاوید نے نورل کو دیے تھے۔

میں نے دونوں چیک جیب میں رکھے اور اپنے آنسو پونچھنے لگا۔ نورل بھی اپنی دھن کا پکا تھا۔ وہ اَن پڑھ اور جاہل آدمی تھا لیکن اس نے محبت میں کسی کی جان نہیں لی بلکہ اپنی جان دے دی۔

مجھے خود سے کراہیت سی محسوس ہوئی کہ میں نے اپنے محسن کو اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اب میں کس منہ سے تایا ابو، تائی امی، فرحانہ اور سب سے بڑھ کر شاہانہ کا سامنا کروں گا؟

☆☆☆

میں جاوید کی میت لے کر پاکستان پہنچا تو ایک کہرام مچ گیا۔ جاوید کی موت پر پورا محلہ اشکبار تھا۔ شاہانہ کو تو سکتہ ہوگیا تھا۔ اس کے بھائی اور فرحانہ کی کوشش سے بہ مشکل تمام اس کے سکتے کی کیفیت ختم ہوئی۔

سب کچھ ختم ہوگیا تھا۔ دنیا میرے لیے ویران ویران ہوگئی تھی۔

میں نے واپس سعودی عرب نہ جانے کا فیصلہ کرلیا۔ میں اگر واپس جاتا تو یقیناً پاگل ہوجاتا۔

زندگی کے شب و روز اسی طرح گزرتے رہے۔ مجھے نہ کھانے کا ہوش تھا، نہ پہننے کا۔ میں ہفتوں شیو نہیں کرتا تھا۔ میرے کپڑے میلے چیکٹ رہنے لگے تھے۔ ابو سمجھتے تھے کہ مجھے جاوید کی موت کا غم ہے۔ ہاں، مجھے جاوید کی موت کا غم تھا لیکن اس سے زیادہ مجھے اس بات کا افسوس تھا کہ اس کا قاتل میں ہوں۔

☆☆☆

جاوید کی موت کو چھ مہینے گزر چکے تھے۔ ایک دن تایا ابو نے دبے لفظوں میں کہا ''نعیم بیٹا! جاوید تجھے سب سے زیادہ چاہتا تھا۔ کیا تو اس کے بچے کو سہارا نہیں دے گا؟''

میں نے حیرت سے ابو کی طرف دیکھا۔

تو تایا ابو پھر بولے ''ہاں بیٹا! وہ بدنصیب باپ بننے والا تھا لیکن اپنی اولاد کی خوشی بھی نہ دیکھ سکا۔''

''تایا ابو! میں جاوید کے بیٹے کو ہر طرح سے سہارا دینے کو تیار ہوں۔''

''تو پھر تو شاہانہ سے شادی کرلے۔'' ابو نے کہا۔

''نہیں ابو! میں یہ نہیں کرسکتا۔ شاہانہ سے شادی کرکے میں ہر وقت جاوید کو یاد کرتا رہوں گا۔ نہ میں اسے خوش رکھ پاؤں گا، نہ خود خوش رہ سکوں گا۔''

تایا ابو بے چارے خاموش ہوگئے۔

اس رات میں سو رہا تھا کہ اچانک کسی نے مجھے جھنجوڑ کر جگا دیا۔ میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ میرے سامنے شاہانہ کھڑی تھی۔

''کیا بات ہے شاہانہ! خیریت تو ہے؟''

''تم یہ بتاؤ نعیم، کہ تم نے شادی سے انکار کیوں کیا؟ اب تمہارے راستے کی رکاوٹ بھی دور ہوگئی ہے۔ اب تمہیں کیا اعتراض ہے؟''

''یہ تم کیسی باتیں کررہی ہو شاہانہ!'' میں نے کہا۔

''تم نے شادی سے انکار کرکے نہ صرف میری توہین کی ہے بلکہ اپنے دوست کی بھی توہین کی ہے۔''

یہ کہہ کر شاہانہ پیر پٹختی ہوئی واپس چلی گئی۔

☆☆☆

میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی شاہانہ سے شادی کرلی لیکن اس کے بعد سے مجھے ایک لمحے کو بھی سکون نہیں ملا۔

جاوید کا بیٹا نوید اب جوان ہوگیا ہے۔ اس کے علاوہ ہماری کوئی اولاد نہیں ہے۔ اولاد ہو بھی کیسے سکتی ہے؟ میں نے جب بھی شاہانہ کے قریب ہونے کی کوشش کی، مجھے جاوید کا ہیولا دکھائی دیتا ہے، دوسری طرف نورل قہقہہ لگا کر کہتا ہے، محبت مارنے کا نہیں، مرنے کا نام ہے صاحب!''

مجھے لگتا ہے کہ میں پاگل پن کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ میں گڑگڑا کر اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہوں لیکن شاید معافی بھی اب میرے مقدر میں نہیں ہے۔

پسند

جناب مدیراعلیٰ
السلام علیکم!
کافی عرصے بعد ایک سچ بیانی ارسال کررہا ہوں۔ دراصل سرگزشت کے لیے سچ بیانی تلاش کرنا آسان بھی تو نہیں ہے۔ پچاس ساٹھ لوگوں کی آپ بیتیاں سنو تو کسی ایک کی اس قابل نکلتی ہے کہ اسے لکھا جاسکے۔ ویسے یہ کہانی بھی بُری نہیں ہے گو کہ انداز تھوڑا دلچسپ بھی رکھا ہے تاکہ قارئین کو شگفتگی کا احساس رہے۔

فاروق انجم
(فیصل آباد)

گرمی الوداعی بوسے لے رہی تھی۔ سردیوں کا آغاز ہورہا تھا۔ موسم کے اس تغیر میں ہمارے گھر میں بھی ایک ہلچل سی برپا تھی۔ گھر کے سبھی افراد فیصلہ کرچکے تھے اور اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے دوڑ دھوپ بھی شروع ہوچکی تھی۔ اپنے طے شدہ منصوبے کے مطابق جھٹ پٹ ہی سب کچھ کرنے کے لیے ایک سعی جاری تھی۔

گھر میں ایک میں ہی تھا جو کنوارا تھا۔ سب بھائیوں کی شادی ہوچکی تھی۔ بہنیں اپنے گھر کی ہوگئی تھیں۔ میری نوکری کو لگے بھی ایک سال ہوگیا تھا۔ کام کے بعد گھر آتا تو مجھے میرے بھتیجے اور بھتیجیاں گھیر لیتے تھے۔ ان سے فارغ ہوتا تو اپنے دوستوں کی طرف چلا جاتا تھا۔ وہاں سے آتا تو ٹیلی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

وڑن کے آگے یوں بیٹھ جاتا تھا جیسے وہ ابھی مجھے کوئی دعا دے گا۔ رات گہری ہو جاتی تو سب اپنے اپنے کمروں میں بند ہو جاتے تھے اور ایک میں ہی ہوتا تھا جو ٹیلی وژن کے آگے براجمان ہوتا تھا۔ بعض اوقات تو مجھے یہ لگنے لگتا تھا کہ میں نہیں بلکہ ٹیلی وژن مجھے دیکھ رہا ہے۔

شاید میری اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے دادا جان نے اپنا فیصلہ ابا جی کو سنایا اور ابا جی نے دادا جان کی بات امی جان کو پہنچادی اور امی نے سب بھائیوں اور بھابیوں کو جمع کرکے اعلان کردیا کہ لڑکی کی تلاش کرو، عقیل کی شادی نومبر نہیں تو دسمبر میں لازمی کردینی ہے۔

اس اعلان کے بعد میرے لیے لڑکی کی تلاش زور شور سے شروع ہوگئی۔ خاندان میں جتنی کنواری لڑکیاں موجود تھیں تو ان کی طرف سب نے نظریں دوڑائیں، ایک کو نظر میں رکھ کر خوبیاں، خامیاں نکالی جانے لگیں، خامیاں نکالنے کی گنتی زیادہ ہوجاتی تو نظر دوسری لڑکی کی طرف چلی جاتی اور جب اس میں بھی کوئی خامی نکل آتی تو نگاہ کسی اور لڑکی کی تلاش میں لگ جاتی اور پتا چلتا کہ خاندان کی لڑکیاں بس یہی تھیں جو نکتہ اعتراض کی نذر ہو کر ختم ہوگئیں۔

ہمارے ایک دور کے رشتے دار نے خاندان سے باہر ایک گھرانے کی نشاندہی کی اور ان کی شرافت کے ایسے گن گائے کہ کوئی پیشہ ور گلوکار بھی کیا گاتا ہوگا۔ پہلے ابا جی، امی جان اور بڑی بھابی اس گھر میں لڑکی دیکھنے کے لیے گئے۔ انہوں نے آتے ہی ایسی مسرت کا اظہار کیا کہ گھر میں شور مچ گیا کہ لڑکی پسند آگئی ہے۔ اس کے بعد لڑکی کی طرف سے اس کے ابا، امی اور کچھ رشتے دار خواتین ہمارے گھر آئیں اور مجھے انہوں نے بالکل ایسے ہی دیکھا جیسے کوئی قربانی کا بکرا دیکھتا ہے۔ اس کے بعد ہمارے گھر والے دادا جان کے ساتھ پھر ان کے گھر گئے اور دادا جان نے ہاں کردی۔ اور ایک ہفتے کے بعد رسم منگنی اور بعد میں شادی خانہ آبادی کا پروگرام ترتیب دے دیا۔

☆☆☆

ایک عجیب سی مسرت کا احساس مجھے بھی تھا۔ ہمارے خاندان کی روایت کے مطابق شادی کی رات تک لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کو نہیں دیکھتے تھے لیکن گھر کے افراد لڑکی کی جو تعریف میں زمین و آسمان ایک کرتے تھے، اس سے یہ پتا چلتا تھا کہ لڑکی خوبصورت ہے۔ مجھے بھی اب اندر ہی اندر منگنی اور پھر شادی کا انتظار ہونے لگا تھا۔

وہ سرمئی شام تھی۔ میں گھر سے نکل کر ایسے ہی باہر چہل قدمی کے لیے نکل گیا تھا۔ اچانک ایک اسٹور کے آگے سے گزرتے ہوئے ایک لڑکی میرے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ میں بھی ٹھٹک گیا اور اس لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں اور ہم دونوں کے چہرے یکدم خوشی سے دمک اُٹھے اور میرے منہ سے خوشگوار حیرت سے نکلا

”روبی......تم......!“

”عقیل، تم یہاں کیا کررہے ہو؟“ روبی کے چہرے پر حیرت اور خوشی ایک ساتھ رقصاں تھی۔

”میں تو یونہی ٹہلنے کے لیے اِدھر آگیا تھا۔ اتنے سال کے بعد اچانک تم سے یوں ملاقات ہوجائے گی، میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا۔“ میں اپنی خوشی اور حیرت چھپا نہیں پا رہا تھا۔

”اور جو مجھے خوشی ہورہی ہے، وہ میں بیان نہیں کرسکتی۔“ روبی نے کہا۔

”کہیں بیٹھیں؟“ میں نے اس کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

اس کی رضامندی کے ساتھ ہی ہم دونوں قریب ہی ایک ریسٹورنٹ کی طرف چلے گئے۔

روبی اور میں ایک ساتھ کالج میں پڑھا کرتے تھے۔ ہماری بہت اچھی دوستی تھی۔ ہم کالج میں فارغ وقت ایک ساتھ بیٹھتے تھے، گپ شپ لگاتے تھے، دوستوں کو مذاق کا نشانہ بناتے تھے۔ ایک دوسرے کی پڑھنے اور نوٹس بنانے میں مدد کرتے تھے۔ خوشی غمی میں ایک دوسرے سے اس کا اظہار کرتے تھے۔ اتنا کچھ کرنے کے باوجود میرے دل میں جو محبت کی پتیاں اس کے لیے کھل گئی تھیں، ان کی مسحور کن خوشبو کو میں اس کے کانوں تک پہنچانے کی ہمت نہیں کرسکا تھا۔ پتا نہیں مجھ میں ہمت نہیں تھی یا کہ میں کسی مناسب وقت کا انتظار کررہا تھا۔ میں ایسا بھی سوچتا تھا کہ یہ بات بھی کرلوں گا اتنی بھی کیا جلدی ہے۔

میرے بات کرنے سے قبل روبی اچانک درمیان میں ہی پڑھائی چھوڑ کر کالج سے غائب ہوگئی تھی۔ کوئی اتا پتا ہی نہیں چل رہا تھا۔ ایک ہفتے کے بعد پتا چلا تھا کہ اس کے والد کا تبادلہ ہوگیا ہے اور وہ شہر چھوڑ گئے ہیں۔ ساری باتیں دل میں ہی رہ گئیں۔ پیار اور چاہت کی جو پتیاں دل کی زمین پر ایک ایک کرکے روز کھلی تھیں، وہ سوکھنے لگی تھیں۔ وقت گزرتا رہا، پھر روبی سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی اور وہ ساری پتیاں وقت نے خود ہی معدوم کردیں اور دل کی زمین پھر سے غیر آباد ہوگئی تھی۔

آج اچانک اس سے ملاقات ہوگئی۔ اس نے بتایا کہ ایک سال قبل اس کے والد کی ریٹائرمنٹ کے بعد وہ پھر اس شہر میں آگئے اور اب اسی شہر میں مقیم ہیں۔

☆☆☆

ایک طویل عرصے کے بعد روبی سے ملاقات نے میری زندگی ہی بدل دی تھی۔ وہ پھول کی پتیاں جو پیار محبت کا پیغام لے کر میرے دل کی زمین پر کھلی تھیں اور وقت کی دھول نے انہیں سوکھا دیا تھا، وہ پھر سے ہری بھری ہوگئی تھیں۔ ان کی خوشبو پھر لوٹ آئی تھی۔

دو دن کے بعد میری پھر روبی سے ملاقات ہوئی۔ اس دن کیونکہ وقت کم تھا اس لیے وہ ملاقات بس سرسری سی ہوئی تھی۔ زیادہ باتیں نہیں ہوئی تھیں اور ہم نے دو دن کے بعد ملاقات کا وقت اسی جگہ طے کیا تھا۔ میں نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ میں روبی سے اپنے دل کی بات کہہ دوں گا۔ اور اگر روبی نے میری محبت قبول کرلی تو جس لڑکی سے منگنی ہونے جارہی تھی، وہ میں اپنے خاندان والوں سے کہہ کر رکوا دوں گا۔

ہم دونوں اپنے آگے گرم چائے کے کپ رکھ کر کچھ دیر کالج کی یادیں تازہ کرتے رہے جیسے گملوں میں عدم توجہ کی وجہ سے اس میں لگے پودے مٹی سے اَٹ جاتے ہیں اور پھر پانی کے چھڑکاؤ سے وہ پودے تر و تازہ دکھائی دینے لگتے ہیں، ایسے ہی ہم نے اپنے کالج کی یادوں پر سے مٹی کی گرد کو اپنی باتوں کے چھڑکاؤ سے پھر سے تازہ کردیا تھا۔

اس کے بعد میں نے اپنے دل کی بات کہنے کے لیے بات سے بات نکال کر کہنا شروع کیا ”کچھ باتیں جلد کہنے کے لیے ہوتی ہیں لیکن ہم کہنے میں ایسی سستی کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ وہ باتیں ادھوری رہ جاتی ہیں اور زندگی کی مسافت آگے نکل جاتی ہے۔ آج وقت ایک بار پھر ہمارے سامنے کھڑا ہوگیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اب دیر کرنے کے بجائے وہ بات کہہ دوں جو مجھے بہت پہلے کہہ دینی چاہیے تھی۔“

”وہ کیا بات ہے؟“ روبی نے پوچھا۔

میں نے کچھ توقف کے بعد کہا ”روبی، میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اگر تمہاری رضامندی ہو تو میں اپنی زندگی کا سفر تمہارے ساتھ طے کرنا چاہتا ہوں۔“

میری بات سن کر روبی چپ ہوگئی۔ اس نے متانت سے چائے کے خالی کپ کو دیکھا پھر چمچ اُٹھا کر اسے میز پر ایسے رگڑنے لگی جیسے کوئی ہاتھ میں پنسل پکڑ کر اسے سفید کاغذ پر پھیرنے لگتا ہے۔ اس کے بعد اس نے چمچ ایک طرف رکھ دیا اور بولی۔

”اگر تم ایسا چاہتے ہو تو پھر میرے گھر اپنے گھر والوں کو جلدی بھیج دو۔ کہیں پھر دیر نہ ہوجائے۔“

روبی کے منہ سے یہ الفاظ سنتے ہی میں خوشی سے جھوم اُٹھا۔ وہ بھی ایسا چاہتی تھی۔ اس نے مجھے اپنے گھر کا پتا لکھ کر دے دیا اور میں نے اسے یقین دلایا کہ کل ہی میرے گھر والے تمہارے گھر رشتے کی بات کرنے کے لیے موجود ہوں گے۔ ہم دونوں ہی بہت مسرور تھے۔

☆☆☆

میں نے روبی کا تذکرہ بھابی سے کرنے کے بعد انہیں کہا کہ وہ یہ بات امی کے کانوں تک پہنچا کر میرا یہ پیغام دیں کہ وہ اس لڑکی کے بجائے میری شادی کی بات اس لڑکی سے کریں جو میری پسند ہے۔ میری بات سن کر بھابی نے میری طرف یوں دیکھا جیسے میں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔ بہرحال وہ بات امی تک جا پہنچی، وہاں سے ابا کے کانوں میں چلی گئی، ابا نے دادا جان کو بتادیا اور پھر پورے گھر میں یہ بات کسی افواہ کی طرح پھیل گئی کہ میں اپنی کسی کالج کے زمانے کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور اس لڑکی کے گھر والوں کو صاف انکار کردیا جائے جہاں چند دن کے بعد اس کی منگنی ہونے والی ہے۔

میری دانست میں تھا کہ میری پسند کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے ویسا ہی کیا جائے گا جیسا میں چاہتا ہوں لیکن بات تو اُلٹی ہوگئی۔ دادا جان نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ سارے گھر والوں کو اکھٹا کیا اور مجھے مخاطب کرکے بولے۔

”عمر کے اس حصے میں جبکہ میرے سر اور داڑھی کے بال سفید ہوچکے ہیں۔ جو زبان میں نے لڑکی والوں کو دی ہے، اس سے مکرنا تو ایک طرف میں ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اب تم اس لڑکی کا خیال دل سے نکال دو اور جو ہم نے فیصلہ کیا ہے، دو خاندانوں نے مل کر ایک دوسرے کو زبان دی ہے اس کا پاس کرو۔“ دادا جان نے اپنا فیصلہ سنا کر مجھے مبہوت کردیا۔ اس کے ساتھ ہی خاندان کے ہر فرد نے یہ کہا کہ وہ قطعاً تمہاری پسند کے لیے انکار نہیں کریں گے۔ تمہاری منگنی اور شادی اسی لڑکی سے ہوگی اور اگر تم نے اس کی مخالفت کی تو گھر میں تصادم کھڑا ہوجائے گا۔

سارا خاندان ایک طرف اور میں اکیلا ایک طرف، یوں کھڑا تھا جیسے وہ سب دریا پار کرگئے ہیں اور مجھے کنارے پر کھڑے ڈر ہی لگے جارہا ہے۔ فیصلہ ہوچکا تھا، میری منگنی کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جوں کی توں تیاری ہو رہی تھی اور مجھے کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ میں روبی کو اپنا سکتا۔ جبکہ اس کی محبت میرے دل میں مضطرب موجوں کی طرح مجھے بے چین کر رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ مجھے کوئی ایسا راستہ مل جائے جس سے روبی میری زندگی میں آجائے اور میرے گھر والے اس کے لیے رضا مند ہو جائیں۔

☆☆☆

میں نے روبی سے بہانہ کیا کہ ہمارے خاندان میں لو میرج کا رواج نہیں ہے اس لیے گھر والے فی الحال مان نہیں رہے ہیں لیکن میری کوشش جاری ہے۔ میری بات سن کر روبی کچھ پریشان ہو گئی اور اس نے کہا۔

''میں نہیں چاہتی کہ اس بار بھی دیر ہو جائے۔ تم ایسا کرو، میرے بھائی سے مل کر تم بات کرو۔ وہ بہت ہی معاملہ فہم ہیں۔ ان کا رویہ بہت ہی دوستانہ ہوتا ہے۔ وہ بہت ٹھنڈے مزاج کے مالک ہیں۔ تمہاری بات غور سے سنیں گے اور کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے۔'' روبی نے مجھے مشورہ دیا۔

میں نے کچھ دیر اس کی بات پر غور کیا۔ ہر خاندان میں کچھ ایسے افراد ضرور ہوتے ہیں جو بات سننا اور کرنا جانتے ہیں۔ روبی کا مشورہ مجھے پسند آیا۔ ان کے گوش گزار کرنے کے بعد ممکن ہے کہ وہ میرے گھر والوں سے بات کر کے انہیں منانے میں کامیاب ہو جائیں اور یوں میری شادی روبی سے ہو جائے۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے ان سے ملنا چاہیے۔ اگر وہ ٹھنڈے مزاج کے ہیں تو مجھے یقین ہے کوئی نہ کوئی حل ضرور نکل آئے گا۔'' میرے اندر ایک جوش بھر گیا تھا۔

☆☆☆

روبی کے بتائے ہوئے پتے پر میں کھڑا تھا۔ روبی کو پانے کے لیے میں ہر قدم اُٹھانے کے لیے تیار تھا بلکہ میں قدم اُٹھا چکا تھا۔

روبی کے بھائی کا نام قیصر تھا۔ اس کا کاروں کا شوروم تھا۔ اس وقت وہ اپنے آفس میں اکیلا ہی بیٹھا ہوا تھا۔ میں پہلے تو گھبرایا اور پھر ان کے آفس میں چلا گیا۔

قیصر مجھے تپاک سے ملا اور اس کا لہجہ ایسا شیریں تھا کہ جیسے میں شوگر مل میں آ گیا تھا۔ وہ بہت ہی نرم لہجے کا مالک تھا۔ اپنائیت سے بھرپور اور اجنبی لہجے سے مبرا رویہ تھا۔

''جی فرمائیے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' قیصر نے شیریں لہجے میں پوچھا۔

اس کا رویہ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ میرے مسئلے کا حل اس جگہ موجود ہے۔ پہلے میں نے اپنا اختصار سے تعارف کرایا پھر بتایا کہ میں روبی کے ساتھ کالج میں پڑھتا رہا ہوں۔ ساتھ ہی میں نے یہ بھی اس کے گوش گزار کر دیا کہ میں روبی کو پسند کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اس سے میری شادی ہو جائے اور اس سلسلے میں آپ میری مدد کریں۔

اس خدا کے بندے نے میری ایک ایک بات بڑے تحمل، غور، فکر اور کشادہ دلی سے سنی پھر کچھ توقف کیا اور بولا ''میرے ساتھ چلیں۔''

مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اس کی سمجھ میں میری بات آ گئی ہے۔ میری سچی محبت کو اس نے دل کی گہرائی سے محسوس کر لیا ہے۔ یقیناً وہ مجھے روبی کے سامنے لے جا رہا ہوگا تا کہ وہ تصدیق کر سکے، اس کی بھی رضامندی جان سکے اور اس کے بعد دونوں خاندانوں کے ملاپ کی کوئی صورت نکل آئے گی۔ میں بہت خوش تھا۔

ہم دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔ قیصر گاڑی چلا رہا تھا۔ راستے میں وہ بڑے دوستانہ انداز میں ہلکی حالات پر بات کرتا رہا، کاروباری مسائل کا بھی رونا روتا رہا اور پھر کچھ ہنسی کی بات بھی ہو گئی۔ میرا تو دل چاہ رہا تھا کہ میں قیصر کا ماتھا چوم لوں جس نے میری محبت میں رکاوٹ بننے کے بجائے فوراً مجھے قبول کر لیا تھا۔ میرا دل مسرت سے سرشار تھا۔

قیصر نے گاڑی ایک جگہ کھڑی کی اور گاڑی سے نکل کر ہم ایک گھر کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ قیصر نے بیل دی۔ مجھے لگا کہ یہ روبی کا گھر ہے۔ میں پُرجوش ہو گیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اندر سے ایک آدمی باہر نکلا۔ قیصر نے مجھے دو منٹ کے لیے وہاں رکنے کے لیے کہا اور خود اس کے ساتھ اندر چلا گیا۔

میں سوچ رہا تھا کہ وہ اندر اپنے گھر والوں سے میرے بارے میں مشورہ کر رہا ہوگا۔ ابھی وہ روبی کی رائے جان کر مجھے بھی اندر بلا لیں گے۔ میں چشم تصور میں روبی کو دلہن کے روپ میں دیکھنے لگا۔

کچھ دیر کے بعد دروازہ کھلا۔ قیصر باہر نکل کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ پھر دروازے کے دونوں پٹ کھول دیے گئے۔ میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ قیصر اندر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ اندر کھڑے آدمی سے بولا۔

''ہاں چھوڑ دو۔''

میں حیران تھا کہ کیا چھوڑا جا رہا ہے؟ میرے استقبال میں کیا گیس کے غبارے چھوڑے جا رہے ہیں؟ اچانک کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ کتے اس گھر سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھونکتے ہوئے باہر نکلے۔ وہ تعداد میں تین تھے۔ تینوں خونخوار اور لمبے دانتوں والے تھے۔ وہ بھونکتے ہوئے میری طرف لپکے۔ میں عین وقت پر سمجھ گیا کہ میری باتوں نے قیصر کو اندر سے اُبال دیا تھا۔ بہن کے معاملے میں وہ بھی جذباتی ہے۔

میں سرپٹ بھاگا۔ کتے میرے پیچھے تھے۔ اس دن میں کوئی ایک کلومیٹر تک کتوں سے بچنے کے لیے بھاگتا رہا۔ مجھے قیصر کی یہ بات بالکل اچھی نہیں لگی کہ اسے میری بات پسند نہیں آئی تھی تو منہ سے انکار کر دیتا، پیچھے کتے چھوڑنے کی تو بڑی گھٹیا حرکت تھی۔ یہ میں ہی جانتا تھا کہ میں کیسے بھاگ رہا تھا۔ سب ہی میری طرف دیکھ رہے تھے اور میری جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ بڑی مشکل سے میں نے کتوں سے جان چھڑائی اور ہانپتا کانپتا گھر پہنچ ہی گیا۔

☆☆☆

دو دن کے بعد میری منگنی تھی۔ میں تو اس ڈر سے گھر سے باہر نہیں نکلا کہ کہیں پھر سے وہ خونخوار کتے میرے سامنے نہ آجائیں۔ قیصر کہیں روبی کو لے کر میرے گھر نہ پہنچ جائے۔ شکر ہے کہ میں نے روبی کو اپنے گھر کا پتا نہیں بتایا تھا۔ سارا عشق، پیار اور محبت دُم دبا کر بھاگ گیا تھا۔ گھر والوں کے فیصلے پر آمین کہہ کر میں نے سب کی رضامندی کے ساتھ اپنی رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ سب گھر والے خوش ہو گئے تھے۔

منگنی والی شام کو پہلے میرے گھر والے لڑکی والوں کے گھر گئے اور انگوٹھی پہنانے کی رسم کر کے آگئے اور دوسرے دن شام کو لڑکی والے ہمارے گھر میں موجود تھے۔ اب انگوٹھی پہننے کی میری باری تھی۔

ہمارے گھر میں مہمانوں کی چہل پہل تھی۔ ہنسی مذاق ہو رہا تھا۔ قہقہے چھوٹ رہے تھے۔ چھیڑ چھاڑ بھی ہو رہی تھی۔ میں بھی تیار ہو کر بڑی ٹھاٹ سے اسٹیج پر براجمان تھا۔ انگوٹھی پہنانے کی رسم کے بعد پُرتکلف کھانے کا اہتمام تھا لیکن لڑکی والوں کو کسی کے آنے کا انتظار تھا۔ وہ سب ایک دوسرے سے دھیمی آواز میں اس کے بارے میں دریافت کر رہے تھے اور میں انتظار کر رہا تھا کہ میری انگلی میں بھی اب انگوٹھی جلوہ افروز ہو جائے۔

سب مہمان ایک ہی جگہ براجمان تھے۔ اچانک میری نگاہ دروازے کی طرف گئی اور میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے ہی رہ گئی۔ دل زور سے دھڑکا، مجھے لگا کہ میں ابھی زمین پر گر جاؤں گا۔ میں مبہوت تھا کہ اسے ہمارے گھر کا پتا کس نے بتایا اور وہ یہاں تک بھی پہنچ گیا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ خوف میرے چہرے سے مترشح تھا۔

میرے سامنے قیصر کھڑا تھا۔ وہ سیدھا میری طرف ہی آیا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف یوں دیکھ رہے تھے جیسے فلموں میں پچیس سال کے بچھڑے بھائی مل رہے ہوں۔ میں نے اس کے عقب میں دیکھا کہ وہ اکیلا ہی آیا ہے کہ خونخوار کتے بھی اس کے ساتھ ہی ہیں۔ مجھے کتے دکھائی نہیں دیے تھے۔

قیصر کا یقیناً غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا ہوگا اور وہ مجھے تلاش کرتا ہوا یہاں تک آگیا۔ اب کچھ دیر کے بعد وہ سب کے سامنے میری حقیقت منکشف کر دے گا کہ میں کیسا گھٹیا قسم کا عاشق ہوں۔ اور اس کا مزہ چکھانے کے لیے اس نے کتے پیچھے چھوڑ دیے تھے۔ میرے عاشق ہونے کی کہانی سن کر منگنی کی رسم اسی جگہ دم توڑ جائے گی۔ میں روبی کو کھو چکا تھا، اب یہ رشتہ بھی ہاتھ سے نکل جائے گا۔

قیصر میری طرف بڑھا، میری ٹانگیں کانپ گئیں۔ وہ اور میرے پاس آگیا اور اس نے یکدم مجھے اپنے گلے لگایا۔ مجھے لگا کہ میں بے ہوش ہو جاؤں گا، اچانک قیصر میرے کان میں بولا۔

''مجھے یہاں آکر پتا چلا، مجھے معاف کر دو۔ میں نے آپ کے پیچھے اپنے دوست کے پالتو کتے چھوڑ دیے تھے۔ دراصل ایک غیرت مند بھائی کو جو کرنا چاہیے تھا، اس دن میں نے وہی کیا تھا، مگر آج جب بزرگوں کے سامنے عزت کے ساتھ رشتہ پیش کیا گیا تو بڑوں کے ساتھ میں بھی راضی ہو گیا۔'' وہ کچھ دیر کے لیے چپ ہوا پھر بولا ''رفعت عرف روبی دراصل میری بہن ہے، برائے مہربانی اس دن والے واقعے کو اسی جگہ دفن کر دیں۔ میرے منہ سے بھی کبھی اس کا ذکر نہیں ہوگا۔''

میں نے قیصر کے منہ سے یہ سنا تو جیسے میرے جسم میں طاقت بھر گئی ہو۔ یعنی کہ میرے گھر والوں نے روبی کا ہی رشتہ پسند کیا تھا۔ کاش مجھے پہلے پتا ہوتا تو نہ میں قیصر کے پاس جا کر کوشش کرتا اور نہ ہی وہ میرے پیچھے کتے چھوڑتا۔ لیکن قیصر نے جو بات مجھے بتائی تھی اس کی خوشی میں، میں سب کچھ بھول گیا اور قیصر کو زور سے دبا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ سب مہمان اور میرے گھر والے حیران تھے کہ یہ ایک دوسرے کو پہلے سے ہی جانتے ہیں۔ اب میں ان سب کو کیا بتاتا کہ ہم دونوں کی جان پہچان کیسے ہوئی تھی۔

مکافات

محترم ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم!

لوگ کہتے ہیں کہ یہ دنیا امتحان گاہ ہے مگر میرا کہنا ہے کہ یہ نتیجہ گاہ بھی ہے۔ انسان جو کچھ کرتا ہے، وہ اس دنیا میں اس کے سامنے آجاتا ہے۔ اب یہی دیکھیں جو میں نے کیا تھا، وہ کس طرح میرے سامنے آگیا۔

جنید

(لاہور)

میں جہاں کھڑا تھا۔ بس وہیں کھڑا رہ گیا۔

وہ آدمی بہت بے ڈھنگے انداز میں فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ کرب کے آثار تھے اور آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ اس کا ایک ہاتھ بائیں جانب اس طرف تھا جہاں دل ہوتا ہے اور وہ مر چکا تھا۔

حامد کی بھی وہی حالت تھی جو میری تھی۔ ''اوہ گاڈ......!'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''جنید یہ تو شاید مر گیا ہے۔''

میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے حامد کی طرف دیکھا۔ ''یہ بتاؤ تم نے تو اس کے ساتھ کچھ نہیں کیا؟''

''نہیں، کچھ بھی نہیں۔ میں نے اس کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔''

''تو پھر یہ کیسے مر گیا؟''

''شاید ہارٹ فیل ہو گیا ہو۔ دل کا مریض ہوگا۔'' حامد نے کہا۔ ''اس کے چہرے پر جس قسم کی کیفیت ہے۔ اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے۔''

''یار...... ہم لوگوں سے بہت بڑا جرم ہو گیا ہے۔''

''اس میں جرم کی کیا بات ہے۔ اسے ہم نے تو نہیں مارا۔ اس کی موت آئی اور یہ مر گیا۔''

''اب کیا ہوگا......؟''

WWW.PAKSOCIETY.COM

''ہونا کیا ہے، اس کی لاش کو گاڑی میں ڈال کر کہیں چھوڑ آتے ہیں۔''

''نہیں یار، یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی۔''

''تو پھر کیا چاہتے ہو کہ پورے شہر میں ڈھنڈورا پیٹ دیا جائے کہ اس بندے کو ہم نے اغوا کیا تھا تاکہ اس سے تاوان وصول کر سکیں۔''

میرا دل بھی اس وقت اپنے قابو میں نہیں تھا۔ جو کچھ ہوا۔ وہ غیر متوقع تھا۔ ہم نے اس پہلو پر تو غور ہی نہیں کیا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ پلاننگ میری تھی۔ خاص میری۔ اور میں نے اس میں حامد کو اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا۔

انتہائی مفلسی کے دن تھے۔ کہیں سے روزگار کا کوئی ذریعہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پہلے میں پراپرٹی کا کام کیا کرتا تھا۔ اس زمانے کے جو پیسے تھے۔ وہ اب خرچ ہوتے جا رہے تھے۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ میں نے تعلیم حاصل نہ کی ہو۔ میں آئی آر میں ماسٹر کر چکا تھا۔ کمپیوٹر سے بھی واقفیت تھی۔ اس کے باوجود کہیں سے کسی بہتر جاب کی آفر نہیں آئی۔ اگر ملتی بھی تو اتنی کم کہ اس سے میں صرف فلیٹ کا کرایہ ہی دے سکتا۔

اکیلا آدمی تھا اور اکیلے آدمی کے ساتھ بھی ہزار جھنجٹ ہوتے ہیں، اس کے بھی اخراجات ہوتے ہیں۔ جس طرح میرے تھے۔

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ یہ خیال بھی آیا کہ ملازمت کا چکر چھوڑ کر اپنا چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر دوں لیکن اس کے لیے بھی پیسے کہاں سے آتے۔ آج کل معمولی کام بھی چار پانچ لاکھ سے کم میں نہیں ہوا کرتا اور اتنے پیسے کہاں سے آتے اور یہی وہ لمحہ تھا جب شیطان نے یہ خیال ذہن میں ڈال دیا۔

میں جس فلیٹ میں رہا کرتا تھا۔ اس کی بلڈنگ کے پیچھے ایک کچی پکی سڑک تھی جو آگے جا کر بڑی شاہراہ سے مل جایا کرتی۔ بہت کم لوگ اس پر سفر کیا کرتے تھے۔ وہ عام طور پر خالی ہی رہتی تھی۔

لیکن وہ شخص روزانہ اسی روڈ سے گزرا کرتا تھا۔ اس روڈ کے انتہائی سرے پر خوبصورت مکانات بنے ہوئے تھے۔ شاید وہ ان ہی میں سے کسی میں رہتا ہوگا۔

شارٹ کٹ کے لیے یہی راستہ اختیار کرتا ہوگا بہت خوبصورت گاڑی تھی اس کی۔ بالکل نئی اور وہ خود بھی بڑا باوقار آدمی تھا۔

مجھے اس کا جائزہ لینے کا موقع اس طرح ملتا تھا کہ اس روڈ کے خراب ہونے کی وجہ سے گاڑی کی رفتار بہت کم ہو تی تھی۔

وہ ہمیشہ قیمتی لباس میں دکھائی دیتا۔ اس کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہو گی ممکن ہے کوئی بڑا آفیسر ہو یا کسی کمپنی کا سربراہ۔

میں نے ہی حامد سے کہا تھا۔ ''یار پیسوں کی ضرورت تجھے بھی ہے اور مجھے بھی یہ بتا پانچ لاکھ میں کام چل جائے گا؟''

''کیوں مذاق کر رہا ہے بھائی۔ کہاں سے آئیں گے دس لاکھ؟''

''فرض کرو اگر آ گئے تو پھر؟''

''پھر یہ کہ میرے سارے جھنجٹ ختم ہو جائیں گے۔'' اس نے کہا۔ ''ابھی تو خوار ہوتا پھر رہا ہوں۔''

''حامد اگر ہم تھوڑی سی ہمت کر لیں تو اتنی رقم آ سکتی ہے۔''

''کیا...... ابے کیوں ایسے خواب دکھا رہے ہو۔''

''خواب نہیں، تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔'' میں نے کہا۔ پھر میں نے اسے اپنی پوری پلاننگ بتا دی۔

''جنید کیا تم واقعی سیریس ہو؟''

''ہاں اس لیے کہ ہم دونوں ضرورت مند ہیں اور میرے اندازے کے مطابق وہ موٹی آسامی ہے۔ اگر اس کے پاس سے دس لاکھ نکل بھی گئے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''اور اسے رکھیں گے کہاں؟''

''اگر تم سیریس ہو اور میرا ساتھ دینا چاہتے ہو تو میں یہ بھی بتا سکتا ہوں۔''

''چلو بتاؤ۔''

''تمہارے پاپا کا ایک کاٹیج ہے۔ ہاکس بے پر، یاد ہے؟''

''ہاں، ہاں اچھی طرح یاد ہے۔''

''وہ ایک ویران علاقہ ہے۔ اس طرف کوئی نہیں جاتا۔ تم بہت آسانی سے چابی لے سکتے ہو بلکہ دو چار دن کے لیے لے لینا۔ دو چار دن میں ہمارے پاس رقم آ ہی جائے گی۔''

''یار تم نے تو بہت بھیانک منصوبہ بنا رکھا ہے۔''

''بہت سوچ سمجھ کر بنایا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب بتاؤ......؟''

حامد نے کچھ دیر سوچنے کے بعد رضامندی ظاہر کر دی کیونکہ اس میں خود اس کا بھی فائدہ تھا۔

ہم دونوں باری باری اس گاڑی کو واچ کرتے رہے۔ وہ ہمیشہ اکیلا ہی ہوتا اور گاڑی خود ہی چلاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی واپسی ٹھیک مغرب کے بعد ہوا کرتی۔ اس وقت یہ روڈ اور بھی سنسان ہوتا اور اس روڈ پر اسے گھیر لینا بہت آسان تھا۔

''سوال یہ ہے کہ اس کو خوفزدہ کرنے کے لیے اسلحہ کہاں سے آئے گا؟''

''کوئی ضرورت نہیں ہے اسلحے کی۔''

''کیا مطلب، کیا خالی ہاتھ پکڑو گے؟''

''خالی ہاتھ نہیں، نقلی پستول سے کام چلا لیں گے۔ آج کل بازار میں اس قسم کے پستول آسانی سے مل جاتے ہیں۔ جو دیکھنے میں بالکل اصلی معلوم ہوتے ہیں۔''

ہمارا پروگرام تھا کہ حامد اس روڈ کے درمیان اس طرح لیٹ جائے گا جیسے کوئی لاش پڑی ہو۔ ایک تو اس روڈ پر گاڑی کی رفتار ویسے ہی سست ہو جاتی تھی پھر وہ لاش کو دیکھ کر گاڑی کو بریک ضرور لگائے گا۔ اس دوران میں جھاڑیوں سے نکل کر سامنے آ جاؤں گا۔

ہم دونوں کے چہروں پر نقابیں ہوں گی اور میرے ہاتھ میں وہ کھلونا پستول ہوگا۔ اس کے بعد ہم اس کے موبائل فون سے اس کے گھر فون کر کے تاوان کا مطالبہ کریں گے۔

سب کچھ پروگرام کے مطابق ٹھیک جا رہا تھا۔ ہم اسے اغوا کر چکے تھے اور ہاکس بے بھی لے آئے تھے لیکن اندر لاتے ہی اس پر دل کا دورہ پڑا اور ایک زندہ انسان لاش میں تبدیل ہو گیا۔

اب ہم دونوں اس کی اکڑی ہوئی لاش کو حیرت اور خوف سے دیکھے جا رہے تھے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب ہم کیا کریں؟

''خدا کے لیے کچھ سوچو جنید۔'' حامد نے کہا۔ ''ہم اس لاش کو اس کاٹیج میں نہیں رکھ سکتے۔''

''میں نے تو سوچ لیا ہے۔''

''کیا سوچا ہے؟''

''ہم اس لاش کو اس کے گھر پہنچا رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''کیوں ایسی بات کر رہے ہو کہ سیدھی پھانسی ہو جائے۔''

''کچھ بھی نہیں ہوگا۔'' میں نے بتایا۔ ''ہم گھر والوں کو یہ بتائیں گے کہ کچی روڈ پر ان کی گاڑی ایک طرف کھڑی ہوئی ملی۔ شاید ڈرائیونگ کرتے ہوئے ان پر دل کا دورہ پڑا ہوگا میں چونکہ اسی روڈ کے ساتھ والی بلڈنگ میں رہتا ہوں اس لیے میں نے یہ گاڑی دیکھ لی۔ جھانک کر دیکھا تو یہ صاحب اپنی سیٹ پر مردہ پڑے ہوئے تھے اور میں نے ان کی جیبوں کی تلاشی لی تو ان کا شناختی کارڈ ملا جس پر یہاں کا پتا تھا...... میڈیکل رپورٹ بھی یہی بتائے گی کہ اس کو دل کا دورہ پڑا تھا اور شاید یہ پہلے سے دل کے مریض ہی ہوں۔''

''میں کہتا ہوں کہ اتنے جھنجٹ کی ضرورت ہی کیا ہے۔ گاڑی میں ڈال کر کہیں چھوڑ آؤ۔''

''نہیں یار، یہ ہمارا اخلاقی فرض ہے۔ اس کی زندگی لینے کے ہم کسی نہ کسی حد تک ذمے دار ہیں۔''

''تو پھر یہ کام تم کرنا، میں نہیں جاؤں گا۔'' حامد نے کہا۔ ''اور بہت دنوں تک مجھ سے ملنا بھی نہیں۔ نہ جانے کیا مصیبت آ جائے۔''

''چلو ٹھیک ہے، اب ہم اسے گاڑی میں ڈالتے ہیں۔''

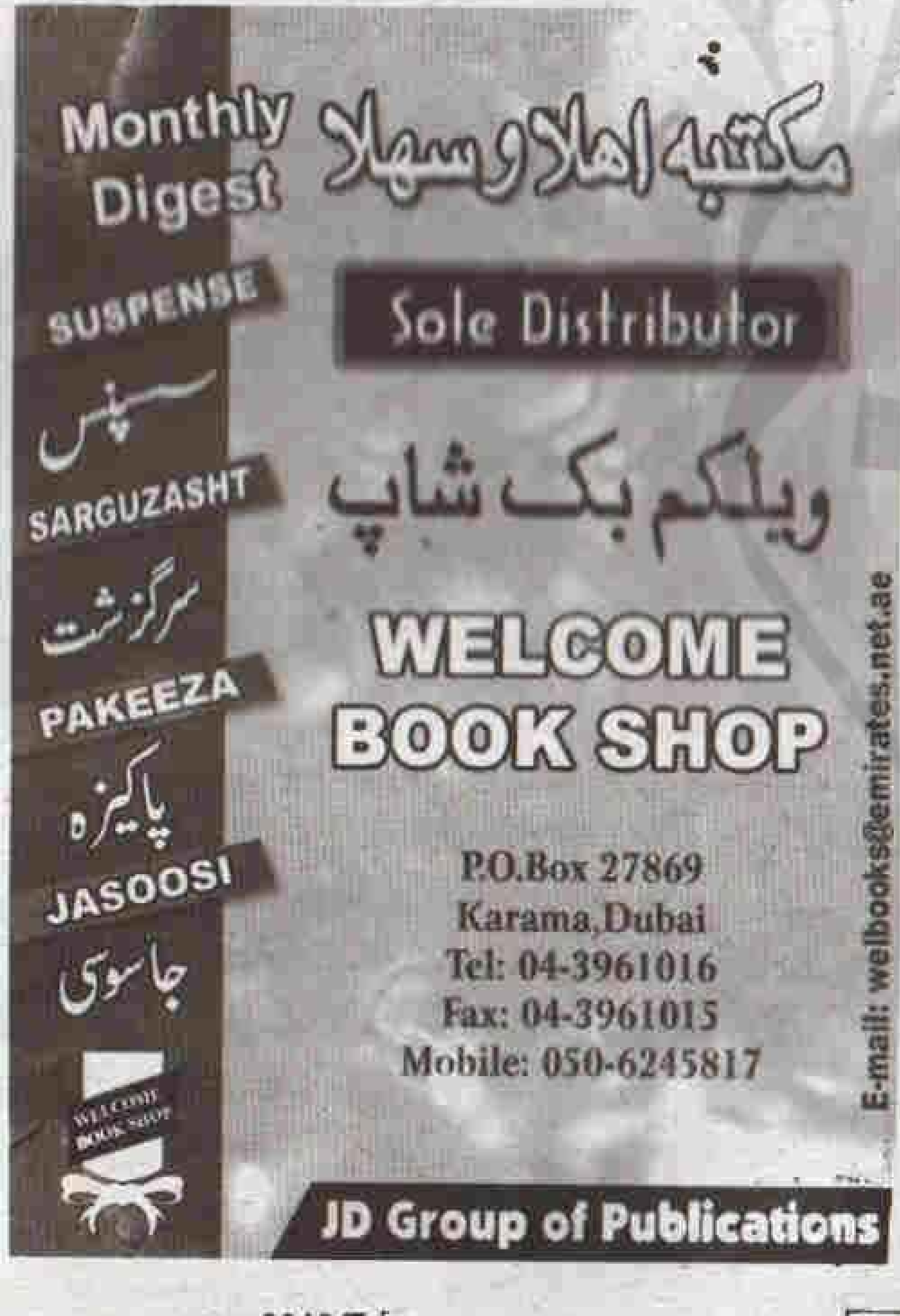

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ مرحلہ بھی طے پا گیا۔ حامد راستے میں اتر گیا تھا اور میں نے وہ کھلونا پستول ایک ویران جگہ پھینک دیا اس کے بعد میں نے اس کی لاش اس کے گھر پہنچادی۔

وہی ہوا...... جو ایسے موقعوں پر ہوا کرتا ہے۔ رونا، دھونا اور اس وقت پتا چلا کہ یہ آدمی واقعی دل کا مریض تھا اور اس کا بائی پاس بھی ہو چکا تھا۔ اسی لیے کسی نے مجھ پر کوئی شک نہیں کیا۔

پورا گھر میرا ممنون تھا کہ میں نے انسانی ہمدردی کا کام کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ میں بہت شرمندگی محسوس کر رہا ہوں۔

اس کی بیٹی کو میں نے وہیں دیکھا۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی اور اس وقت اس پر گزرنے والے اچانک صدمے نے اسے اور بھی خوبصورت کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جیسے خشک ہو کر رہ گئے تھے۔ اس نے جب مجھ سے کہا کہ ”آپ کی بڑی مہربانی۔ ورنہ آج کے دور میں کون کسی کے لیے اتنی پریشانی اٹھاتا ہے۔“ تو میں کٹ کر رہ گیا اور میرے پاس کہنے کے لیے الفاظ ہی نہیں تھے۔

میں اس کی بے قراری اور پریشانی دیکھے جا رہا تھا۔ میں اس مرنے والے کی آخری رسومات میں آخر تک شریک رہا۔

دس دن کے بعد میں پھر وہاں گیا۔ اب وہ گھر اس صدمے سے بڑی حد تک خود کو سنبھال چکا تھا لیکن اس لڑکی کو ابھی تک گہرا صدمہ تھا۔ وہ اس شاک سے شاید نکل ہی نہیں پائی تھی۔ ان لوگوں نے معزز مہمان کی طرح مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔

”آپ کے پاپا کیا کرتے تھے؟“ میں نے اس لڑکی سے پوچھا۔

”بہت کچھ لیکن کچھ بھی نہیں۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”کیا مطلب؟“

”پاپا، ایک کاروباری انسان تھے لیکن بہت سیدھے سادھے۔ ان کے پاس چالاکی اور ہیر پھیر نام کی کوئی چیز نہیں تھی پھر یہ ہوا کہ ایسے لوگوں کو عام طور پر دھوکا دیا جاتا ہے۔ تاکہ دنیا سے شرافت اور ایمانداری کا نام ونشان تک مٹ جائے۔ تو پاپا کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ان کے ساتھ دھوکا ہوا اور وہ تباہ ہو گئے۔“

”افسوس ہوا یہ سب سن کر۔“

”اب ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔“ فرح نے کہا۔ ”یہ جو مکان آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ بھی گروی ہے بینک کے پاس اور پاپا کی جو گاڑی ہے۔ وہ بھی بس دکھاوے کی ہے۔ بینک کا لون اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ کسی وقت بھی یہ گاڑی ضبط ہو سکتی ہے۔“

”لیکن تمہارے پاپا تو روزانہ کہیں آتے جاتے تھے۔ میں چونکہ وہیں رہتا ہوں۔ اس لیے ان کی گاڑی کو دیکھا کرتا تھا۔“

”ہاں، وہ اپنی ساکھ بچانے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ بینک میں ہمارے پاس صرف سات آٹھ ہزار ہی ہوں گے۔“

میں کانپ کر رہ گیا۔ مجھ سے یہ کیسی حماقت ہو گئی تھی۔ اگر فرح کا باپ زندہ بھی رہتا تو بھی اس سے کیا مل سکتا تھا۔ کچھ بھی نہیں یعنی اس کی جان بغیر کسی سبب کے ہی چلی گئی پھر مجھ سے مزید وہاں بیٹھا نہیں گیا۔

میں نے زندگی میں پہلی بار جرم کرنے کا سوچا تھا اور اس کا بھی ایسا نتیجہ سامنے آیا تھا جس نے مجھے دہلا کر رکھ دیا۔

حامد پھر اس کے بعد دکھائی نہیں دیا۔ شاید اسے باہر جانے کا چانس مل گیا تھا اور اس نے اس چانس سے فائدہ اٹھا لیا۔

میں نے اس گھر میں آنا جانا برقرار رکھا۔ میں ہفتے میں ایک ادھ دن ان لوگوں کے پاس چلا جاتا۔ گھر کے لوگ بھی مجھ سے مانوس ہو گئے تھے۔

اس گھر میں فرح کی والدہ کے علاوہ فرح کے دو چھوٹے بھائی بھی تھے۔ اسکول جانے والے بچے جب کہ فرح نے کالج کی تعلیم مکمل کر لی تھی اور اب وہ کسی جاب کی تلاش میں تھی۔

اتفاق سے ان ہی دنوں مجھے اچھی جاب مل گئی بہت معقول تنخواہ اور گاڑی بھی۔ یعنی میرے دن بدل گئے تھے۔

اب میرے پاس بہت کچھ تھا لیکن اندر کے طوفان نے بڑی توڑ پھوڑ مچا رکھی تھی۔ اس شخص کی اکڑی ہوئی لاش اکثر مجھے خواب میں دکھائی دیتی اور احساس ندامت کا ایک آسیب تھا جو مسلسل میرے تعاقب میں رہتا۔

اس دوران میں فرح سے اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی بلکہ میری ہی کوششوں سے اسے ایک دفتر میں جاب بھی مل گئی۔

ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔ ”جنید صاحب، آپ نے ہمارے گھر پر دو احسانات کیے ہیں۔“

”کون سے احسانات......؟“

”ایک تو یہی کہ آپ نے مجھے جاب دلوادی اور دوسرا احسان وہ جب آپ ابو کی لاش اٹھا کر لائے تھے۔“ ایک بار پھر میرے اندر توڑ پھوڑ سی مچ گئی۔

اگر فرح کو اصل بات کا پتا چل جائے تو اس کا کیا رویہ ہوگا یہ اسی طرح مجھ سے باتیں کرے گی......؟ میرا دل چاہتا کہ کاش کسی طرح میں بھی اس گھر کو سپورٹ کر سکوں۔ اپنے جرم کی شرمندگی سے بچنے کا صرف یہی ایک طریقہ تھا میرے پاس۔

☆☆☆

دس سال ہو گئے......!

دس طویل سال...... ان دس برس میں بہت کچھ ہوا۔ میں نے فرح سے شادی کر لی۔ شادی کے سلسلے میں کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی تھی۔

فرح کے گھر والے شاید ذہنی طور پر مجھے قبول کر چکے تھے اس لیے جب میں نے رشتے کی بات کی تو ان کی جانب سے کوئی اعتراض نہیں ہوا اور ہماری شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد میں اور فرح اپنے مکان میں منتقل ہو گئے۔

ان دس برس میں فرح کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا اور وہ مکان فروخت کر کے قرض نمٹائے گئے تھے۔ فرح کے دونوں بھائیوں نے اپنی تعلیم مکمل کر لی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میں اور فرح ایک بہت پیاری سی بچی کے ماں باپ بن چکے تھے۔ اس کا نام ہم نے سمیرا رکھا تھا اور پیار سے اسے گڑیا کہا کرتے۔

گڑیا بھی اب سات برس کی ہو چکی تھی اور ماضی کہیں دور رہ گیا تھا۔ اب شاید میرے دل پر کوئی بوجھ نہیں تھا سب کچھ ٹھیک ٹھاک جو ہو گیا تھا۔

میں اب کمپنی میں ایک بہت بڑے عہدے پر تھا۔ معاشرے میں عزت تھی، دوستوں کا حلقہ تھا۔ فرح کے ساتھ بہت خوشگوار زندگی گزر رہی تھی۔

اچانک ایک دن گڑبڑ ہو گئی۔ یہ گڑبڑ دفتر میں ہوئی تھی۔ میں کوئی فائل دیکھ رہا تھا کہ اچانک گرمی لگنے لگی اور پسینہ بہنا شروع ہو گیا اس کے ساتھ ہی بائیں ہاتھ میں تکلیف ہونے لگی۔

میں نے اپنے سیکریٹری کو بلا کر اپنی حالت سے آگاہ کیا اور مجھے اسی وقت اسپتال پہنچا دیا گیا۔ کئی مرحلوں سے گزرنے کے بعد یہ انکشاف ہوا کہ میں دل کا مریض ہو چکا ہوں۔ نہ جانے کب سے میں نے اس مرض کو اپنے سینے میں پال رکھا تھا۔

سکندر ہندوستان سے واپسی کے سفر میں پنجاب سے سمندر تک جن علاقوں سے گزرا ان میں کئی حکومتیں برسر اقتدار تھیں۔ ان میں شمالی ترین سکدی تھی جسے بھکر کا موجودہ قلعہ یا شہر بتایا جاتا ہے جو دریائے سندھ کے وسط میں ایک جزیرے پر بنا ہوا ہے اور منقسم دھارے کے دونوں کناروں پر سکھر اور روہڑی اس کے مضافات ہیں۔ آئین اکبری سے پتا چلتا ہے کہ یہ جگہ بعد میں منصورہ کہلائی لیکن غالباً یہ محض ایک عارضی نام تھا جو ہندوؤں پر حاصل کی گئی ایک فتح کی یاد میں اس علاقے کے عرب فاتحین نے اسے دیا تھا۔ منصور کا عربی میں مطلب فاتح ہے یا زیر حفاظت۔ شاید بھکر کے محل وقوع اور استحکام کی بدولت دوسرا معنی قرین قیاس ہے لیکن یہ بھی متن کی طرح قیاس آرائی ہے۔ موسیو ڈی اسینول کا خیال ہے کہ منصورہ اس سے بہت نیچے تھا لیکن میرا قیاس اس کے دیے ہوئے مقام پر بھی نہیں ٹھہرتا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ خلیفہ المنصور کی وجہ سے موسوم ہوا ہو جس کے دور میں یہ سلطنت بغداد میں شامل کیا گیا جیسا کہ موسیو نے لکھا ہے۔ اب بھی یہ ایک اہم جگہ ہے گو قلعہ بندیاں ٹوٹ پھوٹ چکی ہیں لیکن کوئی ایسی دستاویز میسر نہیں جس سے یہ پتا چل سکے کہ اسے موجودہ نام بھکر کب دیا گیا؟ 1001ء میں مجھے یہ ذکر ملا ہے کہ مشہور شہنشاہ محمود غزنوی نے اس پر قبضہ کیا اور چند سال پہلے اسے چھبیسویں خلیفہ عباسی القادر باللہ نے مقامی سرداروں کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ آخری خلیفہ تھا جو موجودہ سلطنت ایران کے مغرب کی طرف کے بعض علاقوں پر بھی قابض تھا۔

لیفٹیننٹ ہنری پوٹنگر کے 1816ء میں لکھے گئے ”سفر نامہ بلوچستان اور سندھ“ سے اقتباس

تلاش: اظہر جمیل صدیقی، کراچی

انجیو گرافی میں آیا تھا کہ میرے دل کی ایک شریان بند ہو چکی ہے فی الحال کسی قسم کے آپریشن کا اندیشہ نہیں تھا لیکن مجھے سخت احتیاطی تدابیر اپنائے رکھنی تھی۔ اس کے ساتھ دوائیں بھی دی گئیں۔

فرح بھی اسپتال پہنچ گئی تھی۔

اس کی خوبصورت آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ بہت دیر تک روتی رہی ہے۔ ”اوہو، تم اتنی پریشان کیوں ہو رہی

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہو؟" میں نے کہا۔ "ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ دواؤں سے ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "ویسے میں اپنے پاپا کا ایسا حال دیکھ چکی ہوں۔ اب آپ مکمل آرام کریں گے۔ آپ کو فی الحال آفس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ہاں بھئی بالکل نہیں جاؤں گا۔ یہ بتاؤ گڑیا کہاں ہے؟"

"اسے میں خرم کے یہاں پہنچا کر آئی ہوں۔" فرح نے بتایا۔ "وہ یہاں آنے کے لیے بہت رو رہی تھی۔ بڑی مشکلوں سے اسے خاموش کرا کے آئی ہوں۔"

مجھے دو دن انڈر آبزرویشن رکھا گیا.... اس کے بعد جانے کی اجازت دے دی گئی... لیکن سخت ہدایات کے ساتھ۔ یہ کریں، وہ نہ کریں یہ کھائیں وہ نہ کھائیں۔

ایک عرصے کے بعد گھر پر آرام کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ سمیرا بار بار آ کر مجھ سے چمٹ جایا کرتی۔ "پاپا آپ کو کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں بیٹا۔"

"تو پھر آپ بستر پر کیوں رہتے ہیں؟"

"بیٹا، تمہارے پاپا کام کرتے کرتے تھک بھی تو جاتے ہیں اس لیے آرام کر رہا ہوں۔"

اس وقت وہ میرے گال پر پیار کرتی اور مجھے ایسا لگتا جیسے میری ساری تکلیف غائب ہوگئی ہو۔ فرح اس کی حالت دیکھ کر مسکرانے لگتی۔ "بیٹی کو باپ سے کتنا پیار ہے۔" وہ کہا کرتی۔

"ہاں اس کا تجربہ تو ہو رہا ہے۔"

فرح کی توجہ، اپنی احتیاط اور ہدایات پر عمل کرنے کے بعد میری طبیعت سنبھلنے لگی تھی لیکن دل کے مریضوں کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا کس بھی وقت یہ کم بخت دل بے وفائی کر سکتا ہے۔

شاید اسپتال سے آنے کے بیس بائیس دن بعد کی بات ہے کہ میری طبیعت اچانک بگڑنے لگی۔ میں نے فرح کو آواز دی جو اس وقت بھی کمرے میں سنگار میز کے سامنے بیٹھی تھی۔ "فرح، مجھے اسپتال پہنچا دو۔" میں نے اٹکتے اٹکتے کہا۔

"وہ کیوں؟"

"میری طبیعت بگڑ رہی ہے۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟" اس نے جواب دیا۔

مجھے یقین نہیں آیا کہ یہ بات فرح نے کہی ہوگی۔ میں بے اعتبار نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ وہ بڑے اطمینان سے بال سنوارنے میں مصروف ہوگئی۔ "ف...... فرح میں مذاق نہیں کر رہا ہوں، میں مر رہا ہوں۔"

"میں نے کہا نا کہ میں کچھ نہیں کر سکتی۔"

میرا پورا جسم پسینے میں بھیگ گیا تھا اور درد کی ایک تیز لہر نے پورے وجود کو اپنی گرفت میں لے لیا اور میں بے ہوش ہو گیا۔

میں نہیں بتا سکتا کہ مجھے کب ہوش آیا تھا۔ دو دن، دو ہفتے یا پھر دو مہینے اور جب ہوش آیا تو میں اسپتال کے ایک کمرے میں تھا۔

اس کمرے میں ڈاکٹرز کے علاوہ فرح بھی تھی جس کی آنکھوں میں موتی چمک رہے تھے۔ "مبارک ہو" ڈاکٹرز نے کہا۔ "آپ کا بہت کامیاب بائی پاس ہو چکا ہے۔ دو چار دن بعد آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔"

ڈاکٹرز نے فرح کو کچھ ہدایات دیں اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں نے اس کے جانے کے بعد فرح کی طرف دیکھا۔

"فرح وہ کیا تھا، تم نے ایسا کیوں کیا... پھر مجھے یہاں کیوں لے آئیں؟"

"آپ کی زندگی آپ کی بیٹی نے بچائی ہے۔" اس نے کہا۔ "میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ بھی اسی طرح باپ کے لیے تڑپتی رہے جس طرح میں تڑپتی رہی تھی۔"

"فرح......"

"جنید مجھے پتا چل گیا ہے کہ میرے پاپا کی موت کن حالات میں ہوئی تھی۔"

"پتا...... پتا چل گیا ہے؟"

"ہاں تمہارا دوست حامد آیا تھا۔ اس نے سب بتا دیا ہے۔ میرا تو یہی دل چاہا کہ تم بھی اسی طرح تڑپتے رہو جس طرح میرے پاپا تڑپے ہوں گے۔ تمہاری موت بھی ویسی ہو جیسی ان کی ہوئی تھی پھر مجھے پاپا کے بغیر اپنا اور تمہارے بغیر سمیرا کا خیال آ گیا اور میں تمہیں...... اسپتال لے آئی۔"

"فرح کیا تم مجھے معاف نہیں کرو گی۔ مجھے سزا مل چکی ہے۔"

"نہیں...... شاید کبھی نہیں۔"

فرح نے مجھے ابھی تک معاف نہیں کیا حالانکہ ہم ایک ساتھ ایک ہی گھر میں رہتے ہیں اور میں ٹھیک بھی ہوں لیکن کیا میں واقعی ٹھیک ہوں...... شاید اسی کو مکافات عمل کہتے ہیں۔

نیکی

قابلِ احترام معراج رسول صاحب
السلام علیکم!
نیکی کر دریا میں ڈال، یہ محاورہ حاتم طائی کے زمانے میں سچ ثابت ہوا ہوگا لیکن آج کے دور میں ایسا نہیں ہوتا، اب تو نیکی کر تھانے جا، سزا بھگت کا محاورہ عام ہے۔ خود میری آپ بیتی ملاحظہ کریں جسے سوچ کر مجھے ہنسی آتی ہے۔ اپنی نادانی پر اسی لیے شگفتہ انداز میں لکھی ہے۔

فیض احمد
(کراچی)

وہ بچہ مجھے روتا ہوا مل گیا تھا۔

وہ ایک خوبصورت پیارا سا بچہ تھا جو بہ مشکل چھ سات برس کا ہوگا، بہت سلیقے کے کپڑے پہن رکھے تھے، وہ مارکیٹ کی ایک دکان کے سامنے کھڑے ہوئے روئے جا رہا تھا۔

یہ میری عادت رہی ہے کہ میں بچوں کو روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ ان کی پریشانی دور کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہوں۔ اسی لیے میں نے اس بچے کے پاس جا کر پوچھا۔ "کیا بات ہے بیٹے کیوں رو رہے ہو؟"

"امی۔" بچے نے بتایا پھر رونے لگا۔

ظاہر ہو گیا کہ وہ اپنی ماں سے بچھڑ گیا ہے میں نہ جانے کتنی بار یہ سب دیکھ چکا ہوں۔ خواتین جب دکانوں میں یا مارکیٹ میں داخل ہوتی ہیں تو پھر انہیں کسی بات کا ہوش نہیں رہتا وہ صرف دکانوں کی ہو کر رہ جاتی ہیں پھر ان کی بلا سے ...... بچہ رو رہا ہے گر پڑا ہے یا اس کے ساتھ کچھ اور ہو گیا ہے۔ انہیں کسی بات کی پروا نہیں ہوتی۔

تو یہ بچہ بھی ایسا ہی تھا جس کی ماں کسی دکان میں تھی اور اسے بھول گئی تھی۔ "بیٹے کیا نام ہے تمہارا؟" میں نے بچے سے پوچھا۔

"احمر۔" بچے نے جواب دیا۔

"اور تمہاری امی کا کیا نام ہے؟"

"پتا نہیں۔" اس نے معصومیت سے اپنی گردن ہلا

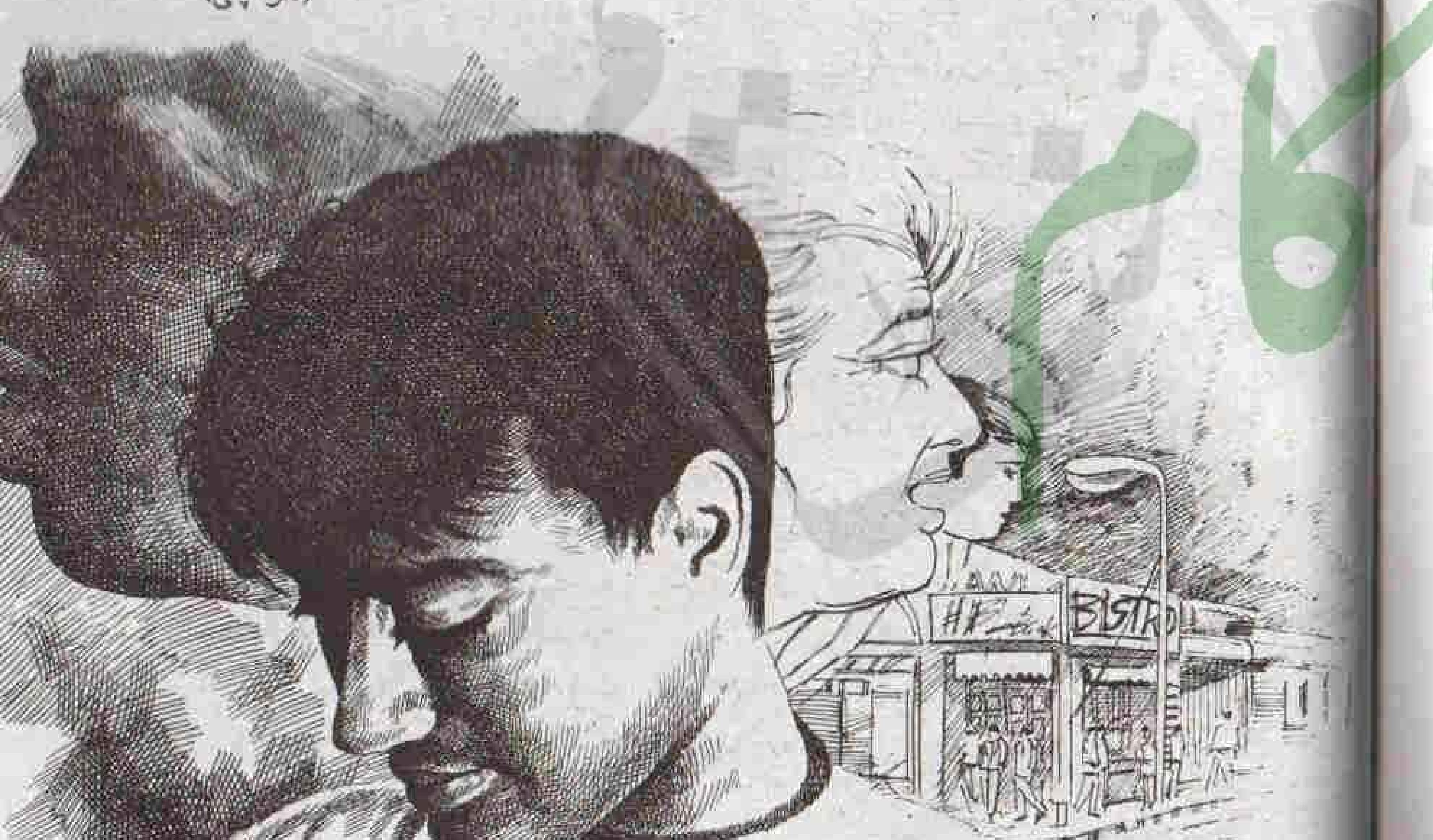

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

دی۔

میں اس بچّے کے پاس ہی کھڑا ہو گیا میں نے دل ہی دل میں ایک تقریر سوچ لی تھی کہ جب اس کی ماں اس طرف آئے گی تو میں اسے کس کس انداز سے برا بھلا کہوں گا۔ کیسی ماں تھی کہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

مجھے ایک خوف یہ تھا کہ ایسا نہ ہو... کوئی بے رحم بچّے کو اٹھا کر لے جائے اس قسم کے واقعات ہمارے معاشرے میں بہت عام ہیں نہ جانے کیسے لوگ ہوتے ہیں جو کسی کے لختِ جگر کو جدا کر دیتے ہیں۔

اور کمال کی بات یہ ہے کہ میں نے آج تک یہ نہیں پڑھا یا سنا تھا کہ کسی اغوا کرنے والے کو سزا سنائی گئی ہو یا پھانسی دی گئی ہو۔ ان کی گرفتاری کی خبر تو آتی ہے اس کے بعد سب غائب ہو جاتا ہے۔

بچہ اب شاید روتے روتے تھک گیا تھا اس لیے بالکل خاموش تھا۔ میں نے اس بچّے سے کہا۔ ''چلو بیٹے تمہاری امی کو ڈھونڈتے ہیں کس طرف گئی تھیں۔''

''وہ اس طرف۔'' بچّے نے ایک طرف اشارہ کر دیا۔

میں نے اس کی انگلی تھامی اور وہ میرے ساتھ چل پڑا۔ مارکیٹ میں درجنوں کے حساب سے عورتیں تھیں۔ وہ کبھی ایک عورت کی طرف اشارہ کرتا کبھی دوسری کی طرف۔ گھومتے گھومتے اچھی خاصی دیر ہو گئی لیکن اس کی ماں دکھائی نہیں دی۔ میں اسے لے کر پھر وہیں پہنچ گیا جہاں وہ ملا تھا۔ لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

ایسا لگتا تھا جیسے اس کی ماں اسے بھول کر گھر واپس چلی گئی ہو لیکن وہ کیسی ماں تھی ..... جسے اپنی اولاد کی پروا نہیں تھی۔

دوسری طرف مجھے گھر پہنچنے میں دیر ہو رہی تھی۔ میں دفتر سے گھر جاتے ہوئے کسی کام سے مارکیٹ میں رکا تھا تو یہ مصیبت میرے گلے پڑ گئی تھی۔

اب مجھے یہ پریشانی ہو گئی تھی کہ کہیں لوگ مجھے بچّے اغوا کرنے والا نہ سمجھ لیں کیونکہ میں بہت دیر سے اس بچّے کو لیے ہوئے اِدھر اُدھر گھومتا پھر رہا تھا۔

اسی لیے میں نے اپنے اوپر ممکنہ الزام سے بچنے کے لیے سامنے والی ایک دکان کا رخ کیا۔ دکاندار اس وقت فالتو ہی بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک کاروباری مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ جی جناب فرمائیں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''جناب میں آپ کو گواہ بنانے کے لیے آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''گواہ کس بات کا گواہ؟''

''آپ یہ دیکھ رہے ہوں گے کہ میں اس بچّے کو لیے بہت دیر سے گھوم رہا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بچہ اپنی ماں سے بچھڑ گیا ہے اور میں اس کی ماں کو تلاش کرتا پھر رہا ہوں لیکن وہ نہیں مل رہی ہے۔''

''یہ تو آپ بہت ثواب کا کام کر رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''ثواب کا کام تو ہے لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس بچّے کا کیا کروں۔ کہاں لے جاؤں اس کو؟''

''اپنے گھر لے جائیں۔'' اس نے کہا۔

''کیسی بات کر رہے ہیں گھر لے گیا تو کہیں اس کے گھر والے مجھ پر کیس نہ کر دیں میں خوامخواہ پھنس جاؤں گا۔''

اس دوران میں دو چار دکاندار میرے پاس آ گئے تھے۔ ان ہی میں سے ایک نے مشورہ دیا ''بھائی آج کل حالات بہت خراب ہیں۔ نیکی گلے پڑ جاتی ہے اس لیے میری مانیں تو اسے پولیس چوکی لے جائیں وہاں اندراج کروا دیں پھر آپ پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔''

اس کی تجویز اچھی لگی اس لیے میں اس بچّے کو لے کر پولیس اسٹیشن پہنچ گیا۔ ہیڈ محرر سامنے ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے جب سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا۔

''جناب میں بچے کی گم شدگی کی رپورٹ لکھوانے آیا ہوں۔''

''کس بچّے کی؟'' اس نے پوچھا۔

''اس بچّے کی۔'' میں نے بچّے کی طرف اشارہ کیا۔

''اوئے کیوں مخول کرتا ہے۔ بچّے کو ساتھ لیے گھوم رہا ہے اور کہتا ہے کہ گمشدگی کی رپورٹ لکھواتی ہے۔''

''جناب یہ بچہ میرا نہیں ہے مجھے مارکیٹ میں مل گیا تھا۔'' میں نے بتایا۔ ''میں چار گھنٹوں سے اسے لیے گھوم رہا ہوں۔ سارے دکاندار گواہ ہیں، جب اس کے ماں باپ نہیں ملے تو آپ کے پاس لے کر آیا ہوں۔''

''حد ہو گئی مجھے کیا کیا کرنا ہے اس بچّے کا، میرے گھر میں تو پہلے ہی آٹھ آٹھ ہیں۔'' اس نے کہا۔

''یہ میں آپ کو دینے نہیں آیا اس کی رپورٹ لکھوانے آیا ہوں اور آپ سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ اس بچّے کا کیا کروں؟''

''اوئے اس کو کچھ کھلایا پلایا یا ایسے ہی ساتھ لیے گھوم

رہے ہو؟''

''میں اس کو پھل وغیرہ کھلا چکا ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''نام کیا ہے اس بچّے کا؟''

''یہ اپنا نام احمر بتاتا ہے۔''

''اور باپ کا نام؟''

''اس کو یاد نہیں ہے صرف ابو بتاتا ہے۔''

''اوہو کیا ستم ہے اتنی چھوٹی سی جان اور اتنے پیارے بچّے کے ساتھ ایسا معاملہ ہو گیا ہے۔'' ہیڈ محرر نے افسوس کا اظہار کیا۔ ''بھائی تم شریف آدمی معلوم ہوتے ہو اپنا نام، پتا لکھوا کر بچّے کو اپنے گھر لے جاؤ۔ ہم اس کے ماں باپ کو تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔''

میں نے اپنا نام اور بچّے کے ملنے کے واقعے کے بارے میں سب کچھ لکھوا دیا۔ اس کے بعد مجھے اس بات کا تو یقین ہو گیا تھا کہ اب مجھ پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔ اسی لیے میں بچّے کو لے کر پولیس اسٹیشن سے باہر آ گیا۔

حمیرا میری بیوی نے بچّے کو دیکھتے ہی رونا شروع کر دیا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کے یہ آنسو اس لیے ہیں کہ ابھی تک ہمارے یہاں اولاد نہیں ہوئی تھی گرچہ شادی کو صرف تین برس ہوئے تھے لیکن حمیرا نے واویلا مچانا شروع کر دیا تھا۔

''حمیرا، کیا پاگل پن ہے۔'' میں نے اسے چپ کرانے کی کوشش کی۔ ''کیوں رو رہی ہو، خدا نے چاہا تو ہماری بھی اولاد ہو گی۔ ایسا ہی ایک پیارا بچہ ہمارا بھی ہو گا۔''

''میں اس لیے نہیں رو رہی بلکہ اس لیے رو رہی ہوں کہ بلی آخر تھیلے سے باہر آ ہی گئی۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ ہے کہ آپ ہی کی ناجائز اولاد ہے۔''

''کیا بکواس کر رہی ہو۔ میں تو اسے جانتا بھی نہیں ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اب چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہ دیکھیں اس کی شکل آپ سے کتنی ملتی ہوئی ہے۔''

''کہاں ملتی ہوئی ہے۔''

''آپ اس کی ناک دیکھیں۔'' اس نے پھر رونا شروع کر دیا۔ ''بالکل آپ کی طرح ہے۔''

''خدا کی بندی! ہوش کے ناخن لو، یہ بے چارہ مارکیٹ میں بھٹک رہا تھا۔ اپنے ماں باپ سے بچھڑ گیا ہے۔ میں نے تھانے میں اس کی رپورٹ بھی لکھوا دی ہے۔ جاؤ پوچھ لو تھانے والوں سے۔''

''مجھے کیا ضرورت ہے کچھ پوچھنے کی۔'' اس نے کہا۔ ''آپ کی اولاد ہے آپ جانیں۔''

''خدا کی پناہ آخر میری بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آ رہی۔'' مجھے اب غصہ آنے لگا تھا۔ ''بکواس کیے چلی جا رہی ہو جبکہ میرا اس سے کوئی تعلق بھی نہیں ہے۔''

بہرحال وہ رات اسی جھگڑے میں گزر گئی تھی۔ میں نے اس بچّے کے لیے خود ہی کھانے کا بندوبست کیا تھا۔ اس کو دودھ بھی لا کر پلایا تھا اور اسے اپنے ساتھ ہی سلایا تھا..... جبکہ وہ عقل کی اندھی رات بھر مجھ سے ناراض رہی تھی۔

لیکن دوسری صبح اس لحاظ سے بہت خوشگوار تھی کہ حمیرا بہت پیار اور محبت سے اس بچّے کو جگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''چلو اٹھ جاؤ شاباش، منہ ہاتھ دھو کر ناشتا کر لو، میں نے تمہارے لیے مزے مزے کی چیزیں بنائی ہیں۔''

بچّے کے بجائے خود میں جاگ اٹھا تھا۔ ''کیا ہوا حمیرا خیریت تو ہے نا۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' وہ مسکرا دی۔ ''کیونکہ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ یہ کس کا بچہ ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اچھا۔'' میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ ''بتاؤ کس کا ہے؟''

''آپ نے مشہور صنعت کار رشدی کا نام سنا ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''کیوں نہیں وہ تو ایک ارب پتی انسان ہے۔'' میں نے بتایا۔

''یہ اس کا بیٹا ہے اخبار میں اس کی گمشدگی کا اشتہار بھی آیا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اور اس کو پہنچانے والے کے لیے دس لاکھ کا انعام بھی ہے۔''

''دس لاکھ کا انعام۔''

''جی ہاں پورے دس لاکھ۔'' اس نے بتایا۔ ''یہ دیکھیں اخبار۔'' اس نے تازہ اخبار میرے سامنے کر دیا۔

واقعی اخبار کے پہلے صفحے ہی پر اس بچّے کی گمشدگی کا اشتہار شائع ہوا تھا۔ اشتہار میں اگرچہ بچے کی تصویر نہیں تھی لیکن اس کا حلیہ وہی تھا۔ اس کے کپڑے وہی تھے اور سب سے بڑھ کر اس کا نام بھی وہی تھا احمر اور اس کو پہنچانے والے کے لیے دس لاکھ کا انعام بھی مقرر کیا گیا تھا۔

''دیکھا حمیرا دیکھا، یہ ہے نیکی کا انعام۔'' میری آواز جوش سے کانپ رہی تھی۔ ''اب یہ دس لاکھ ہمارے ہو گئے کیونکہ بچہ ہمارے پاس ہے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

’’سرتاج۔‘‘ حمیرا نے بڑے پیار سے سرتاج کہہ کر زندگی میں پہلی بار مخاطب کیا۔ ’’میں آپ کے قربان جاؤں۔ کل میں نے آپ کو غلط سمجھا تھا خوامخواہ آپ پر الزام لگا رہی تھی جبکہ آپ کا واقعی اس بچے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔‘‘

’’چلو کوئی بات نہیں۔ عورت کی فطرت میں شک ہے میں نے تمہیں معاف کیا۔ اب جلدی سے اس بچے کو ناشتا کرواؤ۔ پھر ہم اس کو لے کر چلتے ہیں۔‘‘

’’ایڈریس تو سمجھ گئے نا۔‘‘

’’ہاں ہاں خداداد کالونی کی طرف کا ایک.... مکان ہے۔‘‘ میں نے اشتہار پڑھتے ہوئے کہا۔ ’’پورا علاقہ میرا دیکھا ہوا ہے۔‘‘

ہم نے بچے کو ناشتا کروایا۔ میں بازار سے اس کے لیے آئس کریم بھی لے آیا تھا پھر ہم نے ناشتا کیا اور بچے کو لے کر اشتہار والے ایڈریس کی طرف روانہ ہوگئے۔

اس کالونی میں دو قسم کے گھر بنے ہوئے ہیں ایک تو بہت خوبصورت عالی شان اور دوسرے معمولی انداز کے وہ ایڈریس بھی بہت معمولی انداز کے مکان کا تھا۔

’’حمیرا یہ مکان تو بہت ہی تھرڈ کلاس قسم کا ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’ہاں میں خود حیران ہو رہی ہوں اتنا امیر آدمی ایسے مکان میں رہتا ہے۔‘‘

’’یہ لوگ تو دس ہزار بھی نہیں دے سکیں گے۔‘‘

’’چلیں معلوم تو کریں انسان اپنی اولاد کے لیے کیا کچھ نہیں کرتا۔‘‘

میں نے دروازے کی گھنٹی بجادی۔ ایک عورت گیٹ پر آئی تھی۔ اس دوران اس بچے کا رویہ حیرت انگیز رہا تھا۔ اس نے مکان کو دیکھ کر کسی قسم کے جوش وغیرہ کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ ورنہ اسے دوڑتے ہوئے مکان میں گھس جانا چاہیے تھا۔ انتہا یہ تھی کہ خود اس عورت نے بھی بچے کو نہیں پہچانا تھا۔ ’’کیا بات ہے؟‘‘ اس نے پھاڑ کھانے والے انداز میں پوچھا۔

’’ہم یہ بچہ لے کر آئے ہیں۔‘‘ میں نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ ’’آپ لوگوں نے اس کے لیے اشتہار دیا تھا۔‘‘

’’اچھا آؤ، اندر آجاؤ۔‘‘

ہم گھر میں داخل ہوگئے۔ وہ عورت ایک کمرے میں لے آئی تھی جہاں ایک ادھیڑ عمر گنجا بیٹھا ہوا تھا۔

’’جناب لگتا ہے کہ ہم کسی غلط مکان میں آگئے ہیں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’لیکن اخبار میں ایڈریس تو اسی مکان کا ہے۔‘‘

’’تم بالکل صحیح مکان میں آئے ہو۔‘‘ وہ مسکرا کر بولا۔ ’’رشدی صاحب کا بچہ گم ہوگیا ہے۔‘‘

’’تو کیا آپ رشدی صاحب نہیں ہیں؟‘‘

’’نہیں میں ان کا سیکریٹری ہوں۔‘‘ اس نے بتایا۔ ’’مختار نام ہے میرا۔ میں تمہیں پوری بات سمجھا دیتا ہوں کل میں باس کے ساتھ ان کے دفتر میں ان ہی کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ باس کے گھر سے بچے کے غائب ہونے کی اطلاع آئی۔ باس کی پریشانی دیکھنے والی تھی۔ میں نے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ان کا بچہ احمر کہیں گم ہوگیا ہے۔ میں نے باس سے پوچھا آپ اس کا حلیہ بتائیں میں بھی اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور اگر وہ آپ ہی کو مل جائے تو پلیز مجھے ضرور انفارم کر دیجیے گا۔ باس نے وعدہ کر لیا اور پریشانی کے عالم میں دفتر سے نکل گئے اور میں سیدھا اخبار کے دفتر پہنچ گیا۔ میں نے سوچا کہ شارٹ کٹ صحیح ہے۔ فوراً اشتہار دے دیا اور باس کے فون کا انتظار کرنے لگا۔ ان کا ابھی تک فون نہیں آیا ہے اس کا مطلب ہے کہ وہ بچہ انہیں نہیں ملا ہے۔‘‘

’’ملے گا کیسے۔ بچہ تو ہم اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں۔‘‘ حمیرا نے کہا۔

’’اور یہ دس لاکھ کا انعام۔‘‘ میں نے پوچھا۔ ’’کیا آپ کے باس نے کہا تھا۔‘‘

’’نہیں بھائی انہوں نے تو نہیں کہا تھا یہ تو میں نے اپنی طرف سے لکھوا دیا کیونکہ بچہ مل جائے تو باس کے لیے دس لاکھ کی کیا حقیقت ہے۔ وہ پچاس لاکھ بھی دے سکتے ہیں۔ اب ایک شرط ہے۔‘‘ اس نے کہا۔

’’انعام کی رقم میں سے آدھی رقم میری ہوگی۔‘‘ اس نے بتایا۔ ’’کیونکہ میں نے سب کے سامنے یہی شرط رکھی ہے۔‘‘

’’سب کے سامنے۔‘‘ ہم دونوں میاں بیوی چونک اٹھے تھے۔ ’’سب کے سامنے سے کیا مراد ہے۔‘‘

’’جناب عالی، صبح سے اب تک آٹھ آدمی آٹھ بچوں کو لے کر آچکے ہیں۔‘‘ اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ ’’سب بچے اسی عمر اور اسی حلیے کے ہیں۔ سب نے اسی قسم کے کپڑے پہن رکھے ہیں۔‘‘

’’لیکن سب کے نام تو احمر نہیں ہوں گے نا۔‘‘

’’یہی تو کمال ہے کہ سب کے نام احمر ہیں۔‘‘ اس نے بتایا۔ ’’لگتا ہے کہ پورے شہر سے صرف احمر ہی نام کے بچے

گم ہوئے ہیں۔‘‘

حمیرا کا منہ لٹک آیا تھا اب یہ نہیں معلوم کہ ہم جس بچے کو پکڑ لائے تھے وہی احمر تھا یا کوئی دوسرا تھا۔ بہرحال ہم سیکریٹری کے ساتھ دوسرے کمرے میں پہنچ گئے۔ یہاں پانچ مرد تھے، ان کے ساتھ پانچ بچے۔ پھر تین خواتین ان کے ساتھ بھی تین بچے۔

’’خواتین و حضرات۔‘‘ سیکریٹری نے اعلان کیا۔ ’’یہ لیں ایک اور احمر صاحب تشریف لے آئے ہیں۔‘‘

مرد اور خواتین انتہائی غصے بھری نگاہوں سے ہماری طرف دیکھنے لگے تھے۔ ظاہر ہے ہماری آمد نے ان کے اور ان کے احمر والے امکان کو مزید... کم کر دیا تھا۔

’’ہمیں بھی ایک طرف جگہ مل گئی۔ ہم اپنے احمر کو لے کر بیٹھ گئے۔

سارے بچوں نے تقریباً ایک ہی رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ سبھی صاف ستھرے اور پیارے بچے تھے۔

’’سنیں۔‘‘ حمیرا نے سرگوشی کی۔ ’’وہ سامنے دائیں طرف جو موٹی عورت بیٹھی ہے نا اس کے ساتھ جو بچہ ہے وہی مجھے اصلی احمر لگ رہا ہے۔‘‘

’’تمہیں کیسے معلوم۔‘‘ میں نے بھی سرگوشی کی۔

’’خود دیکھ لیں۔ سارے بچے بدتمیزی سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ سب اچک اچک کر ادھر سے اُدھر دیکھ رہے ہیں سوائے اس کے، وہ کتنی سنجیدگی اور وقار کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ مطلب یہ کہ اس کی تربیت بہت اچھی ہوئی ہے۔ رشدی صاحب جیسے امیر شخص کی اولاد کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔‘‘

’’شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔‘‘ میں نے بھی غور سے اس بچے کو دیکھا۔ ’’بہت ہی سوبر قسم کا معلوم ہوتا ہے۔‘‘

’’کسی طرح وہ بچہ ہمارے پاس آجائے تو مزے آجائیں۔‘‘

’’کیا پاگل ہوگئی ہو۔ وہ ہمارے پاس کیسے آئے گا۔ اس کو تو موٹی عورت دبوچے بیٹھی ہے۔‘‘

’’آپ دیکھتے رہیں میرا کمال۔ میں ابھی اس موٹی عورت کو بھڑکا کر بچے کو ایکسچینج کر لیتی ہوں۔‘‘ حمیرا نے کہا۔

مجھے حمیرا کی صلاحیت پر پورا بھروسا تھا۔ وہ جوڑ توڑ کرنے کی ماہر تھی، وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر ٹہلتی ہوئی اس عورت کے پاس چلی گئی۔ کچھ پوچھا۔ عورت نے جواب دیا پھر دونوں کے درمیان باتیں ہونے لگیں۔ کچھ دیر بعد حمیرا واپس آگئی۔ اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ ’’میں نے اس عورت کو شک میں ڈال دیا ہے۔‘‘ اس نے بتایا۔

’’کیا گل کھلا کر آئی ہو۔‘‘ میں نے پوچھا۔

’’میں نے اس سے کہا کہ بہن تم جو بچہ اپنے ساتھ لے کر آئی ہو یہ بے چارہ ایک تو بیمار ٹائپ کا معلوم ہوتا ہے پھر اس میں جھجک کتنی ہے بالکل چپ چاپ بیٹھا ہے، بڑے گھرانوں کے بچے ایسے نہیں ہوتے، ان میں بہت Confidance ہوتا ہے۔‘‘

’’واہ یہ تو تم نے آگ لگادی پھر اس نے کیا کہا۔‘‘

وہ بھی سوچ میں پڑ گئی ہے۔ کسی حد تک میری ہاں میں ہاں ملانے لگی تھی۔‘‘ حمیرا نے بتایا۔

’’چلو یہاں تک تو ہوگیا اب آگے کیا ہوگا۔‘‘

’’آپ دیکھتے رہیں، میں اپنے والے کو کسی بہانے سے اس موٹی کی طرف بھیجتی ہوں۔ وہ موٹی خود ہی اِسے اپنے پاس رکھ کر اُسے ہماری طرف بھیج دے گی۔‘‘

یہ منصوبہ اچھا تھا لیکن اس سے پہلے کہ ہم اسے عملی جامہ پہناتے سیکریٹری کمرے میں داخل ہوا اور تقریر کرنے والے انداز میں بولا۔ ’’خواتین و حضرات میں نے آج کی رجسٹریشن بند کر دی ہے اب کسی بچے کی انٹری نہیں ہوگی۔ پلیز آپ لوگ اس بات پر تالیاں بجادیں۔‘‘

سب تالیاں بجانے لگے۔ بہت مضحکہ خیز پچویشن ہونے لگی تھی۔

سیکریٹری نے تقریر پھر شروع کی۔ ’’خواتین و حضرات آپ سب کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ کچھ دیر میں میرے باس رشدی صاحب یہاں پہنچنے والے ہیں۔ میں نے انہیں ابھی تک کچھ نہیں بتایا ہے کہ میں انہیں کیوں بلا رہا ہوں۔ کیونکہ میں انہیں ان کی زندگی کا سب سے بڑا سرپرائز دینا چاہتا ہوں کہ ان کا گم شدہ بچہ یہاں اس گھر میں موجود ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان نو بچوں میں سے کون ان کا احمر ہے۔ اس کا فیصلہ ابھی ہو جائے گا۔ آپ میں سے کسی ایک کو دس سے بیس لاکھ روپے بھی مل سکتے ہیں۔‘‘

سب لوگوں نے زور زور سے تالیاں بجائیں خود میں بھی ان میں شامل تھا۔

پانچ منٹ کے بعد باہر گاڑیاں رکنے کی آوازیں آئیں۔ ایک سے زیادہ گاڑیاں تھیں۔ سیکریٹری نے باہر کی طرف دوڑ لگادی۔

چند لمحوں بعد سیکریٹری ایک باوقار سے آدمی کو لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے اسے پہچان لیا وہ رشدی ہی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا۔ میں اس کی تصویریں دیکھ چکا تھا اور چینلز پر بھی دکھائی دیتا تھا۔

''کیا بات ہے؟ کیوں بلایا ہے تم نے؟'' اس نے سیکریٹری سے پوچھا۔

''سر یہ دیکھیں یہ سب احمر ہیں۔'' سیکریٹری نے بتایا۔ ''اور ان ہی میں کوئی آپ کا بیٹا احمر بھی ہوگا۔''

''کیا پاگل ہوگئے ہو۔'' رشدی غصے سے بولا۔ ''میرا بیٹا احمر تو اسی دن مل گیا تھا وہ اپنے کسی دوست کے ساتھ اس کے گھر چلا گیا تھا۔''

''کیا'' ''نہ صرف سیکریٹری، بلکہ ہم لوگ بھی بے ہوش ہونے لگے تھے۔

''خوامخواہ میرا وقت برباد کیا۔'' رشدی بولتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

سیکریٹری کا یہ حال تھا جیسے اس کے بدن سے خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ سب سے پہلے ایک موٹا آدمی اٹھا۔ اس نے سیکریٹری کو پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔ ''بے وقوف انسان تو نے ہم لوگوں کے ساتھ کیسا مذاق کیا ہے۔''

''جناب مجھے کیا معلوم۔'' سیکریٹری بلبلانے لگا تھا۔ ''میں نے تو بھلائی کی نیت سے یہ سب کیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ تماشا ہو جائے گا۔''

اس دوران ایک آدمی تیزی سے اندر داخل ہوا وہ بہت بوکھلایا ہوا تھا۔ ''مختار بھائی، پولیس نے ہمارے گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ اس گھر میں بہت سے بچوں کو اغوا کر کے لایا گیا ہے اور بچوں کو نیلام کیا جا رہا ہے۔''

''ارے نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔'' سیکریٹری اب پوری طرح بوکھلا گیا تھا۔

اس دوران بہت سے پولیس والے اندر گھس آئے، ان کے ساتھ کچھ مرد اور عورتیں بھی تھیں۔ وہ سب ان گم ہونے والے بچوں کے والدین تھے۔

اس کے بعد ہماری کون سنتا تھا۔ بچے..... اپنے ماں باپ سے جا کر لپٹ گئے تھے اور ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالی جا رہی تھیں۔ پولیس والوں کے خیال کے مطابق بچوں کو اغوا کرنے والوں کا بہت بڑا گروہ گرفتار ہوا تھا اور سارے بچے بھی بازیاب کرا لیے گئے تھے۔

اس کے بعد کی داستان بہت الم ناک ہے۔ چینل والوں نے ہمارے چہرے دکھائے۔ ہمارے اس گھناؤنے جرم کی داستانیں نمک مرچ لگا کر بیان کی گئیں۔ اخبارات میں ہمارے خلاف مضامین لکھے گئے اور ہم سب کو پانچ پانچ برس کی سزا سنا دی گئی۔ سب سے زیادہ گھاٹے میں وہ سیکریٹری رہا تھا کیونکہ اتنے بچے اس کے گھر سے بازیاب ہوئے تھے۔ چینل والوں نے اسے بچوں کا ذخیرہ اندوز ثابت کر دیا تھا۔

اس لیے اس کی سزا دس برس کی تھی۔

اس کم بخت بچے کے چکر میں ہم دونوں میاں بیوی کی پوری زندگی برباد ہو گئی تھی۔ خاندان والوں نے ہم سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ ہم بچوں کو اغوا کرنے والے لوگ تھے۔

کیسی ستم ظریفی ہوئی تھی ہمارے ساتھ، ہم کہیں کے نہیں رہے تھے۔ میری نوکری ختم ہو گئی تھی۔ حمیرا جس اسکول میں پڑھاتی تھی اس اسکول میں حمیرا کے خلاف ایک قرارداد بھی پیش کر دی گئی۔

پانچ برسوں کے بعد ہم دونوں میاں بیوی جب جیل سے باہر آئے تو ہمارے لیے دنیا بدل چکی تھی۔ ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیں اپنا شہر چھوڑنا پڑا اور ہم کہیں اور آ گئے۔ پھر نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرنا پڑا لیکن آہستہ آہستہ ہم نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

حمیرا کو اسکول میں ملازمت مل گئی، میں نے جاب شروع کر دی۔

پھر ایک دن ہمیں ایک مارکیٹ میں ایک دکان کے باہر ایک روتا ہوا بچہ مل گیا۔ قریب تھا کہ میں اپنی پرانی عادت کے مطابق اس کے پاس جا کر اس سے ہمدردی کرتا کہ اچانک حمیرا نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''حمیرا یہ بچہ شاید اپنے والدین سے بچھڑ گیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''یہ بتائیں کیا اب دس پندرہ برس کے لیے اندر جانے کا ارادہ ہے؟''

''نہیں تو۔''

''تو پھر چھوڑیں اس کو اور آگے چلتے رہیں۔''

اور ہم آگے چلتے چلے گئے۔ ہم نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

محترم معراج رسول صاحب

سلام مسنون!

ازدواجی زندگی پیار و محبت کی ڈور سے بندھی ہوئی نہ ہو تو جہنم کا نمونہ بن جاتی ہے۔ میری بیوی نے مجھے کسی اور کے خیالوں میں کھویا ہوا دیکھا تو اس نے ایک ایسا سبق دیا، وہ جملہ کہا جس نے میری زندگی کو یکسر بدل دیا۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ یہ سبق ہر ایک کو حاصل ہو جائے۔

فیصل ریحان

(حال مقیم، ٹورنٹو، کینیڈا)

تلاش

میری بیوی بہت اچھی تھی بہت خوبصورت بھی، ذہین بھی اور خیال رکھنے والی بھی۔ مجھ سے وفادار بھی تھی اس کے باوجود نہ جانے کیوں ایک انجانی سی خلش مجھے پریشان رکھتی۔

کوئی یاد آتا رہتا حالانکہ میں نورین کے سامنے اپنی اس خلش کا اظہار نہیں کرتا تھا لیکن اسے احساس ہو جاتا کہ میں کہیں اور گم ہو چکا ہوں، وہ مجھے ٹوک دیا کرتی۔ ''کیا ہوا ہے آپ کو؟''

''نہیں کچھ نہیں۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

"پھر آپ کیا سوچتے رہتے ہیں۔" وہ پوچھتی۔ "آپ کو کس کا خیال آتا ہے؟"

"ارے بابا مجھے کسی کا خیال نہیں آتا بس کاروباری پریشانیوں کی وجہ سے دماغ اُلجھا رہتا ہے۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو ورنہ میں تو اندیشوں میں مبتلا ہو جاتی ہوں۔"

"میں جانتا تھا کہ میں کسے یاد کرتا ہوں، کون مجھے ڈسٹرب کرتا رہتا ہے۔ وہ شمی تھی ایک خوبصورت، ہنس مکھ اور دل میں اُتر جانے والی لڑکی۔

ہم نے ایک دوسرے سے ٹوٹ کر محبت کی تھی۔ ہر بار لو اسٹوری میں ایسا ہی ہوتا ہے، شاید یہ سلسلہ ہزاروں لاکھوں برسوں سے اسی طرح چلا آرہا ہے۔ ہم ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور ایک دوسرے کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔

بہ قول ہمارے ایک استاد کے، وہ کہا کرتے تھے۔ کیمسٹری مل جاتی ہے یا مقناطیسی لہریں ایک دوسرے کو اٹیچڈ کرتی ہیں اس لیے محبت کے مرحلے شروع ہو جاتے ہیں اور یہ عمل خالصتاً جسمانی اور روحانی ہونے کے علاوہ سائنسی بھی ہوا کرتا ہے۔

تو میری اور شمی کی کیمسٹری مل گئی تھی۔ ہم ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔ یہ پسند بڑھتے بڑھتے محبت پھر عشق میں بدل گئی تھی۔

ایک معمولی سا واقعہ ہمیں ایک دوسرے کے قریب لے آیا تھا۔

انٹر کے امتحانات ہو رہے تھے۔ وہ شاید امتحان ہی دینے گھر سے نکلی تھی۔ سفید یونیفارم میں۔ اس کا رکشا خراب ہو گیا تھا اور وہ رکشے کے پاس بے چین اور پریشان کھڑی تھی۔

اتفاق سے میں بھی اُدھر ہی سے گزر رہا تھا۔ مجھے اس لڑکی کی بے چینی اور پریشانی کا اندازہ ہو گیا تھا اسی لیے میں نے اپنی گاڑی اس کے پاس لے جا کر روک دی اور بہت مہذب انداز میں اسے مخاطب کیا۔ "محترمہ میرا خیال ہے کہ آپ کو پیپر دینے جانا ہے اور آپ کا رکشا خراب ہو گیا ہے۔"

"جی ہاں۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے تھے۔ "سمجھ میں نہیں آرہا کیا کروں؟"

"سینٹر کہاں ہے آپ کا؟"

"اسی روڈ پر سرسید کالج۔" اس نے بتایا۔

"چلیں میں آپ کو وہاں ڈراپ کر دیتا ہوں ورنہ رکشے کے چکر میں رہیں گی تو ماری جائیں گی۔"

"جی۔" اس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔ "آپ ڈراپ کریں گے؟"

"دیکھیں میں خود بھی تعلیم حاصل کر رہا ہوں اور اس وقت کی اہمیت سے واقف ہوں۔ ایک شریف آدمی ہوں اس لیے آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔"

کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے رکشے والے کو کچھ پیسے دیے اور میری گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس کی یہ احتیاط مجھے اچھی لگی تھی۔ میں نے راستے میں اس سے کہا۔ "محترمہ۔ آپ یہ مت سمجھیے گا کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو چپک جاتے ہیں اسی لیے آپ کو اُتارنے کے بعد میں آپ کو نظر نہیں آؤں گا۔"

"بہت بہت شکریہ آپ کا۔" وہ مسکرا دی۔ میں نے اس کی مسکراہٹ آئینے میں دیکھ لی تھی۔ "میں نے بھی آپ کو ایسا نہیں سمجھا ہے۔"

کچھ دیر بعد اس کا سینٹر آگیا۔ میں نے اسے ڈراپ کیا اور خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ گیا لیکن نہیں میں آگے کہاں بڑھا تھا، میں تو شاید وہیں رہ گیا تھا۔ اس لڑکی کے آس پاس۔

استاد صاحب کی مقناطیسیت اور کیمسٹری والی بات یاد آنے لگی تھیں۔

بہت اچھی لگی تھی مجھے۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ میں دوبارہ نظر نہیں آؤں گا لیکن میں ایسا نہیں کر سکا۔ میں شام کے وقت اس کے سینٹر پہنچ چکا تھا لیکن میں نے اپنی گاڑی کچھ فاصلے پر کھڑی کی تھی۔ پیپر کا وقت ختم ہوا۔ لڑکیاں گیٹ سے باہر آنے لگیں۔ سب ایک ہی جیسی لگ رہی تھیں، سفید یونی فارم میں لڑکیوں کے غول کے غول باہر آرہے تھے۔

میں مایوس ہو کر جانے ہی والا تھا کہ مجھے وہ دکھائی دے گئی۔ یہاں بھی وہی فارمولا سامنے آگیا تھا یعنی مقناطیسیت والا۔ میں نے اسے ان درجنوں لڑکیوں کے درمیان ..... پہچان لیا تھا۔

وہ کچھ لڑکیوں کے ساتھ ایک طرف جا رہی تھی۔ میں اپنی گاڑی کی طرف آگیا۔ میں اس کے سامنے آ کر اسے ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ میں نے اس کے تعاقب کا ارادہ کر لیا تھا۔ چلتے چلتے وہ اسٹاپ پر آگئی۔

میں بہت دور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ بسیں آتیں اور گزر جاتیں لیکن وہ کسی بس میں سوار نہیں ہوئی۔ میرے اندازے کے مطابق تقریباً ہر روٹ کی بسیں آ کر گزر چکی تھیں لیکن وہ اپنی جگہ اسی طرح کھڑی رہی تھی جیسے کسی کا انتظار کر

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

رہی ہو۔

بالآخر اُکتا کر میں نے اپنی گاڑی بڑھائی اور بس اسٹاپ پر لے آیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور بے جھجک میرے ساتھ آ کر بیٹھ گئی۔

''محترمہ یہ سب کیا ہے؟'' میں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

''محترم میں بھی یہی پوچھ رہی ہوں کہ یہ سب کیا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''جانتے ہیں کہ میں اپنی روٹ کی بس میں کیوں نہیں بیٹھی؟ اس لیے کہ مجھے یقین تھا کہ آپ آس پاس ہی منڈلا رہے ہوں گے۔''

''یہ کس طرح یقین کرلیا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''بس لڑکیوں کو ایسی باتوں کا اندازہ ہو جاتا ہے۔'' اس نے کہا۔

''چلیں اب آپ ہمیں یہ بتا دیں کہ آپ کو کہاں ڈراپ کیا جائے؟''

''میں گلبرگ میں رہتی ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''اور میں نارتھ ناظم آباد میں۔''

''زیادہ فاصلہ نہیں ہے لیکن نہ جانے کیوں مجھے یقین ہے کہ میں اب وقت پر سینٹر پہنچ جایا کروں گی۔''

''واہ محترمہ آپ نے تو بکنگ ہی کرالی۔''

''جی جناب! ویسے یہ بات کنفرم ہے کہ آپ ایک شریف آدمی ہیں اسی لیے آپ کو اپنا نام بتانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میرا نام شمی ہے۔''

''اور میں فیصل ریحان ہوں۔'' میں نے اپنے بارے میں بتایا۔

تو اس طرح میری اور شمی کی ملاقات ہوئی اور ہم ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے گئے۔ قریب سے قریب تر۔ پہلے پسند، محبت پھر عشق۔ ایک دوسرے کو دیکھے بغیر چین نہیں ملتا تھا۔ جس دن ملاقات نہیں ہوتی وہ دن انتہائی اداس اور تھکا ہوا گزرتا۔ میں یہ سوچا کرتا کہ خدایا یہ کیسی خلش ہے، کیا ہے یہ؟

اس کے بعد اچانک وہ سب کچھ ہو گیا جس کے بارے میں ہم دونوں سوچتے ہوئے اداس ہو جایا کرتے تھے۔ شمی کسی اور کی ہو گئی۔ بالکل اچانک اس کے والد کی طبیعت خراب ہوئی اور انہوں نے اپنے ایک دوست کے بیٹے سے شمی کی شادی کردی۔

وہ بے چاری چیختی رہ گئی، روتی رہ گئی لیکن کون اس کی بات سننے والا تھا۔ کون اس کے آنسو پونچھنے والا تھا۔ صرف ایک ازلی اور ابدی محرومی۔

اس کے جانے کے بعد خود میں بجھ کر رہ گیا تھا۔ زندگی میں رہے گی تمہاری کمی۔ دن گزرنے کو یوں تو گزر جائیں گے۔

بہت دنوں تک میری یہی کیفیت رہی۔ اداس، پریشان اس کے بعد میرے والدین نے زبردستی نورین سے میری شادی کردی۔

نورین بہت اچھی تھی بہت ہمدرد، بہت مخلص، بہت پیار کرنے والی۔ اس نے مجھے بہت خوشیاں دیں۔ ہر طرح میرا خیال رکھا۔ اس کے ساتھ زندگی بہت اچھی گزر رہی تھی۔ اس کے باوجود شمی کا خیال کبھی کبھی آ کر شب خون مار کر مجھے اداس کر جاتا۔

میری اس کیفیت کو نورین محسوس کر لیا کرتی تھی۔

''کیوں اتنے اداس ہو جاتے ہیں۔ کیا ہوا ہے آپ کو؟''

''کچھ بھی نہیں بس یونہی۔''

وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلا دیتی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب مجھے نورین کی طرف سے ہر طرح آرام اور سکون ہے تو پھر میں کسی اور کو کیوں یاد کرتا ہوں۔

ایک دن میں نے ایک کتاب پڑھی جس میں ایک جگہ لکھا ہوا تھا۔ ''محبت کسی ایسے شخص کو تلاش نہیں کرتی جس کے ساتھ رہا جائے بلکہ محبت تو ایسے شخص کی تلاش میں رہتی ہے جس کے بغیر نہ رہا جائے۔''

اس مقولے نے میرا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ واقعی محبت کو اس کی تلاش تھی جس کے بغیر میرا رہنا محال ہو گیا تھا۔ یعنی شمی، کیا خوبصورت بات تھی اور دل کے سچے جذبے کی عکاسی کرتی ہوئی۔

ایک دن پھر نورین نے مجھے اداس دیکھ کر پوچھا۔

''پلیز آج آپ مجھے بتا ہی دیں کہ آپ کی بے چینی اور اداسی کا سبب کیا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ اب تمہیں بتا ہی دینا چاہیے۔'' میں نے کہا پھر وہ کتاب اس کے سامنے کردی۔ ''تم یہ جملہ پڑھ لو تمہاری سمجھ میں آ جائے گا۔''

اس نے وہ جملہ پڑھا اور خاموش ہو گئی۔ وہ اداس ہو گئی تھی پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ ''اب میں آپ کی اداسی اور پریشانی کا سبب سمجھ گئی ہوں۔ آپ نے مجھے آج تک نہیں بتایا، کون ہے وہ؟''

پھر میں نے اسے اپنی اور شمی کی پوری کہانی سنا دی۔

سب کچھ بتا دیا اس کو، بہت دیر تک بولتا رہا تھا۔ نرم جذبے، محبت، خوبصورت باتیں، خوبصورت وعدے۔ وہ سارے احساسات اور جذبات جو شمی کے حوالے سے میرے ذہن میں تھے۔ میں نے اسے وہ سب کچھ بتا دیا تھا۔

اس دوران وہ بالکل چپ رہی تھی۔ سوچتی رہی تھی پھر اچانک اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

ظاہر ہے اس کی ایسی کیفیت تو ہونی تھی۔ دنیا کی کوئی عورت یہ برداشت نہیں کرسکتی ...... کہ اس کا شوہر رہے تو اس کے قریب لیکن اس کے دھیان میں کوئی اور بسا ہوا ہو۔ وہ کسی اور کو یاد کرتا رہتا ہو۔ کسی اور کے لیے اداس اور بے قرار رہتا ہو۔ بہرحال اس نے کہا تو کچھ نہیں لیکن خاموش رہنے لگی تھی جب کہ میں صرف اس کی خاطر اپنے آپ کو نارمل رکھنے کی کوشش کیا کرتا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا۔ اس کو آؤٹنگ پر لے جاتا۔ یہ ظاہر کرتا کہ میں نے اب شمی کو اپنے دھیان سے جھٹک دیا ہے۔

ایک رات نورین نے مجھ سے کہا۔ ''اگر میں آپ سے ایک بات کہوں تو آپ ناراض تو نہیں ہوں گے۔''

''نہیں تو میں تم سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتا۔ بتاؤ کیا بات ہے؟''

''اس کتاب میں لکھا ہوا جملہ بالکل درست ہے۔'' اس نے کہا۔

''ہاں وہ تو ہے لیکن اس وقت وہ جملہ کیوں یاد آ گیا بھول جاؤ اس کو؟''

''نہیں ریحان بھولنا ہی تو مشکل ہے کیونکہ میں نے آپ سے ایک بات چھپائی ہے اور وہ یہ ہے کہ میری نگاہیں بھی کسی ایسے کو تلاش کرتی رہتی ہیں جس کے بغیر رہنا مشکل ہو۔''

''کیا۔'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو۔''

''ہاں میں نے بھی کسی سے محبت کی تھی۔'' اس نے بتایا۔

میں دنگ رہ گیا۔ میں نے پہلی بار سنا تھا۔ میں لاکھ روشن خیال سہی لیکن یہ سوچنا ہی عجیب لگ رہا تھا کہ میری بیوی کسی کی دوست کسی کی محبوبہ رہ چکی ہے۔ یہ کیسا احساس تھا جس نے ذرا سی دیر میں میرے ہوش اُڑا دیے تھے۔

میں نے اس سے کچھ نہیں پوچھا کہ وہ کون تھا، کیا تھا؟ دونوں کس طرح ملتے تھے؟ جس طرح میں نے اسے اپنی محبت کی داستان سنا دی تھی۔ اسی طرح اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا اور مجھے اس سے کچھ معلوم بھی نہیں کرنا تھا۔

''لیکن اتنا ضرور ہوا کہ ہم دونوں کے درمیان ایک سردمہری کی فضا قائم ہو گئی۔ باتیں بھی ہوتیں تو بہت رسمی، کام کی باتیں۔

شاید ہم دونوں ہی کے دلوں میں چور تھا۔ اسی لیے ایک دوسرے سے نگاہیں چُرا رہے تھے یا کوئی اور بات تھی بہرحال اتنا ہوا کہ ہم خاموش ہو گئے تھے۔

زندگی کے معمولات گرچہ اسی طرح چل رہے تھے۔ میں اسی طرح دفتر جاتا وہ اسی طرح گھر کے کاموں میں مصروف ہو جاتی بظاہر سب کچھ ٹھیک تھا۔ پھر بھی اندر ٹوٹ پھوٹ مچی ہوئی تھی۔

پھر وہ دن آ گیا جب میری سالگرہ تھی۔

وہ ہر سال بہت اہتمام اور پیار کے ساتھ یہ دن منایا کرتی تھی۔ خوبصورت ڈریسنگ کرتی، اچھے کھانے بناتی پھر ہم لانگ ڈرائیو پر نکل جاتے۔

اس دن صبح اُٹھ کر اس نے وش کرتے ہوئے کہا۔ ''آج میں نے آپ کے لیے ایک خاص قسم کا تحفہ بنایا ہے۔''

''خاص تحفہ۔ وہ کیا ہے بھائی۔'' میں نے بھی مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی دیکھنا چاہتے ہیں یا شام کو۔''

''ابھی۔''

''او کے۔'' اس نے اپنی ڈائری میرے سامنے کردی اور ایک صفحہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''اسے پڑھ لیں۔ اس کتاب کے جملے میں کچھ اضافہ کیا ہے آپ کو ضرور پسند آئے گا۔ اصل جملہ یہ تھا۔ ''محبت کسی ایسے شخص کو تلاش نہیں کرتی جس کے ساتھ رہا جائے بلکہ محبت تو اس کی تلاش میں رہتی ہے جس کے بغیر نہ رہا جائے۔''

اور اس نے اضافہ یہ کیا تھا کہ اگر یہ دونوں اپنے اپنے محبوب کو تلاش کرنے والے اتفاقاً ایک دوسرے سے مل جائیں تو انہیں یہ چاہیے کہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر نئی منزلوں کا سفر شروع کر دیں اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھیں۔''

وہ میرے قریب تھی اس نے واقعی مجھے ایک خوبصورت تحفہ دے دیا تھا۔

اب ہم دونوں میاں بیوی زندگی کے سفر پر ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں، اب ہم پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھتے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایسا کیوں؟

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
السلام علیکم!
آپ کے ڈائجسٹ میں سچی اور منفرد انداز کی آپ بیتیاں شائع ہوتی ہیں۔ میری زندگی کا بھی ایک واقعہ بہت منفرد اور انوکھا ہے، وہ میں قلمبند کررہا ہوں۔ الگ انداز کی یہ سچ بیانی ہے اس لیے آپ کو بھی پسند آئے گی۔

کمال الدین رازی
(کراچی)

بی کام کا رزلٹ آنے میں ابھی چھ مہینے باقی تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ اتنا عرصہ میں کیسے گزاروں گا؟ اگرچہ میں اپنے کسی دوست کے ساتھ رہ سکتا تھا اور ابھی مجھے ہاسٹل سے نکلنے کو نہیں کہا گیا تھا لیکن زندگی گزارنے کے لیے کھانے پینے کی ضرورت بھی تو ہوتی ہے۔ بارہ سال کی عمر میں حیدرآباد سے کراچی آیا تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی اتنی مشکل بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے والدہ کو دیکھا ہی نہیں۔ وہ اس وقت انتقال کر گئیں جب میں صرف دو مہینے کا تھا اور بارہ سال کا ہوا تو والد صاحب انتقال کر گئے۔ وہ اپنا لیتھ مشین کا کارخانہ چلا رہے تھے۔ وہاں ہمارا ذاتی مکان بھی تھا۔ قریبی رشتے داروں میں صرف چچا خیرو تھے اور وہی مجھے کراچی لائے تھے۔ میں حیران تھا کہ وہ مجھے کراچی کیوں لائے ہیں؟ پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ مجھے کراچی کے ایک اچھے اسکول میں داخل کرانے لائے ہیں۔ اس وقت میں نہیں سمجھ سکا کہ چچا خیرو جو ایک جماعت نہیں پڑھے ہوئے تھے ان کو میری تعلیم سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔

کراچی میں وہ مجھے ایک چھوٹی سی بستی میں لائے جہاں کچی گلیوں میں گندا پانی بہہ رہا تھا اور ہر طرف بے شمار بچوں کے غول تھے۔ یہاں چچا خیرو کا ایک جاننے والا تھا۔ کریم الدین سبزی بیچتا تھا۔ چچا خیرو اس کے مختصر سے گھر میں رکے اور دوسرے دن مجھے چھوڑ کر روانہ ہو گئے اور جب میں نے چچا خیرو کو نہ پایا کر ان کے بارے میں پوچھا تو کریم الدین نے مجھے مارا اور دھمکی دی کہ میں نے دوبارہ چچا خیرو کا نام لیا تو وہ مجھے گھر سے نکال دے گا اور میں بھوکا مروں گا۔ میں ڈر گیا تھا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ کریم الدین مجھے اپنی دکان پر لے جانے لگا۔ اسے ایک مددگار کی ضرورت تھی اور وہ اسے میری صورت میں بلا معاوضہ مل گیا تھا۔ ایک دو بار میں نے کریم الدین کو بتانے کی کوشش کی کہ چچا خیرو مجھے یہاں اسکول میں داخل کرانے لایا تھا تو اس نے ڈانٹ نکال کر کہا۔

''ابے او کمالے، سمجھ لے یہی تیرا اسکول ہے۔ یہاں سے سیکھ اور کمانے کا دھندا کر۔''

سبزی بیچنے میں آدمی کیا سیکھ سکتا ہے۔ میں تو پڑھنا چاہتا تھا اور شاید میری یہی لگن کام آئی۔ کریم الدین کی دکان جس علاقے میں تھی وہ پوش تھا اور وہاں سارے دولت مند لوگ رہتے تھے۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ناظم آباد بھی کوئی بہت دولت مندوں کا علاقہ نہیں تھا۔ لیکن اس وقت مجھے لگا تھا کہ یہاں کے رہنے والے بہت دولت مند ہیں۔ سبزی لینے کے لیے زیادہ تر عورتیں آتی تھیں۔ ان میں ایک ذرا بڑی عمر کی لیکن خوب صورت اور چہرے سے نرم مزاج نظر آنے والی خاتون بھی تھیں۔ وہ عام طور سے صبح سبزی لینے آتی تھیں اور ڈھیر ساری سبزیاں لے کر جاتی تھیں۔ بعض اوقات تو اتنی سبزی لیتی تھیں کہ ان کو اسے لے جانے کے لیے رکشا کرنا پڑتا تھا۔ میں حیران ہوتا کہ وہ اتنی سبزی کا کیا کرتی ہوں گی۔ وہ مجھے اچھی لگتی تھیں اس لیے وہ جب آتیں تو میں بھاگ بھاگ کر ان کے لیے سبزی نکالتا اور اچھی نکالتا۔ شاید وہ اسی بات سے متاثر ہوئی تھیں۔

ایک دن وہ آئیں تو میں پیٹی سے نکلنے والا انگریزی کا اخبار دیکھ رہا تھا۔ حیدرآباد میں ایک نجی اسکول میں چھٹی کلاس میں پڑھ رہا تھا جب ابا کا انتقال ہوا اور میری انگریزی کی استعداد بھی اچھی تھی۔ اتنے میں وہ آئیں اور مجھے اخبار دیکھتے پا کر پوچھا۔ ''کیا دیکھ رہے ہو کچھ سمجھ میں بھی آ رہا ہے؟''

''جی تھوڑا تھوڑا۔'' میں نے مستعدی سے کہا اور ان کو ایک خبر اور پھر اس کا اردو ترجمہ سنایا۔ یہ مکمل تو نہیں تھا لیکن ایک سبزی فروش بچے کے منہ سے ان کے لیے حیرت انگیز تھا۔ انہوں نے حیرانی سے کہا۔

''تمہاری انگریزی اچھی ہے تم پڑھتے ہو؟''

''جی چھٹی کلاس تک پڑھا ہے پھر ابا کا انتقال ہو گیا اور خیرو چچا مجھے یہاں چھوڑ گئے۔''

''تم یہاں اپنا وقت اور صلاحیتیں ضائع کر رہے ہو تمہیں تو پڑھنا چاہیے۔''

''خیرو چچا مجھے یہی کہہ کر یہاں لایا تھا لیکن ....'' میں نے بے چارگی سے سبزیوں کی طرف دیکھا۔

''کریم الدین سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

خوش قسمتی سے اس وقت کریم الدین دکان کے اندر سبزیوں کی چھانٹی میں لگا ہوا تھا اس لیے مجھے ان سے بات کرنے کا موقع مل گیا ورنہ وہ مجھے کسی گاہک سے بات بھی کرنے نہیں دیتا تھا۔ میں نے بیگم صاحبہ کو بتایا کہ میرا کریم الدین سے کوئی تعلق نہیں ہے اور میں اس کے پاس کام کرتا ہوں۔ مجھے کوئی تنخواہ نہیں ملتی ..... اور صرف تین وقت کا کھانا اور رہنے کی جگہ ملی ہوئی ہے۔ ان کو یہ سب سن کر افسوس ہوا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔

''سنو، میں ایک اسکول چلاتی ہوں۔ اگر تم چاہو تو میں

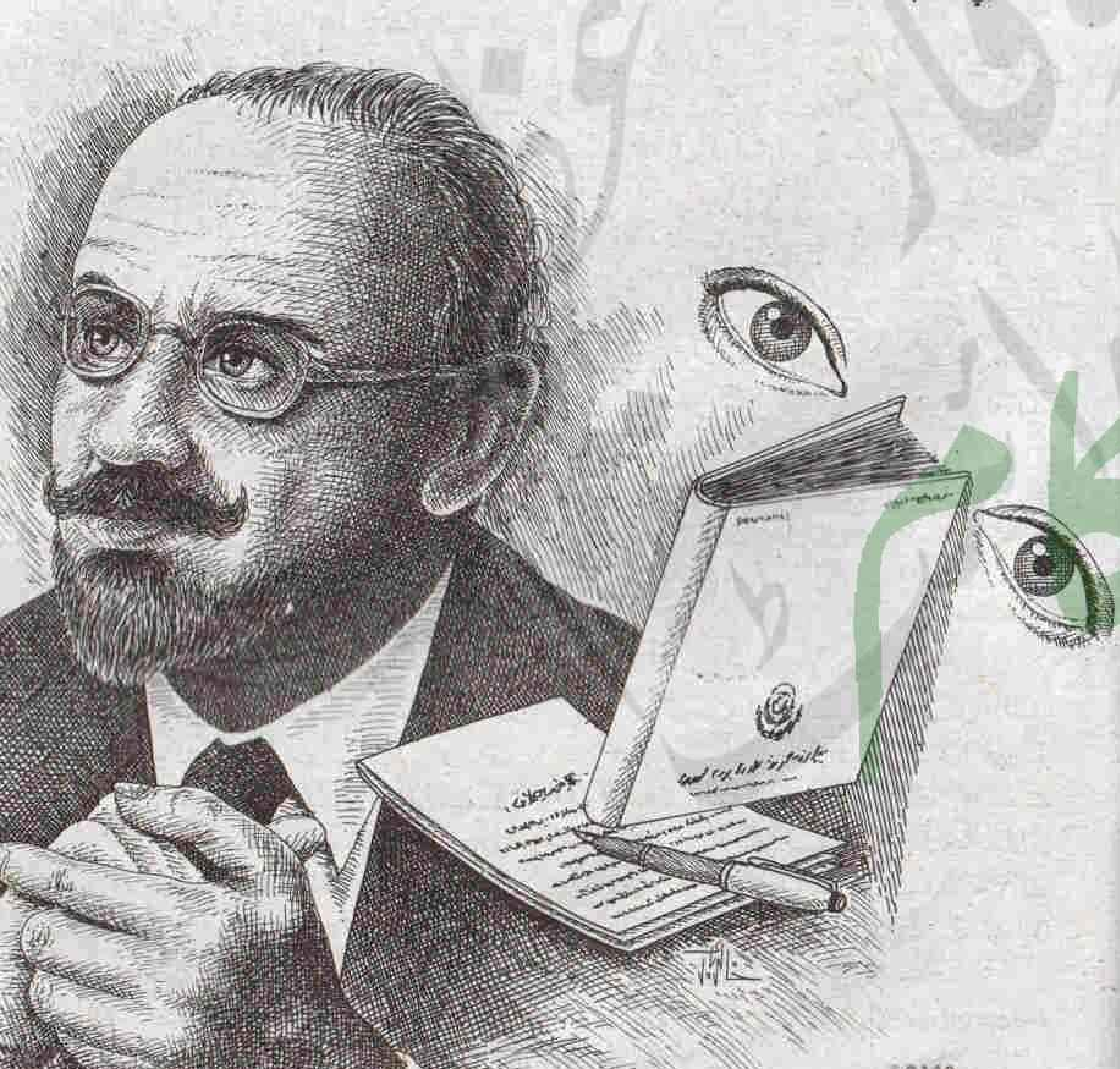

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

تمہیں اس میں داخلہ دے سکتی ہوں اور تم سے کوئی فیس بھی نہیں لوں گی۔ کتابیں اور یونیفارم سب اسکول کی طرف سے ہوگا۔"

میں خوش ہوگیا تھا پھر مجھے کریم الدین کا خیال آیا اور میں نے کہا۔ "کریم چچا نہیں مانیں گے۔"

"میں اس سے بات کرتی ہوں۔" انہوں نے مجھے سبزیوں کی لسٹ تھمائی۔ "جب تک یہ سب نکال کر رکھو۔"

وہ دکان کے اندر گئیں اور کچھ دیر بعد واپس نکلیں تو ان کے چہرے پر مایوسی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ کریم الدین نے انکار کر دیا ہے۔ ظاہر ہے اس نے مجھے کام کے لیے رکھا ہوا تھا اسکول میں پڑھانے کے لیے تھوڑی رکھا تھا۔ بیگم صاحبہ نے سبزی لی اور خاموشی سے چلی گئیں۔ انہوں نے مجھ سے بات نہیں کی تھی۔ میں مایوس اور کسی قدر خوف زدہ تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کریم الدین مجھے مارے گا لیکن اس کا ردِعمل اتنا زیادہ ہوگا یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس نے گھر پہنچتے ہی اپنی چمڑے کی بیلٹ سنبھالی اور مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ اس کی بیوی کو مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں تھی اور اس سے پہلے کریم الدین جب بھی مجھے مارتا تھا تو وہ بے حسی سے دیکھتی رہتی تھی لیکن اس روز مجھے اتنی بے دردی سے مارا کہ مجبوراً وہ مجھے بچانے آگئی اور اس نے بہ مشکل کریم الدین کو روکا۔ "بس کرو کیا اسے مار دو گے؟"

اتنی دیر میں کریم الدین نے میری چیخوں کی پروا کیے بغیر مجھے مار مار کر لہولہان کر دیا تھا۔ اسے مجھ پر بالکل رحم نہیں آیا تھا۔ بلکہ اس کی بیوی نے روکا تب بھی وہ بار بار مجھے مارنے کے لیے دوڑ رہا تھا اور وہ اسے روک رہی تھی۔ میری کھال اور کپڑے دونوں پھٹ گئے تھے۔ رات کسی وقت کریم الدین کی بیوی نے میرے زخم صاف کر کے ان پر ہلدی لگائی اور مجھے دوسرے کپڑے پہننے کو دیے۔ ہلدی سے بہت آرام ملا تھا اس کے باوجود صبح میری یہ حالت تھی کہ مجھ سے ہلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ پھر بھی کریم الدین مجھے دکان پر لے آیا اور میں درد سے ٹوٹتے جسم کے ساتھ کام کرنے پر مجبور ہوگیا تھا۔

کچھ دیر میں بیگم صاحبہ آئیں اور انہوں نے میرے چہرے کے زخم سے بھانپ لیا کہ میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوا۔ انہیں یہ بھی پتا چل گیا کہ میرے ساتھ یہ سلوک اس لیے ہوا کہ انہوں نے مجھے اپنے اسکول میں داخلہ دینے کے لیے کریم الدین سے بات کی تھی۔ وہ غصے میں بھری ہوئی دکان کے اندر گئیں اور ان کے زور زور سے بولنے کی آواز آنے لگی۔ کریم الدین دب کر بات کر رہا تھا لیکن کچھ دیر میں وہ بھی اونچی آواز میں بولنے لگا۔ کچھ دیر میں جھگڑا دکان سے باہر آگیا اور مارکیٹ کے دوسرے لوگ بھی جمع ہو گئے۔ بیگم صاحبہ نے لوگوں کو بتایا کہ کریم الدین ایک بے سہارا اور یتیم بچے کے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہے۔ جس سے اس کا کوئی رشتہ بھی نہیں ہے۔

"تو تجھے کیا ہے؟" کریم الدین نے بدتمیزی سے کہا۔ "کیا تیرا رشتے دار لگتا ہے۔"

"بکواس مت کرو۔" بیگم صاحبہ نے اسے جھڑکا۔ "میں ابھی پولیس میں رپورٹ کراتی ہوں۔"

پولیس کا نام سن کر کریم الدین کے ہوش اُڑ گئے تھے۔ وہ فوراً شرافت کے دائرے میں آگیا تھا۔ جب وہ انسان بنا تو بیگم صاحبہ نے اعلان کیا۔ "اس بچے کو میں لے جا رہی ہوں۔"

"آپ اسے کس طرح لے جا سکتی ہیں؟" کریم الدین نے اعتراض کیا۔ بیگم صاحبہ نے جواب دیا۔

"جیسے تم اسے رکھ سکتے ہو اور اسے جانوروں کی طرح اپنے ظلم کا نشانہ بنا سکتے ہو۔"

کریم الدین نے مزاحمت کی کوشش کی تھی لیکن بیگم صاحبہ اور مارکیٹ کے دوسرے لوگوں کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ خود میں بھی کریم الدین کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں تھا۔ بیگم صاحبہ جن کا نام اسما احمد تھا۔ اسی علاقے میں ایک اسکول چلا رہی تھیں۔ انہوں نے بڑی محنت اور کوشش کے بعد یہ اسکول قائم کیا تھا۔ ان کے شوہر معذور تھے لیکن پڑھے لکھے آدمی تھے وہی اسکول کے پرنسپل تھے۔ اپنے اسکول کا معیار بہتر رکھنے کے لیے وہ دونوں بہت محنت کرتے تھے۔ حد یہ کہ انہوں نے اسکول کینٹین تک خود سنبھالی ہوئی تھی اور ایک ملازم رکھا ہوا تھا جو چیزیں بناتا تھا۔ اسما بیگم اسی کے لیے اتنی ڈھیر ساری سبزی لے کر جاتی تھیں۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ جس طرح ان کے اسکول میں بچوں کو معیاری تعلیم دی جاتی ہے اسی طرح ان کو باہر کی خراب چیزوں کے بجائے معیاری اور اچھی چیزیں ملیں۔

اسما بیگم اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ اسکول کے اوپر ہی رہائش رکھتی تھیں۔ انہوں نے مجھے اسکول میں داخلہ دیا اور ساتھ ہی رہنے کے لیے جگہ بھی دے دی۔ میں اسکول کے ایک کمرے میں رہنے لگا تھا۔ اسکول کا وقت ختم ہونے کے بعد میں اسکول اور گھر کے مختلف کام کرتا تھا۔ اسما بیگم نے اس پر منع نہیں کیا تھا لیکن انہوں نے مجھ سے کہا۔ "میں تمہیں یہاں پڑھنے اور ایک اچھا انسان بنانے کے لیے لائی ہوں۔ اس میں کوتاہی کر کے تم میرا سر نیچا مت کرنا۔"

"میں دل لگا کر پڑھوں گا۔" میں نے ان سے وعدہ

کراچی کا قلعہ بند قصبہ 24.52 عرض بلد شمالی اور 67.17 طول بلد مشرقی میں واقع ہے اور صوبہ سندھ کے جنوب مشرقی سرے پر ہے اور اب چند سالوں سے اہم ترین بندرگاہ بن گیا ہے۔ اس کی بندرگاہ جسے گاہے ماہے خورعلی کہہ کر ممیز کیا جاتا ہے۔ بہت محدود ہے اور اس کے دہانے پر روک ہونے کی وجہ سے ان جہازوں کے لیے اس میں داخل ہونا دور اندیشی نہیں جو سولہ فٹ سے زیادہ پانی میں چلتے ہوں، گو وہ ایک دفعہ اس روک کو پار کر جائیں تو انہیں دوسری طرف گہرا اور ہموار پانی مل جاتا ہے۔

1797ء کا بنا ہوا ایک قلعہ خلیج کی مغربی طرف کے خشکی کے حصے پر ایستادہ ہے اور اس میں داخلے کو روکنے کے لیے نہایت مناسب ہے اور اگر اس پر اچھی توپیں نصب ہوں اور انہیں صحیح طور پر چلایا جائے تو میرے خیال میں کوئی جہاز بلا خوف و خطر اس میں نہیں آسکتا یا کم از کم موثر طور پر نہیں آسکتا کیونکہ اس کی توپوں کے دہانے بہت اوپر اٹھانے پڑیں گے تاکہ ان کے گولے پہاڑی سے نہ ٹکرائیں اور یوں دس میں سے نو اوپر سے گزر جائیں گے اور دوسری طرف سمندر میں جا گریں گے۔ اس سے وہ قلعہ کی گولہ باری سے تو محفوظ رہ سکتا ہے لیکن چونکہ وہ پہاڑی کے بالکل نیچے ہوگا لہٰذا اس کے عرشوں کو تفنگچیوں سے خالی کرنا ہوگا جو چٹان کی آڑوں میں محفوظ ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ایسی صورتِ حال میں واحد طریقہ یہ ہوگا کہ فوج کو کچھ فاصلے پر اتار دیا جائے اور پھر اسے سیڑھی لگا کر قبضے میں لیا جائے۔ قصبے کی قلعہ بندیاں بہت کمزور اور بے قاعدہ ہیں اور کہیں کہیں پانچ چھ فٹ سے زیادہ بلند نہیں اور یہ اتنی خستہ و شکستہ ہیں کہ ایک گھڑ سوار نہایت آسانی سے ان کے اوپر چڑھ سکتا ہے البتہ بعض جگہوں پر وہ خوب بلند اور اچھی حالت میں ہیں۔ سب کہگل کی بنی ہوئی ہیں جو مٹی، بھوسا اور قریبی دلدلوں میں اُگنے والے لمبے بلدار گھاس پھوس کا امتزاج ہوتی ہیں۔ البتہ دہانہ بندر سے بہنے والی کھاڑی کی طرف انہوں نے حفظ ماتقدم کے طور پر قلعہ بندی کو پتھر اور گارے سے کافی اونچا بنا دیا ہے۔ امیران سندھ کے حکم پر 1813ء میں اندرون فصیل مکانات کی تعداد تین ہزار دو سو پچاس تھی۔ ان کے علاوہ قلعہ کے آس پاس کچھ بکھری ہوئی جھونپڑیاں تھیں جو اس خانہ شماری میں شامل نہیں تھیں۔ اس وقت عارضی قیام کنندگان کے سوا آبادی تیرہ ہزار نفوس تک بڑھ گئی تھی جو 1809ء میں قیام مشن کے وقت سے ڈیڑھ گنا سے بھی زیادہ تھی۔ باشندوں کی اکثریت ہندو ہے جو بہت وسیع پیمانے پر تجارت کرتے ہیں، باوجود اس کے کہ ان پر بہت بھاری محصولات اور چنگی عائد ہیں جو ان کا اپنا ہی ایک قبیلہ نافذ کرتا ہے جس کے سپرد کراچی کے محاصل ہیں۔

1809ء میں کراچی سے سرکاری خزانے کو جو آمدنی ہوئی وہ ننانوے ہزار روپے (12.375 پاؤنڈز) سالانہ تھی اور اجارہ دار کے کوئی بارہ ہزار اس کے علاوہ تھے جو وہ اپنی کارگزاری کے لیے لیتا ہے۔ اوّل الذکر اب تک ایک لاکھ تئیس ہزار ہو چکی ہے اور موجودہ اجارہ دار کوئی بیس ہزار کما لیتا ہے۔ یہ اس جگہ کی تدریجی ترقی کا بین ثبوت ہے جو اسے اس کے سازگار محل وقوع کی وجہ سے حاصل ہو رہی ہے کیونکہ یہ ہندوستان اور مملکت کابل، ایران خراسان، بلخ، بخارا وغیرہ کے وسط میں ہے۔

لیفٹیننٹ ہنری پوٹنگر کے 1816ء میں لکھے گئے "سفرنامہ بلوچستان اور سندھ" سے اقتباس

تلاش: اظہر جمیل صدیقی، کراچی

کیا اور یہ وعدہ اس طرح پورا کیا کہ جب میں نے ان کے اسکول سے میٹرک کا امتحان دیا تو پورے بورڈ میں میرا نمبر چوتھا تھا۔ اس کا سارا کریڈٹ اسما بیگم کو جاتا ہے جنہوں نے ایک یتیم اور بے سہارا بچے کو سہارا دیا۔ مجھے ایک اچھے کالج میں داخلہ اور اسکالرشپ مل گیا تھا اس لیے میں نے اب اسما بیگم کے ساتھ رہنے کے بجائے ہاسٹل میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ مجھے خوشی خوشی رخصت کیا۔ میں ہاسٹل میں رہنے لگا تھا اور اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے بچوں کو ٹیوشن پڑھاتا تھا۔ یہ ٹیوشن بھی مجھے اسما بیگم نے دلوائی تھیں۔ میں ہر چھٹی والے دن ان سے ملنے جاتا تھا۔

لیکن افسوس یہ سلسلہ میرے انٹر کے دوران ہی ختم ہو گیا۔ ایک رات ان کے گھر ڈاکو گھس آئے تھے اور انہوں نے مزاحمت پر معذور مزمل صاحب کو قتل کر دیا، یہ دیکھ کر اسما بیگم کا غم سے ہارٹ فیل ہوگیا تھا۔ چند منٹوں میں ایک ہنستا بستا گھر اُجڑ گیا تھا۔ بچوں کو ان کے دوسرے رشتے دار لے گئے اور اسکول بند ہوگیا۔ مجھے ان میاں بیوی کے مرنے کا ایسا غم ہوا تھا جو اپنے سگے ماں باپ کے مرنے پر بھی نہیں ہوا تھا۔ میں ہفتوں روتا رہا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ صبر آگیا۔

آئی کام کرنے کے بعد میں نے اسی کالج میں بی کام کرنے کے لیے داخلہ لے لیا۔ اس بار بھی میں نے اتنی اچھی پوزیشن لی تھی کہ مجھے ایک بار پھر وظیفہ مل گیا۔ میرے اکثر

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اخراجات اسی سے پورے ہو جاتے تھے۔ باقی میں ٹیوشن پڑھا کر پورے کر لیتا تھا۔ بی کام فائنل میں پڑھائی پر توجہ دینے کے لیے میں نے ٹیوشن چھوڑ دی تھی کیونکہ میں آگے آئی سی ایم اے میں داخلہ لینا چاہتا تھا لیکن میری مالی حیثیت ایسی نہیں تھی کہ میں اس تعلیم کے اخراجات برداشت کر سکتا۔ اس لیے میں نے ایک فرم میں بہ حیثیت ایرنٹس کام کرنے کی درخواست دی۔ یہ فرم مجھے تعلیم بھی دلواتی اور تنخواہ بھی دیتی اور اس کے بدلے میں وہاں آڈٹ کا عملی کام کرتا۔ لیکن جب تک میرا رزلٹ نہیں آجاتا تب تک میں کیا کرتا؟ میں یہ سوچ کر پریشان تھا۔

اس صبح بھی میں ایک ہوٹل میں ناشتا کرتے ہوئے اس بارے میں سوچ رہا تھا کہ میری نظر سامنے پڑے اخبار پر پڑی۔ میں نے اخبار اُٹھا لیا اور ضرورت ہے والا حصہ نکالا۔ اس سے کسی نے ناشتا کر کے ہاتھ صاف کیا تھا لیکن بہر حال یہ پڑھنے کے قابل تھا۔ میں نے اس میں ملازمتوں کے اشتہار دیکھے۔ پھر ایک اشتہار نے میری توجہ کھینچ لی۔ اشتہار کچھ یوں تھا۔

''ضرورت ہے ایک ملازم کی جو چھ مہینے کے لیے ایک آدمی کے لیے تین وقت کھانا بنا سکے۔ معقول تنخواہ اور کام اچھا کرنے کی صورت میں بونس دیا جائے گا، رابطہ....'' آگے ایک فون نمبر تھا۔ مجھے یہ اشتہار اچھا لگا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ اشتہار میرے ہی لیے دیا گیا ہو۔ کیونکہ اکیلے رہ کر میں ہر قسم کے کھانے بنانے کا ماہر ہو گیا تھا۔ جب اسکول میں تھا تو اسما بیگم نے مجھے بہت ساری چیزیں بنانا سکھائی تھیں جو میں اسکول کینٹین کے لیے بناتا تھا۔ میں نے ایک نزدیکی پی سی او سے مطلوبہ نمبر ملوایا۔ دوسری طرف سے ایک کھرکھراتی مردانہ آواز نے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

میں نے تعارف کرایا اور بتایا کہ میں اشتہار کے جواب میں کال کر رہا ہوں۔ اس آدمی نے کہا۔ ''ٹھیک ہے میں تمہیں ایک پتا بتا رہا ہوں وہاں ابھی آجاؤ لیکن یاد رکھنا دروازے پر تین بار دستک دینا اور گھڑی دیکھ کر ٹھیک دو منٹ بعد دروازہ کھول کر اندر آجانا۔'' اس نے پتا بتایا اور فون بند کر دیا۔

میں ادائیگی کر کے فوراً روانہ ہو گیا کیونکہ پتا گلشن اقبال کے ایک فلیٹ کا تھا۔ میں بس کے ذریعے وہاں پہنچا۔ فلیٹ دوسری منزل پر تھا اور عمارت خاموش اور خاصی ویران سی تھی۔ میں نے ہدایت کے مطابق تین بار دروازے پر دستک دی اور گھڑی پر نظر جما کر کھڑا ہو گیا۔ اگرچہ یہ طریقہ کار پُراسرار سا لگ رہا تھا لیکن مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ مجھے ملازمت چاہیے تھی تاکہ میری مشکل آسان ہو جائے۔ ٹھیک دو منٹ بعد میں اندر داخل ہوا تو حیران رہ گیا۔ سامنے ایک بڑا سا لاؤنج تھا جس کے ایک طرف کچن تھا اور سامنے دو دروازے نظر آرہے تھے جو بند تھے۔ لاؤنج میں پرانے انداز کا شاندار صوفہ سیٹ تھا۔ روشنیاں جل رہی تھیں اور ہر چیز بالکل صاف ستھری اور چمکتی ہوئی تھی۔ میں آواز دینے والا تھا کہ میری نظر میز پر پڑے کاغذ پر گئی اور میں نے بے ساختہ اسے اُٹھا لیا۔ اس پر میرے لیے تحریر تھی۔

''ملازمت کی یہ شرائط ہیں۔ اوّل، تم صبح آٹھ بجے آؤ گے اور ناشتا بنا کر بائیں طرف والے دروازے کے سامنے رکھ کر واپس چلے جاؤ گے۔ پھر دوپہر ایک بجے آؤ گے اور کھانا بنا کر اسی طرح رکھ کر واپس چلے جاؤ گے اور پھر سات بجے آؤ گے، کھانا بنا کر ٹرے میں رکھ کر واپس چلے جاؤ گے۔ دوم، تم جاننے کی کوشش نہیں کرو گے کہ کمرے میں کون ہے اور نہ ہی آس پاس کسی سے پوچھو گے۔ سوم، ان تین اوقات کے علاوہ یہاں بالکل نہیں آؤ گے۔ چار، اگلے دن کے کھانے کا مینو تمہیں روزانہ رات کو مل جائے گا اور اس کے مطابق چیزیں لانا بھی تمہاری ذمے داری ہوگی۔ اس کے لیے روزانہ تمہیں رقم بھی مل جائے گی۔ بتائی گئی ذمے داری کے علاوہ تمہیں اور کوئی کام نہیں کرنا ہے لیکن کچن اور برتنوں کی صفائی تمہارے ذمے ہوگی۔ کسی بھی ہدایت کی خلاف ورزی کی صورت میں تمہیں فوری نکال دیا جائے گا۔ اگر تمہیں یہ شرائط منظور ہیں تو تین بار بائیں طرف والے دروازے پر دستک دو، اس دوران میں منہ سے کچھ مت کہنا اور ہاں یہاں کام کرنے کی صورت میں بھی کوئی آواز نہیں نکالو گے۔ یہ لازمی ہے۔''

مجھے لگا جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ یہ ملازمت تھی تو ایسی ملازمت کے بارے میں کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ لیکن اگر مجھے معقول تنخواہ مل رہی تھی تو مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ رقعے میں تنخواہ کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ مجھے امید تھی کہ اس دستک کے جواب میں کچھ ہوگا اور ایسا ہی ہوا جیسے ہی میں نے تین بار دستک دی۔ دروازے کے نیچے سے ایک خالی لفافہ سرسراتا ہوا باہر آیا۔ یہ میرے لیے تھا۔ میں نے لفافہ اُٹھایا اور اسے کھولا تو اندر سے کچھ رقم اور ایک اور چھوٹا رقعہ نکلا۔ اس پر تین وقت کے کھانوں کی فہرست تھی اور نیچے لکھا ہوا تھا۔ ''تمہیں ہر ہفتے تین ہزار روپے تنخواہ دی جائے گی۔ اس کے علاوہ روزانہ کھانے کے لیے پانچ سو دیے جائیں گے۔ اگر اس میں سے کچھ رقم بچی تو وہ بھی تمہاری ہوگی۔ اگر رقم کم پڑے اور سامان چاہیے ہو تو کسی وقت کے

کھانے کی ٹرے کی ساتھ کاغذ پر لکھ کر رکھ دینا۔ تم کل سے اپنا کام شروع کر دو۔''

میں خوش ہو گیا تھا کیونکہ تین ہزار روپے ہفتہ آج سے دس سال پہلے خاصی بڑی رقم ہوتی تھی۔ پھر ایک دن کے ایک آدمی کے کھانے کے لیے پانچ سو روپے خاصی بڑی رقم ہوتی تھی۔ وہ کچھ خاص کھانے کا شوقین نہیں تھا کیونکہ اس نے تمام کھانے سادہ لکھے تھے۔ کیونکہ اب میرا کوئی کام نہیں تھا اس لیے میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میرا ہاسٹل صدر میں تھا اور گلشن تک مجھے آنا جانا دور پڑتا۔ وہ بھی دن میں تین بار۔ اس کا ایک ہی حل تھا کہ میں کام کر کے وہاں سے جاتا تو کہیں آس پاس وقت گزار کر دوبارہ آجاتا۔ بعد میں میں نے اس کا اچھا حل نکال لیا۔ پاس ہی ایک لائبریری تھی۔ میں نے ابھی سے آئی سی ایم اے کی تیاری شروع کر دی۔ کتابیں لے آیا اور جب یہاں سے فارغ ہوتا تو سیدھا لائبریری چلا جاتا۔

اگلے دن میں مطلوبہ سامان لے کر فلیٹ پہنچا پہلے دن کی طرح تین بار دستک دی اور دو منٹ بعد ہینڈل گھمایا تو دروازہ کھل گیا۔ میں اندر آیا سارا سامان اپنی جگہ رکھا اور پھر ناشتا بنایا۔ کچن بالکل صاف ستھرا تھا اور لگ رہا تھا کہ استعمال ہوتا ہے۔ ناشتے کی ٹرے رکھ کر میں نے دروازے پر دستک دی اور باہر نکل گیا۔ میں نے ایک گھنٹے میں اپنا کام کر لیا تھا۔ نو بجے میں وہاں سے روانہ ہو گیا تھا۔ اب مجھے چار گھنٹے بعد آنا تھا۔ یہ چار گھنٹے میں نے ایک نزدیکی پارک میں ٹہل کر گزارے۔ ایک بجے واپس آیا۔ دستک دے کر دو منٹ بعد اندر آیا تو ناشتے کی خالی ٹرے کچن میں رکھی تھی۔ میں نے برتن دھوئے اور دوپہر کے کھانے کی تیاری شروع کر دی۔ کچن میں مائیکرو ویو اوون کے ساتھ کام کرنے والی تمام مشینری تھی۔ فلیٹ بہت بڑا تو نہیں تھا اس میں اس بڑے لاؤنج کے ساتھ دو بیڈ روم تھے لیکن یہ بہت پوش علاقے میں تھا اور اس کی تمام چیزیں بہت اچھی اور مہنگی تھیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس آدمی نے مجھے ملازم رکھا تھا اور گھر کا یہ حصہ پورے اعتماد سے میرے حوالے کر دیا تھا۔ وہ نہ تو مجھ سے ملا تھا اور نہ ہی اس نے مجھے دیکھا تھا۔ دوپہر کا کھانا بنا کر میں نے اسی طرح دروازے کے سامنے رکھا اور دستک دے کر فلیٹ سے نکل گیا۔ اس بار بھی مجھے ایک گھنٹا لگا تھا اور اب مجھے پانچ گھنٹے کہیں اور گزارنے تھے۔ میں اسی پارک میں آگیا۔ وقت بڑی مشکل سے گزرا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اب ہمت کر کے ہاسٹل واپس چلا جایا کروں لیکن بس سے آنے اور جانے میں دو گھنٹے لگ جاتے اور تین گھنٹے کی ملازمت کے

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 6,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں، ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جا سکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد ادائیگی کر کے رسید حاصل کر سکتے ہیں
رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

لیے روزانہ چھ گھنٹے کا سفر بہت مشکل کام تھا میری ہمت نہیں ہوئی۔ بہرحال کچھ عرصے بعد لائبریری مل گئی تو یہ مسئلہ بھی حل ہوگیا۔ وہاں میں آرام سے پڑھتا تھا اور اکاؤنٹس کی پریکٹس کرتا تھا۔

اب میں صبح ہاسٹل سے نکلتا، پہلے فلیٹ میں آکر اس آدمی کے لیے ناشتا بناتا جو نہ جانے کیوں مجھے اپنی صورت نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔ وہ کمرے میں حرکت کرتا تھا یا چلتا پھرتا تو آہٹیں ہوتی تھیں۔ شروع میں مجھے معاملہ کچھ پُراسرار لگا تھا اور کچھ دن تو میں خوف زدہ بھی رہا تھا کہ یہ کوئی اور چکر نہ ہو۔ لیکن رفتہ رفتہ مجھے یقین آگیا کہ اندر کوئی آدمی ہی ہے، آسیب نہیں ہے اور وہ کسی وجہ سے اس طرح زندگی گزار رہا ہے۔ یہ تو طے تھا کہ وہ خاصا پیسے والا آدمی تھا اور روزانہ پانچ سو تو صرف کھانے پر خرچ کرتا تھا۔

میں اس کی دی ہوئی رقم سے اس کے لیے بہترین چیزیں لاتا تھا اس کے باوجود تین سو روپے بھی خرچ نہیں ہوتے تھے اور باقی رقم مجھے ملتی تھی۔ اس رقم سے میں تینوں وقت باہر کھانا کھاتا تھا، آنے جانے کا کرایہ دیتا تھا اور پھر بھی مجھے کچھ رقم بچ جاتی تھی۔ اس طرح دیکھا جائے تو تنخواہ مجھے ساری کی ساری بچ رہی تھی۔ یہ مہینے کے کوئی ساڑھے تیرہ ہزار روپے بن جاتے تھے۔

شروع میں تو میں اس کی ہدایت کے مطابق اس سے بالکل لاتعلق رہا تھا لیکن رفتہ رفتہ مجھے تجسس ستانے لگا۔ آخر وہ شخص ایسا کیوں کر رہا تھا؟ وہ کیوں مجھ سے چھپ رہا تھا اور ممکن ہے کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی اس کا رویّہ ایسا ہی ہو تب بھی اس کی کیا وجہ تھی؟ نارمل زندگی میں کوئی ایسا نہیں کرتا..... کئی بار میرے دل میں خیال آیا کہ جب میں اس کے فلیٹ کا دروازہ بجاتا ہوں تو وہ یقیناً آکر دروازہ کھولتا تھا اس وقت میں تالے کے سوراخ سے جھانک کر اسے دیکھنے کی کوشش کرسکتا تھا۔ لیکن جب اگلے روز میں نے عملاً یہ کام کرنے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ تالے کا سوراخ سیدھا نہیں ہے اس لیے اس سے اندر کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

پھر میں نے سوچا کہ کسی دن کھانے کی ٹرے رکھ کر واپس جانے کے بجائے رک جاؤں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میں رکتا تو لازماً اس کی نظروں میں آجاتا۔ لاؤنج کا فرنیچر ایسا تھا کہ اس میں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ کچن میں فریج باتیں بیڈروم کے دروازے کے تقریباً سامنے تھا اور اس کے عقب میں بھی چھپنا ناممکن تھا۔ اس نے وارننگ دے دی تھی کہ اگر میں نے اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کی تو مجھے فوراً ملازمت سے نکال دے گا اور میں اتنی اچھی ملازمت سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتا تھا جس میں مجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی سوائے تین وقت کھانا بنانے کے اور تنخواہ مجھے کہیں بھی اور کسی کام کی اتنی نہیں مل سکتی تھی۔ بس یہی سوچ کر میں اپنے ارادے سے باز رہا۔

مگر میرا تجسس برقرار تھا۔ اس نے پرچے پر لکھ کر کچھ ڈبا بند کھانے اور کچھ ایسی چیزیں منگوالی تھیں جو ہنگامی صورت میں کھانے کے کام آتیں۔ یہ شاید اس لیے تھیں کہ میں کسی وجہ سے نہ آسکوں تو وہ اس دن گزارا کرلے۔ اگرچہ اس نے وضاحت نہیں کی تھی کہ اس نے یہ چیزیں کیوں منگوائی ہیں لیکن میرا اندازہ تھا کہ اسی لیے منگوائی ہوں گی۔ اس کا معمول روزِ اوّل والا تھا اور اس نے ایک بار بھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ ہر پیر والے دن صبح آتا تو تنخواہ کا لفافہ لاؤنج میں میز پر مل جاتا تھا اور جب رات کو کھانا بنانے جاتا تو اگلے دن کے اخراجات کی رقم اور کھانوں کی فہرست مل جاتی تھی۔

چند مہینوں میں میرے پاس اتنی رقم آگئی تھی کہ میں نے ہاسٹل چھوڑ کر پاس ہی ایک چھوٹا سا فلیٹ کرائے پر لے لیا اور اب مجھے آنے جانے میں آسانی ہوگئی تھی۔ فارغ اوقات میں لائبریری جانے کے بجائے میں فلیٹ میں آکر پڑھتا یا اپنے دوسرے کام نمٹاتا تھا۔ اس دوران میں یہ خیال میرے ذہن میں رہا تھا کہ یہ شخص کون ہے اور کس وجہ سے اس طرح قید ہوکر زندگی گزار رہا ہے؟ وہ فلیٹ سے نکلتا تھا یا نہیں، یہ جاننے کے لیے میں نے دو بار رات کو فلیٹ سے رخصت ہوتے ہوئے دروازے کے بالکل نچلے حصے میں ایک بہت چھوٹا سا ٹیپ کا ٹکڑا چپکا دیا۔ اگر وہ دروازہ کھولتا تو یہ ٹکڑا اکھڑ جاتا لیکن دونوں بار صبح مجھے ٹکڑا اپنی جگہ ملا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ باہر جانے سے گریز کرتا تھا۔

پانچ مہینے گزر گئے اور میرا رزلٹ آگیا تھا۔ اس بار بھی میں نے بہت اچھی پوزیشن حاصل کی تھی اور مجھے یقین تھا کہ مجھے منتخب کرلیا جائے گا۔ میں درخواست اور انٹرویو پہلے ہی دے چکا تھا اب صرف نتیجے پر فیصلہ ہونا تھا۔ میں نے مارک شیٹ کی کاپی جمع کرائی اور تین دن بعد مجھے لیٹر مل گیا کہ آنے والی پہلی تاریخ سے مجھے جوائن کرنا تھا۔ تنخواہ اور دیگر الاؤنسز کے لیے مجھے ایڈمنسٹریشن سے رابطہ کرنے کو کہا گیا تھا۔ ایک دن میں موقع نکال کر چلا گیا۔ کمپنی کے ایڈمن آفیسر نے مجھے بتایا۔

”تمہیں شروع میں چھ ہزار ملیں گے اس کے علاوہ کہیں آڈٹ ٹیم کے ساتھ جاؤ گے تو اس کا ڈیلی الاؤنس کھانے اور رہائش کی سہولت کمپنی کی طرف سے ہوگی۔“

گویا یہاں مجھے آدھی تنخواہ دی جا رہی تھی۔ لیکن میرا اصل کام تو یہی تھا اس پُراسرار شخص نے شروع میں بتا دیا تھا کہ مجھے چھ مہینے کے لیے رکھ رہا ہے اور میرا اپنا ارادہ بھی یہی تھا۔ یہ نوکری تو میں نے وقت گزاری کے لیے کی تھی اور مجھے اس سے بہت کچھ مل گیا تھا لیکن میں ساری عمر یہ کام نہیں کرسکتا تھا اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ پہلی تاریخ سے پہلے یہ نوکری چھوڑ دوں گا اور کیونکہ مجھے پہلے سے اسے خبردار کرنا تھا اس لیے میں نے اسی روز رات کے کھانے کی ٹرے کے ساتھ رقعہ لکھ کر رکھ دیا۔

”سر بعض مجبوریوں کی وجہ سے میں اس مہینے کی آخری تاریخ کو یہ جاب چھوڑ رہا ہوں۔“

اگلے روز جب میں پہنچا تو لاؤنج میں میز پر رقعہ رکھا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ ”کیا تمہیں تنخواہ کم لگ رہی ہے یا کوئی اور مسئلہ ہے؟“

میں نے ناشتے کے ساتھ رقعہ رکھا۔ ”نہیں سر آپ مجھے بہت اچھی تنخواہ دے رہے ہیں لیکن اب مجھے ایک چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ فرم میں اپرنٹس شپ مل گئی ہے، میں آئی سی ایم اے کی تیاری کر رہا ہوں اس لیے مجبوراً یہ جاب چھوڑنا پڑے گی اور ویسے بھی آپ نے چھ مہینے کا کہا تھا جو اس مہینے میں پورے ہوجائیں گے۔“

دوپہر کے وقت آیا تو اس کا جواب موجود تھا۔ ”ٹھیک ہے وِش یو گڈ لک.....“

میں حسبِ معمول کام کرتا رہا۔ مزے کی بات تھی کہ میں اس کے بارے میں بے خبر تھا لیکن اس نے بھی مجھ سے میرے بارے میں نہیں پوچھا تھا، حد یہ کہ نام تک نہیں پوچھا تھا۔ نہ ہی وہ میرا کوئی پس منظر جانتا تھا اس کے باوجود اس نے مجھ پر اعتماد کرلیا۔ اپنے گھر کا ایک حصہ میرے حوالے کر دیا۔ وہ مجھے ہفتے کی تنخواہ پیشگی دیتا تھا۔ اگر میں کچھ چرا لیتا یا تنخواہ لے کر دوبارہ نہیں آتا تو اسے نقصان ہوتا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے اعتماد تھا کہ میں ایسی کوئی حرکت نہیں کروں گا یا وہ اتنا دولت مند تھا کہ اسے پروا نہیں تھی اور اس کے نزدیک یہ معمولی نقصان ہوتا لیکن اگر ملازم اچھا نکلتا تو یہ اس کا بونس بن جاتا جیسا کہ ہوا تھا۔

اتفاق سے مہینے کی آخری تاریخ اتوار کی تھی اور اس سے ایک ہفتہ پہلے اس نے مجھے آخری تنخواہ دے دی تھی۔ ان چھ مہینوں میں اس نے مجھے کوئی اسی ہزار روپے تنخواہ کی صورت میں دیے تھے اور تقریباً چالیس ہزار مجھے روزانہ دی

کراچی کے قرب و جوار کی سطح ہموار ہے (قلعہ کے شمالی، مشرقی اور جنوبی پہلوؤں پر) اور شمال اور مشرق میں آٹھ دس میل اور جنوب میں سمندر تک پھیلی ہوئی ہے چونکہ سندھ میں مشن کی آمد سے پہلے تین موسموں سے خشک سالی رہی تھی لہٰذا زمین جلی ہوئی تھی اور اس پر روئیدگی کا نشان تک نہ تھا سوائے اس کے کہ چھوٹی چھوٹی محروم افزائش جھاڑیاں میدان کے سینے سے لپٹی ہوئی سسک رہی تھیں لیکن میں نے ایک دو کنوئیں دیکھے جن کے گرد ہرے بھرے درختوں کے جھنڈ تھے اور باشندوں نے ہمیں یقین دلایا کہ موسلا دھار بارش کے اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر پوری زمین گھاس کی زربفتی چادر اوڑھ لے گی۔ یہ میدان سواری کے لیے بہترین ہے اس لیے کہ اس کی زمین پر نہ پتھر ہیں نہ دراڑیں۔ اسی لیے ہم اپنے شکاری کتے لے کر اکثر باہر نکل جاتے تھے لیکن ہمیں صرف ایک دفعہ ایک گیدڑ نظر آیا جس کے پیچھے ہم نے گھوڑے ڈالے لیکن وہ بھی ایک کنوئیں میں کود کر ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ ہمیں بتایا گیا کہ آگے اندر کی طرف گیدڑ، لومڑ، جنگلی سور، ہرن اور دیگر جانور بہت تھے، لیکن ہم اندر نہ جاسکے۔

لیفٹیننٹ ہنری پوٹنگر کے 1816ء میں لکھے گئے ”سفرنامہ بلوچستان اور سندھ“ سے اقتباس

تلاش: اظہر جمیل صدیقی، کراچی

اسد خاں، مبارک خاں یوسف خیل کا بیٹا تھا۔ اس کی دریا دلی اور فیاضی کی داستانیں مشہور تھیں۔ ایک دفعہ سلطان سکندر لودھی نے اسد خاں کو کسی خاص خدمت پر مامور کیا۔ جب یہ چندیری پہنچا تو معلوم ہوا کہ جن جانوروں کی پیٹھ پر خزانہ لدا ہوا ہے وہ شدید مجروح ہیں۔ لوگوں نے تجویز پیش کی کہ سارا روپیہ فوج میں تقسیم کر دیا جائے پھر بعد کو ان کی تنخواہ اور جاگیر سے وضع ہو کر خزانے میں داخل ہو جائے گا۔ اسد خاں نے منظور کرلیا لیکن بعد کو اس کے سامنے حساب پیش کیا گیا تو اس نے کہا میں صراف نہیں ہوں کہ روپیہ دوں اور لوں، یہ کہہ کر اس نے سارے کاغذات پھاڑ ڈالے اور سات لاکھ تنکہ جو فوج میں تقسیم کیا گیا تھا، معاف کر دیا۔

اقتباس: تاریخ اسلامی ہند علامہ نیاز فتح پوری

تلاش: شعیل متین، ڈیلاس، یو ایس اے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جانے والی رقم سے بچت ہوئی تھی۔ حالانکہ وہ جو کھانا بنانے کو کہتا تھا میں اس کے لیے بہترین سے بہترین چیز لاتا اس کے باوجود اتنی رقم بچ گئی تھی اور میرے چھ مہینے کا خرچ اسی میں نکل آیا تھا۔ تنخواہ کی ساری رقم ویسے ہی بینک میں جمع تھی۔ یہ بعد میں میرے بہت کام آئی جب میں نے چار سال بعد فرم کی ملازمت چھوڑ دی اور خود سے آگے پڑھنے لگا تھا۔ اس وقت اگر یہ رقم میرے پاس نہ ہوتی تو میں اتنی آسانی سے اپنی تعلیم مکمل نہ کر پاتا۔

آخری روز میں حسب معمول صبح سویرے پہنچا اور میں نے دروازے پر دستک دی اور پھر گھڑی دیکھنے لگا۔ اچانک ہی عقب سے آہٹ ہوئی میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک ادھیڑ عمر لیکن چہرے سے اچھا کھاتا پیتا اور پڑھا لکھا آدمی کھڑا تھا اور مجھے مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے متوجہ پا کر وہ شخص بولا۔ ”آپ کون ہیں اور یہاں کیا کر رہے ہیں؟“

مجھے اس شخص کا لہجہ ناگوار گزرا تھا اس لیے میں نے کسی قدر خشک انداز میں کہا۔ ”میں یہاں ملازم ہوں اور کام کرنے آتا ہوں۔“

اس شخص کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ ”کیا کہہ رہے ہو یہ فلیٹ تو برسوں سے خالی پڑا ہے۔ اس کا مالک کہیں باہر ہوتا ہے۔“

اس بار میری آنکھیں پھیل گئیں۔ ”برسوں سے ... جناب میں اس فلیٹ میں چھ مہینے سے کام کر رہا ہوں اور روز آتا جاتا ہوں۔“

اس آدمی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ کس طرح ممکن ہے، میں اس کے اوپر والے فلیٹ میں رہتا ہوں اور میرا روز کا آنا جانا ہے، اگر یہ فلیٹ آباد ہوتا تو کیا مجھے اطلاع نہیں ملتی۔“

میں ہچکچایا لیکن پھر میں نے کہہ دیا۔ ”اصل میں یہاں جو صاحب ہیں وہ بہت زیادہ تنہائی پسند لگتے ہیں، وہ شاید یہاں سے نکلتے ہی نہیں ہیں۔ انہوں نے مجھے ملازم رکھا ہے کہ میں ان کو تین وقت کھانا بنا کر دیا کروں۔“

”کون صاحب ہیں یہ؟“

”یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔“ میں نے کہا۔ اب مجھے پریشانی ہونے لگی تھی، کہیں یہ شخص مجھے کوئی غلط آدمی نہ سمجھے اور مجھے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دے تو میرا تو کیریئر ہی تباہ ہو جاتا۔

اس نے مزید شک سے مجھے دیکھا۔ ”تم اس شخص کے پاس کام کر رہے ہو اور اسے جانتے تک نہیں ہو؟“

میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی اور اسی بوکھلاہٹ میں میں نے اس شخص کو بتا دیا۔ ”اصل میں وہ کبھی میرے سامنے نہیں آئے اور نہ ہی مجھ سے بات کی ہے۔“

اس کی آنکھوں میں شک بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میاں تم عجیب اور سمجھ میں نہ آنے والی بات کر رہے ہو۔ اس فلیٹ میں کام کرتے ہو اور کام بھی کھانا بنانے کا تو یہ کس طرح ممکن ہے، تم نے آج تک مالک کو نہ دیکھا ہو اور نہ اس سے بات کی ہو۔ میرا خیال ہے مجھے چوکیدار کو بلا لینا چاہیے۔“

میں نے محسوس کیا کہ بات غلط رُخ پر جا رہی ہے۔ میں بول کر پھنستا جا رہا تھا۔ اب مجھے ساری بات بتانی تھی اس لیے مجھے بتانا پڑا اور اس کی حیرت مزید بڑھ گئی۔ ”میاں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص یوں سامنے آئے بغیر کسی سے کام لے اور تم تیار کیسے ہو گئے؟“

”مجھے کام چاہیے تھا اور یہ شخص تنخواہ بہت اچھی دے رہا ہے اور آج تو میرا آخری دن ہے۔ اگر آپ کو یقین نہیں آ رہا ہے تو میں آپ کو دکھا سکتا ہوں۔“ میں نے کہا اور ہینڈل گھمایا۔ دروازہ حسب معمول کھلا ہوا تھا لیکن جیسے ہی میں نے دروازہ کھولا مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ اندر جہاں کل تک شاندار سجا ہوا لاؤنج تھا وہاں اب کچھ بھی نہیں تھا اور فرش پر یوں گرد پڑی تھی جیسے وہاں برسوں سے کسی نے قدم نہ رکھا ہو۔ میں بوکھلا کر اندر آیا۔ یہی حال کچن والے حصے کا تھا اور وہاں بھی کوئی ایک چیز بھی نہیں تھی شیلف پر ڈھیروں مٹی جمی تھی۔ وہ شخص بھی میرے پیچھے آیا تھا۔ اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

”کہاں ہے تمہارا مالک جو بہ قول تمہارے تمہیں تنخواہ دیتا تھا؟“

”وہ اس کمرے میں ہوتا تھا۔“ میں نے بائیں بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ”میں کھانے کی ٹرے اسی کمرے کے سامنے رکھ دیتا تھا۔“

میں نے دروازے کا ہینڈل گھمایا اور وہ بھی کھل گیا لیکن اندر وہی منظر تھا جو لاؤنج میں نظر آیا۔ بالکل خالی کمرا اور وہ بھی گرد سے اَٹا ہوا۔ دوسرا کمرا بھی ایسا ہی تھا۔ پورے فلیٹ میں کہیں کوئی ایک چیز بھی نہیں تھی اور ہر جگہ کی حالت ایسی تھی جیسے کسی نے برسوں سے یہاں قدم نہ رکھا ہو اور نہ ہی کسی جگہ کو استعمال کیا ہو۔ مجھے لگا جیسے میرا سر گھوم رہا ہو اور میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ وہ شخص دوسرا کمرا دیکھ رہا تھا جب میں واپس لاؤنج میں آیا تو میں نے دروازے کے پاس ایک چھوٹا خاکی لفافہ دیکھا میں نے جلدی سے اسے اُٹھایا اور

اسے کھولا تو اس میں سرمئی نوٹ جھانکتے نظر آئے میں نے اس شخص کے دوسرے کمرے سے آنے سے پہلے لفافہ جیب میں رکھ لیا جب ہم اندر آئے تو مجھے یہ لفافہ نظر نہیں آیا تھا۔ اس وقت میں بدحواس ہو رہا تھا شاید اس لیے میری نظر لفافے پر نہیں گئی تھی۔ وہ شخص دوسرے کمرے کا معائنہ کر کے آیا اور مجھ سے کہا۔

”تم نے دیکھ لیا یہاں کوئی نہیں رہتا ہے پھر تم چھ مہینے تک کس کے لیے کام کرتے رہے؟“

میں نے اپنا سر سہلایا۔ ”مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا...... لیکن میں نے جو کہا ہے اس میں ذرہ برابر بھی جھوٹ نہیں ہے۔“

”مجھے لگ رہا ہے تم سے شاید کوئی غلطی ہوئی ہے، ایسا کرو گھر جا کر آرام کرو۔“ اس نے میرا شانہ تھپکا۔ ”میں دیکھتا ہوں یہ فلیٹ کس کی ذمے داری ہے اور فی الحال تو یہاں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے چور لے جائیں لیکن پھر بھی میں فلیٹ انتظامیہ کو اطلاع کرتا ہوں۔ تم نے کہا کہ تمہارا آج آخری دن تھا؟“

”جی جناب کل سے میں اس کام پر نہیں آتا۔“

”تب تم سمجھو کہ تم فارغ ہو گئے ہو۔ تم مجھے شکل سے شریف نوجوان نظر آ رہے ہو میں نہیں چاہتا کہ تم کسی مشکل میں پڑو اس لیے اب یہاں مت آنا۔“

میں جان چھوٹنے پر خدا کا شکر ادا کر رہا تھا، میں نے کہا۔ ”جی اب مجھے آنے کی کیا ضرورت ہے تو مجھے اجازت ہے؟“

”بالکل تم جاؤ یہاں کے معاملات میں دیکھ لوں گا۔“

اس نے کہا تو میں فوراً وہاں سے روانہ ہو گیا۔ باہر آ کر جب میں نے قدرے سکون کا سانس لیا اور محسوس کیا کہ میں خطرے سے نکل آیا ہوں تو مجھے فکر ہوئی کہ میں چھ مہینے تک کس کے لیے کام کرتا رہا؟ کیا یہ کوئی آسیبی چکر تھا یا کسی نے مجھے کھلونا بنایا تھا۔ لیکن یہ کس قسم کا کھیل تھا جس میں مجھے کوئی نقصان نہیں ہوا اور میں تو مزے کرتا رہا تھا۔ سارے دن میں صرف تین گھنٹے کا اور اس کے بعد آرام۔ تنخواہ الگ اور روزانہ ملنے والی رقم سے بچت الگ۔ کام تو مجھے کل سے شروع کرنا تھا۔ ایڈمن آفیسر نے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ دفتر میں آتے وقت گھڑی ضرور دیکھتے رہنا لیکن واپسی کے لیے گھڑی دیکھنے کی زحمت نہ کرنا۔

میں نے گھر پہنچ کر لفافہ دیکھا تو اس میں میری دو ہفتے کی تنخواہ کے برابر رقم موجود تھی اور ایک چھوٹی سی چٹ پر لکھا تھا۔ بونس فور گڈ ورک۔ اگلے دن سے میں نے جوائن کر لیا اور شروع میں اتنے کام سے واسطہ پڑا کہ مجھے اس واقعے کے بارے میں کیا اپنے بارے میں بھی سوچنے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ صبح سویرے نکلتا تھا تو رات سے پہلے واپسی نہیں ہوتی تھی اور پھر امتحان کی تیاری بھی کرنی ہوتی تھی۔ میں نے شکر ادا کیا کہ اس پُراسرار شخص کی ملازمت کے دوران مجھے پڑھنے کا بھرپور موقع ملا تھا اور وہی میرے کام آیا۔ رفتہ رفتہ کام سیکھ لیا اور اس طرح بوجھ کم ہونے لگا۔ چار سال بعد میں نے محسوس کیا کہ اب پڑھائی اور نوکری میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا ہوگا۔ حالانکہ اس وقت مجھے تنخواہ بھی بہت اچھی ملنے لگی تھی لیکن ایک بار میں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بن جاتا تو میری آمدنی اس سے کہیں زیادہ ہو سکتی تھی۔ اس لیے میں نے ملازمت چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور اپنا مکمل وقت تعلیم کو دینے لگا۔ اب تک میری ساری فیسیں کمپنی ادا کرتی آئی تھی لیکن اب مجھے فیس بھی خود ادا کرنا تھی۔ ملازمت کے دوران .... بھی میں نے کچھ رقم بچائی تھی لیکن میرے اصل کام وہی رقم آئی جو مجھے چھ مہینے کی تنخواہ کی صورت میں ملی تھی اور ساری کی ساری میرے پاس موجود تھی۔ اس سے میں آنے والے دو سال تک گزارا کرتا رہا اور اپنا سارا وقت تعلیم کو دیتا رہا۔ یوں میں نے چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بننے کا اعزاز حاصل کر لیا۔ یہ کتنا مشکل کام ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ پاکستان میں ہر سال پانچ ہزار ڈاکٹرز اور اس سے زیادہ لوگ انجینئر بنتے ہیں لیکن چارٹرڈ اکاؤنٹنٹس کی تعداد ایک ڈیڑھ درجن سے زیادہ نہیں ہوتی۔

تعلیم مکمل کرتے ہی مجھے جاب کی آفرز ہونے لگی تھیں لیکن میں نے ایک چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ فرم کے مالک کی پیش کش قبول کر لی۔ اس نے مجھے فرم میں تیس فی صد کی شراکت داری کی پیش کش کی تھی۔ یہ پیش کش ہم دونوں کے لیے فائدے مند تھی۔ میں جتنا کام کرتا اسی لحاظ سے میری کمائی ہوتی اور وہ مجھے جتنا ادا کرتا تھا اس سے زیادہ کما لیتا تھا۔ سوا سال بعد میں ڈیفنس میں بنے اپنے بنگلے میں شفٹ ہو گیا تھا اور اسی سال میری شادی میرے پارٹنر کی بیٹی سے ہو گئی۔

اب میں آتا ہوں اصل بات کی طرف جس کی وجہ سے مجھے اپنی یہ کہانی لکھنے کا خیال آیا۔ دفتر سے آنے کے بعد میں ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ ایک ایوننگ پروگرام میں ایک معروف رائٹر مدعو تھا جو ان دنوں ٹی وی کے لیے بے حساب ڈرامے اور دوسری چیزیں لکھ رہا تھا۔ مجھے خود تو ڈراموں سے خاص دلچسپی نہیں ہے لیکن میری بیگم کو ہے اور بیوی کو جس چیز

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے دلچسپی ہوتی ہے وہ لازمی اس بارے میں شوہر کو بتاتی ہے۔ میری بیگم بھی مجھے اس رائٹر اور اس کے ڈراموں کے بارے میں بتاتی رہتی تھی۔ میں اس کے نام سے واقف تھا لیکن کبھی اسے دیکھا نہیں تھا۔ آج پہلی بار اسے دیکھنے کا اتفاق ہو رہا تھا اور مجھے اس کی صورت جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ وہ میزبان کو بتا رہا تھا کہ اس نے کن حالات میں لکھنا شروع کیا۔ اس سے پہلے وہ رسالوں اور اخبارات کے لیے لکھتا رہا تھا پھر اسے ٹی وی کا خیال آیا اور اس نے محسوس کیا کہ آنے والے دنوں میں ایک رائٹر سب سے زیادہ ٹی وی سے کما سکتا ہے اس لیے اس نے سوچا کہ وہ قبل از وقت تیاری کیوں نہ شروع کر دے۔ اس مقصد کے لیے اس نے ایک فلیٹ کرائے پر لیا اور بیوی بچوں کو باہر جانے کا کہہ کر اس فلیٹ میں شفٹ ہو گیا اور لگاتار چھ مہینے اس فلیٹ میں رہ کر لکھتا رہا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ ان چھ مہینوں میں ایک بار بھی فلیٹ سے باہر نہیں نکلا تھا اور اس نے کاموں اور کھانا بنانے کے لیے ایک ملازم رکھ لیا تھا۔

جب اس نے یہ بات کی تو میں چونک گیا اور پھر مجھے یاد آ گیا کہ مجھے اس کی صورت کیوں جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ یہ وہی شخص تھا جو مجھے آخری دن فلیٹ کے باہر ملا تھا۔ اگرچہ میں سو فی صد یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ اس بات کو دس سال گزر گئے تھے اور اتنے عرصے میں آدمی کی یادداشت پر کچھ نہ کچھ اثر تو پڑتا ہے۔ شاید مجھے مغالطہ ہو رہا تھا۔ پھر بھی میرے اندر سے کوئی کہہ رہا تھا کہ یہ وہی شخص ہے اس کے بولنے کا انداز بھی وہی تھا۔ وہ سارا واقعہ ایک بار پھر میری یادوں میں تازہ ہو گیا جسے میں بھول چکا تھا۔

اگلے روز دفتر سے آتے ہوئے میں نے گاڑی کا رُخ اسی عمارت کی طرف موڑ دیا۔ تازہ رنگ و روغن اور اچھے ماحول کی وجہ سے عمارت پہلے سے زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔ پہلے میں اس فلیٹ تک پہنچا جہاں میں چھ مہینے کام کرتا رہا تھا۔ میں نے کال بیل بجائی تو اندر سے کسی خاتون نے پوچھا۔

''میں اس فلیٹ کے مالک سے ملنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میرے شوہر گھر پر نہیں ہیں۔'' عورت نے دروازہ ذرا سا کھول کر مجھے دیکھا۔ ''آپ کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں؟''

''دراصل اس فلیٹ میں دس سال پہلے میرے ایک واقف کار مقیم تھے میں ان کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔''

''میرے شوہر نے یہ فلیٹ چار سال پہلے خریدا تھا اس سے پہلے یہاں کون تھا؟ ہم اس بارے میں نہیں جانتے۔ ...... ویسے آپ رات کو آئیں تو میرے شوہر اس بارے میں بتا سکتے ہیں۔''

میرا رات کو آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں اس کے بجائے اس فلیٹ کے عین اوپر والے فلیٹ پر آیا اور کال بیل کے جواب میں ایک بوڑھی عورت نے باہر جھانکا۔ ''مجھے اس فلیٹ کے مالک سے ملنا ہے۔'' میں نے کہا۔

''کہو بیٹا میں ہی اس کی مالک ہوں۔'' بوڑھی عورت شائستہ انداز میں بولی۔

''کیا آپ کے شوہر ہیں؟''

''نہیں ان کا تو پندرہ سال پہلے انتقال ہو چکا ہے۔'' اس نے دکھ سے کہا۔

''آپ کا کوئی بیٹا ہے؟''

''نہیں میری کوئی اولاد نہیں ہے میں اکیلی ہوں۔'' بوڑھی عورت نے جواب دیا۔ ''لیکن تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو بیٹا؟''

میں نے گہری سانس لی۔ ''آنٹی دس سال پہلے یہاں ایک آدمی مجھے ملا تھا اور اس نے کہا تھا کہ وہ اس فلیٹ میں رہتا ہے۔''

''اس آدمی نے یہ کہا تھا۔'' بوڑھی عورت پریشان ہو گئی تھی۔

میں نے اسے تسلی دی۔ ''آپ پریشان مت ہوں۔ اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ آپ اس بارے میں پریشان مت ہوں۔''

میں وہاں سے روانہ ہوا تو بات کسی حد تک واضح تھی۔ جو شخص مجھے پڑوسی بن کر ملا تھا وہی اس فلیٹ میں مقیم تھا اور وہ یہاں اس کا بھی آخری دن تھا۔ جیسے ہی میں ایک دن پہلے رات کو وہاں سے روانہ ہوا تو اس نے یقیناً سارا فرنیچر اور چیزیں وہاں سے ہٹا دیں اور کسی طرح سے فلیٹ کو مٹی مٹی کر دیا۔ یہ کوئی بہت مشکل کام نہیں ہے۔ ایسی اسپرے گن آتی ہے جو باریک مٹی اسپرے کرتی ہے اور کسی بھی جگہ کو اس طرح بنا دیتی ہے کہ جیسے وہاں برسوں سے کسی نے قدم نہ رکھا ہو۔ پھر وہ صبح میرا منتظر تھا اور جب میں آیا تو پیچھے سے وہ بھی آ گیا۔ اس کا مقصد تھا کہ میں خالی فلیٹ دیکھ کر شور نہ کروں اس طرح دوسرے لوگ آ جاتے۔ اس نے بہت ہوشیاری سے مجھے ڈرا کر بھگا دیا۔ جب ہم اندر آئے تو وہاں کوئی لفافہ نہیں تھا۔ جب میں بیڈ روم دیکھ رہا تھا تو اس نے لفافہ لاؤنج میں گرا دیا۔

ooo

WWW.PAKSOCIETY.COM